Made with Xodo PDF Reader and Editor

نذر ضیاء الہدیٰ رح

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ رح کی شخصیت، افکار اور خدمات

مجلس رفقائے قدیم حلقہ طلبہ اسلامی، بہار

نذر ضیاء الہدیٰؒ

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ کی شخصیت، فکر اور خدمات

(۱۹۱۸ء۔۱۹۹۸ء　　۱۳۳۵ھ۔۱۴۱۹ھ)

مجلس ادارت

احمد علی اختر

شبیر عالم خاں

سید محمد اقبال

راشد نیر

ارشد اجمل

مجلس رفقائے قدیم حلقہ طلبہ اسلامی بہار

بی۔۲۱، علی نگر، انیس آباد۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۲

نام کتاب

نذر ضیاء الہدیٰ

NAZR -E- ZIYAUL HUDA

قیمت

۱۵۰ (پیپر بیک)

۲۵۰ (ہارڈ باؤنڈ)

تعداد

۵۰۰

سنہ اشاعت

فروری ۲۰۰۳ء

کمپوزنگ و ڈیزائننگ

محمد جاوید عالم

طباعت

پاکیزہ آفسٹ، پٹنہ

Printed by : Pakiza Offset, Ph. : 667019

ناشر

مجلس رفقائے قدیم حلقہ طلبہ بہار

ملنے کے پتے

مکتبہ اسلامی، پتھر کی مسجد۔ پٹنہ ۶

'ضرورت'، چمن اپارٹمنٹ، بھکنا پہاڑی، پٹنہ۔۶

مرکزی مکتبہ اسلامی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ ۲۵

دانش بک ڈسٹری بیوٹرس، 1739/3 (بیس منٹ) نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

نذر ضیاء الہدیٰؒ

فہرست مضامین

حرف وصوت

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''نذر ضیاء الہدیٰ'' ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات پر حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے قدیم ارکان کی ایک حقیر پیشکش ہے ۔

گر قبول افتدز ہے عزوشرف

اس پیشکش پر ہم اللہ رب العزت کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں ایک مرد حق کی ان مساعی جمیلہ کو محفوظ کرنے کی کسی قدر توفیق بخشی جو اقامت دین کے لیے کی گئیں تا کہ استفادہ کی راہیں مزید ہموار ہوں ۔ مرحوم کے لیے ہماری طرف سے یہ ایک طرح کا خراج محبت وعقیدت بھی ہے اور اس روشنی کو تا دیر اور تا دور پھیلانے کی حقیر سعی بھی جو مرحوم نے اقامت دین اور تعمیر اسلامی معاشرہ کے تعلق سے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک جلائے رکھی ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کوششوں کو قبول فرمائے ،غلطیوں اور کوتاہیوں کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے ۔ آمین !

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم اسم با مسمّٰی تھے ۔ گو ہمارے درمیان ہدایت کی یہ روشنی موجود نہ رہی مگر دین کے تعلق سے کی جانے والی قابل تحسین کوششوں کی روشن قندیلیں یادوں کے نگار خانے میں اب بھی فروزاں ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان روشن قندیلوں سے چراغ جلائے جاتے رہیں اور اقامت دین کی راہ میں سعی وجہد کرنے والے گرمی اور روشنی حاصل کرتے رہیں ۔

مرحوم کی شخصیت غیر معمولی تھی ۔ وہ ان گراں مایہ اور یگانہ روزگار ہستیوں میں سے ایک تھے جو روز روز نہیں پیدا ہوتیں ۔ میر تقی میر نے کچھ ایسے ہی لوگوں کے لیے غالباً یہ خیال ظاہر کیا تھا ۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ممکن ہے ڈاکٹر صاحبؒ کو اس شعر کا مصداق قرار دیا جانا مبالغہ تصور کیا جائے مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ ہزاروں میں ایک تھے ۔ ان کی شخصیت منفرد اور غیر معمولی تھی ۔ بظاہر معمولی آدمی تھے مگر ان کے اندر بہت سی خوبیاں تھیں ۔ وہ ذہین وطباع ، فکر رس اور بالغ نظر تھے ، محنتی وجفاکش ، مخلص وبے ریا ، حسن عمل اور حسن اخلاق کے پیکر ، مصلحت اندیشی سے بے نیاز اور جرأت مومنانہ سے سرشار تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے قول وعمل میں تضاد نہ تھا جو اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب شئے ضرور ہے ۔ گواہی وہ معتبر ہوتی ہے جو قریب ترین لوگ دیں ۔ اہل خاندان ، پڑوسی ، ہمسفر ، معاملات کے شریک ۔۔۔۔ اور ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے متعلق ایسے سب لوگوں کی گواہیاں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ ان کا قول وعمل یکساں تھا ۔ آزمائش کے کسی موقع پر مرحوم نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی ۔ ایثار وقربانی اور صبر وعزیمت کی روشن مثالیں قائم کیں ۔ خودداری اور عزت نفس ، فقر اور درویشی والی زندگی اختیار کی ۔ اپنے دلنواز تبسم سے لبھایا ، محبت وشفقت سے دلوں میں گداز پیدا کیا ، حکیمانہ باتوں سے دماغ کی بند گرہیں کھولیں اور ایمان انگیز گفتگو سے قلوب میں یقین کی روشنی اور ایمان کی حلاوت اور حرارت پیدا کی ۔ یقیناً یہ خوبیاں ایسی ہیں کہ ان کے ''حوالے'' اقامت دین کی تحریک کے ہمسفروں کے لیے مشعل راہ کا کام دیں گے ۔ حفیظ میرٹھیؒ نے فرمایا تھا ۔

لوگ چن لیں جس کی تحریریں حوالوں کے لیے
زندگی کی وہ کتاب معتبر ہو جائیے

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم کی کتاب زندگی کچھ ایسی ہی معتبر تھی کہ ان کے حوالے ہمارے لیے روشنی، رہنمائی، گرمی اور توانائی فراہم کریں گے (انشاءاللہ)۔

اقامت دین کی سعی میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم کی فکرمندی، منصوبہ بندی اور عمل پذیری مسلسل نظر آتی ہے۔ طالب علمی کی زندگی ہی سے اس کا سراغ ملتا ہے۔ تحریک اسلامی سے تعارف اور تعلق نہ تھا اس وقت بھی قرآن سے والہانہ لگاؤ اور دین سے گہرے تعلق کی مثالیں اور شہادتیں ملتی ہیں۔ تحریک اسلامی میں شمولیت کے بعد تو مرحوم نے اپنی زندگی دین کی اقامت کے لیے وقف ہی کردی۔ فکرمندی اور دل سوزی کے ساتھ لوگوں کو تحریک اسلامی کا مقصد و غایت بتایا۔ خاص طور سے قرآن کے ذریعہ لوگوں کو دین کے صحیح تصور سے آشنا کرنے کی سعی کی۔ اس سے ان کے رابطے میں آئے ہوئے لوگوں کے اندر قرآن فہمی کا ذوق بھی پیدا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے مردوں، خواتین، طلبا اور طالبات سب کو اپنی کوششوں کا ہدف بنایا۔ تربیت اور دعوت ہر پہلو سے جماعت کے کارکنوں کے اندر اہلیت اور شوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دعوت دین کی راہ میں ان کوششوں سے جہاں عام کارکنوں کا شوق سفر بڑھا وہیں خواتین اور طالبات کا بھی عزم سفر تیز ہوا۔ خاص طور سے طلبہ پر غیر معمولی کام ہوا۔ مرحوم نے اپنی ایمان انگیز اور رجائی باتوں سے ان کے اندر ایک ولولہ اور جوش پیدا کردیا۔ ان کے حوصلوں کو مہمیز دے دی۔ انہیں سکوت و جمود کی ٹھنڈی فضا سے نکال کر حرکت و عمل اور تحریک و تنظیم کی گرم اور ہنگامہ خیز فضا سے آشنا کردیا۔ ''حلقہ طلبہ اسلامی بہار'' کے نام سے ایک پوری تنظیم وجود میں آگئی جس نے طلبہ کے درمیان معیاری کام کیا۔ بہت سے طلبا کی زندگی سنور گئی۔ آنے والے وقتوں کے لیے وہ تحریک اسلامی کا سرمایہ (Asset) بن گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کیا، کام کرنے والوں کے لیے وہ ایک اچھی مثال ہے۔ ہماری طرف سے محبت و عقیدت کا بہترین نذرانہ یہی ہوگا کہ ہم اس پاک مشن کو زندہ رکھیں جس کے لیے مرحوم نے سعی کی۔ مرحوم کے سلسلے میں یہ یادگار مجلّہ نکال کر ہم ایسا محسوس کررہے ہیں جیسے اس مشن کو زندہ رکھنے میں یہ بھی ایک Contribution ہو۔ نیز اس مجلّہ کو نکال کر ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ مرحوم کی طرف سے ہم پر کوئی قرض تھا جسے ہم ادا کرنے کا ایک موقع پا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو قبول فرمائے اور لوگوں کے لیے مفید بنائے۔ آمین!

آپ کے سامنے یہ مجلّہ مجلس ادارت کے رفقاء کے فیصلوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے، بالخصوص برادر راشد نیر اور برادر ارشد اجمل کے ایڈیٹنگ کے کام میں عملی شرکت نے اس میں کسی قدر اپنے حوصلے کے مطابق رنگ بھرنے کے کام کو آسان کیا۔ اس کی پروف ریڈنگ میں، خاص طور سے آیات قرآنی کی، مولانا حامد حسین ندوی، کا ہمیں خاص تعاون حاصل رہا اور اس تعلق سے قاری جاوید صاحب اور برادر محمد کوثر نیازی نے بھی ہماری معاونت کی۔ یہ تمام حضرات الحراء اسکول پٹنہ کے اساتذہ ہیں۔ جناب ابونصر فاروق صاحب نے اس کے ابتدائی مسودہ کو کافی لگن اور اہتمام کے ساتھ کمپوز کیا اور برادر جاوید عالم نے بقیہ تمام مسودہ کو نہ صرف کمپوز کیا بلکہ اس کی تزئین و آرائش میں خاص دل چسپی لے کر اسے نکھارا۔ رفیقی چودھری عبیداللہ صاحب نے اس کی طباعت اور اسے منظر عام میں لانے میں ہماری خصوصی معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام رفقاء کو جزائے خیر دے۔ آمین!

اس مجلّہ کو نکالنے میں ہم نے اپنے طور سے بہتر کوشش ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ ہماری کوششیں کوتاہیوں اور خامیوں سے خالی ہرگز نہ ہونگی۔ پس آپ ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی کریں اور ہمیں مفید مشوروں سے نوازیں تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔

(احمد علی اختر)

کچھ ڈاکٹر صاحبؒ اور کچھ مجلّہ کے بارے میں

ارشد اجمل

جب حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے قدیم ارکان میں سے چند نے اس مجلّہ کو نکالنے کا فیصلہ کیا تو اس کا ایک خاکہ ان کی نشستوں میں تجویز ہوا۔اسی خاکے پر بکھرے بکھرے رنگ بھر کر آپ کے سامنے پیش خدمت ہے۔اس خاکے پر تھوڑی گفتگو، اس لئے کہ بعد میں کوئی اوالوالعزم اس خاکے کے تمام گوشوں میں مناسب رنگ پر کر سکے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود یہ خاکہ اپنے آپ میں مکمل ہے اس پر بھی سونچا جا سکتا ہے اور ترمیم اور ممکن ہے کہ بالکل دیگر خاکہ زیادہ بہتر شکل میں سامنے آئے۔

اس خاکے کے تین حصے تجویز کردہ تھے: 'ڈاکٹر صاحب'، حروف صوت' اور 'نذر'۔موجود مجلّہ میں 'نذر' کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ پر خطوط و دستاویزات کو شامل کیا جارہا ہے۔اس میں ایک حصہ وہ ہے جس سے ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ایک قطعہ اس سلسلے میں ''رفیق'' کے مولانا عروج قادری نمبر میں مولانا سید احمد عروج قادری صاحب کی ڈائری کے عکس کے طور پر شائع ہوا تھا جس کا آخری مصرعہ تھا'' یک بیک پھیل گئی دور تلک تیری ضیا'' پورا قطعہ تو آپ آگے ملاحضہ فرمائیں گے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵/اپریل ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر صاحب برخواست کردیئے گئے۔ڈائری شاید مرکزی مکتبہ سے جو چھوٹی والی نکلتی تھی وہ ہے۔اس اعتبار سے ہجری تاریخ ۳۰/رجب ۱۳۷۲ھ بھی پرنٹ ہے۔آسمان کی اونچائی کو چھوتا ہوا مینار کا آرٹ ہے اور لکھا ہے چاند نمودار ہوگا۔ڈاکٹر صاحب کے ملازمت کے دوران کے دو Collegue محمد یوسف اور سید مظہر حسین صاحب سے میری ملاقات ہے۔اس میں سے محمد یوسف صاحب کمیونسٹ تحریک سے منسلک رہے ہیں، ٹیل کام کے بڑے ٹریڈ یونین لیڈر، بہت بااصول آج کل سیاسی طور سے CPI (ML) کے ممبر ہیں، دوسرے سید مظہر حسین صاحب متدین اور تبلیغی جماعت سے ایک گونہ وابستگی ہے۔ان دونوں حضرات سے میں نے ڈاکٹر صاحب کے استعفیٰ کے تعلق سے معلومات حاصل کرنی چاہی۔محرک یہ تھا کہ ایک طرف استعفیٰ کے تعلق سے کچھ زیادہ معلومات حاصل ہوا اور دوسری جانب یہ کہ معتقدین کے حلقہ میں کبھی واقعات غیر ضروری حد تک Glorify ہو جاتا ہے، جب کہ ہم عصر واقعہ کو اتنا اہم نہیں مانتے ہیں۔جب ڈاکٹر صاحب نے ستعفیٰ دیا تو اس وقت الہ آباد کے رئیس خاندان کے حاجی قاضی امیر الدین صاحب اس شعبہ کے سربراہ تھے۔ڈاکٹر صاحب کی پہچان اپنے شعبہ میں ایک Competent اور پابند وقت اسٹاف کی تھی اور ساتھ ہی خوش اخلاق اور باکردار شخص کی۔ان دونوں صاحبان کی مشترکہ روایت ہے کہ ڈاکٹر صاحب اگر چاہتے تو بہت آسانی سے اپنی سروس بچا سکتے تھے بلکہ یہ بھی کہ سربراہ شعبہ کی جانب سے بھی ایک ہمدردی کا رویہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی ہند سے اپنے عدم تعلق کا اظہار کر کے اپنی ملازمت بچالیں۔دستاویز کے شعبہ میں دوسرا حصہ ڈاکٹر صاحبؒ اور جماعت اسلامی ہند سے ان کے استعفیٰ دینے کے تعلق سے اور اس وقت ارکان جماعت پر سے ووٹ دینے کی پابندی اٹھانے کے تعلق سے جماعت اسلامی ہند کے فیصلے اور تحریک اسلامی کے قائدین سے خط و کتابت پر مشتمل ہے۔ہمارا یہ ماننا ہے کہ یہ چیزیں تاریخ کی امانت ہے جسے ہم جوں کا توں ریکارڈ کر دے رہے ہیں۔محترم نسیم احمد صاحب نے اپنے مضمون میں مجلّہ کے مرتبین کو اس ذمہ داری کا احساس دلایا ہے کہ وہ اس مجلّہ میں ڈاکٹر صاحب کے جماعت اسلامی ہند سے مستعفی ہونے پر صاف صاف روشنی ڈالیں۔اس کا ایک جواب تو خود نسیم احمد صاحب نے دیا ہے، دوسرے اوپر مذکورہ دستاویزات کو ہم نے نقل کیا ہے اور راشد نیر صاحب کا مضمون بھی اس لئے ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فکر و عمل کا وہ

حصہ واضح طور پر آئے جو مستعفی ہونے کے وقت اور بعد کا ہے۔اس سلسلے میں ہم تو اتنا کر پائے ہیں۔

دستاویز کا ایک بڑا ذخیرہ Undeciphered راشد نیر صاحب کے پاس موجود ہے، جو اس بات کا متقاضی ہے کہ مناسب صلاحیت اور مناسبت رکھنے والے افراد ان سے استفادہ کریں اور اسے افادہ عام کے لئے سہل بنائیں۔ہم ڈاکٹر صاحب کے اس Undeciphered ذخیرے سے ایک چیز نموناً اس مجلّہ میں دے رہے ہیں۔وہ ڈاکٹر صاحب کی ایک ڈائری میں جو پیلے رنگ کی ہے اس میں ''تبریز ترجمہ ابریز'' اوپر لکھا ہے اور نیچے ''حروف تہجی سریانی زبان میں کس معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں (اور بقیہ حروف مقطعات کی شرح بھی ان کے ذریعہ معلوم ہوسکتی ہے)'' کی عبارت لکھی ہے۔اس کے بعد مختلف حروف فتحہ،ضمہ اور کسرہ کی حرکت کے ساتھ لکھا ہے اور سامنے اس کا معنی ہے۔قرآن میں حروف مقطعات کو حل کرنے کی کئی کوششیں کی گئی ہیں۔ڈاکٹر صاحبؒ اس پر بہت تفصیل سے کبھی بولے یا نہیں یہ نہیں معلوم،لیکن اس پر وہ سوچتے رہتے تھے اس کا اظہار تو کئی مواقع پر ہوا ہے۔ایک حدیث آپؒ نے ایک موقع پر سنایا تھا کہ کوئی اہل کتاب عالم کسی صحابی سے ملا اور اس نے جب حروف مقطعات میں سے ایک سنا تو کہا کہ تمہارا دین اتنے سال تک رہے گا، جب اس نے دوسرا سنا تو دین کے اور دیر تک رہنے کی بات کہی اور جب کچھ اور سنایا گیا تو اس نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا۔اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ تم نے اسے پورا کیوں نہیں سنا دیا۔حدیث کے اصل الفاظ،اس کی تخریج اور اس کو روایت اور درایت پر پرکھنا حدیث کے عالم کا کام ہے وہ اسے کریں،ہم نے تو صرف نقل کر دیا ہے۔

مذکورہ ذخیرے میں دو جہانوں کی سیر ہوگی ایک روحانی اور دوسرے جسمانی۔میں نے جو چار ڈائریوں کی Browsing کی ہے اس میں روحانی میدان میں اسماء حسنیٰ میں جلالی، جمالی، ان کی تاثیر، ان کے اعداد اور عددی میں واحد سے لے کر الف تک کا شمار، مختلف قسم کے نقش، الگ سے بعض نقش مخصوص قسم کے کاغذ اور چمکی وغیرہ پر، مختلف قسم کے اوراد و وظائف اور ان کی تاثیر، مختلف کتابوں سے نوٹ جس میں مکتوبات محمدی، انفاس العارفین، حل المشکلات، حجۃ اللہ البالغہ، حصن المسلم اور مخدوم شرف الدین بہاری، مخدوم یحییٰ منیری، سیرت سید احمد شہید، تیرے پراسرار بندے، شہاب نامہ اور ایسی کتابیں بھی ولی بنانے والی کتاب، نعمت اللہ ولی کے اشعار اور کلکتہ کا چلتا جادو، دوسری جانب Cherios Numerology، Number of Alphabet's، Astrology میں Number of Planets اور Number of Days وغیرہ ہے ساتھ ہی Clonning پر بھی ایک اقتباس ہے۔جسمانی میں طب نبوی، مجربات سلف صالحین، مختلف افراد سے حاصل شدہ طب کے نسخے اور مختلف بیاض سے ان افراد کے نام کے ساتھ جنہوں نے یہ بیاض فراہم کیا، مختلف نسخوں کی نقل۔ہماری یہ خواہش تھی کہ کوئی صاحب ڈاکٹر صاحبؒ کے طریقہ علاج پر بھی کچھ لکھیں جسے ہم لوگ پیار اور عقیدت سے Ziaopathy کہتے تھے، جس میں ہومیوپیتھ اور طب یونانی کا امتزاج ہوتا تھا اور بعض وہ نسخے بھی جو ڈاکٹر صاحب کو Dying Wisdom کے ذخیرہ سے ملا اور اس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنا تجربہ کیا، سنہری دوا ایک ایسا ہی نسخہ تھا۔ڈاکٹر سعید الحق کے پاس بعض نسخوں پر عمل ہو رہا ہے۔ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس میں روحانی اور جسمانی علاج کا تذکرہ ایک ساتھ ہو جائے گا۔ایک لڑکی کا رشتہ ایک لڑکے سے قرار پایا، بات مکمل ہوگئی۔خدا کا کرنا رشتہ طے ہونے کے بعد لڑکی کو Leprosy ہوگیا۔لڑکی کے خاندان والے اونچے اخلاق کے لوگ، جو شخص بیچ میں تھا اسے بلایا اور کہا کہ لڑکے کو جا کر بتایا جائے کہ لڑکی اس مرض میں مبتلا ہوگئی ہے، اب اس رشتہ کو ختم کر دیا جائے۔جو شخص بیچ میں تھا اس نے لڑکی کو پٹنہ میں ڈاکٹروں سے دکھایا، ایلوپیتھی کے ڈاکٹروں نے کہا کہ علاج ہو جائے گا لیکن اس میں وقت پانچ سال کا لگے گا۔ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ کو لڑکی کو دکھایا گیا انہوں نے ایک دوا لگانے کی دی اور ایک دوا کھانے کی اور کہا کہ لڑکی کھانے میں بیسن کا استعمال کرے، انشاء اللہ دو، تین ماہ میں مرض جاتا رہے گا۔اس کے بعد لڑکے سے رابطہ کر کے لڑکی

والوں کا پیغام دیا گیا۔ لڑکا اخلاق کی ایک اور اونچی منزل پر تھا، اس نے کہا رشتہ کے ختم ہونے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ آپ تصور کریں کہ رشتہ تو قرار پا چکا ہے، اگر شادی ہو جاتی اور تب یہ مرض ظاہر ہوتا تو اس کے علاج کی ذمہ داری تو میری ہی ہوتی۔ قصہ مختصر لڑکی تین ماہ میں پورے طور پر صحت یاب ہوئی، نکاح ہوا اور اسی انداز میں ہوا جو ڈاکٹر صاحب پسند فرماتے تھے، کوئی باراتی نہیں۔ سادگی کے ساتھ شادی ہوئی، لڑکی رخصت ہوئی کوئی دسہرہ کھانے کے لئے واپسی نہیں ہوئی، لڑکی شاید تین چار ماہ بعد پھر اپنے گھر آئی تھی۔ آج وہ جوڑا بہت مطمئن ہے، ماشاء اللہ اولادیں ہیں اور دونوں تحریک اسلامی کے فدائی کارکن ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا میدان متنوع ہے اس لئے ان کے جہان میں داخلہ بھی ایک عنوان ہے، ہم چاہتے تھے کہ ''جہان ضیاء الھدیٰ میں داخلہ'' (How to enter into the world of Ziaul Hoda) پر بھی کچھ آئے۔ آپ کے دلچسپی کے عنادین میں اگر Physics ہے تو دوسری جانب Metaphysics بھی، Chemistry ہے تو سونا بنانے کا نسخہ بھی ہے، تصوف کی گوشہ گیری ہے اور مراقبہ اور اوراد و وظائف، اجناء اور نقش ہے تو دوسری جانب قرآن، انقلاب، امامت اور تحریک بھی ہے۔

دستاویز کا یہ حصہ بذات خود اہم ہے اور اسے ہم مجلّہ کا حصہ بنانے پر خوش ہیں۔ لیکن جو حصہ ہم نہیں ترتیب دے سکے یعنی 'نذر' اس کا ہمیں افسوس ہے۔ اس حصہ میں ہم تین آزادانہ مضامین دینا چاہتے تھے، ان عنوانات پر جن سے ڈاکٹر صاحب کو خصوصی لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے غور و فکر کا محور و مرکز قرآن تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ قرآن کی چند معروف تفسیروں کا اس اعتبار سے جائزہ لیا جاتا کہ ان کے ذریعہ قرآن کی تعلیمات کی ترسیل کس حد تک عام انسانوں تک ہوتی ہے اور کس حد تک ان سے حجاب پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ قرآن کی تعلیمات کو عام انسانوں تک پہنچانے کے لئے خصوصی طور سے ہندوستان کے پس منظر میں کن امور اور نشانات راہ کو پیش نظر رہنا چاہئے۔ اس کے لئے ہم نے ''قرآن ___ غیر مسلموں کے لئے'' کا عنوان تجویز کیا تھا۔ اس تعلق سے ہم نے ایک اہل علم سے رابطہ بھی کیا تھا، لیکن ان سے مضمون کا حصول ہمارے لئے ممکن نہیں ہو پایا۔

ڈاکٹر صاحب کا بڑا کارنامہ اسلامی طلبہ تنظیم کا قیام ہے۔ گو کہ ڈاکٹر صاحب کی طلبہ تحریک کے قیام کی کوشش ۱۹۶۹ء میں حلقہ طلبہ اسلامی متفقین جماعت اسلامی پٹنہ کی صورت میں بارآور ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن غیاث صاحب ڈہری آن سون ناظم علاقہ مگدھ، جماعت اسلامی بہار کی روایت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ۵۴۔۱۹۵۳ء میں ہی، پٹنہ میں اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (SIO) کے نام سے طلبہ کا ایک حلقہ قائم کیا تھا۔ ڈہری آن سون کے ہی ایک صاحب جوان دنوں پٹنہ میں شاید بسلسلہ تعلیم مقیم تھے ان کو ڈاکٹر صاحب نے ذمہ دار بنایا تھا یا وہ اس تنظیم کے سرگرم فرد تھے۔ ویسے اس زمانہ میں نوجوانوں کا جو حلقہ ڈاکٹر صاحبؒ کے اردگرد تھا، اس میں ڈاکٹر ہلال صاحب پٹنہ اور ڈاکٹر معز صاحب نوادہ کا نام اہم ہے۔ وہ صاحب غیاث صاحب کی اطلاع کے مطابق آج کل بیرون ملک مقیم ہیں۔ تقریباً اسی دور سے متصل علی گڑھ میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، راو عرفان خاں، فضل الرحمٰن فریدی صاحبان کی کوششوں سے اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن کے نام سے ہی ایک تنظیم کا قیام عمل میں آتا ہے اور ایک بہت ہی وقیع پرچہ ''اسلامک تھاٹ'' کے نام نکلنا شروع ہوتا ہے۔ اس طرح سے ہندوستان مین اسلامی طلبہ تحریک کی تاریخ چالیس سال سے زائد عمر کی ہو چکی ہے۔ اور اگر حلقہ جاتی سطح پر منظم ہوئی طلبہ تنظیم کا جائزہ لیا جائے تو بھی اس کی عمر تیس سال کے قریب ہوتی ہے۔ کل ہند سطح کی بھی تنظیم کی عمر بیس سال کی ہوتی ہے۔ یہ ایک اتنا طویل دور تو ہے ہی کہ اب اس کا جائزہ لیا جائے۔ جائزہ مقاصد اور اہداف کے اعتبار سے۔ جائزہ معنویت اور نئی معنویت کی تلاش کے اعتبار سے۔ جائزہ طلبہ تحریک کے اندر پیدا مسائل اور مباحث کے اعتبار سے۔ جائزہ تنظیمی شکل اور ہیئت کے اعتبار سے۔ جائزہ میدان کار اور پیش رفت کے اعتبار سے۔ یوں تو عمومی طلبہ تحریک بھی جائزے کے عمل سے بہت نہیں

گذری ہے لیکن اسلامی طلبہ تحریک کا ہندوستان میں جائزہ نہیں کے برابر لیا گیا ہے۔ اہل علم اور اہل نظر کو اس عنوان پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ ہمارے خاکہ میں ایک مذاکرہ تھا، جس میں طلبہ تحریک کے سابق ذمہ داروں کو اور آج کی طلبہ تحریک کی قیادت کو ایک جگہ جمع کرنا تھا اور اس عنوان پر اظہار خیال کی دعوت دینی تھی اور اس کو ترتیب دے کر اس مجلّہ میں شامل کرنا تھا۔ لیکن ہم اس میں بھی کامیاب نہیں ہو پائے۔ ہمارے خیال سے یہ ایک ایسا کام ہے جسے ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا ایک اہم میدان طالبات وخواتین کے درمیان کام ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نگاہ وقت سے بہت آگے نظر آتی ہے۔ حلقہ طالبات کا قیام آپ کی دلچسپی کا مظہر ہے۔ بہار کی جماعت اسلامی کی شوریٰ کے اجلاس میں خواتین نمائندگی میں بھی آپ کے Initiative کا بڑا دخل تھا۔ بعض خواتین وطالبات نے آپ کی خصوصی توجہ حاصل کی اس میں معینہ خاتون عرف عرشیہ، امینہ خاتون، ذاکرہ کوکب، افروز انجم، رفعت عائشہ، صہبا فاطمی، مسرت فاطمہ وغیرہ نے خواتین وطالبات کے حلقوں کے قیام میں بڑی محنت اور لگن کا ثبوت دیا۔ حلقہ طالبات حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے تحت ہی ہوا کرتا تھا، لیکن جب SIO کا قیام عمل میں آیا تو اس میں طالبات شریک نہیں ہوسکتی تھیں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب طالبات کے ایک آزادانہ حلقہ کے لئے فکرمند تھے۔ اب خیر دوبارہ بہار میں گرلس اسلامک آرگنائزیشن کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ یوں تو تحریک اسلامی نے روز اول سے خواتین کے اندر کام کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کے تمام اہم اجتماعات میں خواتین کثیر تعداد میں شریک ہوتی ہیں، لیکن آج بھی اسلام اور عورت اور خصوصی طور سے اسلامی تحریک اور عورت کا موضوع سخت اور تلخ بحث کا موضوع ہے۔ ہم نے یہ بھی طے کیا تھا کہ اس موضوع پر کوئی بات اس مجلّہ میں آ سکے جس میں خواتین کے اندر تحریک اسلامی کے کام کا جائزہ بھی ہو۔ اس وقت ایک دو باتوں کا یاد کرنا مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کا احساس تھا کہ خواتین آج کے سماج میں Deprived, oppressed and neglected ہیں، ان کو اسلام نے جو آزادی دی ہے آج انہیں وہ میسر نہیں ہے۔ کہا کرتے تھے کہ حضرت عائشہؓ موجود تھیں تو انہوں نے مردوں پر لگام لگا رکھا تھا۔ اس حدیث کا حوالہ بھی دیتے جس میں نماز کے آگے سے عورت، کوئی جانور کا نام اور کسی ایک اور چیز کے گزرنے سے نماز کے فاسد ہو جانے کا تذکرہ کسی صحابی نے کیا تو حضرت عائشہؓ نے ان سے فرمایا کہ تم نے تو ہم کو اس جانور کے مماثل کر دیا اور فرمایا کہ رسولؐ نماز پڑھتے رہتے اور میں ان کے سامنے لیٹی رہتی تھی۔ فرماتے تھے حضرت عائشہؓ کے بعد کوئی خاتون فقیہہ نہیں ہوئیں اس لئے بہت سارے معاملات میں خواتین کو Consider نہیں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب طالبات کو صرف قرآن وحدیث کا ہی درس نہیں دیتے تھے بلکہ ان کو ثقافتی پروگرام کے لئے بھی ابھارتے تھے۔ ایک وقت ململ میں اجتماع تھا اس میں طالبات کے پروگرام میں خود انہیں کے درمیان انہیں ایک ڈرامہ پیش کرنا تھا۔ واقعہ اس لئے یاد ہے کہ ڈرامہ کے لئے جو Costume طالبات نے تیار کیا تھا وہ بکس ٹرین کے سفر میں چوری ہو گیا تھا اور طالبات بہت خفا تھیں۔ اسی وقت وہ بات بھی یاد آرہی ہے جب ڈاکٹر صاحب غازی عبدالجبار کو یاد کرتے تھے اور فرماتے اصلاً غازی عبدالجبار صاحب کو ہندوستان میں ہی رہنا تھا اور وہ تحریکی Orientation کے آدمی تھے۔ ان کے کام کے خاکہ میں نکڑ ناٹک بھی تھا۔

ایک طریقہ خراج عقیدت پیش کرنے کا معروف ہے کہ جن کو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے ان کے اعزاز میں مطالعہ پیش کیا جائے۔ تحریک اسلامی کے حلقہ میں بھی مولانا مودودیؒ کے اعزاز میں خورشید احمد صاحب کا مرتب کردہ انگریزی میں وقیع مضامین کا مجموعہ Islamic Perspective عشرہ دو عشرہ قبل منظر عام پر آچکا ہے۔ وہ مجموعہ "Study in honour of Maulana Maudidi" کے نام ہے۔ یہ مطالعہ پیش کیا جانا ایک قرض ہے جسے ڈاکٹر صاحبؒ سے فیض یافتہ افراد کو ادا کرنا ہے۔

دوسرا حصہ ''حرف صوت'' ہے۔ اس میں الحمدللہ کامیابی ملی کہ ڈاکٹر صاحبؒ کی بیش تر طبع شدہ چیزیں ہم ایک جگہ پیش کر

مناسب نہیں سمجھا جاتا؛ درمرعوبیت کی نشانی محسوس ہوتا ہے۔لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کا مسلک دوسرا ہے۔ان کے اعتبار سے تمدن ارتقاء پذیر ہے اور اگر خدا کے ماننے والے قرآن کی روشنی میں تمدن کو آگے بڑھانے کا کام کریں گے تو تمدن فائدہ مند ثابت ہوگا ورنہ قرآن کی رہنمائی کے علی الرغم اور خدا پر ایمان نہیں رکھنے والے تمدن کی گاڑی کو آگے بڑھائیں گے تو اس سے سماج میں فساد برپا ہوگا۔اسی لئے تمدن کے تعلق سے ڈاکٹر صاحبؒ کا رویہ نہ تو انکار وفراریت پر مبنی ہے اور نہ ہی مرعوبیت کا شکار۔ڈاکٹر صاحب آگے کے لئے تمدنی ارتقاء کے لئے نکات بھی بتاتے ہیں، ایک بنیادی لائحہ عمل بھی تجویز کرتے ہیں اور بعض موضوعات پر غور وفکر اور تجربہ بھی کرنے کو کہتے ہیں۔ایک اصول تجویز کر کے آپ نے ایک بڑا میدان کھولا۔اس اصول کو تو تفصیل سے آپ اس مجلّہ میں ملاحضہ فرمائیں گے، جو اس مجلّہ کے مضامین ''نظام تعلیم'' اور ''آیات اللہ'' میں ہے۔اس کی صرف ایک بات کہ آدمؑ کی پیدائش اور عیسیٰؑ کی پیدائش میں فرق ہے کہ عیسیٰؑ کی پیدائش کے طریقہ کو انسان دریافت کرسکتا ہے کہ بغیر مرد اور عورت کے ملاپ کے پیدائش ہو جائے۔ Test Tube Baby، Genetic Engineering اور Clonning ڈاکٹر صاحبؒ کی نگاہ بصیرت کو خیرہ نہ کرسکتا تھا۔ڈاکٹر صاحبؒ نے قرآن میں غور وفکر کے بعد جو اصول تجویز کیا تھا اس پر ایک جاندار تبصرہ مولینا عنایت اللہ سبحانی صاحب نے کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس اصول میں سقم ہے۔یہ تبصرہ رفیق منزل کے خطوط کے کالم میں شائع ہوا تھا۔اس تبصرہ پر ڈاکٹر صاحبؒ نے بھی Respond کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی فکر اور تحریر پر زبانی تبصرے بھی ہوتے رہے ہیں۔ایک تو شدت انتہا اور غلو کا ہے ساتھ ہی ساتھ جذباتیت کا۔اس پر تبصرہ تو ان کا معتبر ہوگا جو معتدل ہوں اور لوگ بھی ان کو معتدل مانتے ہوں۔مذکورہ الفاظ کا المیہ یہ بھی ہے کہ ان کا استعمال جا و بے جا ہوتا رہتا ہے۔انگریزی میں Conviction اور Emotion میں فرق کیا جاتا ہے۔اردو میں شاید ''ایمان سے لبریز'' کہنے سے بات نہیں بنتی اور ایک دوسرا تاثر ابھرتا ہے۔یہ بہت پامال استعمال ہے۔دوسرا تبصرہ قلت مطالعہ کا ہے اور معلومات کو بہت زیادہ روایت ودرایت پر پرکھے بغیر قبول کرنے کا ہے۔اصل میں علم کے میدان میں ایک گروہ اہل مطالعہ کا ہے اور ایک دوسرا گروہ اہل فکر کا ہے۔اہل مطالعہ کبھی کبھی Victim of Book ہو جاتے ہیں اور بعض ہی کو Master of Book کا منصب مل پاتا ہے۔ایسا Francis Bacon کہتا ہے۔اقبال کے ہاں بھی ''کتاب خواں'' اور ''صاحب کتاب'' کا فرق واضح ہے۔ڈاکٹر صاحبؒ کا تعلق اہل فکر کے گروہ سے کرنا شاید مناسب ہے۔لیکن 'اہل فکر' کا وہ گروہ نہیں جہاں فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں، بلکہ قرآن کی رہنمائی میں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے جادواں پیہم رواں ان کی زندگی ہے اور دوسروں کی زندگی کی الجھی ہوئی ڈور سہولت وطمانیت کے ساتھ کھلتی چلی جاتی ہے اور زندگیوں میں انقلاب رونما ہونے لگتا ہے۔

جو حصہ ''ڈاکٹر صاحبؒ'' کے تحت ہے اس میں ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصیت، فکر اور جد وجہد پر مختلف حضرات کے مضامین ہیں۔ان مضامین کا محاکمہ پیش نہیں ہوسکا ہے۔مضمون میں جو تاثر ہے، وہ صاحب مضمون کا ہے۔اگر کوئی تاثر دوسرے مضمون سے متاثر ہوتو قاری کو اپنے فہم اور درک پر اعتماد کرنا ہوگا۔اور ڈاکٹر صاحبؒ کی کوئی ایک رخی تصویر بنانا مناسب نہیں ہوگا۔جب ہم نے اس مجلّہ کو نکالنے کا فیصلہ کیا تو ایک ردعمل یہ سامنے آیا کہ یہ تو شخصیت پرستی ہے، جو خود صحیح نہیں ہے اور ڈاکٹر صاحب بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔دراصل اس ردعمل کے پشت پر اس تعلیم کا ایک حصہ ہے جس میں اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنت رسول اللہ (میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، تم ہرگز نہیں بھٹکو گے اگر ان دو چیزوں کو پکڑے رہو گے ___ ایک کتاب اللہ اور دوسرے سنت رسول اللہ)۔حدیث کی شرح کرنے والے بتاتے ہیں کہ دونوں کو ایک ساتھ پکڑنا ہے، اگر ایک کو چھوڑ کر صرف دوسرے کو پکڑا گیا تو بھٹکنا مقدر ہے۔مثال تلاش کرتے ہوئے لکھا

سکے۔اس میں ایک حصہ اور غالب وہ ہے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ہم نے اس کے اشاعت کی تاریخ بھی ساتھ میں دی ہے کہ معلوم ہو سکے کہ وہ تحریر کس دور کی ہے۔دوسرا حصہ وہ ہے جو یا تو ٹیپ کی مدد سے یا دوران تقریر لئے گئے تحریری نوٹ کی مدد سے تیار کردہ اور کسی پرچہ میں شائع شدہ تقریر ہے۔ایک حصہ وہ بھی ہے جو مضمون کی شکل میں مختلف اوقات میں ڈاکٹر صاحبؒ نے لکھا اور پرچہ میں شائع ہوا۔

شائع شدہ مضامین میں ''نظام تعلیم'' کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ سب سے قبل پٹنہ کے انجمن اسلامیہ ہال میں لیبیا کے سفیر یوسف المغاریف کے اعزاز میں دیئے گئے عصرانہ میں ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا تھا۔ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ اس خاکہ کو حکومتی سطح نافذ کرنے کی کوئی صورت نکلنی چاہئے۔یہ مقالہ کم از کم دو دفعہ ڈاکٹر صاحبؒ کی نگرانی میں نظر ثانی کے مرحلے سے گذرا، پہلی دفعہ کی نظر ثانی کے بعد ''زندگی'' میں شائع ہوا اور دوسری دفعہ کی نظر ثانی کے بعد جو صورت ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔اس مقالہ کا انگریزی ترجمہ ہوا اور کسی حکومت کے پاس اسے دیا جائے۔اس کام کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر جاوید اختر صاحب کو یہ مقالہ حوالہ کیا تھا، لیکن شاید یہ کام نہیں ہو پایا۔قرآن کی روشنی میں تعلیم کا اتنا تفصیلی خاکہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ماہرین تعلیم کی توجہ کا مستحق ہو اور Pedagogically بھی اس کا جائزہ لیا جائے۔ڈاکٹر صاحبؒ کے نظریہ تعلیم میں ایک بات بہت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ جو تعلیم دی جاتی ہے وہ ماضی رخی ہے جب کہ تعلیم کو مستقبل رخی ہونا چاہئے اور ایسی ہی تعلیم تمدن کو آگے بڑھا سکتی ہے۔

''حرف وصوت'' میں چار چیزیں بالکل نئی اور غیر مطبوعہ ہم پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔اس میں ایک تفسیر القرآن ہے۔دراصل طالبات کے ایک گروپ کے درمیان ڈاکٹر صاحب نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا، انہیں کی کاپی کی مدد سے یہ پیش کش ہے۔دوسری چیز ''نصاب مطالعہ وتربیت'' ہے، یہ بھی کاپی سے تیار کیا گیا ہے۔دو چیزیں کیسٹ سے اتارا گیا ہے۔''ظہور دجال'' دراصل انجمن اسلامیہ ہال میں دوران رمضان دیئے گئے جمعہ کے خطبہ میں سے ایک خطبہ ہے۔ایک درس قرآن کو ڈاکٹر وقار انور صاحب نے کیسٹ کی مدد سے تیار کیا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی نوٹ ہو جانی چاہئے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے دروس قرآن اور تقاریر کے درجنوں کیسٹ ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں اور ان کیسٹوں میں تفکر وتدبر کے گہرے موتی موجود ہیں۔ایک بات کی یقین دہانی تو کرائی جا سکتی ہے کہ ان کیسٹوں میں مضمون کا تکرار نہیں ہوگا کہ یہ ڈاکٹر صاحبؒ کی خاص خصوصیت تھی کہ ہر تقریر تازہ اور ندرت فکر اور ڈوبا ہوا تدبر آپ کی گفتگو کی پہچان تھی۔کیا بہتر ہو کہ ان کیسٹوں کو ایک جگہ محفوظ کر لیا جائے اور ڈاکٹر صاحب پر ایک Compact Disc تیار ہو جائے۔یہ کام وسائل نہیں وقت کا تقاضہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی تحریروں پر سخت تبصرے بھی ہوئے ہیں۔اس میں سے بعض تبصرے تحریری بھی ہیں۔ہم چاہتے یہ تھے کہ وہ تمام تبصرے اس مجلّہ میں دے پائیں، لیکن ان کی تلاش کا حق ہم ادا نہیں کر سکے، ویسے جو تبصرے ہم تلاش کر پائے وہ شامل مجلّہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریباً شروع کے دور کی تمام کتابوں پر ''زندگی'' میں تبصرہ شائع ہوا اور مبصر بالعموم سید احمد قادریؒ جن کو تحریکی حلقے میں عروج قادری صاحب کے نام سے جانا جاتا رہا ہے، رہے ہیں۔''تجلی'' میں بھی ڈاکٹر صاحبؒ کی کتابوں پر تبصرہ مولانا عامر عثمانیؒ کرتے رہے۔''خلائی دور'' پر مولانا عامر عثمانیؒ کا تبصرہ بہت سخت تھا۔دراصل اس کتاب کا پس منظر ۱۹۶۹ء میں چاند پر اپولو۔11 کا اترنا اور پہلے انسانی قدم کے شکل میں نیل آرم آسٹرانگ کا پہنچنا ہے۔دراصل جدید علم وسائنس سے فائدہ اٹھانے کا ایک انداز یہ ہوتا ہے کہ جو بھی خبریں سائنس کے نام پر آئیں، ایک گروہ یہ کہنے لگتا ہے کہ یہ بات تو ہمارے مذہب میں پہلے سے موجود ہے۔یہ انداز

عیسائیوں نے کتاب کو چھوڑا اور عیسیٰؑ کو پکڑا، کتاب تو تحریف کا شکار اور گم ہو ہی گئی، عیسیٰؑ کی شخصیت بھی جو اللہ کے پاک نبی تھے کبھی خدا، کبھی خدا کا بیٹا اور کبھی تین میں ایک اور ایک میں تین کا شکار ہوگئی۔ جس ردعمل کا تذکرہ کیا گیا اس میں پوشیدہ انتباہ بہت اہم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انبیا، شہداء، صدیقین اور صالحین کا تذکرہ، ان سے رہنمائی اور جذبہ لینا بھی اہم ہے۔ یہ بات نقل اور عقل دونوں سے مدلل ہے۔ تو آخر راہ کیا ہو؟ شخصیت کا تذکرہ ہو اور جائزہ بھی ہو لیکن کسوٹی قرآن کی اور سنت کی کبھی اوجھل نہ ہو۔ شخصیت کا ذکر خیر ہو لیکن مقصد رہنمائی اور سبق ہو۔ کوئی ایسا ہالہ شخصیت کے گرد نہیں بنا جائے کہ شخصیت ایک بت بن جائے۔ برخلاف اس کے ایک دوسری حرکت بھی ہوتی ہے کہ اپنے ذوق اور فہم کے لحاظ سے صحیح اور سچی تصویر بنانے کے بجائے شخصیت کا کارٹون بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے شخصیت ویسی حقیقت میں ہوتی نہیں اور اصلاح طلب اصل میں ذوق اور فہم ہوتا ہے۔ ہمارے خاکہ میں ایک مضمون اس حصہ کے لئے تھا، جسے ہم نہیں دے پا رہے ہیں، عنوان ہم نے تجویز کیا تھا ''شخصیت کے مطالعہ کا طریقہ''۔

اس حصہ میں تین اور مضامین شامل کرنے کا پروگرام تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصیت پر Subaltern پیٹرن پر ایک مضمون۔ ادھر اس نوعیت کا ایک بہت اہم مطالعہ اردو میں آیا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ پر ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے ''ذکر فراہیؒ'' کے نام سے ایک ۸۴۰ صفحات کی کتاب پیش کی ہے، اس سے اس نوع کے مطالعہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مضمون کا عنوان ہم نے ''آپؒ کا دور'' تجویز کیا تھا۔ ان دونوں عنوانات پر برادرم سرور احمد نے کام شروع کیا تھا، برادر راشد نیر صاحب نے بھی اس میں معاونت کیا تھا۔ ستر۔ اسی صفحات کے نوٹ کو لیا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر کلیم عاجز، علیم الدین بلخی صاحب وغیرہ سے تو تفصیلی انٹرویو ہوا تھا۔ حضرت مولانا نظام الدین صاحب امیر شریعت، ڈاکٹر رضی احمد صاحب سے بھی ابتدائی گفتگو ہوئی تھی۔ خدا کا کرنا سرور احمد صاحب کے مکان کی منتقلی میں دونوں کاپیاں گم ہوگئیں۔ اب صرف افسوس ہے۔ ''آپؒ کے ہم عصر'' پر ہماری خواہش تھی کہ ہم عصروں کے ساتھ ہی آپؒ کے رفقاء کار کا بھی تھوڑا تذکرہ ہو۔ ناموں کی حد تک محترم نسیم احمد اور برادر احمد علی اختر صاحبان کے مضامین اس ضمن میں اہم ہیں۔ ہمارے خاکہ کا حصہ تو نہیں تھا، لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کی ظرافت سے بھی لوگ خوش وخنداں ہوتے رہے ہیں اور ایسے لطائف کی تعداد خاصی ہے۔ اس وقت دو لطیفہ سناتا ہوں۔ میری سب سے پہلی ملاقات ڈاکٹر صاحب سے انجمن اسلامیہ ہال میں ہوئی۔ اس وقت مغرب کی جانب باورچی خانہ اجتماع کے وقت بنایا جاتا تھا۔ صبح کے ناشتہ کے لئے وہیں تخت پر ڈاکٹر صاحب اور ایک دو صاحب ناشتہ کر رہے تھے، جب میں وہاں پہنچا تو ڈاکٹر صاحبؒ نے مجھے بھی ناشتہ میں شریک کیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ اسرار کے ساتھ ایک بالکل نووارد کو ناشتہ کرا رہے تھے۔ اسرار میں ایک لطیفہ بھی شامل تھا۔ کہا بادشاہ نے ایک لڑکے کو کھانے پر بلایا، لڑکا کھانے کے ساتھ ساتھ رو رہا تھا۔ بادشاہ نے رونے کی وجہ لڑکے سے دریافت کیا اور تسلی دلاسا دیا۔ لڑکے نے کہا میں کھا تو رہا ہوں لیکن اس کے باوجود بہت سارا سامان بچ جائے گا، میرے پاس لے جانے کا سامان نہیں ہے اسی لئے میں رو رہا ہوں۔ ایک دوسرا لطیفہ شبیر عالم صاحب کو بہت یاد ہے اور اکثر سناتے ہیں۔ نوادہ ضلع میں ایک گاؤں ہے 'نرہٹ' جہاں کے برادر سید محمد اقبال ہیں۔ وہاں حلقہ طلبہ اسلامی بہار کا تربیتی اجتماع ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دسترخوان پر کہا'' آپ لوگوں کو معلوم ہے اس گاؤں کا نام نرہٹ کیوں ہے؟'' لوگ جواب کے اشتیاق میں متوجہ ہوئے، جواب آیا'' دراصل یہاں کی عورتیں اپنے مردوں کی کہتی ہیں اے نر (مرد) تو ہٹ''۔ دیکھئے ثقاہت کا کوئی پیمانہ مت یہاں پر استعمال کریں۔ مولانا مودودیؒ نے باقر خان صاحب سے بھی ان کی ''باقر خوانی'' کی خیریت دریافت کی تھی۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصیت سے جو بھی ان کے قریب رہا ہے متاثر ہی ہوا ہو ایسا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اور شاید یہ فطری بھی نہیں۔ تین صاحبان سے میری واقفیت ہے جو ڈاکٹر صاحبؒ کو High Esteem میں نہیں لیتے تھے اور اس کا اظہار انہوں نے میرے سامنے

کیا۔ ہم جیسے لوگ جو ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصیت سے مسحور تھے اور جن کی شخصیت ہمارے لئے دلیل تھی ایسے لوگوں کی گفتگو بہت ٹھیس پہنچاتی تھی۔ لیکن بہر کیف ایسا تھا۔ ایک صاحب رکن جماعت تھے، ان کا تاثر تھا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کی وجہ سے جماعت کا کام بہت پیچھے چلا گیا ہے، یہ گفتگو ۸۲۔۱۹۸۰ء کی ہے، وہ انیس الدین احمد صاحبؒ کے دور امارت حلقہ سے ڈاکٹر صاحبؒ کے امارت حلقہ کا موازنہ کرتے تھے۔ ایک دوسرے صاحب جو ڈاکٹر صاحبؒ کے رفیق ۱۹۵۵ء کے دور کے تھے ان سے جب میں نے ڈاکٹر صاحبؒ پر مجلّہ نکالنے کے فیصلے کا تذکرہ کیا تو بہت تلخی کے ساتھ انہوں نے فرمایا، ڈاکٹر صاحبؒ اپنے گرد لوگوں کو جمع تو کر لیتے لیکن ان کے انفرادی معاشی مسائل کو حل کرنے کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے میرا ان سے اختلاف ہو گیا اور میں ان سے دور ہو گیا۔ حالانکہ میرا اپنا ذاتی تجربہ بالکل دوسرا ہے اور بہت سے دوسرے واقعات بھی اس تاثر کے بالکل برخلاف میرے علم میں ہے۔ دونوں تاثر پر میں کوئی محاکمہ نہیں کرنے جا رہا ہوں، صرف تصویر کا ایک اور رخ بھی پیش کرنا میرا مقصود ہے۔ اوپر کے دونوں بزرگ بھی اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ایک تیسری شخصیت جس نے حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے ناظم اعلیٰ کی ذمہ داری بھی ادا کی اور ڈاکٹر صاحبؒ حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے سرپرست تھے، ان سے میں نے اس مجلّہ کے لئے مضمون کی گذارش کی، انہوں نے فرمایا کہ "میں ڈاکٹر صاحب سے بالکل متاثر نہیں ہوا"۔ میں نے عرض کیا، اس کے باوجود اس تاثر کے ساتھ آپ مضمون لکھ دیں۔ دراصل ناظم اعلیٰ کا یہ دور سرپرست کے بعض فیصلوں سے اختلاف کا دور ہے اور اس دور میں خط و کتابت بھی ہوئی ہے۔ میرا نقطۂ نظر تھا کہ تاریخ کا یہ حصہ بھی رکارڈ ہو جائے، فائدہ مند ہی ثابت ہوگا۔ لیکن ہمارے یہ ساتھی اس کو ایک میٹھی یاد کے طور پر اپنے پاس ہی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، وہ بات ٹال گئے۔ اردو کے بڑے شاعر محترم کلیم عاجز صاحب نے ایک مسلک کا اظہار کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اسی مسلک کو نبھائیں

تیرے رعب حسن سے چپ ہیں سب
میں بھی چپ رہوں تو مزا ہے کیا

ہم نے اپنے بھر ایمانداری سے ایک ایسے شخص پر مجلّہ پیش کیا ہے جس نے کم از کم تین نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے اور اسے خیر کو پھیلانے کا ذریعہ بنائے۔

ارشد اجمل صاحب، حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے ذمہ دار اور اس کی شوریٰ کے رکن رہے۔ SIO بہار اور یو۔ پی۔ کے شوریٰ کے رکن رہے۔ معروف سماجی کارکن اور الخیر چیریٹیبل ٹرسٹ کے صدر ہیں۔ بچپن سے ہی تحریکی افراد سے تعلق رہا جو بعد میں تحریک اسلامی سے تعلق میں بدل گیا۔ ضیاء الہدیٰ سے ذاتی و تحریکی قربت رہی۔ (قیام: پٹنہ)

نذر ضیاء الھدیٰ

ڈاکٹر صاحبؒ

تقریباً ایک سو ساٹھ (۱۶۰) صفحات پر مشتمل مضامین کا یہ حصہ جنہیں ان لوگوں نے لکھا جنہوں نے ڈاکٹر صاحبؒ کو قریب سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا۔ زبان خلق سے ان کی جو تصویر بنتی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

شجرۂ نسب

سید ضیاء الہدیٰ

مرتب: ریحان غنی

سید سرفراز علی بہار شریف

زوج بی بی کبیر النساء بنت سید شاہ احمد علی دیوروی

- (۱) لیاقت حسین
- (۲) لطافت حسین
- (۳) بشارت حسین
- (۴) ہدایت حسین زوج اول عصمت النساء

لیاقت حسین

- (۱) سید علی اعظم
  زوج محمودن بنت بشارت حسین
  بن میر سرفراز علی
- (۲) سید عطا کریم
  زوج بنت ہدایت حسین
- (۳) سید شاہ نور الہدیٰ
  زوج بی بی عالیہ بنت میر وحید الدین
  روہائی (گیا)، وفات ۱۹۵۴ء
  قبرستان خانقاہ مجیبیہ،
  پھلواری شریف میں تدفین ہوئی

سید شاہ نور الہدیٰ کی اولاد

- (۱) سید شمس الہدیٰ
  (شادی نہیں کی)
  کراچی میں انتقال ہوا
- (۲) سید ضیاء الہدیٰ
  عرف سلیمان
  زوج رضیہ بنت سید شاہ علی
  اسلام پور (نالندہ)
  (لاولد)
- (۳) سید سراج الہدیٰ
  زوج بی بی عاصمہ بنت عبد العزیز
  شاہو بگہہ، گیا
  ان دنوں امریکہ میں اپنے
  بیٹوں کے ساتھ مقیم ہیں
- (۴) رشیدہ
  زوجہ سید شاہ نعمان غنی دیوروی
  بن مولانا سید شاہ
  محمد عثمان غنی دیورہ ضلع گیا
  ۱۹۸۶ء میں انتقال ہوا
  پھلواری شریف قبرستان
  خانقاہ مجیبیہ میں تدفین ہوئی

سید ضیاء الہدیٰؒ
ایک سوانحی خاکہ

اقبال احمد

۱۔نام	: ضیاء الہدیٰ (مردم شماری میں عبداللہ ضیاء الہدیٰ لکھوایا)
۲۔عرفی نام	: سلیمان (گھر کے لوگ سُلّو کہتے)
۳۔سنہ پیدائش	: ۱۳۳۵ھ مطابق 1918ء
۴۔مقام پیدائش	: محلہ مرار پور، بہار شریف
۵۔والد کا نام	: سید نورالہدیٰ ('چشمۂ حیوانات' ایک منظوم کتابچہ کے مصنف۔ خانقاہ اسکول، اسلام پور میں مدرس)
۶۔والدہ کا نام	: عالیہ خاتون
۷۔اہلیہ کا نام	: رضیہ خاتون بنت سید شاہ علی، اسلام پور، نالندہ (کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بن ماں باپ کی ایک نوزائیدہ بچی کی پرورش کی)
۸۔دادا کا نام	: لیاقت حسین (بہار شریف)
۹۔نانا کا نام	: میر وحید الدین (رُہائی، اروِل)
۱۰۔بچپن میں قیام	: والدہ کی چچازاد بہن کے مکان کشمیری کوٹھی، پٹنہ سیٹی میں
۱۱۔بچپن کے مشاغل اور شوق	: مطالعہ، کھیل اور خاص کر ڈرامہ کا شوق تھا (علی بابا چالیس چور جیسے ڈرامے کھیلا کرتے تھے)۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔
۱۲۔دینی تعلیم	: کچھ عرصہ دارالعلوم، دیوبند میں حاصل کی پھر مولانا لاڈلے قریشیؒ، پٹنہ سیٹی (ایک معروف جید عالم) سے قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کی۔
۱۳۔اسکول میں داخلہ	: محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سیٹی میں ۱۹۲۸ء میں داخل ہوئے۔
۱۴۔اسکول کی تعلیم	: ۱۹۳۷ء میں میٹرک پاس کیا (اسی سال والدہ کا انتقال ہوا)
۱۵۔ملازمت	: ۱۹۴۱ء میں ٹیلیگرافسٹ کی حیثیت سے تقرری (ملازمت سے قبل کچھ دنوں تجارت کی غرض سے مرادپور، پٹنہ میں ایک دکان کھولی)
۱۶۔تحریک اسلامی سے وابستگی	: ۱۹۴۱ء میں ملازمت کے بعد ٹریننگ کے لئے لکھنؤ گئے تو وہاں ایک تحریکی رفیق سے مولانا مودودیؒ کی کتاب پردہ پڑھنے کو ملی۔ قبل بھی مولانا کی تحریر پڑھ چکے تھے۔ اس وقت عمر ۲۲۔۲۳ سال کے قریب تھی۔ پٹنہ واپسی پر مولانا تقی الدین نعمانی مرحوم کے مکتبہ دین ودانش سے تحریکی لٹریچر خرید کر پڑھنے لگے۔
۱۷۔جماعت اسلامی کی رکنیت	: ۱۹۴۶ء میں الہ آباد کے اجتماع میں مولانا مودودیؒ نے درخواست رکنیت منظور کی۔ اس اجتماع میں پنڈال کے انچارج تھے۔

۱۸۔امیر مقامی : جماعت اسلامی ہند، پٹنہ کے امیر ۱۹۴۷ء میں بنے (۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک اور دوبارہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۲ء تک اعزازی طور پر یہ ذمہ داری ادا کی)۔

۱۹۔اعلیٰ تعلیم : ۱۹۴۸ء میں بیچلر آف ہومیو پیتھی میڈیسن کا امتحان پاس کیا۔

۲۰۔ملازمت سے سبک دوشی : ۱۵؍اپریل ۱۹۵۳ء میں جماعت اسلامی کی رکنیت کی وجہ کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد علاج و معالجہ کو بطور پیشہ اختیار کیا۔

۲۱۔قیم حلقہ مدراس و کرناٹک : ۵۳ء میں حلقہ مدراس و کرناٹک کے قیم بنے لیکن چند ہی ماہ بعد بیماری کی وجہ کر گھر واپس آ گئے۔

۲۲۔امیر حلقہ جنوبی بہار (نامزد) : ۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی ہند، حلقہ جنوبی بہار کے امیر نامزد کئے گئے لیکن معذرت کر لی اور انیس الدین احمد مرحوم کا نام پیش کیا۔

۲۳۔رکن مرکزی مجلس شوریٰ : ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی ہند کے مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بنے (۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۵ء تا مارچ ۱۹۹۱ء)

۲۴۔ رکن مجلس نمائندگان : ۱۹۵۶ء تا مارچ ۱۹۹۱ء جماعت اسلامی کی مجلس نمائندگان کے رکن رہے۔

۲۵۔امیر حلقہ، بہار : ۱۹۷۲ء میں جماعت اسلامی حلقہ بہار کے امیر مقرر ہوئے (۱۹۷۲ء سے اعزازی طور پر یہ ذمہ داری ادا کرتے رہے اور ۱۹۸۶ء میں خود ہی سبکدوشی اختیار کر لی)۔

۲۶۔اسیر زنداں : ۱۹۷۵ء میں ہندوستان میں ایمرجنسی لگی تو جماعت اسلامی پر پابندی لگ گئی اور ڈاکٹر صاحب تقریباً پونے دوسال جیل میں قید رہے۔ اہلیہ بھی تقریباً دو ماہ قید کی گئیں۔

۲۷۔رکنیت سے استعفیٰ : یکم رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ (۱۸؍مارچ ۱۹۹۱ء) کو جماعت اسلامی کی رکنیت سے اس کی پالیسیوں سے اختلاف کی بنا پر استعفیٰ دیا۔

۲۸۔تعمیر معاشرہ کی تحریک : جماعت سے استعفیٰ کے بعد عمر کے آخری دنوں تک اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے عنوان سے اپنی تحریکی کوششوں کو جاری رکھا۔ اتوار کے دن بعد نماز عصر دلال جی کی مسجد عالم گنج، پٹنہ میں اجتماع کرتے۔

۲۹۔تصنیفات : آیت اللہ، خلائی دور، انقلابی تحریک، اسلامی معاشرہ، نماز ایک معجزہ، نظام تعلیم وغیرہ

۳۰۔حج بیت اللہ : ۱۹۹۲ء میں حج کا فریضہ ادا کیا۔

۳۱۔وفات : ۱۶؍صفر ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲؍جون ۱۹۹۸ء بروز جمعہ

۳۲۔ نماز جنازہ : نماز جنازہ جناب علیم الدین بلخی (سابق پرنسپل گورنمنٹ طبیہ کالج، پٹنہ) نے ڈاکٹر صاحبؒ کے محلہ عالم گنج، پٹنہ میں قائم ایک مدرسہ، اصلاح البنات کے احاطہ میں پڑھائی۔

۳۳۔تدفین اور دعا : درہراری منتھی قبرستان، عالم گنج، پٹنہ میں عصر کے وقت تدفین ہوئی۔ تدفین کے بعد مولانا عبدالسمیع جعفری صاحب نے دعا فرمائی۔

اقبال احمد صاحب نے اس خاکہ کی ترتیب میں خصوصی تعاون کیا۔ ان کا ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ سے ہم سائیگی اور عقیدت کا رشتہ رہا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی متعدد کتابوں کا ان سے املاء کروایا۔ الحراء اسکول پٹنہ اور الیکٹرونک میڈیا سے وابستہ ہیں۔ (قیام: پٹنہ)

ڈاکٹر صاحبؒ میری نظر میں

نسیم احمد

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامان باغبان و کفِ گل فروش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ علیہ الرحمۃ نہ پی ایچ ڈی تھے نہ ایم بی بی ایس۔ ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ ہم لوگ ان کو صرف ''ڈاکٹر صاحب'' ہی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ گویا یہ ان کا نام تھا۔ متوسلین جماعت جب ''ڈاکٹر صاحب'' بولتے تو اس سے مراد سوائے ضیاء الہدیٰ صاحب کے اور کوئی نہ ہوتا۔ ہم ان کا نام لینا ایک طرح کی بے ادبی سمجھتے تھے۔

میرا ان سے باضابطہ رابطہ ۱۹۴۶ء میں ہوا جب وہ ٹیلیگراف آفس جی پی او پٹنہ میں ٹیلیگرافسٹ کی حیثیت سے ملازم تھے اور عدالت گنج کے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ ان کے والد نور الہدیٰ صاحب بھی ان ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ بہت ضعیف تھے۔ اس وقت ان کی عمر ستر پچھتر سال ہوگی جبکہ ڈاکٹر صاحب کی عمر ۳۰۔ ۳۵ ہوگی۔ نیو مارکیٹ پٹنہ جنکشن پر میری بیڈنگ کی دوکان تھی۔ اس کا نام Imperial Bedding Store تھا۔

چند ماہ پہلے میں جماعت سے متاثر بلکہ متعارف ہوا تھا۔ اس وقت میں اپنے بڑے بھائی کلیم عاجز صاحب کے ساتھ بی این کالج کے سامنے رہتا تھا۔ کرائے کا دو منزلہ مکان تھا جس میں نیچے دوکان تھی، اوپر رہائش۔ اس دوکان کا نام General Bedding Store تھا۔ بھائی صاحب ہی میرے گارجین تھے۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری عمر اس وقت پندرہ سولہ برس تھی۔

۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، میں میٹرک پاس کر کے بی این کالج میں داخلہ لے چکا تھا۔ ایک روز دوکان میں بیٹھا تھا کہ ایک مولوی صورت نوجوان کھادی کا کرتہ، کھادی کا علیگڈھ کٹ پاجامہ اور کھادی ہی کی دو پلیا ٹوپی پہنے خشخشی داڑھی، ہاتھ میں ایک کپڑے کا جھولا لئے سلام کرتے ہوئے آئے اور سیدھے بھائی صاحب کے پاس جا کر فرش پر بیٹھ گئے۔ جھولے سے چند پتلی پتلی کتابیں نکالیں اور یہ کہتے ہوئے بھائی صاحب کے سامنے پیش کر دیں کہ یہ کچھ دینی کتابیں ہیں، میں آپ کو پڑھنے کے لئے دینا چاہتا ہوں۔ آپ انہیں پڑھ لیں گے تو واپس لے جاؤں گا اور کچھ اور کتابیں دوں گا۔ یہ ''سلامتی کا راستہ'' اور ''خطبات'' کے بعض حصے تھے۔ بھائی صاحب نے ان کتابوں کو رکھ لیا اور جب وہ چلے گئے تو وہ کتابیں میری طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا دیں کہ پڑھو گے۔ یہ نوجوان اویس احمد مرحوم تھے۔ جماعت اسلامی ہند بہار کے اولین ارکان میں سے ایک۔ ٹی بی کے مرض میں گرفتار تھے۔ مگر اتنے متحرک کہ فنافی الجماعت۔ آخر ایک

سال بعد خون تھوکتے تھوکتے انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ اولین شخص تھے جن کے ذریعہ میں جماعت سے متعارف ہوا ورنہ اس سے پہلے نہ میں مولانا مودودی سے واقف تھا اور نہ جماعت سے۔ چلتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ قریب ہی باقر گنج کی گلی میں جماعت کا دفتر اور دارالمطالعہ ہے۔ دوسرے دن کتابوں کو پڑھ کر میں دوسری کتابیں لانے دفتر میں گیا۔ اس میں محترم حسنین سید صاحب اپنے دو ایک ہمدردوں کے ساتھ مقیم تھے۔ اس وقت وہ خوب صورت جوان تھے۔ سیاہ داڑھی، چھریرا بدن، شیروانی ٹوپی، پتلی موری کا پاجامہ، سراپا جامعی (جامعہ ملیہ اسلامیہ کے گریجویٹ، جماعت اسلامی کے اساسی رکن، بہار کے پہلے قیم)۔ اب روزانہ دفتر جماعت جانا، پڑھی ہوئی کتابیں واپس کر کے دوسری کتابیں لینا معمول بن گیا۔ ہفتہ وار اجتماع میں شریک ہونے لگا۔ ذاتی مطالعہ کے ساتھ ساتھ دوسروں کو لٹریچر پڑھوانے، گفتگو کرنے، رپورٹ پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد میں مستقل اپنی اسٹیشن والی دوکان میں بیٹھنے لگا۔ اس طرح ضیاء الھدیٰ صاحب سے بھی ان کے کوارٹر عدالت گنج میں ملنے، استفادہ کرنے اور دل کی پیاس بجھانے کا موقع ملنے لگا۔ عدالت گنج ہی کے ایک کوارٹر میں جنید بھائی رہتے تھے۔ یہ جماعت کے قدیم متفق ہیں۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں اور پاٹلی پترا کالونی میں رہتے ہیں۔ اللہ ان کی حیات لمبی کرے۔ اس زمانے میں پٹنہ میں کل پانچ ارکان جماعت تھے۔ ضیاء الھدیٰ صاحب، مولانا سید احمد عروج قادری صاحب، شفیق بھائی، بہاری بھائی اور اویس صاحب۔ یہ گویا پانچ سیارے تھے جماعت کے آسمان پر چمکنے والے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل ہمدردوں کا ایک کہکشاں تھا جو ڈاکٹر صاحب کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لئے رہتا تھا۔

(۱) مولانا تقی الدین نعمانی صاحب، معلم مدرسہ اسلامیہ شمس الھدیٰ پٹنہ

(۲) مولانا عبدالباری صاحب زہٹی۔ یہ زہٹ ضلع گیا (موجودہ نوادہ) کے رہنے والے تھے۔ جید عالم دین۔

(۳) شبیر احمد صاحب، ہلمل، ضلع دربھنگہ (موجودہ ضلع مدھوبنی)۔ پٹنہ کالجیٹ کے سامنے سوڈا واٹر فیکٹری کے مالک۔ بعد میں جمال پریس دہلی کے منیجر ہوئے۔

(۴) محمد اسرائیل صاحب، باقر گنج۔ میرے پڑوسی، ہم عمر، باقر گنج مسجد اور محلے میں ہم دونوں جماعت کا کام ساتھ کرتے۔

(۵) وسیم اللہ صاحب، ملازم پٹنہ سکریٹریٹ۔ شروع سے جماعت کے مکتبہ کے اعزازی انچارج۔ کبھی ایک پیسہ معاوضہ نہیں لیا۔

(۶) جنید عالم صاحب، ملازم پٹنہ ہائی کورٹ۔ مقیم پاٹلی پترا کالونی، پٹنہ۔

(۷) مشیر احمد صاحب، ہلمل، دربھنگہ۔ شبیر احمد صاحب کے چھوٹے بھائی۔

(۸) عبدالمجید صاحب، کوئری ٹولہ نمو ہیاں، پٹنہ۔ مونگیر میں رفوگری کے پیشے سے منسلک رہے۔

(۹) مولانا عبدالغنی صاحب، پسر اکبر مولانا عبدالخبیر صاحب، امیر جماعت اہل حدیث۔

(۱۰) حافظ بشیر احمد صاحب، بہترین قاری، لکھنؤ سے فارغ۔ بارو کے رہنے والے۔

(۱۱) بشیر احمد صاحب، ہلمل، دربھنگہ۔ شبیر احمد صاحب کے منجھلے بھائی۔

(۱۲) شاہ احمد امام صاحب، ملازم سکریٹریٹ، گردنی باغ، پٹنہ۔

(۱۳) شاہ اسعد صاحب، پسر اکبر شاہ احمد امام صاحب۔ اسٹوڈنٹ پٹنہ سائنس کالج۔

(۱۴) عبدالمعز منظر صاحب، طالب علم پٹنہ کالج۔ کامرس کالج کے پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

(۱۵) سید ضیاء الدین صاحب، (ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، وائس چانسلر، بہار اور مگدھ یونیورسٹی، میٹرک میں میرے کلاس فیلو تھے)۔

(۱۶) ڈاکٹر معزالدین صاحب، نرہٹی۔ اس وقت پٹنہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، نوادہ میں پریکٹس کی، حال میں انتقال ہوا۔
(۱۷) حکیم اکرام الدین صاحب، جمالی دواخانہ، سبزی باغ پٹنہ کے مالک۔
(۱۸) ڈاکٹر نورالعین صاحب، ڈنٹسٹ، پھلواری شریف۔
(۱۹) قرۃ العین صاحب ندوی، پھلواری شریف۔ نورالعین صاحب کے چھوٹے بھائی۔
(۲۰) حسین الحق صاحب، الکٹریکل انجینئر۔ (اس وقت سائنس کالج، پھر سندری انجینئرنگ کالج میں پڑھاتے تھے)
(۲۱) عبدالرب صاحب (بعد میں پاکستان منتقل ہوگئے)۔
(۲۲) ڈاکٹر ہلال احمد صاحب، اسٹوڈنٹ پٹنہ میڈیکل کالج۔ آج کل سلطان گنج میں مقیم ہیں۔

سب ایک ہی لیلےٰ کے مجنوں، ایک ہی شمع کے پروانے اور ایک ہی منزل کے مسافر تھے۔
سب کی نگاہ منزل پر مرکوز تھی اور سب کو اپنی منزل معلوم تھی۔ یعنی پورے کے پورے دین کو عملاً قائم کرنا۔ پہلے اپنے ملک میں پھر پوری دنیا میں۔ کوئی ابہام نہیں، کوئی کنفیوژن نہیں۔ کوئی نظریاتی اختلاف نہیں۔ نہ مقصد میں، نہ طریق کار میں، نہ پالیسی میں۔ یک جہتی اور فکری ہم آہنگی کے چلتے پھرتے نمونے تھے۔

یہ تو پٹنہ کے چاند اور تارے تھے۔ جب کبھی پورے بہار کا اجتماع ہوتا تو جو نمایاں شخصیتیں ابھر کر سامنے آتیں ان میں سے کچھ یہ تھیں:۔

(۱) مولانا شفیع داؤدی، خلافت اور کانگریس کے بزرگ رہنما، جو بعد میں جماعت میں شامل ہوگئے۔
(۲) مولانا محمد حبیب اللہ صاحب نظام پوری ثم چترپوری، قدآور عالم دین اور زبردست خطیب، جمیعۃ العلماء سے نکل کر جماعت میں آئے تھے۔
(۳) جناب انیس الدین احمد، انسپکٹر آف اکسائز کے عہدے سے استعفےٰ دے کر جماعت میں آئے، بعد میں امیر حلقہ بہار ہوئے۔
(۴) جناب محمد مطیع الرحمٰن احقرؔ، Grow More Food Officer، استعفیٰ دے کر جماعت کے رکن ہوگئے، بعد میں مرکزی مکتبہ دہلی کے منیجر ہوئے۔
(۵) مولانا عبدالرحمٰن کامی صاحب، کامتا، چھوٹا ناگ پور کے رہنے والے جید عالم دین۔
(۶) مولانا حکیم تصدق حسین صاحب، موضع برنانواں ضلع نالندہ کے رہنے والے بہترین قاری اور مفسر۔
(۷) مولانا شہباز ہندی اصلاحی صاحب بھاگل پوری، جید عالم دین، اعلیٰ درجہ کے مقرر۔
(۸) مولانا سراج الحق صاحب شمسی، خاص گنج، بہار شریف۔
(۹) عبدالفتاح صاحب، ٹیچر ہائی اسکول سے استعفےٰ دے کر جماعت کے رکن بنے، بعد میں بنگال کے امیر حلقہ ہوئے۔
(۱۰) شمیم احمد صاحب، ہزار یباغ۔ ہائی اسکول سے استعفےٰ دے کر جماعت کے رکن بنے۔
(۱۱) حاجی محمد عمر صاحب، دھنباد۔ تبلیغی جماعت سے نکل کر جماعت کے رکن ہوئے، چمڑے کے بڑے تاجر۔ جان ومال سے جماعت پر فدا تھے۔
(۱۲) اصغر مجیبی صاحب، بہار شریف۔ تن من دھن سے جماعت پر فدا۔
(۱۳) مولوی ابوالحسن صاحب، کاکو بی بی پور ضلع جہان آباد۔ اردو ٹیچر پرائمری اسکول۔ سراپا انکسار ومعصومیت۔

(۱۴) اظہار کریم صاحب، بھاگل پور۔ گریجویٹ۔ فنافی الجماعت۔

(۱۵) عبدالقدوس صاحب، بھاگل پور، تاجر۔ اخلاص کے پتلے۔

(۱۶) محمد اشفاق صاحب، بھاگلپور۔

(۱۷) رحمت اللہ صاحب، انکی، رانچی۔ ناگپوری زبان کے قادر الکلام اسلام پسند شاعر۔

(۱۸) شہود الحق صاحب روشن، چتر پور، ہزاری باغ۔

(۱۹) علی احمد صاحب، چترپور، ہزاری باغ۔ خوشحال آدمی مگر خوشحالی جماعت کے لئے وقف۔

(۲۰) مولانا عبدالغنی صاحب، رانچی۔ مجلسی گفتگو میں دل موہ لینے والے۔ بڑے بڑے دانشوروں کو گفتگو میں چت کر دینے والے۔

(۲۱) دوست محمد خان صاحب، دھنباد۔ جوتے کے تاجر۔ بعد میں دھنباد سے رام گڑھ آ کر جوتے کی دوکان کی۔ بڑے اجتماعات میں نماز کی اذان پکارنے کی ذمہ داری ان کو دی جاتی۔ اللہ نے ایک خاص دل ہلا دینے والی بلالی آواز عطا کی تھی۔

یہ سب چند نمایاں شخصیتیں تھیں۔ تمام ارکان و ہمدردان کی فہرست پیش کرنا مقصود نہیں۔ یہ سب کے سب اخلاص کے مجسمے تھے۔ ایثار و قربانی ان کا مشترک وصف تھا۔ کوئی مدرسہ چھوڑ کر آیا تھا، کوئی سرکاری نوکری چھوڑ کر، کوئی تعلیم چھوڑ کر، کوئی کاروبار اٹھا کر۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو قربانی کا دریا پار کئے بغیر ادھر آیا ہو۔ ہر شخص اپنی پچھلی دنیا کو خیر باد کہہ کر ادھر آیا تھا۔ آرام و آسائش کو، روشن مستقبل کو قربان کر کے آیا تھا۔ پرانے رشتوں کو کاٹ کر نئے رشتے میں بندھا تھا۔ پچھلے مقاصد زندگی کو تج کر ایک نیا مقصد، اعلیٰ مقصد اپنا چکا تھا۔ اس مقصد نے اس کے تمام پچھلے مقاصد کو جو کبھی اسے بے حد عزیز تھے بھلا دیا تھا۔

مقصدے مثل سحر تابندۂ ماسوا را آتش سوزندۂ

مقصدے از آسماں بالا ترے دلربائے دل ستانے دلبرے

یہ مقصد حکومت الٰہیہ کا مقصد تھا۔ ہم لوگوں نے جس ''دستور جماعت اسلامی'' کو پڑھ کر جماعت کو سمجھا تھا، وہ پرانا دستور تھا۔ اس میں نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام لکھا ہوا تھا۔ پہلے اپنے ملک میں پھر ساری دنیا میں۔ یہی دستور پڑھ کر ڈاکٹر صاحب جماعت میں آئے تھے۔ یہی دستور پڑھ کر میں جماعت میں آیا تھا۔ یہی دستور پڑھ کر وہ سارے لوگ آئے تھے جن کے نام گنائے گئے۔ اس لئے مقصد اور نصب العین کے بارے میں ان سب لوگوں کے درمیان کامل ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ایک آگ تھی جو سب کے سینے میں لگی ہوئی تھی۔ اس مقصد نے سب کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ سب کو ایک فوج کی شکل دے دی تھی۔ ایک کمپنی ایک بٹالین کی شکل دے دی تھی۔ جب کوئی بڑا اجتماع ہوتا تو معلوم ہوتا ایک فوجی کیمپ ہے۔ فوجی ڈسپلن میں سب کسے ہوئے ہیں۔ گھڑی دیکھ کر وقت پر جمع ہونا، وقت پر اٹھنا، وقت پر بیٹھنا، وقت پر اجتماع شروع ہونا، وقت پر ڈسپلن کے ساتھ منتشر ہو جانا۔ ہر طرف سے سلام سلام کی آواز۔ ہر شخص خود تکلیف اٹھا کر دوسرے کو آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسرے کے بستر کو اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ہے۔ دستر خوان پر اپنے پلیٹ میں کھانا لینے سے پہلے دوسرے کو لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم کھاتے تھے تو ڈاکٹر صاحب ٹہل ٹہل کر جائزہ لیتے تھے کہ سب کھا رہے ہیں یا نہیں۔ ہم اجتماع گاہ میں سوتے تھے، ڈاکٹر صاحب دیر رات تک گشت لگا کر دیکھتے تھے کہ سب سو رہے ہیں یا نہیں۔ سب کے پاس بستر ہے یا نہیں۔ چادر ہے یا نہیں۔ کسی کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ جب سب کو دیکھ کر اطمینان کر لیتے تو خود جا کر سوتے۔ جاتے کہاں وہیں سوتے جہاں ہم لوگ سوتے۔ اب تو اجتماع کا سماں جشن کا سماں ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ دست خود دہان خود کی کیفیت ہے۔ ''کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا'' والا منظر دنیا ہی میں نظر آ جاتا ہے۔ کوئی بوڑھا ہے تو ہوا

کرے، ضعیف ہے تو رہا کرے۔ اعلیٰ وادنیٰ کا فرق ہے۔ ہم چنیں من دیگرے نیست۔ میں امیر ہوں۔ میں ''ذمہ دار'' ہوں۔ لہذا لوگوں کو میری خدمت کرنی چاہیئے۔ میرا بستر اٹھانا چاہیئے۔ میرے لئے کھانا لانا چاہیئے۔ مجھے پانی پلانا چاہیئے۔ میرا کام بس جزاک اللہ کہہ دینا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس مزاج سے ناآشنا تھے۔ ایک مرتبہ ایک اجتماع میں فجر کے وقت مجھے اٹھنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ بھائی شبیر صاحب ململ میرا پیر دبانے لگے۔ بڑا آرام ملا مگر نیند ٹوٹ گئی۔ حالانکہ وہ سن میں مجھ سے بڑے تھے۔ جیسا امیر ویسے مامور۔ جیسا درخت ویسا پھل۔ انگریزی ادب کی ایک کتاب میں پڑھا تھا As the leader is so will his followers be: ڈاکٹر صاحب اوران کے ساتھی اس قول کے مجسم نمونہ تھے۔

جب میں نے ہفتہ وار اجتماع میں شریک ہونا شروع کیا تھا اس وقت کے اجتماع اور آج کے اجتماع میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ اس وقت کے ہفتہ وار اجتماع کا آج کے ہفتہ وار اجتماع سے کوئی موازنہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا جائے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ موازنہ کے لئے الفاظ نہیں ملیں گے۔ وہ اجتماعات زندہ، متحرک، تپتے ہوئے، دہکتے ہوئے، دھڑکتے ہوئے، خوشبو پھیلانے والے، جام بکف، نغمہ بلب، دامان باغبان وکف گل فروش ہوتے تھے۔ ان میں سوز ہوتا تھا، سرور ہوتا تھا، نشہ ہوتا تھا، دیوانگی ہوتی تھی۔ ایک طرف تخریب تو دوسری طرف تعمیر ہوتی تھی۔ شکست وریخت بھی ہوتی تھی۔ نقاشی وگلکاری بھی ہوتی تھی۔ دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز ہوتی تھی، سمجھانے اور بیان کرنے کی نہیں۔ سب کچھ ہونے کے باوجود تشنگی باقی رہ جاتی تھی۔ ایک اجتماع کے بعد دوسرے اجتماع کا ہفتہ بھر انتظار رہتا تھا۔ ہر شخص وقت سے پہلے اجتماع میں پہنچنے کی کوشش کرتا کہ کہیں کسی لطف سے محروم نہ رہ جاؤں۔ اب وہ سوز وسرور کہاں، وہ نغمہ کہاں، وہ ساز کہاں، وہ دل آویزی کہاں، وہ نشہ کہاں، وہ ساقی کہاں، وہ لیلیٰ کہاں، وہ مجنوں کہاں، وہ رقص بسمل کہاں۔ نہ وہ آتش نمرود نہ وہ عشق خلیل۔ نہ وہ نمازوں میں تاثر نہ وہ دعاؤں میں رقت

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

موجودہ دفتر جہاں ہے اس سے پہلے دفتر کئی جگہ منتقل ہوتا رہا تھا۔ سب سے پہلے باقر گنج کی گلی میں ایک کرائے کے مکان میں تھا۔ صرف ایک کمرہ۔ اسی میں دفتر، اسی میں دارالمطالعہ، اسی میں حسنین سید صاحب کا ڈیرہ، اسی میں مہمان خانہ۔ باہر ورنڈے میں ایک لمبا سا ٹیبل۔ اس کے چاروں طرف چار پانچ لکڑی کی کرسیاں۔ آنے جانے والے اسی کرسی پر بیٹھتے۔ ایک طرف حسنین صاحب بیٹھتے۔ جماعت کا تعارف کرایا جاتا۔ دعوت پیش کی جاتی۔ قرآن وحدیث سے دلائل دیئے جاتے۔ لٹریچر پیش کیا جاتا۔ کتاب لی جاتی، کتاب دی جاتی، نہ چاہئے نہ وائے مگر آنے والا اسیر ہوکر جاتا، مالا مال ہوکر جاتا، اسے لگتا کہ دنیا میں آنے اور رہنے کا مقصد معلوم ہو گیا۔ اب تک بے کیف زندگی بسر ہورہی تھی۔ اب زندگی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ جان جان آفریں کی امانت بن گئی۔ اب زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی معلوم ہونے لگا۔ ایمان کے معنی سمجھ میں آ گیا۔ ایمان کی حلاوت مل گئی۔ نماز میں مزہ آنے لگا۔ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کا لطف ملنے لگا۔ نمازوں میں پہلے سے زیادہ وقت لگنے لگا۔ غرض دفتر میں آنے والا جب آتا تو کسی اور کیفیت میں آتا، جب جانے لگتا تو کسی اور کیفیت کے ساتھ جاتا۔ دل کی دنیا میں ایک ہلچل ہوتی، دل کی دنیا بدل گئی ہوتی۔ دماغ میں توڑ پھوڑ ہوتی۔ دوبارہ آنے، بار بار آنے کا ارادہ کرکے جاتا۔ بغل ہی میں گاندھی میدان تھا، اس کا نام اس وقت تک لان کا میدان تھا۔ جہاں وہ روزانہ شام کو ہوا خوری کے لئے آتا تھا، بغل ہی میں دو دو مشہور سنیما ہال الفنسٹن اور ریجنٹ تھے جہاں وہ سنیما دیکھنے کے لئے جاتا تھا مگر اب نہ وہ لان کے میدان کی طرف جاتا نہ الفنسٹن اور ریجنٹ کی طرف قدم بڑھاتا بلکہ باقر گنج گلی میں مڑ کر سیدھا جماعت اسلامی کے چھوٹے سے دفتر چلا جاتا۔ اس کے دل میں حسنین سید صاحب سے ملنے، باتیں کرنے اور مولانا مودودی کی کتابیں لینے کا شوق

موجزن ہوتا۔ کم از کم میرے دل کی تو یہی کیفیت تھی۔

باقر گنج کے بعد دفتر انجمن اسلامیہ ہال کے اتر پورب والے کمرے میں منتقل ہوا۔ وہاں بھی ایک ہی چھوٹا سا کمرہ تھا، مگر جماعت کا کام مسلسل بڑھ رہا تھا۔ متاثرین کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ رفتار تیز نہیں تھی مگر جو آ رہا تھا قربانی دے رہا تھا، وقت کی قربانی، پیسے کی قربانی، عادتوں خصلتوں کی قربانی، ادنیٰ مقاصد زندگی کی قربانی۔ کچھ دن یہاں رہنے کے بعد پچھّم دروازہ پٹنہ سیٹی دفتر منتقل ہو گیا۔ اس علاقے کے لوگ کافی تعداد میں متاثر ہوئے۔ مرد بھی خواتین بھی۔ خاص متاثرین میں عبدالمنان صاحب، امین احمد صاحب، علاء الدین صاحب، یحیٰ صاحب، سلیم صاحب عطر والے، ولی محمد صاحب، جسیم صاحب وغیرہ تھے۔ یہ لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر سراپا خلوص۔ مرد بھی عورتیں بھی۔ یہاں مرد کے علاوہ عورتوں کا بھی اجتماع ہونے لگا۔ کثیر تعداد میں عورتیں شریک ہونے لگیں۔ ایک درسگاہ بھی قائم ہوگئی جہاں مشنری اسپرٹ کے ساتھ بچوں بچیوں کی تعلیم و تربیت ہونے لگی۔ رمضان میں تقریباً ہر ہفتہ اجتماعی افطار کا پروگرام ہوتا۔ محلّہ امنڈ پڑتا۔ یہ افطار محض برائے ثواب نہیں تھا بلکہ دعوت و تحریک کا ایک اہم پروگرام تھا۔ تقریباً ہر ہفتہ ڈاکٹر صاحب افطار کے بعد حاضرین کو خطاب کرتے۔ افطار میں شامل ہونے والے سارے لوگ پوری توجہ سے تقریر سنتے۔ ایک آدمی بھی تقریر سنے بغیر نہیں جاتا۔ ہم لوگ باقر گنج سے افطار اور خطاب میں شرکت کے لئے پچھّم دروازہ جاتے۔ عشاء سے پہلے واپس آتے۔

پچھّم دروازہ کے بعد دفتر بیچ شہر یعنی رمنہ روڈ میں منتقل ہوا۔ یہاں محبوب بھائی، اقبال بک ڈپو کے مالک نے اپنا مکان قلیل کرائے پر پیش کیا۔ وہ خود جماعت سے متاثر ہو گئے اور ہر قسم کا تعاون کرنے لگے۔ جس زمانے میں دفتر رمنہ روڈ میں تھا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ہفتہ وار اجتماع میں ڈاکٹر صاحب ہی درس قرآن دیتے تھے اور کبھی کبھی خطاب بھی کرتے۔ یہ خطاب تربیتی نوعیت کا ہوتا۔ ایک روز اجتماع کے بعد یا اجتماع سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے اسی نوعیت کا خطاب فرمایا۔ یہ یاد نہیں کہ خطاب کا موضوع کیا تھا۔ بہر حال مجھ پر اس خطاب کا ایک خاص اثر ہوا۔ دوسرے ہفتے میں شریک اجتماع نہیں ہوا اور ایک پرزہ کسی ساتھی کو ڈاکٹر صاحب کو دینے کے لئے دے دیا۔ میں اس وقت رکن نہیں ہوا تھا، مگر ہمدرد کی حیثیت سے کافی پرانا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب خاص شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ پرزہ کا مضمون یہ تھا کہ میں جماعت کا اپنے کو اہل نہیں سمجھتا اس لئے میں اجتماع میں شرکت سے قاصر ہوں۔ ان دنوں میں اپنی اسٹیشن والی دوکان میں بیٹھا کرتا تھا۔ اجتماع مغرب بعد ہوا کرتا تھا۔ میں اس دن مغرب میں رمنہ نہیں گیا۔ اسٹیشن والی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی اور دوکان میں آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی سائیکل پر پہنچے۔ سائیکل دوکان پر لگائی اور مجھ سے کہا، ذرا مسجد تک آ یئے۔ میں ان کے ساتھ کشاں کشاں چلا گیا۔ جیسے ہی مسجد کے صحن میں قدم رکھا ہے ڈاکٹر صاحب لپٹ گئے اور بچوں کی طرح بھکار مار مار کر رونے لگے۔ میں بھی رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب دونوں کچھ نارمل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے رقت آمیز آواز میں کہا، ''نسیم صاحب! آپ بھی ہم کو چھوڑ دیجئے گا تو پھر کون میرا ساتھ دے گا''۔ میرے منہ سے نکلا ''نہیں ہم آپ کو نہیں چھوڑیں گے''۔ اس سوال جواب کے بعد ایسا لگا کہ ڈاکٹر صاحب کے دل پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا جو ہٹ گیا اور میں نے بھی اپنے دل کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ اس کے بعد حسب معمول اجتماع میں جانے آنے لگا۔ بعد میں اجتماع کے حاضرین سے معلوم ہوا کہ اس روز جیسے ہی اجتماع کی کارروائی درس قرآن سے شروع کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے قرآن سامنے رکھا میرے ساتھی نے میرا پرزہ ڈاکٹر صاحب کو بڑھا دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پرزہ پڑھا، قرآن بند کیا اور حاضرین سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ آپ لوگ اسی طرح بیٹھے رہیے، میں آتا ہوں۔ اپنی سائیکل اٹھائی اور روانہ ہو گئے۔ سیدھے میری دوکان نیو مارکیٹ پہونچے تھے۔ آہ اب یہ ادا کہاں دیکھنے کو ملے گی۔ اب تو معاملہ یوں ہے کہ ے

اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا کچھ وہ کھنچے کھنچے رہے کچھ ہم کھنچے کھنچے

ڈاکٹر صاحب کی سائیکل ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔ سائیکل کے بغیر ان کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ اب بھی جب میں ان کے بارے میں لکھ رہا ہوں وہ مع سائیکل کے میرے تصور میں موجود ہیں۔ دونوں ہاتھ سائیکل کے ہینڈل پر ہے، دونوں پیر میں کلپ لگا ہوا ہے، مسکراتے ہوئے السلام علیکم کہتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ عالم گنج میں جہاں وہ ایک کھپڑہ پوش مکان میں رہتے تھے، پچھم دروازہ باغ تک اور پورب پٹنہ سیٹی تک جہاں کہیں بھی وہ جاتے، چاہے کسی اجتماع میں، کسی سے ملاقات کے لئے، کسی کی عیادت کے لئے، کسی کی تعزیت کے لئے، کسی نکاح میں، کسی سیرت کے جلسے میں اپنی سائیکل ہی سے جاتے۔ ان کو سائیکل سے پیار تھا۔ نہ وہ سائیکل کو چھوڑتے تھے نہ سائیکل ان کو چھوڑتی تھی۔ شہر میں رکشہ یا بس سے کہیں جاتے آتے ان کو نہیں دیکھا۔ چوڑی مہری کا پاجامہ پہنتے تھے، اس لئے جب بھی سائیکل پر سوار ہوتے پاجامے کی مہری لپیٹ کر کلپ لگا لیتے تاکہ پاجامہ پھنسنے نہیں۔ اس ہیئت میں بڑے سے بڑے مجمعے، اونچی سے اونچی محفل میں بلا تکلف مسکراتے ہوئے السلام علیکم کہتے ہوئے چلے جاتے، لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے اور تپاک سے استقبال کرتے، وہ سب سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر جا بیٹھتے۔

ڈاکٹر صاحب مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے مگر مجتہدانہ شان رکھتے تھے۔ لکیر کی فقیری نہیں کرتے تھے۔ کبھی بریلویت سے قریب نظر آتے، کبھی دیوبندیت سے، کبھی اہل حدیث سے۔ مصافحہ ایک ہاتھ سے کرتے دونوں ہاتھ سے نہیں، جو اہل حدیث حضرات کا طریقہ ہے۔ عید کے موقع پر عام طور پر مصافحہ کرتے۔ مگر کبھی کبھی معانقہ بھی۔ میں بچپن سے ابھی تک عید ملنے کے موقع پر معانقہ کرنے کا عادی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب یہ جانتے تھے اس لئے جب میں عید ملنے کے لئے جاتا یا اجتماعی ملاقات ہوتی تو اور رفقاء سے تو مصافحہ کرتے مگر مجھ سے از راہ شفقت معانقہ کرتے اور کہتے آیئے آپ تو معانقہ کرتے ہیں، کہتے ہوئے گرمجوشی سے گلے ملتے۔ بارہا ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ لمبے سفر میں ہمیشہ جمع بین الصلوتین کرتے یعنی ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازیں ملا کر پڑھتے۔ ہم بھی ان کی اتباع میں ایسا ہی کرتے، حالانکہ احناف کے نزدیک ایسا کرنا صرف حج کے موقع پر عرفات اور مزدلفہ میں جائز ہے عام سفروں میں نہیں۔ عصر کی نماز ایک مثل پر پڑھنا اولیٰ سمجھتے۔ حالانکہ احناف کے نزدیک عصر کا وقت دو مثل پر شروع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو تین چیزوں سے الرجی تھی۔ ایلو پیتھک دوا، چائے اور بارات کے کھانے سے۔ تینوں معاملے میں متشدد تھے۔ چائے تو کبھی پیتے ہی نہیں۔ اس لئے ان کے جاننے والے چائے کی جگہ پر ایک کپ دودھ پیش کر دیتے تھے۔ بارات کے کھانے کو تو حرام ہی سمجھتے تھے۔ ایلو پیتھک دوا کبھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ آخر عمر میں جب بہت کمزور ہو گئے تھے، احباب کے بڑے اصرار پر ایلو پیتھک دوا لینے پر رضامند ہوئے۔

میں جماعت سے منسلک ہونے کے بعد بھی بہت دنوں تک داڑھی نہیں رکھتا تھا۔ ''ہمدرد'' تھا رکن نہیں ہوا تھا۔ ماہانہ اجتماع میں، جو گشتی ہوا کرتا تھا، میرے ذمے کھڑے ہو کر تفہیم سے ایک رکوع مع ترجمہ تفسیر پڑھنے کا پروگرام رہتا تھا۔ ایک مرتبہ پٹنہ کی جماعت کا ماہانہ اجتماع بہار شریف میں ہوا۔ اس زمانہ میں بہار شریف میں جماعت قائم نہیں ہوئی تھی۔ میرا بہار شریف سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے اس سے پہلے بہار شریف دیکھا بھی نہیں تھا۔ یا تو تلہاڑا میں رہا یا پھر ۱۹۴۲ء سے پٹنہ میں۔ بہار شریف سے میرا تعلق شادی کے ذریعہ ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ ۱۹۶۷ء سے مکان بنا کر رہنے لگا۔ اجتماع مدرسہ اسلامیہ میں ہوا تھا۔ جماعت کا قیام ایک شب اسی مدرسہ میں رہا تھا۔ حسب معمول یہاں بھی میں نے تفہیم پڑھی۔ جب یہاں سے جماعت پٹنہ واپس گئی اور ایک روز میں یونہی ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا تو مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''بہار شریف میں اجتماع کے بعد ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا کہ جن صاحب نے تفسیر

پڑھی وہ کون ہیں۔ میں نے آپ کا نام بتایا تو انہوں نے کہا کہ ان کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی'' ۔ یہ کہہ کہ خاموش ہو گئے اور مسکراتے رہے۔اسی وقت میں نے داڑھی رکھنے کا فیصلہ کرلیا جو بحمد اللہ آج تک قائم ہے۔ یہ ان کی حکمت تربیت کا ایک نمونہ ہے۔

جب ہفتہ وار اجتماع میں پابندی سے حاضری ہونے لگی تو ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے چند نوجوانوں کو منتخب کر کے فرمایا کہ آپ لوگ آئندہ سے خطبات کا ایک مضمون پڑھ کر آئیں اور یہاں اپنی زبان میں پیش کریں۔ میں فطرتاً خاموش اور کم سخن واقع ہوا ہوں۔ دو ہفتہ تقریر کرنے کے بعد میں ڈاکٹر صاحب سے ان کے گھر پر ملا اور کہا کہ مجھ سے تقریر نہ ہوگی۔ مجھے مستثنیٰ کر دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔''آدمی کو خود اپنی صلاحیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ میرا حکم ہے آپ کئے جایئے''۔ پھر میں نے کبھی انکار کی جرأت نہیں کی۔

ماہانہ اجتماع میں خطاب ہمیشہ ڈاکٹر صاحب خود کیا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ماہانہ اجتماع میں جس میں شرکاء کی تعداد سینکڑوں ہو جاتی تھی، کبھی کبھی خواتین بھی شریک ہوا کرتی تھیں، خاص کر عالم گنج اور پچھم دروازہ میں، ڈاکٹر صاحب نے خطاب عام کے لئے مجھے کھڑا کرنا شروع کیا۔ اس وقت تک میں رکن ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میری دستگیری کے لئے موجود رہتے۔ جب میں گھنٹہ پون گھنٹہ بول کر بیٹھ جاتا تب اٹھتے اور پندرہ منٹ خطاب کرتے۔ خطاب کا آغاز اکثر اس جملے سے ہوتا'' جیسا کہ ابھی میرے دوست نسیم صاحب نے فرمایا''۔

غالباً ۱۹۵۰ء میں میں نے ڈاکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل میں رکنیت کا فارم بھرا۔ درخواست رکنیت کو آگے بڑھانے میں ڈاکٹر صاحب کا اپنا معیار تھا جس کو خود ان کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ میری درخواست پانچ برس تک ان کی فائل میں پڑی رہی۔ میں ادھر سے بے پرواہ اپنے کام میں لگا رہا۔

درخواست کے متعلق نہ میں نے کبھی جاننے کی کوشش کی نہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی کچھ بتایا۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں اچانک مجھے بتایا گیا کہ میری درخواست منظور ہو گئی۔ اس سے چند ماہ پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ میری درخواست شادی کے انتظار میں رکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال اور تجربہ تھا کہ شادی کے بعد اکثر نوجوانوں کے خیالات میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ شادی کا دھکا اگر کسی نے برداشت کرلیا گویا وہ ایک بڑی آزمائش سے صحیح سلامت گذر گیا اور اب اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو یوں تو ہومیوپیتھی سے بھی دلچسپی تھی، علم نباتات سے بھی، حدیث اور تصوف سے بھی مگر اصلاً ان کا سبجکٹ قرآن تھا۔ وہ قرآن کے آدمی تھے۔ قرآن میں غرق رہتے تھے۔ قرآن کے سمندر میں غوطہ لگاتے رہتے تھے۔ اور ایک سے ایک نادر موتی اس سمندر سے برآمد کرتے رہتے تھے۔ وہ شاہ ولی اللّٰہی اسکول سے بھی متاثر تھے، مولانا حمید الدین فراہی کے نظم قرآن سے بھی اور مولانا مودودیؒ کی وسیع النظری سے بھی۔ مگر ان سب منزلوں کے اوپر انہوں نے اپنی بالائی منزل خود تعمیر کی تھی جس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں تھا۔ یہ منزل ان کی ذاتی تجربہ گاہ تھی جس میں وہ تنہا بیٹھ کر تجربات کرتے رہتے تھے اور جب اس بالائی منزل سے نیچے اترتے تو عوام کو اپنے تجربات سے آگاہ کرتے۔ میں نے سب سے زیادہ جس استاد سے استفادہ کیا وہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب ہی تھے۔ میں نے سترہ سال ان سے قرآن سیکھا۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، آمین۔ تفسیر قرآن میں وہ ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ اللہ نے ان کے لئے قرآن کے اسرار کھول دئے تھے۔ ان کی تحریر، تقریر اور گفتگو تینوں قرآنی دلائل سے مزین ہوتی تھی۔ تقریر اور گفتگو میں حسب موقع طنز و مزاح کی گلکاری ہوتی جس سے کلام کی شگفتگی میں اضافہ ہو جاتا۔ تقریر چونکہ قرآن و حدیث کے دلائل سے مدلل ہوتی اس لئے عقل سلیم ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو کچھ وہ کہتے تھے ان کا کردار اس پر گواہ ہوتا تھا۔ ان کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ جو کچھ بولتے شرح صدر کے ساتھ اور دل کی گہرائی سے بولتے۔ بےلوث اور بے

خوف وخطر بولتے ۔ ان کی تقریر مسلکی اور جماعتی ہر قسم کی عصبیت سے پاک ہوتی اس لئے ہر مسلک اور ہر جماعت کے لوگ ان سے متاثر ہوتے ۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے جلسوں میں جس میں ہر مسلک و مکتب کے لوگ شامل ہوتے کسی کو بھی ان کی تقریر میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی ۔ حتیٰ کہ جماعت کے مقصد وطریق کار سے اختلاف رکھنے والے لوگ بھی ان کو اپنا ہمدرد، غم گسار اور اپنا امام تصور کرتے ۔ انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں جہاں، وہ رمضان المبارک میں جمعہ کی نماز پڑھایا کرتے تھے، ان کا خطبہ سننے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے پٹنہ سیٹی سے لے کر دانا پور تک کے ہر مسلک و جماعت کے لوگ آتے تھے ۔ انجمن کا ہال اور باہر کا میدان نمازیوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ۔ ان کا خطبہ خاصا طویل ہوتا تھا مگر کوئی بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ۔

جس جماعت کو پروان چڑھانے میں ڈاکٹر صاحب نے چالیس سال تک اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، جس کی خاطر انہوں نے سنٹرل گورنمنٹ کی ملازمت سے بلا تامل استعفیٰ دے دیا کیوں کہ ان کو حکومت کی طرف سے نوکری یا جماعت میں سے ایک کو منتخب کرنے کا حکم ملا تھا، روشن مستقبل قربان کر دیا، خوش حالی پر خستہ حالی کو بہ رضا و رغبت ترجیح دی اور ان سب کے صلے میں کبھی جماعت سے ایک پیسہ معاوضہ یا کفاف کی شکل میں قبول کرنا گوارہ نہ کیا حالانکہ ان سے کافی اصرار کیا گیا تھا ۔ جس کے امیر مقامی کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے امیر حلقہ، رکن مجلس نمائندگان، رکن مرکزی مجلس شوریٰ کے منصب تک پہونچے جس کے بعد ان کے لئے صرف کل ہند امیر جماعت ہی کا منصب باقی رہ گیا تھا ۔ چالیس سال کے بعد یکا یک اس کی بنیادی رکنیت تک سے استعفیٰ دے دیا ۔ اس واقعے کو اگر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا ۔ ڈاکٹر صاحب کی سوانح حیات مرتب کرنے والے فرد، افراد یا ادارے کا یہ فرض ہوگا کہ اس اہم ترین واقعے کے اسباب ومحرکات کی تحقیق کرے اور ان سے عقیدت رکھنے والوں کو بتائے کہ ایسا کیوں کر ہوا ۔ اس سلسلے میں محض قیاس آرائی، پردہ پوشی یا لیپا پوتی سے کام نہیں چل سکتا، بلکہ اس سوال کا شافی جواب ملنا چاہئے ادھورا نہیں ۔

جو لوگ ڈاکٹر صاحب کی تحریکی زندگی میں قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے ہیں وہ تو اس حقیقت سے واقف ہی ہیں کہ ''دین عملاً'' قائم ہو جائے یہ آرزو ان کی سب سے قیمتی متاع حیات تھی ۔ وہ اس آرزو پر دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دینے کا عزم وحوصلہ رکھتے تھے مگر اس آرزو کو کسی بڑی سے بڑی اور محبوب سے محبوب چیز پر بھی قربان کرنے کے لئے تیار نہ تھے حتیٰ کہ جماعت پر بھی نہیں ۔ جماعت ان کے لئے منزل مقصود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ اور سواری تھی ۔ سواری اگر منزل کی طرف جا رہی ہو تو فبہا ورنہ اگر رخ بدل دے یا راستہ میں خراب ہو جائے اور بننے کی امید نہ ہو تو اس کو چھوڑ دینے میں ان کو کوئی تامل نہ تھا ۔ ان کی مختصر مگر گرانقدر تصنیف ''انقلابی تحریک'' اس مسئلے کو سمجھنے میں کافی مدد کر سکتی ہے ۔ اس کتابچے کی پیشانی پر لکھی تحریر مذکورہ مسئلہ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے اپنے اندر بہت کچھ پیغام رکھتی ہے ۔

''دین قائم ہو جائے اس کی خواہش تو مجھے زمانہ شباب ہی سے رہی، مگر اس کا نہج کیا ہو یہ سامنے نہیں تھا ۔ چالیس سال سے زیادہ گزارنے کے بعد کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی ۔ مگر بہ حیثیت مجموعی نہج Process پھر بھی واضح نہیں تھا ۔ کچھ نوجوان اور کچھ سن رسیدہ حضرات اس سلسلے میں مجھ سے سوال کرتے رہے مگر میں کوئی واضح جواب نہیں دے سکتا تھا ۔ ان کے تقاضوں سے میری پریشانی بڑھتی گئی ۔ میں نے سوچا کہ قرآن اپنے مقصد ومدعا کے معاملے میں خاموش تو نہیں رہ سکتا اس لئے میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا ۔ سورہ الضحیٰ کی آیت ووجدك ضالاً فهدیٰ جب خود پڑھتا یا سنتا تو میں اپنے آپ کو اس کا مخاطب تصور کر کے اللہ سے امید باندھتا کہ وہ ضرور یہ گرہ کھول دے گا ۔ رفتہ رفتہ بات واضح ہونے لگی جس کو میں تحریر کی شکل میں اس لئے نہیں لا رہا ہوں کہ جو

اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں ان پر کوئی نقد یا تبصرہ پیش نظر نہیں ہے (ہر ایک کو اس کے خلوص کے مطابق آخرت میں اجر بہر حال ملے گا) بلکہ اس کا محرک یہ اندیشہ ہے کہ اپنے مقصد یعنی دین کو عملاً قائم کرنے کے حصول میں موجودہ تحریکوں کی شان وشوکت کے باوجود ان کی ناکامی آئندہ نسلوں کو پست ہمت نہ کردے'' (انقلابی تحریک، ص ۱)

اس اقتباس سے جو باتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر صاحب کو جماعت کے نصب العین ''اقامت دین'' سے اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ تو زمانہ شباب ہی سے ان کی آرزو تھی۔ اسی نصب العین نے ان کو کھینچ کر جماعت میں لایا تھا۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ دین کو عملاً پورا کا پورا قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے نہ کہ صرف اس کی طرف دعوت دی جائے۔ تحریک اسلامی کو وہ صرف دعوتی تحریک نہیں بلکہ انقلابی تحریک دیکھنا چاہتے تھے۔

(۲) دین کو عملاً کس طرح قائم کیا جائے، ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ تھا۔ یہی اصل بنائے اختلاف تھا۔ معاملہ ''نہج'' اور Process کا تھا۔ اس معاملے میں وہ جماعت کے موجودہ رنگ ڈھنگ اور طرز عمل سے مطمئن نہیں رہے تھے۔

(۳) ان کے خیال میں تحریک اپنی ظاہری ''شان وشوکت'' کے باوجود ناکامی کی طرف بڑھ رہی تھی اس لئے کہ جو نہج اس نے اختیار کیا تھا وہ درست نہیں تھا۔ جماعت کی ظاہری ترقی کو وہ ''شان وشوکت'' سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے نزدیک جماعت میں ہر چیز کی Quantity تو بڑھی تھی مگر Quality بہت گھٹ گئی تھی۔ وہ اس سادگی کو ڈھونڈتے تھے جو دور رسالت سے لے کر خلافت راشدہ تک اسلامی تحریک کا طرہ امتیاز تھا، جس پر جماعت اپنے ابتدائی دور میں گامزن تھی اور جو خود ڈاکٹر صاحب کے کردار اور زندگی کا نہج تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جماعت کا موجودہ تنظیمی ڈھانچہ اور دفتری نظام اس کی تحریکی اسپرٹ کو ختم کر رہا تھا اور اس کے اندر ''مفاد پرستانہ'' اور ''ملازمانہ ذہنیت'' کو پروان چڑھا رہا تھا۔ چنانچہ اسی کتابچے کے صفحہ ۲۳ پر وہ لکھتے ہیں:

''اسلامی انقلاب بھاڑے کے لوگوں اور بامعاوضہ (خواہ اسے مشاہرہ کہا جائے یا کفاف) کام کرنے والوں کے ذریعہ برپا ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکی دور میں ایسا کوئی ایک کارکن بھی بھرتی نہیں کیا گیا اور مدنی دور میں بھی جب تحریک انقلاب برپا کر کے اس کو چلانے کے مرحلے میں پہنچ گئی تھی ایک شخص بھی ہمہ وقتی یا جز وقتی بامعاوضہ کارکن (Paid worker) نہیں تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اصحاب صفہ جو صحیح معنوں میں ہمہ وقتی کارکن (Whole timer) تھے ان کا بھی کوئی کفاف یا معاوضہ طے نہیں کیا گیا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ آپ مسلمانوں سے کہتے کہ تم لوگ ان کے گزر بسر کے لئے چندہ میرے پاس جمع کرو اور میں ان میں تقسیم کروں گا بلکہ آپ نے اس معاملہ کو جذبۂ انفاق اور انفرادی روابط کے حوالے کر دیا اور تحفہ تحائف کی شکل میں ان کی اعانت پر زور دیا۔ مصلحت واضح ہے کہ پہلی شکل میں ان کے اندر دنیاوی میلان کی کمزوری پیدا ہو سکتی تھی اور ملازمانہ ذہنیت ابھر سکتی تھی۔ بخلاف اس کے دوسری شکل میں آپس کی محبت (تہادو و تحابوا) پیدا ہوئی اور تحریکی کام کے ذریعہ اپنی دنیاوی ضرورت پورا کرنے کا رجحان پیدا نہیں ہوا'' (انقلابی تحریک، صفحہ ۲۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ ضیاء الھدیٰ صاحب کا جماعت سے استعفیٰ کوئی معمہ یا چیستاں نہیں ہے بلکہ ایک کھلا ہوا راز ہے۔ ان کے اندر بے چینی اور بے اطمینانی یکایک نہیں پیدا ہو گئی تھی بلکہ جیسا کہ ان کے قریبی لوگ جانتے ہیں عرصہ دراز سے پرورش پا رہی تھی جس کا اظہار کبھی کبھی غیر رسمی گفتگوؤں میں ہو جاتا تھا۔ وہ بہت دنوں سے دو کشتیوں پر سوار تھے یا دوسرے الفاظ میں نفسیاتی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک طرف ان کے ذاتی رجحانات و میلانات تھے دوسری طرف جماعتی ذمہ داریاں اور محدودیتیں (Limitations) تھیں۔ ایک طرف ضابطہ تھا دوسری طرف ضمیر کے تقاضے تھے۔ بہت دنوں تک دونوں متضاد تقاضوں کو وہ بڑے صبر وضبط کے ساتھ نبھاتے رہے مگر ذہنی تناؤ بڑھتا گیا۔

۱۹۸۵ء میں جماعت نے ووٹ کے استعمال کے سلسلے میں ارکان پر سے وہ پابندی اٹھالی جو ایک محدود دو قفے کو چھوڑ کر برابر عائد رہی تھی۔ اس فیصلے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ کچھ عرصے تک ڈاکٹر صاحب مرکزی شوریٰ میں اس فیصلے کو بدلوانے کی کوشش کرتے رہے۔ جماعت تنظیمی لحاظ سے ایک رہی لیکن نظریاتی اعتبار سے دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ دونوں حصوں کو ملائے رکھنے کیلئے جماعت نے ووٹ دینے اور نہ دینے دونوں کی اجازت دیدی۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس سے مطمئن نہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ پالیسی ایک ہونی چاہئے اور واضح ہونی چاہئے تھی۔ ہاں بھی اور نہیں بھی ان کو اپیل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ Straight forward آدمی تھے۔ تھوپ تھاپ اور لیپا پوتی کے قائل نہ تھے۔ ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ وہ جس موقف پر یقین رکھتے تھے اس کا لازمی تقاضہ تھا کہ وہ استعفیٰ دے دیتے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ Straight forwardness کا ایک باب ختم ہو گیا۔

جب میں نے پٹنہ کے ایک اردو اخبار میں ان کے استعفیٰ کی خبر پڑھی تو مجھے صدمہ ہوا لیکن حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے محسن اور مربی کو ایک طویل خط لکھا۔ مجھ میں جتنی طاقت تھی میں نے اس خط میں صرف کر کے ان سے التجا کی تھی کہ آپ کو جماعت کی پالیسی سے اختلاف ہے (نصب العین سے نہیں) اس لئے جتنی پالیسی ساز مجلسیں ہیں، مرکزی مجلس شوریٰ، مجلس نمائندگان، حلقہ کی مجلس شوریٰ ان سب سے استعفیٰ دے دیجئے تا کہ آپ کے ضمیر پر بوجھ باقی نہ رہے لیکن رکنیت سے استعفیٰ پر نظر ثانی کیجئے۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے وہ خط ان کے عالم گنج والے مکان کے پتے پر ڈاک سے بھیجا تھا مگر وہ خط انہیں کبھی ملا ہی نہیں۔ معلوم نہیں اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اگر چہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ خط انہیں مل گیا ہوتا تب بھی وہ اپنے فیصلے کو نہ بدلتے۔ وہ جو بھی فیصلہ کرتے تھے علیٰ وجہ البصیرت کرتے تھے۔ وہ جذباتی نہیں تھے۔ ان کے نزدیک جماعت کا اندرونی نظام پہلے ہی اطمینان بخش نہیں رہا تھا، ووٹ کے بارے میں تازہ فیصلے سے ان کے خیال میں جماعت کا راستہ بھی بدل گیا تھا۔ یہ راستہ اسلامی نظام کی طرف نہیں جمہوری نظام کی طرف جاتا تھا اور موجودہ جمہوری نظام کو وہ غیر اسلامی نظام سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک طرف اتنے سنجیدہ تھے جس کا نمونہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ دوسری طرف وہ نہایت شگفتہ مزاج اور باغ و بہار آدمی تھے۔ خشکی اور خشونت ان کو چھو بھی نہیں گئی تھی

ہو محفل یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

بے تکلف مجلسوں میں لطائف و ظرائف کے خوب خوب گل کھلاتے۔ ہنسنے ہنسانے کی بات ہوتی تو بھر پور حصہ لیتے، خوب ہنستے خوب ہنساتے۔ ایک مرتبہ پٹنہ سیٹی کے ایک رئیس صاحب کا قصہ سنایا جو شاعر بھی تھے۔ دبستان عظیم آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر ان کے دولت خانہ پر شعراء جمع ہوتے اور مشاعرہ ہوا کرتا۔ رئیس صاحب کی مجلس میں پٹنہ سیٹی کے ایک صاحب شریک ہوا کرتے جو پڑھے لکھے نہیں تھے۔ مگر رئیس صاحب سے بے تکلف تھے۔ مشاعروں میں بھی شریک رہتے اور خوب خوب داد دیتے۔ ایک مرتبہ رئیس صاحب کے یہاں لکھنؤ کے ایک شاعر مہمان تھے۔ شام کو ایک مشاعرہ ہوا۔ لکھنوی شاعر نے بھی اشعار سنائے۔ پٹنہ سیٹی کے ان پڑھ لوگ عموماً بات چیت میں ''ر'' کو ''ڑ'' اور ''ڑ'' کو ''ر'' بولتے ہیں۔ ایک جملہ ان کا مشہور ہے ''چمڑو کے چوڑ ہے پر گھورا پراک پراک دور ڑہا تھا'' (چمرو کے چوراہے___ پٹنہ سیٹی کے ایک چوراہے کا نام___ پر گھوڑا پڑاک پڑاک دوڑ رہا تھا)۔ رئیس صاحب نے ایک شعر پڑھا جس میں معشوق کی سیاہ و پر پیچ زلفوں کی تعریف تھی۔ ان پڑھ مصاحب نے اچھل کر داد دی ''واہ حجوڑ واہ۔ کیا سیر کہا۔ ایک تو کالی کالی جلپ، اس پر سے پڑ پیچ۔ کا سالا لکھنؤ والا کہے گا۔ (واہ حضور واہ کیا شعر کہا۔ ایک تو کالی کالی زلف۔ اس پر سے پر پیچ۔ کیا کوئی سالا لکھنؤ والا کہے گا)۔

ڈاکٹر صاحب کی زبان سے اس لطیفے کو سن کر ہم لوگ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی خوب ہنسے۔ یہ ان کی خوش بیانی

کا محض ایک نمونہ تھا۔ان کے رفقاء واحباب کو ایسی بہت سی مثالیں یاد ہوں گی۔ڈاکٹر صاحب کا آبائی مکان بہار شریف محلّہ خانقاہ سے ملے ہوئے محلہ کہنہ سرائے میں تھا۔غالبًا یہ محلّہ خانقاہ ہی کا پہلے ایک حصہ رہا ہوگا۔غالبًا ڈاکٹر صاحب کو خانقاہ سے رشتہ داری کا تعلق بھی رہا ہوگا۔کیوں کہ تصوف سے ان کا فطری تعلق معلوم ہوتا تھا۔بلخی خاندان سے ان کا تعلق بھی تھا۔ان کے ایک رشتے کے بھائی مولانا حکیم تقی الدین بلخی صاحب تھے جن کی خانقاہ فتوحہ میں ہے۔حکیم صاحب کے صاحب زادے مولانا حکیم علیم الدین بلخی ریٹائرڈ پرنسپل طبیہ کالج پٹنہ،محلّہ عالم گنج پٹنہ میں ہیں۔یہ ڈاکٹر صاحب کے رشتہ میں بھتیجہ ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی سسرال محلّہ خانقاہ اسلام پور میں تھی۔ان کی اہلیہ محترمہ شاہ ایوب ابدالی صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔پروفیسر طیب ابدالی پسر شاہ ایوب ابدالی صاحب کے ڈاکٹر صاحب اپنے پھوپھا تھے۔ڈاکٹر صاحب کے ایک رشتے کے نواسے رضوان اللہ صاحب کا مکان محلّہ خانقاہ بہار شریف میں ہے۔ان سے میری ملاقات ہوئی۔انہوں نے ہی مجھے وہ جگہ بتائی جہاں پر ڈاکٹر صاحب کا ننہال یا آبائی مکان تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہیں دنیا میں اپنا گھر نہیں بنایا مگر سیکڑوں دلوں میں گھر بنا کے چلے گئے۔عدالت گنج کا سرکاری کوارٹر چھوڑنے کے بعد ان کے یار غار شفیق بھائی مرحوم کے مکان سعید منزل سلطان گنج میں ہومیو پیتھک پریکٹس کرتے رہے۔کچھ یونانی دوائیں خود تیار کرتے جو خاص خاص مریضوں کو دیتے۔کبھی کچھ عطر تیار کرتے جو ان کے معتقدین خرید کر لے جاتے۔کبھی سرمہ تیار کرتے اور فروخت کرتے۔یہی سب ان کا ذریعہ معاش تھا باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ان کے ایک عقیدت مند نے اپنے مکان کا ایک کمرہ دے رکھا تھا اسی میں وہ رہتے تھے۔یہ ایک کچا مکان تھا پرانا۔کچی زمین،کھپرے کی چھپر۔ایک چوکی بچھی رہتی اس پر مچھر دانی کے اوپر پلاسٹک تنی ہوئی رہتی کیوں کہ برسات میں چھپر سے پانی ٹپکتا تھا۔اس پانی کو روکنے کے لئے پلاسٹک ٹانگی گئی تھی۔بغل میں ایک پرانی لکڑی کی کرسی پڑی رہتی۔یہی ان کا ڈرائنگ روم بھی تھا،بیڈ روم بھی اور مطب بھی۔ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ایک آئے ایک گئے۔اگر بیک وقت ایک سے زیادہ آدمی آجاتے تو ایک کرسی پر بیٹھتے باقی ان کی چوکی پر،اسی پر ڈاکٹر صاحب بھی سمٹ کر بیٹھ جاتے۔ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے۔ہر ایک کو اس کے حسب حال مشورے اور دوائیں بھی دیتے رہتے۔جسمانی امراض کی دوا بھی روحانی امراض کی دوا بھی۔مگر عطر سب کو پیش کرتے۔وہیں سیاست پر بھی گفتگو ہوتی،ملکی سیاست سے لے کر بین الاقوامی سیاست تک،قرآن وحدیث کے مسائل بھی بیان ہوتے،نجی گھریلو مسائل میں بھی رہنمائی ہوتی،ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی چھوٹتیں۔۱۹۹۵ میں جو مجھے Heart Attack ہوا،میں اسپتال میں تھا،ڈاکٹر صاحب خود بھی بہت کمزور تھے،عیادت کے لئے سائیکل سے آنہیں سکتے تھے۔رکشہ ٹمپو سے آنے کے لئے پیسے نہیں ہوں گے،پھر میں کس وارڈ میں کہاں پر ہوں یہ بھی پتہ نہیں تھا اس لئے خود نہ آسکے لیکن اپنے ایک شاگرد رشید کو میرے پاس اسپتال بھیجا۔انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا سلام پہنچایا اور مزاج پرسی کی۔جب میں اللہ کے فضل سے شفایاب ہوا تو ڈاکٹر صاحب سے ملنے ان کی کٹیا میں گیا۔ہنس کر کہا ''آپ کو کیسے یہ مرض ہو گیا'' ہمت افزائی کی اور کہا ''گیس کو کنٹرول میں رکھئے انشاء اللہ ٹھیک رہئے گا۔میرا خیال ہے کہ اللہ نے دو شیطان پیدا کئے ہیں۔ایک ابلیس اور دوسرا گیس''

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

☆☆☆

نسیم احمد صاحب،سابقہ متعدد میقات میں جماعت اسلامی،حلقہ بہار کی شوریٰ کے رکن رہے،کچھ دنوں نائب امیر حلقہ بھی رہے۔ضیاء الہدیٰ'' کے دیرینہ تحریکی رفیق۔طالب علمی کے زمانہ میں ہی مولانا مودودیؒ سے ملنے دارالسلام پٹھان کوٹ گئے،بعد میں ان کے بڑے بھائی بلند پایہ شاعر اور بزرگ جناب کلیم عاجز صاحب نے انہیں مولانا مودودیؒ کے پاس سے لایا(قیام:بہار شریف)

ایک مرد درویش کی یاد آرہی ہے

جلال الدین عمری

۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ میں جامعہ دارالسلام عمر آباد میں زیر تعلیم تھا۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ سال کے قریب تھی۔ جامعہ کی تعطیلات کے موقع پر میں بنگلور گیا ہوا تھا۔ وہاں میرے ایک بزرگ دوست مولوی سید محمود عمری مرحوم، جن سے میرے عزیزانہ تعلقات بھی تھے، ملازمت کررہے تھے۔ ان کی مجلس میں میرا آنا جانا تھا۔ ان کی رہائش گاہ پر عشاء کی نماز کے بعد بالعموم ملاقات کی نشستیں جمتی تھیں جس میں شہر کے بعض معزز اور پڑھے لکھے لوگ شریک ہوتے تھے اور مختلف علمی، ادبی اور دینی موضوعات پر باتیں ہوتی تھیں۔ ایک روز عشاء کی نماز کے بعد میں پہنچا تو حسب معمول مجلس جمی ہوئی تھی۔ وہاں میں نے ایک ادھیڑ عمر کے دبلے پتلے، دراز قد اور جاذب نظر شخص کو دیکھا۔ چہرہ اس قدر نورانی تھا کہ ایک طرح کی کشش محسوس ہوتی تھی۔ میں مجلس کے ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ باتیں ہورہی تھیں۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ اس وقت کس قسم کے موضوعات زیر بحث تھے۔ البتہ یہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پوری مجلس اس شخص کی طرف متوجہ تھی اور ان کی باتیں شوق اور دل چسپی سے سن رہی تھی۔ جب مجلس برخواست ہوئی تو میرے بزرگ رفیق مولوی سید محمود مرحوم نے فرمایا کہ یہ ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب تھے جو حلقہ کرناٹک کے قیم کی حیثیت سے ہمارے شہر میں تشریف لائے ہیں۔ مولانا سید محمود عمری صاب کو طالب علمی کے زمانہ ہی سے جماعت اسلامی سے دل چسپی تھی اور وہ مولانا مودودی علیہ الرحمہ کے عقیدت مندوں میں تھے۔ محمود عمری مرحوم نے فرمایا کہ ایک طویل عرصہ سے میرا جماعت اسلامی سے تعلق ہے اور میں نے جماعت کا لٹریچر بھی کافی پڑھا ہے لیکن صحیح معنوں میں جماعت کی دعوت اور مولانا مودودی کی فکر کو میں نے ڈاکٹر صاحب سے گفتگو اور تبادلہ خیال کے بعد ہی سمجھا ہے، اس سے پہلے میں نے اس طرح نہیں سمجھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے متعلق یہ میری پہلی واقفیت تھی لیکن براہ راست تعارف اور ملاقات و گفتگو کا موقع اب بھی نہیں ملا تھا۔

حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے اجتماعات کی شرکت کے سلسلے میں جب میرا بہار آنا جانا ہوا اور متعدد مواقع پر پٹنہ حاضر ہوا تو ان سے ملاقات و گفتگو بھی ہوئی اور ان کی زندگی، شب و روز کی معمولات اور اخلاق و عادات سے متعلق میری معلومات بھی کچھ اور بڑھیں۔

جب وہ جماعت اسلامی کی نمائندگان اور مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور دہلی بار بار ان کی آمد و رفت رہی تو ان سے ملاقات کا اور انہیں قریب سے دیکھنے کا زیادہ موقع ملا۔ میرے مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اور زیادہ قربت بڑھی اور ان کے اخلاق و کردار کو دیکھنے کے مزید مواقع ملے۔

مرکزی مجلس شوریٰ میں جو لوگ کم بولتے تھے ان میں ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب نمایاں تھے۔ وہ بالعموم خاموش رہتے۔ وہ اپنی فکر میں پختہ اور اپنے موقف میں مضبوط تھے اور اپنی بات کو دلائل کے ساتھ پیش کرتے لیکن انداز بہت ٹھنڈا ہوتا۔ اپنی بات پر بے جا اصرار یا ایک ہی بات کا بار بار اعادہ نہیں کرتے تھے کہ بحث و تکرار کی بدمزگی پیدا ہو جائے۔ وہ بس ضرورت بھر مدلل اظہار کر دیتے تھے۔ البتہ نجی محفلوں میں ڈاکٹر صاحب بے تکلف تھے اور مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود میں ان سے بہت بے تکلف نہیں تھا۔ ان کی بزرگی اور سنجیدگی اس میں حائل رہتی تھی۔

ایک بات جس سے میں متاثر ہوا وہ ان کی سادہ زندگی اور ان کا صاف ستھرا ذوق تھا۔ وہ نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ معمولی لباس، کرتا پاجامہ زیب تن کرتے مگر صاف ستھرا اور دھلا ہوتا۔ کپڑا غالباً خود ہی دھوتے، دھوبی سے نہیں دھلواتے تھے۔ کبھی استری کیا ہوا کپڑا بھی میں نے ان کے جسم پر نہیں دیکھا۔ شوریٰ کے اجلاس میں آتے تو ان کے پاس فقط ایک جھولا ہوتا جس میں غالباً ان کا ایک

تھی جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

(ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم)

ڈاکٹر حسن رضا

فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔کون صاحب بول رہے ہیں؟ جواب ملا بشارت حسین [۱] ،علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا پٹنہ سے کوئی خبر ملی ہے؟ میں نے کہا نہیں، کیا بات ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کا کل [۲] انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ڈاکٹر صاحب سے جو قلبی لگاؤ تھا اس کی وجہ سے یہ خبر سنتے ہی ذہن میں ایک خلا سا ہو گیا۔ دل و دماغ کے سارے در و بام اچانک جیسے بجھ گئے اور ایک اندھیرا سا چھا گیا۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

پھر دھیرے دھیرے ڈاکٹر صاحب کی دلنواز شخصیت کی ایک ایک ادا نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگی۔ پہلی دفعہ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات رمضان المبارک کے موقع پر انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ رمضان المبارک میں جمعہ کا خطبہ انجمن اسلامیہ ہال میں دیتے تھے۔ پہلے وہ رمضان المبارک میں خطبہ جمعہ گولک پور کی مسجد میں دیا کرتے تھے۔ بہر حال ان کا خطبہ بہت مشہور تھا اور اس کو سننے کے لئے پٹنہ کا باشعور طبقہ، اہل علم اور حوصلہ مند نوجوان پٹنہ سیٹی سے، پھلواری شریف تک کے جمع ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اکثر کسی ایک عنوان کے تحت رمضان المبارک میں قسط وار خطبہ دیتے تھے جس کا دن بھر چرچا ہوتا رہتا تھا۔ اس موقع پر پٹنہ سیٹی کے چند نوجوانوں میں مفیض خان، ربانی صاحب اور سلطان گنج کے سلطان احمد صاحب وغیرہ نے مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے پہلی دفعہ ملوایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب خطبہ جمعہ کے بعد جناب اسرائیل صاحب رکن جماعت کے بک اسٹال کے قریب سیاہ رنگ کی شیروانی اور کالی ٹوپی پہنے بے تکلفی کے ساتھ ہنس ہنس کر لوگوں سے مل رہے تھے۔ کھڑا چہرہ، گورا رنگ، ہنستی آنکھیں جس میں سرمہ اور اسلامی حیا دونوں کی لکیریں جھلک رہی تھیں۔ اونچی ناک، مسکراتے ہونٹ، کشادہ پیشانی جس پر سجدے کا ہلکا سا نشان، مسنون داڑھی، نہ زیادہ ڈیل ڈول نہ بالکل دبلے پتلے۔ موزوں قد و قامت، شرعی وضع قطع۔ عطر کی بھینی بھینی خوشبو سب نے مل کر شخصیت میں ایک جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ لیکن کوئی ایسا ظاہری طنطنہ یا رکھ رکھاؤ نہ تھا کہ آدمی پہلی ملاقات میں گرویدہ ہو جائے۔

ان کی شخصیت کا جادو آہستہ آہستہ چڑھتا تھا۔ جیسے جیسے ہم لوگ ان سے قریب ہوتے گئے ان کی عظمت کا راز کھلتا گیا اور اندازہ ہوا کہ ان کی عظمت ان کی پارسائی اور فقر وغیور میں ہے، اور ان کی کشش کا راز ان کے بے پناہ جذبہ ایثار و قربانی میں پوشیدہ

---

۱ رکن جماعت جواندنوں رانچی میں مقیم ہیں۔

۲ ۱۲/جون ۱۹۹۸ء بروز جمعہ

جوڑا کپڑا، لنگی، چادر، بنیان، برش، منجن، صابن وغیرہ ہوتا، اگر موسم سرد ہوتا تو ایک کمبل کا اضافہ ہو جاتا جو سفر میں ان کے کندھے پر لٹکا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے معیار زندگی کو بہت کم کر کے رکھا تھا۔ پٹنہ کے دو ایک دوروں میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب نے مجھے کھانے کی دعوت دی جسے میں نے بصد شوق قبول کیا۔ ان کی دعوت میں بڑی سادگی اور بڑا اخلاص تھا۔ سادہ روٹیاں، پتلی دال، موٹا چاول۔ مگر پورے خلوص اور شوق سے انہوں نے خود بھی کھایا اور مجھے بھی کھلایا۔ میں ان کے اس سادہ طرز رہائش سے بہت متاثر ہوا۔ صحیح معنوں میں وہ سادگی کا نمونہ تھے اور اس نمونہ پر وہ آخر دم تک قائم رہے۔ دنیا اور اس کے عیش و آرام کو کبھی مقصد نہیں بننے دیا۔ یہ نہیں کہ وہ رہبانیت یا گوشہ گیری کی طرف مائل تھے، نہ ان کی گفتگو میں رہبانیت کی کوئی جھلک ہوتی اور نہ ان کی زندگی میں خلوت اور گوشہ نشینی یا معاشرہ سے کٹنے کا ہی کوئی رجحان تھا، انہوں نے بھرپور اجتماعی زندگی گذاری اور اسی کی تلقین کرتے تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے آخری دور کا وہ رہائشی کمرہ بھی دیکھا ہے جو بہت معمولی تھا، جس کی چھت کھپریل کی تھی اور جو اتنا چھوٹا تھا کہ ایک چوکی اور دو تین کرسیوں سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی، جس میں کوئی پنکھا نہ تھا۔ ایک ٹیبل فین بھی نظر آیا، معلوم یہ ہوا کہ صرف مہمانوں کے لیے ہے۔ مہمان نہ ہوتے تو وہ دستی پنکھا استعمال کرتے۔ یہ کمرہ بھی ڈاکٹر صاحب کا اپنا نہ تھا، کرایہ کا تھا۔ کرایہ کا کمرہ کچھ اچھا بھی حاصل کر سکتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب معیار زندگی بڑھانے کے قائل ہی نہیں تھے۔ انہوں نے زہد و قناعت کا کوئی مصنوعی لبادہ نہیں اوڑھ رکھا تھا بلکہ ان کی زندگی حقیقتاً زہد کی تصویر پیش کرتی تھی۔ ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ مرحوم ہومیو پیتھ کی پریکٹس کرتے تھے۔ اگر اسی پریکٹس پر پوری توجہ دیتے تو ان کی مالی حالت بہتر سے بہتر ہو سکتی تھی مگر وہ ضرورت ہی کی حد تک پریکٹس کرتے، بقیہ وقت دعوت اور جماعتی کاموں کے لیے مخصوص رکھتے۔ ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی ہند بہار کے امیر حلقہ رہے مگر یہ خدمات انہوں نے اعزازی انجام دیں، کوئی معاوضہ کبھی نہیں لیا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خوبیاں ان کے اخلاص کا پتہ ہی نہیں دیتیں، دین کے خادموں کے لیے روشنی بھی فراہم کرتی ہیں۔

وہ باقاعدہ عالم دین نہیں تھے۔ البتہ ان کی تحریر اور گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ گہرا تھا۔ وہ عربی زبان سے کسی قدر واقف تھے۔ قرآن مجید پر مستقل غور و فکر کرتے اور بعض اوقات نئے نکات پیش کرتے۔ میں نے ان کی گفتگو اور خطاب سنے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ براہ راست قرآن کی آیات پر تدبر اور غور و فکر کرتے اور اسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو اور نکتوں میں ایک طرح کی Originality، ندرت اور تازگی نظر آتی ہے۔

ایک بات اور جس نے مجھے متاثر کیا وہ یہ کہ وہ نماز کے بڑے پابند تھے، نماز با جماعت کا بڑا اہتمام کرتے۔ میں نے انہیں وظائف کا بھی پابند دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیح تو کبھی نہیں دیکھی، البتہ یہ دیکھا کہ شوریٰ کی مصروفیات کے بعد بھی وہ رات کو دیر تک چہل قدمی کرتے ہوئے مسنون اوراد ضرور پڑھتے۔ ڈاکٹر صاحب کو نوجوانوں کی دینی اور اخلاقی تربیت سے خاص دل چسپی تھی۔ وہ ان میں دین سے تعلق پیدا کرنے اور اس کے لئے قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔ اس میں وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔

ڈاکٹر صاحب کو الیکشن کے مسئلہ میں جماعت اسلامی کے فیصلہ سے اختلاف رہا۔ اور یہی اختلاف زندگی کے آخری دور میں جماعت سے علیحدگی کا باعث بنا۔ اس کا ہم سب کو بڑا صدمہ ہوا۔ جماعت سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنے طور پر دینی خدمت کی کوشش کی لیکن اس کا انہیں زیادہ موقع نہیں ملا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک درویش انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ اس درویش کی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنے نیک اور صالح بندوں میں شامل کرے۔ آمین!

مولانا جلال الدین انصر عمری، جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ کے صدر، اس کے سہ ماہی مجلہ 'تحقیقات اسلامی' کے مدیر اور عالم اسلام کے معتبر مصنف۔ (قیام: دہلی)

ہے۔انہوں نے فقر اور دنیوی لذتوں سے بے نیازی کا جو رویہ ایک بلند نصب العین کی خاطر اختیار کیا تھا اس سے کوئی آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔یحیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں جن لفظوں میں بشارت دی گئی ہے اس میں ایک لفظ حصوراً[1] آیا ہے یعنی کمال درجے کی ضابطہ بندی اور لذت دنیوی سے کنارہ کشی۔ یہ صفت ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اندر بھی نمایاں تھی۔انہوں نے پوری زندگی عزیمت کو اپنا شعار بنایا اور اس رویے پر کسی لومت لائم کی کبھی پرواہ نہ کی۔انہوں نے جس اصول کو اپنایا اس پر آخر دم تک مضبوطی سے جمے رہے۔گہرے روابط اور والہانہ تعلقات کے ذریعہ افراد کی رہنمائی وتزکیہ،عوامی پروگراموں اور اداروں کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح وتربیت اور خاموشی کے ساتھ عام انسانوں کی خدمت اوران کے سکھ دکھ کو اپنا سکھ دکھ بنا لینے کا جو ہنر اور ملکہ اللہ تعالےٰ نے ان کو عطا کیا تھا انہوں نے پوری زندگی کو انہی کاموں کے لئے وقف کر دیا اور انتہائی اخلاص و استقلال کے ساتھ اس کو انجام دیا۔یہی ڈاکٹر صاحب مرحوم کا کمال تھا۔وہ وفاداری بشرط استواری کے آدمی تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا سب سے اہم اور نمایاں وظیفہ قرآن تھا۔قرآن کی تلاوت، اس میں غور وفکر، اس کا درس، قریبی لوگوں بالخصوص نوجوانوں میں قرآن فہمی کا ذوق وشوق پیدا کرنا ان کا محبوب عمل تھا۔۵۷۔۱۹۵۶ء کے زمانے میں انہوں نے پٹنہ شہر میں گردنی باغ سے لے کر پٹنہ سیٹی تک درجنوں مقامات پر درس قرآن کا حلقہ قائم کیا تھا۔چنانچہ ایک دن میں دو دو اور تین تین مقامات پر ان کو درس دینا پڑتا تھا۔پٹنہ کی مئی جون والی گرمی جب کہ لو کے ساتھ دھول دھکڑ چلتی تھی، ڈاکٹر صاحب اپنی سائیکل پر کہیں ظہر، کہیں عصر اور کہیں مغرب کے بعد درس قرآن دیتے تھے۔ برسوں ان کا یہی معمول رہا۔درس قرآن کی اس محفل میں جب میں پہلی دفعہ شریک ہوا تھا اس وقت غالباً وہ سورہ یونس کی آیتوں کا درس دے رہے تھے۔اور اس کے بعد پابندی سے میں اس درس میں سورہ لقمان تک شریک رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن سے قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا ایک نیا ذوق پیدا ہوتا تھا۔مطالعہ کا ایک نہج اور آزادانہ تدبر کا بھی حوصلہ ملتا تھا۔قرآن کی آیتوں کا درس وہ قرآن ہی کی روشنی میں دیتے تھے۔اور عقل عام (Common sense) کا استعمال قرآن کے مفہوم کو سمجھنے اور سمجھانے میں کرتے تھے۔بعض نکتے پر بڑی ذہانت سے روشنی ڈالتے،خصوصاً تلاوت آیات یعنی فطرت و کائنات میں اللہ کی نشانیوں پر غور وفکر میں ان کو خاص ملکہ تھا۔ان کا خیال تھا کہ قرآن جو آفاقی ذہن وکردار بنانا چاہتا ہے اس کے لئے کائنات میں غور وفکر کی بڑی اہمیت ہے۔قرآن کے مطالعے کے سلسلے میں وہ کسی تفسیر یا مکتبہ فکر کے پابند نہ تھے۔زندگی کے جن مسائل سے وہ دوچار تھے، جن حالات سے ان کو سابقہ پیش آتا تھا، معاشرے کو وہ جس سطح پر برتتے رہے تھے ان سب کے لئے فکری اور روحانی غذا وہ قرآن سے حاصل کرتے تھے۔

قرآن کے رسمی مطالعے سے فرد اور قرآن کے درمیان ایک حجاب پیدا ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب قرآن کے اس رسمی مطالعے کے سخت مخالف تھے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم کے یہاں کوئی چیز بھی رسمی نہ تھی۔ان کے ہر کام میں ایک زندگی وتابندگی تھی۔قرآن کا زندہ مطالعہ وہ اس طرح کرتے تھے کہ کتاب الٰہی اور کتاب زندگی دونوں کا ورق ساتھ ساتھ الٹ رہا تھا۔اسی وجہ سے ان کے گفتار و کردار میں قرآن کا نور جھلکتا تھا۔مجھے یاد ہے درس قرآن کی ایک محفل میں انہوں نے سبحان الذی اسریٰ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے واقعہ معراج پر بہت فکر انگیز گفتگو کی تھی اس کا کچھ حصہ ''خلائی دور'' نامی کتابچے میں آ گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو مستقبلیات (Futurology) کے مطالعے کا بھی خاص ذوق تھا۔حدیث کا وہ حصہ جس میں

---

[1] ان اللہ یبشرک بیحیی مصدقا بکلمتہ من اللہ و سیدا و حصورا و نبیا من الصلحین (آل عمران۔۳۹)

مستقبلیات سے متعلق کوئی اشارہ ملتا ہے ڈاکٹر صاحب برابر اس پر غور کرتے رہتے تھے۔ ان کے نظریہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اس کا خاص مقام ہے، انہوں نے اپنے مضمون میں اس کی وضاحت کی ہے۔ یہ مضمون زندگی کے شمارے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن کی طرح ان کی تقریریں بھی عوام میں پسند کی جاتی تھیں اور لوگ متاثر ہوتے تھے۔ ان کی تقریر میں ایک اور تخلیقیت اور تازگی ہوتی تھی۔ ان کے یہاں تقلید کا رنگ کسی چیز میں نہ تھا۔ جگر نے کہا ہے ؎

کہنے کو اہل علم کی کوئی کمی نہیں لیکن خود اپنی فکر خود اپنی نظر کہاں

ڈاکٹر صاحب کی اپنی نظر بھی تھی اور اپنی فکر بھی۔ جس کا اظہار نجی محفل، درس قرآن اور خطاب عام ہر جگہ ہوتا تھا۔ ان کی تقریروں میں وہ جوش خطابت نہ تھا جس میں الفاظ گونجتے، گرجتے، ناچتے اور وجد کرتے ہیں۔ اس میں آوازوں کا کوئی خاص اتار چڑھاؤ بھی نہ تھا۔ انگریزی کے بھاری بھرکم الفاظ، اشعار کے برمحل استعمال، مغربی فلسفیوں یا انسائیکلوپیڈیا کا حوالہ دے کر اظہار علم وفضل اور مرعوب کن طرز بھی وہ اختیار نہ کرتے تھے۔ تقریروں میں بے جا تکلف کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کسی بڑی محفل میں تقریر کرنے کے لئے خاص شیروانی اور اونچی ٹوپی کے استعمال کو تصنع سمجھتے تھے۔ ایک ہی مواد کو الٹ پلٹ کر بار بار پیش کرتے ہوئے بھی میں نے ان کو نہیں سنا۔ ہاتھ پاؤں کی اٹھا پٹک، مونڈھے کی جنبش یا اس طرح کا کوئی دوسرا ڈرامائی طرز اظہار وہ اختیار نہ کرتے تھے۔ بس جس عنوان پر تقریر کرنی ہوتی اور جو وقت دیا جاتا اس کے اندر اپنی بات پوری صفائی، صراحت اور منطقی استدلال کے ساتھ بیان کردیتے۔ ان کی تقریروں میں جو چیز روح ڈالتی تھی وہ عام فہم، سادہ اور عوامی طرز اظہار کے ساتھ قرآنی نکات اور بالکل سامنے کی چیزوں سے مثال تھی جس سے سننے والوں کو تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ متحدہ سیرۃ کمیٹی پٹنہ کے پلیٹ فارم سے ۱۸/ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں جو پرمغز تقریر انہوں نے کی تھی اس کے اندر آج بھی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بیت المقدس کی بازیابی پر بھی ڈاکٹر صاحب کی تقریر بڑی عالمانہ ہے۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب سے زیادہ قریب ہونے کا موقع مجھے ابتدائی دور ہی میں مل گیا۔ ۶۸۔۱۹۶۷ء میں منظور صاحب مالک آزاد سوپ فیکٹری گیا کے دولت کدے پر دس روزہ تربیتی اجتماع میں ہم لوگ ساتھ ساتھ رہے۔ میں اس وقت اپنی طالب علمی اور نوجوانی کے سب سے زیادہ اضطراب وانقلاب کے دور سے گذر رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب اس وقت قدرت کی طرف سے روحانی سہارا بن کر سامنے آئے۔

حسن اتفاق سے فرش پر ڈاکٹر صاحب کا بستر اور ہمارا بستر بالکل پاس تھا۔ اسی طرح دس دنوں تک اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے کا موقع ساتھ ساتھ ملا۔ انہوں نے مجھ پر خصوصی توجہ دی اور ہر چیز میں میرا خیال رکھا۔ یہاں تک کہ وہ میرے داخلی کرب اور ذاتی اضطراب کو بھانپ گئے۔ ایک دن صبح اٹھنے کے بعد کہنے لگے کہ ؎

آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں کہ جاگے ہو رات بھر

میں نے کہا نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے راز دل کو ٹٹولنے کی خاطر اپنے ٹوٹے ہوئے سپنوں کا حال بیان کرنا شروع کردیا۔ ایک بار غالب کے اشعار سنانے لگے ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

کبھی ورڈسورتھ کے اشعار سناتے۔ اس وقت تک میں ڈاکٹر صاحب کو بالکل نثر کا آدمی سمجھتا تھا لیکن معلوم ہوا کہ نہیں شخصیت کا یہ ظاہری پہلو ہے باطن میں بھرپور شعریت ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کو انہوں نے دبا دیا تھا۔ بہر حال اس کے بعد میں ان سے بہت

قریب ہوگیا اور ان کی حیثیت میرے لئے ایک پیر و مرشد کی ہوگئی۔ جو کچھ مجھ پر گذرتی سب کچھ ان کے علم میں ہوتا۔ اپنی ذاتی الجھنیں، گھریلو مسائل، ٹوٹتے بکھرتے خواب، نئے جنم لیتے عزائم، اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں سب ڈاکٹر صاحب کے علم میں آتی رہتیں۔ وہ ساری باتوں کو توجہ اور اطمینان سے سنتے اور پھر کچھ اس طرح حل کرتے کہ بوجھل دل لے کر ان کے پاس جاتا اور نشاط و انبساط کے ساتھ واپس آتا۔ الجھتے سلجھتے ہوئے ذہن کے ساتھ جاتا اور شرح صدر و طمانیت قلب کے ساتھ واپس آتا۔ اسی طرح وہ فکر و نظر، جذبات و احساسات سب کی تربیت کرتے رہے۔ وہ کسی کے لئے بھی خشک ناصح نہ تھے بلکہ چارہ ساز و غم گسار کا رول ادا کرتے تھے۔

ان دنوں میرا معمول تھا کہ کم و بیش روزانہ علی الصباح راجندر نگر پٹنہ سے ڈاکٹر صاحب کے یہاں عالم گنج حاضر ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم چوکی پر بیٹھے ہوئے تلاوت کلام پاک کرتے رہتے۔ ان کے اس چھوٹے سے کمرے میں دو تین سیکنڈ ہینڈ کرسیاں دیوار سے لگی رہتیں۔ بھولن مستری[1] کے یہاں کا بنا ہوا دو ٹین کا ریک (Rack) دیوار پر ٹنگا ہوا تھا جس پر ہومیوپیتھی کی دوائیاں اور ڈبے رکھے ہوئے رہتے۔ کونے میں ایک چھوٹا سا ٹیبل تھا جس پر اخبار و پرچے کچھ سلجھے اور کچھ الجھے ہوئے رکھے رہتے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس چوکی پر ایک معمولی سا بستر اور ایک چادر بچھی ہوئی رہتی اور تکیہ کے نیچے ایک جوڑا کپڑا بس۔ اور اسی سہ منزلہ مقام پر وہ بیٹھ کر تلاوت، تذکیر، آنے جانے والوں کی دل جوئی سب کرتے رہتے۔

زمیں پر بوریا ہے بوریا پر مرگ چھالا ہے فقیر بے نوا سہ منزلہ کا رہنے والا ہے

اس طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم سے میرے تعلقات میں ایک اپنا پن اور گہرائی آتی گئی۔ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان کی زندگی خانوں میں بٹی ہوئی نہ تھی۔ ان کی خلوت اور جلوت دونوں یکساں تھی۔ ان کی سادگی کا حسن، ان کے خلوص کی گرمی اور صداقت کی روشنی ان کے ہر پہلو میں نمایاں تھی۔ سفر و حضر، حلقہ احباب، کارکنوں کی محفل، جلسہ سیرت النبی، چھوٹے بڑے اجتماعات، مطب، مسجد و مئے خانہ (دفتر حلقہ) ہر جگہ ان کے قلب کی شفافیت کا حال یکساں تھا۔ ان کی سادگی میں کوئی بناوٹ، بے نفسی میں کوئی پوشیدہ نفسانیت اور انکسار کی تہہ میں کوئی پندار نہ تھا۔

ملٹن نے اپنی نظم میں لکھا ہے کہ شہرت شریف النفس انسان کی آخری کمزوری ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اندر اس آخری کمزوری کی ہلکی سی پرچھائیں بھی کبھی نظر نہیں آئی۔ ایک دفعہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے فرمائش کی کہ آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ پہلے تو انکار کیا لیکن مجھے یقین تھا کہ جو چیز شرعاً ممنوع نہیں ہے اس کے لئے ان کو تیار کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ لوگوں کا دل رکھنے والے تھے، کسی کی دل شکنی گوارہ نہ تھی، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجھے وہ ٹال نہیں سکتے کیوں کہ میں ان سے دلیل مانگتا۔ کئی مسائل تھے جن سے میرا اختلاف تھا۔ بہر حال میں نے نوٹ بک نکالی اور کئی سوالات داغ دئے تا کہ وہ نکل نہ جائیں۔ اس انٹرویو کے دوران انہوں نے بتایا کہ اسکول میں الکزنڈر پوپ (۱۶۸۸ـ۱۷۴۴) انگریزی کے ایک مشہور شاعر کی نظم اوڈ آن سولی چیوڈ (Ode on Solitude) بہت پسند تھی۔ اس کا آخری حصہ ان کو زبانی یاد تھا، انہوں نے مجھے سنایا۔ میں نے اس کو ڈائری میں نوٹ کرلیا۔

Thus let me live unseen, unknown
Thus un lamented let me die
Steal from the world, and not a stone
Tell where I lie.

---

[1] بھولن مستری جماعت کے کارکن پچھّم دروازہ میں ان کی الماری اور ریک بنانے کا ورک شاپ تھا۔

آج اس نظم کو دوبارہ دیکھتا ہوں تو اس میں شاعر کی تمنا اور ڈاکٹر صاحب کی آرزو دونوں میں گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ذات میں ایک گہری داخلیت تھی۔زہد اور درویشی کی طرف ایک فطری میلان تھا۔پوپ کی یہ پوری نظم ڈاکٹر صاحب کی داخلیت کی غماز ہے۔

اپنی اسی طبیعت کی وجہ سے انہوں نے کسی منصب کو دل سے قبول نہیں کیا۔اگر کوئی منصبی ذمہ داری اٹھانی پڑی تو نظم وضبط کی مجبوری کی وجہ سے اس کو قبول کیا۔انہوں نے انٹرویو کے دوران بتایا کہ تقسیم ملک کے بعد غازی عبدالجبار صاحب پاکستان کی جماعت کی طرف سے مولانا ابواللیث صاحب سے مطالبہ کرتے رہے کہ ڈاکٹر سید ضیاءالہدیٰ کو جلد ہندوستان سے بھیج دیا جائے تاکہ وہ مشرقی پاکستان کے قیم کی ذمہ داری اٹھاسکیں۔ڈاکٹر صاحب مرحوم جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے،اور دربھنگہ کے اجتماع کے موقع پر جب مولانا ابواللیث صاحب مرحوم نے ان سے دریافت کیا کہ آخر غازی عبدالجبار صاحب کو کیا جواب دیں تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ انہیں لکھ دیجئے کہ بحیثیت قیم ذمہ داری سنبھالنا منظور نہیں،البتہ ماتحت قیم کی حیثیت سے کوئی کام ہے تو لکھ بھیجیں میں تیار ہوں۔بالآخر ڈاکٹر صاحب نہیں گئے۔اس سطر کو لکھتے ہوئے پوپ (Pope) کی اسی نظم کی دو لائن مجھے یاد آرہی ہے۔

Content to breathe his native air

In his own ground

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بقول ملٹن شہرت شریف النفس انسان کی آخری کمزوری ہے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم شریف النفس تھے لیکن شہرت والی کمزوری کا دور دور بھی سایہ ان پر نہیں پڑا۔ریاکاری سے ان کو سخت نفرت تھی اور شہرت کی خاطر کام کرنے والوں سے وہ ایک فطری کراہیت رکھتے تھے۔بعض بڑے لوگوں کے یہاں کاروبار میں خلوص اور خلوص میں کاروبار دونوں پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم سراپا خلوص تھے۔کسی چیز میں بھی کاروباری پن ان کے یہاں نہیں تھا۔غریب ونادار مریض علاج ومعالجہ کے لئے ان کے پاس آتے تو مفت دوا کے ساتھ غذا کے لئے پیسے بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم دے دیا کرتے تھے۔وہ اپنی پریکٹس میں امیروں سے پیسے لیتے اور غریبوں کے علاج میں خرچ کردیتے تھے۔اکثر کہتے تھے کہ ڈاکٹری کا پیشہ پرائیوٹ نہیں ہونا چاہئے۔مریض اور ڈاکٹر کا رشتہ صرف خدمت کا ہونا چاہئے۔اس کا معاوضہ سرکار کو دینا چاہئے۔ان کی دلیل یہ تھی کہ ایک مریض جب پریشان حال اور درد سے بےچین کراہتا ہوا آتا ہے اور وہ ڈاکٹر کے لئے آمدنی کا ذریعہ بھی ہوتا ہے تو اس سے قلب نازک پر مادیت کی کثافت بڑھتی ہے۔اس کا علاج انہوں نے اپنی حد تک یہی کیا تھا کہ اپنی ناگزیر ضروریات کو مطب سے پوری کرنے کے بعد آمدنی کا بقیہ حصہ خدمت خلق کے لئے وقف کردیتے۔قرآن میں انفاق کے سلسلے میں ماذا ینفقون ''پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں'' کے جواب میں آتا ہے قل العفو (البقرہ:۱۹۹) ''کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو''۔ڈاکٹر صاحب مرحوم نے رضاکارانہ طور پر ایثار وقربانی کے اسی معیار کو اپنے سامنے رکھا تھا۔اسی وجہ سے ان کی پریکٹس کے اتار چڑھاؤ کا اثر ان کی طرز رہائش یا بود وباش پر نہیں پڑا۔اسی سلسلے میں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔میں نے ان کو مشورہ دیا کہ اپنی آمدنی سے بچا کر کچھ رقم آپ اپنی اہلیہ کے نام پر رکھ دیجئے۔کیونکہ وہ برابر بیمار رہتی ہیں۔اپنا مکان نہیں ہے۔کرائے کے اس خستہ حال مکان میں آپ لوگ رہتے ہیں۔کوئی اولاد نہیں ہے۔حتیٰ کہ قریبی رشتہ دار بھی یہاں نہیں ہے۔موت وحیات کا کیا ٹھکانہ۔میاں بیوی میں کس کا بلاوا پہلے آجائے۔خدانخواستہ ایسی کوئی بات ہوئی تو آپ کے بعد آپ کی اہلیہ کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ڈاکٹر صاحب نے ایک سیدھا اور ٹھیٹھ سوال کردیا کہ کیا ان کا نان ونفقہ مجھ پر میری زندگی میں فرض ہے یا میرے مرنے کے بعد بھی؟ اللہ رازق ہے،وہی سب کا انتظام کرتا ہے۔اس وقت قرآن کی وہ آیت میری

نگاہوں کے سامنے جھلک گئی جس کا ترجمہ ہے۔ ''جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستہ سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے وہ کافی ہے'' (طلاق: ۲،۳)۔ میں اس کے بعد آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اللہ کا ایسا کرنا کہ ان کی اہلیہ کا انتقال ان سے کئی سال قبل ہوا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی پریکٹس کو مادی آسائش کا وسیلہ بنانے کے بجائے روحانی منازل طئے کرنے کا زینہ بنا لیا تھا۔

تحریک اسلامی ہند کے اندر بھی بعض لوگوں کے کاروباری پن سے وہ بہت غمزدہ رہتے تھے۔ جماعت کے بعض قلمکار حضرات کے بارے میں ان کی رائے اس لئے اچھی نہیں تھی کہ وہ مکتبہ جماعت سے اپنی کتابوں کی روائلٹی کے سلسلے میں کاروباری پن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ثانوی درسگاہ کے بعض فارغین کی ذہانت اور علمی استعداد کے اعتراف کے باوجود وہ دل سے ان کے قدرداں نہیں تھے جنہوں نے جماعت کو اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے ضروریات زندگی کی فہرست اتنی طویل کر دی کہ جماعت اس کو برداشت نہ کر سکی۔ ان کے خیال میں وہ ضروریات ناگزیر نہ تھیں۔ اصل میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی ضروریات زندگی کی فہرست اتنی مختصر کر دی تھی کہ بہت سارے لوگوں کی ضروریات ان کے نزدیک انقلابی دور میں تعیش کی فہرست میں آ جاتی تھیں۔ یقیناً یہ پہلو ان کا بڑا تابناک اور روشن تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں ایک بڑے فتنے سے بچا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مال کے ساتھ اولاد کو بھی فتنہ کہا ہے۔ جو لوگ بال بچے، بیٹی داماد، بیٹا اور بہو رکھتے ہیں ان کے لئے یہ معیار برقرار رکھنا ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم تحریک اور تحریکی اداروں کے رشتے کے بارے میں صاف، شفاف اور مخلص تھے اور اپنے تجربے کی روشنی میں برابر کہا کرتے تھے کہ بعض لوگوں کی شخصیت اور ذہنیت میں مادی مفاد کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ مئے وانگبیں کی لاگ کے بغیر کسی راہ میں آگے نہیں بڑھتے، اور ایسے لوگ کسی نہ کسی انداز سے اپنے دنیوی مفاد کی سبیل نکال لیتے ہیں۔ تحریکی ساکھ اور اس کے ذیلی اداروں سے فائدہ اٹھانے والوں کی ذہنیت کو وہ ایک طرح کی منافقت سمجھتے تھے۔ کارکن سازی اور فرد کی تربیت کا ایک بنیادی نکتہ ان کے نزدیک یہ تھا کہ کارکنوں کی ذہنی نشو و نما ابتداء ہی سے اس انداز سے کی جائے کہ تحریکی رشتے سے مادی منفعت کے حصول کا خیال کسی کے دل میں جمنے نہ پائے۔ کارکن اور تحریک کا رشتہ ان کے نزدیک محبوب کا رشتہ ہونا چاہئے۔ تحریک اسلامی کے حوالے سے جو کام بھی کیا جائے وہ صرف رضائے الٰہی اور تحریکی مفاد کے پیش نظر کیا جائے۔ ذاتی مفاد کسی حال میں سامنے نہ آئے۔ لیڈری کا شوق نمایاں ہونے کی بے چینی، تعلقات کے وسعت کی لذت، منصب کی ہوس، تقریر کے بعد واہ واہ کی چاٹ سب پر ڈاکٹر صاحب کی نگاہ ہوتی تھی۔ اجتماعی زندگی میں ان کمزوریوں کو محسوس کر کے اس کو تربیت کے پہلے مرحلے میں ختم کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔ افراد کو قریب کرنے اور آگے بڑھانے کی اس حکمت عملی کو وہ صحیح نہیں سمجھتے تھے کہ کسی کی کمزوریوں کی رعایت کی جائے۔ افراد کی ذاتی استعداد اور فطری صلاحیتوں کو نشو و نما کے مواقع دینا اور باصلاحیت افراد کی کمزوریوں کی ایسی رعایت کرنا کہ وہ کمزوریاں تحریکی ماحول سے غذا حاصل کرنے لگیں۔ دونوں کا فرق ان پر واضح تھا۔ چنانچہ پٹنہ کے بعض معروف اور باصلاحیت افراد جو تحریک سے ہمدردی بھی رکھتے تھے، ڈاکٹر صاحب مرحوم ان کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اور ایسے لوگ بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم سے شاکی رہا کرتے۔ وہ جس شخص کے اندر انا کی بو محسوس کرتے وہ پھر کتنا ہی لام قاف کا آدمی ہو اس کو تحریک اسلامی میں لفٹ نہیں دیتے تھے۔ ان کی راہ و رسم تک ایسے لوگوں سے بہت محدود ہو جاتی تھی۔ وہ ظاہری ٹیپ ٹاپ، دنیوی وجاہت اور تام جھام سے بالکل متاثر نہیں ہوتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم تجربے کو منطق پر ترجیح دیتے تھے، لیکن ان کا تجربہ متنوع نہ تھا، اس لئے تیزی سے بدلتے ہوئے تمدنی

حالات کے تقاضوں کا ساتھ دینے میں انہیں الجھن ہوتی تھی۔ڈاکٹر صاحب مرحوم کو عالم علوی اور سفلی دونوں کی سیر کا موقع نہیں ملا۔ وہ کبھی رند نہیں رہے، اسی لئے جو لوگ رندی اور پارسائی دونوں کا تجربہ رکھتے ہیں ڈاکٹر صاحب مرحوم کو کچھ زیادہ نیک سمجھتے تھے۔ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم کی ابتدائی زندگی سے جو لوگ واقف ہین وہ گواہی دیں گے کہ واقعی انہوں نے آگ اور پانی دونوں سے نہیں کھیلا۔ڈاکٹر صاحب مرحوم اگر شاعری کرتے تو حالی کی مسدس کی طرح اس کی جلد دوم شائع ہو جاتی۔ان کے یہاں ایک آئیڈیلزم پایا جاتا تھا۔اس لئے وہ ہجوم لے کر نہیں چل سکتے تھے۔کچے پکے افراد کو لے کر چلنے کی صفت دوسری ہوتی ہے۔شاید یہ صفت انیس الدین صاحب مرحوم میں تھی۔ڈاکٹر صاحب ہجوم سے چند افراد کو منتخب کر لیتے تھے۔کھوئے ہوؤں کی جستجو ان کا تحریکی مشغلہ تھا، اور اس کام کے لئے آئیڈیلزم ضروری ہے۔انہوں نے اپنی آئیڈیلزم سے بھرپور کام لیا۔جس پر ان کی نگاہ انتخاب ٹک جاتی اس کو وہ اپنے سے بہت قریب کر لیتے۔اس کے اوپر کوئی عملی ذمہ داری سپرد کر دیتے اور اس پر بھروسہ کرتے۔ڈاکٹر صاحب حوصلہ مند نوجوانوں کا حوصلہ بڑھاتے۔جس کو بھی کسی عملی محاذ پر لگاتے اس کو تجربے اور مشق کی ایسی آزادی دیتے کہ

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ان کے وقت میں کئی تحریکی کام اسی مشق ناز کا نتیجہ ہیں۔بہرحال اس سے کئی نوجوانوں کی بہتر تربیت ہوئی۔ابتدائی دور میں پچھّم دروازہ میں درس گاہ اسلامی کا ناظم بناتے وقت جب میں نے اپنی ناتجربہ کاری کا ذکر کیا تو کہا شہر سکھائے کوتوالی، اور پھر میں اس کو چلاتا رہا۔کئی اتار چڑھاؤ آئے اور فیصلہ مجھے ہی لینا پڑا۔اللہ کا شکر ہے کہ ہم پر ان کا بھروسہ آخر دم تک قائم رہا۔پٹنہ میں پرسنل لاء کے ایشو پر جب گولی چل گئی تو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے فوراً مجھے طلب کیا۔اس وقت ارشد اجمل اس محاذ پر مقامی طور پر نوجوانوں کی رہبری کر رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرنے میں ایک حوصلہ ملتا تھا۔کبھی وہ حوصلہ شکن بات نہیں کرتے تھے۔اسی طرح خانہ خدا فلم پٹنہ میں لگی تو ہم چند نوجوانوں نے ڈاکٹر صاحب کے مشورے سے اس کو نہ چلنے دینے کا عزم کیا اور طے کیا کہ سب لوگ جمعہ کی نماز کے فوراً بعد ایلفنسٹن پہنچ کر وہاں پر ایسا ماحول پیدا کر دیں کہ فلم کا چلنا ناممکن ہو جائے۔کئی لوگوں کی مصلحت اندیشی اور کوتاہی سے یہ پروگرام کامیاب نہ ہو پایا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کے اندر بھی ایک مثبت پہلو نکال لیا اور فرمایا، ابتدائی زندگی میں یہ تجربہ مستقبل کے لئے بہت مفید ہوگا کیوں کہ عام طور سے اجتماعی زندگی میں قابل اعتماد اور بھروسہ مند ساتھیوں کی شناخت قیادت کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اصلاً وجدان کے آدمی تھے۔وہ ایسا دل جو عقل کا غلام ہو قبول کرنے کے قائل نہ تھے۔کہتے تھے کہ دلیل تو شیطان نے بھی دی اور اللہ میاں کے سامنے دی۔عقل کے پاس دلیل کی کوئی کمی نہیں ۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

ڈاکٹر صاحب کے اہم فیصلے اور اقدامات اسی عشق، وجدان اور عرفان کا نتیجہ ہوتے تھے۔حق و باطل کی کشمکش میں وہ کبھی بھی محو تماشائے لب بام کے قائل نہیں رہے۔وہ بے خطر کود پڑنے والا مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے۔یہی ان کا اصل مزاج تھا۔چوں اور چرا، این و آں قیل و قال ان کی زندگی میں نہ تھا۔وہ اپنی اصل طبیعت کے اعتبار سے سادہ اور کھرے تھے۔ان کا حسن سونے چاندی کے زیورات کا حسن نہ تھا جس میں ملاوٹ ضروری ہے۔ان کا کردار کھرے سونے یا سچی چاندی کی ڈلی کا تھا۔

ان کے یہاں کوئی فنکاری نہ تھی۔ان کی شخصیت رنگا رنگ اداؤں اور تہہ داریوں سے بالکل پاک تھی۔وہ راست گفتار تھے یا رطرحدار والی بات نہ تھی۔اقرار میں انکار اور انکار میں اقرار سے وہ کوسوں دور تھے۔جو بات دل میں تھی وہ زبان پر اور جو زبان پر تھی وہ دل میں۔آپ کو برا لگے یا بھلا۔

ڈاکٹر صاحب کے اندر نہ تحزب تھا نہ ہم عصریت۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ پچھم دروازہ میں جماعت اسلامی ہند پٹنہ کا ماہانہ اجتماع تھا اور اسی محلے کی دوسری مسجد میں جماعت اصلاح المسلمین (اہل حدیث) کا ماہانہ اجتماع تھا۔ مولانا عبدالخبیر صاحب مرحوم اس وقت امیر جماعت اصلاح المسلمین تھے۔ ایک محلے میں دو مذہبی جماعت کا عوامی جلسہ ڈاکٹر صاحب کو اچھا نہیں لگا کہ دونوں جماعت کے لوگ اعلان کریں کہ بعد نماز مغرب خطاب عام ہے، آپ لوگ تشریف لائیے۔ ایک طرف اعلان ہو کہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب امیر جماعت اسلامی پٹنہ خطاب کریں گے اور دوسری طرف اعلان ہو کہ مولانا عبدالخبیر صاحب امیر جماعت اصلاح المسلمین خطاب عام کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم مولانا عبدالخبیر صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جماعت کی طرف سے تجویز بھیجی کہ خطاب عام ایک جگہ ہو۔ ہم لوگ اسی مسجد میں آجائیں جہاں اہل حدیث حضرات کا اجتماع ہو رہا ہے یا وہ لوگ آجائیں۔ مولانا عبدالخبیر صاحب مرحوم نے تجویز منظور کی اور خود اس مسجد میں آئے جہاں جماعت اسلامی کا اجتماع ہو رہا تھا۔ اجتماع کا پروگرام بعد نماز مغرب ساتھ ساتھ ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب نے پہلے تقریر کی بعد میں مولانا عبدالخبیر صاحب نے۔ دونوں میں ادب و احترام کا ایسا رشتہ، جو واقعی دین میں مطلوب ہے، میں نے اس دن دیکھا۔

معروف امریکی مصنف آر کوی (R.Covey) کے نزدیک ملنے جلنے اور راہ و رسم کے اعتبار سے شخصیتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک کو پرسنلٹی اتھکس (Personalitiy ethics) اور دوسرے کو کیرکٹر اتھکس (Character ethics) والی شخصیت کہتے ہیں۔ پرسنلٹی اتھکس والی شخصیتیں عوامی زندگی میں رابطہ عامہ کے گر اور پبلک ریلیشن (Public Relation) کی تکنیک کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کے رویئے، میل جول اور اخلاق میں اصل چیز اپنا امیج (Image) ہوتا ہے۔ دوسری طرف کیرکٹر اتھکس والی شخصیتیں اپنے پاس کچھ اقدار رکھتی ہیں اور ان کی تمام سرگرمیاں انہیں اقدار کے گرد گھومتی ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم اپنی شخصیت اور امیج سے بالکل بے نیاز تھے۔ ان کے پاس ایک زندہ دل تھا، اس دل میں ایک آگ تھی۔ اس آگ کو ہر دل میں لگانا ان کا مشن تھا۔ لہٰذا تمام اجتماعی سرگرمیاں اور تعلقات اسی مشن کے تابع تھیں۔ اسی لئے عوامی رابطے میں کوئی اخلاقی تکنیک کا استعمال نہیں کرتے، کہیں کوئی مصالحت نہ تھی، جو بات جہاں کھٹکتی اس کو برملا کہہ دیتے۔ تحریکی کارکنوں کو کبھی کبھی بد و بننے کے لئے کہتے تھے۔ کہتے تمدن زدہ مت ہو جایئے، جہاں نفاق کو اخلاق اور ظاہرداری و بناوٹ کو آداب وایٹی کیٹ کے حسین پردے میں پروان چڑھایا جاتا ہے۔ تقریبات میں بھی شرکت کا انداز وہی قلندرانہ تھا۔ امیروں کی محفل ہو یا غریبوں کی، ان کے انداز قلندرانہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے چند نوجوان کافی قریب تھے۔ میں بھی ان لوگوں میں ایک تھا اور شوخ بھی تھا۔ جو سوال جی میں آتا کر دیا کرتا۔ ان سے سوال کرنے میں کوئی لحاظ نہ تھا کہ وہ کیا سوچیں گے۔ خفا ہو جائیں گے یا کہنے لگیں گے کہ بنی اسرائیل کی گائے مت بنا دیجئے۔ ہم لوگ سوال ہی نہیں ان کے جواب پر سوال کر دیتے تھے۔ محبت بھی کرتے تھے، اعتراض بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کہا، آپ افراد سازی میں اوسط درجے کا کارکن تیار کرتے ہیں۔ رفیق صاحب (رکن جماعت) کے چھوٹے بھائی شریف صاحب (اب وہ بھی رکن ہیں) جنھوں نے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا تھا، ان کو ڈاکٹر صاحب نے میرے ورک شاپ میں ویلڈنگ کے کام میں لگا دیا تھا۔ میں نے ان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ تحریکی نوجوانوں کو بڑا بنانے کا وژن آپ کے پاس نہیں ہے۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے ہم اوسط آدمی ہیں اس لئے اوسط افراد تیار کرتے ہیں اور بڑا بننے کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔ یہ تھی ان کی بے تکلفی۔ یہ تھا انداز رفاقت۔ یہ تھی معرفت نفس۔ حدیث میں ایک دعا کا ذکر آتا ہے کہ اے اللہ مجھے اپنی نظر میں چھوٹا اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے حق میں یہ دعا قبول ہوئی تھی۔ اندیشہ ہائے دور دراز اور سود و زیاں سے بلند ایک قناعت پسند

مومن حنیف کی زندگی انھوں نے گذاری۔ جو آئیڈیل سامنے رکھا اس کے لئے تمام دل و جان سے وقف رہے۔ فکر، جذبہ اور عمل کی ایسی یکسوئی، آسودگی اور ہمواری خال خال ہی نظر آتی ہے۔

کہیں میں نے پڑھا ہے کہ ہر شخصیت کے اندرون سے کچھ غیر مرئی شعائیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ یہ تابندگی (Radiation) اس شخص کے نور و ظلمات سے چھن چھن کر اس کے اردگرد ایک ہالہ بنا دیتی ہیں۔ یہی ہالہ کسی شخصیت کا اصل پرتو ہوتا ہے۔ جو لوگ کسی کے قریب ہوتے ہیں ان کو اس ہالے میں اس کی اصل شخصیت صاف نظر آتی ہے۔ اسی لئے بسا اوقات دور سے بعض شخصیتیں بڑی نورانی نظر آتی ہیں، لیکن ان کے قریب جانے پر ظلمات کا ہالہ سارا بھرم کھول دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے گرد بھی ایک ہالہ تھا جس میں بڑی تابانی و درخشانی تھی جس کو ہر شخص اتنا ہی محسوس کرتا تھا جتنا قریب ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سبک، دلکش اور کومل پہلو کا اظہار ان کی اس نجی محفل میں ہوتا تھا جس میں بہت بے تکلف اور قریبی نوجوان شریک ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میں حسب معمول علی الصباح ان کے یہاں پہنچا۔ جاڑے کا موسم تھا، میرے پاس ان دنوں گرم کپڑا نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک اچھی سی گرم چادر تحفتہً مجھے پیش کی۔ میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا اور کہا کہ شاید آپ نے میری ضرورت کا خیال کر کے یہ چادر خریدی ہے۔ اگر یہ چادر میری ضرورت نہ ہوتی تو میں بصد شوق اس تحفے کو قبول کر لیتا، لہٰذا آپ اصرار نہ کریں۔ میں جذبات میں یہ سب باتیں بول گیا۔ ڈاکٹر صاحب بالکل چپ ہو گئے۔ صرف ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا کر رہ گئے۔ جھلملاتے آنسو کی گرمی سے میں پگھل جاتا مگر میں نے دل کڑا کر لیا، جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا۔

انسان کی ایک کمزوری چھپانا ہے اور دوسری کمزوری ظاہر کرنا ہے۔ کہیں وہ اپنے کو چھپانا چاہتا ہے اور کہیں اچک اچک کر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ جہاں چھپانا چاہیے وہاں نمایاں کرتا ہے اور جہاں نمایاں کرنا چاہیے وہاں پردہ ڈالتا ہے۔ اس کمزوری پر قابو پانا آسان نہیں ہے۔ اس کمزوری پر قابو پانے کے لئے اپنی ذات سے ہجرت کرنی پڑتی ہے اور اپنے آپ کو اپنا غیر بنا لینا پڑتا ہے اور یہ مشکل جہاد ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایاز کی طرح آدمی اپنی پوستین ہر وقت سنبھال کر رکھے تاکہ خود فراموشی کی اونگھ طاری نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی پوستین ہمیشہ ان کے سرہانے رہتی تھی اور سفر میں جھولے میں۔ اس لئے خود فراموشی کے لمحات ان پر طاری ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ خود فراموشی کی پہچان یہ ہے کہ دل پر اونگھ آ جاتی ہے دل دنیا کی طرف راغب ہو جاتے ہیں ؎

بیدار ہیں دل جن کے وہ دنیا سے خفا ہیں

حدیث میں آتا ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرو جن کی صحبت میں دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی صحبت کا سب سے بڑا فیض یہ تھا کہ دنیا، جس کے چشم نرگس اور عارض گلنار پر آج ساری دنیا دیوانہ وار چلی جا رہی ہے، ایک کالی کلوٹی پوپلی بڑھیا کی شکل میں کاسۂ گدائی لئے دے بابا کی صدا لگاتی نظر آنے لگتی تھی۔ وہ اکثر کہتے تھے جو دنیا کو اصل روپ میں دیکھ لیتا ہے اس کے سامنے وہ اصلی روپ میں آتی ہے۔ میں نے کہا اصلی روپ میں دیکھنے کا نسخہ؟ کہا سورہ کہف پھر سورہ روم کی اس آیت کی بھی تلاوت کی جس کا ترجمہ ہے "لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں"[1]۔ اس پہلو سے مسبحات کی تلاوت اور تدبر کا مشورہ بھی دیتے تھے۔

میرے خیال میں ذمہ داران تحریک اسلامی کے اندر تین خوبیاں نمایاں ہونی چاہئیں۔ ایک بے غرضی، دوسری امانت داری اور تیسری خیر خواہی۔

---

[1] یعلمون ظاھرا من الحیٰوۃ الدنیا و ھم عن الآخرۃ ھم غافلون ۔ (سورہ روم، آیت ۷)

قرآن میں تمام انبیاء علیھم السلام کی زبان سے بلا وجہ یہ اعلان نہیں کرایا گیا کہ میں تم سے بدلہ نہیں چاہتا۔ سورہ الشعراء میں اٹھا کر کوئی دیکھ لے تو ہر پیغمبر کی دعوت میں اس جملے کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ ''میں تمھارے لئے امانت دار رسول ہوں، لہذا تم اللہ سے

ڈرو اور میری اطاعت کرو، میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے''[1]۔ امانت داری اور بے غرضی کا اس طرح بار بار ذکر قابل غور ہے۔ سورہ یٰسٓ میں بھی اس کو اسی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اصحاب قریہ کا حال بیان کرتے ہوئے ایک شخص کے دوڑتے ہونے کا ذکر کیا۔ اس وقت کی جو فضا ہے اس کو قرآن میں دیکھنا چاہئے۔ وہ دوڑتا ہوا آنے والا شخص قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہی کسوٹی پیش کرتا ہے۔ اے قوم (اتبعوا من لا یسئلکم اجراً) '' اتباع کرو ان کی جو تم سے بدلہ نہیں چاہتے جو بے غرض لوگ ہیں''۔ ایک مقام پر امانت داری اور خیر خواہی کا اعلان ایک ساتھ کیا گیا، (انی ناصح امین) ''میں سچا خیر خواہ اور امانت دار ہوں''۔

اس پہلو سے میں دیکھتا ہوں تو ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کے اندر یہ تینوں خوبیاں تھیں۔ ان کی بے غرضی اور بے لوثی نے ان کے جاننے والوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ یقیناً وہ بین الاقوامی شہرت کے آدمی نہ تھے۔ انھوں نے کوئی بلند پایہ تصنیف بطور یادگار نہ چھوڑی بلکہ وہ تو تصنیف کے آدمی بھی نہ تھے۔ شوق تصنیف بھی نہ تھا۔ پانچ سات کتابچے جو کچھ ہیں وہ تحریری سے زیادہ تقریری ہیں۔ اور کتابی شکل میں ان کی طباعت ادائے فرض کے تحت کی گئی ہے۔ اس لئے بڑے مصنف ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کسی بڑی دینی درسگاہ یا جامعہ سے دستار فضیلت یا سند کے حصول کا شرف بھی انہیں حاصل نہ تھا، بس پرانے زمانے کے میٹرک پاس تھے۔ لیکن ایسے بہت سارے لوگوں سے زیادہ بڑے تھے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ جنہوں نے قلم اور روشنائی کا ضیاع کر کے الماریوں کا بوجھ بڑھایا ہے۔ یقین جانئے بعض لوگوں کے نام بڑے ہوتے ہیں مگر وہ خود بونے ہوتے ہیں، ایسے لوگ وقت کی دھوپ اور روشنی میں ایسے مقام پر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ان کا سایہ قد آور لگتا ہے جس کو دنیا دیکھتی ہے۔ بعض لوگ اشتہاری ایجنسیوں کے کاندھے پر یا کسی ادارے کی اونچی مسند پر بیٹھ کر اونچے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بحیثیت انسان بڑے تھے اس لئے کہ بے غرض تھے۔ بے غرض آدمی اتھاہ ہو جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جمال الدین افغانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''خیالات و افکار کا پیدا کرنا آسان ہے مگر خیالات و افکار کے بقا و قیام کے لئے اشخاص کا پیدا کرنا مشکل ہے۔ اور کسی مصلح کے لئے جن پیغمبرانہ اوصاف کی ضرورت ہے ان میں اولین صفت یہی ہے'' یہ پیغمبرانہ اوصاف جمال الدین افغانی کی طرح ڈاکٹر صاحب میں بھی پائے جاتے تھے۔ کسی انسان کے کردار میں ایسی تب و تاب اور قوت تخلیق کہ وہ انقلابی افراد پیدا کرے آسان نہیں ہے اس کے لئے انہیں پیغمبرانہ اوصاف کی ضرورت ہے۔ بے غرضی، امانت داری اور خیر خواہی۔

جمال الدین افغانی نے یہ بات کہی تھی کہ میں کتابیں نہیں لکھتا افراد پیدا کرتا ہوں۔ زوال پذیر معاشرے میں افراد پیدا کرنا پتھر نچوڑنا ہے۔ حسن البنا نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا ''اُصنف رجال'' میں آدمی گڑھتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی آدمی گڑھتے تھے، اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کی زندگی میں تیاگ، تپسیا اور تڑپ ہو۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بہار کے جمال الدین افغانی تھے۔

---

[1] انی لکم رسول امین فا تقوا اللہ و اطیعون و ما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العالمین آیت ۱۰۷۔۔۱۰۹ الشعراء (اس جملے کو اس سورہ میں پانچ بار دہرایا گیا ہے)۔

کردار سازی کا یہ کام آج تحریکی حلقوں میں ماند پڑتا جا رہا ہے۔اس کی تلافی نت نئے پروگراموں کی چہل پہل اور مختلف اجتماعات کی ہلچل سے نہیں کی جا سکتی۔یہ کسی ندی پر باندھ باندھنا نہیں ہے کہ افراد کے ہجوم اور بھیڑ سے انجام پا جائے۔اس کے لئے تحریک اسلامی کے ذمہ داروں میں کچھ خاموش اداؤں کی ضرورت ہے جو بے غرض اور بےلوثی کی مقدس آگ میں تپنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے یہاں بلا مبالغہ میں ہزاروں دفعہ گیا اور ہر حال میں گیا۔جب وہ عالم گنج کے اس گنجان آبادی میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔جب وہ ایمرجنسی کے دوران پھلواری شریف سنٹرل جیل میں تھے۔جب وہ مختلف قسم کے آپریشن کے بعد نرسنگ ہوم میں زیر علاج تھے۔کبھی ان کو اپنی ذات کے لئے ملول نہیں پایا۔ہمیشہ تر و تازہ۔بہت زیادہ عسرت وتنگی کے دور میں بھی لوگ بتاتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کے یہاں چولہا جلا ہے کہ نہیں۔ویسے ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ کبھی بھی دن بھر فاقے کا دور نہیں گذرا۔ابتدائی دور میں ایسا اکثر ہوتا کہ ۲۷۔۲۸ دنوں تک مطب میں کوئی مریض نہیں آتا لیکن مہینے کے آخر میں کوئی نہ کوئی ایسا مریض آ جاتا کہ مہینے بھر کا خرچ اور بقدر کفاف کا انتظام ہو جاتا۔ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ دوسروں کے لئے یا تحریک اسلامی کے لئے فکر مند پایا۔پھلواری شریف سنٹرل جیل میں ایمرجنسی کے دوران ملنے گیا تو انہوں نے جعفر صاحب اور ڈاکٹر مناظر خلیل صاحب[1] کے لئے اپنی فکر مندی کا اظہار کیا،اور مجھے مشورہ دیا کہ گرفتاری سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرو تا کہ تحریکی ساتھیوں کی بڑی تعداد جو سلاخوں کے پیچھے ہے ان کے مسائل کے حل کے لئے دوڑ بھاگ کر سکو،نیز ایمرجنسی کی وجہ سے باہر کے ماحول میں جو افراتفری ہے اس میں اپنا رول ادا کر سکو۔

ڈاکٹر صاحب کی اس خوبی کی وجہ سے ان کا مکان تحریکی سماجی کارکنوں اور نوجوانوں کا مرجع تھا۔صنعتی ترقی کے اس دور میں شہری زندگی میں جو ہرجائی پن ہے ہم سب اس کو جانتے ہیں۔گھر،مسجد،مدرسہ،خانقاہ،بازار سب کی سرحدیں مل گئی ہیں۔دور جدید کی ساری قدریں کاروباری اور بازاری ہو چکی ہیں۔اس وجہ سے قوم کا نوجوان اپنی سند اور ذہانت کو لے کر کھلے بازار میں صدا لگاتا پھرتا ہے لے دہی۔چنا چور گرم۔اور اس بازار میں جس کو جتنی قیمت مل رہی ہے وہی قیمتی ہے۔ان حالات میں ڈاکٹر صاحب کی ذات پریشان حال اور ستم رسیدہ نوجوانوں کا سہارا تھی۔قرآن میں رسول ﷺ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمھاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ''[2]۔سورہ کہف میں ارشاد ہوا ہے کہ اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو[3]۔ ڈاکٹر صاحب کا رویہ بھی تحریکی کارکن اور مخلص نوجوانوں کے لئے ایسا ہی تھا۔ان کے مکان پر تحریک کے ہر طرح کے لوگ آتے رہتے تھے۔پچھم دروازہ کے بھولن مستری،عالم گنج کے نور ٹیلر،سائکل پر منجن اور اخبار و رسائل سے لدے پھدے اسرائیل صاحب۔صلو،جمن،بفاتی سب اپنا دکھ درد،الجھن مسائل لے کر آتے رہتے۔تھوڑی دیر بیٹھتے۔ڈاکٹر صاحب سبھوں کے لئے اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھتے۔اسی طرح مختلف سطح کے لوگ مسائل لے کر آتے رہتے۔میاں بیوی کے جھگڑے،محلے ٹولے کی رقابتیں،وراثت کی تقسیم،شادی بیاہ کے رشتے ناطے،کاروباری چشمک،سب میں ڈاکٹر صاحب اپنی حد تک لوگوں کے کام آتے۔بعض لوگوں کو دعائیں سکھا

۱۔ رکن جماعت اس وقت لندن میں ہیں۔

۲۔ واخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین آیت ۲۱۹ الشعراء

۳۔ واصبر نفسک مع الذین...... آیت ۲۷ الکہف

دیتے، کچھ وظیفہ بتا دیتے، بعض کا دل لطیفے سے ہلکا کر دیتے، کچھ لوگوں کو ہومیوپیتھی کی گولیاں دے دیتے۔

ڈاکٹر صاحب کے معمولات سب کو معلوم تھے۔ ان معمولات میں چند بے جان اصولوں کی کارفرمائی نہ تھی۔ ایک فطری انداز تھا۔ سبھوں کے لئے آپ کا دروازہ یکساں کھلا ہوا رہتا، ان کا گھر ایک پبلک پلیس تھا۔ وہاں ہر چیز کھلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کتاب زندگی بھی کھلی ہوئی تھی۔ ان کی محفل بوجھل نہ ہوتی تھی۔ کسی قسم کی بے کیفی و بے رنگی نہ تھی۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب بہت باغ و بہار قسم کے آدمی نہ تھے۔ ایک سنجیدگی اور متانت تھی لیکن ظرافت کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی محفلوں میں ظرافت کے چھینٹے، ہنسنے ہنسانے کی باتیں، چٹکلے، لطیفے، پرانے قصے، عقلمندوں کی حماقتیں، احمقوں کی دانشوری، ہمعصروں کی نوک جھونک کے دلچسپ واقعات، سماج کی ناہمواری، حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا رہتا تھا۔ اس میں پڑھے لکھے نوجوان، معمولی پڑھے لکھے ورکر، ان پڑھ کاریگر، اہل علم، پروفیسر، ڈاکٹر، تجارت پیشہ حضرات سب لوگ شامل رہتے تھے۔ احمد رضا خان صاحب مرحوم اپنے اے ون پروگرام کے ساتھ آتے۔ نصیر الدین صاحب رکن جماعت دفتر کے مسائل لے کر آتے۔ ایک زمانے میں وہ دفتر میں ہمہ وقتی کارکن تھے۔ آدھے درجن نوجوان تو روزانہ آنے والوں میں تھے۔ صبح سے گیارہ بجے تک یکے بعد دیگرے لوگ آتے جاتے رہتے۔ کبھی چچا چھکن ٹائپ کے لوگ یا حاجی بغلول صاحب تشریف لے آتے تو دیر بھی ہو جاتی اور مزہ بھی آتا۔ اس طرح نئے افراد کے آنے سے رنگ بدل جاتا اور محفل جمی رہتی۔ یاد آتا ہے ایک صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے مسئلہ دریافت کیا کہ نماز با جماعت میں اگر کوئی اگلی صف میں ہو اور اس کو نکسیر پھوٹ جائے اور وضو جاتا رہے تو صفوں کے بیچ سے کیسے باہر آئے؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اگر اہل حدیث کی مسجد ہو تو نمازیوں کے دونوں ٹانگوں کے بیچ سے آسانی سے نکل جائے۔ سائل اہل حدیث تھے۔ سب لوگ ہنس پڑے۔ وہ بھی محظوظ ہوئے۔ اسی طرح ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ محفل میں گفتگو کا دور چلتا اور بدلتا رہتا۔ بیچ بیچ میں قرآنی آیات، تحریک اسلامی کی کوئی بات، تزکیہ کا کوئی نکتہ، بعض جڑی بوٹی کی خصوصیات، عطر کی خوشبو، خلوص و اعتماد کی ایک روحانی فضا ان کے ڈیرے پر قائم رہتی۔ ڈاکٹر صاحب کسی کو نہ ناشتہ کھلاتے نہ چائے پلاتے نہ بسکٹ، نہ انڈا نہ ٹھنڈا نہ گرم۔ اور کسی کا ذہن بھی ادھر نہیں جاتا۔ کسی کو کبھی ایسی شکایت بھی نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب، ناشتہ کا وقت ہے۔ نہ آپ کھلاتے ہیں نہ پلاتے ہیں۔ روز دیکھتا ہوں کہ ناشتہ کا وقت ہوتا ہے۔ محمود عالم صاحب مرحوم پڑوسی ٹائپ رائٹر میکینک آتے ہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے چلے جاتے ہیں اور پھر آ کر محفل جم جاتی ہے۔ بے تکلفی سے بولے ناشتہ لائیں، اور کہنے لگے آپ جانتے ہیں اہلیہ بیمار رہتی ہیں، پڑوسی کی مہربانی سے یہ کام چل جاتا ہے۔ چائے نہ پیتا ہوں نہ پلاتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے پاس بہت سارے لوگوں کی امانتیں بھی رہتی تھیں۔ محلے ٹولے اور شہر کی بعض بیوہ بیکس خواتین یا غریب مسلمان اپنی چھوٹی موٹی چیزیں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس رکھ دیتے تھے۔ ایمرجنسی میں جب جیل جانے لگے تو اس وقت اندازہ ہوا کہ اتنے لوگوں کی امانتیں ان کے پاس تھیں۔ قرون اولیٰ کے بزرگوں کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ ذمہ داریوں کی اونچی مسند اور علم و فضل کے بلند مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود محلے ٹولے کے معمولی افراد کے کام آتے تھے۔ کسی بوڑھیا کا سودا سلف لا دیتے۔ کسی غریب کی بکری دوہ دیتے۔ کسی نادار کی دوا لا دیتے۔ آج کل تو بڑے لوگ خدمت خلق کا بڑا سائن بورڈ لگا کر بڑی بڑی خدمات انجام دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کو خاموش طریقے سے خدمت خلق میں خاص مزہ ملتا تھا۔

پٹنہ سیٹی ہسپتال میں ایک عورت زچگی کے دوران انتقال کر گئی، اس کا شوہر نوزائیدہ بچی کو لاوارث چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کی پرورش و پرداخت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی عسرت کے باوجود اس بچی کو اٹھا کر اپنے یہاں لے آئے اور اس کے

سر پرست بن گئے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ چونکہ وہ لاولد ہیں اس لئے انہوں نے شاید اپنی اہلیہ کی دلجوئی یا فطری خواہش کی تسکین کے لئے ایسا کیا ہے۔ ایک دن میں نے اکیلے میں دریافت کیا کہ آپ نے منہ بولی بیٹی کیوں لے رکھی ہے۔ تب انہوں نے یہ ماجرا سنایا کہ یہ بچی ٹور ہے اور باپ بھاگ گیا، لہذا مجبوراً میں نے اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ غور کیجئے ایک اجنبی بن ماں کی بچی کا سہارا بن گئے۔ ایسے واقعات ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں بہت ہیں۔ برے وقت پر وہ بہت لوگوں کے سہارا بن جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو میں نے دوسروں کے کام آنے میں اپنی شخصیت تک کو داؤ پر لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔ کسی کے کام آنے میں وہ کہاں تک جا سکتے ہیں اس کا گمان بھی لوگ نہیں کر سکتے۔ میں نے ایک دفعہ ان کو روکا۔ آپ کی شخصیت صرف اپنی نہیں ہے۔ اس کو اس طرح داؤ پر لگانا مصلحت کے خلاف ہے۔ ایک معاشرہ ہے۔ تحریکی ساکھ ہے، سب کا حق ہے۔ انہوں نے کہا اگر بدنامی ہوگی میری ذات کی ہوگی، اس غریب کا کام نکل جائے گا، اللہ دیکھ رہا ہے۔ بس شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ آپ شرعی طور پر اس حد تک جا کر کسی کے کام آنے کے مکلف نہیں ہیں۔ انہوں نے پھر کہا یہ کام میں غیر شرعی تو نہیں کر رہا ہوں۔ میں خاموش ہوگیا۔ خدا کا ایسا کرنا کہ وہ کام ان کے ارادہ کی برکت سے ہوگیا اور ان کو کسی اقدام کی ضرورت نہ پڑی۔ لیکن اس دن ڈاکٹر صاحب مرحوم اتنے اونچے اور بلند لگ رہے تھے کہ میری نگاہیں جھک گئیں، میں سوچنے لگا، ساتھ رہنے والوں کی امنگوں، حوصلوں، پریشانیوں، مسکراہٹوں اور آنسوؤں کا ساتھ دینے کا حوصلہ اور سلیقہ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے کوئی سیکھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا در ایسا تھا جہاں مروت، شرافت اور رفاقت جیسے الفاظ کو زندگی، توانائی اور نئی معنویت عطا ہوتی تھی۔

ہماری شادی کے مسئلے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم پیش پیش رہے۔ ان کو فکر رہتی تھی کہ ہر تحریکی نوجوان کو دیندار اور تحریکی بیوی ملے۔ ۱۹۷۰ء کی بات ہے اس وقت میں معاشی طور پر خود کفیل نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے مشورے سے Reliable Engineering کے نام سے عالم گنج، ترّی پولیا کے نزدیک ایک اسٹیل فرنیچر کا ورک شاپ شروع کیا تھا۔ ابھی یہ کام شروع ہی ہوا تھا کہ ایک تحریکی لڑکی سے رشتے کی بات کا آغاز ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ آمدنی ذرا مستقل ہو جائے تو شادی بیاہ کا مسئلہ حل کیا جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا کہ تحریکی لڑکی آسانی سے نہیں ملتی اور وہ بھی دیکھی بھالی۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ میری معاشی حالت جانتے ہیں۔ ورک شاپ میں کچھ پیسہ آپ کا لگا ہوا ہے۔ ابھی وہی قرض ادا نہیں ہوا ہے۔ شادی کے لئے کہاں سے قرض لاؤں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اللہ مالک ہے، پہلے آپ تیار ہو جائیے۔ چنانچہ رشتہ پکا ہوگیا اور شادی کے کل اخراجات کا انتظام ڈاکٹر صاحب نے اپنے پاس سے کیا جس کو کئی سال بعد میں نے قسطوں میں ادا کیا۔

شادی کے بعد جب پہلی دفعہ ہم دونوں میاں بیوی پٹنہ آئے تو ڈاکٹر صاحب نے دونوں کو اہتمام کے ساتھ دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد دونوں کو اسی کمرے میں کرسی پر آس پاس بٹھایا اور ازدواجی زندگی کی کامیابی کے لئے بنیادی باتیں سمجھائیں۔ بہرحال شادی کے بعد ہم دونوں میاں بیوی کے تعلقات ڈاکٹر صاحب مرحوم سے گھریلو مربی جیسے رہے۔ ہم دونوں کی بہت خواہش تھی کہ وہ ماہ دو ماہ کے لئے رانچی آکر ہم لوگوں کے ساتھ رہتے اور خدمت کا موقع دیتے۔ جب بھی اس خواہش کا اظہار ہم دونوں نے کیا ہنس کر آئندہ پر ٹال دیا۔ اصل میں کسی کو اپنے لئے تکلیف دینا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ اپنا بیشتر کام وہ خود کرتے تھے۔

ہاں میں نے ڈاکٹر صاحب سے بڑی مشکل سے ایک انٹرویو لیا تھا جس میں پوپ کی نظم کا ذکر تھا۔ میں نے اس موقع پر ان سے سوال کیا تھا کہ آپ جماعت اسلامی میں کس طرح آئے؟ انہوں نے اپنا پورا واقعہ سنایا جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۴۰ء میں مولوی پرچے میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے سلسلے میں مولانا مودودیؒ کا مضمون پڑھا تھا، اس سے متاثر ہوئے اور

اندازہ ہوا کہ کوئی موڈرن عالم دین ہے۔لیکن بات آئی گئی ہوگئی۔اس وقت ان کی عمر ۲۲۔۲۳ برس کی تھی اور وہ اپنی معاشی تگ ودو میں مصروف تھے۔ابتدا ہی سے انقلابی طبیعت تھی اس لئے سوچ رکھا تھا کہ سرکاری ملازمت نہیں کرنی ہے۔میٹرک کے بعد جب تعلیمی سلسلہ منقطع کردینا پڑا تو شرکت کے اصول پر ایک دوکان مراد پور پٹنہ میں شروع کی۔اس دوکان کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر Fixed Price کا بورڈ لگا ہوا تھا۔پٹنہ شہر میں مسلمانوں کی شاید پہلی دوکان تھی جس پر اس طرح کا بورڈ لگایا گیا تھا۔احباب ورشتہ دار کے علاوہ بعض علماء کرام بھی آکر بحث کرتے کہ تم نے یہ کیا Fixed Price کی دوکان کھول رکھی ہے۔یہ انگریزی طریقہ ہے۔حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں سیرت صحابہ میں آتا ہے کہ وہ بہت مول تول کر کے سامان خریدتے تھے۔غرض اسی میں ماہ وسال گذر گئے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم دوکانداری کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے،لہذا انہیں اس تجارت میں کامیابی نہیں ہوئی۔اس وقت پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف میں جگہ خالی ہوئی۔ملازمت کی عمر بھی ختم ہو رہی تھی۔ملازمت نہ کرنے کا فیصلہ کوئی شعوری فیصلہ نہ تھا،محض طبیعت ومزاج کی ایک بات تھی،اس لئے گھر والوں کے دباؤ اور حالات کی مجبوری کے تحت ملازمت کے لئے درخواست دینی پڑی اور با دل ناخواستہ تقرری ہونے کے بعد ۱۹۴۱ء میں اس شعبے میں جوائن کیا۔تقرری کے بعد محکمے نے انہیں لکھنؤ ٹریننگ کے لئے بھیجا۔وہیں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ملاقات ایک تحریکی رفیق سے ہوئی جنہوں نے ان کو مولانا مودودیؒ کی کتاب پردہ پڑھنے کو دیا۔اور ان کے تحریکی لٹریچر کے مطالعے کا آغاز پردہ کتاب سے ہوا۔عجب اتفاق کہ میں نے بھی تحریکی لٹریچر کے مطالعے کا آغاز پردہ کتاب سے کیا۔مولانا کی وہ کتاب اپنے موضوع،مواد اور اسلوب کے اعتبار سے لاجواب ہے۔بہرحال یہ سلسلہ جاری تھا کہ ٹریننگ ختم ہوگئی اور ڈاکٹر صاحب پٹنہ واپس آگئے۔

واپسی کے بعد انہوں نے معلوم کیا کہ تحریکی لٹریچر یہاں کیسے دستیاب ہوسکتا ہے۔کسی نے انہیں بتایا کہ پٹنہ مراد پور کی مسجد میں بعد نماز مغرب ایک صاحب آتے ہیں ان سے تحریکی لٹریچر حاصل ہوسکتا ہے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اسی حساب سے ان سے ملاقات کی اور ان کے پاس خطبات مکمل کے علاوہ جتنی کتابیں تھیں سب خرید لیا۔ڈاکٹر صاحب مرحوم کے لفظوں میں پٹنہ آکر وہ تحریکی لٹریچر پڑھنے نہیں،نگلنے لگے۔اسی دوران مولانا تقی نعمانی صاحب مرحوم کے مکتبہ دین ودانش کا پتہ مل گیا اور وہاں سے خرید کر اس وقت جتنی کتابیں شائع ہوئی تھیں سب کو دن رات کر کے پڑھ ڈالا۔کتابوں کے مطالعے کے دوران جنید صاحب اور ڈاکٹر نورالعین صاحب (Dentist) سے ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ ہندوستان میں ایک اسلامی جماعت ہے جو اسلام کی خدمت کرتی ہے اور یہ لٹریچر پھیلاتی ہے۔اس وقت پٹنہ کے امیر مقامی ڈاکٹر نورالعین صاحب تھے۔چنانچہ ضیاء الہدیٰ صاحب بھی بحیثیت کارکن اسی دور میں ہفتہ وار اجتماع میں شریک ہونے لگے۔

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم سے اس دن میری نشست طویل ہوگئی تھی۔وہ ذہن پر زور دے کر اپنے ماضی کو کرید رہے تھے اور میں اہم نکات نوٹ کر رہا تھا۔کبھی کبھی ٹوکتے اس کو لکھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں اپنا کام کئے جارہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج اس کو مکمل کر لینا ہے،مشکل سے تیار ہوئے ہیں۔اگر بیچ میں معاملہ ٹل گیا تو پھر ٹلتا ہی رہے گا۔میں نے فوراً سوال کیا آپ رکن کیسے بنے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس وقت حسنین سید صاحب بابائے تحریک اسلامی،بہار،بنگال،اڑیسہ اور آسام علاقے کے قیم تھے۔ایک بار دورہ پر پٹنہ تشریف لائے اور ہفتہ وار اجتماع میں شریک ہوئے۔وہیں ڈاکٹر صاحب مرحوم سے ان کا پہلا تعارف ہوا۔جب حسنین سید صاحب کو معلوم ہوا کہ انہوں نے تقریباً سبھی لٹریچر کا مطالعہ کر لیا ہے۔مقامی طور پر تحریکی کام بھی انجام دے رہے ہیں اور پابندی سے ہفتہ وار اجتماع میں شریک ہوتے ہیں تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے براہ راست دریافت کیا کہ آپ اب رکن کیوں نہیں

بن جاتے ہیں ؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا میں سرکاری ملازم ہوں ۔ ملازمت کے بعد لٹریچر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اگر پہلے اس تحریک سے واقفیت ہو جاتی تو سرکاری ملازمت ہی نہ کرتا لیکن اب جبکہ گورنمنٹ سروس میں ہوں اور پانچ سال کا باؤنڈ ہے، ابھی استعفیٰ نہیں دے سکتا ایسی حالت میں درخواست رکنیت کیسے دے سکتا ہوں؟ سوچ رہا ہوں پانچ سال کسی طرح گذر جائے پھر ملازمت ترک کر کے رکنیت اختیار کروں گا۔ حسنین سید صاحب نے ساری باتوں کو سننے کے بعد ان کی غلط فہمی دور کی اور بتایا کہ لٹریچر تو مزاج ایسا ہی انقلابی بناتا ہے لیکن جماعت اسلامی کا دستور اس میں مانع نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو دستور کی وہ دفعہ حسنین صاحب نے پڑھوائی۔ تب ڈاکٹر صاحب مرحوم نے فوراً درخواست رکنیت دے دی۔ یہ درخواست ۱۹۴۶ء کے اجتماع الٰہ آباد میں مولانا مودودیؒ نے منظور کی۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پٹنہ کے دو اور آدمی اس اجتماع میں رکن بنائے گئے۔ ایک بہاری بھائی جو بعد میں جماعت اسلامی کی رکنیت سے مستعفی ہوئے یا ہٹائے گئے اور دوسرے شمیم صاحب مرحوم پرل موٹر کے والد شفیق صاحب مرحوم۔ یہ تینوں امیدوار رکنیت کی حیثیت سے اجتماع میں شریک ہوئے اور رکن بن کر واپس آئے۔

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم نے انٹرویو کے دوران بتایا کہ انہوں نے پنڈال کا لفظ پہلی دفعہ اسی اجتماع میں سنا تھا اور اتفاق سے وہی پنڈال انچارج بھی بنائے گئے تھے۔ اس طرح کے کاموں کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن اللہ نے مدد کی اور پنڈال کے سارے انتظام وانصرام بحسن وخوبی انجام پائے۔ ڈاکٹر صاحب سے اس بہانے اجتماع الٰہ آباد کے تاثرات سننے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۴۶ء میں رکن ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں امیر مقامی پٹنہ بنا دیے گئے۔

ڈاکٹر صاحب تقسیم ملک سے پہلے تحریکی بزرگوں میں غازی عبدالجبار مرحوم سے بہت متاثر تھے۔ کئی بار اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر وہ ہندوستان میں رہ جاتے تو وہی امیر جماعت اسلامی منتخب ہوتے ، بلکہ تقسیم ملک کے بعد ان کو ہندوستان ہی میں رہنا تھا لیکن حالات کی ستم ظریفی، وہ واپس نہ آ سکے۔ بار بار ڈاکٹر صاحب کہتے کہ اگر غازی صاحب ہندوستان کے امیر جماعت ہوتے تو کام کا نقشہ دوسرا ہوتا۔ اس وقت جماعت اسلامی ہند جو کتابی ہو کر متوسط طبقہ کے پڑھے لکھے خواص کی جماعت بن گئی ہے ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہندوستان کے نئے ماحول میں ایک فعال وسرگرم عوامی جماعت کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتی۔ یہ کس طرح ہوتا؟ اس کی وضاحت انہوں نے کبھی نہیں کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف محکمے سے اپنی برطرفی اور بنگلور جانے اور واپس آنے کا قصہ سنایا۔

انہوں نے بتایا کہ ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی ہند پر حکومت کی خاص عنایتوں کا سلسلہ شروع ہوا، چنانچہ خفیہ سرکلر کی روشنی میں ان پر بھی کارروائی کا آغاز ہوا۔ پہلے تو P.M.G. نے کہلوایا کہ لکھ کر دے دیں کہ ہم جماعت اسلامی کے ممبر نہیں ہیں، بس کام چل جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کے لئے یہ ناممکن تھا۔ بہر حال اپنی ملازمت سے برطرفی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جذبہ تشکر جھلک رہا تھا کہ خدا کے بھروسے جو اقدام انہوں نے کیا اللہ تعالےٰ نے ان کی مدد کی۔ انہوں نے اس واقعہ کی آخری کڑی کا ذکر کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا کہ ایک دن پوسٹ ماسٹر جنرل نے جھنجھلاہٹ اور غصے میں انہیں بلا کر گفتگو کی۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی پوری ایمانی قوت کے ساتھ نتائج کی پرواہ کئے بغیر ترکی بہ ترکی جواب دیا اور آخر میں انگریزی میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے Then you do whatever you like اس کے بعد ان کے خلاف چارج شیٹ تیار کی گئی جس میں خفیہ سرکلر کے منشاء کے مطابق غلط بیانی سے کام لیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ جب یہ چارج شیٹ انہیں ملی تو بات کو طول دینے کے بجائے انہوں نے اس پر دستخط کر دیا اور اس طرح ان کی برطرفی کا آخری فیصلہ کر دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جس وقت آفس میں یہ مراحل طے ہو رہے تھے اس وقت احباب دفتر بالخصوص مسلم ساتھیوں نے ازراہ ہمدردی بار بار انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ کسی طرح سروس بچالیں۔ ان لوگوں نے کہا، نوکری چلی جانے کے بعد کیا ہوگا۔ کہاں سے کھاؤ گے۔ کہاں رہو گے۔ ان سب نے اس مسئلہ کو بھیانک بنا کر سمجھانے کی کوشش کی، بعض نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اہلیہ کو بھی الٹی سیدھی باتیں سمجھانے میں کسر نہیں چھوڑی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان لمحات کو یاد کرتے ہوئے طمانیت بھرے لہجے میں فرمایا کہ الحمدللہ اس وقت میرے قلب پر ایک سکینت طاری تھی اور بالکل اطمینان تھا کہ اگر زندگی ہے تو رزق کا انتظام بھی کہیں نہ کہیں سے ہوگا، اور اگر پیمانہ زیست لبریز ہو گیا ہے تو پھر اس کی فکر کیا۔ اور یہی بات انہوں نے اپنے دفتر کے احباب سے بھی کہی۔ بالآخر سروس ختم ہوگئی۔ سرکاری کوارٹر خالی کرنا پڑا۔ پٹنہ میں رہنے کا کوئی متبادل نظم نہیں ہو سکا اور ڈاکٹر صاحب نے عارضی طور پر اپنی سسرال اسلام پور فوری طور پر منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔

کچھ دنوں کے بعد مرکز جماعت اسلامی ہند رامپور سے ہدایت دی گئی کہ مدراس و کرناٹک کے قیم کا چارج انہیں لینا ہے اس لئے وہ رام پور آجائیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے قیام رامپور کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ ایک دن امیر جمعت مولانا ابواللیث صاحب نے بتایا کہ تمہیں بنگلور جانا ہے اور ضابطے کی رو سے مبلغ دوسو روپے ماہانہ بطور کفاف ملا کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا سے درخواست کی، یہ رقم زکوٰۃ کی مد سے نہ دی جائے، لیکن امیر جماعت نے مجبوری ظاہر کی۔ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب وہیں پر موجود تھے۔ امیر جماعت کے جواب پر ڈاکٹر صاحب سوچ میں ڈوب گئے۔ یہ دیکھ کر مولانا صدرالدین اصلاحی مرحوم نے کہا۔ کیا کیجئے گا ضیاء الہدیٰ صاحب ؎

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

اس مصرعہ کو سن کر ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے اور بتایا کہ بالآخر اطاعت امر کے تحت بنگلور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے برابر دعا کرتے رہے کہ کوئی ایسی سبیل نکل جائے کہ وہ دین اسلام کی خدمت کرتے رہیں اور زکوٰۃ کی مد سے کچھ لینا نہ پڑے۔

عجب اتفاق کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بنگلور کی پر بہار فضا کے باوجود خراب رہنے لگی۔ بواسیر سے بہت خون آنے لگا جس کے سبب بہت کمزوری ہوگئی۔ چنانچہ دو ماہ کے بعد بنگلور سے واپس آئے۔ بہار آتے ہی خون آنا بند ہو گیا اور جلد صحت بحال ہونے لگی۔ صحت بحال ہونے کے بعد انہوں نے بنگلور جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسلام پور سے پٹنہ منتقل ہو کر آزاد معاش کی خاطر ہومیو پیتھی پریکٹس شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح سات آٹھ ماہ گذر گئے اور اس دوران کفاف کی رقم مرکز سے آتی رہی۔ پھر انہوں نے اپنے پروگرام کی اطلاع امیر جماعت کو دیتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ انہیں کرناٹک اور مدراس کی قیمی سے سبکدوش کر دیا جائے۔ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں۔ امیر جماعت اسلامی ہند نے ان کی اس درخواست کو قبول کرلیا اور دعا دی کہ ڈسپنسری خوب چلے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے شکریے کا خط لکھتے ہوئے جواب دیا کہ ایسی بددعا مت دیجئے، بس نان شعیر کافی ہے۔ زندگی بھر وہ اسی کے خواہاں رہے اور بس۔ وہ اس راز کو سمجھتے تھے ؎

جہاں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی زندگی کے ان گذرے ہوئے واقعات کو سناتے ہوئے مجھ پر اس راز پر سے پردہ اٹھایا کہ جیسے ہی ان کے پاس اتنی رقم جمع ہوئی کہ وہ بیت المال سے بطور کفاف لی ہوئی رقم کو لوٹا سکیں، انہوں نے اولین فرصت میں اسے واپس کر دیا مجھے تاکید کی کہ اس کا ذکر کسی سے مت کیجئے گا۔ اچھا نہیں لگتا۔ اس راز کو بتاتے ہوئے ان کے چہرے پر ایک اطمینان و مسرت کو میں

نے محسوس کیا۔اور انہوں نے خود بھی کہا کہ چلو ایک بوجھ تھا جس کو ادا کرنے کے لائق اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بنا دیا۔ڈاکٹر صاحب اپنے اور اپنے قریبی لوگوں کے لئے یہی پسند کرتے تھے کہ وہ بیت المال سے کفاف لے کر کام نہ کریں اور اگر ایسا کرنا پڑے تو بحالت مجبوری ہی اس کو قبول کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔اس معاملے میں ان کے پاس کوئی خاص شرعی دلیل نہ تھی،بس ایک احساس کی بات تھی۔انہیں احساسات کی وجہ سے بعض لوگ انہیں اپنے اوپر بے جاسختی کرنے والا سمجھتے تھے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔وہ اپنی ذات کو یقیناً اجتماعی معاملات میں کوئی الاؤنس نہیں دیتے تھے لیکن کارکنوں پر بوجھ بقدر ہمت ہی ڈالتے بلکہ بسا اوقات ڈھیل دیتے تھے۔بیت المال کے معاملے میں غایت درجہ محتاط تھے اور محتاط رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب حضرت عمرؓ کی شخصیت کو اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے۔جب انہوں نے مجھے یہ بات بتائی تو میں سوچنے لگا کہ حضرت عمرؓ تو جہاں بینی اور جہاں بانی دونوں میدان کے شہسوار تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم جہاں بانی کے آدمی نہ تھے،ہاں جہاں بینی ان کی فطرت میں تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم پٹنہ شہر کے امیر مقامی، ناظم ضلع، ناظم کمشنری پٹنہ، امیر حلقہ جنوبی بہار اور امیر حلقہ بہار مختلف ذمہ داریوں کو ادا کرتے رہے لیکن ان کے لیل ونہار میں کوئی فرق نہیں آیا۔اول روز سے اپنے لئے جو میدان انہوں نے منتخب کیا تھا وہی کام یعنی افراد سازی کا آخری وقت تک انجام دیتے رہے۔فرق اتنا ہوا کہ جب امیر مقامی رہے تو ارکان کے ساتھ بعض لوگوں کو امیر مقامی کی حیثیت سے تیار کرنا چاہتے تھے اور جب امیر حلقہ مقرر ہوئے تو امیر حلقہ تیار کرنے میں لگ گئے۔لیکن معیار وہی رہا۔آخر دور میں کہتے تھے کہ اب چار افراد امیر حلقہ کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔جعفر صاحب،احمد علی اختر صاحب اور قمر الہدیٰ صاحب وغیرہ۔

امیر حلقہ بہار کی حیثیت سے ان کے شب وروز میں بس اتنا فرق آیا تھا کہ سہ پہر کو دفتر حلقہ آجاتے۔ڈاک دیکھتے،کبھی خطوط کا جواب عبدالودود صاحب مرحوم تیار کر کے رکھتے اس کو سن لیتے اور کبھی جواب کے بارے میں کچھ مشورے دیتے۔دفتر کے امور اور تنظیمی مسائل میں عبدالودود صاحب مرحوم پر ابتدائی دور میں پورا اعتماد تھا،ان کی تنظیمی صلاحیت اور تحریک کی مزاج شناسی کے آخر دم تک وہ قائل رہے۔سرکلر اور خطوط سے فارغ ہونے کے بعد وہ خاص منجن گوڑا کو استعمال کرتے اور نماز عصر ادا کرتے۔پھر دفتر میں آنے جانے والوں سے ملنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔اگر کوئی پروگرام طئے رہتا تو اس میں شرکت کے لئے چلے جاتے۔امیر حلقہ کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نظم وضبط کے آدمی ضرور تھے لیکن تنظیمی ضابطہ بندی میں رہ کر کام کرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔کئی اجتماعی معاملات میں ضابطہ بندی سے پرے ذاتی تعلقات، اجتماعی ضروریات اور اپنے رسک پر فیصلے کرتے تھے۔بعض ہمہ وقتی کارکنوں سے ذاتی Understanding پر کام لیتے۔محمود عالم صاحب ٹائپ رائٹر والے سے بھی انہوں نے دفتر کے سلسلے میں ذاتی طور پر وعدہ کر لیا تھا۔ان کے اس طریقے پر بسا اوقات انہیں شوریٰ میں الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ اجلاس شوریٰ میں ایک دو ارکان شوریٰ کی تجویز پر دیگر ارکان نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سامنے تجویز رکھی کہ ارکان شوریٰ دفتر حلقہ کا احتساب کرنا چاہتے ہیں اور آپ کی غیر موجودگی میں یہ جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے اس کو مان لیا اور عبدالباری صاحب مرحوم کو اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری سپرد کر کے وہ اجلاس شوریٰ سے باہر چلے گئے۔بعد میں بعض ارکان شوریٰ کو احساس ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم پر، جو اس وقت امیر حلقہ تھے،زیادتی ہو گئی۔شوریٰ تو امیر حلقہ کو مشورہ دینے کے لئے تشکیل دی گئی ہے،اور ان کی طلب پر اجلاس ہو رہا ہے اس لئے یہ بات ٹھیک نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب پر بھی اس کا اچھا اثر نہیں ہوا۔لیکن انہوں نے دستور جماعت کی دفعہ دکھا کر اس تجویز کو رد نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم خواتین میں کام کرنے کے لئے بھی بہت فکر مند رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کالج کی کچھ لڑکیوں کو قرآن اور اسلامیات کی تعلیم دینے کی غرض سے سعید منزل جہاں دفتر حلقہ تھا اس کی بالائی منزل میں ایک ہال میں ایک گھنٹہ کلاس کا نظم کیا۔ اس پر ایک دو ارکان شوریٰ بہار نے اعتراض کیا اور شوریٰ کی غیر رسمی مجلسوں میں محرم و نامحرم کی بحث چھڑ گئی اور ڈاکٹر صاحب مجبور ہو گئے کہ اس سلسلے کو بند کر دیں۔

مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے تحت ۱۹۵۵ء میں پہلی دفعہ ڈاکٹر صاحب مرحوم جنوبی بہار کے امیر حلقہ مقرر کئے گئے تھے۔ اس وقت کا حال مجھے زیادہ معلوم نہیں، البتہ یہ معلوم ہوا کہ جلد ہی ڈاکٹر صاحب نے انیس الدین صاحب مرحوم کی صلاحیت کے بارے میں مرکز کو مطلع کر کے ان کو اپنی جگہ امیر حلقہ مقرر کرنے کی درخواست کی تھی جس کو مرکز نے منظور کر لیا تھا۔ پھر انیس الدین صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر صاحب مرحوم بہار کے امیر حلقہ مقرر کئے گئے اور آخر وقت تک امیر حلقہ رہے۔

یہ بات کہنے میں اب کوئی حرج نہیں کہ امیر حلقہ بہار کے لئے جب بھی استصواب ہوا میں نے کبھی بھی ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کا نام تجویز نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے امیر حلقہ ہونے سے تین چار افراد کو انہوں نے امیر حلقہ بہار کے لئے خصوصی طور پر تیار کیا لیکن تنظیمی سطح پر پورے صوبہ بہار کا بڑا نقصان ہوا۔ ڈاکٹر صاحب دورہ کرنے سے معذور رہے۔ انیس الدین صاحب مرحوم نے مختلف مقامات پر تحریک و تنظیم کو جہاں پہنچایا تھا دعوتی اعتبار سے کام آگے بڑھا، لیکن مختلف مقامات پر تنظیمی پختگی نہیں آئی۔ دور دراز کے علاقے کے ارکان سے امیر حلقہ کا ذاتی ربط بہت کمزور ہو گیا جس کی تلافی آج تک نہیں ہو سکی۔ انیس الدین صاحب مرحوم کے تربیت یافتہ افراد اب بہار کے دور دراز مقامات سے اٹھتے جا رہے ہیں۔ دو چار سالوں میں اس کمی کا احساس اور زیادہ ہوگا اگر منصوبہ بند طریقے سے اس کی طرف توجہ نہ کی گئی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم ۱۹۵۶ء میں مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے۔ پھر ان کی جگہ پر ۱۹۶۰ء میں انیس الدین صاحب مرحوم رکن مرکزی مجلس شوریٰ منتخب ہوئے۔ دوسری دفعہ پھر جب امیر حلقہ مقرر ہوئے تو رکن شوریٰ بھی منتخب ہوئے۔ ایمرجنسی کے بعد ۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو جو اجلاس شوریٰ منعقد ہوا تھا اس میں ڈاکٹر صاحب شریک تھے اور ایمرجنسی کے بعد ارکان جماعت سے ووٹ نہ دینے کی پابندی اٹھانے کا جو فیصلہ ہوا تھا اس میں ڈاکٹر صاحب کی بھی رائے یہی تھی۔ وہ غیر معمولی صورتحال یا حالات اضطرار میں ارکان جماعت پر سے ووٹ کی پابندی اٹھانے کی حد تک جماعت اسلامی ہند سے ہم خیال رہے۔ لیکن بعد میں موجودہ نظام کی حقیقت، اس کے ساتھ عملی رویہ، ملی مسائل اور الکشن کی راہ سے اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی طویل فہرست اور ان مباحث میں رسمی، غیر رسمی سطح پر بے احتیاطی و بے اعتدالی کے رویے پر ایک گونہ پریشان رہے۔ اور ان کو اندیشہ ہونے لگا کہ جماعت کہیں غلط رخ پر نہ چلی جائے۔ مرکزی اجلاس شوریٰ کے باہر بعض ایشوز کو شریعت کے حوالے سے مزاح کا عنوان بنانے پر وہ شاکی رہنے لگے۔ جماعت کے لٹریچر کے بارے میں ان کا خیال شروع سے یہ تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں۔ اس میں عقلی استدلال پر زور ہے اور آخرت سے متعلق تشنگی پائی جاتی ہے۔ اس لئے ارکان میں فلاح آخرت، جہنم سے نجات اور جنت کی طلب سے بہرہ ور ہونے والی کیفیت میں کمی ہوئی۔ لیکن ابتدائی دور میں مولانا مودودیؒ کی انقلابی قیادت اور اس وقت کے ایشوز پر مولانا کا دوٹوک نقطہ نظر اور انقلابی لہجہ سے وہ مطمئن تھے۔ آزادی کے بعد وہ قیادت کا خلا محسوس کرتے تھے اور آہستہ آہستہ مختلف ایشوز پر وہ لہجہ بھی نہیں رہا اور اختلاف بھی سامنے آنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو مولانا ابواللیث صاحب مرحوم سے ایک عرصہ تک عقیدت رہی۔ اجلاس نمائندگان کی شرکت سے واپسی پر ہم لوگ تاثرات دریافت کرتے تھے تو ڈاکٹر صاحب بعض باتوں کا مجملاً ذکر کرتے تھے۔ اکثر وہ مولانا ابواللیث

صاحب مرحوم کی ذہانت، صبر، تحمل و بردباری وغیرہ کا ذکر کرتے رہے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا اس مرتبہ آپ نے امارت کے لئے کس کے حق میں رائے دی۔ کہنے لگے، یہاں سے تو خالی الذہن گیا تھا کہ ہاؤس میں جو رائے بن جائے لیکن دوران اجلاس خواب دیکھا کہ مولانا ابواللیث صاحب نے اپنی شیروانی کھونٹی میں لٹکائی لیکن وہ گر گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ اٹھا کر کھونٹی میں لٹکا دیا۔ بس اس خواب کے بعد ان کا اطمینان ہو گیا۔

لیکن آخر کے دنوں میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کو مولانا ابواللیث مرحوم سے وہ عقیدت باقی نہیں رہ گئی تھی اور ان کا خیال تھا کہ اب وہ تحریک کی قیادت کی ذمہ داری اٹھانے کے لائق نہیں رہے۔ اپنی ذہانت سے نباہ کر رہے ہیں۔ بعض ایشوز پر ان کی خاموشی کو مصلحت آمیز کہتے تھے اور اس مصلحت سے ان کا اتفاق نہ تھا۔ تشکیل جماعت کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ہم امت بنانے نہیں اٹھے ہیں، امت مسلمہ موجود ہے جس میں کچے پکے، ایماندار، منافق، بے دین ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ تشکیل جماعت کی غرض یہ ہے کہ ایک ایسی جماعت امت میں سے چھانٹ کر بنائی جائے جو اسلام کا عملی نمونہ بن کر عوام کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ جماعت کی رکنیت میں وہ احتیاط برتتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب جماعت کے ارکان و کارکنان کی دینی و اخلاقی سطح پست ہوتی جا رہی ہے تو کڑھنے لگے کبھی کبھی خصوصی مجلس میں کہتے، ایسی جماعت بنانے کا کیا فائدہ جس میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوں۔

غرض یہ کہ جماعت کا لٹریچر، اس کی قیادت، ایشوز کے اختلاف، جماعت میں عام ارکان کی اخلاقی و دینی حالت وغیرہ پر ان کے خیالات و احساسات میں بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ مزید یہ کہ ۱۹۸۴ء میں جب جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ نے ارکان پر ووٹ نہ دینے کی پابندی چند شرائط کے ساتھ اٹھا دی تو ڈاکٹر صاحب کی بے اطمینانی اور بڑھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب کو ان دلائل پر اطمینان نہ تھا جن کے تحت یہ فیصلہ ہوا تھا۔ مزید براں اس فیصلے کو آخری مرحلے تک لے جانے میں بعض ارکان شوریٰ کے رویے پر وہ بے حد مضطرب رہتے تھے۔ ان کے خیال میں اس فیصلے کی زد جماعت اسلامی نے جو تصور حاکمیت الٰہ کا پیش کیا ہے اس پر پڑتی ہے جو تحریک اسلامی کا طرۂ امتیاز ہے۔ سیکولر جمہوری نظام اور اس نظام کے علم برداروں کو وہ طاغوت سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں جو مباحث سامنے آئے اس سے ان کا یقین پختہ ہو گیا کہ اب جماعت سابقہ موقف پر لوٹ کر نہیں آ سکتی ہے۔ اور اس کا سابقہ کردار بحال کرنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ دھیرے دھیرے فقہی گنجائشوں اور حالات کے دباؤ کے تحت رخصتوں کا سہارا لے کر جماعت اسی راہ پر آگے بڑھتی رہے گی۔ ان کے خیال میں چند لوگوں کو چھوڑ کر اگلی صف کے لوگوں کے بھی ریزرویشن ہیں، ذاتی عزائم ہیں، تعلقات کی نزاکتیں ہیں، کچھ مفادات بھی ہیں۔ ان حالات میں کسی انقلابی اقدام کا امکان نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اضطراب روز افزوں بڑھتا گیا۔ افسوس کہ صوبہ بہار کے بعض پرانے اور کچھ نئے ارکان نے ان کے اضطراب کو بڑھانے میں مدد کی۔ ڈاکٹر صاحب اسی رخ پر آگے بڑھتے گئے۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ ان کو اندازہ ہوا کہ جو لوگ ہم خیال ہیں ان کے اندر جرأت رندانہ کی کمی ہے۔ پرانی رفاقتوں کی بیڑیاں بھی ہیں۔ تحزب بھی ایک بت ہے۔ بس وہ اپنے جذبۂ دروں کو روک نہ سکے۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے ہی ان کو اندازہ ہو گیا کہ اب مزید انتظار فریب نفس ہے، انہوں نے انا الحق کی صدا لگا کر جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ بہر حال بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ جو نوجوان ان کے اور مولانا صدرالدین اصلاحی کے بیچ واسطے کی کڑی تھے انہوں نے مولانا کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔ ممکن ہے مولانا کے اظہار بیان میں الفاظ جو کبھی ٹھہر جاتے تھے اس کی وجہ سے سننے اور سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ صوبہ بہار کے بعض پرانے ارکان نے بھی اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے شہادت حق اور خدا کی رضا جوئی کی طلب میں جماعت کی رکنیت قبول کی تھی اور اپنے رب

ہی کی خاطر اور اس وجہ سے کہ کتمان حق کے الزام سے خدا کے حضور شرمندگی اٹھانی نہ پڑے جماعت سے مستعفی ہو گئے۔ لوگ ان کے استعفیٰ کی جو بھی توجیہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے۔ ان کا یہ عمل بھی ایک صاحب عزیمت کا عمل تھا، اسی لئے میرے نزدیک ان کا احترام کم نہیں ہوا بلکہ بڑھ گیا۔ خواہش تو یہی تھی کہ وہ ایسا نہ کرتے۔ ہم لوگ توحید، اس کے تقاضے اور حاکمیت الٰہ کے رشتے پر بحث کرتے رہے لیکن ان کی ذات پر مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر صادق آتا ہے ۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

خیر ڈاکٹر صاحب کے اس رویئے کے بعد ہمارے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کی حیثیت اسی طرح مربی کی باقی رہی۔ پہلے بھی ایک دو باتوں میں اختلاف تھا۔ اب اس میں ایک چیز کا اضافہ ہو گیا لیکن ادب واحترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ ان کا اور ان کے خدا کا معاملہ تھا۔ انھوں نے جس بات کو حق سمجھا اس کی گواہی دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، معاملہ اپنوں سے ہو یا غیروں سے۔ ان کا جذبہ بہت ہی اعلیٰ، ارفع اور نیت بالکل پاک وصاف تھی جس کا اجروہ اللہ کے یہاں پائیں گے۔

ہاں بعض لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے اس فیصلے پر ذرا منفی انداز سے تنقید وتبصرہ شروع کر دیا تھا، لیکن انصاف کی بات وہی ہے جس کا ذکر مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب مرحوم نے حسنین سید صاحب کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ ''ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کے اقدام کے سلسلے میں ساری تفصیلات میرے علم میں ہیں۔ یہ اقدام تو وہ بہت پہلے کر چکے ہوتے مگر کچھ رفیقوں کی گذارشوں کی وجہ سے جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے وہ مزید انتظار کے لئے تیار وآمادہ ہو جاتے رہے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حالات خرابی کی طرف برابر بڑھتے ہی جا رہے ہیں (ان کے جائزے کے مطابق) تو ان کی بے قراری انتہا کو پہنچ گئی اور پھر وہ قدم بھی انہوں نے اٹھا ہی لیا جس کا نہ اٹھانا ان کے بس میں نہ رہ گیا تھا۔ ان کا ضمیر اب بھی خاموشی اختیار کئے رہنے کی اجازت دینے سے انکار کر چکا تھا۔

میری اپنی خواہش اور رائے تو یہی تھی اور ہے کہ وہ یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتے، اندر رہ کر ہی اصلاح حال کی کوشش جاری رکھتے۔ لیکن اب جب کہ یہ قدم وہ اٹھا چکے تو ان کے اس رویئے پر اس طرح کا تبصرہ بھی نہیں کر سکتا جس طرح کا تبصرہ آپ کے گرامی نامے میں درج ہے۔ ضیاء الہدیٰ صاحب جیسے مخلص، خداشناس اور باعمل انسان کے بارے میں یہ گمان نہیں کر سکتا کہ انہوں نے کسی غلط رجحان کے تحت یہ اقدام کر ڈالا یا غور وفکر کا حق ادا کئے بغیر رکنیت چھوڑ بیٹھے'' [1]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جماعت سے علیحدگی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے علی الاعلان جماعت کی مخالفت نہیں کی۔ کوئی ایسا بیان نہیں دیا جس سے جماعت اسلامی کی کردارکشی کرنے والوں کو ایک نیا ہتھکنڈہ مل جائے۔ علیحدگی کے بعد اخبار والوں نے ان سے انٹرویو بھی لیا لیکن اس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت محتاط رہے۔ انہوں نے کوئی منفی کام نہیں کیا۔ علیحدہ ہونے کے بعد اسلامی معاشرہ اور اصلاح معاشرہ کا کام اسی خلوص اور بے لوثی سے کرتے رہے جیسے پہلے کرتے تھے۔ زندگی کی آخری سانس تک افراد سازی اور نوجوانوں کی رہنمائی ان کا اصل وظیفہ رہا۔

ایک مصلح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں تمسک بالکتاب اور اقامت صلوٰۃ [2]۔ یعنی اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامنا اور نماز کا قیام۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی تھیں۔ انھوں نے اسلامی معاشرہ کی جو تحریک اپنے انقلابی تصورات کے تحت شروع کی اس میں یہ دونوں چیزیں نمایاں تھیں۔ ان کے ارد گرد جو لوگ جمع ہوئے ان کے اندر بھی یہ دونوں خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ معلوم

---

[1] ازمکتوب مولانا صدرالدین اصلاحی مرحوم

[2] والذین یمسکون بالکتاب واقاموا الصلوٰۃ انا لا نضیع اجر المصلحین (اعراف ۱۷۰)

ہوا کہ اس تحریک سے وابستگی کا اظہار بھی لوگ قرآن پر ہاتھ رکھ کر کرتے تھے۔ان کا بیعت قرآن ہی سے تھا۔ڈاکٹر صاحب نے جن نوجوانوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کیا ہے اللہ تعالیٰ یقیناً اس کا اجر ان کو اور ان کے نوجوان شاگردوں کو دے گا بشرطیکہ یہ نوجوان اسی بے غرضی و بے نفسی کے ساتھ اس راہ پر گامزن رہیں۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات بعد کے ادوار میں بھی برابر ہوتی رہی۔میں نے کئی دفعہ انہیں توجہ دلائی کہ آپ کے اردگرد ادھر جو نوجوان جمع ہوئے ہیں وہ جماعت اسلامی ہند کے بارے میں اپنی رایوں کے اظہار میں بے احتیاطی اور بے اعتدالی کے شکار ہوجاتے ہیں۔کہیں آپ کی علیحدگی کا ان پر ردعمل تو نہیں ہے۔ان کی تربیت میں اس پر توجہ دینی چاہئے۔مجھے کبھی کبھی اندازہ ہوا کہ مرکز دہلی سے بعض کچے نوجوان ادھوری معلومات کے ساتھ آکر ڈاکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں ملانے کی خاطر غیر تحقیقی باتیں پھیلا دیتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب مرحوم انہیں مخلص سمجھ کر یقین کر لیتے ہیں۔لہذا میں نے اس کی طرف بھی ان کو متوجہ کیا۔ڈاکٹر صاحب شخصیتوں کے بارے میں اپنی رایوں کو پوشیدہ نہ رکھ پاتے تھے۔رفقاء کار کے لئے حد درجہ مخلص تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے سارے تجربات، احساسات، معلومات سب کو منتقل کردیں۔اور بعض لوگ ان کے تجربات و احساسات کے متحمل نہیں ہوتے تھے اور منفی اثرات قبول کر لیتے تھے۔میں نے کئی بار اس بات کی طرف بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کو متوجہ کیا کہ ۔ دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے جب بھی گفتگو ہوئی ان کے انداز میں وہی جانی پہچانی کیفیت جھلکتی تھی، میرے لئے کسی ادا میں اجنبیت نہ تھی۔البتہ زخموں کی جو کائنات ڈاکٹر صاحب کے پاس تھی اس سے اب خون زیادہ رسنے لگا تھا۔کسی نے کہا ۔

عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے خون ہوا دل باغ ہوا پھر درد ہوا پھر غم ہے اب

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے رستے ہوئے خون جگر سے اپنے اردگرد ایک باغ سجا لیا تھا اور وہی ان کی کل کائنات تھی، اس میں وہ مگن رہتے تھے، لیکن درد اور ٹیس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ڈاکٹر صاحب بہت ساری آزمائشوں سے گذرے۔کئی آپریشن ہوئے۔کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔عرصے تک ڈاکٹر صدیقی صاحب کے نرسنگ ہوم میں صاحب فراش رہے۔لیکن ڈاکٹر صاحب کو آزمائشوں سے زیادہ درد و غم اس نصب العین کا تھا ۔ دل پر خوں کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے

یہی شراب الست تھی جو رگ جاں میں خون بن کر رواں دواں تھی اور لہو بن کر زخموں سے ٹپکتی رہتی تھی۔

اس دوران وہ حج بیت اللہ کے لئے بھی گئے۔واپسی پر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔مبارکباد دینے کے بعد پوچھا، اتنا روپیہ کہاں سے لایا ڈاکٹر صاحب؟ آپ تو چھپے لاکھ پتی نکلے۔ہنسنے لگے۔کہا شروع ہی سے میرا معمول تھا کہ وقتاً فوقتاً کچھ رقم ایک جھولے میں ڈال دیتا تھا کہ جب اللہ کو منظور ہوگا تو حج کی سعادت نصیب ہوجائے گی۔گذشتہ سال اندازہ ہوا کہ شاید اتنی رقم جمع ہوگئی ہے کہ حج ادا کرسکوں لیکن دیکھا تو رقم کم تھی، پھر اس سال حج کا اعلان ہوا تو دیکھا کہ اس دفعہ کیا پوزیشن ہے۔حسن اتفاق کہ جتنی رقم کا اعلان ہوا تھا ٹھیک اتنی ہی رقم تھی۔بس فارم بھر کر اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے بھیج دیا اور یہ سعادت نصیب ہوگئی، اللہ تعالےٰ قبول کرے۔میں نے اپنی عادت اور ڈاکٹر صاحب سے بے تکلفی کا جو رشتہ تھا اس کی بنیاد پر قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گیا کہ حج کے تاثرات بیان کیجیے۔ٹال مٹول کرنے لگے۔پھر کہا اسلام کا تربیتی و روحانی نظام پانچ وقت نماز باجماعت کا اہتمام اور قیام جمعہ و عیدین ہے۔لیکن امت کے اندر اقامت صلوٰۃ اور قیام جمعہ میں جو کوتاہی ہے اس کا نظارہ بڑے پیمانے پر حج کے موقع پر ہوجاتا ہے۔پھر کہنے لگے رمی میں جو کیفیت ہوتی ہے اس سے تو مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ کنکریاں شیطان پر مارتے ہیں اور شیطان جیسے قہقہہ لگا رہا ہو۔وہ ریل پیل دھکا مکا ہوتا ہے کہ ایک حاجی کا احرام کھل کر گر گیا اور وہ مادرزاد ننگا ہوگیا۔حکومت کے کارندوں کا رویہ بھی Harassing ہوتا ہے۔حج کے

اندر اسلام کی بین الاقوامی امت کی جو روح ہے وہ بھی مجروح ہو چکی ہے۔ میں نے پوچھا آپ نے کوئی کیفیت کسی مرحلے میں محسوس کی، ٹال گئے۔ بہت سپاٹ انداز میں جواب دیا کہ حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر لیا بس۔ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتی ہے اس وقت ایک کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے پھر کریدا، کوئی واردات قلبی؟ چپ رہے۔ میں سمجھ گیا اس موضوع پر زیادہ بات کرنا نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں اور حاجیوں سے مختلف تھے جو ہر بات پر حج کے واقعات وتاثرات بیان کرتے رہتے ہیں اور یاد دلاتے رہتے ہیں کہ وہ صرف نمازی نہیں حاجی بھی ہیں۔ لہٰذا میں نے بھی زیادہ ڈاکٹر صاحب کو پریشان نہیں کیا۔ آب زمزم کا چند گھونٹ پیا اور چلا آیا۔

انتقال سے چند دن پہلے ڈاکٹر صاحب نے ایک خط مجھے لکھا تھا جس میں چند اشعار بھی تھے۔

کہاں یہ دعویٰ تھا حالات کچھ بھی ہوں لیکن ہمیں ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ
کٹھن ہے توڑنا دیرینہ بت رفاقت کا کہوں میں تنہا اذاں لا الہ الا اللہ

آخر وقت میں ڈاکٹر صاحب کے اندر ایک احساس تنہائی جنم لے رہا تھا۔ ابتدا میں شاید ان کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہوا ہوگا کہ تحریک کا برپا کرنا اور اس کے لئے کاروان حق کے ایک گروہ کا رواں دواں ہو جانا آسان نہیں ہے۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سید احمد شہیدؒ کے بعد ایک کوشش محدود پیمانے پر امارت شرعیہ کے قیام کی ہوئی، لیکن وہ بھی بہار اور اڑیسہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مولانا ابو الکلام آزادؒ نے بھی شرعی نظام، سمع وطاعت اور حزب اسلامی کے نام سے اس بھاری پتھر کو اٹھانا چاہا لیکن پھر چوم کر چھوڑ دیا۔ جماعت اسلامی سے نکل کر کئی بزرگ اور محترم شخصیتوں نے اپنے انداز سے کوششیں کیں لیکن حلقہ ارادت، مجلس تدبر قرآن، اسلامی سنٹر سے زیادہ آگے بات نہ بڑھ سکی۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بات ہم لوگ سمجھا نہ سکے۔ شفیع مونس صاحب بھی نہ سمجھا سکے۔ پھر ہم لوگ کیا سمجھا سکتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی کے مرکزی ذمہ داروں نے اپنی حد تک ڈاکٹر صاحب کو ساتھ رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جناب احمد علی اختر صاحب کو امیر حلقہ کی حیثیت سے مقرر کرنے میں یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ بہار کے امیر حلقہ کی تقرری ایسے شخص کی ہونی چاہئے جس پر ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کو پوری طرح اعتماد ہو۔ میں اس وقت مرکز میں موجود تھا جس وقت یہ فیصلہ محترم امیر جماعت مولانا سراج الحسن صاحب، مولانا شفیع مونس صاحب اور محمد جعفر صاحب کی موجودگی میں ہو رہا تھا۔ بہر حال یہ بھی سچ ہے کہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کے اس آخری خط کے ملنے کے بعد دوسرے ہی دن انتقال کی خبر بھی ملی۔ کچھ دنوں کے بعد پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا تو محلہ عالم گنج گیا۔ آج اس گلی میں سناٹا تھا جہاں کبھی چہل پہل رہتی تھی۔ اور جاڑے کی دھوپ میں ڈاکٹر صاحب باہر نکل کر ہاتھ میں تسبیح لئے اسی کوچے میں ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ اور گذرنے والا ایک نظر اس نورانی چہرے پر ڈالتا ہوا، روحانی تقویت محسوس کرتا ہوا گذر جاتا تھا۔ ایک رفیق جماعت نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی قبر تک میری رہنمائی کی۔ ہرے بھرے ایک درخت کے نیچے تھوڑی بلندی پر ڈاکٹر صاحب کی قبر ہے، وہاں پہنچ کر فاتحہ پڑھی اور سوچتا رہا بڑے لوگ اور بھی ہیں لیکن بہت کم آدمی عمر بھر بڑے رہتے ہیں، بعض آدمیوں کی زندگی میں بڑائی کے چند دن آتے ہیں، بعض عمر کے کسی حصے میں بڑے ہوتے ہیں اور بقیہ عمر اس بلندی سے اترنے والی سیڑھیوں کے گننے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم تمام عمر بڑے رہے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے وہی معاملہ کرے گا جس کا وعدہ اس نے محسنین سے کیا ہے۔ بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

ڈاکٹر حسن رضا صاحب، رکن مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند، صدر شعبہ اردو ایس۔ ایس میموریل کالج، رانچی اور صاحب قلم ہیں۔ آپ نوجوانی کے زمانہ ہی سے ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ کے قریب رہے اور ان کی رہنمائی میں قائم حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے تاسیسی رکن رہے۔ (قیام: رانچی)

یادوں کی برات

ڈاکٹر احسن ظفر اللہ

یادوں کی ایک برات ہے، خوشبوؤں کا ایک طوفان ہے، آنسوؤں کی برسات ہے۔ آیئے کچھ دیر بیٹھ جایئے اور بھولی بسری چند کہانیاں سن لیجئے۔ کل شاید سنانے والے بھی نہ رہیں اور سننے والے بھی نہ رہیں۔ جو اہل علم ہوتے ہیں ان کے علمی کارنامے ان کی یاد دلاتے ہیں اور جو اہل ارادت ہوتے ہیں ان کے اہل سلسلہ ان کا ذکر واذکار کرتے رہتے ہیں۔ مگر اندھیروں میں چراغ جلانے والوں کو کون یاد کرتا ہے۔ نہ اندھیروں کا راج ختم ہوا کہ مورخ اس کو بیان کرے، نہ تاریکیٔ شب کو چیر کر کوئی سحر نمودار ہوئی کہ آنکھوں والے اسے دیکھ سکیں، مگر ہاں ایک وہ جو نور السمٰوات والارض ہے وہ ضرور قدرداں ہوتا ہے، وہ تو رب مشکور ہے۔ وہ جن کے دلوں میں اخلاص کا نور عطا فرماتا ہے ان کے اعمال میں بھی قبولیت کا نور عطا فرماتا ہے، ان کی زندگی سراپا نور ہوتی ہے۔ کسی کو نظر آئے یا نہ نظر آئے۔ آنکھیں اگر بینا نہ ہوں کیا نظر آئے۔

فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التى فى الصدور۔ ومن لم يجعل الله له نوراً فما له من نور۔

تو ایک نور ڈاکٹر صاحبؒ کو بھی عطا ہوا تھا، ہر کسی کو نہیں ملا کرتا۔ فرمایا ہے اقبال علیہ الرحمۃ نے:؎

نہ ہر کس از محبت مایہ داراست — نہ با ہر کس محبت ساز گاراست
بروید لالہ با داغ جگر تاب — دل لعل بدخشاں بے شراراست

ہم آپ کیا کر سکتے ہیں، ہاں آیئے دعا کریں کہ وہ نور ہمیں بھی عطا ہو، اخلاص ہمیں بھی نصیب ہو، وہ محبت ہم کو بھی مل جائے، وہ جگر کے داغ ہمارا بھی مقدر ہوں اور ان کے جیسے اعمال صالح کی کچھ توفیق ہمیں بھی دے دی جائے۔

بچپن کی یادیں اب دھندلی ہوتی جاتی ہیں۔ ہم لوگ گردنی باغ کے ۱۹ نمبر روڈ میں رہتے تھے۔

بغل میں گردنی باغ کی مسجد تھی۔ ہر اتوار کو ظہر کی نماز کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ کا درس قرآن ہوتا۔ بیچارے عالم گنج سے سائیکل پر گردنی باغ آتے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم لوگوں کے ساتھ کھاتے۔ نماز کے بعد درس اور درس کے بعد واپسی۔ ہم تینوں کے لئے لیمن چوس ضرور لاتے۔ جو بچے ان کی گود میں کھیلتے ان کے بچوں کی بھی اب شادیاں ہوگئیں مگر یادوں کی مٹھاس باقی ہے۔ تو ظہر کے بعد گردنی باغ میں، عصر کے بعد اسٹیشن کی مسجد میں، مغرب کے بعد انجمن اسلامیہ ہال یا مراد پور کی مسجد میں اور عشاء کے بعد پچھّم دروازہ میں جماعت کا ہفتہ وار اجتماع، اور خدا جانے کتنی رات گئے واپس عالم گنج پہنچتے ہوں گے۔ سر پر ٹوپی، لمبی قمیص، خالتہ پائجامہ جس کے پائنچے میں سائکل کی سواری کے لئے کلپ لگایا کرتے تھے۔ (اب تو وہ کلپ شاید بازار میں بھی نہیں ملتی) مسکراتا ہوا چہرہ۔ چہرے کی مسکراہٹ ذہن کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ کسی محفل میں ایسا نہیں ہوا کہ نظریں ان سے ٹکرائی ہوں اور ان کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آئی ہو۔ یہ ایک دل جیتنے والی مسکراہٹ تھی۔ دلوں کو موہ لینے والی، اخلاص کا نور بکھیر دینے والی۔

'مغرب' میں جو میں آیا تو دیکھا کہ یہاں تو ہر شخص ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتا ہے، کسی سے تذکرہ بھی کیا کہ یہاں تو ہر شخص ڈاکٹر صاحب بنا ہوا ہے۔ مگر جب غور کیا تو پتہ چلا کہ یہاں تو بس ایک تصنع ہی تصنع ہے۔ نہ اخلاص کا کوئی نور ہے۔ نہ محبت کی کوئی بنیاد ہے۔ نہ دل کو کوئی موہتا ہے نہ موہنا چاہتا ہے۔ اس مسکراہٹ میں تو وہ سفاکی ہوتی ہے جو کسی قاتل کو زیب دیتی ہے، ایسا نفاق ہوتا

ہے جواصحاب اسفل السافلین ہی کے لئے موزوں ہوتا ہے۔وہ تو مسکراہٹوں کے ساتھ لیمن چوس بھی بانٹتے رہے۔ریاض کے قیام کے دوران درس قرآن کی محفلوں میں جاتا تو اصحاب خانہ کے بچوں کو دیکھ کر خیال ہوتا کہ یہ بچے مجھے کیا یاد رکھیں گے۔ میں بخیل تو کبھی ان کے بچوں کے لئے کچھ نہیں لے گیا۔انہیں دنیا بہت کم عطا ہوئی تھی کہ درجات انہیں عقبیٰ میں ملنے والے تھے،اور یہاں دنیا کی دنیا ملی ہے خدا جانے عقبیٰ کا کیا حال ہوگا،مگر انہیں دل عطا ہوا تھا یہاں دل ہی نہیں ہے۔

یہ اجتماعات بہت کامیاب اجتماعات نہ تھے۔چند ہی لوگ سننے کو آتے اور جو آتے پھر چلے جاتے،کم ہی ساتھ چلنے کو تیار ہوتے۔معاملہ یہاں تک پہنچا کہ یہ محفلیں بند ہوتی چلی گئیں۔گردنی باغ میں تو ہم لوگوں کے محلّہ چھوڑنے سے قبل ہی بند ہو گیا تھا۔پھر اسٹیشن کی مسجد کا پروگرام بند ہوا۔مراد پور کی مسجد کا پروگرام ایمرجنسی تک چلتا رہا۔پھر ہم ہی شہر سے نکل آئے۔شہر سے کیا ملک ہی سے نکل آئے۔کوئی خبر احوال کی نہ رہی۔عالم گنج کی مسجد میں جب تک حیات رہی پروگرام چلتا رہا۔ یادش بخیر ۸۲ء یا ۸۳ء۔

جب میں میڈیکل کا طالب علم تھا تو ماسٹر شمیم صاحب مجھے رمنہ روڈ کے اجتماع میں لے گئے۔اجتماع جس ہال میں ہوتا تھا اس میں ان دنوں روشنی نہیں ہوتی تھی۔شاید لائن کاٹ دی گئی تھی۔ہم دونوں مغرب بعد دیر سے پہنچتے اور پیچھے کونے میں جا کر بیٹھ جاتے۔ڈاکٹر صاحب ایک موم بتی کی روشنی میں قرآن سامنے رکھ کر درس دیتے۔درس کے بعد میں چند تیکھے سوال واعتراضات کرتا۔وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیتے۔کبھی لہجے میں تیزی نہیں آئی۔ایسا بھی ہوا کہ فرمایا، میں نہیں جانتا ہوں۔کوئی اور صاحب اگر جانتے ہوں تو بتا دیں۔اس زمانے میں، اللہ مغفرت فرمائے انیس الدین صاحب بھی شریک محفل ہوتے بلکہ صدر محفل ہوتے۔ان سے درخواست کرتے کہ اگر آپ جانتے ہوں تو جواب دیں۔یاد آتا ہے کہ ایک بار یقتلون النبیین بغیر حق کی تفسیر بیان کی تو میں نے سوال کیا کہ مدینہ میں اس دور میں موجود یہود پر یہ الزام کیوں عائد کیا جاتا ہے جب کہ آخری نبی کو قتل ہوئے چھ سو سے زیادہ سال گزر چکے تھے۔جواب دینے سے قبل فرمایا کہ اس مضمون کو دانستہ اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ دیکھوں لوگ کان کھول کر بات سنتے ہیں یا نہیں،اور پھر تفصیلی جواب دیا۔ایک روز ولله علی الناس حج البیت پر سوال کیا کہ ہر رکن کی فرضیت کے لئے مختلف الفاظ کیوں استعمال کئے گئے ہیں۔بڑی سادگی سے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں،پھر انیس صاحب غفراللہ لہ سے درخواست کی اور انہوں نے جواب دیا۔چار پانچ ہفتے اندھیرے میں گزر گئے۔درس کے بعد ہم لوگ بغیر کسی سے ملے چپکے سے اٹھ کر چلے آتے۔اجتماع کی کارروائی چلتی رہتی۔آخر جب ایک ہفتے میں بجلی آ گئی اور ہم دونوں حسب معمول چپکے سے پیچھے میں جا کر بیٹھ گئے اور کان لگا کر درس سننے لگے تو درس کے بعد حسب معمول میں نے ایک سوال جڑ دیا۔بے ساختہ بول اٹھے،اچھا تو یہ تم تھے۔بڑی شفقت فرماتے تھے مجھ پر۔مجھ پر کیا خصوصیت تھی،ہر ایک پر۔ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے سب سے قریب میں ہوں۔حلقہ طلبہ کیا تھا سب ان کے بیٹے بھتیجے تھے۔بچپن سے تو ہم انہیں چچا کہتے تھے مگر اب دوسروں کی ''ہسکا ہسکی'' میں ڈاکٹر صاحب کہنے لگے،گرچہ جب گفتگو ہوتی تو انہیں چچا کہہ کر ہی مخاطب کرتے۔کیا دور تھا کیا زمانہ تھا جوان کے ساتھ گزر گیا۔جہان آباد کے اجتماع میں شرکت،میری تربیتی اجتماع میں پہلی شرکت تھی۔شروع سے آخر تک محفل میں بغیر ٹیک لگائے بیٹھتے اور مسکراتے رہتے۔وقفوں میں سوالات کے جوابات دیتے رہتے۔ہر پروگرام کے دوران حسب ضرورت ایک ایک دو دو جملے بولتے رہتے۔گیا کا اجتماع تو شاید آپ کو بھی یاد ہو۔دن بھر کا پروگرام،پھر تراویح اور پھر تہجد۔جوانوں کے تو چھکے چھوٹ گئے مگر ان کے چہرے کی مسکراہٹ نہ گئی۔ہم لوگوں نے مسافرت کا عذر کیا۔قصر میں نوافل کی حیثیت پر سوالات کئے۔آٹھ رکعت تراویح پر احادیث پیش کیں مگر وہ تو ایک چٹان تھے۔مسکراتی ہوئی چٹان۔عزیمت کا ایک ایسا چٹان جو عذر و معذرت کی گرد سے بہت بلند ہو۔پھر کوٹھی کا اجتماع ہوا۔ڈاکٹر

صاحب امیر حلقہ ہو گئے تھے اور اس کی مصروفیات تھیں۔ایک اور صاحب بحیثیت مربی تشریف لے گئے۔علم وفضل کا انکار نہیں مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ہم نے تو یہ مانا کہ تربیتی اجتماع ہوا مگر تربیت نہیں ہوئی۔

تربیت کیا ہے؟ تربیت کیسے ہوتی ہے؟ کس چیز کی ہوتی ہے؟ پتھر کو ہیرا کیوں کر بنا دیتی ہے؟ سوالات اتنے بڑے ہیں کہ عمر عزیز کا ایک حصہ اسی پر لگا دیا مگر آج تک اس کا واضح جواب نہ ملا۔تصوف اور اہل تصوف کا مطالعہ کیا۔سیرت طیبہ کی کتابوں میں اس کا جواب تلاش کیا۔جنہیں مربی اور مزکی سمجھا ان سے پوچھا۔ہمارے یہاں تربیت کے موضوع پر جو لکھا گیا ہے اس کا بغور مطالعہ کیا مگر سوال اب تک لاینحل ہے۔خیر تو ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ بھی تربیت فرماتے تھے۔اگر چہ کوئی خانقاہ نہ تھی،کوئی مدرسہ نہ تھا،کوئی کیمپ نہ تھا مگر تربیت ضرور تھی اور اس تربیت کا اہم ترین جزو خود ان کی ذات تھی۔کیا خوب کہا ہے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہ ؎

اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

تو وہ لاریب شعیب زماں تھے۔اگر چہ دعویٰ نہ تھا۔دعویٰ تو کسی چیز کا نہ تھا،مگر ایک گر آتا تھا شبان کو کلیم بنا دینے کا،جس کا پہلا جزو تو ان کی دل موہ لینے والی شخصیت تھی کہ جوان کے پاس آتا چپک کر رہ جاتا بقول اقبالؒ ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

اس جاذب پیر مغاں کی دوسری بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دوسروں کو اہم بنا دیتے تھے اور خود ''غیر اہم'' رہتے تھے۔جب بھی ان کی محفل سے اٹھے تو احساس ہوا کہ ہم عظیم ہیں۔یہ واقعتاً ان کی عظمت تھی۔ہم جو ہیں وہ تو معلوم ہے۔نہ علم،نہ فضل،نہ کمال۔آخر کاہے کی عظمت تھی جس کا احساس ہوتا تھا۔اب یہ خیال آتا ہے کہ اس عظیم شخصیت کا اثر تھا جو ذہنوں میں اجالا کر دیتا تھا۔وہ فکر کو مہمیز کرتا۔اس کے ساتھ رہ کر کمتری کا احساس ذہن سے نکل جاتا تھا۔آگے بڑھنے کا ایک شوق،ایک ولولہ دلوں کے اندر پیدا ہوتا تھا۔عزیمت کے ایسے بلند پہاڑ وہ تھے کہ ان کے دامن میں آ کر مستقبل کے موہوم اندیشے یکسر ختم ہو جاتے تھے۔ایک عظمت تو وہ ہوتی ہے کہ آپ کسی سے ملیں تو احساس ہو کہ آپ ایک عظیم ہستی سے مل کر آ رہے ہیں لیکن اس سے زیادہ عظیم وہ شخص ہوتا ہے جس سے مل کر خود میں عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ کبھی اگر ایسی نوبت آئی کہ کسی کی اصلاح کے لئے گر کچھ کہتے تو بڑے نرم لہجے میں مسکراتے ہوئے مزاحاً کہہ جاتے،کہ ولو کنت فظا غلیظ القلب کا وہ ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ہم نے اوروں کو بھی دیکھا ہے۔اوروں کو تو کیا خود کو دیکھتا ہوں کہ عمر جو ڈھلی ہے تو غصے پر قابو نہیں رہتا۔سخت سست باتیں ادنیٰ سے اشتعال پر کہہ جاتا ہوں،اور لوگ ذرا دور دور ''پھر کے پھر کے'' رہتے ہیں کہ کہیں بے بھاؤ کی سنی نہ پڑ جائے۔تو دو کان میں دینے کو تو بہت دیکھا کہ بہت کچھ ہے؟ مگر پہرے پر ایک شیر بھی بٹھا رکھا ہے اور رعب داب ایسا ہے کہ کوئی قریب نہیں پھٹکتا۔مگر وہ ایسے نہ تھے۔ہم نے کبھی ان کا رعب محسوس نہ کیا۔ایک درجہ میں بے تکلفی سی تھی،گر چہ وہ میرے والد رحمۃ اللہ کے ہم عمر یا شاید ان سے بھی بڑے تھے مگر ہم سے بھی بے تکلفی سے گفتگو کرتے۔ہم سے تو کیا ہم نے تو گود کے بچوں کو ان سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا ہے۔وہ سب کے برابر کے تھے اور سب کے ساتھ برابری سے رہتے۔ہر کس و ناکس اپنے دل کی بات ان سے کہہ سکتا تھا۔

گفتگو میں بڑی سادگی تھی۔علمیت کا غلبہ نہ تھا۔یوں بھی وہ علمی شخصیت نہیں رکھتے تھے۔کتابیں اتنی نہیں پڑھتے تھے۔جتنا غور و فکر کرتے۔گر چہ غور و فکر سطحی نہیں ہوتا بلکہ اس میں بڑی گہرائی اور گیرائی ہوتی۔چنانچہ جب باتیں کرنے والے،پوچھنے والے کوئی سوال پوچھتے تو فلاں نے یہ فرمایا ہے اور فلاں کا یہ قول ہے اور فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے کبھی سننے کو نہیں ملتا بلکہ سامع کے معیار سے ایک

مختصر بات کہہ دیتے۔ کبھی کبھی تفصیلی جواب بھی سننے کو مل جاتا مگر اس میں بھی قال اقول کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ تشنگی بجھ جاتی، شرح صدر ہو جاتا۔

شرح صدر پر ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک آیت پر ایک اشکال دل میں پیدا ہوا۔ بہت غور و خوض کیا، تفاسیر دیکھیں۔ احباب کے سامنے مختلف طور پر مسئلہ پیش کیا مگر کسی کے جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔ شیطان کا کام تو وسوسہ اندازی ہے۔ چنانچہ وہ اشکال ایک وسوسہ کی شکل اختیار کر گیا۔ کم وبیش بارہ سالوں تک میں اس میں مبتلا رہا۔ ایک بار آخر ہمت کر کے ڈاکٹر صاحب کے سامنے اس مسئلے کو شرح وبسط کے ساتھ رکھ دیا۔ گرچہ امید نہ تھی کہ جواب ملے گا۔ ایک بار قبل بھی میں اس کرب سے گزر چکا تھا۔ ریاض میں درس قرآن دیتے دیتے سورہ مائدہ کی اس آیت کی جب باری آنے کو تھی تو اپنے ایک بزرگ اور استاد سے درخواست کی کہ میری جگہ پر درس دیدیں۔ انہوں نے پوچھا کیوں؟ عرض کیا کہ کچھ اشکال ہے۔ فرمانے لگے تو اس میں کیا مشکل ہے۔ آپ کے اشکال میں حل کئے دیتا ہوں اور آپ جا کر درس دے آئیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اپنا وسوسہ ان کے سامنے بیان کر دیا۔ سوال انہوں نے سن لیا تو کچھ دیر خاموشی رہی، پھر فرمایا اچھا غور کروں گا۔ ٹھیک ہے آپ فکر نہ کریں میں درس دے دوں گا۔ خیر بلا ٹلی۔ ایک دو دنوں کے بعد ایک تیسرے صاحب کا فون آیا کہ فلاں صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کے حلقے میں فلاں رکوع کا درس دے آؤں، شاید آپ کو اس میں کچھ اشکال ہے۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ جناب عالی اشکال تو ہے مگر آپ پہلے درس دے آئیں ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں آپ بھی مبتلا نہ ہو جائیں۔ خیر وہ مان گئے اور میری جان چھوٹی۔ آمدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت۔ تو ڈرتے ڈرتے ایک بار وہی اشکال ان کے سامنے بھی پیش کر دیا۔ ساری باتیں کان لگا کر سنتے رہے جیسی ان کی عادت تھی اور پھر مسکرا کر کہا کہ وہ آیت پھر سے پڑھو۔ چنانچہ پھر سے پڑھی تو فرمایا کہ دیکھو اس میں یہ بھی تو ہے۔ بارہ برس تک جس آیت کو ''گھونستے'' رہے ایسا لگا کہ پہلی بار پڑھی ہے۔ آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے۔ لمحے بھر کو میں خاموش ہو گیا اور اس کے بعد احساس ہوا کہ شرح صدر کسے کہتے ہیں۔ تصوف کی کتابوں میں بار بار پڑھا تھا کہ بزرگوں کی صحبت میں شرح صدر ملتا ہے۔ ذاتی تجربہ پہلی بار ہوا۔ اس واقعہ کے بعد بار بار خواہش ہوئی کہ ریاض سے روانگی سے قبل ان آیات کی تفسیر کر دوں مگر اس کا موقع نہ آیا اور اب تو خیر وہ محفل ہی نہ رہی کیا رونا رو دیئے۔

یہ تو وہ موقع تھا کہ واضح جواب مل گیا۔ مگر چند ایک بار جواب نہیں بھی ملا مگر دل میں ایک خلش سی جو ہوتی ہے وہ ختم ہو گئی۔ کیا ضروری ہے کہ سب کچھ ہم سمجھ ہی جائیں۔ کون بندہ ایسا ہے جو مولیٰ کے کلام کو مکمل طور پر سمجھنے کا دعویٰ کرے۔ ہاں مگر اس پر ایمان رہے ، ہدایت ملتی رہے اور ضلالت اور گمرہی سے حفاظت رہے، تو ان کے پاس ایمان و یقین بہت مضبوط تھا، علم ممکن ہے کم رہا ہو۔ علامہ تو بہت ملتے ہیں اہل ایمان مگر کہاں ملتے ہیں۔

ایک بار ایسے ہی ایک سوال پوچھا تو جواب نے دنگ کر دیا۔ میرے پاس ۳۲ تفاسیر ہیں اور سب میں اس آیت کا مطالعہ کر چکا تھا۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ کون سی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں؟ بڑی سادگی سے فرمایا کہ میں کسی تفسیر کا مطالعہ نہیں کرتا ہوں بہت قبل تفسیر کبیر (امام رازی کی) اس غرض سے دیکھی تھی تا کہ معلوم ہو کہ تفسیر کیسے لکھی جاتی ہے پھر چھوڑ دی۔ کیوں کہ ایک بار کوئی تفسیر دیکھ لی جائے تو پھر ذہن اسی لائن پر سوچنے لگتا ہے۔ آزادیٔ فکر ختم ہو جاتی ہے۔ میں قرآن پر تدبر کرتا ہوں۔ تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ افلا یتدبرون القرآن کے معنی یہ نہیں ہوتے ہیں کہ تم 'تدبر قرآن' کیوں نہیں پڑھتے۔

قرآن کے بہت سے مضامین پر انہوں نے جو فرمایا تھا، خدا جانے ان کو کبھی کوئی جمع کرے گا یا نہیں، کسی کو توفیق ہوگی یا نہیں۔ ان کی فکر سے اتفاق بھی ضروری نہیں۔ ان کے ذہن کا افق بہت وسیع تھا اور وہ اسی وسعت کے ساتھ سوچتے تھے۔ ایک عام

سائنس داں یا ایک عالم کے خیال میں اتنی وسعت نہیں ہوتی، اتنی ممکنات بھی نہیں ہوتیں، عقائد میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہوتی، کس میں اتنا دم خم ہے کہ کہہ سکے کہ انسان موت پر قابو پالے گا، مردوں کو زندہ کردے گا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے تو حیرت ہوتی تھی کہ ایسی باتیں کہنے کی جرأت کیسے کر جاتے ہیں۔ خوش قسمت تھے کہ کفر کے فتوے نہ لگے۔ شاید اگر لکھتے تو لگ ہی جاتے۔

ایک مدت تک تو ہم لوگ ان کی تفسیر سنتے رہے۔ اس وقت تک مطالعہ بھی نہیں تھا۔ کتابیں بھی میسر نہ تھیں۔ صحیح و غلط کی ایسی تمیز بھی نہ تھی، تو جو کچھ وہ فرماتے ہمارے نزدیک سب مستند ہوتا اور ہم لوگ سب کچھ پر آمنا و صدقنا کہتے۔ کسی دوسرے اہل علم سے نہ پالا پڑا نہ کسی کی ان کے فرمودات پر تنقید سنی اس لئے سب کچھ چلتا رہا۔ ایک مختصر سی معجم ان کے پاس تھی مگر وہ یقیناً نا قابل اعتبار حد تک غیر مکمل رہی ہوگی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے فواد عبد الباقی کا اور انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے کہ ایک جامع معجم المفہرس لالفاظ القرآن مکمل کردی۔ چودہ سو سالوں میں ایسا کام نہیں ہوا۔ خیر تو جب وہ کتاب آ گئی تو ہر کس و نا کس کچھ فرمانے لگا۔ اس زمانے میں غالباً رفیق میں ان کا ایک مضمون آیا تھا جسے شاید ملفوظ کہنا زیادہ مناسب ہو۔ حقیقت حال تو شاید مولینا محمود عالم صاحب [1] ہی کو معلوم ہو۔ خیر تو اگلی اشاعت میں اس پر فلاح یا اصلاح کے کسی طالب علم نے اعتراضات کیے اور دلیل میں کچھ آیات پیش کیں۔ بعد میں انہوں نے اس کا اپنی عادت کے مطابق دو جملوں میں جواب دے دیا۔ میری حاضری ان دنوں میں ہوئی تو عرض کیا کہ مناسب ہو کہ اس سلسلے میں معجم پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ پہلی بار انہوں نے فرمائش کی اور الحمدللہ سعادت حاصل ہوئی۔

وہ کوئی فراہی وقت تو نہ تھے، علمی مقام کا تو کوئی دعویٰ ہی نہ تھا، ہاں فکر کرتے رہتے تھے۔ شاید ان کے تربیت یافتہ لوگوں میں سے کسی کو ان کے ملفوظات کو یکجا کرنے کی سعادت ہو اور پھر کوئی علمی تنقیح کرے، دیکھئے کسے توفیق ہوتی ہے۔ خیر وہ تو ہو نہ ہو مگر جوان کے شاگردان تھے، مریدان تھے، شائقین تھے، سامعین تھے ان کے اندر ایک جذبہ قرآن کو سمجھنے اور اس پر غور و فکر کرنے کا پیدا ہو جاتا۔

آج مجھے جو کسی درجے میں قرآن سے تعلق ہے تو اس میں ایک تو ہاتھ ابا جان کا ہے کہ پکڑ کر حافظ بنوا دیا اور ایک ڈاکٹر صاحب کا ہے کہ قرآن فہمی کا شوق دل میں پیدا کر دیا۔ اللہ دونوں کی مغفرت فرمائے اور دونوں کے درجات بلند فرمائے۔ ریاض کے قیام کے دوران جتنے اشکالات ہوتے اسے ذہن میں جمع کئے رہتا اور پٹنہ میں جب حاضری ہوتی تو وہ سارے سوالات ان کے سامنے رکھتا جاتا۔ بڑی توجہ سے سوالات سنتے اور بڑی شفقت کے ساتھ جوابات سمجھاتے۔ درمیان میں ان کا کوئی مریض آ جاتا، یا کوئی دوسرے صاحب ملنے کے لئے آ جاتے تو کچھ مجھ پر گراں ہوتا کچھ ان پر جبر ہوتا، پھر وہ کوئی اور وقت دے دیتے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ آخر کے دور میں کہ جب بھی خبر کر کے جانا ہوا یا مقررہ وقت پر پہنچا تو کوئی نہ کوئی صاحب پہلے سے موجود ہوتے، کبھی کبھی ایک سے زیادہ بھی۔ مجھے دوسروں کے سامنے جھجھک ہوتی تو ایک بار بغیر کسی تعارف کے فرمایا کہ ان لوگوں کو سننے کے لئے بلایا ہے۔ تم پوچھو جو پوچھنا ہو۔ یہ سلسلہ آخری ملاقات تک چلتا رہا۔ پچھلے سال دسمبر میں حاضری ہوئی۔ صورت بہیں حالت میپرس کا عالم تھا۔ غایت درجہ نقاہت تھی۔ میری خاطر بیٹھ گئے۔ میں نے لاکھ چاہا مگر وہ لیٹنے کو تیار نہیں ہوئے۔ ریاض کے احباب کی، خصوصاً برادرم جاوید صاحب [2] کی خیریت پوچھی۔ میں نے دعاؤں کی درخواست کی تو فرمایا دعا تو کرتے ہی رہتے ہیں اللہ تعالیٰ خیر فرمائے۔ پہلی بار احساس ہوا کہ نقاہت کی وجہ سے بیٹھنا میرا ناگوار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اجازت لی۔ فرمانے لگے پھر کسی دن آؤ تو اطمینان سے باتیں ہوں گی مگر جمعہ کے دن آنا۔ اٹھ آیا دل پر ایک بوجھ تھا۔ احساس تھا کہ ایک چراغ سحر ہے جو بجھا چاہتا ہے۔ ہفتے کے بعد پھر حاضری ہوئی۔ چہرے پر بشاشت آ گئی تھی۔ تا دیر گفتگو ہوتی رہی۔ احوال عالم پوچھتے رہے۔ میں نے خلاصہ بیان کر دیا۔ عرض کیا کہ عنقریب شاید دس پندرہ سالوں میں مسلمانوں کو کسی عالمی ابتلائے عظیم سے گزرنا پڑے۔ فرمانے لگے کہ تم دس پندرہ سالوں کو کہتے ہو میں نے تو حساب کیا ہے تو تین چار سالوں کے اندر ہی

ہونے جا رہا ہے۔ میں نے چونک کر سوال کیا کہ حساب آخر آپ نے کیسے کیا تو قرآن کی آیات کے حوالے دیئے۔ میں نے امام مہدی کے سلسلے میں جو احادیث پر اعتراضات ہیں ان کا دبی زبان سے ذکر کیا۔ فرمانے لگے ان سب کو رہنے دو مگر یہ ہونے جا رہا ہے۔ بڑے شرح صدر کے ساتھ اور بڑے حتمی انداز میں یہ بات کہی۔ میں نے بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور دعا کی درخواست کی کہ اس وقت ہم لوگ حق کے ساتھ ہوں۔ بڑے جزم سے انشاء اللہ فرمایا۔ پھر اذکار پر گفتگو ہوتی رہی، میں کچھ اشکالات پیش کرتا رہا وہ جوابات دیتے رہے، اسی ضمن میں ایک کتاب کا تذکرہ آیا۔ انہوں نے فرمائش کی، (بعد میں وہ کتاب پاکستان سے نیوزی لینڈ اور نیوزی لینڈ سے ہندوستان گئی) اسی سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ نانا ان کے بڑے عالم اور عامل تھے اور گھر میں کتابیں رہتی تھیں۔ ایک دن ان کی والدہ نے کوئی دعا یا کوئی عمل کیا تو اس کے نتیجے میں دیوار کے اس پار کی چیزیں نظر آنے لگیں۔ بہت گھبرائیں اور ان پر ایک وحشت طاری ہوگئی۔ ان کے والد کو خبر ہوئی تو کچھ دوسرا عمل اس کے توڑ کا کیا۔ پھر فرمانے لگے ایک صاحب کا نام لے کر، اب مجھے یاد نہیں ہے، پٹنہ سیٹی کے کسی خانقاہ سے تعلق تھا، کہ ان سے تذکرہ کیا تو فرمانے لگے کہ میں نے بھی عمل کیا تو میرے سامنے سے بھی دیوار ہٹ گئی۔ کچھ دنوں تک وحشت رہی مگر جب اس پر قابو پالیا تو پھر اس عمل کو مزید کیا یہاں تک دیواریں ہٹتی چلی گئیں اور جیسے یہاں سے (ان کے گھر سے) گنگا تک نظر آنے لگا۔ بعد میں یہ مصیبت لگنے لگا تو اب اس سے چھٹکارے کی فکر ہوئی تو کسی نے صلاح دی کہ گالی بکا کرو۔ چنانچہ ایک مدت تک گالی بکا کیے تو نجات ملی۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے دونوں میں سے کسی سے پوچھا نہیں کہ وہ عمل کیا تھا، جواب نفی میں ملا۔ انہیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ انہیں دوسری چیز عطا ہوئی تھی جس کی دعا اقبال علیہ الرحمۃ نے کی ہے ۔

یارب درون سینہ دل باخبر بدہ　　　در بادہ نشہ رانگرم آں نظر بدہ

اور یہ چیز اصلاح قلب اور عفت نگاہ کے بغیر نہیں ملتی اور اس پر بھی ایک طویل دوام چاہئے۔ فارسی کا ایک شعر کہیں سنا ہے صحیح طریقے سے یاد بھی نہیں ہے خیر سن لیجئے

صوفی نہ شود صافی تا در نہ بکشد جامے　　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

تو انہوں نے ایک لمبا سفر طے کیا تھا اور منزل آخر سے بہت دور نہ تھے۔ خیر تو آخری محفل کا تذکرہ تھا، حسب معمول کوئی اور صاحب آ گئے، شمع کے پروانے بہت تھے، عیادت کرنے والے، خیریت پوچھنے والے، علاج کروانے والے، اصلاح کروانے والے، غرض طرح طرح کے لوگ تھے اور ہماری خواہش تھی کہ ہم ہوں اور وہ ہوں اور قرآنی نکات بیان ہوتے ہوں۔ کوئی ناشناس آجاتا تو انہیں بھی بولنے میں تکلف ہوتا اور مجھے بھی انقباض ہوتا۔ دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہی انہوں نے بھی دعا کے لئے کہا۔ دعا کرتے رہو گے اب چل چلاؤ ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ کچھ یہی الفاظ تھے یا اس جیسے ہی الفاظ تھے۔ چند لمحوں کیلئے ان کے سینے سے لگ گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چہرے کو پھیر کر نکل آئے۔ ابن انشاء نے ایک نظم لکھی ہے، چند اشعار یاد آتے ہیں

اس شام وہ رخصت کا سماں یاد رہے گا　　　وہ شہر وہ کوچہ وہ مکاں یاد رہے گا

ہم شوق کے شعلے کی لپک بھول بھی جائیں　　　اس شمع فسردہ کا دھواں یاد رہے گا

تو شمع آخر شب کو پہنچ رہی تھی اور بجھا چاہتی تھی۔ ایک زندگی پروانے کی ہوتی ہے، اپنی جان ایک آن میں قربان کر دیتا ہے اور ایک زندگی شمع کی ہوتی ہے، جلنا، سلگنا، پگھلنا، روشنی بکھیرنا، ایک تسلسل کے ساتھ آسان کام نہیں ہوتا۔ کیا خوب کہا ہے کلیم عاجز صاحب نے

سلگنا اور شے ہے جل کے مر جانے سے کیا ہوگا

جو ہم سے ہو رہا ہے کام پروانے سے کیا ہوگا

تو ایک کام اللہ تعالیٰ نے ان سے لے لیا، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

اس ملاقات کے بعد ایک صاحب کا فون آیا۔ نام یاد نہیں آتا، شاید جعفر صاحب کے بھانجے تھے، فرمانے لگے کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ ہر نماز کے بعد تین بار سبحان اللہ العظیم و بحمدہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھ لیا کریں اور اپنے نام کے اعداد کے برابر ولسوف یعطیک ربک فترضی کسی وقت پڑھیں۔ بہت تعجب مجھے ہوا کہ یہ عطائے بلا سبب کیا معنی۔ میں نے ان سے کوئی حاجت بیان نہیں کی۔ کوئی دکھڑا انہیں رویا۔ اس سے قبل کئی بار اذکار پر گفتگو ہوئی مگر کسی چیز کی تلقین نہیں ہوئی۔ بلکہ یاد آتا ہے کہ ایک زمانے میں خطبات حکیم الاسلام، جو قاری طیب صاحب کی تقاریر کا مجموعہ ہے، اس کا مطالعہ کیا تو اس میں انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ ہر صبح سو بار حسبنا اللہ ونعم الوکیل پڑھ لیا جائے تا کہ رزق ملتا رہے اور ہر رات لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین سو بار پڑھ لی جائے تا کہ دن بھر کی خطائیں معاف ہو جائیں۔ ان کے سامنے ذکر کیا۔ متصوفین اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ کتابوں میں دیکھ کر اذکار کو اختیار نہ کیا جائے بلکہ کسی بزرگ سے مشورہ کر لیا جائے۔ ہم تو خیر یہ سب کہاں مانتے ہیں مگر اس خیال سے پوچھا کہ شاید کوئی حدیث نظر سے گزری ہو۔ اگر حدیث میں کوئی چیز ملتی ہے تو خواہ کوئی کچھ کہے میرے خیال سے امت کے لئے اجازت عام ہے تو فرمایا کہ صبح والے میں تو کوئی حرج نہیں کہ قرآن اس کے ساتھ فانقلبوا بنعمۃ من اللہ ورضوا بھی کہتا ہے تو معاملہ ہی مبارک ہے مگر شام والی "گرم" ہے۔ یہ گرم کا لفظ انہی کا ہے اور تاکید فرمائی کہ جب تک بہت سخت حالات نہ ہوں نہ پڑھے جائیں۔ الحمد للہ اسی کا معمول کر لیا ہے۔ روٹیوں کی تو کمی نہیں ہوئی مگر گناہوں سے چھٹکارا بھی نہیں ہوا۔ خیر تو تذکرہ ہو رہا تھا اذکار کی تعلیم کا، حیرت ہوئی اور حیرت رہی۔ توفیق نہ ہو سکی کہ جا کر پوچھوں مگر خیر مرشد تھے عمل شروع کر دیا اور برکات الحمد للہ نصیب ہوئے۔

کن کن چیزوں کا تذکرہ کروں۔ مضمون شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جاتا ہے۔ لذیذ بود حکایت بے پایاں طویل تر گفتیم۔ ایک زمانے میں مجھ سے سخت خفا ہو گئے۔ میرا موقف یہ تھا (پٹنہ کے ناظم حلقہ طلبہ کی حیثیت سے) کہ طلباء کو جماعت کا صرف کارندہ نہ بنایا جائے۔ مگر کون سنتا ہے فغان درویش، ہمیشہ سے جو ہوتا چلا آیا تھا (اور اب تک ہو رہا ہے) اس پر کون اعتراضات سنتا۔ لمبی کہانی ہے اس موقع پر سنانا نہیں چاہتا۔ خیر تو نوبت بہ ایں جا رسید کہ ڈاکٹر صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ کچھ لوگ حلقہ طلبہ اور جماعت میں افتراق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میں عجیب مخمصہ میں تھا۔ تذکرہ یقیناً صرف میرا ہی تھا، تفصیل جس کی طویل، تکلیف دہ اور بے موقع ہے۔ افسوس اس قدر تھا کہ مجھ سے اس موضوع پر کوئی گفتگو انہوں نے نہیں کی تھی

انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے پیش تر اک بار سوئے دامن یوسف بھی دیکھئے

خیر تو وہ رسم رہ گئی اس وقت اسی کا غصہ تھا۔ جب عمر آئی تو بات سمجھ میں آئی کہ جس سے محبت ہوتی ہے اسی پر عتاب بھی زیادہ ہوتا ہے۔ بہر کیف ہم نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب حلقہ طلبہ سے علیحدگی ہی میں خیر ہے۔ ایک خانہ زاد بہانہ پیش کر کے (جو غلط بھی نہ تھا) میں نے بنیادی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ چند ہی ہفتوں بعد ایمرجنسی کی مصیبت آئی۔ اگر چہ ان چند ہفتوں میں گوشہ گیر رہا تھا تا کہ کوئی فتنہ نہ ہو مگر جب جماعت کی معطلی کی خبر ملی تو بھاگا ہوا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بحیثیت امیر حلقہ احکامات دے رہے تھے۔ گہرے تفکرات چہرے پر عیاں تھے۔ ہم لوگ بھی پہنچے۔ اتفاق سے میں اور احمد علی اختر صاحب اور پرقمر صاحب [۳] کے کمرے میں بی بی سی سننے چلے گئے، اور اسی اثناء میں پولیس آئی اور گرفتاریاں ہوئیں۔ ہم دونوں باہر رہ گئے تھے۔ سخت دور تھا۔ کبھی اس دور کی یادوں کو یکجا کیا جانا چاہئے، اس پر تبصرہ اور تجزیہ ہونا چاہئے۔ اس قسم کے حالات کا پھر عود کرنا عین ممکن ہے۔ تو ایک پالیسی بن جائے قبل اس کے کہ ہر شخص

کے جو سمجھ میں آئے کرے۔ محفلیں اجڑ گئیں۔ کیا کچھ گزری کیا کیا ذکر کیجئے۔ اسی زمانے میں پٹنہ کالجیٹ کے گراؤنڈ میں اے جی آفس کا مشاعرہ ہوا، اور شاعر وقت کلیم عاجز صاحب نے سماں باندھا، پوری غزل مرصع تھی۔ جو اشعار یاد آتے ہیں لکھے دیتا ہوں کہ کچھ یاد تازہ ہو جائے:

آنکھوں میں کہیں آنسو نہ رہے سینے میں کسی کے دل نہ رہا
ہے شہر میں قاتل ہی قاتل سنتے ہیں کوئی بسمل نہ رہا
مت کہیو کہ اب مجنوں نہ رہا لیلیٰ نہ رہی محمل نہ رہا
کہو کہ لہو کا کھیل ہے یہ اور اتنا لہو فاضل نہ رہا
دلی پہ بہار آئی عاجز افسوس جناب میر نہیں
جب زخم رہا مرہم نہ رہا مرہم ہے تو زخم دل نہ رہا

اور بھی اشعار تھے مگر مشتے از خروارے، اور اب حافظہ کہاں ہے۔ خیر تو ڈاکٹر صاحب پھلواری جیل میں اور ہم سڑکوں اور گلیوں پر۔ او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم کا مضمون تھا۔ ایک دن ہمت کر کے زیارت کے لئے گئے۔ ایک جم غفیر گیٹ پر ہوتا تھا اس میں منٹ دو منٹ کی ملاقات ہوئی اور ایک جملہ یاد رہ گیا کہ تم لوگ تو کہیں نکل سکتے ہو نکل جاؤ۔ تو نکلنے کی تیاریاں ہوئیں، مگر نکلے [۴] اس وقت جب وہ باہر نکل چکے تھے اور ''بریلی کے بازار میں جھمکا گرا رے'' والا گانا سنا کر اندرا گاندھی کی شکست فاش کا اعلان آکاش وانی نے کر دیا تھا۔ اسباب تو یقیناً مسبب الاسباب نے بہت سے پیدا کر دیے تھے مگر ہم تو یہی جانتے تھے کہ پنج وقتہ ایک مرد خدا کی قنوت نازلہ سنی گئی تھی فالحمد للہ۔ اس زمانے میں یہ سنا کہ ایک جن نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی اور ایک موکل تھا جس سے باہر کی خبریں معلوم ہوتی تھیں۔ غیر مصدقہ ذرائع سے سنی اور کبھی تحقیق نہیں کی۔ تحقیق کس سے کرتے ہم تو باہر نکل آئے۔

ہم کیا باہر نکلے ایک تانتا بندھ گیا۔ اس وقت تک ان کی رائے بھی بدل چکی تھی۔ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے جگر گوشے باہر چلے جائیں۔ جس فصل کو انہوں نے خون جگر سے تیار کیا تھا اسے باہر بھیج دینے کو وہ تیار نہ تھے مگر شدنی تو شدنی ہے۔ مقدرات کہیں اور طے ہوتے ہیں۔ خیر تو اس کے بعد دنیا بدل گئی۔ ''وہی آب وگل ایراں وہی تبریز'' مگر جاوید و جعفر و احمد و مناظر [۵] جیسے لوگ پیدا نہیں ہوئے۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ بہت سے نام لیتے ہوئے تو یہ ڈر لگتا ہے کہ اختلافات کے بعد وہ اب اپنے کو ان کا تربیت یافتہ سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ اپنا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ کچھ کر نہ سکا کچھ ہو نہ سکا۔ آخر الناس کا لمعادن کی حدیث بھی تو ہے۔ ''کوئی قابل ہو تو پھر شان کئی دیتے ہیں''۔ خیر تو احساس یہ ہے کہ پھر ویسے لوگ پیدا نہیں ہوئے یا ہماری ان سے ملاقات نہیں ہوئی یا اپنی بے بصری سے ان کے جوہر کو پہچانا نہیں۔

کہاں سے کہاں بات نکل جاتی ہے۔ عرض کر رہا تھا کہ محفل اجڑ گئی۔ یاروں نے بہت دور بستیاں بسا لیں۔ خط و کتابت کا سلسلہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ انگلینڈ سے آنا جانا کہاں تھا۔ تحریکی لحاظ سے مکمل جمود تھا۔ کچھ پڑھنے کو مل جاتا دل کو خوشی ہوتی۔ پھر سعودی عرب آنا ہوا۔ آنا جانا بھی بڑھا، کچھ سرگرمی بھی بڑھی۔ ہر بار ان کی خدمت میں حاضری بھی ہوئی۔ آخرش وہ فتنہ اٹھا جس میں ڈاکٹر صاحب کی جماعت سے علیحدگی ہوئی۔ کیا ہوا، کیسے ہوا، کیوں ہوا، کیا بتاؤں؟ وما شھدنا الا بما علمنا وما کنا للغیب حفظین۔ مگر جو ہوا وہ ایک منطقی نتیجہ تھا برسوں کے طرز عمل کا۔ اگر بصد احتیاط اور بصد احترام میں عرض کروں تو معاملہ کچھ یوں تھا کہ خیر القرون میں رسول اللہ ﷺ نے جو جماعت تیار کی وہ پوری جماعت صلحاء کی جماعت تھی، تابعین اور تبع تابعین کی بھی

بالعموم صلحا کی جماعت تھی، اس کے بعد من حیث القوم صالحیت کا دور تو گویا ختم ہو گیا مگر صالح افراد جماعت میں پیدا ہوتے رہے۔ پوری تاریخ میں جس کسی نے کوشش کی اس نے افراد ہی کو تیار کیا، پوری جماعت یا نظام کی فکر نہیں کی۔ مولانا مودودی نور اللہ مرقدہٗ نے پورے نظام کی تبدیلی کی بات کی اور جماعت اسی اقامت دین کے لئے قائم ہوئی۔ لامحالہ اس کے لئے ضروری تھا کہ صلحاء کی ایک جماعت تیار کی جائے مگر ایسا نہ ہو سکا، کیوں نہ ہو سکا اس کا جواب تو کوئی محقق ہی دے گا مگر جو بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ اس جانب کماحقہٗ توجہ ہی نہیں دی گئی۔ تصوف اور متصوفین کا جی کھول کر مذاق اڑایا گیا۔ جن لوگوں نے نسلاً بعد نسلٍ صلحاء اور اتقیا کی کھیپ تیار کی کسی کو توفیق ہی نہیں ہوئی کہ ان کی اچھی چیزوں ہی کو بیان کرنے اور لینے کی کوشش کرتا۔ اخبار عالم کا سننا اور جاننا انتہائی اہمیت کی چیز اور اذکار وادعیہ قابل مضحکہ تھیں۔ ٹائی اور سوٹ میں درس قرآن دینے کو قابل فخر سمجھا جانے لگا۔ پھر بے ایمانی اور بد دیانتی بڑھ گئی۔ ''المیز ان'' جیسے واقعات پیش آئے۔ مگر کسی کی اس جانب توجہ نہیں ہوئی۔ تربیت علم کی عین سے شروع ہو کر خطابت کی تے پر ختم ہوتی تھی۔ تزکیہ بھی کوئی چیز ہے، فکر آخرت کیوں کر پیدا کی جائے اس کا خیال ہی نہ آیا۔ چنانچہ دو نسلوں کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نسل اٹھ کھڑی ہوئی ہے جو عقائد سے ناواقف، عبادات میں تساہل، اخلاق کی اعلیٰ قدروں سے ناآشنا، معاملات میں اسلام کے عام معیار سے بھی گری ہوئی، معاشرت میں ''خان بہادریت'' کی طرف مائل، غرض اونٹ رے اونٹ تری کون سی کل سیدھی اور ساتھ ساتھ اقامت دین کے بھی داعی۔ تو وہ جو قافلہ بڑے عزم وارادے سے چلا تھا جن تاریک گلیوں میں آکر کھو گیا اس کی داستان تو طویل ہے مگر مختصراً یہی ہے کہ کردار کی شمعیں روشن نہ ہو سکیں اور جب یہ نہ ہوا اور نہ دعوت عام ہوئی، نہ غیر مسلمین میں دعوت ہوئی تو سوال یہ ہونے لگا کہ ہم نے کیا حاصل کیا، ملک وقوم کو کیا دیا ہے تو خیال ہوا کہ کچھ ملک وقوم ہی کے لئے کر کے دکھایا جائے۔

اقامت دین سے اقامت جنتا دل تک ایک طویل مسافت ہے، شاید کوئی مورخ اس پر نظر کرے۔

ڈاکٹر صاحب اس راہ پر کب تک چلتے اور کب تک امیدیں لگائے رکھتے۔ اس راہ پر ایک نہ ایک دن تو انہیں جدا ہونا ہی تھا، مگر اس کی ہمت پیدا کرنا بھی دل گردے کا کام ہے بقول شاعر

اسے بے وفا کہوں اب یہ جگر کہاں سے آئے　　　　بہ ہزار نامرادی جسے عمر بھر سراہا

بہر کیف وہ اس مرحلے سے گذر گئے مگر ایسا لگا کہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ میں نے کبھی ان سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔ میں نے کلیم صاحب کا وہ شعر سن رکھا تھا

کوئی ناشناس مزاج غم کہیں ہاتھ اس کو لگا نہ دے　　　　یہ جو زخم دل کو پکائے ہم لئے پھر رہے ہیں چھپائے ہم

تو اس موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی ان سے۔ ان سے تو کیا، میں تو ہر ایک کو یہی سمجھا تا رہا کہ جو مناسب سمجھئے کیجئے، ہر وقت اسی ایک موضوع پر بحث کرنے کا کوئی حاصل نہیں۔ ایک بار تنہائی میں ان سے ذکر کیا کہ بعض ارکان جماعت کی خواتین دہلی کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر برقع پہنتی ہیں کہ اب مرکز جانا ہے اور بعض کے بارے میں سنا کہ امریکہ میں برقع اتار کر پھینک دیا تو وہ جلال میں آگئے۔ پہلی بار لہجے میں تیزی اور تلخی کا احساس ہوا۔ دیر تک تربیت، مقصد زندگی، خوف خدا، ترجیح آخرت پر کلام کرتے رہے، میں تو سک دم رہ گیا۔ اس کے بعد کبھی مجال نہیں ہوئی کہ ان موضوعات پر گفتگو کروں۔ یوں تربیت کے موضوع پر بار بار گفتگو ہوئی اور اب افسوس ہوتا ہے کہ اسی وقت ان کے ملفوظات کو قلم بند کیوں نہ کر لیا۔ بارہا کوشش کی کہ ان کا کہیں درس ہوتا ہو تو اس میں تبرکاً شرکت کر لی جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے جو ملنے والے تھے وہ ان کے شریک محفل نہیں رہ گئے تھے اور ان کے جو نئے نئے شرکاء محفل تھے وہ مجھ سے متعارف نہ تھے، اس لئے کچھ خبر نہ ملتی تھی۔ آخر ایک بار بارش میں بھیگتے پہنچے۔ عالم گنج کی مسجد میں حلقہ باندھ کر کچھ نوجوان بیٹھے تھے۔ باری باری اپنے

اشکالات اور سوالات پیش کر رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب حسب موقع مختصر یا تفصیلی جواب دے رہے تھے۔ اسی حلقہ میں ایک صاحب نے، جو ایرانی انقلاب سے بہت متاثر رہے ہیں، (جب اکابرین میں سے بعضے متاثر رہے ہیں تو خردوں کا کیا کہنا ہے) سوال کیا کہ عملاً اگر سعودی عرب کی حکومت پر امریکہ کا حکم چلتا ہے تو کیا وہاں شرک کی حکومت نہیں ہے۔ الفاظ مختصراً میرے ہیں، غایت سوال کی یہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا جس کا حاصل یہ تھا کہ اگر عملاً ایسا ہے تو وہ شرک کی حکومت ہے۔ میں خاموش نہ رہ سکا اور اس پر اعتراض کر بیٹھا۔ مفروضے پر بھی اور فتوے پر بھی اور فتوے کے جو اثرات ہوتے اس کی جانب بھی۔ محفل میں طریقہ یہ تھا کہ صرف ڈاکٹر صاحب بولیں اور کسی دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔ اہل محفل کو گراں گزرا۔ بعضوں نے جو مجھ سے واقف نہ تھے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو سائل نے جو مجھ سے بخوبی واقف تھے فرمایا، یہ سعودی عرب کے تنخواہ دار ملازم ہیں۔ مجھے جو تکدر ہوا اس کا تو کیا تذکرہ کیا جائے مگر افسوس ہوا کہ کس قسم کے افراد ساتھ میں جمع ہو گئے ہیں۔ اندازہ اس دن بھی یہی ہوا اور بعد میں بھی یہی رپورٹیں ملیں کہ بہت باصلاحیت افراد انہیں مل سکے، کبھی برادرم نعمان صاحب (۹) سے تفصیلی گفتگو نہیں ہوئی۔ جب وہ جماعت میں اور میں حلقہ طلبہ میں تھا تو بھی بہت زیادہ قریبی تعلقات نہ تھے۔ اس کے بعد تو سلام دعا کی رہ گئی۔ خیر خیریت سے بات کبھی آگے نہ بڑھی۔ خدا کرے کہ انہیں توفیق ہو کہ ان جوانوں کو دین کی راہ میں آگے بڑھا سکیں۔

حسنین سید صاحب نے اپنے تاثرات میں ان کے فقر اختیاری کا تذکرہ کیا ہے۔ ہم نے تو جماعت کے سارے کارکنوں کو ایک حال میں دیکھا۔ بڑی اکثریت تو غریب طبقے ہی سے تعلق رکھتی تھی اور اسی میں سفید پوشی نبھاتی تھی۔ ان کا کمال یہ تھا کہ جیسی کچھ گزری اس میں ''بھاڑے کا ٹٹو'' بننا گوارا نہ کیا اور جب تک جماعت میں رہے اس لفظ کا تذکرہ بھی نہ کیا۔ اگر جماعت سے علیحدگی نہ ہوتی اور خیالات نے قلم کی راہ سے الفاظ کا جامہ نہ پہنا ہوتا تو ہمیں کسی کے کہنے پر یقین نہیں آتا کہ انہوں نے ایسی بات کہی ہوگی، مگر تجربہ کا کون انکار کر سکتا ہے۔ اس چھوٹے سے گھر میں ایک کرایہ دار کی حیثیت سے زندگی گزار دی۔ معمولی کپڑوں میں ایک شان سے زندہ رہے۔ پہلے ایک سیاہ شیروانی تھی جو سردیوں میں استعمال کرتے تھے، بعد میں اس کی جگہ سیاہ کملی نے لے لی۔ میں نے کبھی ان سے کسی محفل میں تنگی کا رونا نہیں سنا۔ اس کوٹھری میں جس میں ان کا ٹھکانہ تھا سامان دنیا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ صرف آخری ملاقات میں یہ دیکھا کہ ایک سیلنگ فین لگ گیا ہے۔ وہی چوکی، وہی بستر، وہی حال۔ عشروں پر عشرے گزر گئے کوئی فرق نہیں آیا۔ مجھ سے میری ایک بہن ہی نے روایت کی تھی کہ جب ان کی منہ بولی بیٹی کی لاش گھر لائی گئی تو لوگوں نے کہا چادر لاؤ چادر لاؤ چادر اڑھادی جائے۔ گھر میں چادر کہاں تھی۔ ضیا چچا اندر آئے، الگنی پر ایک لنگی سوکھ رہی تھی وہی پھاڑ کر اڑھادی گئی۔ نہ اسباب دنیا تھا نہ اسباب دنیا کی طرف توجہ تھی۔ خدا جانے حج کی خواہش کیسی دل میں رہی ہوگی اور کیسے پیٹ کاٹ کاٹ کر پیسہ جمع کیا ہوگا۔ ہمیں تو کبھی یقین نہ آتا اگر حسنین چچا جیسی ثقہ شخصیت نے اس کو بیان نہ کیا ہوتا۔ حج کے سفر میں وہ خوش شاید نہ رہے۔ افراتفری کا جو عالم رہتا ہے اس میں خشوع وخضوع کیا ہو۔ واپسی پر شیخ عبدالعزیز بن باز کو ایک خط بھی لکھا، شاید اس کا جواب نہ آیا۔ میں نے تو تفصیلاً یہ بھی نہ پوچھا کہ کن کن چیزوں پر اعتراض تھا۔

تبتل الی اللہ کی کیفیت الگ تھی۔ جس کی پوری زندگی ہی تبتل میں گزری ہو اس کے رجوع الی اللہ کی کیفیت کیا بیان کیجئے۔ ان کے پیچھے نماز میں جو خشوع ہوتا تھا اس کا کیا ذکر کروں۔ اگرچہ نماز ان کے پیچھے کم ہی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک نماز تو یاد آتی ہے کہ دلی سے امیر حلقہ انیس الدین صاحب رحمۃ اللہ کے انتقال کی خبر آئی۔ رمنہ روڈ کی مسجد میں اجتماع سے قبل ہم لوگ جمع ہوئے۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب ہی نے امامت کی۔ سورہ ضحیٰ کی جو تلاوت کی تو لگا کہ دل گلے میں آکر اٹک گیا، وہ نماز آج تک مجھے یاد

ہے۔ایک دوسری نماز جو یاد ہے، اس زمانے میں ملک منزل [7] میں میرا قیام تھا۔ امتیاز الرحمٰن صاحب [8] کی رائے ہوئی کہ شب قدر کی تہجد ان کے ساتھ چل کر پڑھی جائے۔ کچھ دیر سے پہنچے۔ پہلے تو کچھ رجوع الی اللہ پر دلوں کو گرمایا پھر طویل رکوع وسجود کے ساتھ نماز پڑھی گئی، آخر میں وتر کی دعائیں بالجہر کی گئیں۔ ہمارے لئے نیا تجربہ تھا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ دوبارہ کبھی اس کا موقع نہیں ملا۔ ریاض کے قیام میں عادل کلبیائی کے پیچھے پھر وہی لطف آیا۔ مگر ہندوستان عموماً اس لطف سے نا آشنا ہے۔

ایک بات رہی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ معروف معنوں میں صوفی نہ تھے۔ نہ کسی کے مرید تھے، نہ کسی کو مرید کیا، نہ پاس انفاس، نہ ہو حق، نہ خانقاہ، نہ جبہ و دستار، نہ تعویذ نہ گنڈا، نہ فتوحات کی قبولی، نہ مراقبہ، نہ قبروں کی زیارت، نہ اولیاء کی ارادت_____ مگر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر چکے تھے۔ تخلقوا باخلاق للہ کا ایک نمونہ تھے۔ جس ایک سے قلبی ارادت کی اس کے طریقے پر عمر نبھادی۔ جس کسی نے اپنے آپ کو تربیت کے لئے حوالے کیا اس کو ہیرے کی طرح چمکا کر جگمگا دیا۔ کس قسم کے ذکر پر مداومت تھی میں نہیں جانتا مگر عملی اذکار میں زندگی گزار دی۔ وہی ان کی کوٹھری ان کی خانقاہ تھی ؎

کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

ان کا سادہ لباس ہی جبہ و دستار کی طرح ان پر سجتا تھا، ان کی مسکراہٹ ہی ایک تعویذ کا اثر رکھتی تھی اور ان کی باتیں ہی شفاء القلوب تھیں۔ فتوحات کی نہ طلب تھی نہ اس پر نظر تھی مگر زندگی قرآن کی تفسیر کی طرح گزر گئی۔ وہ مردہ دلوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ وہ تو وہ صوفی تھے کہ جسے اقبال نے کہا ہے کہ ؎

وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد محبت میں یکتا حمیت میں فرد

مگر نہ وہ عجم کے خیالات میں کھوئے نہ مغرب سے کسی طرح متاثر ہوئے۔ کس مقام تک پہنچے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اہل تصوف کے یہاں ایک چیز شجرہ کہلاتی ہے۔ ہر شخص جو بیعت کرتا ہے اس کے حوالے کی جاتی ہے کہ ہر صبح اپنے پیر اور ان کے پیر در پیر پر فاتحہ پڑھ دیں اور ان کے لئے دعائے مغفرت کر دیں۔ ہمارے یہاں نہ سلسلہ ہے نہ شجرہ ہے۔ نہ جانے کتنے کارکنوں کے دلوں میں روزانہ مولٰینا مودودی رحمۃ اللہ کی مغفرت کا خیال آتا ہوگا۔ دوسروں کا تو کیا سوال ہے، بلکہ شاید دلوں میں یہ خیال بھی رہتا ہوگا کہ ایسے لوگوں کو دعاؤں کی کیا حاجت ہے، مگر ترقی درجات تو ہے ایک چیز جس کا کیا انکار ہو سکتا ہے۔ آخر درود میں رسول اللہ ﷺ کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں، اذان کے بعد کی دعا میں ان کے لئے وسیلے کی دعاء کی جاتی ہے تو دوسروں کا تو خیر کیا ذکر ہے۔ اس لئے دعائیں ہم سب کو کرنی چاہئے۔ اب دعاؤں ہی کا انتظار ہوگا اور دعاؤں ہی کی سوغات ان کو بھیجی جا سکتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔ دین کی سربلندی کے لئے انہوں نے جو کوششیں کیں اللہ تعالیٰ اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ انہوں نے نوجوانوں کی تربیت کے لئے جو خون جگر لگایا اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا بہترین ثمرہ عطا فرمائے۔ ان کی کوششوں سے جس قدر دین پھیلا اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے۔ قرآن فہمی کے لئے جس قدر انہوں نے کوششیں کیں اور جس قدر جدوجہد کی اس کی اللہ تعالیٰ قدر فرمائے۔ قرآن کو ان کے لئے حجت اور نور اور برھان بنادے اور قرآن کے نور سے ان کی قبر کو منور فرمادے اور قرآن کی شہادت ان کے حق میں قبول فرمائے اور قرآن کو ان کے لئے شافع اور مشفع بنائے۔ اے مالک الملک ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہمیں قرآن کی راہ پر لگانے والے وہی تھے۔ قرآن کی مشکلات کو سمجھانے والے وہی تھے۔ قرآن کا نمونہ بن کر دکھانے والے وہی تھے۔ اے ہمارے رب ہماری گواہی کو ان کے حق میں قبول فرما اور ان کے درجات بلند فرما اور ان کے بعد ہمیں فتنے میں مبتلا نہ فرما۔

اے غفور الرحیم تیرا بندہ، تیرے بندے کا بیٹا، تیری بندی کا بیٹا تیرے پاس حاضر ہو گیا۔ تیری ذات اس سے بلند ہے کہ تو

اس کو سزا دے اور تو اس سے غنی ہے کہ تو اس سے بدلہ لے۔ اے غفار تیری غفاری سے توقع ہے کہ تو ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے گا، اے ارحم الراحمین تیری رحمانیت سے امیدیں ہیں کہ تو ان پر رحم فرمائے گا۔ اے ذوالجلال والاکرام ان کے اعمال صالحہ کو قبول فرما اور ان کا بہترین بدلہ عطا فرما۔ اے پروردگار ! تیرے بندے نے تیری دنیا پر تیری جنت کو ترجیح دی۔ اے رب تو نے اسے دنیا سے محروم رکھا اب آخرت میں اعلیٰ درجات عطا فرما۔ اے اللہ تیرا بندہ ساری زندگی تیری رضا کی تلاش کرتا رہا، اب تو اس سے راضی ہو جا اور اسے بھی راضی کر لے۔ رب رحیم ساری عمر وہ دین کو سربلند کرنے کی کوشش کرتے رہے، اب ان کی کوششوں کو ثمر آور فرما۔ اے اللہ اس دین کی مدد فرما جس کی مدد کرنے والوں کی تو مدد فرماتا ہے۔ اے رب جن لوگوں کی انہوں نے تربیت فرمائی ان کو استقامت عطا فرما اور ان کو توفیق عطا فرما۔ توفیق عطا فرما کہ جیسی کوششیں انہوں نے دین کی سربلندی کے لئے کیں اس سے بہتر کوششیں ہم کرسکیں۔ اے رب ،ان کے حقوق ادا کرنے میں ہم سے کوتاہیاں ہوئیں۔ اے اللہ تو ہماری جانب سے بہترین حق ان کا ادا فرما دے۔ ان کی عزت کا جیسا کچھ حق تھا ہم نے ادا نہیں کیا اے اللہ تو ان کی عزت افزائی فرما۔ اے اللہ ان کی قبر کو ٹھنڈی رکھ اور اس میں وسعت فرما اور اس میں نور عطا فرما اور ان کا حساب آسان فرما اور ان کو جنت کے بلند درجات عطا فرما اور نبی اکرم ﷺ کی مرافقت عطا فرما۔ آمین!

☆☆☆

۱ محمود عالم صاحب، لائبریرین ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ، ریاض۔ جس وقت کے ''رفیق'' کا حوالہ ہے اس وقت محمود عالم صاحب ہی مدیر تھے۔ 'مولینا' کی نسبت یوں ہے کہ محمود عالم صاحب فاضل شمس الہدیٰ مدرسہ ہیں۔ ڈاکٹر احسن ظفر اللہ اور محمود عالم صاحبان آپس میں گہرے دوست ہیں اس کی چاشنی مولینا کی نسبت ہی ہے)

۲ ڈاکٹر جاوید اختر، حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے پہلے ناظم اعلیٰ۔ پٹنہ میڈیکل کالج سے MBBS، انگلینڈ سے MRCP کی ڈگری حاصل کی، اپنے فن میں کمال اور نام دونوں حاصل کیا۔ ڈاکٹر احسن ظفر اللہ کے دوست۔ PMCH پٹنہ، انگلینڈ، ریاض دونوں ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے گئے۔

۳ قمر الہدیٰ صاحب، موجودہ امیر حلقہ، جماعت اسلامی بہار)

۴ یہ نکلنے کا تذکرہ ملک سے باہر جانے کا ہے۔ حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے جن اولین ساتھیوں نے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کی غرض سے سفر کیا اس میں برادر ڈاکٹر احسن ظفر اللہ، کو سبقت حاصل ہے۔ برادر موصوف اس وقت انگلینڈ روانہ ہوئے۔

۵ مراد ڈاکٹر جاوید اختر، محمد جعفر جو موجودہ قیم جماعت اسلامی ہند ہیں، احمد علی اختر جو جماعت اسلامی حلقہ بہار کے ذمہ دار اور کچھ دنوں کے لئے قائم مقام امیر حلقہ بھی رہے اور مدیر مجلہ ہذا، ڈاکٹر مناظر خلیل جو ڈاکٹر صاحبؒ کے ساتھ جیل میں بھی رہے اور حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے ناظم بیت المال اور سکریٹری رہے، مدھم مدھم مسکراہٹ والے، آج کل انگلینڈ میں ہیں۔

۶ محمد نعمان، پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف فزکس پٹنہ یونیورسیٹی، جماعت اسلامی ہند پٹنہ کے امیر مقامی رہے۔ جماعت اسلامی ہند کی رکنیت سے استعفیٰ دیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے حلقہ سے متعلق رہے۔

۷ طلبہ کی ایک پرائیوٹ لاج، رمنہ روڈ، پٹنہ میں۔ اس میں حلقہ طلبہ کے بہت سے ارکان وکارکنان نے طالب علمی کا دور گزارا۔ کبھی کبھی یہ لاج حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے ذیلی دفتر کا سماں پیدا کرتا تھا۔ جس زمانے کی بات ہے اس وقت ڈاکٹر جاوید اختر ساتھ ڈاکٹر واجد علی اسی لاج میں رہتے تھے، جو حلقہ طلبہ بہار کے خازن بھی رہے۔ کچھ عرصہ بیرون ملک رہ کر اب شیر شاہ کی نگری سہسرام میں پریکٹس کرتے ہیں۔

۸۔ امتیاز ارحمٰن بھی پٹنہ میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔حلقہ طلبہ بہار کے رکن بھی رہے۔شاید بعد میں مستعفی ہوئے۔ بیرون ملک تعلیم اور ملازمت کے بعد آج کل گیا شہر کے معروف سرجن ہیں۔ان کے تذکرہ میں ڈاکٹر اظہر حسین صاحب، جہان آباد کا تذکرہ ہو جائے تو بہتر ہوگا۔اظہر صاحب کی صاحب زادی سے ڈاکٹر امتیاز الرحمٰن صاحب کی شادی ہوئی۔ڈاکٹر اظہر حسین صاحب جہان آباد میں مرجع خلائق رہے اور ان کے دست شفا سے کثیر آبادی فیض یاب ہوئی۔اخلاق کا گرویدہ ایک جہان تھا۔موصوف کو جماعت اسلامی سے گہری اور جذباتی وابستگی تھی اور ڈاکٹر صاحبؒ سے عقیدت کا رشتہ تھا۔خدمت اور اخلاق کے اس پیکر کی نماز جنازہ میں لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے، غیر مسلم بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر احسن ظفر اللہ صاحب، حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے موسس، اس کے شعبہ رابطہ خارجہ کے سکریٹری، شوریٰ کے رکن اور پٹنہ کے ناظم رہے۔ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ اور ان کے والد وسیم اللہؒ آپس میں مخلص تحریکی رفیق تھے، اس لئے ان سے بچپن سے جذباتی تعلق اور بعد میں تحریکی تعلق بھی رہا۔آپ نے تعلیم کے ابتدائی زمانہ میں قرآن حفظ کیا، پٹنہ اور انگلینڈ میں تعلیمی سلسلہ رہا اور میڈیکل سائنس میں سند لی۔انگلینڈ، کنیڈا، نیوزی لینڈ میں مقیم رہے۔(قیام: سعودی عرب)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ رح بحیثیت امیر حلقہ

احمد علی اختر

امیر حلقہ کی تقرری :

۲۳ ستمبر ۱۹۷۲ء کو انیس الدین احمد مرحوم کا انتقال اچانک اس وقت ہوا جب وہ جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے۔ تقریباً سترہ سال کامیابی کے ساتھ پہلے جنوبی بہار، بعد ازاں پورے بہار کی امارت حلقہ کی ذمہ داری سنبھالنے والی قدآور شخصیت کا اچانک اٹھ جانا ایک ایسا خلاء تھا جسے پر کرنے والی شخصیت بہار میں دور دور تک نظر نہ آتی تھی، اور کہیں اگر نظر ٹکتی تھی تو بس ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ پر۔ مگر ان کی کچھ معذوریاں تھیں۔ سترہ سال قبل بھی ۱۹۵۵ء کے اجلاس شوریٰ بنگلور میں، جب جماعت نے ریاست بہار میں کام کو آگے بڑھانے کے لئے حلقہ بہار کو دو حصوں میں تقسیم کر کے شمالی بہار کا قیم محمد حسنین سید صاحب کو اور جنوبی بہار کا قیم ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب کو بنانے کا فیصلہ کیا تھا تو ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب نے، جو بنگلور کے اجلاس کے موقع پر وہاں موجود تھے، اپنی معذوری صحت کی وجہ سے امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب سے معذرت چاہ لی تھی، اور انیس الدین احمد صاحب کا نام پیش کر دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر انیس الدین احمد مرحوم جنوبی بہار کے قیم مقرر کئے گئے تھے۔ سترہ سال کے بعد اب پھر وہی مرحلہ درپیش تھا۔ انیس الدین احمد مرحوم کے انتقال کے تقریباً ایک ماہ کے بعد، تاریخ تو یاد نہیں، ۱۹۷۲ء اکتوبر کے اواخر یا نومبر کے اوائل میں امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف رح صاحب پٹنہ تشریف لائے اور امیر حلقہ کی تقرری کے سلسلے میں دفتر جماعت اسلامی، رمنہ روڈ میں ایک مشاورتی نشست منعقد ہوئی اور ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب کے نام پر لوگوں کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی صحت کی کمزوری اور اہلیہ کی مسلسل علالت اور تیمارداری کی ذمہ داری کی وجہ سے دورہ نہ کر سکنے کا عذر ایک بار پھر پیش کیا جو ایک معقول عذر تھا۔ انہوں نے چاہا کہ اس ذمہ داری کیلئے ان سے اہل تر کسی شخص کا انتخاب ہو جائے مگر اب کے انیس الدین احمد مرحوم جیسی کوئی شخصیت ان کی نظر میں نہیں تھی کہ جس کا نام پیش کر کے وہ گلوخلاصی کر لیتے۔ بادل ناخواستہ یہ ذمہ داری انہیں سنبھالنی ہی پڑی اور موصوف نے ۱۸ ردسمبر ۱۹۷۲ء کو باضابطہ امیر حلقہ کا چارج لے لیا۔

معاون اسٹاف :

جس وقت ڈاکٹر صاحب نے امیر حلقہ کا چارج لیا اس وقت ایک ہی اسٹاف جناب عبدالودود مرحوم ہوا کرتے تھے جو دفتر انچارج کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے اور سعید منزل سلطان گنج ' پٹنہ ۶ ہی میں سکونت پذیر تھے جہاں اس وقت حلقہ بہار کا دفتر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دفتر حلقہ میں کوئی پیون نہیں ہوتا تھا۔ اب ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کو دورے وغیرہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے سلسلے میں معاونین کی تلاش ہوئی۔ اس سلسلے میں منتخب رفقاء جماعت سے گفتگو اور ان کا عندیہ معلوم کرنے کا اچھا خاصا سلسلہ چلا۔ بالآخر دو ایسے جوانوں پر معاملہ آ کر رک گیا جو ابھی جماعت کے رکن بھی نہیں بنے تھے۔ ان میں ایک جناب محمد جعفر (موجودہ قیم جماعت) تھے اور دوسرا یہ راقم الحروف۔ اس وقت محمد جعفر صاحب کی عمر تقریباً ساڑھے اکیس سال اور میری عمر تقریباً ساڑھے اٹھائیس سال تھی۔ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ تنخواہ پر بحیثیت آفس سکریٹری یا معاون دفتر حلقہ ہماری تقرریاں عمل میں آئیں۔ جون ۱۹۷۳ء میں ہم دونوں کو جماعت کی رکنیت ملی۔ محمد جعفر صاحب نے تو اسی ماہ دفتر جوائن کیا اور میں نے تقریباً ایک ماہ بعد جولائی ۱۹۷۳ء میں دفتر جوائن کیا۔

دورے کے علاوہ ہمارے کاموں کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی کہ میرے ذمہ شعبہ نشر واشاعت، رپورٹیں، سرکلرز اور عمومی مراسلت تھی۔ محمد جعفر صاحب کے ذمہ بیت المال کا حساب وکتاب، تنظیمی نوعیت کے معاملات کی دیکھ بھال، مرکز جماعت سے مراسلت اور تنظیمی نوعیت کی مراسلت وغیرہ تھی۔ عبدالودود صاحب آفس انچارج تھے۔ دفتر کی نگہداشت، مہمان خانہ، مکتبہ اور خازن وغیرہ کی ذمہ داریاں ان پر تھیں۔ اور جب ہم لوگ دورے پر ہوتے تھے تو مراسلت کی خدمات بھی وہ انجام دیتے تھے۔ اس طرح تین نفری اسٹاف کے ساتھ یہ سلسلہ چلا۔

یوں تو یہ تین افراد ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کے ساتھ ان کے پورے دور امارت میں رہے، لیکن ایمر جنسی سے پہلے اور ایمر جنسی کے بعد (ایمر جنسی کا وقفہ: جون ۱۹۷۵ء تا مارچ ۱۹۷۷ء) کچھ اور رفقاء کی بھی ہمہ وقتی یا اعزازی خدمات حاصل ہوتی رہیں۔ ان میں پہلا نام نسیم احمد صاحب کا ہے جنہیں ایمر جنسی سے تقریباً ایک سال پہلے غالباً اپریل ۱۹۷۴ء میں امیر حلقہ کا معاون خصوصی مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب تو انہیں امیر حلقہ ہی بنانا چاہتے تھے اور اس خواہش کا اظہار انہوں نے اس وقت کیا تھا جب انہیں شدید نمونیہ کا حملہ ہوا تھا اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ مرکز نے امیر حلقہ کی خواہش پر یہ فیصلہ کیا کہ انہیں امیر حلقہ ہی کے اسکیل پر معاون مقرر کرلیا جائے اور امیر حلقہ چاہیں تو صحت یابی کے بعد بھی ان کو پورا اختیار دے کر ان سے کام لیں لیکن امارت میں تبدیلی نہ ہو۔ ایمر جنسی ختم ہوتے ہی مجلس شوریٰ کا پہلا اجلاس ۱۰ر تا ۱۲ر اپریل ۱۹۷۷ء کو منظور عالم صاحب کے گھر پر گیا میں ہوا تو اپنے احساسات کے تحت موصوف نے استعفیٰ دے دیا۔ دوسرا نام رضیہ قمر صاحبہ کا ہے جو اعزازی ناظمہ حلقہ خواتین بنائی گئی تھیں اور اپنی کمزوریٔ صحت کے باوجود بہت عرصہ تک یہ خدمت انجام دیتی رہیں۔

ایمر جنسی کے بعد جن لوگوں کی ہمہ وقتی یا اعزازی خدمات امیر حلقہ کو حاصل ہوئیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

شمیم احمد صاحب۔ ہزاری باغ، نصیر الدین خانصاحب۔ گیا، عبدالباری صاحب مرحوم۔ موسیٰ بنی، قمر الہدیٰ صاحب، ململ (موجودہ امیر حلقہ، جنہوں نے ڈاکٹر صاحبؒ کی تحریک پر سرکاری ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لیا اور دفتر حلقہ سے ان کے خاص معتمد کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے)، ابونصر فاروق صاحب۔ پٹنہ، شہاب الدین صاحب۔ اکبر پور، امینہ خاتون صاحبہ۔ پٹنہ

ایمر جنسی کے بعد اس پہلے اجلاس شوریٰ میں، جس میں نسیم احمد صاحب نے استعفیٰ دیا، سیاسی محاذ پر کام کے لئے ایک ہمہ وقتی کارکن کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ شمیم احمد صاحب اور نصیر الدین خاں صاحب دونوں کو ان کی آمادگی پر ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ شمیم احمد صاحب نے اپنے حالات کی وجہ سے باضابطہ دفتر جوائن نہیں کیا، البتہ حلقہ کے اہم کاموں اور حکومت وانتظامیہ کے اہم ذمہ داران سے ملاقات کے لئے امیر حلقہ کی خواہش پر دو تین بار پٹنہ تشریف لائے۔ نصیر الدین صاحب نے فیصلہ کے دو ماہ بعد آفس جوائن کیا اور جولائی ۱۹۷۷ء سے مارچ ۱۹۷۹ء تک آفس سکریٹری برائے رابطہ عام یعنی لائزن آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ عبدالباری صاحب مرحوم کو اجتماع ارکان دربھنگہ کے موقع پر منعقدہ اجلاس شوریٰ مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۸۲ء میں محترم امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیثؒ صاحب نے معاون امیر حلقہ مقرر کیا۔ لیکن موصوف کو پہلے تنظیمی دورے کے موقع پر ہی گیا میں کینسر کی تشخیص ہوگئی اور وہ بمشکل تقریباً ایک سال ہی اس ذمہ داری پر فائز رہ سکے۔ ان کی علالت کے پیش نظر انہیں ۱۵ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ہمہ وقتی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ قمر الہدیٰ صاحب نے بحیثیت آفس سکریٹری فروری ۱۹۸۲ء میں دفتر حلقہ جوائن کیا اور اس کے بعد سے مسلسل اب تک ہمہ وقتی خدمات انجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ شمیم احمد صاحب کو دوبارہ ۱۷ر اگست ۱۹۸۳ء کے اجلاس شوریٰ میں ہمہ وقتی خدمت تفویض کی گئی اور انہیں معاون امیر حلقہ بنایا گیا اور یہ بھی طئے ہوا کہ ان کے حالات کے لحاظ سے ان کا ہیڈ کوارٹر

ہزاری باغ میں رہے گا۔ موصوف اکتوبر ۸۳ء سے جون ۸۶ء تک معاون امیر حلقہ رہے۔ ۱۷/ اگست ۱۹۸۳ء ہی کے اجلاس شوریٰ میں ابونصر فاروق صاحب کو آفس اسسٹنٹ کی حیثیت سے بحال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے بعد سے موصوف ڈاکٹر صاحب کے دور امارت میں آخر وقت تک ہمہ وقتی خدمات انجام دیتے رہے۔ اہینہ خاتون صاحبہ کو نائب ناظمہ حلقۂ خواتین کی حیثیت سے ہمہ وقتی خدمت کی ذمہ داری اکتوبر ۱۹۷۸ء میں دی گئی اور موصوفہ مئی ۱۹۸۴ء تک ہمہ وقتی خدمات انجام دیتی رہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الهدیٰ مرحوم کے دورامارت میں نظمائے علاقہ جات :

۱۔ محمد حسنین سید صاحب (دربھنگہ)	اعزازی ناظم علاقہ دربھنگہ وترہت	۱۹۷۴ء تا آخری دورامارت
۲۔ مولانا محمد اثری صاحب (دملہ ضلع دربھنگہ)	ہمہ وقتی معاون ناظم علاقہ دربھنگہ وترہت	۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۲ء
۳۔ مولانا ارتضاء الدین صاحب (سہسرام)	ہمہ وقتی ناظم علاقہ مگدھ	پورے دورامارت میں
۴۔ شمیم احمد صاحب (ہزاری باغ)	ہمہ وقتی ناظم علاقہ چھوٹا ناگپور	۱۹۸۴ء تک
۵۔ محمد جعفر صاحب (پٹنہ)	ہمہ وقتی ناظم علاقہ بھاگل پور وکوسی	۱۹۸۳ء تک
۶۔ احمد علی اختر (پٹنہ)	ہمہ وقتی ناظم علاقہ دربھنگہ وترہت	۱۹۸۶ء تک
۷۔ شہاب الدین صاحب (اکبر پور ضلع روہتاس)	ہمہ وقتی ناظم علاقہ بھاگل پور (چھ ماہ کیلئے)	ناظم علاقہ بھاگل پور کوسی، جون ۱۹۸۳ء
۸۔ عبدالرزاق شبنم (غریب پور ضلع بھاگل پور)	ہمہ وقتی ناظم علاقہ بھاگل پور	۱۹۸۴ء تا آخری دورامارت
۹۔ بشارت حسین صاحب (رانچی)	ہمہ وقتی ناظم علاقہ شمالی چھوٹا ناگپور	۱۹۸۴ء تا آخری دورامارت
۱۰۔ محمد حسن رضا صاحب (رانچی)	اعزازی ناظم علاقہ جنوبی چھوٹا ناگپور	۱۹۸۴ء تا آخر دورامارت

ڈاکٹر ضیاء الهدیٰ صاحب کے دورامارت میں شوریٰ حلقہ بہار کے ارکان

۱۔ محمد حسنین سید صاحب۔ دربھنگہ، پورے دورامارت میں	۲۔ مولانا عبدالغنی عزیزی مرحوم۔ رانچی، پورے دورامارت میں
۳۔ مولانا ارتضاء الدین صاحب۔ سہسرام، پورے دورامارت میں	۴۔ جناب عبدالباری مرحوم۔ موسیٰ بنی مائنس، پورے دورامارت میں
۵۔ نسیم احمد صاحب۔ بہار شریف، پورے دورامارت میں	۶۔ شمیم احمد صاحب۔ ہزاری باغ، پورے دورامارت میں
۷۔ مولانا حبیب اللہ مرحوم۔ چتر پور، ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۶ء	۸۔ جناب سید شاہ محمد اسعد مرحوم۔ موتی پور، ۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۴ء
۹۔ جناب زکی اشرف مرحوم۔ دربھنگہ، ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۴ء	۱۰۔ نصیر الدین خاں صاحب۔ گیا، ۱۹۷۸ء تا ۱۹۹۰ء
۱۱۔ شمیم احمد مدنی صاحب۔ جمشید پور، ۷۸ء تا ۸۲ء، ۸۴ء تا ۹۰ء	۱۲۔ جناب سلیمان صادق مرحوم۔ گیا، ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۰ء
۱۳۔ جناب احمد سجاد۔ رانچی، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء	۱۴۔ جناب محمد حسن رضا۔ رانچی، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء
۱۵۔ مولانا طیب عثمانی ندوی صاحب۔ گیا۔	

جماعتی ذمہ داریاں ایک نظر میں :

ڈاکٹر صاحب کی جماعتی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو رکن بننے سے لے کر مستعفی ہونے تک ۴۵ سال کی طویل تحریکی رفاقت کے دوران وہ بیشتر ذمہ داریوں ہی کے منصب پر رہے۔ ۱۹۴۱ء میں جماعت سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں اجتماع الہ آباد میں رکن بنے۔ اس اجتماع میں پنڈال کے انچارج بھی تھے۔ ایک سال کے اندر ہی ۱۹۴۷ء میں پٹنہ کے امیر مقامی بنائے گئے اور جون ۱۹۵۲ء تک مسلسل رہے۔ ۱۹۵۵ء میں حلقہ مدراس وکرناٹک کے قیم بنا کر بنگلور بھیجے گئے۔ مگر بنگلور کی ہوا راس نہیں آئی۔ علیل رہنے لگے۔

چنانچہ دو ماہ بعد ہی واپس آ گئے۔اس دوران پٹنہ کے امیر مقامی مولانا سید احمد عروج قادری صاحبؒ بنائے گئے تھے جو جولائی ۵۲ء سے جولائی ۵۶ء تک امارت مقامی کی خدمات انجام دیتے رہے۔اس کے بعد اگست ۵۶ء میں مولانا مرحوم ماہنامہ زندگی کی ادارت کے لئے رام پور تشریف لے گئے تو اگست ۵۶ء میں امارت مقامی کی ذمہ داری دوبارہ ڈاکٹر صاحب کے سر آ گئی جس کا سلسلہ ۱۹۷۲ء تک چلا۔اس طرح پٹنہ کے امیر مقامی کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب نے کم وبیش بیس (۲۰) سال خدمات انجام دیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بہت ہی کامیاب امیر مقامی تھے۔ڈاکٹر صاحب ذمہ داریوں کے منصب پر کم وبیش ۴۴ سال رہے۔مگر یہ ساری خدمات اعزازی تھیں۔ڈاکٹر صاحب کبھی جماعت کے Paid Worker نہیں رہے۔پیشے کے اعتبار سے ہومیو پیتھ ڈاکٹر تھے اور کسب معاش کیلئے کچھ وقت علیحدہ سے مخصوص رکھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن ۲۰ سال رہے۔پہلی بار ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۰ء رہے۔دوبارہ مئی ۱۹۷۵ء سے مسلسل ۱۹۹۱ء تک رہے۔مجلس نمائندگان کے رکن ۳۵ سال رہے یعنی ۱۹۵۶ء سے ۱۹۹۰ء تک۔

امیر حلقہ کے لئے مطلوبہ اوصاف :

امارت حلقہ کے لئے مطلوبہ صفات کا ذکر دستور جماعت اسلامی ہند دفعہ ۴۷ میں اس طرح کیا گیا ہے: ''امیر حلقہ کے انتخاب میں حسب ذیل اوصاف کو ملحوظ رکھا جائے گا:

(۱) وہ حلقہ کی امارت یا کسی اور جماعتی منصب کا امیدوار یا خواہش مند نہ ہو (۲) علم دین، تقویٰ، امانت ودیانت، معاملہ فہمی، بردباری، تحریک اسلامی کی مزاج شناسی اور اس سے وابستگی، دستور جماعت کی پابندی، دعوتی جدوجہد، راہ خدا میں استقامت اور تنظیمی صلاحیت کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی عام ارکان حلقہ سے بہتر ہو''۔

ذمہ داریوں کی انجام دہی کے سلسلے میں دستور جماعت میں اس طرح درج ہے: ''امیر حلقہ مرکز کی ہدایات کے تحت اپنے حلقہ کی جماعتوں کے نظم ونسق اور ارکان حلقہ کی تربیت ورہنمائی کا ذمہ دار ہوگا، اور ان سارے امور میں امیر جماعت کے سامنے جواب دہ ہوگا۔امیر حلقہ اپنی ذمہ داریوں کو اپنے معاونین کے ذریعہ بھی انجام دے سکے گا''۔

دستور جماعت کی ان مطلوبہ صفات کی روشنی میں بطور خاص میرے خیال سے امیر حلقہ کے اندر کم از کم تین اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔اول لیڈر شپ یعنی رہنمائی کی صلاحیت، دوئم ایڈمنسٹریشن اور آرگنائزیشن کی صلاحیت، سوئم اپنی ٹیم کو نصب العین کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت یعنی افراد کی فکری واخلاقی تربیت وتزکیہ۔الحمدللہ درجات کے فرق کے ساتھ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ علیہ الرحمہ کے اندر یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔

قائدانہ لیاقت :

جہاں تک لیڈر شپ اور رہنمائی کا سوال ہے یہ صلاحیت مرحوم کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی۔کسی نظریاتی تحریک کے رہنما کا اولین مطلوبہ وصف نصب العین کا واضح شعور ہوتا ہے۔اس شعور کو دوسروں تک منتقل کرنے کی تفہیمی اور ابلاغی صلاحیت دوسری ناگزیر صفت ہوتی ہے۔حالات زمانہ اور مسائل حاضرہ سے باخبری، ہم عصر تحریکوں سے واقفیت، وقت کے نظریات وتصورات اور تہذیب حاضر کے پیدا کردہ اشکالات وسوالات سے الجھتے ذہنوں کو مطمئن کرنے کی لیاقت وغیرہ بھی ایسی صفات ہیں کہ ایک رہنما کے اندر ان کا ہونا ضروری ہے۔ان تمام پہلوؤں سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت جامع تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے نظریات وتصورات واضح اور واشگاف تھے۔خیالات میں ژولیدگی اور پیچیدگی نہ تھی، کسی طرح کا ابہام

اور خلا نہ تھا، کوئی بے ربطی اور بے ترتیبی نہ تھی بلکہ ان کی باتیں بڑی صاف وشفاف اور ذہن کو روشن کرنے والی ہوتی تھیں۔ یہ سچ ہے ڈاکٹر صاحب کوئی جذباتی مقرر اور شعلہ بیان خطیب نہ تھے، نہ ان کی تحریروں میں انشاپردازی کا رنگ پایا جاتا تھا۔ اسکے باوجود ان کی تحریر وتقریر، درس قرآن اور گفتگو اتنی مدلل اور دل نشیں، منظم اور مربوط، حکیمانہ نکتوں اور علمی وفکری مواد سے آراستہ اور اتنے واضح تصورات (Clear concept) کی حامل ہوا کرتی تھیں کہ ذہن کے بند دریچے کھل جاتے تھے اور تاریک دلوں میں روشنی کی کرنیں بکھرنے لگتی تھیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان سب کے پس منظر میں ڈاکٹر صاحب کا مضبوط کردار ان کی باتوں کو اور زیادہ موثر اور وزن دار بناتا رہتا تھا۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے تحریک کے اندر کا ہی نہیں تحریک کے باہر کا بھی ایک بڑا حلقہ ان کا معتقد تھا۔ عوام الناس میں نہ صرف کردار کے اعتبار سے بلکہ رہنمائی کے اعتبار سے بھی ان کی شخصیت غیر متنازعہ اور قابل اعتبار سمجھی جاتی تھی اور لوگ گونا گوں انفرادی اور اجتماعی معاملات میں ان سے رہنمائی کے طالب ہوتے تھے۔

اگر امیر حلقہ کی شخصیت وحیثیت جماعت سے باہر بھی معروف اور ہر دل عزیز ہو تو اس سے بھی جماعت کی ساکھ اور وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہوا بھی۔ ملت کے اندر اجتماعی شعور کی بیداری میں ان کی بعض نمایاں کوششیں رہی ہیں۔ ان میں متحدہ سیرت کمیٹی کا قیام اور زکوٰۃ کا اجتماعی نظم قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نظم میں ملت کی معروف شخصیات اور بااثر طبقہ شریک رہا اور سرپرستی ڈاکٹر صاحب کی رہی۔ مختلف صلاحیتوں اور مختلف الخیال لوگوں کو لے کر چلنا لیڈرشپ کیلئے ضروری ہے۔ یہ کام بھی موصوف نے نظم جماعت کے اندر اور نظم جماعت کے باہر دونوں سطح پر بحسن وخوبی انجام دیا۔

ابتلاء و آزمائش کا دور:

قائد کی لیاقت کا ایک امتحان ابتلاء وآزمائش کے وقت بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دور امارت میں جماعت ابتلاء و آزمائش سے بھی گزری۔ دو تین مواقع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مواقع پر بھی ڈاکٹر صاحب کی قائدانہ لیاقت ابھر کر سامنے آئی اور رفقاء کی دستگیری، سرپرستی اور رہنمائی کرتی رہی۔ ان مواقع میں ایمرجنسی کے دوران اور ایمرجنسی کے متصل بعد پیدا ہونے والے حالات، بھٹوگردی کا آزمائشی دور اور شاہ بانو کیس کے دور میں پیدا شدہ حالات ہیں۔

ایمرجنسی:

۲۶/جون ۱۹۷۵ء کو اندرا گاندھی کے دور حکومت میں ملک میں ایمرجنسی نافذ کی گئی تو بعض دوسری جماعتوں کے ساتھ جماعت اسلامی ہند پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ ارکان جماعت گرفتار کرلئے گئے اور دفاتر سربمہر (Seal) کردیے گئے۔ ۲۱ ماہ سے کچھ زائد یعنی جون ۱۹۷۵ء سے مارچ ۱۹۷۷ء تک ایمرجنسی کی وجہ سے جماعت کا کام التوا اور تعطل کا شکار رہا۔ ایمرجنسی کے دنوں میں ماحول اتنا تاریک اور فضا ایسی ہولناک ہوگئی تھی کہ جماعت کا نام لینا اور جماعت کے لوگوں سے ملنا تو دور کی بات ہے لوگ کارکنان جماعت کے سائے سے بھی ڈرنے لگے تھے۔ غیر تو غیر اپنے بھی بے گانے ہوگئے تھے۔ بظاہر انتشار، مایوسی اور ٹوٹ پھوٹ کے اس دور میں کارکنان جماعت کے ہوش وحواس کی نہ صرف بحالی بلکہ حوصلوں کو نئی مہمیز دینے میں قائد کی ایمانی صلابت، استقامت وعزیمت، ہمدردی وخبر گیری اور رہنمائی کا بھی نمایاں رول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایمرجنسی کے بعد جماعت گویا نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان عمل میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب MISA کے تحت گرفتار تھے اس لئے دوسرے لوگ تو بیل پر نکلتے رہے مگر وہ پوری ایمر جنسی کے دوران جیل ہی میں رہے۔ اور جیل کے اندر ہی سے رفقاء کی، خواہ وہ جیل کے اندر کے رفقا ہوں یا باہر کے، خبر گیری اور رہنمائی کرتے رہے۔ دوسری طرف جیل کے اندر تبلیغ ودعوت کا کام جاری تھا اور ان کے درس وتقریر اور اخلاق وکردار نے وہ اثرات ڈالے کہ مختلف پارٹیوں کے ورکرس اور ذمہ داروں نے ان کو کسی نہ کسی درجہ میں اپنا پیرومرشد اور گرو مان لیا اور ان کے مشوروں کو غیر معمولی اہمیت دی جانے لگی اور جیل کے عملے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایمر جنسی کے بعد پہلے اجلاس شوریٰ میں اطمینان وتشکر کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ابتلا کے دور میں ہم کو داخل بھی کیا اور ہمارا نگہبان اور پشتیبان بھی بنا رہا اور ہمیں آزمائش کے دور سے نجات بھی دی۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہمیں دوبارہ اکٹھا ہونے کا موقع نہ ملے گا، مگر یہ احساس صرف ان لوگوں کا تھا جو محض ظاہری اور مادی اسباب پر نگاہ رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ مایوسی اور ناامیدی کے عمیق غار میں ڈوب جایا کرتے ہیں۔ لیکن جن کی نگاہ دوررس اور گہری ہے، جو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جن کے پیش نظر صرف دنیا نہیں آخرت ہے وہ اخلاقی طاقت کی فتح مندی پر یقین رکھتے ہیں۔ دنیا میں بھی اخلاقی پہلو ہمیشہ غالب ہوتا ہے۔ جس طرح یہ حقیقت ہے، یہ مادی جسم دماغ کی بہ نسبت بہت بڑا ہے اسی طرح ہمیں یہ مادی دنیا اخلاقی پہلو کے مقابلے میں بڑی نظر آتی ہے۔ لیکن جس طرح انسان کے بڑے جسم میں چھوٹا دماغ غیر معمولی اور غالب اہمیت کا حامل ہے اسی طرح مادی دنیا کے پھیلاؤ اور وسعت کے باوجود اخلاقی پہلو کی عظمت، رفعت اور غالب حیثیت مسلم ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کی نگاہیں اخلاقی پہلو پر ہوتی ہیں وہ حالات کے ظاہری الٹ پھیر سے ہراساں اور پریشان نہیں ہوتے۔''

ایمر جنسی ختم ہوئی تو ایک دوسری آزمائش سامنے آئی۔ مسلمانوں کے درمیان اس پروپگنڈے نے بڑے شدومد کے ساتھ سر ابھارا اور اردو اخبارات نے بھی اس میں خوب خوب حصہ لیا کہ جماعت اسلامی اور آر ایس ایس میں گٹھ جوڑ اور خفیہ معاہدہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ بات اتنی سی تھی کہ جیل میں ۲۱ ماہ جماعت کے کارکنان کو آنند مارگ، آر ایس ایس اور دیگر سیاسی پارٹیوں کے کارکنان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جماعت کے کارکنوں نے غیر مسلموں کے درمیان تبلیغ دین اور تعارف اسلام کا فریضہ انجام دیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی اور جب جیل سے باہر آئے تو بھی ان جیل کے ساتھیوں کو اسلامی لٹریچر پہنچاتے رہے جو مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے، اس میں آر ایس ایس کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ امیر جماعت نے بیان دیا کہ آر ایس ایس کے سربراہ بالا جی دیورس سے آج تک نہ میری ملاقات ہوئی ہے، نہ مراسلت تو گٹھ جوڑ اور معاہدہ کس نے کیا۔ کیا سربراہوں کی بات چیت کے بغیر ایسا ہو سکتا ہے؟ اور کیا دو متضاد نظریہ رکھنے والے لوگوں کے درمیان کوئی سانٹھ گانٹھ ممکن ہے؟ اس کے باوجود جب بنارس میں آر ایس ایس کے دفتر کی عمارت میں جس کا نام ''رام مندر'' تھا جب جماعت کے کارکنان ملاقات کیلئے گئے اور نماز کا وقت آ گیا تو وہیں نماز پڑھ لی تو اخبارات نے یہ شر انگیز پروپگنڈہ کیا کہ جماعت اسلامی والوں نے رام مندر میں نماز پڑھی۔ بالا جی دیورس کا جمشید پور دورہ ہوا تو اخبارات نے یہ بے پر کی خبر اڑائی کہ جماعت اسلامی ہند کے شمیم احمد مدنی نے بالا جی دیورس کو سونے کا قلم تحفہ میں پیش کیا۔ اپریل ۱۹۷۹ء کے اوائل میں جمشید پور میں ہولناک فساد ہوا تو جماعت اسلامی پر یہ بہتان گڑھا گیا کہ جمشید پور کے فساد پر جماعت اسلامی خاموش رہی کیونکہ اس میں بھی آر ایس ایس ملوث تھا۔ حالانکہ فساد کے فوراً بعد مسلم مجلس مشاورت کے وفد نے جمشید پور کا دورہ کیا تھا جس میں امیر جماعت اسلامی ہند بہ نفس نفیس شریک تھے اور وفد نے فساد کیلئے آر ایس ایس کو کھلے لفظوں میں مجرم ٹھہرایا تھا۔ جمشید پور میں ایک ایمبولنس گاڑی کو جب بم سے اڑا دیا گیا جس میں عورتیں اور بچے بھی تھے تو امیر

حلقہ بہار نے اس ہولناک واقعہ کی مذمت کی مگر پٹنہ کے ایک مسلم اخبار نے اس بیان کے بعد بھی شرانگیزی جاری رکھی تو امیر حلقہ نے اخبار کے مدیر کو خط لکھ کر تذکیر اور خدا سے ڈرنے کی تلقین کی۔

بھٹو گردی :

یہی وہ موقع ہے جب ۴ راپریل ۱۹۷۹ء کو پاکستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو مقدمہ قتل کے سلسلے میں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ مسٹر بھٹو کو سزائے موت پاکستان میں دی گئی لیکن اس کے ردعمل کے طور پر ظلم وستم کا نشانہ جماعت اسلامی ہند اور جماعت اسلامی کشمیر کو بنایا گیا۔ سب سے زیادہ لرزہ خیز واقعات تو کشمیر میں پیش آئے جہاں ۱۲۷ گاؤں میں جماعت اسلامی والوں کے مکانات پھونک دیے گئے اور سینکڑوں مکانوں، دکانوں، لائبریریوں، دفاتر، کارخانوں، باغات کو لوٹا، جلایا اور کاٹا گیا اور ۴۰ کروڑ سے زیادہ کی املاک کا نقصان ہوا اور جماعت کے تین رفقاء کو بلوائیوں نے شہید کیا۔ لیکن ہندوستان میں جس ریاست میں سب سے زیادہ نقصان پہنچایا گیا وہ بہار ہے جہاں متعدد شہروں مثلاً بہار شریف، سہسرام، اسلام پور، جموئی، بھاگل پور، موتی ہاری، سیتامڑھی، دربھنگہ، بارو، فاربس گنج، رانچی، کنزاس گڑھ، وغیرہ میں جماعت کے دفاتر، لائبریریوں، درس گاہوں پر قبضہ کیا گیا یا انہیں لوٹا اور جلایا گیا۔ جماعت کے لوگوں کو گالیاں اور دھمکیاں دی گئیں اور ایذائیں پہنچائی گئیں۔ پورے ہندوستان میں پروپگنڈہ کیا گیا کہ جماعت اسلامی والوں نے خوشی منائی اور مٹھائیاں تقسیم کیں۔ اتفاق کی بات کہ اس موقع پر حلقہ بہار میں دعوتی ہفتہ منایا جارہا تھا۔ جس دن بھٹو مرحوم کو پھانسی دی گئی غالباً ہفتہ کا آخری دن تھا اور پٹنہ کے دفتر میں معززین کی نشست رکھی گئی تھی۔ محترم ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم نے محض احتیاط کے طور پر یہ ہدایت فرمائی کہ ٹی پارٹی میں مٹھائی نہ رکھی جائے۔ کہیں لوگ یہ نہ محسوس کریں کہ آج بھٹو مرحوم کو پھانسی دی گئی ہے اور ہمارے اجتماع میں مٹھائی کھائی جارہی ہے۔ چنانچہ اس ہدایت پر عمل ہوا۔ لیکن اجتماع کے فوراً بعد ہی شہر میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ جماعت کے دفتر میں مٹھائی تقسیم ہوئی۔

اس تمام طوفان بدتمیزی میں دین کو افیون سمجھنے والے کمیونسٹ مسلمان تو پیش پیش تھے ہی، اچھے خاصے دیندار مسلمان، دینی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے اور دین کے لیے گشت کرنے والے مسلمان بھی شامل ہو گئے تھے۔ مدتوں سے جماعت کے خلاف جو پروپگنڈہ دینی حلقوں کی طرف سے کیا جارہا تھا مثلاً ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ سہارنپور سے ان جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا تھا----''مودودی فتنہ کو مٹادو''، ''مودودی تحریک مہلک اور زہر قاتل ہے''، ''مودودی کے ہم خیال گمراہ ہیں''، ''مودودیوں کے پیچھے نماز نہ پڑھو'' یا مثلاً ایمرجنسی کے دوران، جب جماعت کے افراد قید وبند کی آزمائش سے دوچار تھے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی کتاب ''فتنہ مودودیت'' شائع ہوئی تھی، اس کے نتیجے میں سادہ لوح عوام نے جماعت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ظاہر ہے جو جماعت ضال ومضل ہے اس کو تو بہت پہلے ہی مٹادینا چاہئے تھا۔ اب جو مسٹر بھٹو کی پھانسی کے بعد یہ سنہرا موقع ہاتھ آیا تو اسے کیسے ضائع کر دیتے۔ اس لئے ہر طرح کے مسلمان اور متضاد عناصر خواہ وہ اشتراکی ہوں یا دیندار، جو جماعت سے کسی درجہ میں بھی مخاصمت رکھتے تھے یا سادہ لوح عوام جو غلط فہمی کے شکار تھے وہ سب جماعت کے خلاف ایک ''مقدس جہاد'' کیلئے صف آراء ہو گئے اور انہوں نے جماعت کے لوگوں کو ایذا پہنچانے، ان پر حملے کرنے، ان کی اور جماعت کی املاک کو لوٹنے، جلانے اور ان پر غاصبانہ قبضہ کرنے نیز قرآن وحدیث کی بے حرمتی کرنے کے ''مقدس کارنامے'' انجام دئے۔ چنانچہ سہسرام میں اسٹڈی سرکل کی تباہی کے بعد جب ایک غیر مسلم نے قرآن کے پھٹے ہوئے اوراق زمین پر بکھرے ہوئے دیکھے تو انہیں جمع کر کے قریب کے ایک درخت کی شاخ میں کاغذ کی ایک تھیلی میں رکھ کر لٹکا دیا کہ یہ پاک کتاب کے اوراق ہیں، انہیں اس طرح نہیں پھینکنا

چاہیئے۔اس موقع پر اردو اخبارات نے بھی خوب خوب زہر افشانی کی اور جماعت کے خلاف بہتان، افتراء اور تہمتوں کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ پٹنہ کے ایک کانگریسی اخبار نے بھی خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اس ہیجان انگیز ماحول میں بہار کی جماعت نے ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں صبر و ثبات، تحمل و بردباری اور پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے قابل قدر کوششیں کیں۔ مضامین اور کتابچے شائع کئے۔ مولانا طیب عثمانی صاحب نے اپنے قلمی نام سے اس موضوع پر ایک مفصل اور موثر مضمون لکھا جو اس وقت کے 'دعوت' میں شائع ہوا۔ مضمون کا عنوان تھا ''میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند''۔ حلقہ بہار کی جماعت نے اسے کتابچہ کی صورت میں چھپوا کر بڑے پیمانہ پر تقسیم کیا۔

انجمن اسلامیہ میں امامت سے بے دخلی :

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب عرصۂ دراز سے انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں رمضان المبارک کے موقع پر باضابطہ انجمن کی دعوت پر خطبۂ جمعہ دیتے اور نماز پڑھاتے چلے آرہے تھے اور ڈاکٹر صاحب کا خطبہ سننے کیلئے شہر کا پڑھا لکھا طبقہ بڑے ذوق وشوق اور بہت اہتمام سے یہاں بہت بڑی تعداد میں جمع ہوتا تھا۔ لیکن بھٹو گردی کی مخالفانہ لہر کے بعد جب پہلا رمضان آیا تو انجمن کے ذمہ داران نے کمیونسٹوں کے زیر اثر اس بار ڈاکٹر صاحب کو خطبۂ نماز جمعہ کیلئے نہیں بلایا۔ یہ گویا انہیں انجمن کی امامت سے محروم کرنے کی ایک چال تھی۔ اسی سال عید الفطر کے خطبہ میں جماعت اہل حدیث کے رہنما مولانا عبدالسمیع جعفری صاحب (جو ان دنوں مدینہ میں تھے اور رخصت پر آئے ہوئے تھے) ہزاروں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ جو قوم اپنے درمیان اہل تقویٰ کو منبر سے اتارتی ہے وہ بد نصیب ہوتی ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اللہ کا عذاب اس پر نازل نہ ہو، اور یہ فرمایا کہ ضیاء الہدیٰ صاحب سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو لیکن وہ نیک اور متقی آدمی ہیں، اُن کو خطبہ سے روک کر اہل پٹنہ نے اچھا نہیں کیا۔ اس خطبہ کا بڑا اچھا اثر مصلیوں نے لیا اور پھر بات پورے شہر میں پھیلی۔ مگر دوسرے سال بھی رمضان کے موقع پر جب یہی ہوا کہ خطبہ و نماز کے لئے ڈاکٹر صاحب کو انجمن کی طرف سے دعوت نہیں دی گئی اور کسی اور کو امامت کے لئے بلایا گیا تو نمازیوں نے احتجاج کیا اور کہا کہ وہ کسی اور کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے۔ چنانچہ عین وقت پر نماز پڑھانے کے لئے لوگوں کو جا کر ڈاکٹر صاحب کو کار سے لانا پڑا۔ اس کے بعد موصوف برابر رمضان میں حسب سابق خطبہ و نماز کا فریضہ انجام دیتے رہے سوائے ان ایام کے جب آپ شدید بیمار ہوئے اور کلنک میں بھرتی رہے۔

شاہ بانو کیس اور ایس آئی او کے جلوس پر فائرنگ:

ایک اور اہم واقعہ قابل ذکر ہے، یعنی شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کا شریعت اسلامی سے متصادم وہ فیصلہ جس نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں بے چینی اور بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی تھی۔ ریاست بہار کے اندر ایس آئی او کے زیر اہتمام اور ایس آئی او کے بینر (Banner) کے تحت مسلمانوں کے ہر طبقہ و فرقہ کے متحدہ احتجاجی جلوس بڑے تزک و احتشام، نہایت حسن انتظام اور امن و آشتی کے ساتھ مختلف شہروں میں نکالے گئے جس میں بلا مبالغہ لاکھوں لاکھ مسلمان شریک ہوئے اور ملی اتحاد کا ایسا مثالی مظاہرہ ہوا جیسا کہ ۱۹۶۴ء کے فساد کے بعد مسلم مجلس مشاورت کے جلسوں میں ہوا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ ان مظاہروں کا حکومت وقت پر مثبت اثر پڑا اور تحریک احتجاج نے فیصلے کو بدلوانے میں موثر رول ادا کیا۔ اس موقع پر غالباً پٹنہ وہ واحد مقام ہے جہاں ایس آئی او کے زیر اہتمام مسلمانوں کے جلوس پر پولس فائرنگ ہوئی جس میں متعدد طلباء زخمی ہوئے۔ ایک دو تو زندگی بھر کے لئے معذور ہو گئے۔ جلوس کو اشتعال و انتشار اور تخریب و تشدد سے بچانے کے لئے ایس آئی او پٹنہ کے اس وقت کے صدر مقامی ارشد اجمل صاحب نے موقع واردات ہی پر اعلان کر دیا کہ لوگ اس وقت گھروں کو لوٹ جائیں اور آج شام میں انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں جمع ہوں۔ چنانچہ عوام

الناس کا بہت بڑا اور پر جوش مجمع انجمن کے وسیع وعریض ہال میں جمع ہو گیا مگر ایس آئی او کے ذمہ داران یعنی اس وقت کے صدر تنظیم جناب اشفاق احمد اور مقامی صدر جناب ارشد اجمل چونکہ فائرنگ کے فوراً بعد وفد لے کر چیف منسٹر سے ملاقات کے لئے چلے گئے تھے اور وہاں سے واپسی پر زخمیوں کا حال دیکھنے ہسپتال پہنچے تھے اس لئے ان لوگوں کو وقت پر انجمن پہنچنے میں تاخیر ہوئی۔ ایسے موقع پر بڑا اندیشہ ہوتا ہے لیڈر قسم کے لوگ، جو ایسے مواقع کی تلاش ہی میں رہتے ہیں، اسٹیج سنبھال کر حالات وواقعات کا رخ کچھ سے کچھ کر دیں اور اپنی جذباتی اور اشتعال انگیز باتوں سے تعمیری تحریک کو تخریب کا راستہ دکھا دیں۔ اور فی الواقع پٹنہ کے کئی سرکردہ لیڈر وہاں موجود تھے اور مائک سنبھالنے کے کوشاں بھی تھے۔ مگر ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب نے، جو بروقت وہاں سرپرست ایس آئی او بہار کی حیثیت سے موجود تھے، موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر ہی اچانک مائک سنبھال لیا۔ جب ایس آئی او کے ذمہ داران وہاں پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کا خطاب جاری تھا اور وہ فرما رہے تھے کہ آپ کے قائدین چیف منسٹر کے پاس گئے ہوئے ہیں، وہ آکر بتائیں گے کہ کیا باتیں ہوئی ہیں۔ مجمع جو جوش اور جذبات بلکہ اشتعال سے بھرا ہوا تھا اسے ڈاکٹر صاحب کی سنجیدہ اور حوصلہ مندانہ باتوں سے تعمیری رخ ملا، جذبات میں جو تموج تھا اس میں ٹھہراؤ پیدا ہوا اور ٹکراؤ، تشدد اور مقابلہ آرائی کی جو نا مناسب فضا بن گئی تھی، جس کے نتیجے میں یقیناً تحریک احتجاج کا مقصد فوت ہو جاتا اور ایس آئی او پر بھی اشتعال، تشدد اور ہنگامہ آرائی کا الزام آتا اس پر روک لگ گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ بروقت اقدام ان کی قوت فیصلہ، قائدانہ بصیرت اور رہنمایانہ سوجھ بوجھ کا بین ثبوت ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب خلوت وگوشہ، تذکیر ودرس اور تربیت واجتماع کے آدمی ہیں مگر ان کے طرز عمل نے بتا دیا کہ وہ عوامی رہنما بھی ہیں اور وقت آنے پر ہنگامی حالات میں بھی عوامی تحریک کی قیادت بحسن وخوبی کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ جلوس انجمن اسلامیہ ہال سے جس وقت روانہ ہو رہا تھا محترم ڈاکٹر صاحب نے روایت کے بالکل خلاف اس جلوس کو شاید پہلی بار انجمن کے بالا خانہ کی بالکونی سے خطاب کیا تھا اور سامعین کا مجمع ہال کی بجائے انجمن کے میدان میں موجود تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی تمام خطابات انجمن کے ہال میں موجود اسٹیج سے کیے جاتے رہے یا جمعہ کی نماز کے موقع پر منبر وخطبہ والی جگہ سے۔ اس لحاظ سے یہ خطاب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک یادگار خطاب تھا۔

پولس فائرنگ سے حکومت اور انتظامیہ کی تصویر بہت خراب ہو گئی تھی اور بڑا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وزیر اعلیٰ نے بار بار ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن ہر بار وہ یہ جواب بھجواتے رہے کہ ان کی پولس اور ذمہ داران نے زیادتی کی ہے، جن پر زیادتی ہوئی ہے ان سے بات کریں اور انہیں اعتماد میں لینے کی کوشش کریں۔ یہاں تک کہ فون پر بھی بات کرنا موصوف نے وزیر اعلیٰ سے گوارہ نہیں فرمایا۔ نتیجتاً حکومت نے متاثرین کے علاج ومعالجہ پر غیر معمولی توجہ کی، یہاں تک کہ چند طلبہ کو بذریعہ طیارہ دہلی بھی علاج کے لیے بھیجا۔

زندگی انجمن آراء:

رہنما کے اوصاف کے سلسلے میں علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

بلا مبالغہ ڈاکٹر صاحب اس شعر کا مصداق تھے۔ فکر کی گہرائی، ذہنی افق کی وسعت، نصب العین سے عشق، اس کے حصول کے لئے والہانہ تڑپ اور پیہم سعی وعمل، رفقائے کار کے ساتھ خوئے دلنوازی، اخلاص فی العمل اور کردار کی بلندی---- ان جواہر نے

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو چار چاند لگا دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مجسم تحریک اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ اپنے رفقائے کار کے لئے خاص طور سے Magnet کی حیثیت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اندر رہنمائی کی صلاحیت فطری تھی۔ چنانچہ زندگی کی آخری سانس تک یہ فریضہ وہ انجام دیتے رہے۔ کسی ذمہ داری کے منصب پر نہ بھی ہوتے تو ان کی شخصیت میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ ارادت مندوں کا ایک حلقہ ان کے گرد ضرور رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کبھی تنہا اور الگ تھلگ نظر نہیں آئے، بلکہ ان کی زندگی ہمیشہ ''انجمن آراء ونگہبان خود است'' کی تصویر نظر آئی۔ جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد بھی ان کی اس انجمن آراء زندگی میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔

ڈاکٹر صاحب کی اس انجمن کے پروانوں میں ایں قدر سے آں قدر تھے۔ توتلی زبان بولنے والے چھ سات سال کے بچوں سے لے کر ستر اسی سال کے ضعیف العمر تک۔ اور کمال یہ ہے کہ انسیت اور بے تکلفی میں کوئی کسی سے کم نہیں تھا۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ ڈاکٹر صاحب بھی ہر عمر کے لوگوں سے یکساں دوستی، محبت اور شفقت رکھتے تھے۔ اسی لیے ہر عمر کے لوگوں کے یار اور مونس وغمخوار تھے۔ بچوں کے بھی دوست اور بچوں کے باپ کے بھی دوست۔ سب کیلئے مرکز کشش اور وجہ طمانیت وانبساط۔ یہ خوبی کم لوگوں میں دیکھی گئی ہے، اس لئے اسے ڈاکٹر صاحب کا امتیازی وصف کہا جائے تو کوئی بے جا بات نہ ہوگی۔

دفتر کے معمولات:

ڈاکٹر صاحب معمولات کے بہت پابند تھے، لیکن اس پابندی میں بھی انکسار اور دوسروں کی رعایت کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ ورنہ عام طور پر معمول کے پابند لوگوں سے رجوع کرنے میں خاصی زحمتیں پیش آتی ہیں۔ پہلے سے وقت طے کیے بغیر ملاقات کرنا دشوار ہوتا ہے، مگر ان کے ملنے والوں کو شاید ہی کبھی ایسا احساس ہوا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی کٹیا کیا تھی ایک کھلا دربار تھا۔ باریابی کے لئے پہلے سے اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، جاہل عالم جو کوئی ان سے ملاقات کیلئے پہنچ جائے اس کا استقبال خوش دلی سے کرتے۔ کبھی کسی کو یہ جواب نہ دیتے کہ آپ بے وقت تشریف لائے، آج ملاقات نہیں ہوسکتی، یا کسی کو یہ نہ کہتے کہ ابھی فلاں شخصیت سے محو گفتگو ہوں، تم ذرا بعد میں آنا۔ ایسی مثال مجھے نہیں معلوم الا ماشاء اللہ۔ اس کے برعکس ان کے چھوٹے سے کھپریل والے کمرے کا منظر بالعموم یہ ہوتا کہ بیک وقت ہر سطح کے لوگ موجود رہتے اور ہر طرح کے موضوعات پر باتیں ہوتی رہتیں۔

ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ مرحوم ومغفور کی دفتر حلقہ میں حاضری کا معمول یہ تھا کہ آپ ظہر کی نماز کے بعد عموماً ڈھائی بجے دن میں تشریف لاتے اور عشاء کی نماز کے بعد اپنی قیام گاہ واپس چلے جاتے۔ بالعموم امیر حلقہ والے کمرے میں بیٹھنے کی بجائے اسٹاف روم میں ہی بیٹھتے اور وہیں پر دفتری امور انجام دیتے۔ جب کبھی مشاورتی نشست ہوتی یا کسی مہمان سے ملاقات وگفتگو کا موقع ہوتا تب ہی اپنے چیمبر میں بیٹھنے کی نوبت آتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ دفتر میں کوئی خاص کام ان کی توجہ کے لیے نہیں رہا، لیکن اس کا لحاظ کیے بغیر کہ وقت کا زیادہ سے زیادہ بہتر استعمال دفتر کے اوقات میں ہورہا ہے یا نہیں، وہ اپنی تمام تر ذاتی وسماجی مصروفیات سے دستکش ہوکر یکسوئی اور اہتمام کے ساتھ دفتر حلقہ میں موجود رہتے۔ لیڈر کی موجودگی بھی کیڈر اور ورکر کیلئے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے نفسیاتی اور واقعی اثرات ہوتے ہیں۔ کارکردگی پر اس کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے اور پڑتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب دفتر آتے تو پہلے ڈاک دیکھتے۔ جواب طلب اور اہم خطوط کے سلسلے میں اپنے معاونین کو ضروری ہدایتیں دیتے۔ خطوط کا جواب اپنے ہاتھ سے نہیں لکھتے تھے۔ اس لیے کہ ایک زمانہ میں داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں فریکچر ہوجانے کے بعد سے لکھنے کا سلسلہ موقوف ہوگیا تھا۔ کوشش بھی کرتے تھے تو بمشکل کچھ لکھ پاتے تھے۔ خطوط کے جواب املاء بھی نہیں کراتے تھے جیسا کہ بعض

امرائے حلقہ جات اور ذمہ داران کو دیکھا ہے املاء کراتے ہوئے، بلکہ اس کے برعکس اپنے سکریٹریز کو ضروری نکات بتا دیتے تھے اور خطوط تیار ہو کر ان کی میز پر آ جاتے تھے۔ کوئی سرکلر بھیجنا ہوتا تو اس کا مسودہ بھی سامنے آ جاتا اور ان کی منظوری کے بعد سپرد ڈاک کر دیا جاتا۔ یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے معاونین پر خاصا اعتماد تھا۔

لیڈرشپ کی یہ خصوصیت بھی موصوف میں نمایاں تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے مسئلہ میں دخل نہیں دیتے تھے بلکہ اہم معاملات میں ہی رہنمائی فرماتے تھے تاکہ کارکنوں میں خود اعتمادی، خود احتسابی اور خود سے فیصلہ کر لینے کی صلاحیت پروان چڑھے۔ بالعموم رہنمائی اس وقت کرتے تھے جب ان کے احباب اور ماتحت کارکنان رہنمائی کے طالب ہوں۔ البتہ بعض اہم معاملات میں، جہاں لوگوں کی نگاہیں نہ جا رہی ہوں، جب انہیں احساس ہوتا تو وہ پہل بھی کرتے تھے۔ مثلاً پندرہویں صدی ہجری کے استقبال کی بجائے ہر جگہ پندرہویں صدی کے آغاز کی بات ہو رہی تھی اور جماعت کے لوگوں کی تحریروں میں بھی یہ بات آ رہی تھی تو انہوں نے دفتر حلقہ سے جاری کیے جانے والے سرکلر میں بطور خاص اس امر کی صراحت کی کہ آغاز کی بجائے استقبال کا لفظ استعمال کیا جانا چاہیے۔

تنظیمی صلاحیت :

گرچہ موصوف کے اندر تنظیمی صلاحیت نمایاں نہیں تھی، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تنظیمی صلاحیت کا فقدان تھا۔ ایک بڑے نظم میں اگر اس صلاحیت کا فقدان ہو تو افراتفری اور بے اطمینانی عام ہو جاتی ہے، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا اس کے باوجود کہ معمول کے تنظیمی دورے امیر حلقہ بہ نفس نفیس خود نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہی محسوس ہوتی ہے کہ ضروری تنظیمی لیاقت ان کے اندر موجود تھی اور وہ مختلف صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ اگرچہ اس طرح کے کاموں میں راست دخل نہیں دیتے تھے لیکن ان کاموں کے لئے مناسب افراد کا انتخاب اور بہتر سے بہتر شخص کو مامور کرنے کی طرف توجہ ہوتی تھی۔ ایک اچھے منتظم کی اپنی نوعیت کی یہ بھی ایک بڑی لیاقت کہی جائے گی وہ خود تو دورہ نہ کرے اور بہ نفس نفیس یونٹوں میں پہنچ کر حالات کا جائزہ نہ لے سکے مگر ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر ہی ہر طرف نظر رکھے اور سارا نظم سنبھالے رہے۔ چنانچہ یہ لیاقت ڈاکٹر صاحب کے اندر موجود تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی صحت اور اپنی اہلیہ کی مسلسل علالت اور علاج و تیمارداری کی ہمہ وقت ذمہ داری کی وجہ سے دورہ کرنے سے معذور تھے۔ بڑے بڑے پروگراموں اور اجتماعات میں تو شرکت ہو جاتی تھی لیکن معمول کے تنظیمی دوروں میں امیر حلقہ کی نیابت ان کے معاونین ہی کیا کرتے تھے۔ یہ تنظیمی لیاقت کی کمی نہیں بلکہ ایک طرح کی معذوری تھی ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر امیر حلقہ بہ نفس نفیس خود دورہ کرنے کے قابل ہوتے تو کتنا بھی کم دورہ کرتے وہ معاونین کے دوروں سے تو یقیناً زیادہ موثر ہوتا۔ ابھری ہوئی تنظیمی صلاحیت کے نہ ہونے کے باوجود میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کی شخصیت میں جو وجاہت، وزن اور وقار تھا، جو علمی و فکری گہرائی، تقویٰ اور للّٰہیت تھی، کردار کی جو بلندی اور نصب العین کے لئے جو خود سپردگی تھی، تحریک کے لئے ایثار و قربانی کی جو مثالیں انہوں نے قائم کی تھیں اور ان سب کی وجہ سے رفقائے کار میں ان کے لئے تقدس اور احترام کا جو جذبہ پایا جاتا تھا ان کی موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کا بحیثیت امیر حلقہ کسی مقام پر بہ نفس نفیس پہنچ جانا ہی اس مقام کے کارکنوں اور متوسلین جماعت کو سرگرم عمل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ ظاہر ہے یہ اثر ان کے معاونین تو نہیں ڈال سکتے تھے۔ یہ کمی بہرحال رہی اور کسی قدر اس کے منفی اثرات بھی پڑے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے معاونین کے ذریعے ممکنہ حد تک اس کمی کی تلافی کی کوشش کی اور بفضلہ تعالیٰ کسی طرح کی بے اطمینانی کا احساس نہیں پایا گیا۔ البتہ خوب سے خوب تر کی جستجو اور مطلوب کی تلاش کی فطری خواہش پوری نہ ہوئی۔

تنظیمی صلاحیت اور نظم و ضبط کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر ایک اچھے آرگنائزر میں سختی کا کچھ پہلو نمایاں ہوتا

ہے۔موصوف کے اندر یہ چیز نہیں تھی۔ڈاکٹر صاحب مزاجاً نرم تھے۔اصولوں کی پابندی میں سخت گیری ضرور تھی مگر اس حد تک نہیں کہ تنبیہہ واصلاح میں سخت کلامی اور درشت خوئی کا رویہ اختیار کرلیں یا کوئی ایسا انداز اختیار کریں جو ان کے رفقائے کار کو آزردہ خاطر کرنے والا ہو۔وہ لوگوں کی عزت نفس کا بڑا خیال رکھتے تھے اور بالعموم تذکیر میں کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کردیا کرتے تھے۔اس نرم مزاجی کے باوجود نظم وضبط اور ڈسپلن کے خود بڑے پابند تھے اور دوسروں کو پابند رکھنے کی حتی الوسع کوشش کیا کرتے تھے۔نظم وضبط کی پابندی کے معاملہ میں ان کی یہ چابکدستی اور ان کا یہ ذاتی عمل بذات خود رفقائے تنظیم کے لیے ایک خاموش پیغام تھا۔وہ نظم وضبط کے سلسلے میں کچھ کہیں یا نہ کہیں، جہاں ڈاکٹر صاحب پہنچ جاتے، ان کی شخصیت کے زیر اثر وہاں خود بخود نظم وضبط کا ایک ماحول پیدا ہوجاتا تھا۔پٹنہ کے امیر مقامی، ڈاکٹر صاحب ایک لمبے عرصہ تک رہے اور شاید اسی وجہ سے پٹنہ کی تنظیم نظم وضبط اور ڈسپلن کے اعتبار سے نسبتاً معیاری اور مثالی رہی۔

تنظیم کے فروغ اور استحکام کے لئے تدبیریں سوچتے رہنا اور انہیں روبہ عمل لاتے رہنا ان کے مزاج کا حصہ تھا۔چنانچہ ضلعی اور علاقائی نظم کو چست اور بہتر بنائے رکھنے کے لئے دوروں کا اہتمام کروانا، اجتماعات کا مناسب وقفوں سے انعقاد اور انہیں مفید وموثر بنانے پر مسلسل توجہ، نیز حلقہ خواتین، حلقہ طلبہ اور حلقہ طالبات میں کام کو منظم اور مستحکم کرنے کے لئے نوع بہ نوع پروگراموں کو روبہ عمل لانے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔حلقۂ خواتین میں کام کو فروغ دینے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے حلقہ کی سطح پر باضابطہ ایک خاتون رکن جماعت محترمہ امینہ خاتون کی ہمہ وقتی خدمات بھی حاصل کرلی تھیں جنہوں نے خواتین کا شعبہ سنبھال کر بہار کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور خواتین میں کام کو منظم اور متحرک کرنے کی کوشش کی۔اس کوشش کے مثبت اثرات ہوئے اور خواتین میں کام کے لئے کچھ تیز ہوگئی۔جہاں تک طلبہ میں کام کا سوال ہے امیر حلقہ بننے سے پہلے ہی جبکہ ڈاکٹر صاحب پٹنہ کے امیر مقامی ہوا کرتے تھے، ان کی نگرانی وسرپرستی میں جماعت سے متاثر طلبہ کا علیحدہ حلقہ ''حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی، پٹنہ'' کے نام سے وجود میں آچکا تھا۔یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ویسے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۷ء میں ہی طلبہ میں منصوبہ بند کام کی باضابطہ ابتدا کردی تھی اور اس سلسلے میں ۱۹۶۹ء میں حمزہ پور شیر گھاٹی میں ہونے والا طلبہ کا پانچ روزہ تربیتی اجتماع ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔امارت حلقہ کی ذمہ داری آئی تو طلبہ کی تنظیم جو بتدریج پٹنہ کمشنری کی سطح تک پھیل چکی تھی امیر حلقہ کی سرپرستی میں باضابطہ ایک دستور کے تحت ''حلقہ طلبہ اسلامی بہار'' کے نام سے ۱۹۷۳ء میں پورے بہار کی سطح پر منظم ہوگئی، اور ڈاکٹر صاحب کی مربیانہ رہنمائی، حوصلہ افزائی اور مشفقانہ سرپرستی میں روز بروز آگے ہی بڑھتی رہی۔اظہار واقعہ اور تحدیث نعمت کے طور پر یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس وقت پورے ملک میں طلبہ کے درمیان میں جماعت کا سب سے معیاری اور مستحکم کام بہار ہی میں تھا۔بہر حال جو کچھ تھا وہ ڈاکٹر صاحب کا ہی فیض اور ان کی کوششوں کا مرہون منت تھا۔اپنی امارت حلقہ کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے طالبات کے کام پر بھی خاص توجہ دی۔کچھ لڑکیوں کی خصوصی تربیت کی۔انہیں قرآن وحدیث اور کسی قدر عربی کی تعلیم سے آراستہ کیا، ان کی حوصلہ افزائی کی، انہیں آگے بڑھایا۔اس کے نتیجے میں طالبات کے درمیان بھی کام بڑھا اور ''حلقہ طلبہ اسلامی بہار'' کے تحت حلقہ طالبات بھی منظم ہوگیا۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ خواتین اور طالبات کے کام کو آگے بڑھانے میں ڈاکٹر صاحب کی ذاتی دلچسپی اور فکرمندی کا بڑا دخل تھا اور اس سلسلے میں جیسا کچھ تعاون ان کے رفقائے کار کا انہیں ملنا چاہیے تھا اس میں کمی کا احساس انہیں رہا جس کا اظہار ان کے بعض بیانات سے بھی ہوجاتا ہے۔مثلاً ۱۰؍تا ۱۳؍اپریل ۱۹۸۴ء کے اجلاس شوریٰ کے موقع پر فرمایا:

''جو انقلاب ہمارے پیش نظر ہے وہ خواتین کے بغیر ممکن نہیں۔ان کو نظر انداز کرنے کا جو رجحان سامنے آیا ہے وہ ہمارے

لیے پسندیدہ نہیں، سوچیے کہ خواتین کا حلقہ کیسے منظم ہو۔۔۔۔اسی طرح آپ کو خصوصی توجہ دینا چاہیے طالبات کی طرف۔طلبا کا حلقہ قائم ہوگیا مگر طالبات اپنے آپ کو کسمپرسی میں مبتلا محسوس کرتی ہیں۔شوریٰ میں طالبات کے سلسلے میں جو کچھ ہوا اس کو میں دہرانا نہیں چاہتا۔لیکن اب بعض افراد اپنے تجربات کی روشنی میں خود ہی بڑھ بڑھ کر اس کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔طالبات میں اب اتنا حوصلہ نہیں رہا کہ وہ آل بہار سطح پر تنظیم قائم کریں، اس لیے مقامی سطح پر تنظیم کے قیام کی طرف پیش قدمی ہوئی ہے۔مگر اس میں کچھ اختلاف ہوگیا ہے کہ مقامی تنظیم کے لئے دستور کی کیا ضرورت ہے۔ایس آئی او سے ان کا تعلق نہیں رہ گیا۔وہ جماعت سے علیحدہ ہوکر نیم آزاد ہی کی حیثیت سے کام کرنا چاہتی ہیں۔اس لیے آپ غور کریں کہ ان کے کام کو زیادہ سے زیادہ موثر کیسے بنایا جائے‘‘۔

موصوف کی اس تقریر سے ان کی فکرمندی بھی ظاہر ہوتی ہے اور ایک طرح کی خلش کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں کام کرنے والوں کو جو مسرت و شادمانی اور خود اعتمادی کی دولت ملتی تھی اس کا کچھ ذاتی تجربہ مجھے بھی ہے۔جولائی ۱۹۷۳ء ہی سے امیر حلقہ کی معاونت کی سعادت مجھے حاصل رہی جو تقریباً چودہ سالوں کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔میں آفس سکریٹری تھا اور میری ذمہ داریوں میں دفتری امور کی انجام دہی کے علاوہ تنظیمی دورے بھی تھے۔ان دنوں میرا تعلق حلقہ طلبہ اسلامی بہار سے بھی تھا۔میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۴ء تک حلقہ طلبہ اسلامی بہار کا سکریٹری اور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۸ء تک ناظم اعلیٰ رہا۔ اسی دوران ایمرجنسی کے بعد ۱۹۷۷ء میں حلقہ طلبہ اسلامی بہار کی طرف سے ایک پندرہ روزہ ترجمان ’’رفیق‘‘ جاری کیا گیا تو اس کے پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کی ساری ذمہ داریاں بھی میرے سر آگئیں جس کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔اگر کوئی سخت گیر امیر حلقہ ہوتا اور تحریک اسلامی کے وسیع تر مفاد میں سوچنے کی بجائے صرف ضابطوں کی بات کرتا تو میں دفتر حلقہ میں بیٹھ کر جماعت کی دفتری ذمہ داریوں کے پہلو بہ پہلو حلقہ طلبہ اسلامی بہار کی تنظیمی ذمہ داریوں اور پندرہ روزہ رفیق کی ادارت اور انتظامی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہوسکتا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی مشفقانہ سرپرستی کی وجہ سے میری دوہری ذمہ داری الحمدللہ بہت عرصہ تک جاری رہی۔میں جب جماعت کے تنظیمی دورے پر جاتا تو اسی دورے میں حلقہ طلبہ اسلامی بہار کی یونٹوں کا تنظیمی دورہ بھی خود بخود ہوجاتا۔کسی مقام پر پہنچنے کے بعد جہاں جماعت کے کاموں کا جائزہ لیتا، رفقاء سے انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں کرتا وہیں طلبا کی بھی علیحدہ نشستیں ہوتیں اور ان کے کاموں کو بھی دیکھتا۔اس طرح ایک پنتھ دو کاج، کم خرچ بالانشیں سے حلقہ طلبہ اسلامی بہار کی یونٹوں کو خاصا فائدہ ہوا۔رفیق کی ادارت کا سلسلہ تو اپریل ۱۹۷۷ء سے جنوری ۱۹۸۱ء تک چلا۔۲ر فروری ۱۹۸۱ء میں جب حیدرآباد میں ہونے والے آل انڈیا اجتماع کی وجہ سے دفتر حلقہ بہار کی جانب سے اجتماع سے متعلق جملہ مراسلت و سرکلر اور نشر و اشاعت کا بھاری بوجھ دیگر دفتری مصروفیات کے ساتھ ساتھ مجھ پر آن پڑا اور ڈاکٹر صاحب اس ذمہ داری سے رعایت دینے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئے تو میرے لئے ناگزیر ہوگیا کہ رفیق کی جملہ ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو سبکدوش کرلوں۔چنانچہ رفیق کی ذمہ داری میرے کمزور کاندھوں سے اتر کر رفیق عزیز سید محمد اقبال صاحب کے مضبوط کاندھوں پر منتقل ہوگئی۔بعدازاں محمود عالم صاحب کے کاندھوں پر منتقل ہوئی۔یہی رفیق ’’رفیق منزل‘‘ کے نام سے ایس آئی او آف انڈیا کے ترجمان کی حیثیت سے اب دہلی سے شائع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب بیت المال کے معاملہ میں غیر معمولی محتاط تھے اور اسلامی تعلیمات اور قدروں کی اس معاملہ میں پوری پاسداری کرتے تھے۔ایسے مزاج کے لوگ بیت المال کو مستحکم نہیں کرپاتے لیکن اپنی تنظیمی صلاحیت ہی کی وجہ سے وہ جب امیر مقامی رہے تو مقامی بیت المال کو بھی بہت مستحکم رکھا اور رفاہ عام کے کام بھی کروائے۔اور جب امیر حلقہ رہے تو سابق امیر حلقہ کے دور کے مقابلہ میں حلقہ کی مالی حالت بہتر ہوئی۔ہمہ وقتی خدمت کرنے والے بھی بڑھے اور ہمہ وقتی خدمت کرنے والوں کے مشاہروں میں بھی

اضافہ ہوا۔خود تو کوئی معاوضہ یا کفاف بیت المال سے نہ لیتے تھے مگر اپنے ہمہ وقتی کارکنوں کی مالی حالت کی بہتری کے لئے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے اور ان کے مشاہروں میں اضافہ سے انہیں مسرت ہوتی تھی۔

دفتر کی جدید کاری:

ذاتی طور سے غیر معمولی استغنیٰ اور قناعت پسندی پر عامل تھے، اس لئے زندگی غیر معمولی سادہ تھی لیکن دفتر کو منظم کرنے اپ ٹو ڈیٹ (Up to date) اور حتی الامکان مزین رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے دور میں دفتر حلقہ کے نظام میں وسعت پیدا ہوئی، افرادکار میں اضافہ ہوا اور تقسیم کار میں اصول پر کام بھی آگے بڑھا۔

دفتر حلقہ کو Up to date کرنے اور دفتری لحاظ سے چست و درست رکھنے کے نقطۂ نظر سے موجودہ امیر حلقہ جناب قمر الھدیٰ صاحب کو پٹنہ سکریٹریٹ کی ملازمت چھوڑ کر اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ترغیب دلائی اور اس میں کامیاب رہے۔ موصوف نے والنٹری ریٹائرمنٹ لے کر یکم فروری ۱۹۸۲ء کو دفتر حلقہ جوائن کرلیا۔ امیر حلقہ کو دفتر اور فیلڈ پر جیسی کچھ متوازن نظر رکھنی چاہیے ویسی ہی نظر ڈاکٹر صاحب نے رکھی اور عملاً پورے بہار کے نظم کو دفتر حلقہ سے کنٹرول کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی۔

دفتر حلقہ کی عمارت سعید منزل سلطان گنج پٹنہ۔۶ کے حاصل ہونے میں مرحوم کا ذاتی رول نمایاں رہا۔ پھر اسے فروخت کرکے موجودہ دفتر لیڈی انیس امام ہاؤس، پتھر کی مسجد، پٹنہ۔۶ جو پہلے کے مقابلہ میں خاصا وسیع اور بہتر ہے، ان ہی کے حوصلہ اور حسن تدبیر کی وجہ سے جماعت کو مل سکا۔ سعید منزل کی خریداری ۱۹۶۷ء میں اور لیڈی امام ہاؤس، کی خریداری جولائی ۱۹۸۴ء میں ہوئی تھی۔

تطہیر واصلاح:

افراد سے غیر معمولی شفقت ومحبت اور مزاج میں نرمی ولطافت کے باوجود تطہیری کارروائی میں کوئی سستی یا کمزوری نہیں دکھاتے تھے۔ وہ اس خیال کے حامل تھے کہ جماعت کو مستحکم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ نیا اور صاف خون داخل ہوتا رہے اور فاسد خون کا اخراج ہوتا رہے۔ چنانچہ افراد کو قریب کرنے اور ان کی سیرت کی تعمیر کرنے پر جس طرح ان کی توجہ مرکوز تھی اسی طرح ان کے دور میں حسب موقع وضرورت تنبیہہ اور تطہیر کی کارروائی بھی ہوتی رہی۔ موصوف رکن بنانے میں بھی سخت تھے۔ دستور کی پابندی، تحریک اسلامی کی مزاج شناسی اور کردار ومعاملات کی پختگی پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان معاملات میں کمزوریوں کے ساتھ، اس دلیل کی بنیاد پر کہ رکن بننے کے بعد یہ کمزوریاں خود بخود دور ہو جائیں گی، کسی کو رکن بنانے کے قائل نہ تھے۔ ان کا تجربہ تھا کہ رکن بننے کے بعد بیشتر لوگ اپنی کمزوریوں پر قائم ہی نہیں رہتے بلکہ اور پختہ ہو جاتے ہیں الا ماشاءاللہ۔

موصوف نے اس کا بھی لحاظ رکھا کہ نظم جماعت میں اوپر کی سطح پر آنے والے کمزور قسم کے لوگ نہ ہوں۔ اس لئے کہ ذمہ دارانہ مناصب پر جب کمزور لوگ آجائیں گے تو پوری جماعت کمزوریوں کا شکار ہو جائے گی۔ بحیثیت امیر حلقہ یہ ان کا بہت بڑا Contribution تھا۔ خاص طور سے باصلاحیت لوگوں کی بظاہر چھوٹی چھوٹی نظر آنے والی کمزوریاں بھی ان کی نظر میں چھوٹی نہیں ہوتی تھیں۔ اس لئے کہ باصلاحیت لوگوں کے مناصب پر پہنچ جانے کے روشن امکانات ہوتے ہیں۔ ان کی تقریر وتحریر کی غیر معمولی صلاحیت بہت جلد انہیں متوسلین جماعت میں مقبول اور ہردلعزیز بنا دیتی ہے اور صلاحیتوں کی چمک دمک سے نگاہیں اتنی خیرہ ہو جاتی ہیں کہ اس میں ان کی وہ غلطیاں نظر نہیں آتی ہیں جن کی موجودگی میں ان کے لئے ذمہ دارانہ منصب مناسب نہیں ہوتا ہے یا اگر نظر آتی ہیں تو لوگ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی رعایت کرکے ان غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور انہیں ذمہ دارانہ مناصب پر پہنچا دیتے ہیں۔ مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کمزوریوں کے منفی اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور بے اطمینانی کی فضا پنپنے لگتی ہے۔ اس وقت نہ

اصلاح کا موقع ہوتا ہے اور نہ کمزوریوں پر قابو پانے کا۔

تربیت افراد سازی اور ٹیم بنانے کی صلاحیت :

اس سلسلے میں مجھے کچھ زیادہ خامہ فرسائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے اس لئے کہ ایک دنیا ڈاکٹر صاحب کی اس صلاحیت کی معترف ہے۔ وہ اصلاً تربیت ہی کے آدمی تھے۔ افراد سازی اور ٹیم کی بہتر سے بہتر تربیت اور صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہوئے صلاحیتوں کے مناسب استعمال پر ان کی خاص نظر تھی۔ افراد کی علمی تربیت اور عملی تربیت دونوں پر برابر متوجہ رہے۔ علمی تربیت کے لئے جماعت کے طے شدہ مطالعۂ نصاب کے علاوہ اپنا بھی ایک نصاب بنایا اور اسے روبہ عمل لانے کی ممکنہ کوشش کی۔ ایک ایک فرد کی تربیت پر خاص وقت اور توجہ دیتے۔ فیلڈ میں تجربہ کے لئے افراد کو بھیجنا اور حتی الوسع آزادی دینا تاکہ ان کے جوہر کھل سکیں، غلطیوں سے درگذر کرنا اور حوصلہ افزائی کرتے رہنا۔ اس طرز عمل نے اچھی صلاحیتوں کے افراد کی تعمیر کی۔ افراد کے اندر جذبۂ قربانی ابھارنا اور سادہ زندگی اور جفاکشی اختیار کرنے کا عادی بنانا ان کی توجہ کا خاص مرکز تھا۔ لیڈرشپ کے لیے منتخب افراد کی علمی و عملی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے برابر فکرمند اور کوشاں رہے۔ ایسے افراد کے مسائل کو آگے بڑھ کر ہاتھ میں لے لینا اور انہیں فوری طور پر حل کرنے کی کوشش کرنا بھی ان کے مزاج کا حصہ تھا جس سے کارکنوں کو بڑا حوصلہ ملتا تھا اور امیر حلقہ نیز تحریک سے انس ومحبت کا ایک خاص تعلق پیدا ہو جاتا تھا۔ ایمرجنسی میں جیل میں رہتے ہوئے افراد تحریک اور قریبی ساتھیوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے کے لیے برابر ان کی خبر گیری کرتے رہے، صورت حال کی رپورٹیں طلب کرتے رہے اور رہنمائی فرماتے رہے۔ چنانچہ ایمرجنسی ختم ہونے اور جماعت پر سے پابندی اٹھنے کے بعد حلقۂ بہار کی تحریک اسلامی بلند حوصلگی اور تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھی اور نئے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لئے موصوف نے حلقہ کی ٹیم میں نئے افراد کو شامل کیا اور پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ کام کو آگے بڑھایا۔

عمل کی روشنی :

تربیت کے لئے ڈاکٹر صاحب کی تذکیری گفتگو سے جہاں روشنی ملتی تھی وہاں ان کی عملی زندگی اور عملی نمونوں سے بھی نور کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ کسی نے سچ کہا ہے Action is louder than voice یعنی عمل کی طاقت زبان کی طاقت سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جنہوں نے لوگوں کیلئے اصلاح کے مواقع فراہم کیے۔ ہم یہاں بطور مثال چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب مدن پور ضلع ارریہ کے اجتماع میں شرکت کیلئے پٹنہ سے تشریف لے گئے۔ اجتماع کے پروگراموں سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے مقامی ذمہ دار شمیم احمد صاحب سے پوچھا کہ سونے کا انتظام کہاں ہے۔ شمیم احمد صاحب نے بتایا کہ آپ کے سونے کا انتظام یہاں ہے، وہاں ایک بستر بچھا تھا اور مچھردانی لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ نے میرے لیے تو مچھردانی کا انتظام کیا ہے مگر دوسرے شرکائے اجتماع کیلئے نہیں۔ یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ذمہ دار مچھردانی میں سوئے اور ہمارے کارکنان بغیر مچھردانی کے۔ اس لئے آپ مچھردانی یہاں سے ہٹا دیجیے۔ شمیم صاحب ایسا کرنے کے لیے آمادہ نہیں معلوم ہوتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب کے حکم پر انہیں مچھردانی ہٹانی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب اجتماعات وغیرہ میں کسی امتیازی سلوک کو پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ چاہتے تھے کہ امیر و مامور، امیر حلقہ اور عام شرکاء ایک ہی انداز سے رہیں، سب کی رہائش وخوراک میں عمومیت ہو الا عذر صحت تاکہ لوگوں کے دلوں میں کوئی کھٹک، بے اطمینانی اور بے اعتمادی نہ پیدا ہو۔

۱۹۷۹ء کی بات ہے۔ ہسوا (ضلع نوادہ) میں حلقہ طلبہ اسلامی بہار، پٹنہ کمشنری زون کا چارروزہ سالانہ تربیتی اجتماع تھا جس

میں ڈاکٹر صاحب بطور مربی اور نگراں شریک تھے۔ بحیثیت امیر حلقہ وہ دستوری اعتبار سے حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے سرپرست اعلیٰ بھی تھے۔ اس اجتماع میں ان کی حیثیت مہمان خصوصی اور مدعو کی تھی مگر وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنی طعام فیس بہ اصرار اپنی جیب خاص سے اسی طرح جمع کی جس طرح عام شرکاء نے۔ اس واقعہ نے طلباء کو متاثر کیا اور اجتماعی کاموں کیلئے اپنی جیب سے پیسے خرچ کرنے کی ترغیب پیدا کی۔

۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر صاحب کا ہرنیا کا آپریشن ہوا تھا۔ کلنک سے اخراج کے بعد ان کے معالج نے ہدایت کی تھی کہ دو تین مہینے آرام سے رہیں۔ زیادہ حرکت وعمل سے انہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آرام اور سہولت کے خیال سے رفقاء نے ان کی رہائش گاہ عالم گنج کی بجائے ان کی رہائش کا بندوبست دفتر حلقہ کی بالائی منزل والے ایک کمرہ میں کیا تھا جو مہمان خانے کا حصہ تھا تاکہ یہاں رہ کر دفتری امور کی نگرانی اور منصبی ذمہ داری کی انجام دہی بھی بسہولت کر سکیں۔ ڈاکٹر صاحب آنے کے لئے راضی تو ہو گئے مگر اس شرط پر کہ وہ اس کا کرایہ ادا کریں گے۔ رفقاء اور حلقہ کی شوریٰ نے بہت چاہا کہ وہ ایسا نہ کریں مگر وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ چنانچہ مرکز کو صورت حال سے مطلع کیا گیا۔ محترم شفیع مونس صاحب نے مرکز سے ۱۱ر مئی ۱۹۸۶ء کو خط میں جواباً لکھا۔ ''آپ کے رہائشی کمرہ کے سلسلے میں محترم امیر جماعت سے مشورہ ہوا۔ موصوف کا ارشاد یہ ہے کہ دفتر میں آپ کا قیام ظاہر ہے خود جماعت کے لئے بہت مفید ہوگا۔ اس لیے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اس صورت میں آپ کو کرایہ کی ذمہ داری بھی ہو۔ امید ہے آپ مطمئن ہو جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کا دلی احساس کچھ دوسرا ہو تو پھر مناسب یہ ہوگا کہ حلقہ کی مجلس شوریٰ ضرورت اور آپ کے احساسات کو سامنے رکھ کر کوئی رائے قائم کرے اور آپ کو اطمینان ہو جائے۔'' چنانچہ ۲۰/۲۵ر مئی ۱۹۸۶ء کے اجلاس شوریٰ کے موقع پر مجلس سوریٰ کے ایک وفد نے آپ سے ملاقات کر کے آپ کے احساسات معلوم کیے اور موصوف کے مافی الضمیر کا خیال کرتے ہوئے مجلس شوریٰ نے یہ طئے کیا کہ جب تک دفتر حلقہ کے بالا خانے پر من حیث امیر حلقہ قیام پذیر رہیں ان سے تیس روپے ماہانہ کے اعتبار سے کرایہ لیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کے کردار کا یہ پہلو بہت منفرد اور غیر معمولی تھا۔ نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے زندگی بھر جماعتی خدمات کا کوئی معاوضہ یا کفاف نہیں لیا بلکہ جماعت کو اپنی ذات کے لئے استعمال کرنے، اس کے وسائل سے ذاتی فائدہ اٹھانے اور جماعتی ومنصبی اثر ورسوخ کا خراج وصول کرنے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی۔ وہ حد درجہ محتاط آدمی تھے اور اس معاملے میں انہوں نے ایسی مثالیں قائم کی ہیں اور ایسا نمونۂ عمل چھوڑا ہے جس کا مشاہدہ اب ہم جماعت کے ذمہ داروں میں بھی خال ہی خال کر سکتے ہیں۔ بلکہ میرا احساس تو یہ ہے کہ مرور ایام کے ساتھ ساتھ بیت المال کے استعمال کے سلسلے میں بے احتیاطی بڑھتی جا رہی ہے۔

حلقہ طلبہ اسلامی پٹنہ کے ایک رکن نے پرنٹنگ اور پبلشنگ سے متعلق ایک کام شروع کیا مگر سرمایہ کی کمی مانع تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے دلچسپی لی، حوصلہ افزائی کی اور اس خیال سے کہ انہیں کاروباری استحکام حاصل ہو جائے چودہ ہزار کی رقم جوان کے کمرے کے کسی گوشہ میں پڑی ہوئی تھی نکال کر دی۔ بقول رکن مذکور یہ رقم ڈاکٹر صاحب نے کاروباری شرکت کے طور پر دی تھی۔ سوء اتفاق کاروبار میں گھاٹا ہوا اور رقم ڈوب گئی۔ اس شرمندگی سے کہ رقم ڈوب گئی ہے اس نوجوان کو ہمت نہ ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرے۔ وہ شخص جو ہفتہ میں ایک دوبار ڈاکٹر صاحب سے ضرور ملتا تھا اس کا ملنا جلنا ترک ہو گیا تھا۔ اسے بڑی خفت تھی۔ ڈاکٹر صاحب معمولی آمدنی کے آدمی تھے۔ آج سے بیس سال قبل کے Valuation کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ ایک بڑی رقم تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو اس کا ملال نہ تھا، نہ انہوں نے کبھی کسی سے اس کا تذکرہ کیا، نہ ان کے چہرے بشرے سے کبھی اس کا اندازہ ہوا بلکہ شاید انہیں فکر تھی تو اس بات کی تھی کہ اس نے آنا چھوڑ دیا ہے۔ ایک بار بڑی ہمت جمع کر کے اس نوجوان نے ملاقات کی تو

ڈاکٹر صاحب نے چھوٹتے ہی اپنے مخصوص محبت بھرے انداز میں کہا ''ارے تے! کہاں تھا اتنے دن سے، آج کل آتا نہیں ہے۔'' نوجوان جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ڈاکٹر صاحب! ہمت نہیں ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے تسلی دی کہ کاروبار میں گھاٹا اور نفع تو ہوتا ہی ہے، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تسلی کے بعد بھی خفت وندامت برقرار رہ گئی۔ ایک حجاب زندگی بھر کے لئے حائل ہوگیا۔ بعد کے دنوں میں جب اس شخص نے دوسرا کاروبار کیا اور حالات اچھے ہوئے تو اس نوجوان کے دل میں یہ خواہش مچلتی رہی کہ کسی طرح یہ رقم ڈاکٹر صاحب کو واپس کردے، مگر نوجوان ڈاکٹر صاحب کا مزاج آشنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اصولی آدمی ہیں۔ جب رقم انہوں نے کاروباری شرکت کے طور پر دی تو وہ کبھی اس رقم کو قبول نہ کریں گے۔ اور اسی وجہ سے خواہش کے باوجود اسے ہمت نہ ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کو رقم واپس کرے۔ رقم واپس کرے بھی تو کس بنیاد پر، اسے کوئی معقول دلیل نہ ملتی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے اس نقصان کا قلق اسے ہمیشہ رہا۔ ایک احساس جرم اس کے ذہن پر زندگی بھر چھایا رہا۔ مگر خود ڈاکٹر صاحب کو اس کا کوئی قلق نہ تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کردار کی بہت اونچی منزل پر مسند نشیں تھے۔

ڈاکٹر صاحب بڑے اجتماعات وغیرہ میں جب کبھی ہدایات دیتے تو اس پہلو پر اکثر توجہ دلاتے کہ آپ دسترخوان پر بیٹھیں تو اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھیں۔ بات معمولی سی ہے مگر تربیت کے پہلو سے اہم ہے۔ کیونکہ دسترخوان پر بارہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ لوگ پڑوسی کی ضرورتوں سے بے نیاز اپنی ہی ضروریات پوری کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ پڑوسی کو روٹی اور بوٹی ملی کہ نہیں اس کے لیے انگلیوں پر شمار کی جانے والی تعداد فکرمند ہوتی ہو تو ہوتی ہو، سواد اعظم کا حال برا ہوتا ہے۔ اچھے اچھے عالم، مقرر اور مقالہ نگار حضرات بھی اس حمام میں ننگے ہی نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا پیمانہ ہے کہ جس سے کسی شخص کی اخلاقی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اندر صبر، قربانی اور ایثار کا کتنا مادہ ہے۔ اس کے ظرف میں کتنی وسعت اور تنگی ہے۔ جب دسترخوان پر سامان کی فراوانی ہو تب شاید آپ کو کچھ محسوس نہ ہو لیکن جب سامان کی کمی ہو تب دسترخوان آپ کے لیے ایک آزمائش ہے۔ اس وقت پتہ چل جاتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص کی تقریر یا درس سن کر آپ اس کی دانشوری کے قائل اور اس کی عقیدت ومحبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں دسترخوان پر اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر آزردہ بھی ہونے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دسترخوان ہماری اعلیٰ ظرفی اور کم ظرفی کا ایک کھلا پیمانہ ہے۔ دسترخوان پر ہمارا طرز عمل باہمی محبت کے فروغ کا ذریعہ بھی بنتا ہے اور زوال کا سبب بھی۔

تحریک اور ضابطہ :

تحریک اور ضابطہ کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ وہ دونوں میں ایک متوازن اور مناسب تعلق کے قائل تھے۔ جس چیز کی جو حیثیت اور جو تقاضے تھے وہ ملحوظ رکھتے تھے۔ جس طرح دین میں اصل اور فروع، فرض، سنت اور نفل کا اپنا اپنا مقام ہے اور اس کو ملحوظ رکھنا دینی اسپرٹ کا تقاضہ ہے اسی طرح تحریک کی جو اصل حیثیت ہے اور ضابطے کی جو ثانوی اور ضمنی حیثیت ہے اس کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اس سلسلے میں ان کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ اجلاس شوریٰ ۱۰/ تا ۱۳/ اپریل ۱۹۸۴ء کے موقع پر افتتاحی تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''......تحریکی ہیئت کو ضابطوں کا بہت زیادہ پابند بنا دیا جائے تو تحریکیت ختم ہونے لگتی ہے۔ اس لئے میرا اپنا نقطۂ نظر یہی رہا ہے کہ تحریکی ہیئت پر ضابطوں کو زیادہ غالب نہ آنے دیا جائے مگر ہماری شوریٰ کا رجحان کچھ ایسا ہے کہ ضابطوں کو اتنی زیادہ اہمیت دی جارہی ہے کہ تحریکی ہیئت پر غالب آتی جارہی ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں تحریک ضابطوں اور قانون ہی کے ادھیڑ بن میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے بعد کون امیر حلقہ آئے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آئندہ بہت زیادہ ضابطہ بندی اور تحریکیت کے مابین

کشمش کی صورتحال نہ پیدا ہو جائے۔ تحریکیت مجروح ہونے سے فطری طور پر یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ تحریک سے مخلصانہ تعلق میں کمی آجاتی ہے۔ ضابطے اور قانون کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ بے لچک ہوتے ہیں اور تحریک اپنی فطرت میں لچک دار ہوتی ہے۔ اس لئے دونوں کا امتزاج ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مکی دور میں ضابطوں کا ہلکا پھلکا نظام بھی نہ تھا۔ ضابطوں کا نظام اس وقت آیا جب معاشرہ کی تشکیل کا دور شروع ہوا۔ میری کوشش یہ رہی کہ تحریک کو ضابطوں کی بہت زیادہ پابندی سے بچایا جائے لیکن ابھی جو Trend ہے اس میں ایسا لگتا ہے کہ آئندہ میں اس میں کامیاب نہ ہوسکونگا''۔

ذمہ داران کی تربیت :

ذمہ داران کی تربیت ڈاکٹر صاحب کی پہلی ترجیح تھی، اس لیے کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس پہلو سے خاصی کمی ہے۔ چنانچہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ منتخب افراد کی تربیت اس انداز سے ہو کہ وہ آنے والے دنوں میں ارکان شوریٰ کی جگہہ بھی لے سکیں اور امارت حلقہ کی ذمہ داری بھی سنبھال سکیں۔ ایمرجنسی کے بعد پہلے اجلاس شوریٰ کے موقع پر افتتاحی تقریر کرتے ہوئے جہاں انہوں نے کچھ کمزوریوں کی نشاندہی کی وہیں نئے لوگوں کو مدعو کرنے کے مقصد پر بھی روشنی ڈالی:

''ہمارے لئے اتنی بات کافی نہیں ہے کہ ہم مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بیٹھیں اور کچھ فیصلے کرلیں بلکہ اس فیصلے کو نافذ کرنے کے لئے جدوجہد بھی کریں۔ ہماری مجلس شوریٰ کو ایک مثالی مجلس شوریٰ ہونی چاہئے۔ لیکن ہم نہایت کوفت اور قلبی دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کے لئے جو تیاری، ڈسپلن اور پختگی ہونی چاہئے ہم اس سے کوسوں دور ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ ہم وقت کی پابندی سے بھی محروم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ بہار کی مجلس شوریٰ کا جو اجلاس ہم بلاتے ہیں تو اس میں خصوصی مدعوعین کو بھی شریک کرتے ہیں تاکہ شوریٰ کا یہ اجلاس تربیتی ہو جائے اور نئے لوگ غور وفکر، بحث وتحیث اور فیصلہ کرنے کی تربیت حاصل کرسکیں تاکہ وہ آئندہ ارکان شوریٰ کی جگہہ لے سکیں''۔

مجلس شوریٰ میں مشورہ دینے کے آداب کیا ہیں، اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اجلاس شوریٰ مورخہ ۲۹ رتا ۳۱ ر دسمبر ۱۹۸۲ء کے موقع پر فرمایا:

''.....مشورہ دینے کے لئے یکسوئی کی ضرورت ہے اور مشورہ دینے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ نہایت غور وفکر کے بعد کوئی مشورہ دینا چاہئے۔ بسا اوقات اپنے غور وفکر کے بعد کوئی رائے ذہن میں جمتی ہے لیکن تبادلۂ خیالات کے بعد مختلف پہلو روشن ہوتے ہیں۔ اسی لئے اپنی رائے بدلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں محسوس کرنا چاہئے''۔

اجلاس شوریٰ میں بعض لوگوں کے بے جا اصرار کے نامناسب رویہ پر توجہ دلاتے ہوئے ۱۰ رتا ۱۳ ر اپریل ۱۹۸۴ء کے اجلاس کے موقع پر فرماتے ہیں:

''........تحریک کے رفقاء کے بارے میں میرا گمان ہے کہ مخلص بھی ہیں اور ذہین بھی، اس لئے دلائل کو پیش کرکے خاموش ہو جاتا ہوں۔ میں اس کمزوری کا شکار ہونا نہیں چاہتا کہ ایک ہی دلیل کو بار بار پیش کیا جائے اور پھر اپنی بات پر اصرار کیا جائے، میں اسے پسند نہیں کرتا۔ مگر یہ بیماری ہمارے رفقاء کے اندر ہے اور وہ ایک ہی دلیل کو بار بار پیش کرکے اپنی بات پر اصرار کرتے ہیں اور اس طرح معمولی معمولی فیصلے میں وقت بھی زیادہ لگ جاتا ہے۔ اس سے کسی کی رائے میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ تضیع اوقات ہوتا ہے''۔

ذمہ داری کے منصب پر پہنچنے کے بعد افراد میں احساس برتری کی جو بیماری پیدا ہو جاتی ہے اسکی طرف نشاندہی کرتے ہوئے اجلاس شوریٰ ۲۹ رتا ۳۱ ر دسمبر ۱۹۸۲ء کے موقع پر کہتے ہیں:

''.........ہمیں ایسا مترشح ہوتا کہ کسی ذمہ داری کے منصب پر پہنچ جانے کے بعد بعض افراد کے اندر احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمیں دونوں انتہاؤں کے بیچ اپنی راہ نکالنی چاہئے۔ نہ احساس برتری کے فتنہ میں مبتلا ہوں اور نہ احساس کمتری میں مبتلا رہنا چاہئے''۔

اہل شوریٰ سے الوداعی خطاب :

اپنی امارت حلقہ کے آخری دنوں میں ۲۰ تا ۲۵ مئی ۱۹۸۶ء کے اجلاس شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا حلقہ میں ذمہ داروں کی تربیت کے سلسلے میں ان کے نقطۂ نظر اور کوششوں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ اہل شوریٰ سے یہ ڈاکٹر صاحب کا الوداعی خطاب تھا اس لئے انہوں نے اپنے تجربات و احساسات کی روشنی میں شوریٰ کو کچھ ضروری مشورے دئے تھے۔ اہم نکات ملاحظہ ہوں:

''اللہ کا بے حد و حساب شکر ہے کہ اس نے ہمارے سامنے اپنی رضا کی راہ کھول دی جو اقامت دین کی راہ ہے اور ساتھ ساتھ اس نے یہ توفیق بھی بخشی کہ ہم اس راہ پر چلنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ دور چلنے کے بعد ہم کچھ ایسے مخمصے میں پھنس گئے ہیں کہ ہم پر اپنی راہ واضح نہیں ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اور اس بات کی اس سے توقع بھی رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ اس حیثیت میں، جس میں اس وقت میں آپ کو خطاب کر رہا ہوں، میرا یہ آخری خطاب ہوگا، اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ باتیں تفصیل سے عرض کردوں کیونکہ اس کام کو آپ ہی لوگوں کو لے کر چلنا ہے۔ آپ چاہیں تو آئندہ میری ان باتوں سے فائدہ اٹھائیں اور نہ چاہیں تو آپ کی خوشی!

آپ جانتے ہیں کہ جس وقت مجھ پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی، یعنی امارت حلقہ کی ذمہ داری، تو میں نے اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود اس مجبوری کے تحت اس ذمہ داری کو قبول کرلیا تھا کہ واقعتاً حلقہ کے اندر جماعت کا کوئی ایسا فرد میسر نہیں تھا جو اس ذمہ داری کو سنبھال سکتا۔ چنانچہ پہلے ہی دن سے میری یہ کوشش رہی کہ اس لائق لوگوں کو بنایا جائے۔ اس وقت کام اتنا زیادہ نہیں تھا کہ دو یا تین آفس سکریٹری کی ضرورت ہوتی۔ میں چاہتا تو ایک کلرک سے کام چلا سکتا تھا مگر میرا مقصد یہ تھا کہ امرائے حلقہ تیار کئے جائیں، اس لئے دفتر میں اتنے لوگوں کو جمع کیا۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ بہار میں امیر حلقہ ہونے کی صلاحیت کے لحاظ سے افراد کا فقدان نہیں ہے، بلکہ میں اس بات پر بڑی خوشی محسوس کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا مشکور بھی ہوں کہ اس نے ہم کو ایسے افراد دے دیے ہیں جو اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اس منصب کے لئے موزوں اور مناسب ہی نہیں، بلکہ مجھ سے بہتر ہیں۔ جماعت کی پہلے اسپرٹ یہی تھی کہ جیسے ہی باصلاحیت آدمی آجائے پہلا شخص جگہ چھوڑ دے۔ چنانچہ آپ نے پڑھا ہوگا کہ مولانا مودودیؒ بڑے اجتماعات میں برابر یہ بات پیش کردیا کرتے تھے کہ جماعت اپنے اندر سے ان کی جگہ پر بہتر شخص کا انتخاب کرلے اگر کوئی شخص امارت کے منصب کے لئے زیادہ اہل نظر آرہا ہو۔ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب جماعت کے اندر انقلابی اسپرٹ موجود تھی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اب تحریک انقلابی کی بجائے انتظامی ہوگئی ہے۔ چنانچہ انقلاب کی جگہ ضابطہ اور قانون نے لے لی ہے اور ذہنیت بھی ایسی ہی بنتی جارہی ہے۔ اب تو اگر کوئی شخص امیر منتخب ہوتا ہے تو اس سے بہتر شخص جماعت میں نظر آجائے تب بھی چونکہ اسے ضابطہ کی رو سے چار سال تک منصب امارت پر فائز رہنا ہے اس لئے وہ اس منصب پر برقرار رہے گا۔ روح ختم ہوگئی اور ضابطہ رہ گیا۔ میں بھی مجبوراً اس کام کو کسی طرح انجام دیتا رہا لیکن اب جبکہ مجھ سے بہتر لوگ آگئے ہیں میرا ضمیر مجبور کر رہا ہے کہ یہ جگہ ان کو ملنی چاہیے۔ بعض لوگوں نے میری اس بات کا برا مانا کہ میں یہاں لوگوں کو امیر حلقہ کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ میری تو یہ خواہش رہی کہ ہمارے اندر جو رفقاء ہیں وہ امیر جماعت کے منصب کے لئے تیار ہوں اور اس لائق

بنیں۔ میں نے اگر کسی کو آگے بڑھانا چاہا تو اس میں جماعت کا ہی مفاد پیش نظر تھا۔ اور بعض خام لوگوں کو جماعت میں آگے بڑھنے کے سلسلے میں ہمت افزائی نہ کی تو یہ بھی جماعت کے ہی مفاد کا تقاضہ تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے یہ ریمارک دینے میں بھی کچھ تکلیف محسوس نہیں کیا کہ میں خائف ہوں کہ اگر فلاں شخص جماعت میں شامل ہو گیا تو وہ امیر حلقہ بن جائے گا، اس لیے میں اسے شامل کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ حالانکہ لوگ جانتے ہیں کہ میں برابر امیر حلقہ کی ذمہ داری سے سبکدوشی کی گذارش کرتا رہا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان باتوں سے مجھ کو کیا اذیت پہنچتی رہی، لیکن جماعت کی خاطر میں نے سب کچھ برداشت کیا۔ کسی کو آگے بڑھانے میں اور کسی کو روکنے میں ظاہر ہے میرا کوئی ذاتی مفاد پوشیدہ نہیں۔ نہ کسی سے میرا رشتہ ناطہ ہے۔ سب کچھ جماعت کے مفاد کی خاطر ہی ہوا۔

مجھ سے لوگوں کو یہ شکایت بھی رہی کہ میں بعض معاملات میں بے جا ضد یا سختی سے کام لیتا رہا۔ حالانکہ میرا اپنا قاعدہ یہ رہا کہ میں کسی بات پر ضد نہیں کرتا ہوں، حتی الوسع پوری ڈھیل دیتا ہوں کہ لوگ اپنی صوابدید پر کام کو انجام دیں، لیکن جس کام میں جماعت کے مفاد کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس میں اپنا رویہ بدل دیتا ہوں۔ اس میں لوگوں کو برا بھی معلوم ہوتا ہے لیکن میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں Clear cut conception کا قائل ہوں۔ جماعت کے مفاد کی خاطر Assert بھی کرتا ہوں۔ فرد ہو یا جماعت جب اس کے سلسلے میں کوئی واضح راہ میرے سامنے ہوتی ہے تو اس معاملے میں نہ صرف یہ کہ زور دیتا ہوں بلکہ Risk بھی لیتا رہا ہوں۔

یہ جو میقات گذر رگئی معلوم نہیں کیا ہوا، اس میں ہمارے یہاں عجیب قسم کے حالات پیدا ہوتے رہے۔ تین درخواستیں بیک وقت استعفیٰ کی آتی رہیں۔ میں انہیں کسی طرح سمجھا بجھا کر کام لیتا رہا۔ میری کوشش یہی رہی کہ بددلی دور ہو اور لوگ خوش دلی سے کام کریں، لیکن بعض حالات میں ایوان نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ اس سے تحریک کو سخت نقصان پہنچا۔ طالبات میں کام کے لئے میں نے پورا زور لگایا لیکن ناکام رہا، یہاں تک کہ طالبات کا کام ختم ہو گیا۔ خواتین میں کام کے سلسلے میں بھی لوگوں کی دلچسپی افسوسناک رہی۔ انقلاب میں خواتین کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا.....خواتین کو الگ کر کے تحریک کا کام نہیں ہوسکتا...''۔

شوریٰ اور اس کی حیثیت کے سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے موصوف نے مزید فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تو ایسی بنائی ہے کہ اس میں ایک خاص حد تک دماغ کام کرتا ہے۔ مسئلہ کو کھینچتے رہنے سے کوئی بات صاف نہیں ہوتی۔ اپنی رائے پر بے جا اصرار اچھی چیز نہیں ہے۔ ہر آدمی اپنے اختیارات کے لئے زور لگائے تو یہ بات بھی درست نہیں۔ ایک ہی بات کو طرح طرح سے پیش کرنے کے پیچھے یہی کمزوری کام کرتی ہے کہ میری بات ہی کسی طرح مان لی جائے۔ شوریٰ ڈبیٹ کی جگہ نہیں ہے، مشورہ کی جگہ ہے۔ میں نے شروع ہی سے یہی کیا کہ جو مسئلہ ہے اس کے جتنے پہلو سامنے آئیں ان کو پیش کر دیا، پھر جب تمام پہلو ہر طرف سے آگئے تو جو رائے بنی اس کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ مجلس شوریٰ مشورہ دیتی ہے اور امیر فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن اب یہ سوال بھی اٹھنے لگا کہ فیصلہ کا اختیار کس کو ہے۔ یہاں تک کہ یہ سوال بھی سامنے آیا کہ کیا حلقہ کی مجلس شوریٰ کے فیصلے کو تبدیل کرنے یا رد کرنے کا اختیار امیر جماعت کو بھی پہنچتا ہے؟ اپنی بات کو منوانے پر بہت زیادہ زور ڈالنے سے نقصان بھی ہوتا ہے اور فیصلے میں بھی دیر ہوتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ ایوان کی طرف سے جو مسئلہ آجائے اس میں Chair جو معلومات فراہم کر سکے یا کر دے تو پھر سوالات کر لیے جائیں۔ بات جب واضح ہو جائے تو مشورہ اور فیصلہ ہو جائے ورنہ وقت اور مال کا بیجا صرفہ ہوگا۔ اس بے جا اصرار کے نتیجہ میں جب فیصلہ کے باوجود کوئی بات بار بار چھیڑی جاتی ہے تو بہت سے غلط فیصلے ہو جاتے ہیں''

مسائل اور وسائل کے سلسلے میں رہنمائی کرتے ہوئے مزید فرمایا:

''......ایک بات اور میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے مسائل اور وسائل دونوں ہی کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ تب ہی صحیح

منصوبہ بندی ممکن ہے۔ اگر آپ بھی باہر کے وسائل پر بھروسہ کرنا شروع کریں گے جیسا کہ بعض حلقوں میں ہو رہا ہے تو اپنی حیثیت سے بڑھ کر منصوبے بننے لگیں گے جو میرے خیال میں غیر فطری بھی ہے اور نقصان دہ بھی۔ ہم کو اپنے وسائل پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے اور اپنے ہی دائرہ میں رہ کر اپنے وسائل کے اضافہ کے سلسلے میں غور وفکر اور تگ ودو کرنی چاہئے۔ ہمارے وسائل بہر حال محدود ہیں۔ جماعت کے پاس جو پیسے آتے ہیں وہ غریب رفقاء ہی دیتے ہیں۔ اس عمارت دفتر حلقہ کی تعمیر ومرمت کے سلسلے میں کچھ لوگوں کی یہ شکایت سامنے آئی ہے کہ پیسے کا بیجا صرفہ ہوا ہے، آپ کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ اگر اس میں واقعی کسی کا قصور ہے تو اسے رب العزت سے معافی مانگنی چاہیے اور اگر یہ لوگوں کی غلط فہمی ہے تو وہ انشاء اللہ دور ہو جائے گی اور ہم کو مطمئن رہنا چاہئے۔

میں نے آپ کے سامنے قدرے تفصیل سے وہ باتیں رکھیں جو میں نے اپنے اور دوسروں کے احساسات کے نتیجے میں محسوس کیں۔ ان باتوں سے جماعت متاثر ہوئی ہے۔ ایک بددلی ہے جو اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ آپ خود سوچیے کہ پھٹے ہوئے دلوں کے ساتھ جماعت کس طرح ٹیم اسپرٹ کے ساتھ کام انجام دے سکتی ہے۔ ایک بوجھل تنظیم کا ڈھونا آسان نہیں۔ ہر جگہ اور بار بار ضابطوں کا حوالہ دینا ٹھیک نہیں۔ انقلاب اور ضابطہ بندی عین ضد ہیں۔ ضابطہ تو کام کو آسان کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ مقصد اور کام پر اس کو بالاتری حاصل نہیں ہوتی۔ ضابطہ کی جکڑ بندیاں تو حکومت میں ہوتی ہیں یا ایسی جماعت میں جو صرف نظم وضبط کو ہی اپنی معراج مانتی ہو، کوئی انقلاب اس کے پیش نظر نہ ہو۔

آپ اہل شوریٰ ہیں۔ اپنے علاقہ کی حد تک پالیسی ساز ہیں۔ آپ خود اپنی اور دوسروں کی تربت کے ذمہ دار ہیں۔ آپ کو غور کرنا چاہیے کہ واقعی ہم کو کیا کرنا ہے۔ میں نے ضابطہ کے زور پر کام نہیں لیا۔ محبت اور شفقت کے رشتہ کو قائم رکھا کیونکہ اس تحریک کے لیے یہی ضروری ہے۔ اب جو بھی امیر حلقہ آئے گا وہ اپنے سوچنے کے انداز اور رجحان سے کام لے گا''۔

اس اجلاس شوریٰ کے بعد ڈاکٹر سید ضیاء الھدیٰ صاحب جولائی ۱۹۸۶ء میں امارت حلقہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے مگر جاتے جاتے موصوف نے حلقہ بہار کو محمد جعفر صاحب کی شکل میں ایک جواں سال اور کامیاب وکامران امیر حلقہ دیا جنہوں نے ڈاکٹر صاحب سے کسب فیض میں اپنی عمر عزیز کا بہترین وقت صرف کیا تھا۔

مارچ ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر صاحب بوجوہ جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ اس طرح جماعت سے رکنیت کے تعلق کا ۴۵ سالہ اور تنظیمی وتحریکی تعلق کا پچاس سالہ باب بند ہوا۔ نصف صدی تک جس جماعت کی پرورش اپنے خون وجگر سے کرتے رہے اسے باحسرت دیاس الوداع کہا ۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۱۲ر جون ۱۹۹۸ء بروز جمعہ بوقت ساڑھے آٹھ بجے صبح بمقام پٹنہ میڈیکل کالج ہسپتال ڈاکٹر صاحب کی وفات ہوئی۔ موصوف ۱۹۱۸ء میں بہار شریف میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے مرحوم نے تقریباً ۸۰ سال عمر پائی۔ بعد نماز عصر ان کے مکان کے قریب ہی مسجد سے متصل میدان میں نماز جنازہ ہوئی اور تدفین بھی پٹنہ ہی کے عالم گنج محلّہ کے متصل قبرستان میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ اور ہمیں ان کے نقش قدم سے روشنی حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

احمد علی اختر صاحب، مجلس شوریٰ جماعت اسلامی بہار کے رکن ہیں۔ کچھ دنوں قائم مقام امیر حلقہ رہے۔ انہیں ضیاء الھدیٰ'' نے جماعت اسلامی کے انتظامی امور میں اپنا معتمد خاص بنایا۔ حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے ناظم اعلیٰ اور اس کے ترجمان 'رفیق' پٹنہ اور اس کے سالانہ مجلّہ 'میزان' کے مدیر رہے۔ 'کیا اسلام فرسودہ ہو چکا ہے؟' نامی کتاب کے مصنف۔ (قیام: ہزاری باغ)

ڈاکٹر صاحبؒ اور طلبہ تنظیم

سید محمد اقبال

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی انقلابی فکر سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی سے وابستہ ہونے اور دین حق کی اقامت کے لئے یکسو ہو کر کھڑے ہونے والوں کے سامنے رزق حلال کا حصول ایک ضروری سوال بن کر سامنے آیا۔ حدت فکر انقلاب میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جس نظام کو وہ بدلنا چاہتے ہیں اسکو چلانے میں حصہ لینا تو اسکی عملی معاونت ہی ہوگی۔ جس درخت کو کاٹ کر گرانا ہو اس پر بسیرا کرنے اور اسکی آبیاری کا کیا سوال۔ یہ سوال تحریک اسلامی تک محدود بھی نہیں بلکہ ہر انقلابی تحریک کو اپنے ماحول اور رائج الوقت نظام کے بارے میں ایک رویہ تو طئے کرنا ہی پڑتا ہے۔

جماعت اسلامی کا قیام اگست ۱۹۴۱ء میں ہوا۔ جیسے جیسے تحریک آگے بڑھی اور نئے لوگوں نے وابستگی اختیار کی حصول معیشت اور مقصد حیات کے درمیان کا ٹکراؤ بھی سامنے آ گیا۔ تحریک سے وابستہ ہونے والے نوکری پیشہ لوگوں نے اپنی نوکریاں چھوڑ کر آزاد پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں سے ایک ہومیوپیتھی پریکٹس بھی تھی۔ اس زمانے میں ہومیوپیتھی پریکٹشنر کی حیثیت سے رجسٹریشن کرا لینا مشکل بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب بھی ان لوگوں میں ایک تھے۔ انہوں نے محکمہ ٹیلیگراف کی اپنی نوکری اپنے مقصد حیات کے لئے چھوڑ دیا اور ہومیوپیتھی پریکٹس کو کسب معاش کیلئے اختیار کر لیا۔ حلقہ میں ڈاکٹر تو کئی تھے مگر ''ڈاکٹر صاحب'' کی حیثیت سے حلقہ بہار بلکہ مرکز تک ایک ہی شخصیت معروف تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ۔ جو پہلے امیر جماعت اسلامی پٹنہ رہے اور بعد میں امیر جماعت اسلامی بہار ہوئے۔

میں نے پہلی بار ڈاکٹر صاحب کو مرزا غالب کالج گیا کے ایک جلسہ سیرت میں سنا۔ باتوں سے متاثر ہوا البتہ ملاقات نہیں ہو سکی نہ میں نے اسکی کوشش کی۔ کوئی دو سال بعد ۱۹۷۲ء میں حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی کا تربیتی اجتماع گیا میں منعقد ہوا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب بحیثیت مربی موجود تھے۔ یہیں ان سے مختصر ملاقات ہوئی۔ میرا یہ پہلا اجتماع تھا اور طلبہ تنظیم سے کوئی عملی وابستگی نہ تھی اس لئے پروگرام ختم ہوتے ہیں گھر چلا جایا کرتا۔ اس سے قبل شیر گھاٹی، ڈمریا اور جہاں آباد میں تربیتی اجتماعات ہو چکے تھے اور اپنی افادیت ثابت کر چکے تھے۔ طلبہ کی ایک ٹیم ڈاکٹر صاحب کی تربیت میں طلبہ کی رہنمائی کے لئے تیار ہو چکی تھی۔

بہار میں طلبہ تنظیم کی بنیاد ڈاکٹر صاحب کے اس درس قرآن میں پڑی جو وہ چھٹی دہائی میں انجمن اسلامیہ ہال میں ہر ہفتہ دیا کرتے تھے۔ جدید تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے خصوصاً سائنس کے طلبہ کے لئے یہ درس غیر معمولی کشش کا مرکز بن گیا کیونکہ وہاں ان طلبہ کے لئے غور و فکر کو پروان چڑھانے اور قرآن پر سائنسی انداز میں تدبر کرنے کا وافر سامان موجود ہوتا۔ قرآن فہمی کی اس سے بہتر درسگاہ نہ تھی جہاں انہیں ہر طرح کے سوالات کا تشفی بخش ملتا۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں سائنس خصوصاً فزکس کی اصطلاحوں (مثلاً۔ انرجی، اسپیس، (Space) ایٹم، چارج، انرشیا، وغیرہ) کا استعمال مہمیز کا کام کرتا۔ درس کے اس حلقے سے طلبہ کی تنظیم تشکیل پائی۔ حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی۔ اس نئی تنظیم کے طلبہ کے لئے ڈاکٹر صاحب نے گرمی کی چھٹی کے دوران تربیتی اجتماع شروع کرایا۔ یہ اجتماع گیا ضلع کے چھوٹے سے مقام شیر گھاٹی سے شروع ہوا۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے قرآن کا مطالعہ خود پیش کیا۔ پھر سالانہ تربیتی اجتماع نے ایک روشن روایت کی شکل اختیار کر لی۔

بہار میں اسلام پسند طلبہ تنظیم کا موجودہ تسلسل جو ۶۹ء میں شروع ہوا یقینی طور سے ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کا مرہون منت اوران کا صدقہ جاریہ ہے۔ پٹنہ شہر سے آگے بڑھ کر حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی پٹنہ کمشنری بنا۔ برادر عبدالوکیل ملک پہلے ناظم کمشنری منتخب ہوئے۔ اس کمشنری سے باہر بھی جب طلبہ متحرک اور منظم ہونے لگے تو ریاست گیر تنظیم کی تجویز سامنے آئی۔ چنانچہ باہمی صلاح ومشورہ کے بعد طلبہ تنظیم کا ایک دستور مرتب کیا گیا اور منظوری کے لئے امیر حلقہ بہار جناب انیس الدین احمد (مرحوم) کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ امیر حلقہ طلبہ کی ریاست گیر تنظیم کے حق میں نہ تھے۔ وہ راضی نہ ہوئے اور اس مہم کو وقتی طور سے جھٹکا لگا اس سال جماعت اسلامی بہار ایک سانحہ سے دوچار ہوئی۔ امیر حلقہ جو دہلی گئے ہوئے تھے اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ کر (مرکز جماعت میں) اپنے رب حقیقی سے جاملے۔ کچھ دنوں بعد بہار کے نئے امیر حلقہ کا انتخاب عمل میں آیا اور ڈاکٹر صاحب امیر حلقہ منتخب ہوئے۔ اسی سال ۷۲ء نومبر میں حلقہ طلبہ کا سالانہ تربیتی اجتماع گیا میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب بحیثیت مربی موجود تھے۔ اس اجتماع میں ڈاکٹر جاوید اختر نے جو اسوقت پٹنہ میڈیکل کالج کے طالبعلم تھے طلبہ کی ریاست گیر تنظیم کے دستور کا مسودہ پیش کیا۔ یہ دستور اس اجتماع میں منظور کیا گیا۔ امیر حلقہ بہار ڈاکٹر صاحب نے تنظیمی حیثیت میں اسکی منظوری دی اور اس طرح ریاست میں حلقہ طلبہ اسلامی بہار وجود میں آیا۔ اس کے پہلے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر جاوید اختر اور جنرل سکریٹری احمد علی اختر منتخب ہوئے۔ یہ نوزائدہ تنظیم نئے عہدہ داروں کی محنت اور ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی۔ دستوری وعملی۔ میں بڑی کامیابی سے آگے بڑھی۔

اس تنظیم کے افراد کا ڈاکٹر صاحب سے اور ڈاکٹر صاحب کا اس تنظیم کے افراد سے ایک والہانہ تعلق استوار ہوا۔ حلقہ طلبہ کے افراد اوران کی سوجھ بوجھ پر ڈاکٹر صاحب کو بڑا اعتماد پیدا ہوا۔ دوسری طرف وابستگان حلقہ طلبہ کے لئے ڈاکٹر صاحب اور انکی صحبت ایک نعمت کے ساتھ ساتھ ایک Inspiration تھی۔ طلبہ اپنے سوالات خصوصاً قرآن کے مطالعہ کے دوران اٹھنے والے سوالات کے جواب ڈاکٹر صاحب سے پوچھنے کا انتظار کرتے اور ان کے جواب سے پوری طرح مطمئن ہوتے۔ یہ سلسلہ دور طالبعلمی تک محدود نہ تھا بلکہ ہمارے کتنے ہی احباب جو اپنی نوکریوں یا اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک کے دوسرے حصوں میں یا ملک سے باہر گئے وہ اپنے سفر پٹنہ میں ڈاکٹر صاحب سے مل کر اپنے اشکال پیش کرتے اور اپنی الجھنیں دور کرتے۔

یوں تو تربیت کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی صلاحیتوں کا اعتراف تحریکی حلقے میں عام تھا۔ مگر حلقہ طلبہ کے وابستگان کی تربیت کے سلسلے میں ہمارا مشاہدہ بہت ہی قریبی رہا۔ شروع کے اجتماعات میں قرآن کا مطالعہ ڈاکٹر صاحب نے خود پیش کیا۔ پھر جب انہوں نے محسوس کیا کہ باصلاحیت طلبہ کی ایک تعداد ابھر چکی ہے اوران کو مطالعہ قرآن کا ذوق بھی ہے تو تیسرے اجتماع سے قرآن کا پروگرام ان کے حوالے کر دیا۔ البتہ مطالعہ قرآن کے وقت موجود رہتے اور رہنمائی فرماتے۔ چوتھے اجتماع میں یہ بھی کہا کہ ہوسکتا ہے آئندہ اجتماع سے میں شریک نہ رہوں اور آپ کو اپنا اجتماع خود ہی کرنا پڑے۔ اگلا اجتماع (کوٹھی۔ ضلع گیا) میں ہوا اور وہ واقعی شریک نہ ہوسکے۔ مگر طلبہ کی علمی وفکری رہنمائی کے لئے ڈاکٹر عبدالمعز منظر صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب اگلے اجتماع میں ہمارے ساتھ رہے جو پٹنہ میں ہوا۔ اس اجتماع میں پہلی بار تین بڑی مرکزی شخصیتیں بھی شریک ہوئیں۔ مولانا حامد علی، مولانا جلال الدین عمری اور مولانا محمد فاروق خاں۔ اور طلبہ نے بھرپور استفادہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب صرف مطالعہ قرآن کے وقت ہی شریک اجتماع نہ ہوتے بلکہ دوسرے پروگراموں کے وقت بھی موجود رہتے اور جہاں ضرورت ہوتی رہنمائی کرتے۔ ایک مشقی تقریر میں ایک رفیق نے دعوتی کام اور اپنی ذمہ داریوں پر زور دیتے ہوئے کچھ اس طرح کی بات کہی کہ ہم نبوت کے مقام پر کھڑے ہیں۔ تقریر ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب گویا ہوئے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ مقرر کیا

کہنا چاہتے تھے اور ان کو کیا کہنا چاہئے تھا۔ ایک سالانہ تربیتی اجتماع میں فجر کی نماز ایک رفیق نے پڑھائی۔ نماز ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے طلبہ سے پوچھا کہ نماز میں کہاں غلطی ہوئی۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ ڈاکٹر صاحب بھی خاموش رہے۔ جب تمام لوگ چلے گئے تو نماز پڑھانے والے رفیق سے گفتگو کی اور انہیں بتایا جو کچھ بتانا تھا۔ طلبہ سے ان کے مضامین (Subjects) پر باتیں کرتے سائنس کے طلبہ سے سوالات کرتے اور بعض موضوع پر کتابوں میں مواد تلاش کرنے کو بھی کہتے۔ سائنسی معلومات کا خود بھی تحلیل و تجزیہ کرتے اور تقریر کرتے وقت یا درس دیتے وقت اس کا حوالہ دیتے اور استدلال کرتے۔ لیکن چیزوں کو رد بھی کرتے اور اسے ''اٹکل پچو'' قرار دیتے۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ وابستگان حلقہ طلبہ اسلامی اپنے تعلیمی کیریر میں شاندار مظاہرہ کریں۔ وہ برابر اسکی ترغیب دیتے۔ امتحانات کے وقت تنظیمی کاموں سے چھٹی لینے کی صلاح دیتے بلکہ چھٹی دلوا دیتے۔ پٹنہ میں تعلیم حاصل کرنے والے اپنے ذہین طلبہ کی خاص طور سے خبر رکھتے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ وہ پڑھنے پر وقت نہیں دے رہے ہیں تو انہیں خاص طور سے متوجہ کرتے۔ یہ چیزیں طلبہ کو ڈاکٹر صاحب ذاتی طور سے قریب کر دیتیں۔ پھر وہ طلبہ اپنے ذاتی امور و مسائل میں بھی ان سے مشورہ کرتے۔ کورس کے انتخاب سے لے کر شادی کے فیصلے تک کا بے تکلف مشورہ۔ بعض دفعہ پورا فیصلہ ہی ڈاکٹر صاحب پر چھوڑ دیتے اور ان کا فیصلہ بے چوں و چرا تسلیم کرتے اور گھر والوں کو بھی آمادہ کرتے۔ تربیتی اجتماعات میں وہ ایک درجہ وار نصاب چاہتے تھے۔ مگر وہ ہو نہ سکا۔ انہوں نے قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ کے مطالعہ کے لئے ایک نصاب خود تیار کیا اور طلبہ کے ایک اجتماع میں اسے پڑھایا گیا۔ یہ نصاب جماعت میں بھی متعارف کرایا گیا مگر بعض اسباب کی بنا پر وہ تجرباتی مرحلے ہی میں رہ گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے قرآنی عربی سکھانے کا کلاس بھی شروع کیا۔ اس سلسلے سے بھرپور استفادہ نہ ہو سکا۔ البتہ ایک وقت پٹنہ کی طالبات میں سے کچھ نے اس سے ضرور فائدہ اٹھایا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حلقہ طلبہ اسلامی بہار میں طالبات بھی شامل تھیں۔ کئی ایک رکن بھی تھیں۔ طلبہ کی تنظیم میں طالبات کی شرکت ایک نازک مسئلہ تھا۔ اور انکی شمولیت کی اجازت کوئی پر اعتماد اور اولوالعزم سرپرست ہی دے سکتا تھا۔ شہیہ گدی مسجد پٹنہ میں منعقد ہونے والے ایک تربیت اجتماع میں تو طالبات شریک بھی ہوئی تھیں چونکہ وہاں ان کے قیام کی سہولت میسر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان طالبات کی کافی حوصلہ افزائی کی اور ان میں با صلاحیت اور صالح طالبات کی ایک ٹیم بھی تیار ہو گئی۔ انفرادی اصلاح و تربیت کے ساتھ تنظیم کی توسیع اور اس کے استحکام کے بارے میں فکر مند رہتے تبادلہ خیالات کرتے اور کبھی کبھی اپنے مشورے بھی دیتے۔ بعض موقعوں پر ہم نے شوریٰ کے اجلاس میں انہیں شرکت کی دعوت دی وہ جزوی طور سے شریک ہوئے ہم نے ان کی موجودگی سے اجتماعی آداب بھی سیکھے اور ان کی تجویزوں سے استفادہ کیا۔ اپنی شوریٰ کے فیصلوں کی توثیق کے لئے ہم برابر ان سے ملے۔ وہ ہمارے فیصلوں کی بھی عام طور پر من و عن توثیق کرتے، بعض دفعہ کچھ سوالات کرتے، بعض دفعہ زبان کی بھی تصحیح کراتے۔ ان سب کے پیچھے ہمارے اندر اعتماد اور قوت فیصلہ کی حوصلہ افزائی کا مقصد کارفرما ہوتا۔ ہمیں ان کے اندر ایک استاد کی شفقت اور توجہ کی جھلک ملتی تھی۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ طلبہ ایک بار ان کے اس مقناطیسی حلقے (Magnetic Field) میں داخل ہونے کے بعد اس سے باہر نکل جاتے۔ نئی نسل میں سائنسی، انقلابی، اسلامی طرز فکر پیدا کرانے کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی کوشش منفرد اور نمایاں رہی ہے۔ اور اس فکر سے استفادہ جاری رہنا چاہئے۔

سید محمد اقبال صاحب، جماعت اسلامی ہند کے حلقہ بہار کی شوریٰ اور اس کی کل ہند مجلس نمائندگان کے رکن۔ بورڈ آف اسلامک ایجوکیشن کے ڈائرکٹر، مرزا غالب کالج گیا میں انگریزی کے استاد اور اسلامک ٹیچرس ایسوسی ایشن کے ذمہ دار۔ تحریک اسلامی سے حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے دور سے وابستہ اور اس کے ناظم اعلیٰ رہے۔ ماہنامہ 'رفیق' پٹنہ کے مدیر رہے۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ سے تحریکی تعلق۔ (قیام: گیا)

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

(ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ)

افروز انجم

اس دار فانی میں انسانوں کے آنے اور جانے کا سلسلہ قدیم ہے مگر انسانوں میں سے کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنکے جانے کے بعد ایک خلاء محسوس ہوتا ہے۔ اس خلاء کو پر کرنا مخلوق کے لئے تو ممکن نہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم کی شخصیت بھی ایک ایسی ہی ہمہ گیر شخصیت تھی جن کی کمی اہل ملت ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے بقول علامہ اقبال ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو قول وفعل کی یکسانیت تھی جو کہ مومن کی پہچان اور مومنانہ زندگی کی شان ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی سادہ زندگی، ان کا صبر وشکر، جڑنا تو دین کے لئے کٹنا تو دین کے لئے، ہر حال میں راضی بہ رضا رہنا دوسروں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔

ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میری عمر کوئی، سات آٹھ سال رہی ہوگی۔ اس زمانہ میں ہم لوگ رمنہ روڈ پٹنہ کے جس مکان میں قیام پذیر تھے اسی مکان کی دوسری منزل پر جماعت اسلامی کا مقامی دفتر تھا۔ یہ مکان مولانا محبوب حسین صاحب مرحوم کا تھا، جو کہ رشتہ میں میرے ماموں لگتے تھے اور ایک باوقار اور بااصول شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جماعت اسلامی کے رکن نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے حمایتی اور بہی خواہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اس وقت شاید امیر مقامی تھے۔ ہر ہفتہ وہاں جماعت کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب اجتماع سے واپسی کے بعد نیچے آئے، میں اور ذاکرہ (محبوب حسین صاحب کی چھوٹی لڑکی) دونوں برآمدے میں تھے، ڈاکٹر صاحب نے ذاکرہ کو پکارا ''کیا دوست! کیا ہو رہا ہے رے''۔ پھر میری طرف اشارہ کر کے میرے بارے میں پوچھا کہ میں کون ہوں۔ مجھ سے بھی دو چار باتیں کیں اور ہنستے ہوئے اپنی سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ آج بھی وہ منظر میری نظروں کے سامنے کل ہونے والے واقعہ کی طرح گھومتا ہے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوتی رہی۔ ان کے پرخلوص، پرشفقت، اور اپنائیت سے بھرے ہوئے انداز نے ہم لوگوں کو روز بہ روز ان سے قریب کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو نوجوانوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ان سے ان کو بہت امید بھی تھی۔ ان کو فعال کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جماعت کی سرپرستی میں ''حلقہ طلبہ اسلامی'' نام کی ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی، طالبات کے لئے الگ ایک شعبہ 'حلقہ طالبات' قائم کیا۔ ہم لوگ بھی جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتے گئے جماعت اسلامی اور حلقہ طالبات سے قریب ہوتے گئے۔ ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب سے بھی قربت بڑھتی گئی، ہر طرح کے مسائل آپ کے سامنے رکھتے، آپ بڑے دل نشیں، مدلل اور پیارے انداز میں سمجھا دیتے کہ دل ایک دم مطمئن ہو جاتا۔ ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم کی تقاریر وخطاب کا انداز اتنا پر اثر تھا کہ سننے والوں کے دل ودماغ کو مسخر کر لیتا۔ زبان بالکل سادہ، شستہ اور مدلل ہوتی۔ قرآن وحدیث کی تفہیم کا تمثیلی انداز بڑا دلنشیں تھا۔ اسی وجہ سے آپ کے مخالفین بھی آپ کے

خطاب کے مشتاق رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصول ونظریات کی نفی کرنے والے بھی آپ کی شخصیت کے ہمیشہ معترف رہے اور برجستہ بولتے، جماعت اسلامی تو ٹھیک نہیں مگر ضیاء الہدیٰ صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔

میں، ذاکرہ (محبوب حسین صاحب مرحوم کی چھوٹی لڑکی)، رفعت عائشہ (جعفر صاحب، موجودہ قیم جماعت اسلامی کی بھانجی) اور امینہ باجی (ڈاکٹر صاحب کے مکان مالک کی لڑکی) ڈاکٹر صاحب مرحوم سے جتنا قریب تھے اتنے ہی شوخ بھی۔ ڈاکٹر صاحب ہر ملاقات پر، قرآن پر غور وفکر اور تدبر کا مشورہ دیتے۔ باتوں باتوں میں ایک بار قرآن کے مطالعہ کا ذکر آیا تو میں نے شوخی سے کہا آپ غور وفکر اور تدبر کی بات کرتے ہیں جبکہ ہم لوگ قرآن پڑھتے ہیں تو اندھے اور بہرے کی طرح ٹیں ٹیں کر لیتے ہیں، جب تک عربی زبان کی شد بد نہ ہوگی خاک قرآن پر تدبر کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب میری بات کو سن کر ہنسے اور بولے اگر تم لوگ تیار ہو تو پڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح ہم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے قرآن کی تفسیر پڑھنا شروع کیا، انہوں نے اپنے قیمتی اوقات کا کچھ حصہ ہم لوگوں کے لئے وقف کر دیا۔ ہم سب جماعت اسلامی کے دفتر جو کہ سلطان گنج میں تھا اکٹھا ہوتے۔ ہفتہ میں دو دن ڈاکٹر صاحب کلاس لیتے، بعد ظہر ہم سب جاتے۔ شروع میں، میں، ذاکرہ اور امینہ باجی نے پڑھنا شروع کیا، پھر کچھ اور لڑکیاں بھی آنے لگیں۔

قرآن پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کوئی متن کا ایک ٹکڑا پڑھ کر اس کا خود سے ترجمہ کرتا۔ جن الفاظ کے معنی نہیں جانتے ڈاکٹر صاحب ان کے معنی لکھوا دیتے۔ اس کے بعد ایک آیت پر سوال وجواب شروع ہوتا۔ سوالات کا جواب پہلے ہم لوگوں کو دینے کو کہتے، ہم سب کا جواب سن لینے کے بعد پھر تفصیل سے اس آیت پر روشنی ڈالتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کسی آیت پر ہم میں سے کوئی سوال نہ کرتا تو میری طرف اشارہ کر کے کہتے، کیا ''بی مسئول'' کے ذہن میں بھی کوئی سوال نہیں آیا۔ میں کچھ زیادہ ہی سوال کرتی، ایک تو عادتاً دوسرے جو بات سمجھ میں آ بھی جاتی اس کو ڈاکٹر صاحب کی زبانی سننے میں بڑا مزہ آتا اور اعتماد حاصل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے درس کی یہ خوبی تھی کہ وہ انسان کے اندر جاننے کی تڑپ اور لگن پیدا کر دیتے تھے۔ اس وقت قرآن کا علم حاصل کرنے کا جو شوق، جو جذبہ، جو لگن اور تڑپ تھی اس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ذریعہ ہم لوگوں نے عم پارہ، سورۃ البقرہ، پورا ختم کیا اور سورۃ آل عمران کا کچھ حصہ۔ دوران درس ذاکرہ کی شادی ہوگئی اور وہ دوبئ چلی گئی۔ جماعت کا دفتر سلطان گنج سے پتھر کی مسجد چلا گیا تو درس کا سلسلہ میرے مکان (لال باغ) پر شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اور لڑکیاں میرے یہاں آجاتیں، رفعت عائشہ کی بھی شادی ہو جانے اور ڈاکٹر صاحب کی صحت کی کمزوری کے باعث جب نقل وحرکت ان کے لئے مشکل ہوگئی تو ہم لوگوں کی پڑھائی کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب کے پاس، ہم لڑکیاں، جو درس کے لئے جمع ہوتیں اس پر جماعت اسلامی کے کچھ لوگ اکثر وبیشتر تنقید وتبصرہ کرتے۔ وہ زمانہ تو ہم لوگوں کے جوش کا تھا، اس طرح کی کئی ایک باتیں سننے کے بعد ایک دن ہم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اتنے سمجھدار لوگ بغیر دیکھے جانے کیسے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہم سبھوں کی بات خاموشی سے سنتے رہے۔ کسی کو نہ اچھا کہا نہ برا، نہ ہم لوگوں کو نصیحت کی، بس دو جملہ میں بات سمجھا دی۔ ہر انسان اپنا اپنا کام کرتا ہے۔ تے لوگ کا کام پڑھنا ہے تے لوگ پڑھ۔ بات بنانے والے اور تنقید وتبصرہ کرنے والے اپنا کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم بڑے پر مزاح انسان تھے۔ طرح بہ طرح کے لطیفے سنایا کرتے۔ مذاق ہی مذاق میں نصیحت کر جاتے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ حلقہ طلبہ کے کسی لڑکے کی منگنی ہوئی (شرعاً جسکی کوئی اہمیت نہیں ہے)، وہ گھوڑا اسہن کے رہنے والے تھے۔ جب منگنی کی مٹھائی ڈاکٹر صاحب کے پاس آئی تو آپ نے کہا ''ارے گھوڑا میں تو لید ہوتی ہے منگنی کہاں سے آ گئی''۔

شمیم صاحب مرحوم (پرل موٹرس، پٹنہ) جو ڈاکٹر صاحب کو اپنے والد کی طرح مانتے تھے کا انتقال ہو گیا۔ کچھ زمانہ تک ڈاکٹر

صاحب کا کھانا انہی کے گھر سے آتا تھا۔ڈاکٹر صاحب مرحوم عموماً ہر جگہ کھاتے پیتے نہیں تھے، جہاں انہیں رزق کے حلال اور طیب ہونے کا یقین ہوتا وہیں کھاتے۔شمیم صاحب کی نماز جنازہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھائی تھی۔ایک دن درس کی مجلس کے موقع پر جب اس بات کا ذکر آیا تو میں نے کہا، کتنا اچھا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ہم لوگ ختم ہو جاتے، ڈاکٹر صاحب نماز جنازہ پڑھاتے اور ہم لوگوں کے لئے گڑ گڑا کر دعا مانگتے، دعا کی بدولت ہم لوگوں کا بیڑا پار ہو جاتا۔ان باتوں کو سن کر آپ خوب ہنسے، پھر بولے، ارے انسان سب سے زیادہ اپنے آپ کو پیار کرتا ہے، دن رات خدا کے آگے رو رو کر گڑ گڑا کر بندہ خود اپنے لئے جو دعا کرتا ہے خدا وہ دعا زیادہ سنتا ہے۔

میری شادی بنگلہ دیش ہوئی۔اس شادی سے وہ بہت خوش تھے۔انہوں نے کہا تھا، یہ شادی نسل وقوم سے اوپر اٹھ کر ہوئی ہے۔شادی کے معاملہ میں اس بات پر ان کا بہت اصرار تھا۔اس کے بعد جب جب میری ان سے ملاقات ہوئی وہ بنگلہ دیش کی دینی وتحریکی سرگرمیوں کے بارے میں پوچھتے۔اس زمانہ میں بنگلہ دیش کے امیر جماعت پر مقدمہ چل رہا تھا، ان کے کیس وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے پوچھتے۔مولانا غلام اعظم صاحب کے لئے ہم لوگوں کے ذریعہ جیل میں کئی کتابیں بھجوائیں۔بنگلہ دیش کی جماعت اسلامی سے وہ بہت پر امید تھے۔مگر وہاں کی جماعت والوں کا حال سن کر (خاص کر شیخ حسینہ کی جس طرح جماعت والوں نے حمایت کی) ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت مایوس ہوتے تھے۔بولے کہ وہاں کی جماعت سے میں بہت امید لگائے تھا کہ بنگالی عموماً منافقت سے پاک ہوتے ہیں، مگر لگتا ہے جماعت اسلامی کا اپنا ہی ایک رنگ ہے جو ہر جگہ چڑھا ہوا ہے۔

اپنی گونا گوں مصروفیتوں کے باوجود اپنے بھائی راشد نیر اور بہنوئی احمد علی اختر صاحب کے حکم پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ گزارے ہوئے اوقات کے کچھ نقوش جو اس وقت ذہن پر ابھرے ہیں ان چند سطور میں قلمبند کر کے آپ قارئین کے پیش نظر کر رہی ہوں تاکہ قوم وملت کے اس مجاہد کو سمجھنے میں شاید کچھ مدد ملے۔

ڈاکٹر افروز انجم صاحبہ، سابق ذمہ دار حلقہ طالبات اسلامی، بہار، پٹنہ یونیورسیٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے ساتھ مطالعہ قرآن کے خصوصی حلقہ میں ڈاکٹر صاحبؒ سے عربی زبان اور تفسیر قرآن کا درس لیا۔ڈاکٹر صاحبؒ سے فکری، تحریکی اور گھریلو تعلق۔

(قیام: ڈھاکہ، بنگلہ دیش)

تعمیر اسلامی معاشرہ کے مفکر و محرک

راشد نیر

پیکرِ عزیمت : کٹھن ہے توڑنا دیرینہ بت رفاقت کا کہوں میں تنہا اذاں، لا الہ الا اللہ

سید ضیاء الہدیٰ علیہ الرحمتہ جنہیں انکے احباب وشناسا ڈاکٹر صاحب کہا کرتے کا یہ شعر ایک طرز فکر کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ انکی پوری شخصیت کا ترجمان ہے۔ انکی گفتگو یا تحریر میں یوں تو اشعار کا استعمال بہت کم ہوتا لیکن اپنی حیات کے آخری ایام میں انہوں نے اپنے چند اشعار جو اس مضمون میں شامل ہیں اپنی نجی ملاقاتوں میں سنائے یا وہ بعض رفقاء جماعت کو لکھے گئے خطوط کا حصہ بنے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے جب سے اپنے معبود حقیقی کو اپنے دل میں جگہ دی اسکے بعد سے بے دریغ بت شکنی کی۔ خواہ وہ ذات یا خاندان کے افتخار کا بت ہو یا زندگی کے معیار کا۔ جیسے ہی دین کا کوئی تقاضا انکے سامنے آیا تو انہوں نے نہ اپنے نفس کی خواہشات کو خاطر میں لایا، نہ نوکری اور کسب معاش کے مستقل ذرائع کی پروا کی اور نہ ہی رشتہ داروں اور احباب سے تعلق کے رسمی تقاضوں کا لحاظ کیا۔ حتی کہ جب انکی سمجھ میں آیا کہ دین کا یہی مطالبہ ہے تو اس جماعت سے بھی اپنے رشتہ کو توڑ لیا جس سے انکا دستوری ہی نہیں بلکہ جزباتی تعلق بھی تھا اور جسکے نظریہ کی کامیابی کے لئے انہوں نے اپنی ذہنی وجسمانی متاع لٹائی تھی اور طعن وتشنیع کے تیر سہے تھے۔ اصول کی خاطر عقیدت مندوں کے حلقے سے نکلنے کی جرأت کوئی اولوالعزم ہی کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی بود و باش ہو یا انکی تحریر وتقریر وہ پر پیچ ہونے کے بجائے سادہ اور دوٹوک ہوتی تھی اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے تقاضائے دینی کا اظہار اور سنت رسولؐ کی بلا کم وکاست پیروی ان کی نمایاں صفت تھی۔ ان کی یہی صفت صرف ظاہری دنیاوی نتائج پر نظر رکھنے والے اور دین کی کنہہ سے ناواقف افراد کو غلو اور بے جا اصول پسندی معلوم ہوتی۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ موقف تھا کہ رسول ﷺ اور صحابہؓ (خاص کر بدری صحابہؓ) کے مثالی نمونہ (Ideal) کو کبھی بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے، تا کہ باعزم افراد ہمیشہ اس مقام پر پہنچنے کی جدوجہد کرتے رہیں، اور کسی نچلی سطح پر مطمئن ہوکر نہ بیٹھ رہیں۔ اس مثالی نمونہ سے قریب تر ایک نمونہ بھی ان گنت ناقص نمونوں کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر طور پر حق کی شہادت دینے والا ہوگا۔

ان کی زندگی میں قول وعمل کا تضاد نہ تھا۔ ان کی شخصیت ان کے قول کی شہادت دینے والی ایک پیکر عزیمت تھی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی خود کو دین کا داعی کہتا ہے تو اس کے لئے زندگی گزارنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے عزیمت کا، نہ کہ رخصت کا۔ اپنے ایک خطاب میں انہوں نے فرمایا ''میں خصوصی طور پر تحریک کے ذمہ داروں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی ذاتوں سے ایسا نمونہ پیش کریں جس کے نتیجہ میں ان کے پیچھے چلنے والے دنیاوی معیار زندگی کو بے وقعت سمجھنے لگیں''۔ قیادت کے منصب پر فائز افراد یا دینی جدوجہد کی دعوے دار اجتماعیت کی کمزوریوں پر انہوں نے سخت گرفت اور تنقید کی کیونکہ ان کی اچھائیاں یا برائیاں مثال بن جاتی ہیں اور دوررس نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔ البتہ معاشرہ کے عام افراد کی اصلاح میں انہوں نے نرمی اور درگزر سے کام لیا اور تحریک کے کارکنوں خصوصاً نوجوانوں کے ساتھ چشم پوشی اور شفقت کا معاملہ کیا۔ معاشرے میں شادی بیاہ اور دوسرے مواقع پر پائی جانے والی برائیوں اور غلط رسوم ورواج کے سخت خلاف ہونے اور اصلاح حال کے لئے کوشاں رہنے کے باوجود ان کا کہنا تھا کہ ''لوگوں سے نہ قطع تعلق کریں اور نہ ہی انہیں حقیر سمجھیں''۔ نکاح کے مجلسوں میں شرکت کی لیکن دعوت کا کھانا کھائے بغیر عقد کا چھہارا لے کر گھر

واپس آ گئے۔اس طرح اپنے طرز عمل سے ایک خاموش تبلیغ کر دی۔کسی شخصیت کی اصل پہچان آزمائش کے بعد ہی ہوتی ہے خواہ معاملات میں ہو یا مصیبت میں۔ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں آئے ایسے بہت سے مواقع میں سے ایک موقع جیل میں قید و بند کی صعوبتوں کا بھی آیا۔اس وقت ڈاکٹر صاحب نے راضی بہ رضا رہنے کی جس صفت کا مظاہرہ کیا وہ ان کے دوسرے رفقاء کی تقویت کا بھی باعث بنا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی ذاتی زندگی سے متعلق بادی النظر میں معلوم پڑتا کہ وہ خانگی جھمیلوں سے آزاد تھے، چنانچہ ان کے لئے تو عزیمت کی زندگی، جسے آج شدت پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے، گزارنا آسان تھا، لیکن دوسروں کے لئے ممکن نہیں۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے گھر کی جن ذمہ داریوں کو ادا کیا اس سے کم ہی لوگوں کو سابقہ پیش آتا ہے۔اپنی گھریلو زندگی کو خاص کر عمر کے اس حصہ کو جس میں انسان خدمت کا خود محتاج ہوتا ہے انہوں نے ایک دائم المریض شریک حیات کی تیمارداری میں گزارا۔بنا ماں باپ کی ایک بے سہارا بچی کی پرورش کی۔جب وہ جوان ہوئی تو اس کی شادی کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا ارادہ کیا لیکن وہ بچی ایک حادثہ میں وفات پا گئی۔چنانچہ خاندان کے جن ذمہ داریوں کو جس طرح ادا کرنے کا خدا اور رسولؐ نے انہیں مکلف ٹھہرایا تھا اسے انہوں نے بہ طریقہ احسن ادا کیا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے صرف اپنی ہی نہیں بلکہ اپنے گھر والوں کے لئے بھی، سہولیات زندگی تو کیا، ضروریات زندگی کی فہرست کو بھی مختصر سے مختصر رکھنے کی کوشش کی تاکہ وہ اپنے خدا کی رضا کے کاموں میں اپنے جسمانی و دماغی قویٰ کو اور اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ لگا سکیں۔ڈاکٹر صاحب کی نجی اور تحریکی زندگی کہ جو خدوخال ابھرتے ہیں اسے بعض لوگ غیر متوازن مانتے۔یہ بات آج کے فساد زدہ ماحول میں غیر متوقع نہیں ہے بلکہ اس کی پزیرائی ہوتی تو یہ بات باعث حیرت ہوتی۔ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا ''ظاہر ہے کہ عالمی سطح پر جب ہر طرف کفر چھایا ہوا ہو اور لوگ امتداد زمانہ کے سبب کفر سے سمجھوتہ بھی کر چکے ہوں تو اسلامی تحریک کو دوست کہاں سے میسر آئیں گے''۔انہوں نے اپنی زندگی جس سادگی اور کفایت شعاری سے گذاری وہ انکی مجبوری نہیں بلکہ سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔وہ فراخ دست نہیں تو تنگ دست بھی نہیں تھے۔انہوں نے خود اپنی ہی رقم سے فریضہ حج ادا کیا، کتنوں کی بطور قرض و صدقہ مدد کی اور کتنوں کا مفت علاج کیا۔جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے طرز زندگی کو ان کی ذاتی افتاد طبع پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا، انہیں ڈاکٹر صاحب کے کچھ محاسن کے اعتراف اور ان سے عقیدت مندی کے اظہار کے باوجود، ان کی زندگی سے اتباع سنت رسولؐ کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوئی تحریک نہیں ملی۔

اتفاق و اختلاف : اپنی دینی زندگی میں ڈاکٹر صاحب نے بہتیرے مشکل فیصلے کئے، لیکن اس میں شاید مشکل ترین اور بڑا فیصلہ ان کا جماعت اسلامی سے علیحدگی کا تھا۔ایک ایسا تعلق جو لوگوں کے درمیان امتیاز اور شناخت کا باعث ہو، اس سے الگ ہونے کی جرأت کرنا صرف ان کے لئے ہی ناممکن نہیں ہوتا جن کے مفادات اس تعلق سے وابستہ ہو جاتے ہیں، بلکہ اس کا فیصلہ اختلاف فکر کے باوجود بہت سے مخلصین بھی نہیں کر پاتے، کیونکہ اپنی فکر کے مطابق اور اپنے بل بوتے پر کسی تحریک کا برپا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ڈاکٹر صاحبؒ نے جماعت اسلامی سے یکم رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۸ر مارچ ۱۹۹۱ء کو استعفیٰ دیا۔جماعت کی پالیسی سے غیر مطمئن تو وہ اپنے استعفیٰ کے کافی قبل ہی سے تھے۔چنانچہ اپنی کتاب ''انقلابی تحریک'' کی پہلی اشاعت (۱۹۸۹ء) کے پیش لفظ میں انہوں نے لکھا ''جس کو میں تحریری شکل میں اس لئے نہیں لا رہا ہوں کہ جو اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں ان پر نقد یا تبصرہ پیش نظر ہو (ہر ایک کو اسکے خلوص کے مطابق آخرت میں اجر بہر حال ملے گا) بلکہ اس لئے لا رہا ہوں کہ ایک طرف تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اپنے مقصد یعنی دین کو عملاً قائم کرنے کے حصول میں موجودہ تحریکوں کی شان و شوکت کے باوجود انکی ناکامی آئندہ نسلوں کو پست ہمت

نہ کردے''۔ وہیں پر دین کے قیام کے نہج (Process) پر مستقل غور وفکر کا تذکرہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں جماعت کی مروجہ پالیسی میں تشنگی کا احساس تھا۔ اس سے یہ تاثر بھی لے لیا گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر نہج (Process) کبھی واضح ہوا ہی نہیں۔ جب کہ یہ تاثر غلط ہے کیونکہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ''رفتہ رفتہ بات واضح ہونے لگی''۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے رویہ میں ایک بڑا موڑ (Turning Point)، جو انکے استعفٰی پر منتج ہوا، اس وقت آیا جب جماعت اسلامی نے اپنے دیرینہ موقف سے ہٹتے ہوئے اپنے ارکان کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دینے کا فیصلہ کیا اور اس پر عمل درآمد کے تعلق سے ذمہ داران جماعت کا ایک خاص رجحان سامنے آیا۔

یہ خیال کہ ڈاکٹر صاحب کا جماعت سے استعفٰی کا فیصلہ جلد بازی کا اور جذباتی تھا مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ ایک واضح فکری نقطۂ نظر کی بنا پر اور کافی انتظار کے بعد اس فیصلے پر پہنچنے کی صراحت اپنے استعفٰی نامہ میں کرنے کے علاوہ مولانا صدرالدینؒ کے نام ایک مکتوب میں ڈاکٹر صاحبؒ نے لکھا'' جماعت سے میرے استعفٰی کی اطلاع شاید آپکو مل چکی ہوگی۔ دل تو قبل ہی اس پر مطمئن ہو چکا تھا لیکن مزید غور وفکر کے لئے کچھ توقف کرنا مناسب معلوم ہوا اور پھر آپ لوگوں سے ایک سال کے انتظار کا وعدہ بھی پورا کرنا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہتری کی امید ہو تو انتظار کو طول دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن امید کی کوئی بنیاد تو ہونی ہی چاہئے، جو مجھے نظر نہیں آتی۔ وہ رفقاء جو تحریک کو صحیح سمت میں چلا سکتے یا رکھ سکتے تھے وہ عملاً یا تو الگ ہو گئے یا کردئے گئے — انتشار صرف جماعت کا بکھر جانا ہی نہیں ہے بلکہ کسی جماعت کا اپنے مقصد سے عملاً الگ ہو جانا بھی انتشار ہی ہے۔ ووٹ دینے کی آزادی کا فیصلہ تو صرف ایک بہانہ ہے بتدریج عملی رویہ کی ایک بڑی تبدیلی کا — ہم جیسے چند لوگوں کے جماعت کے اندر رہنے یا الگ ہو جانے سے جماعت کے طرز عمل میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے البتہ بعض لوگ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو جماعت کے اندر قائم رکھ کر اسکی ساکھ محفوظ رکھی جائے'' ۔ایک دوسرے خط میں لکھا'' جماعت اسلامی کی شوریٰ جس رخ پر چل رہی ہے اب اس کو حاکمیت الٰہ کے بجائے حاکمیت جمہور کی منزل تک جانے سے کوئی نہیں روک سکتا''۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے استعفٰی کا یہ قدم انتہائی تحمل کے بعد اٹھایا، اس کی شہادت محترم حسنین سید صاحب کے نام مولانا صدرالدینؒ کے خط کے اس جملے میں بھی ہے'' کچھ رفیقوں کی گزارش کی وجہ سے، جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے، وہ مزید انتظار کے لئے تیار و آمادہ ہو جاتے رہے — پھر انہوں نے وہ قدم اٹھا ہی دیا جس کا نہ اٹھانا ان کے بس میں نہیں رہ گیا تھا۔ ان کا ضمیر اب بھی خاموشی اختیار کئے رہنے کی اجازت دینے سے انکار کر چکا تھا''

استعفٰی کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ کے بعض اکابرین اور کارکنان جماعت اسلامی سے تعلقات میں گرم جوشی حسب سابق برقرار رہی اور بعض سے ملاقاتوں کی حد تک تعلق قائم رہا لیکن متوسلین جماعت کے راہ و رسم میں عمومی طور پر سرد مہری آگئی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی کے ایک رہنما کی حیثیت کے ختم ہوتے ہی ان میں سے اکثر کے نزدیک ڈاکٹر صاحبؒ کا ملت کے ایک صاحب بصیرت شخص کی حیثیت سے بھی کوئی مقام باقی نہ رہا۔ انکے لئے نہ تو ڈاکٹر صاحبؒ کے درس قرآن میں کوئی ندرت اور نہ اس صاحب اخلاص مربی کی صحبت میں کوئی کشش باقی رہی۔ امت کے وسیع تناظر سے ہٹ کر خاص جماعتی اور گروہی ذہنیت کا یہ فطری اظہار تھا جو ہوا۔

الجماعت کی طرح عام اجتماعیت سے بھی ہر حال میں وابستہ رہنے کا نظریہ مختلف جماعتوں کے وابستگان کے ذہنوں میں راسخ رہا ہے۔ جماعت اسلامی کی ایک بزرگ شخصیت نے ڈاکٹر صاحبؒ کو ان کے استعفٰی کے بعد ایک خط لکھا۔ یہ خط اگرچہ نصح وخیر خواہی کے جذبے سے لکھا گیا لیکن اس میں پوچھے گئے سوال کئے گئے تبصروں میں اسی ذہن کی عکاسی ہوتی ہے'' کوئی علم و تقویٰ کی کتنی ہی بلندی پر ہو اس کو اپنے کو نفس اور شیطان کے شر سے محفوظ نہیں سمجھنا چاہئے۔ جماعت سے استعفٰی کیوں؟ — ہر حال میں جماعتی زندگی گزارنے کی جو تاکید ہے جماعت سے الگ ہونے پر کیا آپ اپنے ہم خیال لوگوں کو لے کر کوئی جماعت بنا سکتے ہیں؟'' شاید اسی طرح کا

تبصرہ جب موصوف نے صدرالدین اصلاحیؒ کے نام اپنے خط میں کیا تو انہوں نے جواباً لکھا'' ان کے اس رویہ پر اس طرح کا تبصرہ بھی نہیں کر سکتا جس طرح کا تبصرہ آپ کے گرامی نامہ میں درج ہے۔ضیاءالہدیٰ صاحب جیسے مخلص اور خدا شناس اور باعمل انسان کے بارے میں میں یہ گمان نہیں کر سکتا کہ انہوں نے کسی غلط رجحان کے تحت یہ اقدام کر ڈالا ہے یا غور وفکر کا حق ادا کئے بغیر رکنیت چھوڑ بیٹھے ہیں''۔

اکابرین جماعت میں جن سے ڈاکٹر صاحبؒ سے گہرے ذاتی اور فکری تعلقات قائم رہے وہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ تھے،جنہوں نے ڈاکٹر صاحبؒ کے سلسلے میں اپنے تاثر کا اظہار ان کی اہلیہ محترمہ کے انتقال پر اپنے تعزیتی خط میں اس طرح کیا'' آپ کے اندر جس مومنانہ صبر وتحمل کا بلکہ تسلیم ورضا کا جوہر دیکھنے والوں کو دکھائی دیا کرتا ہے مجھے قوی امید ہے، یقین کی حد تک امید ہے، کہ اس صدمہ کو پوری ایمانی شان کے ساتھ برداشت کر لے جائیں گے۔اور یہ مظاہرہ صبر وبرداشت کل انشاء اللہ آپکے لئے اجر عظیم کا موجب بن جائے گا''۔اسی طرح مولاناؒ کے بارے میں ان ہی کو ایک خط میں ڈاکٹر صاحبؒ نے لکھا'' میں نے آپ کو آپ کی تحریر میں بھی اور بالمشافہ ملاقات میں بھی فقہی عالم نہیں پایا جسکا کام رخصتیں اور جواز فراہم کرنا رہ گیا ہے بلکہ اسلامی انقلاب کا عالم پایا'' یہ جملہ مولاناؒ کے بارے میں رائے کے اظہار کے ساتھ مروجہ فقہی مسالک اور دین کی انقلابی فکر کے مابین اس فرق کی نشاندہی کرتا ہے جس پر ڈاکٹر صاحبؒ کا خاص اصرار تھا۔وہ فقہی اصولیات پر مبنی رہنمائی کے بجائے قرآن وحدیث کی راست رہنمائی کے قائل تھے۔اسی لئے انہوں نے اپنی ذاتی زندگی میں بھی فقہ کی وضع کردہ امر ونواہی کی رخصتوں کو قبول نہیں کیا۔

مولاناؒ کو ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک تحریکی رفیق ہی نہیں مانا بلکہ ان کی دینی بصیرت کا ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ایک خاص مقام تھا۔وہ اپنی تحریکی فکر اور تحریروں پر ان سے مشورہ اور رائے لیتے رہتے اور مولاناؒ بھی اس میں خاص دلچسپی لیتے۔چنانچہ جب ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی کتاب ''اسلامی معاشرہ'' کا مسودہ مولاناؒ کے پاس نظر ثانی کیلئے بھیجا تو طبیعت کے بہت زیادہ ناساز ہونے کے باوجود مولانا نے اس کام کو کیا اور ڈاکٹر صاحبؒ کو لکھا'' یہ صرف آپکی ذات کا استثناء رہا ہے کہ آپ کے مسودے کی نظر ثانی کا کام از خود میں نے اپنے سر لے لیا تھا'' اس کتاب کے مسودہ میں مولاناؒ نے چند ایک مقامات پر حذف واضافہ کیا اور ڈاکٹر صاحبؒ نے اسے من وعن شائع کرایا۔مثلاً کتاب میں یہ اقتباس مولاناؒ کا اضافہ شدہ ہے'' ایک لڑی میں پرونے کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہئے کہ موجودہ زمانہ میں انجمن سازی کے لئے یا تنظیمیں قائم کرنے کے لئے عام طور سے جو طریقے رائج ہیں ویسے ہی طریقے یہاں بھی اختیار کئے جائیں گے۔ نہیں! اسلامی معاشرہ ان طریقوں سے نہیں بنا کرتا،اور نہ اسکا مزاج ہی انہیں گوارہ کر سکتا ہے۔اسلامی معاشرے کی تعمیر اور تنظیم اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوسری تمام تعمیروں اور تنظیموں سے بالکل مختلف چیز ہے۔چنانچہ اسکے لئے نہ تو رواجی انداز کی ممبر سازی کرنی ہے اور نہ تو صدر اور سکریٹری چننا ہے اور نہ کوئی ٹھیٹھ دفتری نظام قائم کرنا ہے۔کم از کم ابتداء میں تو کافی دنوں تک اس طرح کی باتوں سے بالکل دور رہنا ہوگا۔'' ڈاکٹر صاحبؒ موجودہ دینی جدوجہد کو ایک تحریکی کام سمجھتے تھے نہ کہ تنظیم یا ادارہ چلانے جیسا کوئی کام۔اسی لئے جماعت اسلامی کے تحت تنظیمی نوعیت کی ذمہ داریوں کو انہوں نے بس ناگزیر حد تک ادا کیا۔جو لوگ ڈاکٹر صاحب کے اس سوچے سمجھے طرز عمل کو سمجھ نہ پائے وہ انکی تنظیمی صلاحیت کے تعلق سے ہمیشہ شاکی رہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے جماعت اسلامی سے استعفیٰ پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے انہی کے نام ایک خط میں مولاناؒ نے لکھا '' آپکے استعفیٰ کی اطلاع ملنے پر فطری طور پر ایک جھٹکا لگا ہم نے اپنی پوری عمر اس تحریک سے وابستہ رکھنے کا فیصلہ اس طرح کے دن دیکھنے کیلئے نہیں کیا تھا۔لیکن میں آپ کو آپ کے اس قدم پر مورد الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔مورد الزام اگر ٹھہرایا جا سکتا ہے تو انہی حضرات کو ٹھہرایا جا سکتا ہے جنہوں نے عاقبت اندیشی کا حق نہ ادا کرتے ہوئے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ آپ جیسا شخص بھی الگ ہو جانے

پر مجبور ہوگیا'' ڈاکٹر صاحبؒ نے جب اپنی مجوزہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر کی تحریک کے خاکے پر مشورہ اور عملی رہنمائی چاہی تو مولاناؒ نے اسکے جواب میں اس کام کی تائید کی لیکن اپنی جسمانی اور ذہنی قویٰ کی کمزوری کی بنا پر اپنی طرف سے کسی عملی اقدام سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ''اب میں اپنے جسمانی ہی نہیں ذہنی اور دماغی ضعف کی بھی وجہ سے اس قابل نہیں رہ گیا ہوں کہ اتنے اہم مسئلہ میں یعنی ایک مستقل اسلامی تحریک و تنظیم کے خطوط کار کی کسی واضح اور حسب ضرورت تعین میں کوئی قابل اطمینان مشورہ دے سکوں۔ برادرم! مجھے تو اب از کار رفتہ ہی سمجھئے''۔ایک دوسرے خط میں لکھا ''اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کا صحیح ،نتیجہ خیز اور مکمل خاکہ بنیادی طور پر تو خود آپ کے اس کتابچہ ہی میں موجود ہے اور سچی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک اقامت دین کا بنیادی اور اولین مرحلہ اس طرح کے معاشرہ کی تعمیر ہی تھا اور ہے لیکن افسوس ہے کہ جماعت اس تعمیر کی مطاوبہ کوششوں کا اور اسکی ناگزیر ضرورتوں کا کما حقہ پاس ولحاظ نہ رکھ سکی اور دیگر کم اہم یا بعد کے مراحل کے کاموں میں اپنی توجہات اور اپنی توانائیوں کا بیشتر حصہ صرف کرتی چلی آرہی ہے''۔

فکری خطوط : ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں کردار کی مضبوطی اور اخلاق کا حسن اتنا نمایاں تھا کہ عام لوگوں کی نظروہیں ٹک کر رہ جاتی اور انکے فکر کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتی۔وہ ایک ہمہ گیر علمی وفکری انقلاب کے داعی تھے۔ان کی تحریر و تقریر کے موضوع میں تنوع اور مضمون میں ایک ندرت ہوتی تھی اور ان کی تفسیر قرآن کی مجلس میں تازگی کا احساس ہوتا۔جو بھی ان کی تحریروں (خلائی دور، انقلابی تحریک، نماز ایک معجزہ، اسلامی نظام تعلیم، نصاب مطالعہ وتربیت وغیرہ) کو پڑھے گا یا جس نے ان کی تقریر اور تفسیر کو سنا ہوگا، وہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ان کی تحریر و تقریر بھاری بھرکم الفاظ سے خالی اور اپنے علم کا سکہ جمانے کے لئے دئے جانے والے غیر ضروری حوالوں سے عاری ہوتی تھی۔اسی لئے مشاہیر کی صف میں شامل بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہوتی کہ ڈاکٹر صاحب محدود علم اور معمولی فہم کے آدمی تھے۔حالانکہ دماغ میں صرف معلومات کا انبار جمع کر لینے سے ہی دینی بصیرت حاصل نہیں ہوجاتی جب تک کہ ان معلومات کی روشنی میں کسی صحیح نتیجہ کہ اخذ کرنے کی ربانی ہدایت نصیب نہ ہو۔دنیا بھر کی معلومات خواہ ڈاکٹر صاحبؒ پاس نہ ہوں لیکن ہرزمانہ کے لئے العلم کے سرچشمہ قرآن حکیم کی آیات کے فہم کی ایک فطری استعداد اللہ تعالیٰ نے انہیں ودیعت فرمائی تھی۔اس لئے خاص ضروری معلومات حوادث کی کنہہ کو سمجھنے کے لئے کافی ہوتیں۔ڈاکٹر صاحب کا کسی مسئلہ پر غور وفکر کے نتیجہ میں جس بات پر شرح صدر ہو جاتا اسے وہ مختصراً یکا دآیات قرآنی یا حدیث رسولؐ کے حوالہ سے بیان کر دیتے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی فکری تعمیر کی بنیاد کا پتھر قرآن تھا۔ان کا کہنا تھا کہ ''اس کا اعتراف خواہ مذہبی طبقے والوں کو نہ ہو لیکن قرآن کا مطالعہ کرنے والے اسلام کے مخالفین اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ قرآن ایک انقلابی کتاب ہے اور اس کی عامل امت غلام بنا کر نہیں رکھی جاسکتی ہے۔اور اسی لئے سیاسی طور پر غالب اقوام نے بہت سی جہتوں سے اس بات کی منظم مہم چلائی کہ کسی طرح مسلم عوام کا قرآن کے ساتھ شعوری تعلق ختم کر دیا جائے، جذباتی تعلق رہے تو رہے''۔ڈاکٹر صاحب قرآن کی بنیاد پر اور اس کے حوالے سے فقہہ، تاریخ، سائنس جیسے علوم کے از سرِ نو مطالعہ (Re-study) اور ان کے اصولیات کی ترتیب نو کے قائل تھے۔خود قرآن پر ان کا تدبر موجودہ تفسیری لٹریچر پر منحصر نہ تھا،حتیٰ کہ قرآنی الفاظ وآیات کی وسعت اور گہرائی تک پہنچنے میں دستیاب عربی لغات کی بے بضاعتی کی بھی وہ اکثر شکایت کرتے۔اسی لئے وہ قرآنی الفاظ وآیات کی تفہیم کے لئے سب سے پہلے خود قرآن میں مختلف مقامات پر موجود ان الفاظ وآیات سے مدد لیتے۔قرآن کے علاوہ دوسری کتابوں کے مطالعہ میں ڈاکٹر صاحبؒ بہت Selective تھے گرچہ ان کی علمی دلچسپی میں تنوع تھا، جو ان کی ڈائری سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔شاہ ولی اللہ کی ان کے یہاں خاص قدر تھی۔وہ اس بات کے قائل تھے کہ ''رزق ہی نہیں بلکہ بہت سی کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جن سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے''۔وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار نہ

تھے کہ غور وفکر اور مطالعہ میں اسلاف کے کھینچے ہوئے خطوط سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ان کا کہنا تھا کہ اسلاف بھی زمانہ اور حالات سے اتنے ہی متاثر ہوئے ہیں جتنا کہ ہم ہوسکتے ہیں۔اس لئے قرآن وسنت پر غور وفکر کے نتیجے میں قبل یا بعد کے قائم شدہ مسلمات رد ہوتے ہیں تو رد کردیئے جائیں گے۔یہ بات روایتی مذہبی حلقہ میں عمومی طور پر قائم نقطۂ نظر کے خلاف تھی۔ڈاکٹر صاحب کی بعض تحریروں پر سخت تبصرے بھی ہوئے۔لیکن ان کی بہت سی باتیں جو کل عجوبہ معلوم ہوتی تھیں آج کے جدید انکشافات اور تحقیق جیسے Genetic Engineering وغیرہ نے صحیح ثابت کردی ہیں۔لیکن افسوس کہ نظام ربانی کے متوازی اور رضاء الٰہی کے برخلاف اہل کفر کے ہاتھوں یہ تہذیبی تبدیلی آرہی ہے جو کہ خیر وصلاح کے بجائے فساد کا باعث بن رہی ہے اور اس تہذیب کی ہلاکت کو قریب کررہی ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب ؒ مسلم نوجوانوں کو قرآن وسنت کی رہنمائی میں علمی وتہذیبی قیادت کے منصب پر فائز دیکھنے کے متمنی تھے تاکہ رسول ؐ کے نقش قدم پر تہذیب کو از سر نو استوار کیا جاسکے اور وہ اسکے لئے ان کی فکر کو مہمیز دیتے رہتے تھے۔

ان کے فکری اور علمی نقطہ نظر سے یا ان کے کسی عملی رویہ سے اختلاف تو ہوسکتا ہے، لیکن اسکی بنا قرآنی برہان ہوگا نہ کہ خود تراشیدہ تصورات یا دیگر دلائل۔کیونکہ انکا کہنا تھا کہ انسانی عقل، مشاہدات اور تجربات سب ناقص اور سطحی ہوتے ہیں۔باطل کے پاس اسکے سوا کوئی دوسرا حربہ نہیں ہے۔دلیل کا سب سے پہلا استعمال ابلیس نے کیا جب اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کی عقلی دلیل دیتے ہوئے کہا قال انا خیر منه . خلقتنی من نار و خلقته من طین میں اس (آدم) سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے (ص:۷۶) جبکہ خدا کا یہ حکم برہان تھا امر تک میں نے تجھے حکم دیا تھا (الاعراف ۱۲) اسی طرح بیع (تجارت) اور ربوا (سود) کو ایک ہی طرح کی چیز ماننے کی عقلی دلیل کے مقابلہ میں برہان یہ ہے واحل اللہ البیع و حرم الربوا ''اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام'' (البقرہ ۲۷۵)۔چنانچہ یہی وہ فکری بنیاد ہے جو ان کوششوں پر روک لگائے گی جو شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنی آیات کو نظر انداز کر کے ذہنی عیاشی کو راہ دینے، دینی مسلمات کو تحلیل (Dilute) کرنے اور اجتہاد کے نام پر آج کی غالب باطل تہذیب کے اقدار اور سانچہ (Framework) کے مطابق قرآن وحدیث کی تشریح وتوضیح کرنے کا سبب بنتی ہیں۔جب کہ اسلام انسانی زندگی کہ ظاہر و باطن دونوں کی صورت گری کا اپنا الگ خاکہ رکھتا ہے۔ڈاکٹر صاحب ؒ اسی طرح اس طرز عمل یعنی فقہی موشگافیوں کا سہارا لے کر اپنے مسلک اور اسلاف کی پیروی کو اتباع سنت پر عملاً مقدم رکھنے کے بھی سخت خلاف تھے۔اس طرح بنیادی کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنادینے کی وجہہ کرہی ان کے الفاظ میں'' آج آپ یہ تصور نہیں کرسکتے کہ ایک مسلک والے دوسرے مسلک والے کو اپنا امیر یا قائد بنالینگے جب کہ ایک کمیونسٹ یا سیکولرسٹ کو حنفی بھی اپنا رہنما مان لیتے ہیں اور اہل حدیث بھی''۔ڈاکٹر صاحب گرچہ خود بھی آزادانہ اور Original غور وفکر کے آدمی تھے لیکن ان کے تفکر وتدبر کا سانچہ اور Point of reference لازماً قرآن وسنت ہوتا۔یہ دو انتہاؤں کے بجائے اعتدال کی راہ تھی۔ان کا کہنا تھا کہ'' امتداد زمانہ کے ساتھ ایک خاص ڈگر پر چلتے رہنے کی وجہہ سے، جو لچک دار چیزیں ہیں ان کو لوگ اپنے لئے بے لچک بنالیتے ہیں اور جو چیزیں بنیادی ہیں اور جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے لچک نہیں رکھی ہے، لوگ ان میں لچک پیدا کردیتے ہیں۔صحابہ کرام ؓ کا حال یہ تھا کہ وہ بنیاد پر پہاڑ کی طرح جمے رہا کرتے تھے اور فروعات میں بے حد رواداری برتتے تھے''۔

ڈاکٹر صاحب ؒ نے جب جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تو بہت سے لوگ جماعت اور الجماعت کے فرق کو نہ سمجھنے کی وجہہ کر ان کے اس قدم کی دینی حیثیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔غالباً انکے علم میں یہ نہ ہو کہ جماعت اور جماعتی زندگی سے متعلق ڈاکٹر صاحب ؒ ایک واضح رائے رکھتے تھے جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں کیا'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزیں چھوڑی

تھیں۔ ایک الجماعت اور دوسری امت۔ الجماعت تو کب کی ختم ہوگئی لیکن امت باقی رہی اور باقی رہے گی۔ چونکہ الجماعت باقی نہیں رہی تھی اس لئے امت میں سے باشعور لوگوں کی اولین ذمہ داری تھی کہ الجماعت کو وجود میں لائیں۔ اس سلسلے کی کوششوں میں سے ایک کوشش جماعت اسلامی کی تشکیل تھی جو الجماعت بننے کے رخ پر بڑھ رہی تھی۔ اس طرح یہ بالقوئ الجماعت تھی اور اس لئے ہر اس مسلمان کے لئے جو اپنے ایمان کی خیر چاہتا تھا ایسی کسی دوسری جماعت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس جماعت میں شریک ہونا لازمی تھا۔ لیکن یہ شرکت الجماعت میں ہوتی نہ کہ محض جماعت میں۔ ہمکو الجماعت کے ساتھ وابستگی کا پابند کیا گیا ہے نہ کہ محض ''جماعت'' نام کی کوئی جماعت کے ساتھ۔ کہا گیا علیکم بالجماعة، یہ نہیں کہا گیا علیکم بجماعة۔ اگر جماعت اسلامی بھی اسی سطح پر پہنچ جائے جس سطح پر مسلمانوں کی دوسری جماعتیں ہیں اور اپنی بنیادی خصوصیت کھو بیٹھے تو پھر اسکے ساتھ وابستگی فرض نہیں رہ سکتی۔ اور اگر اسی سطح پر ابتدا بنتی تو جمیعۃ العلماء کی موجودگی میں اس کی تشکیل میرے خیال میں موجب ثواب نہیں ہوتی''۔ ان کا کہنا تھا کہ ''جماعت مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہے، لیکن جماعت ہی اگر مقصد بن جائے تو اس ناچیز کی رائے میں اس سے الگ ہو جانا ہی عین تقاضائے دین ہے جماعت برائے جماعت اور استحکام برائے استحکام کوئی معنی نہیں رکھتا''۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی کتاب ''انقلابی تحریک'' جو انکی فکر کے اہم نکات پر مشتمل ہے، شائع ہوئی تو اس کتاب کے اندراجات کو جماعت اسلامی کی پالیسیوں سے انحراف مانتے ہوئے جماعت اسلامی کی شوریٰ کے حوالہ سے قیم جماعت، افضل حسین صاحب مرحوم نے ڈاکٹر صاحب سے وضاحت طلب کی اور اس کتاب کی فروخت فی الفور بند کرنے کو کہا۔ اپنے جواب میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی اس کتاب کی نوعیت واضح کرتے ہوئے لکھا ''میرا کتابچہ ایک علمی وایجابی (سلبی نہیں) مضمون پر مشتمل ہے جو مستقبل میں انقلابی (اصلاحی نہیں) تحریک لیکر اٹھنے والوں کے لئے لکھا گیا ہے'' ساتھ ہی کتاب کے پیش لفظ کے اس حصے کا حوالہ دیتے ہوئے کہ ''یہ تحریر آئندہ اسلامی تحریک برپا کرنے والوں کے لئے اگر رہنمائی کا سبب بن جائے تو انکے اجر میں شائد میرا بھی حصہ ہو جائے'' اپنے وضاحتی خط میں لکھا ''اس صاف اور صریح وضاحت کے بعد کون سا معروف اخلاقی جواز ہے کہ کوئی مجھ پر یہ الزام لگائے کہ میں نے کسی فرد یا چند افراد یا کسی تحریک کو نشانہ بنایا ہے۔ البتہ علمی حیثیت سے اس پر تنقید، اعتراض اور غلطیوں کی نشاندہی کرنے کا حق ہر آدمی کو ہے اور اسے میں خوش آمدید کرتا ہوں''۔ فکری مباحث پرمبنی اس اہم کتاب میں بیان کئے گئے نکات پر کسی مفصل تبادلہ خیال کی صورت نکالنے کے بجائے ضابطہ کی کارروائی کا جو رویہ ذمہ داران جماعت نے اپنایا وہ باہمی جذباتی تعلق کو مجروح کرنے کا سبب بنا، اور یہ ڈاکٹر صاحب کے قریب رہنے والوں نے بخوبی محسوس کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کے بعض نکات اور اس پر قیم جماعت کے خط میں درج اعتراضات کو سامنے رکھا جائے تو یہ ان کے مابین پالیسی کے فرق کی وضاحت کے ساتھ ڈاکٹر صاحبؒ کی فکر کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔

پہلا خاص اعتراض کتاب کے اس اقتباس پر تھا ''اسلامی انقلاب بھاڑے کے لوگوں اور بامعاوضہ (خواہ مشاہرہ کہا جائے یا کفاف) کام کرنے والوں کے ذریعہ برپا ہو ہی نہیں سکتا'' کتاب میں آگے کے جملوں میں اسکی وضاحت اس طرح ہے'' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکی دور میں ایسا کوئی ایک کارکن بھی بھرتی نہیں کیا گیا اور مدنی دور میں بھی جب تحریک انقلاب برپا کرکے اس کو چلانے کے مرحلہ میں پہنچ گئی تھی ایک شخص بھی ہمہ وقتی یا جزوقتی بامعاوضہ کارکن نہیں تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اصحاب صفہ جو صحیح معنوں میں ہمہ وقتی کارکن تھے انکا بھی کوئی کفاف یا معاوضہ طئے نہیں کیا گیا تھا'' ڈاکٹر صاحب جماعت کے اندر باضابطہ ایک تنخواہ دار طبقہ بنانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انکی رائے یہ تھی کہ اپنی تحریکی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے افراد تحریک اپنی معاش کا خود کوئی بندوبست کریں اور اس میں ضرورت پڑنے پر رفقاء انکے معاون ہوں۔ انہوں نے اپنا بھی نمونہ پیش کیا۔ باہمی رشتۂ مودت پر زور دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ''بڑا فرق

ہے اس کھلانے میں اور اس کھلانے میں کہ کوئی مسافر یا کوئی محتاج آئے اور اس کو اجتماعی فنڈ سے کھلا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ افراد کے درمیان اخوت اور محبت کا رشتہ دیکھنا چاہتا ہے صرف قانون اور ضابطے کی خانہ پری نہیں''۔

کتاب میں ایک جگہ صرف قرآن کو انبیائی تحریک کی مستند تاریخ کا ماخذ مانتے ہوئے لکھا ہے ''انبیاء علیہم السلام جو تحریکیں چلاتے رہے ان کی تفصیلات نہ تو تاریخ میں نہ قرآن سے پہلے کے پچھلے الہامی رکارڈ میں مستند انداز میں محفوظ ہیں'' یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔لیکن اس پر اعتراض کیا گیا، جس کی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی۔

کتاب میں لکھا ہے کہ ''یہ (داعی) اپنی جان اور مال سے ان (خلق خدا) کی خدمت صرف اللہ کی رضا کے لئے کریں نہ کہ پبلسٹی اور تحریک کا امیج بنانے کے لئے--- انکی (مخالفوں) کی کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ مسائل کھڑے کردیں جن میں تحریک والے الجھ جائیں اور انکی یکسوئی متاثر ہو۔اس سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسولؐ نے کسی بھی مسئلہ کو ایشو (issue) نہیں بنایا (جیسے کعبہ میں بتوں کی موجودگی کا معاملہ)--- ایسا ہی کچھ حال دوسری قومی اور ملکی مسائل کا تھا جن کو آپ ذیلی ہدف بناتے تو لوگوں کی مادہ پرستانہ نگاہ میں آپ کا امیج اچھا بنتا لیکن اسلامی انقلاب کا کیا ہوتا؟''۔''(آپؐ) پوری یکسوئی کے ساتھ طئے شدہ منصوبے کے مطابق کھڑے افراد کو چھانٹنے اور ان پر مشتمل ایک اسلامی معاشرہ جو اسلامی نظام کا چلتا پھرتا آنکھوں سے دیکھا جانے والا نمونہ ہو بنانے میں لگے رہے''۔ یہاں واضح طور پر ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تحریک اسلامی مثبت (Positive) فکر کے ساتھ اپنے ہدف اور ترجیحات کے مطابق یکسوئی کے ساتھ اقدام (Act) کرتی ہے، خواہ یہ کسی پیمانہ پر ہو۔اس میں یہ بات خود بخود شامل ہے کہ مخالفین کے عمل کی پیش بنی کر کے ضروری ہوا تو پیشگی قدم (Pre-emptive steps) اٹھائے جائیں، لیکن وہ مخالفین کے ذریعہ اٹھائے جانے والے کسی issue یا پروپگنڈا پر بطور ردعمل (Reaction) کوئی کام نہیں کرتی۔ ردعمل کا نہ ہونا جمود نہیں۔لہٰذا ان باتوں پر، جس میں ایشو میں الجھنے اور زمانہ کی کسوٹی کے مطابق فرد اور جماعت کی شبیہہ (image) بہتر بنانے کی دوڑ میں شامل ہونے سے روکا گیا تھا، دیگر تنقیدی جملوں کے ساتھ خط میں یہ بھی لکھا گیا کہ ''(مصنف) تحریک اسلامی میں دو طرح کے افراد کو غیر مخلصین کے زمرے میں شامل ثابت کرتے ہیں ایک وہ لوگ جو تحریک کا امیج بنانے میں ایشوز اور پبلسٹی سے بھی کام لیتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو بیرون ملک بڑی بڑی تنخواہوں کے ساتھ ملازمت کرتے ہیں''۔ حالانکہ کتاب میں بڑی بڑی تنخواہوں کی ملازمت کو عمومی طور پر نشانہ نہیں بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس تعلق سے تحریک اسلامی کے خواص کے طرز عمل پر ضرور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتے۔ البتہ حیرت ہے کہ اسلام مخالف قوتوں کے آزمودہ اور خاص طریقہ کار کی نشاندہی کرنے والا، کتاب کا یہ اقتباس قابل اعتراض ٹھہرا''اس دور میں تحریک اسلامی کو سبوتاژ کرنے والی طاقتیں باہر سے بڑی بڑی رقمیں دیکر تحریک میں گھسے ہوئے لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنا کر اور بڑی بڑی تنخواہوں کے ساتھ ملازمت دیکر براہ راست اپنے لئے فضا کو سازگار بنانے کی کوشش کرتی ہیں''۔

مصنف کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں تھا کہ اسلام میں بالغ رائے دہندگی کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے اور معنوی اعتبار سے ریاست اسی طرح ایک بت ہے جس طرح بت پرستوں کے مٹی یا دھات کے بت ہوتے ہیں۔ کتاب کے اس اقتباس پر ''شوریٰ کے لوگ عام لوگوں کے منتخب کئے ہوئے یا امیر یا شوریٰ بنانے والے لوگ بھی عام لوگوں کے منتخب کئے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ وہ اللہ، رسولؐ اور اسلام کے لئے اپنے مخلصانہ کارناموں کی وجہ سے خود بخود ممتاز ہو جاتے ہیں'' اور اس پر کہ ''ارباب حل وعقد میں سے مشورے کے لئے افراد کا انتخاب امیر کا کام ہوگا نہ کہ حل وعقد کا''۔ خط میں یہ تبصرہ کیا گیا کہ ''دستور جماعت اسلامی میں امیر اور شوریٰ کے انتخاب کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ موصوف کے ان اقتباسات کی روشنی میں نادرست قرار پاتا ہے''۔

مندرجہ بالا ان اختلافات کے علاوہ اس سیاق میں ڈاکٹر صاحبؒ کی فکر کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ قیادت اور مشاورت کے سلسلے میں جماعت کے مروجہ طریقہ سے غیر مطمئن تھے۔ اسلامی قیادت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب صالح لوگ کسی شخصیت کی بصیرت اور کردار پر اعتماد کر کے اسکے گرد جمع ہو جائیں۔ اسی طرح قائد کا انتخاب وہ چند مخصوص لوگوں کا اختیار مانتے۔ خلفاء راشدین کا طریقہ تو ہمارے سامنے ہے اور رسولؐ کی یہ حدیث بھی ''اگر سیاہ نک کٹا غلام تم پر امیر مقرر کیا جائے تو اس کی بات سنو اور اسکی اطاعت کرو بشرطیکہ وہ اللہ کی کتاب کے مطابق تم پر حکومت کر رہا ہو (مشکوٰۃ، مسلم)''۔ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ''یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تم جس کو اپنا امیر منتخب کرو بلکہ یہ کہا گیا کہ جس کو تم پر امیر بنا دیا جائے''۔ نیز شوریٰ اور امیر کے اختیارات کے تعلق سے ڈاکٹر صاحبؒ کا کہنا تھا کہ ''مشوروں کی حقیقت اسکے سوا کچھ نہیں کہ اس طرح مسائل کے مختلف پہلو سامنے آجائیں جو صرف ایک دماغ کے لئے عام طور پر ممکن نہیں ہے پھر ان کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا حق قائد ہی کو ہوتا ہے — جن کو اس پر اعتماد نہ رہے یا اس کے طریقہ کار سے اختلاف ہو وہ اگر دیانت دار ہوتے ہیں تو خود سے الگ ہو جاتے ہیں ورنہ قائد کو ان کا اخراج (Purging) کر دینا چاہئے ورنہ تحریک کی منزل کھوٹی ہو کر رہے گی''۔ لہٰذا دیانت داری کے اسی تقاضا کو پورا کرتے ہوئے انہوں نے جماعت اسلامی سے استعفیٰ دیا۔

نظم جماعت سے متعلق اپنی ان آراء کے علاوہ نظام سیاست سے متعلق ڈاکٹر صاحبؒ کی فکر کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ نہ صرف نظریہ جمہوری کو بلکہ طریقہ جمہوری کو بھی تعلیمات اسلامی سے متصادم مانتے اور وہ اسکی ایک مضبوط بنیاد رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جمہور تو انتظام ملکی چلا نہیں سکتے۔ اسکے لئے تو اختیارات کا ارتکاز ضروری ہے جسکے واسطے بالغ رائے دہندگی کا طریقہ اپنایا گیا۔ جس میں اکثریت کی رائے فیصلہ کن مانی جاتی ہے۔ زمین پر آباد اکثریت ہر زمانہ میں سادہ لوح عوام پر مشتمل ہوتی ہے جن کو مفاد پرست اور چالاک لوگ طاقت کے مرکز پر قبضہ کرنے کے لئے ہمیشہ بیوقوف اور شعوری یا بے شعوری طور پر اپنا آلۂ کار بناتے رہے ہیں۔ جمہوریت کی بدتر ینی شاید اسی وقت لوگوں کی سمجھ میں آئے گی جب مغرب والے اسکو مکمل طلاق دے دینگے۔ کیونکہ بین الاقوامی معاملات میں تو مغرب اب جمہوریت کو واضح طور سے رد کر ہی چکا ہے۔'' اپنے ایک دوسرے مضمون میں جمہوریت اور دیگر باطل نظریات سے متعلق لکھا کہ ''نہ تو مسائل کو حل کیا اور نہ ہی وہ اپنی اصل شکل میں قائم ہو سکا۔ اس کی تازہ ترین مثال جمہوریت اور کمیونزم کی ہے۔ ہر شخص اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ وہ (جمہوریت) کسی چھوٹے سے چھوٹے خطۂ زمین پر ایک دن کے لئے بھی قائم نہیں ہو سکا۔ وہ محض ایک خیالی مقصد (utopia) ثابت ہوا۔ اسی طرح کمیونزم کا حال ہے''۔ جب کے اسلام مکمل شکل میں قائم ہو چکا ہے اور پھر قائم ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ باطل نظاموں میں جمہوریت سبھوں سے کم ظالم تو ہو سکتی ہے لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ نظام حق یا اسکا بدل ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحبؒ باطل اداروں میں نفوذ کے خلاف تھے ان کے مطابق ''اسلام اپنے ماننے والوں کو اسکا پابند کرتا ہے کہ وہ صاف ستھرے طریقہ پر اپنے قول اور اسکے مطابق صالح عمل کے ساتھ عوام میں نفوذ کریں نہ کہ اداروں، تنظیموں اور نظام میں''۔ جماعت کا طرز عمل ان کے نزدیک، خصوصاً الکشن میں شمولیت کے فیصلہ کے بعد، دراصل خدا کے بجائے جمہور کو قانون سازی کا حق دینے والے اداروں سے بہ خوشی تعلق استوار کرنے کے مترادف تھا، جبکہ نظام باطل میں جبراً کسی کام کو کرنا یا نہ کرنا ایک الگ بات ہے حالانکہ ان حالات میں بھی کم از کم کسی تحریکی فرد یا جماعت کا رویہ عزیمت کا ہی ہونا چاہئے۔ عمر کی آخری منزل میں صلاحیت کی کمی کے احساس کے باوجود ڈاکٹر صاحبؒ کا استعفیٰ اور ان کے استعفیٰ نامہ کا یہ جملہ بھی کے ''باطل کو مٹانے کے لئے جو جماعت قائم کی گئی تھی باطل کو عملاً سہارا دینے کی پالیسی پر گامزن کر دی گئی''، یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسے عقیدے کی سطح کا اختلاف مانتے۔ یہ اگر فروعی یا طریقۂ کار کا اختلاف ہوتا تو وہ علیحدہ نہ ہوتے۔

کہاں یہ دعویٰ کے حالات کچھ بھی ہوں لیکن ہمیں ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ
اور اب حکومت جمہور کی کوشش رہا وہ دعویٰ کہاں لاالٰہ الا اللہ

ڈاکٹر صاحبؒ کا ماننا تھا کہ آج کا دور کلی فساد کا ہے۔''اس (زمین) پر آباد لوگ اللہ کے لامحدود اقتدار کو محدود کر کے یا اس کا انکار کر کے اپنا نظم حکومت قائم کر لیتے ہیں تو اگر چہ بظاہر وہاں لوٹ مار، کشت وخون اور عام لوگوں کے نزدیک جو چیز فساد کہلاتی ہے وہ نہ بھی ہو تو بھی اسلام کی نگاہ میں وہ حالت فساد ہی ہے''۔ دراصل فساد کی جڑ ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وقار اور اس کے قانون کا احترام مجروح ہو۔ اسی لئے وہ اسکے بھی خلاف تھے کہ اصل مقصد اور ترجیح کی قیمت پر تحریک اسلامی کی پالیسی افراد امت کی صرف جانی ومالی بقا کے گرد گھومنے لگے اور مداہنت کی راہ اپناتے ہوئے اس کا ایک نتیجہ یہ سامنے آئے کہ، حق کے علم بردار باطل کے علم برداروں کے ساتھ بقاء باہمی کی اور باطل اقتدار کے سائے میں نام نہاد اور ظاہری امن، جو کہ حقیقت میں فساد ہو، کی دہائی دینے لگیں۔ عام انسانی حسن سلوک تو مطلوب ہے لیکن یہ علیحدہ چیز ہے۔ چنانچہ جماعت اسلامی سے اپنے استعفیٰ نامہ میں انہوں نے لکھا'' کیا روس سے مسلمان تمام تر قہر مانیوں کے باوجود ختم کر دیئے گئے؟ کیا چین سے مسلمان مٹا دیئے گئے؟ کیا برما سے مسلمان نابود کر دیئے گئے؟ ہاں کیا اس وقت سے بھی زیادہ خطرناک اور نازک گھڑی آگئی تھی جبکہ ہمارا آخری نبیؐ ہماری (اللہ کی) بارگاہ میں گڑگڑا کر عرض کر رہا تھا کہ یہ مٹھی بھر جماعت اگر ختم ہوگئی تو قیامت تک روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔ اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی کیا ہم نے (اللہ نے) حکمت عملی کے طور پر ادنیٰ سی مداہنت کی بھی اجازت دی؟۔

کلی فساد کے اس دور میں ڈاکٹر صاحب کلی تبدیلی کو لازمی مانتے اور اصلاحی کوششوں کو لاحاصل مانتے جو کہ اصلاً موجود نظام کی زندگی بڑھانے کے لئے کی جاتی ہیں، نہ کہ اس کی جگہ پر دوسرے نظام کو لانے کے لئے۔ تحریک اسلامی کو وہ انقلابی طریقہ پر عامل دیکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اسی طرح کلی تبدیلی ممکن ہے۔ انقلابی کوششوں کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا'' عام ذہن یہ بن گیا ہے کہ انقلاب لازماً خون خرابہ اور بدامنی کی کوششیں چاہتا ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے، کیونکہ انقلاب واقعتاً اس وقت تک برپا ہو ہی نہیں سکتا جب تک لوگوں کا دل اس انقلاب کے لئے مسخر نہ ہو جائے ____ باطل کے مقابلے میں جب حق میدان میں آجاتا ہے تو باطل اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا اور وہ وسائل اور عوام کے استحصال سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حق کے علم برداروں کو اور سخت کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے، انہیں جماعت کے اندر پائی جانے والی اس رائے سے اختلاف تھا جس کے مطابق جماعت انقلابی نہیں بلکہ اصلاحی مقاصد اور طریقہ کار کی حامل رہی ہے اور رہنا چاہیئے۔ یہ تمام باتیں فکر وعمل کے ان اختلافات کی بنیاد بنیں جو بالآخر ان کے جماعت سے استعفیٰ کا سبب بنے۔

یہ انتظار تراہے فقط بہانۂ نفس کہیں، کہا تھا کہاں لاالٰہ الا اللہ

ڈاکٹر صاحبؒ کی تحریکی فکر کا عنوان ''اسلامی معاشرہ کی تعمیر'' تھا۔ ان کے الفاظ میں ''اسلامی معاشرے کو عدم سے وجود میں لانے کا کام نبی ہی کے کرنے کا ہوتا ہے، غیر نبی یہ نہیں کر سکتا۔ اب جب کہ سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے اور حضور ﷺ کا بنایا ہوا معاشرہ بہت بڑی حد تک درہم برہم ہو گیا ہے، اس کو عدم سے وجود میں لانا نہیں ہے بلکہ اس کو نئے سرے سے مرتب یعنی (Set) کرنا ہے۔'' مسلم معاشرہ کے تنظیم نو کی کوشش کا ایک پہلو دراصل الجماعت یا خلافت کے قیام کی کوشش ہے اور یہ کام صرف اصلاح معاشرہ یا کسی مخصوص جماعت کے قیام اور اسکی توسیع واستحکام کی محدود کوششوں سے زیادہ ہمہ گیر اور عمیق ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک خطاب میں فرمایا'' ایسے لوگ جو کل کے کل اسلام کو اپنی زندگی میں نہیں سموتے ہیں وہ غیر

شعوری طور پر اپنے آپ کو دو مخالف سمتوں میں کھینچنے والی طاقتوں کے حوالے کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں فعال بن کر نہیں رہ سکتے ان کے لئے انفعال مقدر ہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعض حصے پر عمل کرتے ہیں اور بعض حصے پر عمل نہیں کرتے ہیں ان کا بدلہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا میں وہ رسوائی کی زندگی بسر کریں اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہو'۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اسلام کے کسی جزء کے بجائے کل کے احیاء کی بات اس لئے بھی کی کہ حق و باطل کے درمیان تمیز میں ان کے ذہن میں کوئی ابہام نہ تھا۔ ان کا کہنا تھا ''اسلام کھانٹی اور خالص چیز ہے۔ ان میں ذرہ بھی کسی چیز کی آمیزش کر دی تو اگر چہ غالب حصہ اسلام کا ہی رہے گا مگر وہ خالص نہیں ہوگا بلکہ غیر خالص ہو جائے گا جو اللہ کو پسند نہیں ہے اور اس لئے وہ باطل نہ بھی ہو تو باطل کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے شیطان اس پر راضی ہو جاتا ہے کہ ایک انسان سولہ آنا اسلام کا باغی نہ بھی ہو تو کسی قسم کی آمیزش ہی پر راضی ہو جائے۔ اس بات کو اگر سامنے رکھا جائے تو اسلام کے بحیثیت تحریک کہ عروج و زوال کے حقیقی اسباب آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے''۔

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں یہ بات بھی بالکل واضح تھی کہ حق پرستوں کی کامیابی میں تعداد کی کثرت یا قلت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اور وہ مادی طاقت کے بجائے خدا کی غیبی تائید اور ایمان و اخلاق کی قوت کو فیصلہ کن مانتے۔ انہوں نے فرمایا ''یہ ملت اس لئے تو نہیں بنائی گئی تھی کہ مادی طاقت پر بھروسہ کرے اور اس کے بل بوتے پر دنیا والوں سے کشمکش کرے، اگر چہ اس کو اس کا مکلف بھی ٹھہرایا گیا تھا کی وہ حسب استطاعت قوت ضرور فراہم کرے''۔ 'حسب استطاعت' سے واضح ہے کہ اس وقت جو قوت ممکن ہو خواہ کتنی ہی معمولی ہو۔ ''ہر گروہ اپنے کمزور محاذ پر دار کو خالی دے کر اپنے اس محاذ پر مقابلہ کرنا چاہتا ہے جو مستحکم ہو''۔ احیاء اسلام کے علم برداروں کا عددی اور مادی قوت کا محاذ ہمیشہ ہی کمزور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حق کے لئے کی جانے والی جدوجہد میں فکر و عمل کی مکمل یکسوئی، مداہنت سے احتراض، نظروں سے پوشیدہ غیبی عوامل، تحریک سے دنیوی مفاد کی عدم وابستگی، منافقت اور منافقوں سے دوری اور الٰہی برہان کہ مطابق فیصلہ کرنے کو کامیابی کے لئے لازمی شرائط میں شامل کیا۔

اسلامی معاشرہ کی تعمیر کی حکمت عملی میں پہلا بنیادی کام انکے نزدیک السابقون صحابہؓ کے نمونہ پر ایسے افراد کی تیاری ہے جو اپنے فکر و عمل میں کلی تبدیلی کے لئے آمادہ ہوں اور جو کسی خارجی محرک اور دنیاوی ترغیب و سہارے کے بغیر دینی جدوجہد کرنے والے ہوں۔ ایسے افراد کو انہوں نے 'السابقون' کہا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جب تک ایسے افراد کی بنیاد فراہم نہ ہو اس وقت تک اسلامی معاشرہ کی عمارت تعمیر نہیں کی جا سکتی اور اگر کسی طرح کی کوئی تعمیر ہو بھی جائے تو وہ بامقصد اور باعث فلاح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایسی تمام کوششیں سطحی اور لاحاصل ہونگی۔

پیش بینی اور رہنمائی : ڈاکٹر صاحب صرف حال کے مسائل میں الجھے رہنے کے بجائے مستقبل کی بھی سوچتے..... وہ مستقبل جو دنیا سے لے کر آخرت تک محیط ہے۔ وہ نئی نسل کو دنیا کے چیلنج کا مقابلہ کرنے اور ان کو آخرت کی کامیابی کا اہل بنانے کے لئے کوشاں رہتے۔ کسی قیادت کی ایک لازمی صفت یہ ہے کہ وہ صاحب بصیرت (Visionary) ہو اور مستقبل کو سامنے رکھ کر اقدامات کی طرف رہنمائی کرے۔ آج مغربی مفکرین End of History (امریکی مصنف فوکو یاما کی کتاب) کی بات کر رہے ہیں اور مغربی تہذیب کے اپنی معراج پا جانے کی بات کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ ''ہم اب انسانیت کے نظریہ ارتقاء کی آخری بلندیوں کا نظارہ کر رہے ہیں''۔ اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے، جسے انہوں نے ایک حد تک پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے، کہ موجودہ جدید تہذیب خاتمہ کے قریب ہے کیونکہ ترقی کے انتہائی نقطہ سے ہی تنزلی کی ابتدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ساموئیل ہنٹنگٹن Clash of

(Civilization کا مصنف) ہو یا فوکویاما، ان کی تحریریوں میں ظاہر کئے جانے والے اعتماد کے پیچھے ایک اضطراب پوشیدہ ہے۔ اسی لئے ان کی فکر کے مطابق آج کی غالب مغربی تہذیب کے علمبردار بے جا طاقت کے استعمال اور جبر کی جو روش اختیار کئے ہوئے ہیں وہ خوف کی نفسیات کی علامت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے طلبا سے اپنے ایک خطاب میں سالوں قبل فرمایا تھا ''موجودہ تہذیب اب اتنا جلد مٹ جانے والی ہے کہ جو لوگ باقی رہیں گے وہ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ یہ تہذیب خود ہی نہیں مٹے گی بلکہ اپنے علمبرداروں کے ساتھ مٹے گی اور جو لوگ ان علمبرداروں کے پیچھے چل رہے ہونگے ان کا انجام بھی انہیں کے ساتھ ہوگا''۔

دینی جدوجہد کے تعلق سے حالات کے تجزیہ میں ڈاکٹر صاحبؒ قانون فطرت سے رہنمائی کو بہت اہمیت دیتے۔ قرآن میں آفاق وانفس میں موجود آیات الٰہی پر غور کرنے کی تاکید آئی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کو اس حقیقت کا پورا ادراک تھا کہ انسانی معاشرہ اور کائنات میں یکساں قانون الٰہی کارفرما ہے اور ان دونوں کے مابین تطبیق کی اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص صلاحیت عطا کی تھی۔ ان امور کی وضاحت کے لئے انہوں نے ایک کتاب ''فطرت کے اشارے'' اور ایک فولڈر ''موجودہ حالات کا تقاضا اور فطرت کے اشارے'' بھی تحریر کیا۔ جس میں بتایا کہ کسی عملی اقدام سے پہلے ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ یہ کون سا وقت ہے مثلاً رات سے مراد غلبۂ باطل ہے جبکہ فجر کا مطلب غلبۂ حق کا آغاز ہے۔ اس (فجر کے) وقت خنکی اور ٹھنڈک جو رات کی خصوصیت ہے سب سے زیادہ ہوتی ہے اور نیند کا حملہ بھی شدید ہوتا ہے جو دراصل رخصت ہوتی ہوئی رات کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ اسی طرح آج باطل نے ایسے حالات پیدا کردئے ہیں کہ لوگوں کے اعضاء مفلوج اور حواس شل ہو جائیں۔ دن اور رات دونوں کے خاتمہ کے وقت آسمان میں سرخی نمودار ہوتی ہے جسے شفق کہتے ہیں۔ یہ علامت ہے معاشرتی دنیا میں خون کی سرخی کی۔ عمومی قتل وغارت گری کے اس دور میں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم اب چاہیں یا نہ چاہیں قدرت نے ہمیں اس دور میں داخل کردیا ہے جب طلوع آفتاب یعنی غلبۂ اسلام کے آغاز کے وقت کا آخری معرکہ درپیش ہے۔ اسی فولڈر میں لکھا کہ ''اللہ تعالیٰ کی مشیت آج پھر انقلاب کے حق میں ہے اور رسولؐ کے ہاتھوں اسلام کو جس طرح غلبہ حاصل ہوا تھا اسی طرح آج جب کہ اب کوئی نبی نہیں آنے والا یہ غلبہ امام مہدی کے ذریعہ حاصل ہو۔ اس غرض کے لئے مشیت نے بھی غلط عناصر کو چھانٹ کر الگ کرنے کا کام شروع کردیا ہے''۔ اپنے ایک دستی نوٹ میں لکھا ''وہ (اللہ تعالیٰ) اب براہ راست انقلابی عمل کررہا ہے۔ اسلئے سید احمد شہید کی تاریخ نہیں دہرائی جائیگی۔ قرآن وسنتؐ سے بے نیاز رویہ والوں کی صفائی ہوگی''۔ اس میں ان کے پرعزم اور پراعتماد ذہن کی جھلک ملتی ہے۔

آثار واحادیث کی روشنی میں ڈاکٹر صاحبؒ جن حالات کی پیش بینی کررہے تھے انہیں اپنی ایک دوسری کتاب ''عذاب الٰہی اور دور حاضر'' میں بھی تفصیل سے بیان کیا ''اب اس زمین پر دو طرح کی چھوٹی قیامتیں بس آنے ہی والی ہیں جو تہذیب کی قیامت ہوگی۔ قیامت خواہ قیامت صغریٰ ہی کیوں نہ ہو قیامت ہی ہے اس کے برپا ہونے سے پہلے بڑی اتھل پتھل مچے گی جس کا آغاز ہو چکا ہے تقطیب Polarization کا عمل بھی شروع ہوگیا ہے جو بتدریج بڑھے گا اس میں ایمان والوں کیلئے سخت آزمائش ہوگی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نئی تہذیب اور نیا تمدن برپا کرنے کیلئے مخلصین کو کھوٹے لوگوں سے علاحدہ کرکے رہے گا۔ اس غرض کیلئے وہ ایسا انتظام کرے گا کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو دنیا پرست ہونگے یا کم از کم دنیا پرست نہیں بھی ہوں تو دنیا پسند ہوں گے اپنا وزن باطل کے پلڑے میں ڈال دیں گے اس لئے کہ ظاہری اسباب کے لحاظ سے انکو اسلام کا مستقبل بالکل تاریک نظر آئے گا''۔ مستقبل کی ہلاکت سے بچنے کے لئے انہوں نے خصوصاً نوجوانوں سے فرمایا ''موجودہ تہذیب کے ساتھ وفاداری کو ترک کردیا جائے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ آنے والی تہذیب کیسی ہوگی۔ اور پھر اپنے ذہن، اپنے رجحانات اور اپنی خواہشوں کو اسی کے مطابق بدلنے کی اور اپنے عملی رویوں کو اس

سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع کردی جائے۔ انہیں چاہئے کہ جس پٹی پٹائی راہ پر وہ چلتے آرہے ہیں اسے فوراً چھوڑ دیں۔ نئی راہ انہیں خود بنانی ہوگی اور تاریخ سازی کا رول ادا کرنا ہوگا''۔ دوسری جگہ مخلصین کو انہوں نے یہ ہدایت دی ''جب فیصلہ کن گھڑی آجائے تو اس وقت تو انکو حق پسندوں کا ساتھ دینا ہی ہے اس سے پہلے اس کے لئے ذہنی و عملی تیاری کرتے رہیں۔ ذہنی تیاری تو یہ ہے کہ دنیا پرست اور دنیا پسند مسلمانوں کے پرفریب دلائل کو سمجھنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔ اس کے لئے خاص طور پر انکو اپنا ذہن ایسا بنانا ہوگا کہ قرآن وسنت پر عمل کرنے میں کتنا ہی بڑا سے بڑا دنیاوی نقصان (ذاتی یا قومی) دکھایا جائے اس سے متاثر نہ ہوں — اور دنیاوی طور پر معیار زندگی بلند کرنے کے تصور کو اپنے دل دماغ سے پوری طرح کھرچ کر نکال دینا ہے اور اپنی زندگی کو سادہ سے سادہ گزارنا ہے یہاں تک کہ اللہ کبھی اور کسی مرحلہ میں اپنے فضل کی بارش بھی کردے تو اس سے ذاتی طور پر مستفیض نہ ہوکر اسے اللہ کے دین اور اس کے بندوں پر خرچ کردینا ہے''۔

ان تحریروں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی بہت سی دوسری ہدایات بھی آئندہ پیش آنے والے حالات میں حفاظتی اور اقدامی تدابیر کے بطور ہیں۔ گرچہ بہت سوں کو ان کی اہمیت اس وقت سمجھ میں نہ آئی لیکن ہر آنے والا دن اس صورت حال کو قریب لا رہا ہے۔ اپنے خطبہ جمعہ تک میں بارہا لوگوں کو اسکی تاکید کی کہ وہ اپنے گھروں میں کنواں کھدوائیں یا کم از کم جو موجود ہے اسے محفوظ رکھیں۔ زیادہ سے زیادہ آیات قرآنی پڑھنے اور حفظ کرنے کو کہا اور چند خاص اذکار پر مداومت کی تاکید کی۔ رسول ﷺ کی شاید اتباع ہی میں چند دھور زمین خریدی گرچہ اس کے ہبہ کی وصیت کر گئے اور یہ اتباع سنت کا خیال ہی تھا کہ خود سہولت نہ ہونے کے باوجود لوگوں سے یہ کہہ کر بکری پلوائی کہ اس میں برکت ہے اور اس کے لئے لوگوں کو رقم دی، بہ طور ہتھیار اپنے پاس ایک لوہے کی گپتی رکھی، عطر اور خوشبو کا مستقل استعمال کیا اور ہر وقت طاہر رہنے کی کوشش کی، اس کے لئے وضو یا تیمّم کرتے۔ اس طرح مومنین کی حفاظت اور استعانت میں نظام ربانی میں فرشتوں کا جو مقام ہے وہ بھی پیش نظر رہتا۔ یہ بات بھی کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب کی مومن جنّات سے ملاقات تھی۔ انہوں نے جدید تہذیب کے وسائل اور مشین وآلات (ٹیلی فون، پنکھا وغیرہ) کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے بجائے اس سے حتی الامکان پرہیز کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی۔ کسی تہذیب کی تعمیرات ہوں یا دیگر مادی مظاہر دراصل اس تہذیب کی روح اور فکر کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے علاج ومعالجہ کے تعلق سے بھی جدید میڈیکل سائنس کا استعمال نہایت مجبوری کے حالت میں کیا حالانکہ علاج وادویہ ان کے تجربہ وتلاش کا خاص میدان تھا۔ ان کے نزدیک آج کی دجالی تہذیب سے زیادہ سے زیادہ کنارہ کش ہونا ایک ضروری انقلابی عمل تھا۔ یہ کلی فساد فی الارض کی تہذیب ہے جس میں انسان حرام اشیاء اور باطل قوانین سے بالکلیہ محصور ہوگیا ہے۔ چنانچہ آج باطل کا مکمل تسلط کلی انقلاب کی داعی قیادت کا متقاضی ہے۔ اسلامی قیادت کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ''انبیاء علیھم السلام کے علاوہ صالح قیادت دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس کے ذمہ امت کی گاڑی کو چلاتے رہنا ہوتا ہے۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہوتا کہ وہ دبی ہوئی ملت کو ابھار سکے، بلکہ خود امت اپنے اندر سے اس قسم کی قیادت کو ابھارتی ہے۔ یہ امت کی کوتاہی مانی جائے گی کہ وہ ایسی صالح قیادت نہ ابھارے۔ دوسری قسم کی قیادت مجدّد دین امت کی قیادت ہے، جسے امت اپنے اندر سے نہیں ابھارتی ہے بلکہ خود یہ قیادت امت کو ابھارتی ہے اور اس طرح یہ وہبی قیادت ہوتی ہے''۔

دنیا میں آنے والے حالات کا یہی تجزیہ تھا جس کی بنا پر ڈاکٹر صاحب لوگوں سے ملاقات اور تبادلہ خیال میں اکثر امام مہدی اور دجال کا تذکرہ کرتے اور اپنے کام کو آنے والی ایسی ہی ایک وہبی قیادت، جو کہ امام مہدی کی ہوگی، کے لئے زمین کی ہمواری کے کام سے تعبیر کرتے۔ وہ اس زمانہ کو قریب بتاتے۔ کہتے کہ میں نے قرآنی آیات سے جو حساب کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس

وقت کا آغاز نئی صدی عیسوی شروع ہوتے ہی ہو جائیگا۔ یہودیوں اور دجال سے متعلق انفرادی گفتگو کے علاوہ اپنے تفصیلی اور دینی نقطۂ نظر کو تحریری طور پر اپنی کتاب ''بیت المقدس کی بازیابی'' (جس کا دوسرا ایڈیشن ''سازش'' کے نام سے شائع ہوا) میں پیش کیا۔ نیز اس موضوع پر رمضان المبارک کے جمعہ کا سلسلہ وار خطبہ بھی دیا۔ کتاب میں لکھا کہ ''جس طرح شیطان اور شرارت لازم و ملزوم ہیں اسی طرح سازش اور یہودیت دونوں لازم و ملزوم ہیں''۔ دجال سے متعلق لکھا کہ ''اس وقت یہودیوں کا سردار جس کے پاس دجل و فریب میں انتہائی مہارت کے سوا کوئی حقیقی بہت بڑی طاقت نہ ہوگی اپنے مکروفریب کے زور پر یہودیوں کی عالم گیر ریاست کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کا سنہرا اور منتظر وقت سمجھ کر اپنے تمام وسائل اور ہتھکنڈوں کے ساتھ بساط عالم پر نکل پڑے گا اور واقعی دنیا والوں میں سکت باقی نہ ہوگی کہ اس کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اپنے فیصلے کو روبہ کار لانے کے لئے اپنا غیبی ہاتھ بڑھائے گی اور عیسیٰ کے ذریعہ دجال کے فتنے کا خاتمہ ہوگا'' ڈاکٹر صاحبؒ کو اس بات پر شرح صدر تھا کہ رسول اکرمؐ نے قیامت تک وقوع پزیر ہونے والے اس طرح کے جن واقعات کی خبر دی ہے اور جنہیں اکابرین محدثین نے مضبوط سندوں کے ساتھ جمع کیا ہے اور جو زیادہ تر صحاح ستہ کا حصہ ہیں، انہیں اس امت کے فکر و عمل میں خاص مقام حاصل ہونا چاہئے۔ اسی لئے ایک جگہ لکھا ''اس وقت ہمارے کرنے کا جو کام ہے وہ یہ ہے کہ ہم امام مہدی کے ذریعہ برپا ہونے والے انقلاب کیلئے زمین کی ہمواری کے کام میں لگ جائیں۔ اپنے خطبہ میں فرمایا کہ جب مہدی آئے گا تو مسلمان نام کے جو لوگ دنیا میں ہوں گے وہ دو کیمپ میں بٹ جائیں گے۔ ایک کیمپ میں ایمان ہوگا نفاق نہیں ہوگا اور دوسرے میں نفاق ہوگا ایمان نہیں ہوگا۔ دونوں اپنے کو مسلمان کہیں گے۔ امام مہدی تو کسی ایک ہی گھر میں پیدا ہونگے، اس گھر کے لوگ آیا شیعہ ہونگے، سنی ہونگے، یا کسی اور جماعت کے ہونگے۔ اس لئے اس چکر میں رہنے والے لوگ کہیں گے کہ یہ ہمارا قائد نہیں ہے۔ آگے فرمایا'' آپ سن لیں، جو لوگ انتظار میں رہتے ہیں وہ ساتھ نہیں دیتے ہیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو لوگ انتظار کرتے تھے (یعنی یہود) وہ تو انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ آپؐ آئے تو آپ کے منکر ہو گئے۔ اسی طرح اگر آپ انتظار میں رہے کہ امام مہدی آئیں گے تو دیکھا جائے گا تو یقین جانئے اللہ تعالیٰ توفیق نہیں دے گا انکے کیمپ میں جانے کی۔ اپنے معاشرے کو اسلامی بنانے کا کام، اسکی تحریک شروع کر دیجئے۔ اپنے آپ کو بدلنا سیکھئے۔

عملی کوششوں کے تعلق سے ایک فولڈر میں ڈاکٹر صاحب نے یہ ہدایت کی کہ: (۱) آپ فرداً فرداً اللہ تعالیٰ سے جڑ کر اور تمام ہنگاموں اور وقتی و ضمنی مسائل سے الگ ہو کر یکسوئی سے اپنی، اپنے گھر والوں اور اپنے معاشرے کی اصلاح کی کوشش انہی خطوط کار پر کریں جن پر رسولؐ نے اس امت کو حق کے ساتھ کھڑا کیا تھا۔ (۲) اسلام کے جس جس حکم پر عمل کرنے کے لئے جیسے جیسے اور جس حد تک حالات سازگار ہوتے جائیں اس پر عمل کرتے جائیں اور اپنے ساتھیوں سے عمل کرانے کی کوشش کریں۔ (۳) جو افراد بھی تیار ہوتے جائیں انہیں باہم مربوط رکھنے کی کوشش کریں۔ (۴) طرز رہائش میں رسولؐ و صحابہؓ کی طرح سادگی اختیار کریں۔ (۵) تواصو ابالحق اور تواصوا بالصبر (حق اور صبر کی نصیحت) کے ذریعہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچائیں— عمل کے معاملہ میں ہر فرد اپنے ضمیر کا پابند اور اپنے رب کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ (۶) کسی جماعت یا تنظیم سے منسلک نہ ہوں تاکہ انکے بارے میں لوگوں کو یہ اعتماد ہو کہ یہ لوگ جماعتوں اور تنظیموں کے معاملہ میں غیر جانب دار ہیں۔ (۷) نماز کا اور اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتے رہنے کا اہتمام کریں۔ انکا کہنا تھا کہ تہجد سے وہ روحانی ارتقاء نصیب ہوتا ہے جو کسی اور طرح سے ممکن نہیں ہے۔

اس کے علاوہ معاشرہ کی عمومی رہنمائی کے ضمن میں انہوں نے جو ہدایات دیں ان میں چند خاص یہ ہیں:

(۱) ذات، برادری، پیشہ یا کسی اور دنیاوی حیثیت کی بنا پر اونچ نیچ کے تصور کو ذہن سے نکال دیں۔

(۲) تعلقات میں خلوص پیدا کریں۔ دوستی کریں تو مخلصانہ خواہ ایک ہی دوست ہو۔

(۳) معاملات کے کھرے اور زبان کے پکے ہوں جس پر اللہ اعتماد کرے۔ وعدہ کو نبھائیں۔ دین کا مفہوم لوگوں نے محدود کر رکھا ہے یعنی روزہ، نماز، ذکر وغیرہ باقی زبان، عہد، معاملات وغیرہ میں دینی رجحان عموماً بہت کم یا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن عوام کو کسی کی ذاتی عبادات سے کیا مطلب وہ تو اسکے معاملات کو دیکھے گی۔ رفقا کو وعدہ کرنے اور نبھانے کی خاص طور پر مشق کروائی۔

(۴) شادی بیاہ اور دوسرے مواقع پر غلط رسم ورواج کو ترک کریں، بیٹوں کی خرید وفروخت بند کریں، جہیز کے بجائے وراثت میں لڑکیوں کو حصہ دیں اور ان کے دوسرے معاشی حقوق ادا کریں۔

(۵) زکوٰۃ اور صدقات کے ذریعہ خصوصاً ایسے محتاجوں کو تلاش کر کے جو خودداری کے سبب خود ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں ان کی مدد کریں۔

(۶) دنیاوی مفاد کے لئے کسی سے کشاکش نہ کریں خواہ مسلم ہو خواہ غیر مسلم۔

(۷) غیر مسلموں سے غیر سیاسی رابطہ پیدا کریں۔ ان میں طبقات کے امتیاز سے دور رہ کر، انکے ذاتی معاملات میں دلچسپی لیں اور حسن سلوک کریں، البتہ جو ان میں شر پسند ہوں ان کے شر سے حفاظت کا سامان کرتے ہوئے اور دینی زندگی گزارتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب نے جو بات آج سے چالیس سال قبل اپنی ایک تقریر جو ''متحدہ سیرت کمیٹی کی دعوت'' کے نام سے شائع ہوئی، میں کہی تھی وہ آج بھی اتنا ہی صحیح اور حوصلہ افزا ہے۔ انہوں نے فرمایا'' آپ کا اس وقت کا بہت بڑا مسئلہ جان، مال اور آبرو کی حفاظت کا ہے ____ آپ کے قتل کا بازار جو آئے دن گرم ہوتا رہتا ہے یقیناً اس کے (اللہ کے) اذن ہی سے ہوتا ہے اور اللہ اپنے حبیب ﷺ کی امت کے لئے قہار نہیں ہے، اس لئے یقینی بات ہے کہ اس قتل میں اس کی عظیم حکمتیں پوشیدہ ہیں ____ فسادات کے ذریعہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کتنوں کو شہادت کا مقام نصیب کرانا چاہتا ہے ____ اقلیت کشی کے ذریعہ خون ریزی اور لاقانونیت کا جو چسکا لگ رہا ہے، اقلیت کا صفایا تو کر نہیں سکتا، آگے چل کر یہ رنگ لائے گا اور اکثریت کا یہ بھرم جو سیاسی جادوگری کے ذریعہ قائم ہے کھل کر رہے گا ____ ایک اور پہلو یہ ہے کہ اس طرح فرقہ پرست آہستہ آہستہ برہنہ ہوتے جا رہے ہیں اور قدرت ملک والوں کو موقع دے رہی ہے کہ وہ ہوشیار ہو جائیں۔ ورنہ وقت بتا دیگا کہ فرقہ پرستی کے جذبات کو بھڑکا کر، سوچنے سمجھنے والوں کے ذہن ودماغ کو ماؤف کر کے، ان کو تنگ نظری کے مرض میں مبتلا کر کے، ان کی آنکھ میں خاک جھونک کر، موقع پاتے ہی اپنا کھیل کھیل جانے کا کون سا بیرونی منصوبہ کام کر رہا تھا''۔

(۸) فکری یکسوئی میں خلل ڈالنے والے مغربی اور ملکی ذرائع ابلاغ سے متاثر نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلو (الحجرات ٦)

(۹) اپنی روزی خود کمائیں اور اللہ جو دے اس پر قناعت کریں۔

(۱۰) اہل خانہ سے ترش روئی سے پیش نہ آئیں۔ خاندان کی اصلاح پر خاص توجہ دیں کیونکہ کئی افراد کے بجائے ایک خاندان کا بدل جانا زیادہ اثرات مرتب کرتا ہے۔ رشتہ ازدواج میں صالحیت لازمی شرط ہونی چاہئے۔

(۱۱) مفہوم کو سمجھتے ہوئے قرآن، احادیث رسولؐ، سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہؓ وصحابیاتؓ سے کچھ نہ کچھ روزانہ پڑھیں۔ پڑھ نہ سکتے ہوں تو دوسروں سے سنیں۔

(۱۲) بچوں کو قرآن اور احادیث میں بیان کئے گئے اور صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے قصے سنائیں۔

خطوط کار : جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے جب اپنے فکری خطوط پر سرگرمیوں کا آغاز کیا تو انہوں نے کسی بڑی سیاسی وسماجی تبدیلی کے اعلان یا کوئی بڑی تحریک برپا کرنے کے دعویٰ سے پرہیز کیا کیونکہ اپنی اصل راہ کھوٹی کر کے بڑے بڑے دعوں اور نعروں کے سہارے اپنی پہچان بنانے کے مروجہ رجحان پر ان کا یہ تبصرہ تھا ۔

نہیں حقیقت دینی کچھ اس جماعت کی فقط ہو دعویٰ جہاں لا الہٰ الا اللہ

اپنی تحریکی کوششوں سے متعلق عملی طریقۂ کار کی بات ڈاکٹر صاحبؒ نے حقیقت اور امکان کے دائرے میں Micro level پر کی ہے۔انہوں نے Macro level پر بھی نہج کی مفصل فکری (عملی نہیں) گفتگو کی ہے۔ان دونوں ظروف (Parameters) میں خلط مبحث کر دینے کی وجہ کر بات سمجھ میں نہیں آتی ۔

ڈاکٹر صاحبؒ کو یقین تھا کہ حقیقی سماجی تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب کوشش دراصل ایسے افراد کی تلاش وتیاری پر مرکوز ہو جو اللہ کی مرضیات پر چلنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والے ہوں اور جو موجودہ باطل تہذیب کو باطل مانتے ہوئے بھی اس کی ترقیات اور ترجیحات سے مرعوب اور متاثر ہونے والوں میں سے نہ ہوں ۔گویا وہ ایسی انقلابی شخصیت ہو جو السابقون صحابہؓ کی طرح اپنی پہل (Initiative) پر اسلامی زندگی گزارے اور معاشرے کی تبدیلی کا محرک اور اس کا مرکز (Nucleus) بنے ۔ایسے افراد کی ٹیم بنانے کی کوشش کئے بغیر اسلامی نظام کے غلبہ کی بات کرنے پر سخت تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا ''پوچھیے کہ کون سے نظام کا قیام پیش نظر ہے۔حضرت معاویہؓ اور یزید والا یا خلفاء راشدینؓ والا ۔اگر خلفاء راشدین والا ہی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تو پوچھیے کہ اسے قائم کرنے اور چلانے کے لئے جیسے افراد ناگزیر ہیں انہیں تیار کرنے کا کیا منصوبہ اور کوشش ہے اور اس میں کتنی کامیابی ہوئی ہے؟''

حکمت عملی سے متعلق خاکہ ڈاکٹر صاحبؒ نے ''اسلامی معاشرہ'' اور ''انقلابی تحریک'' دو مختصر کتابچوں میں بیان کیا ہے۔جس میں انہوں نے لکھا ''اس تحریر میں بنیادی نکات اور ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔تفصیلات کا رنگ تو تحریک کے چلنے کے دوران بھرا جاتا ہے۔'' کیونکہ ان کے نزدیک تحریک کوئی ایسا کام نہیں کہ جس کا عملی منصوبہ (Blueprint) پہلے سے ٹیبل پر بیٹھ کر تیار کر لیا جائے۔تحریک ایک قدم اٹھانے کے بعد اسکے نتائج اور پیش آمدہ حالات کو دیکھ کر دوسرے اقدامات کرتی ہے۔جو لوگ یہ سمجھ نہیں پاتے کہ تحریک اسلامی ایک متحرک (Dynamic) چیز ہے نہ کہ جامد (جامد تو تنظیم ہوتی ہے)، وہ پہلے ہی روز سے نہج (Process) کے پورے نقشے کی بات کرتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے موقف کی تائید مولانا صدرالدینؒ نے یہ کہہ کر کی کہ ''جب کام صحیح طریقہ سے اور یکسوئی کے ساتھ ہونے لگے گا اور ہوتا رہے گا تو پیش آمدہ حالات اور تجربات خود رہنمائی کرتے جائیں گے۔غرض اصل ضرورت کسی تفصیلی خاکے کی نہیں بلکہ صحیح رخ پر یکسوئی کیساتھ کام کرتے رہنے کی ہے۔آپ کے بقول 'السابقون' کا گروہ وجود میں لانا ہی اس مہم کی شاہ کلید ہے'' افراد کی تربیت اور تزکیہ پر خاص زور دراصل دنیا میں رونما ہونے والی آزمائش سے بھری اس صورت حال کے پیش نظر بھی تھا جس کی پیش بینی ڈاکٹر صاحبؒ مسلسل کر رہے تھے۔افراد کی تلاش سے متعلق ڈاکٹر صاحب نے لکھا ''انقلاب برپا کرنے کے لئے عام آبادی سے منتخب افراد کو چھانٹنے اور تعلیم وتربیت اور تزکیہ کے ذریعہ قابل اعتماد بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مستقل سنت یہ ہے کہ باہر سے مزاحمت اور کشاکش ہو'۔ایسے کسی مرحلہ کے آنے سے قبل جب کہ اللہ تعالیٰ باطل سے کسی خارجی کشمکش اور معرکہ کی صورت پیدا کر دے انہوں نے لوگوں کی فکری، دعوتی، اخلاقی اور روحانی تیاری پر خاص زور دیا ۔

ابھی ہے حکم ہاتھوں کے اپنے روکے رکھو ابھی ہے ضرب اذاں لا الہ الا اللہ

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں تحریک کی قیادت سے متعلق جو سوال تھا اس کا اظہار مولانا صدرالدینؒ کے نام اپنے خط میں اس

طرح کیا "تحریک سے وابستہ لوگوں کے لئے ایک مرکزی کردار ضروری ہے مگر یہاں آکر گاڑی پھنستی ہے۔ اپنے بارے میں تو یقینی علم ہے کہ کسی پہلو سے اسکی صلاحیت نہیں رکھتا اور آپ بھی صحت سے معذور ہیں" لیکن اس کے باوجود لوگوں کی رہنمائی کی حتی المقدور ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے اور اپنے اندر زندہ تحریکیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اپنی فکر کی بنیاد پر کام کا آغاز کردیا۔ تاہم براہ راست اپنے ہاتھ پر بیعت لینے کے بجائے اسکا نیا طریقہ اپنایا اور اسکی وجہ یہ بتائی کہ "اس راہ میں پہلی مشکل تو وہی مرکزی کردار کی شخصیت کا فقدان ہے اور دوسری مشکل بیعت کا خانقاہی تصور ہے جو لوگوں کے ذہن میں پیوست ہو گیا ہے اور اس سے بچنے کا ہے"۔ کسی فرد کے تحریک سے وابستگی کا طریقہ یہ رکھا کہ وہ قرآن پاک کو اپنے ہاتھ میں لیکر اپنے رفقاء کے سامنے اللہ تعالیٰ سے پیمان باندھے۔ انہوں نے اپنے کام کا تعارف کراتے ہوئے لکھا "یہ تحریک دراصل اپنے آپ کو اور دوسرے بندگان خدا کو اللہ تعالیٰ سے براہ راست جوڑنے کی کوشش ہے تاکہ ہمارا تعلق اپنے رب سے بجائے رسمی کے قلبی اور شعوری ہو جائے---- اس تحریک کا کوئی مخصوص نام یا تنظیمی شکل نہیں ہوگی تاکہ افراد تحریک امت مسلمہ کے جز ہونے کے علاوہ کوئی مخصوص گروہ یا جماعت نہ بننے پائیں" البتہ دوسرے اگر کوئی مخصوص نام دے دیں تو یہ انکا معاملہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہمیں کوئی مخصوص گروہی اور جماعتی شناخت پیدا نہیں کرنی ہے بلکہ ہم سب مسلمان ہیں اور اسی نام سے جانے جائیں۔ دعوت اس انداز سے دیں کہ صاف محسوس ہوتا رہے کہ آپ خود کو امت مسلمہ کا حصہ سمجھ رہے ہیں۔ فقہی یا مسلکی اختلاف کی وجہ سے کسی کو گمراہ یا فاسق نہ ٹھہرائیں" یہ باتیں ملت کے سبھی طبقات اور حلقوں سے وابستہ ماضی اور حال کے تمام معتبر شخصی و علمی سرمایہ کو اپنا سمجھنے اور گروہی عصبیت سے اوپر اٹھ کر اس سے استفادہ کے رجحان کو پروان چڑھانے والی تھیں۔

لوگوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان سے انفرادی ملاقاتوں اور گفتگو میں ہدایات و رہنمائی کے علاوہ ڈاکٹر صاحبؒ کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ عالم گنج کی مسجد میں ہر اتوار کو بعد نماز عصر اجتماع کرتے جس میں جو بھی چاہے شریک ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے نظام فکر اور نظام تربیت میں قرآن کو چونکہ کلیدی مقام حاصل تھا اس لئے اجتماع میں شرکاء کو سب سے پہلے تین آیات قرآنی مع ترجمہ سنانا ہوتا اس کے بعد وہ شرکاء کے علمی و عملی سرگرمیوں سے متعلق سوالات کے جوابات دیتے۔ ڈاکٹر صاحبؒ الگ سے درس یا تذکیر بہت کم کسی خاص موقع پر ہی کرتے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگوں کے اندر جاننے کا داعیہ خود پیدا ہو اور ہر کوئی صرف ان ہی معاملات اور مسائل سے متعلق رہنمائی و معلومات حاصل کرے جس سے اس کا سابقہ پیش آئے اور باتیں صرف اصولی نہ ہو کر عملی ہوں۔ مستقل مجالس میں بروز جمعہ بعد نماز عشاء مسجد میں عمومی درس قرآن کی اور ہفتہ میں دو دنوں اپنے کمرہ میں تفسیر قرآن کی خصوصی مجالس شامل تھیں۔ اس میں مکمل پارہ عم کی تفسیر بیان کی جو کیسٹ میں محفوظ ہے۔ ساتھ ہی خواتین کا اجتماع بھی پابندی سے کرتے جس میں انہوں نے عنوان کے تحت سلسلہ وار تقاریر کیں جن میں سے چند شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی مجالس میں پابندی سے شریک ہونے والوں میں کچھ مقامی متوسلین جماعت اسلامی بھی تھے۔ نیز صوبہ بہار سے باہر کے بعض متوسلین جماعت نے بھی ڈاکٹر صاحب سے ربط قائم کیا جو آخر تک قائم رہا۔ بالخصوص مغربی بنگال کے چند مستعفی ارکان جماعت اسلامی جن میں دو ارکان شوریٰ حلقہ بنگال بھی شامل تھے مستقل ربط میں رہے۔ یہ لوگ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات اور استفادہ کی غرض سے اس وقت پٹنہ تشریف لائے جب انہیں علم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب جماعت سے الگ ہو گئے ہیں اور بعد میں ان کے خطوط کار کے مطابق اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی حیات میں وہ لوگ پٹنہ آتے رہے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی پٹنہ سے رفقاء کو انکے پاس بنگال بھیجا۔ علاوہ ازیں عام لوگوں کی اصلاح کے لئے مختلف مواقع کا استعمال کیا۔ انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں ہر سال ماہ رمضان کے انکے خطبہ جمعہ کا شہر اور مضافات کے ہر خاص و عام کے نزدیک خاص مقام تھا۔ اہم موضوعات پر مختلف کتابوں کے علاوہ عوام کی رہنمائی کے لئے فولڈرس بھی شائع اور تقسیم کروایا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی شخصیت، تحریر اور گفتگو سے معاشرہ کے سبھی طبقات کو متاثر کیا۔ ان میں ہر علمی سطح کے لوگوں تک ابلاغ (Communication) کی خاص صلاحیت تھی۔ لیکن ان کی زبان سے زیادہ زوردار آواز ان کے فکر کی بلندی اور کردار کی مضبوطی میں تھی جسے لوگوں کے کان کے بجائے ان کے قلوب براہ راست سنتے۔ ان کی قیادت پہاڑی مقام کے پرشور اور تیز وتندندی نالوں کے بجائے ایسے خاموش دریا کی مانند تھی کہ جو اس کے بہاؤ پر اپنی کشتی ڈال لے اسے وہ راست سمت میں منزل کی طرف گامزن کردے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص ایسا مثالی نمونہ نہیں ہو سکتا جس کی ہر پہلو سے تقلید کی جائے، کیونکہ کامل مثالی (Ideal) ذات تو صرف انبیاء علیھم السلام کی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ قولی طور پر ڈاکٹر صاحب نے رسولؐ اور صحابہؓ (خاص طور پر بدری صحابہؓ) کی زندگی کے مثالی نمونہ کا اپنی تحریر و تقریر میں بہت زیادہ تذکرہ کرنے اور دوسروں کو ان کی زندگی کے مطالعہ کی تاکید کرنے کے ساتھ خود اپنی ذات سے بھی ایک ایسا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی جو رسولؐ اور صحابہؓ سے نہ صرف اخلاق باطن میں بلکہ ظاہری رہن سہن میں بھی قریب تر ہو۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی دعوت و عمل سے اصلاح پذیری کا سلسلہ افراد اور زمانہ دونوں لحاظ سے دراز ہے۔ ان میں صرف وہی شامل نہیں ہیں جو ان کی حیات کے آخری زمانہ میں ان کے حلقۂ تربیت میں رہے۔ ان کی تحریکی زندگی کے آغاز سے لیکر آخر دم تک جو افراد بھی انکے قریب اور زیر تربیت آئے وہ سبھی باصلاحیت اور دینی جدوجہد کے لئے یکسو تو نہ تھے۔ ان کی ایک بڑی تعداد مروجہ تعلیم اور معاش کی وسعتوں میں کھو گئی۔ بعض جذبہ صالح کے تحت کچھ دور تک ساتھ گئے لیکن پھر ٹھٹک گئے اور کہیں راہ حق میں دی گئی قربانیوں پر احساس طمانیت کے بجائے بعد میں اظہار تاسف ہوا۔ لیکن جس نے ان کی صحبت سے جتنا کچھ حاصل کیا وہ اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔

وقت آخریں : وفات کے چند دنوں قبل سے ہی صحت میں خرابی اور نقاحت کے آثار نمایاں تھے۔ مدت حیات کے پورے ہونے کا احساس بھی شاید انہیں ہونے لگا تھا۔ آخری ہفتہ وار مجلس میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو بتانے لگے اور اسکی تلاوت کے دوران ان پر رقت طاری ہو گئی۔ عوامی مجلس میں انکی یہ کیفیت غیر معمولی تھی۔ شرکاء مجلس بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔ وفات سے دو دنوں قبل نماز کی رغبت بہت بڑھ گئی۔ عصر کے وقت بارہ سے بیس رکعت تک نماز ادا کی۔ ایک دن قبل سے زبانی گفتگو کا سلسلہ تقریباً بند ہو گیا اور اس وقت سے آخری سانس لینے تک زبان پر صرف اذکار مسنونہ کا سلسلہ رہا جس میں زبان اور لب ہلتے لیکن آواز نہیں نکلتی۔ اشارے سے بار بار وضو کرانے کو کہتے اور یہ ممکن نہ ہوتا تو تیمم کرتے۔

بالآخر ۱۲ر جون ۱۹۹۸ء مطابق ۱۷ر صفر ۱۴۱۹ھ بروز جمعہ صبح ۳۰۔۸ بجے وہ شخص جسے ایک سائکل پر سوار ٹخنا سے اوپر کلپ لگائے پائجامہ اور کرتا میں ملبوس، سر پر ٹوپی اور پیر میں پلاسٹک کا جوتا پہنے پٹنہ کی سڑکوں پر سردی کی شام اور گرمی کی دوپہر میں شہر کے رہنے والوں نے ایک لمبے عرصے تک دیکھا اور جس کی یہ متحرک تصویر انکی آنکھیں ایک عرصہ تک محفوظ رکھیں گی، اپنے رب حقیقی کی طرف مراجعت کر گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! جنکے درمیان اس شخص نے اپنی زندگی کے ماہ وسال گزارے اب یہ انکا کام ہے کہ اسکا جائزہ لیں کہ انکی ایمانی و عملی ارتقاء کا جو ذریعہ اور نمونہ اللہ تعالیٰ نے انکے درمیان رکھا تھا انہوں نے اس سے کتنا کسب فیض کیا۔

زندگی حق ہے، موت بھی حقیقت ہے مگر ہے وقت نہاں لا الہٰ الا اللہ

راشد نیر صاحب، حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے سابق رکن شوریٰ اور اس کے ترجمان ماہنامہ 'رفیق' سے وابستہ رہے اور ڈاکٹر صاحب کی کئی کتابوں کو ترتیب دیا۔ ایس، آئی، او کی مرکزی مجلس شوریٰ کے سابق رکن اور اس کے حلقہ بہار کے سابق صدر۔ بہار میں مسلم ماحول کے جدید تعلیمی اداروں کے موسسوں میں۔ ضیاء الہدیٰ" سے زمانہ طالب علمی میں ذاتی وفکری وابستگی جو ڈاکٹر صاحبؒ کی تعمیر اسلامی معاشرہ کی تحریکی کوششوں کے واسطہ سے آخر تک قائم رہی۔ (قیام: پٹنہ)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ جیل میں

محمد جعفر

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم صاحب کردار ہی نہیں کردار ساز بھی تھے۔ان دونوں حیثیتوں سے ان کی شخصیت بہت نمایاں تھی۔صوبہ بہار کے تحریکی حلقہ میں جولوگ بھی چھوٹی بڑی حیثیت میں نمایاں نظر آئیں گے ان کی شخصیت کونکھارنے میں بحیثیت رفیق یا بحیثیت مربی ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم کا دور یا قریب کا تعلق ضرور نکل آئے گا۔مجھ پر بھی میرے ماں باپ کے بعد اگر سب سے زیادہ احسان ہے تو ضیاء الہدیٰ صاحب کا ہی ہے۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور اپنے معزز اور مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔آمین

ضیاء الہدیٰ صاحب غیر معمولی کردار کے حامل تھے۔صاحب عزیمت لوگوں میں تھے۔میں نے انہیں کسی معاملے میں اپنے مقام سے نیچے آتے نہیں دیکھا۔کسی بھی ذاتی یا اجتماعی معاملہ میں اصولوں کے تعلق سے مصالحت یا مداہنت کرتے ہوئے نہیں پایا۔ زندگی کے نشیب وفراز میں اکثر انسانی کردار میں بھی ناہمواریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔انسان اپنے مربی کو ہمیشہ کردار کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتا ہے لیکن عملاً ایسا کم ہوتا ہے کہ کردار کی بلندی اور اس کی یکسانیت میں فرق نہ آنے پائے۔اور جب خلاف توقع کوئی فرق محسوس ہوتا ہے تو سعادت منداور متوازن اور خیر پسند لوگ حسن تاویل سے کام لیتے ہیں، اور یہ بات پسندیدہ بھی ہے ورنہ بلند شخصیات سے عقیدت ومحبت اور استفادہ کا دروازہ ہی بند ہوجائے گا۔ضیاء الہدیٰ صاحب کے کردار کی بلندی میں غیر معمولی حالات میں بھی مجھے فرق محسوس نہیں ہوا۔جیسے جیسے قریب ہوتا گیا ان کو بلند سے بلند تر ہی پایا۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے اندر کوئی کمزوری نہیں دیکھی۔کمزوری تو انسانی فطرت کا لازمہ ہے لیکن ذاتی فائدے یا اپنی انا کی خاطر انہیں اپنے مقام سے نیچے اترتے نہیں پایا۔اپنی شعوری زندگی میں ایسی کوئی شخصیت نہیں دیکھی جو ہر چھوٹے بڑے معاملے میں مقام بلند پر نظر آئے۔پوری زندگی قلندرانہ اور فقیرانہ شان سے گزاری۔صبر وقناعت کے پیکر تھے۔ان کی شخصیت وکردار کا جادو ہر قریب آنے والے کومسحور کر کے چھوڑتا تھا۔قرآن سے انہیں غیر معمولی شغف تھا۔موصوف کی زندگی میں اتباع رسول ﷺ کا یہ پہلو بہت نمایاں تھا کہ انہوں نے خود کو قرآنی اخلاق وکردار کا پیکر بنانے کی کوشش کی تھی۔یہی وجہ تھی کہ جو بھی تحریک سے قریب آتا،قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتا اور ان کی تعلیمات کی روشنی میں کردار کی تلاش کرتا تو اس کی نگاہ ضیاء الہدیٰ صاحب پر مرکوز ہو جاتی۔وہ اسم بامسمیٰ تھے۔یقیناً وہ بہت ساروں کے لئے ہدایت کا ذریعہ اور روشنی کا مینار بنے۔اپنے پرائے سبھی ان کے کردار کے معترف اور قدرداں تھے۔مسلمانان بہار کے درمیان جماعتوں اور نمایاں شخصیات میں ان کی شخصیت غیر متنازعہ سمجھی جاتی تھی اور مختلف متنازعہ امور میں مختلف مسالک کے لوگوں کو انہیں ثالث تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔اکثر لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ جماعت سے اختلاف ہے لیکن ضیاء الہدیٰ صاحب سے اختلاف مشکل ہے۔بھٹو مرحوم کو جب پھانسی کی سزا ہوئی تو ہندوستان میں اشتراکی اسلام دشمنوں نے جماعت اسلامی کے خلاف ایسی زہرافشانی کی کہ اچھے خاصے لوگ اندھی مخالفت کی رو میں بہہ گئے اور شہر پٹنہ کے ایک مرکزی مقام انجمن اسلامیہ میں ضیاء الہدیٰ صاحب کو خطبہ دینے سے روک دیا گیا۔اس موقع پر کل ہند جمیعۃ اہل حدیث صادق پور کے امیر جماعت مولانا عبدالسمیع جعفری صاحب نے خطبہ عیدین میں مسلمانوں کے ایک بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو! جولوگ اپنے درمیان کے متقی لوگوں کو

منصب امامت سے ہٹا دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ضیاء الہدیٰ صاحب کے متقی ہونے میں کس کو اختلاف ہوسکتا ہے۔انہیں خطبہ دینے سے روک کر یہاں کے مسلمانوں نے ایک خطرہ کی گھنٹی بجادی ہے، انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور معافی مانگنی چاہئے۔اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس شخص کو تحریکی حلقہ کے باہر کے لوگ بھی ایسی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں وہ اپنے رفقاء کے درمیان کیسا محبوب ہوگا۔ جماعت کے حلقہ میں انہیں ڈاکٹر صاحب کہا جاتا تھا اور ہمارے درمیان متعدد ڈاکٹروں کے بیچ بھی اگر کوئی ڈاکٹر صاحب کہتا تو ہر شخص یہی سمجھتا کہ مراد ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہر رفیق کو یہ خوش فہمی رہتی تھی کہ وہ اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔یہ مسنون صفت ہم لوگوں میں بہت کم ہی نظر آتی ہے۔

عام حالات میں بھی استقلال، پامردی، حوصلہ و جرأت مندی شخصیت کو پرکشش بناتی ہے لیکن آزمائش کے وقت جب یہ صفات کسی شخص میں پائی جاتی ہیں تو کشش اور بڑھ جاتی ہے اور اسے اپنوں اور بیگانوں کے درمیان قابل احترام بنا دیتی ہیں۔ڈاکٹر صاحب مختلف انفرادی اور اجتماعی معاملات میں آزمائشوں سے دوچار ہوئے۔ہر موقع پر ان کے اندر یہ خوبیاں نکھر کر سامنے آئیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت کو بڑھاتی رہیں۔آزمائش کا ایک مرحلہ ١٩٧٥ء میں آیا جب ٢٦ رجون کو ملک میں ایمر جنسی لاگو کردی گئی اور ۴ رجولائی کو کئی جماعتوں پر پابندی عائد کردی گئی۔ان جماعتوں میں جماعت اسلامی ہند کو بھی شامل کرلیا گیا۔پورے ملک میں اس کے دفاتر بند کردیے گئے۔ذمہ داران جماعت اور عام ارکان کو بھی بالعموم گرفتار کرلیا گیا۔کسی پر ڈی آئی آر اور کسی پر میسا کا اندھا قانون نافذ کیا گیا۔جن پر میسا کی دفعات لاگو کی گئیں انہیں ایمرجنسی کے اختتام تک بالعموم قید و بند کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب بھی ایسے ہی بڑے مجرموں میں گردانے گئے اور تقریباً ٢١ ماہ پابند سلاسل رہے،لیکن اس پوری مدت میں ان کے چہرے کی بشاشت اور تبسم میں کوئی فرق نہیں آیا۔جب کسی کی ضمانت ہوتی یا رہائی کی خوش خبری آتی تو جیل سے نکلنے والا خوش و خرم اپنے ساتھیوں سے جدا ہوتا تو اس کے ساتھیوں کے چہروں پر اپنے دوست کی آزادی پر جہاں خوشی کے آثار ہوتے وہیں ایک حسرت و یاس کی جھلک بھی اس کے چہرے پر نظر آتی کہ اس کی قسمت میں ابھی قید کے دن کاٹنے باقی ہیں۔رہا ہونے والا ساتھی اپنے ساتھیوں سے کہتا، گھبراؤ نہیں تم بھی جلد ہی رہا ہو جاؤ گے۔لیکن ان مواقع پر ڈاکٹر صاحب سے جدا ہونے والوں کی کیفیت بالکل مختلف ہوتی۔ڈاکٹر صاحب کے طمانیت و مسرت پھوٹی پڑتی تو ان کو چھوڑ کر جانے والے ساتھیوں کے چہرے پر حسرت کے آثار نمایاں ہوتے کہ کاش ڈاکٹر صاحب بھی ساتھ ہی رہا ہوتے یا اسے بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح ہی رہائی نصیب نہ ہوتی۔کبھی دبی زبان سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا تو ڈاکٹر صاحب بڑے پیار سے سمجھاتے۔آج تمہاری تو کل ہماری باری ہے۔خوشی کا موقع ہے،افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور مومن کے لئے تو پوری دنیا ہی قید خانہ ہے۔کب اسے جانوروں کی طرح چھوٹ ہے۔غرض تسلی تشفی دلا کر ہنسی خوشی اپنے ساتھی کو رخصت کرتے۔

رفقاء سے بہت بے تکلف رہتے تھے۔میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوگیا تھا۔اکثر خیال ہوتا تھا کہ میں ان کی عمر اور بزرگی کا لحاظ نہیں رکھ پاتا۔کبھی یہ احساس شدت کے ساتھ ہوتا تو ان سے معذرت چاہتا تو بڑی بے تکلفی اور ظریفانہ انداز میں کہتے ''اچھا آپ مجھ سے کم بزرگ ہیں کیا؟ بچپن سے تو راست بڑھاپا آیا اور یہ خوش فہمی ہے کہ شاید ابھی جوان ہی ہیں۔اچھا چلو اگر مجھ سے زیادہ بوڑھے نہیں تو برابر ضرور ہوگے۔تم کو تو برابری سے بات کرنی ہی چاہئے''۔اسی بے تکلفی کی وجہ سے میں شوخ ہوگیا تھا۔چنانچہ گرفتاری کے چند ماہ بعد جب میری رہائی کا آرڈر آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں آپ کے ساتھ جیل میں آیا تھا ساتھ ہی یہاں سے باہر جاؤں گا،تو مجھے سمجھانے لگے کہ یہ بات مناسب نہیں ہے، جب تمہاری ضمانت ہوگئی ہے تو باہر چلے جانا چاہئے۔میں نے جب یہ

بات کہی کہ میں ضمانت پر نکلنا نہیں چاہتا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ میرا حکم ہے۔ میں نے شوخی کے ساتھ جواب دے دیا کہ نہیں اس معاملے میں آپ کی بات نہیں مانوں گا تو وہ ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ مومن آزمائش کو دعوت نہیں دیا کرتا، البتہ اگر آزمائش سے اللہ تعالیٰ اسے دوچار کرے تو اس میں ثابت قدمی دکھاتا ہے۔ ان کی اس توجہ دہانی پر اپنی غلطی اور بے جا جسارت پر شرمندگی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

۴ رجولائی ۱۹۷۵ء کو مجھے جماعت پر پابندی لگنے کی خبر ایک اخبار کے دفتر میں ملی جب میں ایک خبر لے کر وہاں پہنچا۔ اخبار والوں نے کہا کہ جماعت کی خبر اب شائع نہیں کی جائے گی کیونکہ اس پر پابندی عائد ہو گئی ہے۔ میں نے اسی وقت دفتر حلقہ فون کیا۔ وہاں بھی لوگوں کو اطلاع نہیں تھی کیوں کہ شام کی نیوز میں ریڈیو نے اس خبر کو نشر کیا تھا اور اسے چند ہی منٹ گزرے تھے۔ میری اس دن دفتر سے چھٹی تھی لیکن جیسے ہی یہ اطلاع میں نے دی ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا کہ یہ خبر میں نے خود سنی ہے، میں نے کہا کہ ہاں خبر مصدقہ ہے تو فرمایا فوراً دفتر آجاؤ۔ دفتر پہنچتے ہی انہوں نے ہدایت کی بیت المال کے حسابات اس دن تک کے رجسٹر میں درج کر دئے جائیں تاکہ دیکھنے والوں پر جماعت کا تاثر بہتر رہے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پولس آ گئی اور دفتر میں موجود لوگوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگائی گئیں اور ڈاکٹر صاحب کو ہتھکڑی کے ساتھ کمر میں رسا بھی لگایا گیا۔ میں نے اس پر اعتراض کیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ تو حکومت کے کارندے ہیں، ان سے کیا کہنا ہے، انہیں اپنی ڈیوٹی انجام دینے دو۔ اس پر پولس والوں کا رویہ بدل گیا اور وہ معذرت کرنے لگے کہ وہ حکم کے تابع ہیں۔ جیسی ہدایت کی گئی ہے ویسا ہی کر رہے ہیں۔ اس سے قبل تک ان کا رویہ بڑا ہی تلخ اور تحکمانہ تھا۔ پولس اسٹیشن پہنچ کر اعلیٰ حکام سے ربط قائم کیا گیا۔ چنانچہ جو غیر ارکان تھے انہیں اسی وقت چھوڑ دیا گیا اور ارکان کو حوالات میں بند کر دیا گیا جہاں بڑی گندگی اور بدبو تھی۔ زمین اس قابل نہیں تھی کہ اس پر بیٹھا جائے یا نماز ادا کی جاسکے۔ عشا کے وقت ہم نے گزارش کی کہ کسی صاف جگہ پر نماز پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے تو انکار کر دیا گیا۔ پھر وضو کے لئے پانی طلب کیا گیا تو اس سے بھی انکار کیا گیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ظالموں سے درخواست کرنا مناسب نہیں ہے، تیمم کر کے نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ہمارے ساتھ ایک مریض اظہار کریم صاحب مرحوم تھے۔ طبیعت کی خرابی، بخار اور کمزوری کے سبب کمبل ان کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسی کمبل پر نماز پڑھ لی جائے اور اسی پر اظہار صاحب آرام کر لیں۔ ہم لوگ کھڑے رہ کر بھی وقت گزار سکتے ہیں۔ چنانچہ تقریباً چوبیس گھنٹے ہمارے اس متعفن تکلیف دہ جگہ پر گزرے۔ دوسری شام ہمیں پھلواری شریف کیمپ جیل پہنچایا گیا۔ جیل کے تمام وارڈ اس وقت بند ہو چکے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ ہمیں پہلی رات عادی مجرموں کے وارڈ میں رکھا گیا۔ وہ رات بھی خاصی تکلیف دہ تھی۔ جگہ کی تنگی اور جرائم پیشہ لوگوں کے انداز و اطوار سے ذہنی کوفت اور گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے جب یہ کہا کہ ہمیں مجرموں کے ساتھ کیوں رکھا جا رہا ہے تو جیل کے عملوں کے بولنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے اپنا موقف دہرایا کہ ہمیں ظالموں سے نہ گزارش کرنی ہے نہ شکایت۔ صبر و شکر کا دامن تھامے رہنا چاہئے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی دہرائی کہ یہ بے چارے تو ظالم حکومت کے ملازم ہیں، ان سے کچھ کہنے کا کیا حاصل ہے، یہ وہی کریں گے جو انہیں کہا جائے گا۔ یہ سن کر وہ عملے فوراً نرم پڑ گئے۔ پہلے تو یہی کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس جو جگہ ہے اسی میں رہنا ہوگا لیکن اب یہ کہنے لگے کہ آج رات کسی طرح گزار لیجئے، کل صبح سے سیاسی قیدیوں کے وارڈ میں انتظام کی کوشش کریں گے۔ بہر حال یہ رات اس رات سے بہتر کٹی جس رات ہمیں حوالات میں بند رکھا گیا تھا۔ دوسرے دن ہمیں سیاسی قیدیوں کے وارڈ میں منتقل کرنے کا مسئلہ بھی خاصا پیچیدہ ہو گیا کیوں کہ آر ایس ایس والے اور جن سنگھ والے کسی طرح اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں تھے۔ سوشلسٹ بھی مذہبی لوگوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کر رہے تھے۔ اور ان دونوں کی تعداد بہت تھی۔ جیل

کے عملے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ ہم بھی سیاسی قیدی ہیں۔ یہ کیمپ جیل ہے۔ گرفتاریاں زیادہ ہورہی ہیں۔ اگر ہر پارٹی کے لوگ یہ چاہیں گے کہ وہ الگ الگ وارڈ میں رہیں اور کوئی دوسرا ساتھ نہ رہے تو بڑی مشکل کی بات ہوگی۔ لیکن کوئی سمجھنے کو تیار نہیں تھا، البتہ جیل اتھارٹی کو اس بات پر لعن طعن ضرور ہر پارٹی کے لوگ کر رہے تھے کہ سیاسی قیدیوں کو مجرموں کے وارڈ میں کیوں رکھا؟ عجب صورت حال تھی۔ ایک طرف ہمارے لئے عملوں سے احتجاج دوسری طرف اپنے ساتھ رکھنے پر راضی نہیں۔ آنند مارگی تعداد میں کم تھے۔ عملوں نے ان پر زور ڈالنا شروع کیا لیکن وہ سب سے زیادہ برہم ہوئے۔ کہنے لگے کہ یہ مسلمان ہیں، گوشت، مچھلی، انڈا، لہسن، پیاز کھائیں گے، اور ہم ان چیزوں کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے ان کی بو بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ ایسے لوگ ہمارے وارڈ کے کسی قریبی وارڈ میں بھی اگر رکھے جائیں گے تو ہم احتجاج کریں گے۔ اس پر ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ صاحب نے برملا کہا کہ ہم وہ چیزیں نہیں کھائیں گے جس سے کسی کو تکلیف ہو۔ یہ سنتے ہی جیلر کے ساتھ ساتھ جن سنگھ، آر ایس ایس، آنند مارگ اور تمام ہی سیاسی وسماجی پارٹیوں کے ذمہ داران حیران ہوگئے۔ شری جے پرکاش نرائن کے بعض قریبی لوگ کہنے لگے، ایسے لوگوں کو adjust نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ آنند مارگی کہنے لگے، آپ لوگ اگر گوشت مچھلی نہ کھائیں تو سبزی، دال میں تو لہسن پیاز کا استعمال کریں گے، اس کے بغیر آپ کو کھانا اچھا لگے گا ہی نہیں۔ ہماری خاطر آپ یہ زحمت کیوں کریں گے جب کہ آپ کو یہاں اپنی مرضی کا کھانا کھانے کا حق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے برجستہ فرمایا ارے بھائی ہم جینے کے لئے کھاتے ہیں کھانے کے لئے نہیں جیتے، پھر ایسا کام جس سے کسی کو تکلیف پہنچے ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔ ہم اپنے ساتھیوں اور پڑوسیوں کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔ اب سب کو خیال ہونے لگا کہ اس اونچی بات کا جواب اونچائی سے ہی دینا چاہیے۔ لوگ کہنے لگے کہ جناب ایسا کھانا جس کے آپ عادی نہ ہوں اگر آپ کھائیں گے تو آپ کی صحت متاثر ہوسکتی ہے اور ہم اسے کیسے پسند کرسکتے ہیں کہ ہماری خاطر آپ لوگوں کی صحت متاثر ہوجائے، یہ تو جیل کے عملے بھی پسند نہیں کرسکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا جو لوگ یہ چیزیں نہیں کھاتے ان کی صحت تو بہت اچھی معلوم ہورہی ہے، اور وہ اپنی جسمانی و روحانی صحت کی خاطر ہی تو ایسی چیزیں نہیں کھاتے، پھر ہماری صحت کیسے خراب ہوجائے گی۔ اس پر سب لاجواب ہوگئے۔ بالآخر آنند مارگ کے چند نوجوانوں نے کہا کہ ہمیں ''چاچا'' کے ساتھ رہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے اگر وہ واقعی ان چیزوں کو استعمال نہ کریں۔ اس وقت سے ڈاکٹر صاحب زیادہ تر جیل میں ''چاچا جی'' کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ اطمینان رکھیں ہم آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ اور جہاں تک کھانے کا سوال ہے تو ہمارا راشن پانی سب آپ کے ذمہ ہوگا۔ آپ جو چاہیں بنائیں اجتماعی طور سے ہم اس میں شریک رہیں گے۔ وہی کھائیں گے جو آپ کھائیں گے، وہی پئیں گے جو آپ پئیں گے۔ اس فیصلہ سے ہمیں تردد ہوا کہ نہ معلوم کیسا کھانا کھانا پڑے گا اور کب تک کھانا پڑے گا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے فیصلے سے اختلاف کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ہم سب اس کے فوراً بعد ہی اس وارڈ میں منتقل ہوگئے جہاں آنند مارگی چند نوجوان تھے اور کسی کو اپنے ساتھ رکھنے پر اب تک آمادہ نہیں کئے جاسکے تھے۔ اب وہ وارڈ آنند مارگ اور جماعت اسلامی کا مشترکہ وارڈ ہوگیا۔ ہمارے جو لوگ بھی گرفتار ہوکر آئے اسی میں پناہ لیتے رہے اور بغیر لہسن پیاز کی سبزی دال بخوشی کھاتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب مغرب کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ آنند مارگی بھی سورج غروب ہونے کے بعد کچھ عبادت کرتے اور تھالیاں بجا کر کچھ مذہبی گیت زور زور سے گاتے تھے۔ ایک دو دن کے بعد ان کو احساس ہوا کہ ہم لوگوں کو ان کے گانے بجانے سے disturbance ہوتا ہوگا۔ کہنے لگے کہ چاچا جی آپ کو نماز میں تکلیف ہوتی ہوگی۔ آپ ہماری تکلیف کا اتنا خیال کرتے ہیں، اچھا نہیں لگتا کہ ہماری کسی بات سے آپ کو تکلیف پہنچے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ نماز کے بعد بھی اتنی دیر تک بیٹھ کر کچھ عبادت کرتے ہیں کہ ہم اگر اپنی عبادت کو موخر کرنا چاہیں تو ہمارا وقت نکل جائے گا۔ اس

لئے ہم پانچ دس منٹ میں اپنا کام کرلیں پھر آپ اطمینان کے ساتھ پڑھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، نماز وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا فرض ہے اور اول وقت ہی میں ادائیگی کو فضیلت ہے، اس لئے اگر آپ کے پاس موخر کرنے کی گنجائش ہو تو کر لیجئے ورنہ کوئی حرج نہیں ہے۔ چند دنوں میں ہم عادی ہو جائیں گے، ہم کو انشاء اللہ کوئی دقت نہ ہوگی۔ اس جواب کے بعد کچھ دنوں تک تو انہوں نے اپنا معمول جاری رکھا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد جیسے جیسے وہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے متاثر بلکہ مرعوب ہوتے چلے گئے اپنے معمولات میں تبدیلی کرتے چلے گئے اور ہر کام میں ہمارے معمول کو ترجیح دینے لگے۔ چنانچہ وہ اپنی یہ عبادت عشاء کی نماز کے بعد تقریباً آدھا گھنٹہ ادا کرنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے درس قرآن کو دعوت وتربیت کا ذریعہ ہمیشہ بنائے رکھا۔ چنانچہ جیل میں بھی ہفتہ وار درس کا سلسلہ اپنوں کے درمیان شروع کردیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد کچھ دوسرے لوگ بھی شرکت کرنے لگے۔ اس میں جن سنگھ، سوشلسٹ، آنند مارگی، آر ایس ایس، سروودئے، ایس پی ایم، سی پی آئی اور سی پی آئی (ایم ایل)، سب کے لوگ باری باری سے شریک ہونے لگے۔ سی پی آئی (ایم ایل) جن سنگھ اور آر ایس ایس سے متعلق تین چار افراد تو بہت قریب آگئے تھے (ان میں ایک موار صاحب تھے۔ جن کا ایک اس مجلہ میں شامل ہے) درس کے علاوہ بھی سوالات کرتے تھے۔ ایک آنند مارگی نوجوان نے تو ہمارا لٹریچر بہت پابندی سے مطالعہ کیا، اور ہم سے یہ کہا کہ ہم اندر سے ان تعلیمات کو ہی درست سمجھ رہے ہیں لیکن یہاں اس کے اظہار کی ہمت نہیں پاتے۔ ڈاکٹر صاحب کا درس قرآن بڑا ہی سائنٹفک اور متاثر کن ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کا درس سننے کے بعد سرودوے کے ایک کارکن نے کہا کہ گرچہ ہم لوگ ''دو چار گوشٹی'' میں اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ کسی مذہب کی بات نہ آئے لیکن اگر آپ اپنی مذہبی بات بھی ہمارے درمیان پیش کریں تو ہم اسے سننا اور سنانا پسند کریں گے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ڈاکٹر صاحب کے طرز استدلال، خوش اخلاقی اور کردار کی بلندی کا سکہ ہر پارٹی کے لوگوں نے مان لیا۔ یہاں تک کہ جرائم پیشہ لوگ اور جیل کے ذمہ داران بھی اپنے جھگڑے چکانے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف سے رجوع کرنے لگے۔ اسسٹنٹ جیلر پاٹھک جی اتنا متاثر تھے کہ اکثر درس میں شرکت کی کوشش کرتے اور گھنٹوں ہم لوگوں سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے اور لٹریچر مانگ کرلے جاتے۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے چند ہی دنوں بعد پٹنہ میں غیر معمولی سیلاب آگیا۔ شہر کے بڑے حصے اور بڑی بڑی کالونیاں زیر آب ہوگئیں۔ جیل میں بھی پانی داخل ہوگیا لیکن جلد ہی قابو پالیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں موجود تمام ہی لوگوں سے کہا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا لیکن ہمارے بھائی اس وقت ہزاروں کی تعداد میں پریشان ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم یہاں رہتے ہوئے ان کی کیا مدد کرسکتے ہیں۔ سبھی کہنے لگے کہ ہم کیا کرسکتے ہیں، ہم کو تو سرکار نے جیل میں بند کردیا ہے، یہ سرکار کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی امداد کا معقول نظم کرے اور ہمارے مدد کی ضرورت ہے تو ہمیں رہا کرے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں تو ایک دن کا راشن خود استعمال کرنے کی بجائے اس کے کھانے تیار کرا کے کسی ذریعہ سے اپنے پریشان حال بھائیوں کو بھجوانے کا نظم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سنتے ہی سب لوگوں نے اس پر عمل کرنے کا اظہار کیا اور اجتماعی طور سے روٹی سالن وغیرہ تیار کرا کے سیکڑوں کیلو جیل اتھارٹیز کے ذریعہ امدادی ٹیم کے لوگوں کو بلا کر ان کے حوالے کیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد جب کوئی ایسی خبر آئی جو سب کی دلچسپی کی ہوتی یا سب کے لئے قابل توجہ تو ڈاکٹر صاحب سے مشورے کے لئے لوگ آجاتے اور مشوروں میں فیصلہ کن بات ڈاکٹر صاحب کی تسلیم کی جاتی۔ انہیں دنوں جیل کے عملوں نے بتایا کہ سیاسی قیدیوں کے لئے کپڑے آگئے ہیں۔ دھوتی، کرتے، لنگیاں، بنیان، تولیہ وغیرہ ہر شخص کے لئے دو سیٹ فراہم کئے جانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے لینے سے انکار کردیا۔ فوراً لوگ رجوع ہوئے کہ کیوں انکار کیا یہ تو ہمارا حق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے

فرمایا میں چاہتا ہوں کہ یہ کپڑے اس وقت سیلاب زدگان کو پہنچائے جائیں، چنانچہ اس کی بھی مہم چل پڑی اور خاصے کپڑے جیل سے سیلاب زدگان کو مختلف ذرائع سے بھجوائے گئے۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے چند ہی دنوں بعد ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ گرفتار کر کے جیل میں لائی گئیں۔ ان کا بلڈ پریشر غیر معمولی بڑھا ہوا تھا۔ بستر علالت پر سے انہیں اس حالت میں گرفتار کیا گیا جب کہ وہ خود سے اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا تو بے چین ہو کر گیٹ تک آئے لیکن جیل کے ذمہ داروں نے ان کو اہلیہ سے ملاقات نہیں کرنے دیا اور چونکہ اس جیل میں خواتین کیلئے نظم نہیں تھا اس لئے موصوفہ کو واپس بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ ملاقات کی گزارش نہیں کی۔ دیگر سیاسی قیدیوں کو جب اس کی خبر ہوئی تو سب احتجاج کرنے لگے اور جیلر وغیرہ کو برا بھلا کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں منع کیا اور صبر و شکر کا ایسا مظاہرہ کیا کہ لوگ حیران ہو کر کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب آخر کب تک آپ اس طرح ظلم کو برداشت کرتے رہیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اللہ کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارے وارڈ میں بہٹا مارکیٹ کے مالک رام نیواس سنگھ بھی زیر حراست تھے ان کے نامور وکلاء اور انتظامیہ وغیرہ سے قریبی تعلقات تھے۔ وہ کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب آپ مجھے اجازت دیں، میں آپ کی اہلیہ کو چوبیس گھنٹے میں رہا کرا کے گھر بھجوا سکتا ہوں۔ آج کل ہر کام رشوت اور پیروی سے ممکن ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواباً بڑے سکون کے ساتھ فرمایا۔ میں غلط طریقے سے باہر نکلنے کے بجائے جیل میں رہنا اور مرنا پسند کروں گا اور یہی بات مجھے اپنے گھر والوں کے لئے بھی پسند ہے۔ ہر شخص کو تشویش تھی کی اس قدر بیمار عورت جیل میں کس طرح رہ سکے گی۔ خود ڈاکٹر صاحب غیر معمولی تشویش کے شکار تھے اور اکثر سنٹرل جیل سے ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے رفقاء کو کہتے اور خیریت کی خبر کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے، اور ساتھ ہی رفقاء کو کہتے کہ غلط طریقہ سے انہیں آزاد کرانے کی کوشش نہ کرنا اور نہ حکومت سے کوئی گزارش کرنا۔ تقریباً دو ماہ پر وہ ضمانت پر رہا ہوئیں تو ان کی حالت بہت غیر ہو چکی تھی۔ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر سے علاج کرانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب جیل ہی سے دوا تجویز کرتے رہے، لیکن موصوفہ کی حالت بگڑتی گئی تو رفقاء نے ڈاکٹر صاحب کے Provisional bail کیلئے کوشش کی۔ کیوں کہ ڈاکٹر صاحب کو Misa کے تحت گرفتار رکھا گیا تھا جس میں ضمانت پر رہائی نہیں ہوتی تھی۔ پندرہ دنوں کے لئے Provisional bail کا order ملا تا کہ وہ اپنی اہلیہ کو دیکھ سکیں اور ان کا علاج کرا سکیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے سختی سے ہدایت کر رکھا تھا کہ ان کی رہائی میں ایک پیسہ بھی ناجائز خرچ نہ ہو اس لئے اس آرڈر پر عمل درآمد میں تقریباً دو ماہ لگے۔ صرف دس روپے ناجائز خرچ اور رشوت دینے سے بچنے کے لئے ڈاکٹر صاحب دو ماہ صبر آزما حالات سے گزرے۔ بالآخر جیل سے باہر محض پندرہ دنوں کے لئے آئے اور ان کی توجہ و علاج سے اہلیہ کی حالت جب سنبھلنے لگی تو دوبارہ جیل چلے گئے۔ حالانکہ اب بھی موصوفہ کی حالت تشفی بخش نہیں ہو سکی تھی۔ ان کے صبر و تحمل، خوش اخلاقی اور کردار کی اس بلندی کو دیکھ کر جیل کے تمام ساتھیوں اور ذمہ داروں کے دلوں میں ان کے لئے اور بھی جگہ بن گئی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ احترام و محبت سے پیش آنے لگے۔

ہم سب لوگ جب گرفتار ہوئے تھے تو ہمیں D.I.R (Defence of India Rule) کے تحت گرفتار کیا گیا تھا جس میں ضمانت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ تقریباً ۴ ماہ بعد میری ضمانت اور میرے رفقاء کی ضمانتیں ہوتی چلی گئیں لیکن ڈاکٹر صاحب پر دو ماہ کے اندر ہی Misa serve کر دیا گیا تھا جس کے بعد ضمانت کا امکان ختم ہو چکا تھا۔ البتہ Misa والوں کو جیل میں D.I.R والوں کی بہ نسبت سہولیات و مراعات زیادہ تھیں۔ چنانچہ ہم سب لوگوں کو زمین پر کمبل بچھانے کے لئے دئے گئے تھے۔ جب ان کو Misa کی خوشخبری سنائی گئی تو آرام کرنے کے لئے ایک چوکی (تخت) فراہم کی گئی۔ ہم لوگوں نے جب ان کا بستر اس پر لگانا چاہا تو انہوں نے

فرمایا کہ کہ امتیاز مجھے پسند نہیں۔ آپ لوگ فرش پر سوئیں اور میں تخت پر۔ ہم سب لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ بوڑھے آدمی ہیں، صحت کمزور ہے اور نہ معلوم کب تک جیل میں رہنا پڑے، جب حکومت نے ہی یہ امتیاز روا رکھا ہے کہ آپ پر الگ دفعہ لگائی تو برابری کیسے کر سکتے ہیں؟ لیکن وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ اس پر کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جائیں، چنانچہ ایسا ہی کرنا پڑا۔

اس تخت پر پورے وارڈ کے لوگوں کے کھانے کے سامان رکھے جانے لگے۔ دیگر سیاسی قیدیوں میں سے جسے تخت کی سہولت ملی وہ اس کی پروا کئے بغیر کہ اس کے ساتھی کس حال میں ہیں سہولت سے فائدہ اٹھانے لگا۔ کھانے پینے کی چیزیں، دوائیں، پھل وغیرہ کی سہولیات بھی Misa والوں کو زیادہ ملنے لگیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا معمول یہ تھا کہ جو چیز بھی ملتی وہ رکھ دی جاتی اور جب تک اس کی مقدار اتنی نہ ہو جاتی کہ وارڈ کے سب لوگوں کو مل سکے تب تک وہ ہاتھ نہ لگاتے۔ پھر سب کو تقسیم کرتے۔ آنند مارگی ساتھی اس کردار سے اتنا متاثر ہوئے کہ اب انہیں ہر وقت یہ خیال رہتا کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچائیں، اور تمام تر کوششوں کے باوجود وہ ڈاکٹر صاحب سے بازی نہ لے جا سکے نہ ہم میں سے کوئی۔ ہر شخص کا سب سے زیادہ خیال ڈاکٹر صاحب ہی رکھتے اور سب کو آرام پہنچاتے۔ خود تکلیف سے رہتے۔ وارڈ میں سب سے تکلیف دہ جگہ اپنے لئے منتخب کی۔ سب سے خراب پلیٹ اپنے کھانے کے لئے منتخب کرتے اور اچھی پلیٹ، اچھا بستر دوسروں کو دیتے۔ ان کی عبادت اور ورد و وظائف کے اہتمام کو دیکھ کر آنند مارگی ساتھی کہنے لگے کہ ''چاچا جی'' کا Concentration بہت اچھا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب گوشت وغیرہ پسند نہیں کرتے اور ممکن ہے کہ گھر پر بھی غذا کا یہی معمول ہو۔ لہسن، پیاز، گوشت وغیرہ کھانے سے Concentration متاثر ہو جاتے ہیں اور چہرہ کی چمک جاتی رہتی ہے، اسی لئے ہمارے گرو نے ہمیں ان چیزوں سے پرہیز بتایا ہے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ ''چاچا جی'' تو روزانہ بڑے کا گوشت کھاتے ہیں تو انہیں یقین نہیں آیا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ روزانہ گوشت پیاز وغیرہ کھانے والے کے چہرے پر ایسی رونق اور اتنا ذہنی ارتکاز کیسے ممکن ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بے چارے ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ ذی فراش ہیں، کھانا پکا نہیں سکتیں۔ وہ سبزی دھوئیں، کاٹیں اور پکائیں اس کی بجائے روزانہ تھوڑا گوشت خرید کر لاتے ہیں اور دھو کر پکا لیتے ہیں، یہی آسان ہے تو انہیں بات سمجھ میں آ گئی اور انہیں اپنے فلسفہ پر سے بھی اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ دوسرے ہی دن کہنے لگے کہ ''چاچا جی'' جب روزانہ گوشت انڈہ وغیرہ کھاتے ہیں تو یقیناً ان کی صحت ان چیزوں کے بغیر متاثر ہو جائے گی اور یہ سب ہماری وجہ سے ہو گا، اب تو ہم کسی بھی طرح اتنے اچھے آدمی کی صحت خراب ہونے نہیں دیں گے۔ انہیں گوشت انڈا وغیرہ Misa کے تحت دیا جاتا ہے اور وہ ہماری خاطر انکار کرتے ہیں، ہم اسے لے کر انہیں کھلائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب تنہا کوئی چیز کھاتے نہیں۔ آپ لوگ نہ کھائیں اور وہ کھالیں اس کی توقع ان سے نہیں ہے۔ ان ساتھیوں نے کہا کہ ہم چاچا جی کو تیار کر لیں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب سے انہوں نے گزارش کی کہ وہ گوشت انڈا اپنے کوٹے کا واپس نہ کیا کریں، لے لیا کریں اور استعمال کریں۔ پیاز، لہسن جو خواہش ہو استعمال کریں، انہیں اس پر اب کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اعتراض نہ سہی لیکن آپ لوگوں کو ان چیزوں سے جب تکلیف پہنچتی ہے اور آپ لوگ جب ان چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں تو آپ کے درمیان رہ کر ان چیزوں کو استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجبوراً انہیں یہ کہنا پڑا کہ اچھا آپ کی خاطر ہم بھی انڈا کھا لیں گے۔ گوشت اور لہسن پیاز تو نہیں کھا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میری خاطر انڈا کھانے کی ضرورت نہیں ہے، جب آپ کھانے لگیں گے تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ روزانہ ڈاکٹر صاحب کو دو انڈے کا Provision تھا وہ لیا جانے لگا۔ جب اتنے انڈے جمع ہو گئے کہ وارڈ کے ہر فرد کے لئے کفایت کر سکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ایک ساتھ اسے ابالا جائے یا فرائی کیا جائے اور سب ایک ساتھ کھائیں۔ اب گویا ہر

ہفتہ دس روز پر اس طرح ایک انڈا ڈاکٹر صاحب اوروں کے ساتھ استعمال کرنے لگے جب کہ انہیں دو انڈے روزانہ ملا کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد آنند مارگی ساتھی گوشت لہسن پیاز سب ڈاکٹر صاحب کی خاطر لینے لگے اور سب کچھ خود بھی کھانے لگے۔ اس پر دوسرے وارڈ میں مقیم آنند مارگیوں نے بڑا واویلا مچایا لیکن کسی کو بھی ڈاکٹر صاحب سے شکایت نہ تھی، کیوں کہ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ایسے آدمی نہیں ہیں جو ان کے ساتھیوں کو غلط طریقہ سے ان چیزوں کا استعمال کرائیں، انہیں شکایت اپنے ساتھیوں سے تھی کہ وہ کمزور پڑ گئے۔ جو لوگ اس وجہ سے ہمیں اپنے وارڈ میں جگہ دینے کو تیار نہ تھے کہ ہم گوشت، انڈا، لہسن، پیاز کھانے والے لوگ ہیں وہ محض ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور کردار سے متاثر ہو کر یہ چیزیں پکا کر ہمیں کھلانے لگے اور خود بھی کھانے لگے۔

جیل میں کئی سوشلسٹ مسلمان جو نماز نہ تو پڑھتے تھے نہ پڑھنا جانتے تھے بغیر کچھ توجہ دلائے محض ڈاکٹر صاحب سے متاثر ہو کر نماز کے پابند ہو گئے۔ نماز سیکھی اور باجماعت ہمارے ساتھ ادا کرنے لگے۔

جیل میں کئی قیدی ایسے تھے جو برسوں سے وہاں پڑے ہوئے تھے۔ کوئی ان کی ضمانت کرانے والا نہیں تھا۔ نہ ان پر مقدمہ چل رہا تھا نہ ان کی کوئی سزا ہوئی تھی۔ وہاں کے خراب ماحول کا اثر قبول کرتے جا رہے تھے۔ اس جانب بھی ڈاکٹر صاحب نے توجہ فرمائی اور ایسے چند لوگوں کی ضمانت کرائی اور انہیں رہا کرا کے روزگار سے لگانے کی کوشش کی۔ ان کے اندر کافی سدھار آیا۔ یہ دیکھ کر بعض سیاسی رہنما بھی اس جانب متوجہ ہونے لگے۔

ڈاکٹر صاحب ایک اچھے معالج بھی تھے۔ جیل میں ہر سطح کے لوگوں کو مفت طبی مشورے کے علاوہ بعض کو دوائیں مفت فراہم کراتے رہے۔ لوگوں کی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس کا بھی بڑا خوش گوار اثر جیل کے ساتھیوں نے قبول کیا۔ رہائی کے بعد بھی برسوں ایسے لوگوں نے ربط قائم رکھا۔

جن سنگھ پارٹی کے جنرل سکریٹری (بہار) رام لکھن گپتا ام پی مونگیر کے رہنے والے تھے۔ وہیں سے ایم پی کا انتخاب جیت کر آئے تھے۔ ہم لوگوں سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ اکثر آ کر اسلامی تاریخ پر تبادلۂ خیال کرتے۔ آر ایس ایس والوں سے بحث کرتے کہ مسلمانوں کے بارے میں ان کا تصور درست نہیں ہے۔ جیل میں رہتے ہوئے جب گپتا جی نے الیکشن لڑا تو ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی کہ وہ ان کے لئے دعا کریں اور اپنے ساتھیوں کو support کرنے کے لئے کہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی شخصی تعلقات کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ انہوں نے عبدالودود صاحب مرحوم کو بلا کر یہ فرمایا کہ مونگیر کے رفقاء کو گپتا جی کی حمایت کے لئے متوجہ کر دیں۔ گپتا جی نے ڈاکٹر صاحب سے متاثر ہو کر جن سنگھ سے تعلق رہنے کے باوجود آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کو ترجیح دیا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر عبدالودود صاحب مرحوم نے مونگیر کا سفر کیا اور وہاں عبدالخالق بادل صاحب وغیرہ کو اس جانب متوجہ کیا۔

آر ایس ایس کے پٹنہ ضلع کے انچارج بھی ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ اکثر ان سے تبادلۂ خیال کرتے۔ ہم جو بھی لٹریچر دیتے بخوشی لے کر پڑھتے اور اکثر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک رفیق کے گھر سے ایک بچہ ناشتہ دان میں گوشت لے کر آ گیا۔ ہمارے گھر والوں کو معلوم تھا کہ جیل میں کوئی چیز بھیجنے پر پابندی نہیں ہے اس لئے گوشت پکا کر ایک بچہ کے ہاتھ بھیج دیا۔ گھر کے سب لوگ مصروف رہے ہوں گے، گیٹ پر ایک کانسٹبل نے پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ بچہ نے کہا کہ گائے کا گوشت ہے۔ یہ سن کر وہ بچہ کو برا بھلا کہنے لگا۔ پھر اسے شرارت سوجھی، اس نے بچہ سے کہا کہ ناشتہ دان اندر لا کر رکھ دے۔ بچہ رکھ کر چلا گیا۔ وہاں پر موجود ایک غیر مسلم ملاقاتی نے آ کر ہمارے کسی ساتھی سے کہا کہ آپ کا سوغات آ گیا ہے۔ اسی دوران اس کانسٹبل نے

یہ شرارت کی کہ Criminal قیدیوں کو ورغلایا کہ میاں جی لوگوں نے گائے کا گوشت منگایا ہے۔ یہ سن کر وہ سب جذبات میں آ گئے اور ہمارے وارڈ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور گالیاں دینے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ پھر آپس میں کوئی جھگڑا ہوا، وہ باہر جانے لگے کہ سمجھائیں گے اور جھگڑا ختم کرائیں گے، لیکن ایک آنند مارگی ساتھی نے کہا کہ چاچا جی آپ بیٹھیں، میں پہلے معلوم کر کے آتا ہوں کہ کیا جھگڑا ہے۔ وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ چاچا جی وہ تو آپ ہی لوگوں کے خلاف نعرہ لگا رہے ہیں اور گالیاں بھی دے رہے ہیں۔ آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ بڑے غم و غصے کا ماحول ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پھر تو مجھے ضرور جانا چاہئے۔ وہ نکل پڑے۔ انہیں باہر نکلتے دیکھ کر Criminal غصہ میں مارنے کو آگے بڑھے۔ ان کے پیچھے آر ایس ایس، جن سنگھی، سوشلسٹ سب جمع ہو گئے اور نعرے لگانے لگے۔ آر ایس ایس کے ضلعی ذمہ دار جو ڈاکٹر صاحب سے بہت متاثر تھے ان کو کسی نے جا کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو لوگ مارنے کے لئے بڑھ رہے ہیں تو وہ تیزی سے آئے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے سیدھے ڈاکٹر صاحب کے قریب پہنچ گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں ہے، سنا ہے کوئی بچہ کھانے پینے کی چیز لایا ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں گائے کا گوشت ہے۔ واللہ اعلم۔ اس نے پوچھا کہ کیا واقعی ایسا ہے یا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صفائی سے کہا کہ بچہ ہے، بڑے کے گوشت کو عام طور پر مسلمان گھرانوں میں گائے کا گوشت بھی کہتے ہیں۔ یا تو اس نے غلط سمجھا ہوگا یا یہ بھی ممکن ہے کہ کسی گھر میں گائے کی قربانی واقعی ہوئی ہو، کیونکہ ہمارے یہاں تو یہ جائز اور پسندیدہ ہے اور ہم شوق سے کھاتے بھی ہیں، اس لئے لوگوں نے، آج عید کا دن ہے، ہمیں بھیجا ہوگا لیکن ہم نے منگایا نہیں ہے۔ اگر جیل میں اس کے آنے کی اجازت نہیں ہے تو واپس کر دیا جائے اور اگر اجازت ملتی ہے تو ہم کھائیں گے۔ فضا اتنی خراب ہو چکی تھی لیکن آر ایس ایس کے ذمہ دار نے جب یہ دوٹوک بات ڈاکٹر صاحب کی زبان سے سنی تو برا نہیں مانا، کیوں کہ وہ دل سے ان کے قدرداں ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ اندر جائیں ہم سنبھالتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب وہیں پر رہے اور کہا کہ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہمارے بھائی بھی غلط فہمی کے شکار ہیں انشاء اللہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ اللہ ہمارا محافظ ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔ اس بات نے اور بھی متاثر کیا اور وہ ایک اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر آر ایس ایس والوں سے کہنے لگے کہ آر ایس ایس کے ساتھی اس بھیڑ سے الگ ایک طرف ہو جائیں۔ سب ایک طرف ہو گئے تو انہوں نے چیخ کر فرمایا کہ آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں کس طرح کے لوگ رہتے ہیں؟ اگر یہاں گائے کا گوشت آیا ہے تو جیل کے ذمہ داروں نے اسے کیوں آنے دیا واپس کیوں نہیں کیا یہ ان سے پوچھنا چاہئے؟ اور کیا آپ ہر مسلمان کے گھر جا کر دیکھیں گے کہ کیا پکا ہے۔ آپ تو حکومت سے پوچھیں کہ کس کی اجازت سے ایسا ہو رہا ہے اور حکومت کیوں قابو نہیں پاتی ان چیزوں پر۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ قابل قدر ہیں آپ ان سے لڑنے چلے آئے۔ آپ سب فوراً اپنے وارڈ میں چلے جائیں اور کسی طرح کے دنگے جھگڑے میں ساتھ نہ دیں۔ یہ سن کر آر ایس ایس کے تمام لوگ اپنے اپنے وارڈ کو جانے لگے۔ یہ دیکھ کر جن سنگھ اور سوشلسٹ بھی جانے لگے۔ بالآخر criminals نے یہ دیکھ کر کہ اب ہم اکیلے پڑ جائیں گے، سیاسی قیدیوں میں اب کوئی ساتھ دینے والا نہیں واپس چلے گئے اور بعد میں آ کر اپنی شرمندگی کا اظہار ڈاکٹر صاحب سے کرنے لگے کہ پولس والوں کے بہکانے میں وہ آ گئے تھے انہیں معاف فرمائیں۔

ہماری جب ضمانت ہوئی اور ہم رہا ہو کر باہر آنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں نصیحت کی کہ اپنے ساتھیوں اور ان کے گھر والوں کی خبر گیری کریں اور حالات سے انہیں برابر مطلع کرتے رہیں۔ چنانچہ ہم نے رفقاء سے ربط قائم کیا، جو جیل میں تھے ان کے گھر والوں کے احوال معلوم کئے اور ان کے مسائل کو ممکن حد تک حل کرنے کی کوشش کی۔ وقتاً فوقتاً ڈاکٹر صاحب کو حالات سے آگاہ کرتے

رہے اور وہ برابر مشوروں سے نوازتے رہے اور ہر وقت ہدایات دیتے رہے۔ ہر ایک رفیق کے لئے برابر فکرمندی کا اظہار کرتے رہے۔ سب کے مسائل کو حل کرنے کی طرف متوجہ اور دعا گو رہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم کی ضمانت ہوگئی ہے تو مجھے ہدایت کی کہ دہلی جا کر ان سے ملاقات کروں اور ان کی ہدایت حاصل کروں اور اس کے مطابق عمل کروں۔ ڈاکٹر صاحب جس طرح جیل سے باہر اپنے گھر میں بیٹھے رفقاء کی تربیت اور ان کے ہر قسم کے مسائل کو حل کرنے کی طرف متوجہ اور فکرمند رہا کرتے تھے بالکل اسی طرح جیل میں بھی رہے۔ ایسا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ جیل میں ہیں۔ لوگ اکثر پابندی کا رونا روتے اور اس کی مذمت کرتے تو ڈاکٹر صاحب مسکراتے اور فرماتے ہمارے دل و دماغ پر تو پابندی نہیں ہے، کوئی چاہے تو بھی کیسے لگا سکتا ہے۔ رہا ہمارا جسم، تو اسے اللہ جہاں چاہے جس حال میں رکھے، ہمیں اس کی فکر زیادہ نہیں کرنی چاہئے۔ ہماری شناخت تو ہمارے فکر و خیال سے ہے، عقیدے اور عمل سے ہے، اس پر کہاں پابندی ہے؟ ہم جہاں ہیں اس لحاظ سے مکلف بھی ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

پاٹھک جی پھلواری شریف کیمپ جیل کے اسسٹنٹ جیلر تھے اور جیل کے عملوں میں وہ سب سے زیادہ ہم لوگوں سے قریب ہو گئے تھے۔ لٹریچر بھی اچھا خاصہ مطالعہ کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن میں پابندی سے شرکت کی کوشش کرتے تھے۔ جب پابندی اٹھی اور ڈاکٹر صاحب رہا ہونے لگے تو وہ آنکھوں میں آنسو لئے کھڑے تھے۔ کہنے لگے کہ اس کی خوشی ہے کہ آپ جیسے آدمی کو رہائی ہوئی لیکن غم ہے کہ آپ جیسا ساتھی چھوٹ رہا ہے۔ بڑے بڑے سیاسی قیدی چھوٹ کر گئے اور جا رہے ہیں۔ نئی سرکار چاہے گی تو یہی لوگ حاکم بنیں گے لیکن ہمارے دل و دماغ پر تو حکومت ڈاکٹر صاحب کی ہی رہے گی۔ بڑی حسرت اور محبت و عقیدت سے سب نے اس سراپا خیر اور صاحب عزیمت ہستی کو رخصت کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے آمین۔ اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد جعفر صاحب قیم جماعت اسلامی ہند، ڈاکٹر صاحب نے بحیثیت امیر حلقہ جن افراد کو اپنا معاون اور معتمد بنایا ان میں سے ایک۔ حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے آخری ناظم اعلیٰ اور اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن کے پہلے کل ہند صدر۔ جماعت اسلامی ہند بہار کے امیر حلقہ بھی رہے۔ (مقام: دہلی)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ

ایک ہمہ گیر شخصیت

شاہد انور

ایک دن میں سڑک پر جا رہا تھا کہ سامنے سے سائیکل پر سوار ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ آتے ہوئے نظر آئے، ان کو قریب آتے ہی میں نے سلام کیا اور کہا ڈاکٹر صاحب آپ سے مجھے کچھ پوچھنا ہے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب نے اپنی سائیکل روک لی اور نہایت شفقت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ کہئے کیا پوچھنا ہے؟ اس وقت مجھے یہ محسوس نہ ہوا کہ میں پٹنہ کی ایک معروف اور بڑی شخصیت سے مخاطب ہوں۔ یہ میری زندگی کا وہ وقت تھا جب مجھے تحریک اور جماعت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کیا ذمہ داری ہوتی ہے، ایک مسلمان کی زندگی کا کیا مقصد ہوتا ہے، ان سب باتوں سے بالکل ناواقف تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ مسلمان پر نماز فرض ہے اور نماز ہر حال میں پڑھنا ضروری ہے۔ یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مسکراتے ہوئے نورانی چہرے اور جمعہ میں قرآنی آیات کے انقلابی انداز میں ان کے ترجمہ اور تفسیر سے میں پہلے ہی سے بہت متاثر تھا لیکن اس روز بغیر کسی ناگواری کے میرے سوالوں کا اطمینان بخش جواب دینا یہ میری گرویدگی کے لئے کافی تھا۔

اس طرح سید مودودیؒ کے لٹریچر کے مطالعہ اور جماعت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع میں حاضری کا سلسلہ شروع ہوا اور میں ڈاکٹر صاحب سے قریب سے قریب تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ روزانہ ایک بار ڈاکٹر صاحب کے گھر جانے لگا۔ کبھی کبھی گھنٹوں خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہتا اور آنے والے لوگوں کی گفتگو کو سنتا رہتا، کچھ سوال ابھرتا تو لوگوں کے جانے کے بعد پوچھتا اور ڈاکٹر صاحب بڑی شفقت سے میری سطح پر آکر مجھ کو سمجھاتے۔ میں جماعت اسلامی کو ایک منظم اور فعال جماعت سمجھ کر اس سے وابستہ ہوا۔ دوسری جماعتوں کے مقابلے میں جماعت اسلامی کی امتیازی خصوصیت کیا ہے یہ بات نہیں معلوم تھی۔ ایک دن رمنہ روڈ کے مقامی دفتر جماعت میں ہفتہ وار اجتماع میں شریک تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ کے اجلاس سے لوٹے تھے۔ اجتماع کا پروگرام حسب معمول درس قرآن اور درس حدیث چلا، اسکے بعد ڈاکٹر صاحبؒ کھڑے ہوئے اور مرکزی مجلس شوریٰ میں جو اہم فیصلے لئے گئے تھے اس کو سنانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اب تک جماعت اسلامی اپنے ممبروں پر ووٹ نہ ڈالنے کی جو پابندی لگائے ہوئی تھی وہ پابندی اس نے اٹھالی ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ جماعت کے ایک ذمہ دار نے بڑے سخت انداز میں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ شوریٰ کا اتنا اہم فیصلہ عام شرکاء کے اجتماع میں نہیں بیان کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے جچے تلے ہوئے انداز میں جواب دیا اور کہا کہ مجھ کو بہار کے ارکان جماعت منتخب کر کے بھیجتے ہیں اس لئے میری ذمہ داری ہوتی ہے کہ میں اپنے رفقاء کو مرکزی مجلس شوریٰ کے ان فیصلوں سے ضرور آگاہ کر دوں جو جماعت اسلامی کے اصولوں سے ٹکراتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر ختم ہوئی تو میں نے پہلی بار دفتر میں لوگوں کو اونچی آوز میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو مجھ کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے شوریٰ میں کوئی غیر اسلامی بات کا فیصلہ لیا گیا ہو۔ کچھ دوسرے لوگوں کی ناراضگی سے مجھ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی حرام چیز کو مجلس شوریٰ حلال کہہ رہی ہو۔ بہر حال کافی دیر تک ڈاکٹر صاحب کی تقریر موضوع بحث بنی رہی۔ اجتماع کے شرکاء کی اکثریت جماعت کے اس فیصلہ سے ناراض نظر آ رہی تھی بلکہ لوگوں کی گفتگو سے مجھے اس وقت ہی یہ معلوم ہوا کہ دوسری جماعتوں کے موجود ہوتے ہوئے ایک

نئی جماعت، جماعت اسلامی کی بنیاد کیوں ڈالی گئی اور اصولی طور پر وہ کون سا کام تھا جو دوسری جماعتیں نہیں کرتی تھیں۔ اس وقت ایسا لگا کہ لوگ جماعت کے اس فیصلے سے اتنے ناراض ہیں کہ اگر جماعت نے اپنے اس فیصلے کو واپس نہیں لیا تو بڑے پیمانے پر لوگ جماعت چھوڑ دینگے۔ ایک موقع پر ڈاکٹر صاحب سے میں نے کہا کہ اگر آپ جماعت چھوڑ دینگے تو بہار میں بہت سے لوگ جماعت چھوڑ دیں گے۔ میری اس بات پر ڈاکٹر صاحب نے برجستہ کہا کہ میں اپنے رفقاء کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں سوائے ایک دو کے جماعت کوئی نہیں چھوڑے گا۔ بعد میں جب ڈاکٹر صاحب نے جماعت سے استعفیٰ دیا تو پٹنہ میں صرف ایک رکن ہی جماعت سے الگ ہوئے، ڈاکٹر صاحب کا اندازہ کتنا صحیح تھا یہ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ حالانکہ جماعت کے اندر جو عالم دین تھے ان کی ایک بڑی تعداد جماعت کے اس فیصلے کو غلط سمجھتی تھی اس کے علاوہ ارکان ہی نہیں قائدین جماعت کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد اس فیصلے کو غلط سمجھتی تھی۔ جماعت کے اس فیصلے کے خلاف ان کا لب ولہجہ بھی سخت تھا لیکن جماعت چھوڑنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب نے بنیادی اصول کی پاسداری کی خاطر بے لچک رویہ کا مظاہرہ کیا۔ تحریکی اور دینی نقطۂ نظر سے اس موقف کو بعد کی صورت حال نے درست ثابت کر دیا۔ میری نظر میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کی قدر ومنزلت پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد اسلامی معاشرے کی تعمیر کے لئے ایک بے نام کی تحریک چلائی کیونکہ باضابطہ اور رسماً ایک تنظیم اور نام کے ساتھ کام کرنے کو انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ میں بھی اس تحریک سے منسلک ہو گیا۔ اس تحریک میں شامل ہونے کا انہوں نے ایک خاص طریقہ رکھا۔ قرآن کو ہاتھ میں لیکر اور دو نیک مسلمانوں کو گواہ بنا کر اللہ تعالیٰ کے سامنے تجدید کلمہ یعنی آئندہ زندگی اللہ کی رضا کی خاطر قرآن وسنت کے مطابق گذارنے کا اقرار کرنا ہوتا۔ ہفتہ وار اجتماع کے ذریعہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ قرآن کا حصہ حفظ کرانے کا اہتمام ہوتا اور لوگوں کے مختلف فکری وعملی سوالوں کے جواب دئے جاتے اور مسائل کے حل کی طرف رہنمائی کی جاتی۔ الحمدللہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد بھی اس مسجد میں اور اسی طرز پر اجتماع ہوتا ہے۔

ایک کام سے مجھ کو اعظم گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں جانے کے بعد خواہش ہوئی، جب یہاں تک آ گیا ہوں تو کیوں نہیں مولانا صدرالدین اصلاحی صاحبؒ سے ملاقات کر لی جائے۔ میں جب مولانا کے گھر پہنچا تو مولانا کے صاحبزادے سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ مولانا گھر پر موجود ہیں لیکن کچھ طبیعت ناساز ہے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد مولانا تشریف لائے، بڑے تپاک سے ملے۔ کچھ رسمی گفتگو کے بعد میں نے ڈاکٹر صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی تحریک کے تعلق سے گفتگو شروع کی۔ ڈاکٹر صاحب کے تذکرے پر مولانا نے ایک کیفیت کے ساتھ ایک خاص محبت اور قلبی لگاؤ کا اظہار کیا۔ مولانا بار بار کہتے کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت کے ولی صفت انسان ہیں۔ میں نے مولانا سے کہا کہ میں جماعت اسلامی کے قریب تھا لیکن اب ڈاکٹر صاحب کی تحریک میں شامل ہو گیا ہوں۔ اس پر مولانا نے کہا ڈاکٹر صاحب نے جس کام کا آغاز کیا ہے اور اس کام کی جو ترتیب رکھی ہے دراصل یہی کام اس وقت کی ضرورت ہے اور اسی ترتیب سے یہ کام کرنا ہے۔ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مولانا نے مزید کہا کہ ''اسلامی معاشرہ'' نام کا جو کتابچہ شائع ہوا ہے اور تحریک کے کام کرنے کا جو اس کتابچہ میں پورا نقشہ کھینچا گیا ہے، یہ میری نظر ثانی کے بعد ہی شائع ہوا ہے۔

تحریک کی ذمہ داری کے منصب پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کا ہر سطح کے لوگوں کے درمیان براہ راست دعوت دین کا ایک لمبا تجربہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ دعوت دین کو آگے بڑھ کر قبول کرنے والا عموماً سماج کا نچلا طبقہ ہوتا ہے، خوش حال طبقہ نہیں۔ انبیائی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ براہ راست مخاطب تو خوش حال طبقہ کو ہی کیا جاتا ہے لیکن جب سماج کے اونچے طبقے کے پاس دین کی دعوت پہنچتی ہے تو فوراً اس کی نظر اس دعوت سے حاصل ہونے والے فوری فوائد پر جاتی ہے اور وہ اس کا موازنہ

اپنے دنیاوی سامان آسائش سے کرتا ہے، جو اسے حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ نچلے طبقے کے پاس کچھ ہوتا نہیں جس سے موازنہ کرے۔ اس لئے وہ دعوت کو آسانی سے قبول کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریکی شخصیت کا ایک پہلو ہمارے سامنے اس وقت آیا جب شاہ بانو کیس میں عدالت کے فیصلہ کے خلاف ایس۔آئی۔او نے تحفظ شریعت مہم چلائی اور اس کے سرپرست کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحبؒ نے انجمن اسلامیہ ہال میں ایک بڑی ریلی کو خطاب کر کے روانہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ایک انقلابی شخصیت تھی۔ رسول اللہؐ کی سنتوں پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ اپنی عملی زندگی میں رسول اللہؐ کی تمام سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اسے ہی رسولؐ سے محبت کا حقیقی مظہر مانتے۔ ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے کہ اپنی زندگی میں سامان زندگی کم کرتے جاؤ یہاں تک کہ جب اللہ کے لئے اللہ کی راہ میں نکلنے کا وقت آ جائے تو دونوں ہاتھ جھاڑ کر نکل جاؤ اور دنیا کے سروسامان چھوٹنے کا تم کو کوئی ملال نہ ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی ان کے اس قول کی پوری پوری گواہی دیتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اس کو عملی زندگی میں برتنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب کے علم وعمل میں مطابقت تھی اور ایک توازن تھا، ان کے مابین پستی اور بلندی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ روزمرہ کی زندگی میں زیادہ لوازمات خصوصاً جدید سہولت کی اشیاء کے استعمال سے پرہیز کرتے۔ چنانچہ دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا کہ سڑی گرمی میں بھی بجلی کے پنکھے کی جگہ پر ہاتھ کا پنکھا ہی استعمال کیا سوائے اپنی حیات کے آخری دنوں میں جب رفقاء نے بہ اصرار کمرے میں ایک بجلی کا پنکھا لٹکا دیا۔ چھپر اور بوسیدہ دیوار والے کمرے میں ملاقاتیوں کے لئے دو تین لوہے کی پرانی کرسی، ایک بستر لگی ہوئی چوکی، ایک کتاب کا اور ایک دواؤں کا دیوار پر لٹکا ٹن کا پرانا ریک، چوکی کے نیچے کھلے ڈھکن کا لکڑی کا ایک بکس اور سنت نبوی کی پیروی میں ہتھیار کے بطور لکڑی کے خول میں تقریباً ایک گز لمبی لوہے کی گپتی، یہ تھا ڈاکٹر صاحب کا سامان رہائش، حضر میں۔ سفر ہو تو ایک جھولا، کچھ کپڑا اور ایک بدھنا۔ اس طرح اپنی زندگی میں انہوں نے اسلام کی سادگی کا بہتر نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سادگی میں طہارت اور صفائی کا پورا خیال رکھتے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ طرز عمل اس لئے تھا کہ وہ موجودہ تہذیب کو باطل سمجھتے اور اس سے زیادہ سے زیادہ دوری پیدا کرنے کو ایک انقلابی کوشش مانتے۔ ان کا کہنا تھا کہ انقلاب اسلامی کو برپا کرنے کا کام امام مہدی اور حضرت عیسیٰؑ کرینگے۔ ہمارا کام ان حضرات کی آمد سے قبل ان کے ماننے والے افراد اور اس کے لئے ماحول تیار کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا ایک پہلو جس سے ان کے رفقاء میں سے کم ہی واقف ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی جنات سے بھی ملاقات تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا ربط ایک نوجوان جن سے تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ نوجوان جن جب آپ سے ملاقات کو آتا تھا تو آپ کیسے یہ جان جاتے تھے کہ وہ آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ نوجوان جب آتا تھا تو میرے کمرے میں ایک خاص قسم کی خوشبو پھیل جاتی تھی جس سے میں سمجھ جاتا کہ وہ نوجوان آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس نے بہت سی وہ معلومات فراہم کیں جو انسانوں کے لئے مشکل کام ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے اس سے علاج ومعالجے کے لئے کئی طرح کے نسخے یا دواؤں کی تلاش میں بھی مدد لی۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد علاج ومعالجہ کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی معاش کا ذریعہ بنایا، ساتھ ہی اس کے ذریعہ خدمت خلق بھی کیا۔ وہ ہومیوپیتھی اور یونانی دونوں طریقے سے علاج کرتے تھے۔ البتہ ایلوپیتھی طریقۂ علاج پسند نہ فرماتے اور ناگزیر حالت میں ہی اسے اپنانے کو کہتے۔ تحقیق وجستجو کے اپنے فطری میلان کی وجہ کر ان کا اس میدان میں بھی نئے نئے نسخوں کی تلاش اور ادویات کی تیاری کا سلسلہ رہتا۔ منجن، سرمہ، عطر اور سنہری دوا وغیرہ اپنے خاص نسخہ سے بناتے۔ یہ چیزیں اپنے مریضوں اور محسنوں کو بڑے اعتماد

سے قیمتاً یا تحفتاً دیتے۔ بہر حال اس نوجوان جن کے آنے جانے کا سلسلہ ایک عرصہ تک رہا، اسکے بعد اس نوجوان کا آنا بند ہو گیا۔ بہت دنوں کے بعد اس نوجوان جن کا دادا آیا اور اس نے بتایا کہ اب وہ نوجوان نہیں آئے گا، اس لئے کہ اسکے چچا نے اس کا قتل کر دیا ہے۔ قتل کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ اس کا چچا غیر اسلامی فکر کا تھا اور بار بار اپنے بھتیجے کو ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے منع کرتا تھا لیکن یہ نوجوان اپنے چچا کی بات نہیں مانتا تھا، کیوں کہ وہ اسلامی فکر کا حامل تھا اور اسی لئے ڈاکٹر صاحب سے ملنے آجاتا تھا۔ اسکا دادا دوبارہ نہیں آیا۔ اس تعلق سے ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے ایک رفیق کے رشتہ دار اچانک غائب ہو گئے، بہت تلاش کے باوجود وہ صاحب نہ مل سکے۔ وہ غائب ہونے والے خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ بہت دنوں کے بعد لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ انہیں شک ہے کہ انسانوں کے علاوہ ان کو کسی دوسری مخلوق نے غائب کر دیا ہے، آپ ذرا اس نوجوان جن سے معلوم کیجئے، شاید ان لوگوں کے علم میں ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے نوجوان جن سے ان کا پورا حال بیان کیا اور کہا کہ ذرا ان کے بارے میں پتہ کرو کہ وہ کہاں ہیں؟ وہ نوجوان جن دو تین دن کے بعد ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے ان کے بارے میں پتہ کر لیا ہے۔ ان کو جنوں کی عورت نے غائب کر دیا تھا اور وہ ان کے قبضہ میں ہیں، ان لوگوں نے ان کی خلقت میں تبدیلی کر دی ہے۔ لیکن میرے پاس وہ علم نہیں ہے کہ میں ان کو واپس انسانوں کی شکل میں لا سکوں۔ ان غائب ہونے والے صاحب نے گھر کے لئے کپڑا اور رقم تحفتاً بھیجی جس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جنوں کا کسب معاش کا جو طریقہ ہے اس سے حاصل ہونے والی چیز ہم انسانوں کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر صاحب اس نوجوان جن کو البتہ تحفتاً عطر وغیرہ دینے کے لئے وہ ان چیزوں کو اپنے کمرے کی کھڑکی پر رکھ دیتے جو وہاں سے اٹھالی جاتیں۔

مافوق الطبیعاتی امور میں بھی ڈاکٹر صاحب کی خاص دلچسپی تھی۔ مجھے ایک کتاب کی تلاش میں ایک ایسے شخص کے پاس بھیجا جس کے پاس ایک جن مؤکل تھا۔ اس کتاب میں کچھ اس طرح کے عملی وظیفے تھے جس کے پڑھنے سے بصارت میں انقلابی تبدیلی ہو جاتی تھی حتیٰ کہ سامنے کی دیوار کے اس پار نظر آنے لگتا تھا۔ اس کتاب کو ان کی والدہ یا نانی نے پڑھا تھا اور پڑھنے سے ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس طرح کی چیزوں کی تلاش بلا وجہ نہ ہوتی۔ بلکہ صحابہؓ کی زندگی میں پائے جانے والے فوق الطبعی نوعیت کے واقعات یا کوئی بات ڈاکٹر صاحب کی اس طرح کی چیزوں میں دلچسپی کا محرک بنی۔ خلیفہ دوئم حضرت عمرؓ کی زندگی کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ شام کے پہاڑی علاقہ میں موجود ایک سپہ سالار کو وہاں سے کافی دور مدینہ منورہ کی مسجد کے ممبر سے ''یا ساری الجبل'' کہہ کر ایک ہدایت دی اور اس سپہ سالار نے اسی وقت اس پیغام کو سنا اور عمل کیا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کے چند ایک خوابوں کا تذکرہ بھی غیر مناسب نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں جب روس افغانستان پر پوری طرح قابض تھا اور اسکے وہاں سے ہٹنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا ڈاکٹر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ روس افغانستان سے واپس جا رہا ہے۔ اسی طرح ایک خواب انہوں نے عروج قادریؒ صاحب کے انتقال سے قبل دیکھا۔ وہ خواب یہ تھا کہ افطار کے وقت اکابرین جماعت ایک جگہ جمع ہیں۔ ایک کمرہ میں ابواللیث اصلاحیؒ اور دوسرے میں عروج قادریؒ بیٹھے ہیں۔ لوگوں نے افطار وقت سے پہلے کر لیا۔ پوچھے جانے پر ابواللیث اصلاحیؒ نے کہا کہ سب لوگوں نے روزہ کھول لیا تو میں نے بھی کھول لیا۔ یہ خواب جماعت اسلامی کے ووٹ ڈالنے کی اجازت سے متعلق فیصلے کے زمانہ کا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں اسلامی تصوف کا رنگ بھی نظر آتا تھا لیکن وہ تصوف نہیں جو ابھی خانقاہوں میں بگڑی ہوئی شکل میں نظر آتا ہے۔ فاضل اوقات میں کثرت سے اللہ کی حمد و تسبیح کرنا ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا۔ مجھ کو خاص کر ہدایت کی کہ لا الــــہ الا اللہ کو کثرت سے پڑھو، اتنی کثرت سے پڑھو کہ تمہاری سانس میں لا الہ الا اللہ رچ بس جائے۔ اپنی ایک تربیتی مجلس میں رفقاء کو

منہ بند کر کے اس ذکر کو کرنے کی مشق کروائی۔ جب کھانا کھانے لگو تو منہ میں لقمہ ڈالنے سے پہلے بسم الله پڑھو اور جب لقمہ نگل چکو تو الحمد لله کہو۔ اسی طرح پانی کے ہر گھونٹ کے شروع میں بسم الله اور جب پانی گھونٹ جاؤ تو الحمد لله کہو۔ ایک موقع پر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مجھ کو کچھ خاص اذکار بتا دیجئے جس کو میں فرصت کے اوقات میں پڑھا کروں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو ہر روز سو بار سبحان الله و بحمده پڑھنے کو کہا۔ میں نے اس کا فائدہ پوچھا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جانتے ہو عیسیٰؑ کے ذریعہ دجال کی ہلاکت کے بعد یاجوج ماجوج بھی جب ہلاک ہو جائینگے تو لاشوں کے سڑنے سے زمین تعفن سے بھر جائے گی، زمین پہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسی صورت حال میں حضرت عیسیٰؑ مومنین کو لے کر پہاڑ کی بلندی پر چلے جائینگے۔ وہاں کچھ کھانے پینے کا سامان نہ ہوگا، اس وقت مومنین کی غذا وہی ہوگی جو فرشتوں کی غذا ہوا کرتی ہے اور فرشتوں کی غذا اللہ کی حمد و تسبیح ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی فنافی اللہ کا حقیقی نمونہ تھی۔ ان کی زندگی میں اللہ سے محبت کا رنگ کتنا گہرا تھا اس کا مشاہدہ میں نے خود کئی بار کیا۔ ایک موقع پر دوا کے ری ایکشن کرنے کی وجہ سے جنوری کے مہینے میں بھی رات کے دو بجے ڈاکٹر صاحب کو پسینہ آنے لگا۔ مجھ سے بار بار کہتے پنکھا چلاؤ، پانی پلاؤ اور پیشانی پر کپڑا بھگو کر پٹی چڑھاؤ اور رات بھر جیسے وجد کے عالم میں الا الله کا ورد کرتے رہے۔ ایک اور موقع پر کئی رفقاء نے ڈاکٹر صاحبؒ سے گذارش کی کہ ایک مہینے میں ایک بار ایک تذکیری نشست ہوا کرے، یہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر صاحب کو لہے کی ہڈی کے آپریشن کے مرحلہ سے فارغ ہو کر صدیقی نرسنگ ہوم سے عالم گنج آ چکے تھے۔ بڑی کوشش کے بعد ڈاکٹر صاحب تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب پیر کی مجبوری کی وجہ سے اسٹول پر بیٹھا کرتے تھے۔ انتقال سے کچھ دنوں قبل ایسی ہی ایک تذکیر کے موقع پر جیسے ہی سورہ فاتحہ کی پہلی آیت پڑھنی شروع کی ڈاکٹر صاحب کی آواز حلق میں اٹک گئی، آواز میں ایک بلبلاہٹ کے ساتھ آنکھ بند ہونے لگی اور قریب تھا کہ وہ اسٹول پر سے گر جاتے۔

اسی زمانہ میں بتاریخ ۹ رجون ۱۹۹۸ء بروز منگل ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد سے لوٹتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو لو لگی۔ گرمی شدید تھی۔ ڈاکٹر صاحب سڑک پر ہی لڑکھڑانے لگے اور کنارے ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ گھر آتے آتے طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ رات کا حصہ بڑی بے چینی میں گزرا۔ پیٹ بہت زیادہ پھول گیا۔ رات کے آخری حصہ میں اجابت ہونے سے پیٹ کی تکلیف کچھ کم ہو گئی۔ رات میں ہی ہم لوگوں نے غسل دلوایا اور ڈاکٹر صاحب کو نیند آ گئی۔ البتہ اسی بے چینی کے عالم میں کچھ چیزیں ہم لوگوں نے دیکھیں جو قابل ذکر ہیں۔ وہ بار بار نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور جب ہم لوگ اصرار کر کے بٹھاتے اور کہتے کہ آپ نماز پڑھ چکے ہیں تو اس پر وہ ناراضگی کا اظہار کرتے اور کہتے کہ تم لوگ مجھے پریشان کر رہے ہو۔ مجھ کو نماز پڑھنے دو۔ ڈاکٹر صاحب عام دنوں میں کچھ مجبوری اور شرعی عذر رہنے کے باوجود مسجد میں نماز با جماعت کی پابندی کرتے۔ کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے کے بعد بھی اپنے محلہ ثقہ ٹولی، عالم گنج کی ناہموار گلی سے گذر کر دلال جی کی مسجد جایا کرتے۔ دوسری بات جو ہم لوگوں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ اس نیم بے ہوشی اور بے چینی میں بھی ڈاکٹر صاحب کا ہونٹ برابر ہلتا رہا اور زبان پر اللہ کا ذکر جاری رہا۔ ڈاکٹر سعید الحق، جو ڈاکٹر صاحبؒ کی تیمارداری میں ہم لوگوں کے ساتھ پیش پیش رہے، کا بیان ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو سورہ لہب بھی پڑھتے سنا۔ گھر پر دو روز علاج کے باوجود بھی ڈاکٹر صاحب رو بہ صحت نہ ہوئے تو ہم لوگوں نے انہیں پٹنہ میڈیکل کالج ہاسپٹل کے شعبہ کارڈیولوجی میں داخل کیا، لیکن یہاں ان کی تکلیف میں کوئی کمی نہ آئی۔ خاص بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ نیم بے ہوشی کے بعد بھی آخر آخر وقت تک ڈاکٹر صاحب کا ذہن کام کرتا رہا۔ ان کے خاص معالج ڈاکٹر صدیقی صاحب (موجودہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف سرجری) نے سلام کیا اور حال پوچھا تو ڈاکٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ''اللہ کا شکر ہے''۔ موت سے کچھ قبل صبح کی نماز سے جب ہم رفقاء فارغ ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے

برادر سعید الحق سے بطور شکایت کہا ''اکیلے اکیلے نماز پڑھ لی''۔ بے ہوشی کے عالم ہی میں خود بخود بولنے لگے ''نہ نہ آج نہیں، جمعہ کو، جمعہ کو''۔ بالآخر دوسرے دن جمعہ ہی کو صبح کے وقت یہ داعئ حق اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے پاس ضیاء الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ان چند نوجوانوں میں سے ایک ہیں جن کا ڈاکٹر صاحبؒ سے محبت کا اور جذباتی رشتہ تھا۔ ۱ تقریباً صبح ۹ بجے ڈاکٹر صاحب کے جسد خاکی کو گھر لایا گیا۔ ایمبولنس کو دیکھتے ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ لوگوں کے چہرے پر حزن وملال کے آثار نمایاں تھے۔ گھر پر محلے کی عورتوں کے آنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جہاں مردوں کے اندر دین کی روح پھونکنے کی کوشش کی تھی وہیں عورتوں کے اندر بھی اپنے دلنشیں وعظ وتذکیر سے دینی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہت سی عورتوں کی خانگی زندگی کے الجھے مسائل کو سلجھایا تھا۔ بیماری کے زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کی عیادت کے کیلئے عورتیں بھی بڑی تعداد میں آیا کرتی تھیں ۔

ڈھونڈھو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم تعبیر ہے جس کی حسرت وغم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

عصر کی نماز کے بعد عالم گنج میں ڈاکٹر صاحب کے گھر کے قریب مدرسہ کے کمپاؤنڈ میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ نماز ڈاکٹر صاحب کے رشتہ میں بھتیجہ جناب علیم الدین بلخی صاحب (سابق پرنسپل، گورنمنٹ طبیہ کالج، پٹنہ) نے پڑھائی۔ شدید گرمی کے باوجود نماز جنازہ کے لئے لوگوں کی ایک بھیڑ امنڈ آئی۔ موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا سامنا نبیؐ، صدیق، شہداء اور صالحین سب کو کرنا پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے جسد خاکی کو جب چھوٹی منتھنی قبرستان (عالم گنج) میں ان کے لیے تیار کی گئی قبر میں اتارا گیا تو اس وقت، خاص کر ان نوجوانوں پر، جنہوں نے ایک مدت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کی اولاد کی طرح گزاری، ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ آج ان کا شفیق مربی ان سے جدا ہوگیا تھا۔ اب کون تذکیر کے ذریعہ ان کا تزکیہ کرے گا، کون ان کے زندگی کے الجھے مسائل کو قرآنی آیات کی روشنی میں سلجھانے کی کوشش کریگا، کون ان کے پیچیدہ سوالوں کا جواب دے گا۔ اشک بار آنکھوں کے ساتھ لوگوں نے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور ڈاکٹر صاحب کی مغفرت اور ان کی نیکیوں کو قبول کرنے کی بارگاہ ایزدی میں دعا کی ۔

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

☆☆☆

۱۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے تعمیر اسلامی معاشرہ کے تحریکی کام سے آغاز میں وابستہ لوگوں میں سے چند کے نام: ڈاکٹر احسن صاحب، پروفیسر نعمان صاحب، گیلانی صاحب، حافظ فیروز صاحب، ڈاکٹر سعید الحق صاحب، عظمت صاحب، محمد انور صاحب، حکیم خلیق الزماں صاحب، محمد ابراہیم صاحب وغیرہ (ادارہ)

شاہد انور صاحب، ایک مخلص تحریکی شخصیت اور ضیاء الھدیٰ ؒ سے دیرینہ ذاتی وتحریکی تعلق۔ ڈاکٹر صاحبؒ حج کو گئے تو تعمیر معاشرہ کے اپنے تحریکی کام کا انہیں ذمہ دار بنایا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی رحلت کے بعد بھی آپ ہی ذمہ دار رہے۔ (قیام: پٹنہ)

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ رح

اسرار عالم

[یہ مضمون ماہنامہ ''اردو بک ریویو'' دہلی کے جولائی، اگست ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا]

سیدنا ومولانا ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ ۱۲ جون ۱۹۹۸ء بروز جمعہ بوقت صبح پٹنہ میں وفات پا گئے اور اسی روز بعد عصر ان کی تدفین عمل میں آئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راقم ان کی رحلت پر پوری ملت اسلامیہ سے اظہار تعزیت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ وہ سارے جہاں کے اہل ایمان کو صبر جمیل عطا کرے اور سید صاحب سے کیے وعدے کو پورا فرمائے اس لیے کہ ہم اپنے علم کی حد تک یہی گمان رکھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ وہ رفیق اعلیٰ کی بارگاہ میں اس طرح گئے ہیں کہ ان کا شمار فمنهم من قضی نحبه، میں ہو۔

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں سے ایک آیت تھے۔ نحیف جسم، روشن چہرہ، اور اس کے اندر عزیمت کا از کراں تا کراں پھیلا سمندر۔ بہت غور سے ان کا مطالعہ کرنے والے افراد راقم کی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ان کے اندر محمدیت، صدیقیت، فاروقیت اور علویت کا ایسا امتزاج تھا جو نادر بلکہ عدیم المثال ہے۔

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ کی پیدائش جنگ عظیم اول اور سقوط خلافت کے مابین ہوئی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں آپ غیر منقسم جماعت اسلامی کے رکن ہو گئے۔ ان کی پوری زندگی مجاہدہ، فقر اختیاری اور صبر و مصابرت کا نمونہ رہی۔ آپ نے کبھی جماعت سے کفاف کے بقدر بھی کچھ نہیں لیا۔ سوائے اس کے کہ آخری ایام میں غالباً اہلیہ محترمہ کے انتقال کے بعد اور جماعت سے علیحدگی سے قبل جب وہ بیمار تھے مرکز حلقہ جماعت پٹنہ کی پہلی منزل کے حجرے میں قیام فرمایا۔ قوت لایموت کے حصول کے بقدر طبابت سے کسب کرتے تھے۔ ان کی اہلیہ جو ابتدائی عہد سے مریضہ تھیں تا حیات شوہر نامدار کو ہی خدمت گار پایا۔ سید صاحب نے ایک لڑکی کو بچپن سے پالا مگر شادی سے چند روز قبل ٹرک سے کچل کر شہید ہو گئیں۔

سید صاحب کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں کسی حادثے یا چوٹ کے سبب تقریباً مفلوج تھیں چنانچہ آپ بمشکل لکھ پاتے تھے بلکہ اکثر املا کرواتے تھے۔ اس حالت میں بھی انہوں نے شاید ہی کسی دوسرے کو اپنا کوئی چھوٹا سے چھوٹا کام کرنے کو دیا ہو۔ سوائے آخری تین سالوں کے جب وہ پہلے آپریشن اور پھر کولھے کی ہڈی کے ٹوٹنے کے بعد طویل عرصے تک صاحب فراش رہے۔ سید صاحب ۱۹۹۲ء کے بعد جماعت سے علیحدہ ہوئے۔ ایمرجنسی میں جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سید صاحب کے ساتھ ساتھ ان کی اہلیہ بھی عرصے تک مقید رہیں۔

راقم کے لئے اس بات کا اندازہ کرنا بے حد مشکل ہے کہ راقم کو ان سے زیادہ انس تھا یا ان کو راقم سے۔ راقم اس اعتبار سے کم نصیب ہے کہ آخری ایام میں اس کی خواہش کے باوجود اسے ان کی خدمت کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اب صرف ان کی یادیں ہیں۔

جب ذکر تیرا کیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

سید صاحب، جو سید صاحب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کے نام سے مشہور تھے، اور قرآن لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ تلاوت قرآن، تدبر فی القرآن، تمسک بالقرآن اور تمسک بالسنّت ان کی زندگی کے ایسے لوازم تھے کہ کسی لمحے کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ وہ ان سے خالی تھا مشکل ہے۔ حتیٰ کہ ایک رفیق نے بتایا کہ آپریشن کے بعد جب وہ Anaesthesia کی پوری طرح گرفت میں تھے اور طبی نقطۂ نظر سے بے ہوش تھے ان کا قلب بیدار تھا حتیٰ کہ ان کے ہونٹ تلاوت قرآن میں مشغول تھے، یہ مدت ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ رہی۔ ایسا صرف اس شخص سے ممکن ہے جس کے شعور، تحت شعور حتیٰ کہ لاشعور پر بھی قرآن کا قبضہ ہو۔ چنانچہ تدبر فی القرآن کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب کے ملفوظات کا سواں حصہ بھی بمشکل امالی کی شکل میں محفوظ رہ سکا۔

قرآن وسنت رسول سے حد درجہ تمسک نے ڈاکٹر صاحب کے اندر ایک غیر معمولی اور ناقابل بیان کیفیت پیدا کردی تھی جسے شاعر مشرق کی زبان میں فقر مومن کہا جاسکتا ہے۔ دنیا اس عہد میں شاید ہی کسی کے پاس سے اتنی نامراد، شرمندہ اور دھتکاری ہوئی لوٹی ہوگی جیسی ڈاکٹر صاحب کے پاس سے وہ آئی۔

جسم پر پائجامہ، بنیان، قمیص، پاؤں میں چپل اور سر پر ٹوپی، ہاتھ میں چھوٹی سی کپڑے کی تھیلی جس میں ایک تہمد، ایک بنیان، ایک گمچھا، ایک چھوٹی سی پوٹلی جس میں کنگھا سرمہ وغیرہ۔ یہی کل زندگی کے سامان تھے۔ جب گھر پر ہوتے تو تھیلی کمرے میں ہوتی سفر پر ہوتے تو ساتھ ہوتی۔ چنانچہ غالباً ۱۹۹۲ء میں جب وہ حج بیت اللہ کو جاتے ہوئے پٹنہ سے دہلی تشریف لائے اور راقم ان کی خدمت میں حج منزل کے ہال میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ سامان میں دو چیزوں کا اضافہ ہے۔ ایک احرام اور دوسرا اس پوٹلی کا جس میں غالباً پاسپورٹ، ٹکٹ وغیرہ چیزیں ہوں گی۔

ان سے ملنے والے افراد کا عام تاثر یہی ہوتا تھا کہ اصحاب رسول ﷺ ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ آپ کی عزیمت، تقویٰ اور مقام بلند کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب آپ جماعت اسلامی ہند سے علیحدہ ہوئے اور جماعت کے صف اول کے ایک قائد اور قدیم رکن نے مولانا صدرالدین اصلاحی مدظلہ العالی کو لکھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی شیطان نے گرفتار کرلیا، تو مولانا اصلاحیؒ نے ان کی سخت تنبیہ کی اور لکھا: آپ نے ڈاکٹر صاحب کی شان میں سخت گستاخی کی ہے۔ ان کے مقام کو آپ کیا جانیں! مجھے اندیشہ ہے کہ ان کلمات پر اللہ تعالیٰ آپ کی گرفت نہ فرمالے۔ چنانچہ آں محترم نے فوراً معافی مانگ لی۔

راقم نے ۱۹۸۴ء میں محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے سپاٹ چہرے کے باوجود ان کا قلب بے حد بے چین ہے جو ان کی آنکھوں سے اب عیاں ہونے لگا ہے۔ تب میں اپنی ایک کتاب کے مسودے کو لے کر انکی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اس کا خلاصہ ان سے بیان کیا تھا اور کتاب پر نظر ڈالنے کی درخواست کی تھی۔ میرا احساس ہے کہ خلاصہ سن کر اور مسودہ دیکھ کر ان کی کیفیت میں غیر معمولی تغیر آیا اور اب گویا مجھ پر ان کی شفقتوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ انہیں ایام میں میں نے ان سے ان کی بے چینی کا حال دریافت کیا۔ عام طور پر ان سے متعلق افراد کا خیال یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی ہند کے فکر وعمل میں ہونے والی تبدیلیوں سے پریشان اور کبیدہ خاطر ہیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ ان کی بے چینی کا صرف ایک حصہ تھی۔ ان کی بے چینی کئی امور سے متعلق تھی۔ جماعت کی صورتحال، جماعت کے علاوہ ساری دنیا میں پھیلی تحریکات اسلامی کی صورت حال، عالم اسلام میں تیزی سے رونما ہونے والا زوال، باطلانہ قوتوں کا ہر طرف سے ہجوم، مشرق وسطیٰ میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیاں۔ پہلی بار مجھے ڈاکٹر صاحب کے اس وسیع تناظر کا احساس ہوا۔

۱۹۸۵ء تک مجھے اس کا بخوبی احساس ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب اس عاجز سے اپنی غیر معمولی بے چینیوں، واردات قلبی اور مشاہدات ومکاشفات کا ذکر کرنے لگے ہیں۔ دہلی آتے تو طویل ملاقات رہتی۔ انہیں دنوں ایک ملاقات میں انہوں نے فرمایا تم نے

القول الجلی پڑھی ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے پوچھا: شاہ صاحب کے فلاں مکاشفے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے مختصر الفاظ میں اپنی رائے بتادی۔ پھر وہ خاموش ہو گئے۔

آٹھ یا دس ماہ کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ دیکھا ان کی بے چینی سوا ہو چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے چہرے پر صدیقیت کے ضبط کا سخت پہرہ تھا لیکن ان کے اندر کی فاروقیت پھٹ پڑنے کو بے تاب تھی۔ محسوس ہوا کہ ان کے قلب سے ایک ہوک اٹھ رہی ہے جو ہونٹوں تک آ کر رک جاتی تھی۔ لیکن ان کی آنکھیں بے قابو ہو جاتی تھیں۔ انہوں نے اچانک ایک ایسی چیز مجھ سے دریافت کی کہ میں کانپ سا گیا۔ سوال سے نہیں، بلکہ سوال کے مقصد سے اور اس بات سے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا کرنے والے ہیں؟ ان کے اندر کا عشق بلاخیز قیامت سے پہلے کسی قیامت کو برپا کرنا چاہتا ہے؟ سوال سن کر پہلا خیال آیا کہ امت مسلمہ کے ناگفتہ بہ حالات اور ہر روز رونما ہونے والے روح فرسا واقعات نے انہیں اتنا توڑ دیا ہے کہ وہ بدحواسی کے اقدامات کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ لیکن فوراً محسوس ہو گیا کہ یہ بات درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ کر گزرنے کی سوچ رہے تھے۔

انہوں نے پوچھا: الذی عندہ علم من الکتاب میں علم من الکتاب سے کیا مراد ہے؟ اس پر غور کر کے جواب دو۔ تقریباً ایک سال کے بعد ملاقات ہوئی انہوں نے پھر پوچھا۔ علم من الکتاب سے کیا مراد ہے؟ میں نے جواب دیا کہ عاجز نے جو کچھ غور کیا ہے اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ علم من الکتاب اس قرآن میں موجود ہے۔ انہوں نے پھر دریافت کیا کچھ اندازہ کر پائے کہاں ہے؟ کچھ مہینوں کے بعد میں نے انہیں لکھا کہ عاجز کا قیاس ہے کہ وہ اسماء حسنیٰ میں ہے۔

اس کے بعد انہوں نے کچھ ایسے سوالات کیے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شیطانی قوتوں، ان کی کمین گاہوں اور طریقۂ حرب پر غور کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک دن انہوں نے پوچھا: ابن باجہ (مشہور محدث ابن ماجہ نہیں) کو تم نے پڑھا ہے؟ ابن باجہ کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں، لہذا میں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ لیکن وہ دہلی آنے والوں کے ذریعہ متعدد بار اس عاجز سے دریافت کرتے رہے کہ میں ابن باجہ کے بارے میں انہیں اور بتاؤں اور اس کی کتابوں کو ان کے لئے فراہم کروں۔ عاجز کو اس کا احساس ہو رہا ہے کہ کہیں وہ باجیہ بن یوسف بن باقودہ اور اس کی کتاب الھدایة الی فرائض القلوب سے متعلق استفسار نہ کر رہے ہوں۔

بہر حال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان کے اس سوال پر میں کانپ سا گیا کہ الذی عندہ علم من الکتاب میں علم من الکتاب سے کیا مراد ہے؟

ابتدائی حیرت کے بعد مجھ پر یہ بات منکشف ہونے لگی کہ ان کے قلب و ذہن میں کون سا طوفان بپا ہے اور وہ کیا کر گزرنا چاہتے ہیں، اس حقیقت کا ادراک درج ذیل میں سے کسی ایک اعتبار سے کیا جا سکتا ہے:

(۱) یا تو رفیق اعلیٰ اس نفس مطمئنہ کو ندی اعلیٰ اور ملاء اعلیٰ کے توسط سے اپنی مرضیات کی تعمیل کے لیے متوجہ کر رہا تھا۔

(۲) یا وہ نفس مطمئنہ خود حظیرة القدس سے مربوط ہو کر روح القدس سے تائید حاصل کرنا چاہتی تھی تا کہ رضاء الٰہی کی تکمیل ہو۔

اس عاجز کا ذہن فوراً اس بات کی طرف گیا کہ کیا ڈاکٹر صاحب ظہور دجال کو قریب ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور اس کی تیاری کر رہے ہیں یا وہ مسیح الدجال کے ظہور سے قبل خود اس کے خلاف اقدام کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

میرا ذہن نظام شیطانی کے ان چار جوارح کی طرف گیا جنہوں نے نظام ربانی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ بعثت محمدی ﷺ کو روکا جا سکے۔

اگر ایسا تھا اور اس عاجز کا غالب رجحان یہی ہے کہ ایسا ہی تھا تو گویا نواسۂ رسول کے اندر حقیقت محمدی اور فرزند علی کے اندر حقیقت کراریت بزور چاہتی تھی۔

معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب حج کے لیے ہر روز کی قلیل آمدنی سے کچھ بچا کر رکھتے رہے تھے۔ بہر حال جب وہ دہلی پہونچے اور حج منزل میں راقم سے ملاقات ہوئی جس کا کچھ احوال میں بیان کر چکا ہوں تو انہوں نے تخلیہ میں فرمایا کہ گزشتہ کچھ مہینوں میں تین بار مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں وہاں آؤں۔ غالباً انہیں تین بار آنحضور ﷺ کو زیارت خواب میں نصیب ہوئی۔

دوسری بار کے حکم کے الفاظ تھے: تم جلد آجاؤ (اوکما قال) اور تیسری بار کے الفاظ تھے: تمہیں کچھ دینا ہے یا تم سے کچھ کہنا ہے۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب حج سے واپس آئے۔ انہوں نے واپس آکر کیا احوال بیان کیا مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس تعلق سے میرا حافظہ بالکل خالی ہے۔ غالباً اللہ کی یہی مرضی ہے۔

واپس آکر ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریک کو پوری یکسوئی سے آگے بڑھانا شروع کیا۔ اس تحریک کے خدوخال کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ وہ ظہور دجال کو زیادہ دور نہیں سمجھ رہے تھے۔

اس عاجز کے پاس کوئی دلیل نہیں، نہ ہی کوئی ایسا قرینہ ہے جسے پیش کیا جا سکے لیکن اس کا دل یہ کہتا ہے کہ دنیا میں حالیہ دنوں میں واقع ہونے والی عدیم المثال تبدیلی اور ڈاکٹر صاحب کی وفات کا باہم ربط ہے۔

بالآخر فرزند علی نے دروازۂ خیبر اکھاڑ کر ہی دم لیا۔

اسی طرح ان کی وفات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے لیے بھی اس عاجز کے پاس کوئی دلیل اور قرینہ موجود نہیں کہ خدانخواستہ ہرج ومرج کا دور دورہ ہونے والا ہے۔ اللھم احفظنا۔

اسرار عالم صاحب، اہل علم اور مفکر۔ اسلام اور عالم اسلام سے متعلق متعدد فکر انگیز کتابوں جیسے 'عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال'، 'روحانی صورت حال' اور 'دجال' وغیرہ کے مصنف۔ ضیاء الہدیٰ" سے علمی، فکری اور تحریکی تعلق۔ (قیام: دہلی)

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ ؒ

ایک داعی، مربی، مفسر اور فقیہ

محمود عالم

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ علیہ الرحمہ کی ذات تحریکی حلقہ میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ بہار اور بنگال میں مسلم نوجوانوں اور عام مسلمانوں میں بھی وہ اسی طرح مقبول تھے جس طرح جماعت اسلامی اور اسلام پسند طلبہ تنظیموں کے کارکنوں میں مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ ان کی شخصیت اہل بہار کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت اور رحمت تھی۔ اولیاء اللہ کی پہچان یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔ بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر انسان کا ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔ میں نے دو بزرگوں کے اندر یہ بات دیکھی کہ وہ اپنے ملاقاتی کے حزن وغم کی کیفیت کو سلب کر لیتے تھے۔ ایک سید شاہ امان اللہ قادری مجیبی قدس سرہ اور دوسرے ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ رحمۃ اللہ علیہ۔ میرا ذاتی تجربہ رہا ہے کہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی، گھنٹہ آدھا گھنٹہ ان کے پاس بیٹھا اور غم اور حزن وملال کی کیفیت ختم ہو گئی۔ ان کی صحبت میں چند لمحے گذار کر ایسی خوشی اور انبساط کی کیفیت حاصل ہوتی تھی کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شخصیت میں روحانیت کی ایسی جھلک نظر آتی تھی جو خاصان خدا ہی میں ہوا کرتی ہے۔ وہ ایک صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے لیکن تصوف کے مروجہ رسوم سے بیزار تھے۔ لیکن اپنی طرز زندگی کے اعتبار سے وہ مکمل صوفی تھے۔ توکل، زہد، تقویٰ، صبر، شکر اور ساری اخلاقی خوبیاں جو بالعموم صوفیہ کرام کا خاصہ رہا ہے ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ سے بے پناہ محبت اور اللہ تعالیٰ کی نسبت سے خلق اللہ سے محبت اور ان کی خیر خواہی ان میں حد درجہ تھی۔ وہ ڈاکٹر تھے اور خدمت خلق کو انہوں نے اپنا مشغلہ بنالیا تھا۔ کسی مریض سے برائے نام دوا کی قیمت لیتے، کسی سے بالکل نہیں لیتے اور کسی سے مناسب قیمت لے لیتے۔ مریض کی معاشی حالت دیکھ کر فیس لیتے تھے، وہ بھی اس کے اصرار پر۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی تھی اور وہ مستجاب الدعوات بھی تھے، اسلئے ان کا مرجع خلائق ہونا حیرت کی بات نہیں۔ ان کی سادگی تو ضرب المثل بن گئی تھی۔ دو جوڑے کپڑے بس، ایک بدن پر اور ایک تکیہ کے نیچے۔ لیکن ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے۔ اپنا سارا کام خود کرتے تھے۔ سفر یا حضر کسی سے خدمت لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہزاروں پر احسان کیا ہوگا لیکن قریب ترین عزیزوں کا احسان لینا بھی گوارہ نہ تھا۔ راقم الحروف نے بی اے کا فارم بھرنے کے لئے دوسو روپئے قرض لئے۔ بار بار لوٹانے کی کوشش کی لیکن مسکرا کر رد کر دیا۔ بالآخر ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ مشکوٰۃ شریف کا اردو ترجمہ بہت خوبصورت چھپ کر آیا تو میں نے خرید کر ہدیہ کر دیا۔ لیکن دوسرے دن اس کی دونوں جلدیں ایس آئی او کی لائبریری میں پہنچ چکی تھی۔ سیکڑوں بار ان سے دوائیں لی ہوں گی لیکن کبھی قیمت نہیں لی۔ ۱۹۶۸ سے لیکر ۱۹۹۸ تک اتنے طویل عرصہ میں بار ہا غلطی ہوئی ہوگی لیکن کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ جماعت اسلامی بہار کے امیر حلقہ رہے لیکن بیت المال سے ایک ادھیلا بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔ دادا اور دادی کے بعد سب سے زیادہ پیار مجھے ان ہی سے ملا۔ وہ سراپا محبت تھے۔ وہ ہر آدمی کے ذاتی مسائل میں اسی طرح دلچسپی لیتے تھے جس طرح ایک گارجین لیتا ہے۔ ۱۹۷۱ میں میں نے شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ انہوں نے میرے لئے ایک لڑکی پسند کی، لیکن ایک معمولی بات کی وجہ سے میں تیار نہ ہوا۔ بعد میں اس نا کدخدا کی علمی اور ادبی صلاحتیں ابھر کر سامنے آئیں تو مجھے بے حد افسوس

ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے بہترین انتخاب کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب عموماً کسی کی سفارش نہیں کرتے تھے لیکن مکتبہ الحسنات میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جگہ خالی ہوئی تو انہوں نے بڑا مختصر سفارشی خط لکھا ''صالح نوجوان ہے۔ اس کی تقرری سے مجھے خوشی ہوگی''۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ کو زلیخا نے پھسلانا چاہا تو اس وقت برہان کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوبؑ کی شبیہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے کردی۔ اس گنہگار کے لئے ایسے موقعہ پر ڈاکٹر صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ نظروں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ وفات سے کچھ دن قبل جب میں پٹنہ گیا تو وہ صاحب فراش تھے۔ اس وقت بھی انہیں اپنی صحت اور جان سے زیادہ امت مسلمہ کی فکر لاحق تھی۔ امت کا درد جیسا کچھ میں نے ڈاکٹر صاحب کے دل میں دیکھا وہ بہت کم نظر آیا۔ مجھ سے فرمائش کی ''کوئی خوش خبری سناؤ''۔

میں نے پچھلے چند برسوں میں امریکہ، جاپان اور جرمنی میں جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے ان کی تعداد اور ان کی کیفیت ایمانی کو مختصراً بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب میری باتوں سے بے حد خوش ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ میں سعودی عرب سے واپس ہندوستان آجاؤں اور ان کی تحریک میں عملاً حصہ لوں لیکن میرے اخراجات اتنے بڑھ چکے تھے کہ میرے لئے ڈاکٹر صاحب کی دیرینہ خواہش کو پورا کرنا ممکن نہ تھا۔ مرنے کے بعد متعدد بار خواب مین ان کی زیارت ہوئی۔ ایک بار عجیب وغریب خواب دیکھا۔ میں کہیں رات کے اندھیرے میں جانا چاہتا ہوں۔ ایک دوست مجھ سے کہتے ہیں ''ادھر مت جاؤ ادھر چڑیل رہتی ہے''۔ میں اس دوست سے کہتا ہوں ''ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ چڑیل کیسی ہوتی ہے''۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب آجاتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں ''تمہارے پاس عینک ہے'' میں کہتا ہوں ''نہیں''۔ ڈاکٹر صاحب اپنی ٹارچ اور اپنا چشمہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں ''انہیں رکھ لو کام آئیں گے''۔

مرنے والے دوسری دنیا میں چلے جاتے ہیں لیکن اس دنیا کے لوگوں سے ان کا سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوجاتا۔ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی نے اپنی کتاب ''شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور'' میں اس موضوع پر کافی مواد جمع کیا ہے اور بڑی مدلل بحث کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سراپا مبلغ اور داعی تھے۔ اسلام کی طرف اور عمل خیر کی طرف وہ کسی نہ کسی شکل میں دعوت دیتے رہتے تھے۔ ان کی تقریر میں سادگی اور ایمان ویقین کی حلاوت ہوتی تھی۔ دل سے نکلی ہوئی بات سامعین کے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ شعلہ بیان مقرر یا فصیح البیان واعظ نہ تھے، اپنی بات ایک معلم کی طرح سیدھے سادے لفظوں میں بیان کرتے تھے۔ لیکن ان کی ایک ایک بات دل ودماغ پر نقش کالحجر ہوجاتی تھی۔ نہ صرف باتیں یاد رہ جاتی تھیں بلکہ زندگی میں نمایاں تبدیلی آجاتی تھی۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ ہوں گے جن کی زندگی میں ان کے مواعظ سے نمایاں تبدیلی آئی۔

ڈاکٹر صاحب داعی بھی تھے اور مربی بھی۔ تحریک اسلامی سے وابستہ جتنے نوجوان تھے سب نے ان سے تربیت پائی۔ اخلاقی، علمی اور تنظیمی ہر طرح کی تربیت۔ طلبہ کے جتنے اہم تربیتی اجتماعات ہوئے ڈاکٹر صاحب اکثر اجتماعات میں بحیثیت مربی اور سرپرست شریک ہوئے۔ اخلاقی تربیت کا انداز نہایت پیارا تھا۔ مسکراتے ہوئے محض اشاروں اشاروں میں۔ کبھی کبھی خطاب یا درس قرآن میں عمومی خرابیوں کو موضوع بناتے جو کارکنوں میں محسوس کرتے اور کبھی کسی خاص شخص میں کوئی بات دیکھتے تو درس میں اس موضوع پر اشارہ کرتے اور کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ کسی خاص فرد کی طرف اشارہ ہے۔ کبھی کبھی بروقت بھی متنبہ کرتے۔ ایک بار ان کی موجودگی میں میں نے ایک صاحب سے ایک خاص وقت ملنے کا وعدہ کیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ایک دوسرے دوست سے اسی وقت ان کے گھر پر آنے کا وقت مقرر کرنے لگا تو ڈاکٹر صاحب نے یاد دلایا کہ آپ نے ٹھیک اسی وقت دوسرے صاحب کو وقت دیا ہے۔ میں نے کہا کہ ان سے معذرت کرلوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''نہیں یہ بات مناسب نہیں، مومن کی بات تو پتھر کی لکیر ہونی چاہئے''۔

ڈاکٹر صاحب یقیناً صاحب کشف بھی تھے، کبھی کبھی ان کو وہ بات بھی معلوم ہو جاتی جسے میں اپنے قریبی دوستوں سے بھی صیغۂ راز میں رکھتا تھا۔ ایمرجنسی کے زمانے میں جب ڈاکٹر صاحب جیل میں تھے تو وہاں بھی میں ان سے ہر ہفتہ ملنے جایا کرتا تھا۔ ایک بار میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے کان میں آہستہ سے فرمایا ''اب آپ بڑے ہو گئے ہیں۔ بچوں والی حرکت چھوڑ یئے''۔ حالانکہ اس حرکت پر ڈانٹ پھٹکار پڑنا چاہئے تھی۔ اب غور کرتا ہوں تو بہت ہنسی آتی ہے۔ شاد عظیم آبادی کا یہ شعر اس دور کی اچھی ترجمانی کرتا ہے:

راتوں کو اٹھکر پہروں رونا، نفل نمازیں، سجدے پہ سجدہ
جو نہ ہو جائز اس کی دعائیں اف رے جوانی ہائے زمانے

اپنی ذاتی کمزوری کو بیان کرنے اور اس پر ڈاکٹر صاحب کی مشفقانہ تنبیہ کرنے کا واقعہ اس لئے بیان کیا گیا کہ ہمارے احباب اس سے سبق سیکھیں کہ تربیت کیسے کی جاتی ہے اور ایک اچھا مربی کس طرح نہایت شفقت کے ساتھ برائی کی دلدل سے نکالتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے نوجوان دوستوں پر بہت اعتماد کرتے تھے اور بڑی ذمہ داری سونپتے ہوئے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں جب میں جماعت سے متاثر ہوا اور دفتر جماعت اسلامی رمنہ روڈ میں اجتماع میں شریک ہوا تو دوسرے ہفتہ سے مجھے درس حدیث کی ذمہ داری دیدی جبکہ اس وقت پروفیسر عبدالمعز، منظر صاحب اور دوسرے اہل علم موجود تھے۔ حلقہ طلبہ کا قیام عمل میں آیا تو مجھے اس کا ناظم بنایا۔ یہ اعتماد جو انہوں نے مجھ پر کیا اس سے میرے اندر جو خود اعتمادی پیدا ہوئی اس کی افادیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو تربیت کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور اس تحریک کے رسم و راہ منزل سے خوب واقف ہیں۔ بہر حال مجھ جیسا کندہ ناتراش آج اگر کچھ ہے تو اس میں سب بڑا دخل اسی محسن کا ہے جن کی موت میرا ذاتی خسارہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہر بقرعید میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ضرور قربانی کرتے تھے۔ بزرگوں سے اپنا تعلق مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے میں بھی حضور اکرمؐ اور خلفائے راشدین اور چند بزرگان دین کے نام سے قربانی کرتا ہوں، ان میں میرے پیر و مرشد مولانا سید شاہ امان اللہ قادری قدس سرہ، مولانا شمس نوید عثمانی اور ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔

میں نے متعدد تفسیریں پڑھی ہیں اور بڑے بڑے علماء کا درس اور وعظ سنا ہے۔ لیکن جو لطف مجھے ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن میں ملتا تھا وہ کہیں نہیں ملا۔ کچھ کچھ برادر مکرم ڈاکٹر احسن ظفر اللہ صاحب کے درس قرآن پاک میں یہ رنگ ہے۔ یا پھر برادر محترم پروفیسر نعمان صاحب کی تقریروں میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا سا لطف ملتا ہے۔ شروع شروع میں جب میں ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن کی مجلس میں شریک ہوتا تو لائبریری جا کر مختلف تفاسیر میں اس مضمون کو تلاش کرتا جو ڈاکٹر صاحب بیان کرتے تھے اور پھر وہ مضمون کسی تفسیر میں نہ پاتا تو حیرانی ہوتی۔ آخر ایک دن ضبط نہ ہو سکا اور پوچھ ہی ڈالا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کس تفسیر سے استفادہ کر کے درس دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو مسکرا کر رہ گئے، جناب نسیم احمد صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب جو مضمون بیان کرتے ہیں وہ خود ان کی فکر کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب تکوینی آیات کی جیسی سائنٹفک تفسیر کرتے تھے ویسی تفسیر نہ کہیں پڑھی اور نہ کسی سے سنی۔ یہ ان کا خاص فن تھا۔ قرآن پاک پر جتنا انہوں نے غور و فکر کیا تھا اس عہد میں شاید ہی کسی مفسر نے کیا ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے باضابطہ تفسیریں لکھی ہیں۔ لیکن جن مضامین تک ڈاکٹر صاحب کی رسائی ہوئی اس عہد کے کسی مفسر کو نہ ہو سکی۔ آج جو جدید ترین سائنسی انکشافات نے کلامی مسائل پیدا کر دئے ہیں ان کا جواب اور حل صرف ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب کے مضامین اور درس قرآن میں موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو ''آیات اللہ'' کے نام سے مضامین لکھے ہیں یا

جو درس قرآن تکوینی آیات کی دی ہیں ضرورت ہے کہ انکا انگریزی اور عربی ترجمہ شائع کیا جائے۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کی جرات اور ہمت تھی کہ انہوں نے آج سے تیس سال پہلے صاف صاف فرمایا کہ انسان قرب قیامت کے زمانے تک اس قابل ہو جائے گا کہ مردے میں جان ڈال سکے۔ ظاہر ہے اس وقت ''تناسخ'' کا نظریہ اور اس پر سائنسی تجربہ سامنے نہ آیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی تفسیر، تفسیر بالرائے کہہ کر نظرانداز کی جاتی تھی لیکن آج اس کی معنویت بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے قرآن وحدیث پر جس قدر غور وفکر کیا تھا اور فقہی مسائل پر جس طرح وہ دلائل شرعیہ پیش کرتے تھے انہیں دیکھ کر ان کی مجتہدانہ صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے باضابطہ کسی مدرسے میں مروجہ درسیات کا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن ذاتی مطالعہ اور غور وفکر سے اپنے اندر جو علمی استعداد پیدا کی تھی وہ مدارس کے فارغین سے کہیں زیادہ تھی۔ عربی زبان پر انہیں عبور تھا اور عربی کی تفسیروں، احادیث شریف کے مجموعوں اور دیگر کتب سے وہ بلا تکلف استفادہ کرتے تھے۔ فقہی مسائل میں وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی رائے دیتے تھے۔ فلم خانہ خدا جب ریلیز ہوئی تو متعدد علماء نے اور جماعت اسلامی مہاراشٹر کے امیر جناب شمس پیرزادہ صاحب نے اس کے جواز کا فتوی دیا۔ کیونکہ یہ فلم حج اور مقامات مقدسہ سے متعلق ایک دستاویزی فلم تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا تفقہ فی الدین مفتیان کرام سے زیادہ تھا۔ انہوں نے قرآن پاک کی سورہ المائدۃ کی آیت ۵۷ اور سورہ الانعام کی آیت ۷۰ اور سورہ الاعراف کی آیت ۵۱، جن میں دین کو کھیل تماشا بنانے کی مذمت بیان کی گئی ہے، سے استدلال کرتے ہوئے فلم خانہ خدا کی نمائش کو غلط قرار دیا اور اس کے عدم جواز کا فتوی دیا۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں تلک اور جہیز کی بری رسم چلی ہوئی ہے۔ جہیز کی لعنت سے علماء خوب واقف ہیں۔ اس کو ختم بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے عدم جواز پر فتوی دیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف تلک اور جہیز کے عدم جواز پر اپنی رائے دی اور ہمیشہ اس کے خلاف تحریک چلاتے رہے بلکہ بارات لے جانے اور بارات کے کھانے کی حرمت پر بھی بڑی شدت کے ساتھ رائے بھی دی اور اس پر عمل بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی دلیل یہ تھی کہ نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں مرد جان و مال سے شریک ہوتا ہے اور عورت صرف جان سے شریک ہوتی ہے اسلئے کسی قسم کا مالی بوجھ لڑکی پر یا لڑکی والوں پر ڈالنا ناجائز ہے اور بارات کا کھانا ایک جبر ہے اور حرام ہے۔ اس طرح کے اور بھی مسائل ہیں جس میں ڈاکٹر صاحب کی رائے سب سے الگ ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے اور اجتہادی بصیرت پر دلیل ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک انقلابی شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ تعالی نے ان کے اندر بہت ساری غیر معمولی صلاحتیں رکھی تھیں۔ وہ جس نظریے اور نظام کو حق سمجھتے تھے اس کے قیام کے لئے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ الکشن کے فیصلے کی وجہ سے ان کو جو مایوسی ہوئی اس کا وہ برملا اظہار کرتے رہے اور اپنے دلائل برابر جماعت کے ذمہ داروں کے سامنے لاتے رہے۔ تقریر و تحریر دونوں شکل میں۔ اور جب مفاہمت اور اصلاح کی کوئی صورت نہ پیدا ہوسکی تو بالآخر جماعت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب ''اصلاح معاشرہ کی تحریک'' شروع کی اور اس کا پہلا اعلان ایک فولڈر کی شکل میں جاری کیا تو اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ نوعمر لڑکے اس کی طرف لپک پڑے۔ میں نے جب اس فولڈر کا مضمون گھر میں پڑھ کر بچوں کو سنایا تو سارے بچے یک زبان ہوکر بولے ''میں بھی ممبر بنوں گا'' حالانکہ ان بچوں کی عمر آٹھ دس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تحریک میں اتنی گنجائش رکھی کہ کوئی تحریک میں شامل ہوتے ہوئے بھی کسی دوسری پارٹی کا ممبر ہوسکتا ہے۔ یہ ایک ذاتی اصلاح اور توبہ کی تحریک تھی جو صوفیہ کرام کی بیعت توبہ سے ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ صوفیہ کرام مرید کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر بیعت کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے بجائے قرآن پاک کو ہاتھ میں لیکر توبہ اور اصلاح کا عہد کرنے کی تعلیم دی تھی۔ تازہ غسل اور تازہ

وضو کے ساتھ دو رکعت نفل نماز پڑھ کر قرآن پاک ہاتھ میں لے کر گناہوں سے توبہ کرنا اور کبائر سے اجتناب اور فرائض کی ادائیگی کا عہد کرنا اور روزانہ قرآن پاک کی تین آیتیں ترجمہ کے ساتھ پڑھنا اور ہفتہ میں ایک دن سیرت اور ایک دن حدیث شریف کا مطالعہ کرنا۔اس تحریک میں شامل ہونے کی بس یہی شرط تھی۔اس کے علاوہ کوئی پابندی نہیں،کوئی قید و بند نہیں،آپ جس جماعت میں رہنا چاہیں رہیں،جس معروف کام کو کرنا چاہیں کریں اور جس جماعت کے ساتھ تعاون کرنا چاہیں کریں،آپ آزاد ہیں۔ہاں جو لوگ اس تحریک کے چلانے والے ہوں گے ان کے لئے یہ پابندی تھی کہ وہ کسی دوسری جماعت کے ممبر نہیں بن سکتے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسلم معاشرہ کی بنیادی خرابی کو محسوس کیا تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ جب تک معاشرہ کا ایک ایک فرد توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق استوار نہیں کر لیتا کوئی اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔جماعت اسلامی کے پچاس سالہ تجربات سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا اور اس لئے وہ اپنی تحریک کو امت کی عمومی اصلاح اور مسلم معاشرہ کی اسلامی خطوط پر تعمیر اور اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔وہ آخری لمحے تک اس کے لئے کوشاں رہے۔وہ ایسے لائق جانشینوں کی تلاش میں تھے جو ان کے بعد اس تحریک کو جاری رکھ سکے۔افراد ملے اور ان کا مشن جاری ہے۔ان کی تحریک کسی جماعت یا تحریک سے متصادم نہیں بلکہ ایک تتمہ اور تکملہ ہے۔جس کام کو لوگ تنظیم اور جماعت کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں ڈاکٹر صاحب اس کو ایک عمومی سطح پر اور بڑے پیمانہ پر کرنا چاہتے تھے۔اس تحریک کی کامیابی اور آئندہ پھلنے پھولنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے جانشین حضرات کس قدر تحریک کی روح کے مطابق اس تحریک کو لیکر آگے بڑھتے ہیں۔جو بات اور جو خوبیاں میں نے ڈاکٹر صاحب کے اندر دیکھیں وہ میں نے بڑے بڑے لیڈروں میں نہیں دیکھی۔مولانا خبیر صاحبؒ کے بعد بہار میں اور خاص طور پر پٹنہ میں ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصیت تھی جو ہر مکتب فکر میں یکساں مقبول اور ہر دل عزیز تھی:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

محمود عالم صاحب، لائبریرین، لائبریری 'ولڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ'، ریاض اور سابق لائبریرین، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ ماہنامہ 'نور'، رامپور اور 'رفیق'، پٹنہ کے سابق مدیر۔ صاحب طرز ادیب، کئی کتابوں کے مصنف اور افسانہ نگار۔ طالب علمی کے ابتدائی دور میں ہی ڈاکٹر صاحبؒ سے متاثر اور حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی پٹنہ کے ناظم۔ (قیام: ریاض، سعودی عرب)

منجھلے ابا مرحوم

سید شاہ علیم الدین بلخی ندوی

اس دارِفانی سے بہت سی نامور ہستیاں کوچ کر کے دارالبقا کی طرف چلی جاتی ہیں۔ وہ عظمت وشہرت کا آفتاب بن کر نمودار ہوتی ہیں اور دنیا کے افق پر ایک عرصہ دراز تک تابندہ اور رخشندہ رہتی ہیں۔ دنیا انہیں یاد تو کرتی ہے اور ایک عرصۂ دراز تک نام لیتی رہتی ہے، پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دنیا انہیں فراموش کر بیٹھتی ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی افراد ہوتے ہیں جن کو دنیا نہیں بھول پاتی ہے۔ انکی یادوں کے لافانی نقوش لوگوں کے دلوں کے لوحوں پر ہمیشہ کے لئے مرتسم ہو جاتے ہیں۔ انکے کارنامے، انکی خدمات لوگوں کے لئے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔ انکی زندگی ایک مثالی زندگی یعنی Ideal Life ہوتی ہے۔ مرحوم ومغفور عم محترم جناب ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ صاحب کی زندگی بھی ہمارے لئے Ideal Life کی ہے اور میں انکی زندگی کو نمونہ عمل سمجھتا ہوں۔ انکی یادوں کے نقوش نہ صرف مجھ پر بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ انکے جملہ ماننے والوں اور معتقدوں پر نقش دوام حاصل کر چکے ہیں۔ ایسی ہستی کے بارے میں اگر کہا جائے کہ ابھی بھی وہ زندہ اور پائندہ ہے تو اقبال مرحوم کے الفاظ میں بیجا نہ ہوگا۔

مرنے والا مرتا ہے لیکن فنا ہوتا نہیں\
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتا نہیں

بلکہ ایک فارسی شاعر کا کلام اس موقع پر پیش کردوں تو بالکل صحیح و درست ہوگا جو اس نے یہ کہا کہ وہ آدمی دنیا میں کبھی نہیں مرتا ہے جس کا دل علم وعرفان اور عشق سے معمور رہتا ہے، اس کا نام اس جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق\
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جناب ڈاکٹر صاحبؒ، خدائے غفور ورحیم انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میں انکے بارے میں کیا لکھوں، کہاں سے وہ دماغ لاؤں جو اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر سکوں، میں تو عدم بصارت کی وجہ سے یوں بھی لکھنے پڑھنے سے مجبور ومعذور ہو چکا ہوں، اگر کسی سے املا کراتا ہوں تو پھر کہاں سے وہ دل وجگر لاؤں جو املا کرانے کے وقت قوت برداشت سے کام لوں اور صبر واطمینان کے ساتھ کچھ لکھوا سکوں۔ تاہم چند سطور اس لئے ہدیۂ ناظرین کررہا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تحریر یقیناً مفید وکارآمد ہوگی۔

وہ میرے اپنے خلیرے چچا تھے اور سگے پھوپھا بھی تھے، انہیں میں منجھلے ابا کہتا۔ وہ برابر یہی مجھ سے کہتے رہے کہ بھائی جان (یعنی میرے والد ماجد حکیم سید شاہ تقی حسن بلخی علیہ الرحمہ) اور جتنا تم سے تعلق ووابستگی مجھ کو رہی اپنے خاندان کے افراد میں کسی سے بھی نہیں رہی۔ میرا خود اپنا دادھیالی اور نانھیالی خاندان سارا کا سارا تقسیم ہند کے بعد کراچی ولاہور (پاکستان) منتقل ہوگیا۔ جون ۱۹۷۲ء کے بعد جس وقت میرے والد صاحب علیہ الرحمہ دنیا سے رحلت فرما گئے تو پھر میں ان ہی کو تنہا اپنا مورث اور سرپرست سمجھتا رہا، اپنی زندگی کے تمام نشیب وفراز اور مراحل میں ان سے ہی مشورہ لیتا رہا اور انکی ہدایتوں پر کاربند رہا اور ان کے قیمتی مشوروں کو قبول کرتا رہا۔ گو وہ مجھ سے صرف دس ہی سال بڑے تھے مگر مجھ کو جب بھی وہ کسی سے ملاتے تھے تو یہ کہتے ہوئے ملاتے تھے کہ میں نے اپنے اس

بھتیجے کو گود کر کے کھلایا ہے۔ میں اپنے بچپن میں جب کبھی اپنے گھر قصبہ فتوحہ سے پٹنہ سیٹی کشمیری کوٹھی ان کے گھر جاتا تھا تو ایک ایک ماہ رہنے کا موقع مل جاتا تھا۔ میری والدہ مرحومہ (ہاجرہ خاتون) یا میری پھوپھی مرحومہ (ذکیہ خاتون) جب مجھے ان کے گھر لے جاتی تھیں تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ کی والدہ مرحومہ (عالیہ خاتون) میری خلیری دادی ہیں۔ وہ مجھے اپنا ہی پوتا کہتی تھیں، سمجھتی تھیں اور میرے ساتھ محبت والفت سے پیش آتی تھیں۔ بلکہ میں نے اپنے والد کے ساتھ بھی ان کا تعلق اسی نوعیت کا دیکھا کہ وہ میرے والد کے ساتھ اپنے بیٹے ہی کی طرح پیش آتی تھیں اور میرے والد نے بھی ان کو ہمیشہ اپنی ماں ہی سمجھا۔ کشمیری کوٹھی میں ان کے قیام کی وجہ صرف اس لئے تھی کہ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دادھیال بہار شریف محلّہ مرار پور کو سرکار نے لے لیا تھا اور وہاں ریلوے لائن بچھادی تھی۔ اپنی ننہال جو میرے والد صاحب کی بھی ننہال تھی موضع روہائی ضلع جہان آباد میں کبھی قیام نہیں رہا کہ وہ بالکل کوردہ دیہات تھا۔ کشمیری کوٹھی میں ڈاکٹر صاحب کی چچیری خالہ تھیں جو میرے برادر بزرگ سید شاہ ریاض الرحمٰن صاحب کی حقیقی دادی تھیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی والدہ کو سگی بہن کی طرح عزیز رکھتی تھیں اور کشمیری کوٹھی کے لق ودق مکان کے ایک حصے کو انکے رہنے سہنے بلکہ بسنے کے لئے دے دیا تھا۔ شاہ ریاض الرحمٰن صاحب کے دادا جناب شاہ لال صاحب جو پٹنہ سیٹی کے رؤسائے اعظم میں تھے۔ لہذا اس گھر میں ہر قسم کے عیش وعشرت کا سامان مہیا تھا اور رئیسوں کی ٹھاٹھ باٹ میسر تھی، کسی قسم کی مال ودولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی والدہ اپنے بال بچوں کو لے کر رہنے سہنے لگیں، اور ڈاکٹر صاحب کی پرورش اسی رئیسانہ ماحول میں ہوئی۔ یہ بات میں نے صرف اس لئے لکھ دی کہ ڈاکٹر صاحب نے جب آنکھ کھولی ہوگی تو ضرور رہی رئیسانہ شان وشوکت، ٹھاٹھ باٹ، عیش وعشرت بلکہ رنگین محفلیں بھی دیکھی ہوں گی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ اس ماحول سے کس طرح وہ علیحدہ ہو کر رہے اور کیوں کر ان کی زندگی تقویٰ وطہارت، عبادت وریاضت کا مجسمہ بن کر رہی۔ اگر اس کو میں ان کی زندگی کی کرامت کہہ دوں تو غلط نہیں ہے۔ میں بچپن میں اور سن شعور کو پہنچنے کے بعد جب کبھی کشمیری کوٹھی گیا تو اس ماحول میں بھی ان کو ایک امتیازی وصف کے ساتھ دیکھا۔ ان میں صوم وصلوٰۃ کی پابندی پائی، بلکہ اکثر قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے پایا، اور میں یہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ قرآن پاک کو حفظ کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور یہ حافظ قرآن ہونا چاہتے ہیں۔ اپنے عالم نوجوانی میں بھی وہ قرآن پاک ترجمہ کے ساتھ پڑھتے رہتے تھے اور سورتوں کو یاد کرنے میں مشغول نظر آتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت ان کا مشغلۂ زندگی بن کر رہ گیا تھا۔ اب میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی سے متعلق چند خصوصی باتیں جو ہم لوگوں کے لئے نمونۂ عمل ہیں، چند ذیلی عناوین کے تحت درج کر رہا ہوں:

فنافی القرآن

جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کو قرآن حکیم کے ساتھ والہانہ تعلق تھا۔ تلاوت قرآن اور مطالعہ قرآن سے اتنا شغف تھا کہ وہ عشق کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ وہ قرآن کریم کے عاشق تھے اور میں بالائی سطروں میں بھی لکھ چکا ہوں کہ وہ بچپن سے ہی تلاوت قرآن پاک میں منہمک رہتے تھے۔ اخیر عمر میں آکر تلاوت اور مطالعہ گویا ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔ وہ ہر مسئلہ کو قرآن حکیم سے حل کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ دنیا کے سارے مسائل صرف قرآن پاک سے حل ہو سکتے ہیں اور دنیا کا کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جو قرآن پاک میں موجود نہ ہو۔ ایک بار گفتگو کے دوران میں نے عربی کا یہ شعر پڑھ دیا ۔

جمیع العلم فی القرآن لکن

تقاصر عنہ افہام الرجال

ترجمہ: تمام علم قرآن پاک میں موجود تو ہیں لیکن لوگوں کے افہام انکے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

تو انہوں نے کہا کہ میں پہلے مصرعہ کے ساتھ ہوں مگر دوسرے مصرعے کے ساتھ نہیں ہوں۔ قرآن پاک تو ہماری ہدایت کے لئے نازل کیا گیا، آسان زبان میں پیش کیا گیا، پھر وہ قرآن پاک کیا ہے جس کے سمجھنے سے لوگ قاصر ہوں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا علوم جدیدہ پر مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ علم طبیعات، کیمیا، ریاضی اور طب پر گہری بصیرت رکھتے تھے۔ سائنسی مسائل سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ فزکس اور کیمسٹری کی موٹی موٹی کتابیں انہیں مطالعہ کرتے ہوئے میں دیکھتا تو مجھے اس کی بھی حیرانی ہوتی تھی کہ اتنی بلند پایہ انگریزی کتابوں کا کیسے مطالعہ کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو چونکہ قرآن پاک پر گہری بصیرت حاصل تھی اور آیتوں کے نئے نئے مفاہیم و مطالیب نکالنے میں کمال حاصل تھا جو میں نے اپنی زندگی میں کسی بڑے سے بڑے عالم دین کے اندر یہ بات نہیں پائی اور خاص طور پر سائنسی علوم کو قرآن پاک سے مستنبط کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ مگر وہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ جدید سائنس کو قرآن پاک پر تو منطبق کیا جا سکتا ہے مگر قرآن پاک کو سائنس پر منطبق کرنا بالکل غلط ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن پاک کے قوانین و احکام تو اٹل ہیں مگر سائنس کے نظریات اور Theories تو روزانہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور کھوج کھوج کر ایسی باتیں نکال لیتے تھے جن کی تصدیق قرآن کرتی ہے۔ ایک بار جبکہ چاند پر جانے والا پہلا انسان آرمسٹرانگ گیا تو ساری دنیا کے مذہبی حلقے میں کھلبلی مچ گئی اور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس لئے کہ چاند پر جانا تمام دنیا کے مذاہب کے خلاف ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جنوبی امریکہ کے ایک پادری نے اس لئے خودکشی کر لی کہ یہ بات بائبل کی آیات کے خلاف ہوگئی۔ اسی طرح بنارس کے ایک پنڈت کو بالاعلان کہنا پڑا کہ میرے وید میں جس چاند کا تذکرہ ہے اور جس چندر ماتا کی ہم پوجا کرتے ہیں وہ یہ چاند نہیں ہے جس پر آرمسٹرانگ گیا۔ بہر حال ایسی بہت سی باتیں میں نے خود اخبار میں پڑھی تھیں اور ہمارے بہت سے مسلم اہل علم اور دانشور حضرات بھی شکوک وشبہات میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے قرآن پاک کی ایسی بہت سی آیتیں ڈھونڈ کر نکال دیں جن میں اس کا اشارہ اور ہدایت ملتی ہے کہ آدمی دوسرے کرّوں میں جا سکتا ہے، وہاں اپنی آبادی بھی قائم کر سکتا ہے، بلکہ دوسرے کرّوں میں بھی زندہ مخلوق کے پائے جانے کا امکان ہے، جس کا اشارہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔ ایک زمانے میں جب انسان کے مصنوعی اعضاء بنا کر فٹ کئے جانے کی ابتدا ہوئی اور مصنوعی خون بھی انسانی رگوں میں داخل کیا جانے لگا تو ہم سے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے اس مسئلہ پر کھل کر گفتگو ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مصنوعی اعضاء تیار کرنا اور خون بنا لینا تو کچھ بھی نہیں ہے ہم اس پر بھی قادر ہیں اور آج کی سائنس اس پر بھی طاقت وقوت رکھتی ہے کہ ہمارے جیسا ہی مصنوعی انسان بنا لے۔ میں نے کہا خالق، باری اور مصور تو اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات ہیں۔ اسکی مخصوص صفات میں ہم کیسے شریک ہو سکتے ہیں تو اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سے اختیارات ہمیں دے رکھے ہیں۔ جن آیتوں میں واحد یا متکلم کا صیغہ یا ضمیر استعمال کی گئی ہے اس میں تو ہم شریک نہیں ہیں، لیکن جہاں اللہ تعالیٰ نے جمع کا صیغہ یا ضمیر استعمال کیا ہے ان میں ہم شریک ہیں اور ہم وہ سارے امور بھی انجام دے سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ انجام دیتا ہے۔ پھر میں نے یہ سوال کر دیا کہ میرے بنائے ہوئے انسان اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے انسان میں کیا فرق باقی رہے گا۔ انہوں نے یہ جواب دے کر مجھے خاموش کر دیا کہ میرا بنایا ہوا انسان مصنوعی انسان تو ہوگا لیکن وہ اللہ کا نائب اور خلیفہ نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا انسان اللہ کا نائب وخلیفہ ہوتا ہے۔ بات یہیں پر آ کر رک گئی، وہ ہمارے بزرگ تھے، میں نے ان سے مباحثہ کرنا اچھا نہیں سمجھا اور میرا ذہن آج تک اس معاملہ میں صاف ستھرا نہیں ہوا۔ بہر حال کہنے کی غرض یہ ہے کہ اگر ان کے افکار ونظریات کو جمع کیا جائے اور قرآن حکیم اور سائنس کے عنوان پر کچھ لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔

اخلاص فی العمل

ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی نوجوانی سے خدمت قوم وملت میں رہے اور جو کچھ بھی کرتے رہے پورے اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ کرتے رہے۔ اپنے کسی کام میں قوم وملت سے کوئی معاوضہ حاصل نہیں کیا۔ نام ونمود اور سستی شہرت طلبی سے، جو آج ہمارے رہنماؤں کا مزاج اور طرۂ امتیاز بن چکا ہے، گریزاں رہے۔ انتہائی مالی تنگی اور عسرت کے باوجود بھی وہ اپنی نوجوانی سے اس وقت تک جب تک صلاحیت رہی کبھی ایک پیسہ کسی انجمن سے یا ادارہ سے بطور اجرت ومعاضہ نہیں لیا اور اپنے مطب سے جو بہت چلتا ہوا مطب نہ تھا گھر کے اخراجات پورا کرتے رہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے (یہ بات صرف اسلئے لکھ رہا ہوں کہ میں نے ان سے اسکے متعلق سوال نہیں کیا) کہ جماعت اسلامی میں جب تک وہ امیر رہے اور ساری خدمتیں انجام دینے کے باوجود جماعت اسلامی سے کوئی معاوضہ جس کو کفاف کہا جاتا ہے، کبھی نہیں لیا۔ میں نے جوانی کا وہ دور بھی دیکھا ہے کہ پٹنہ سیٹی سے لے کر بانکی پور تک ہر دن ان کے درس قرآن کا مقرر تھا اور مختلف مساجد میں وہ درس قرآن دیتے تھے۔ سیرت پاک کے جلسے ہوں یا اور کوئی قومی وملی مجلس ہو، وہ کہیں ناشتہ اور کھانا تو کجا، اس لئے کہ وہ اسے بھی معاوضہ سمجھ لیتے تھے، اپنی سائیکل سے سفر کرتے، دوسری سواری سے بھی گریز کرتے تھے۔ اگر میلاد کی محفلوں میں کسی نے تبرک دے دیا تو وہی لیتے تھے جو سبھوں کو تقسیم کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۳ء کی بات ہے جب میں گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ میں پڑھتا تھا۔ میرے کالج کے طلبہ نے ایک بڑا جلسہ میلاد النبی منعقد کیا تھا اور ڈاکٹر صاحب بھی مقرر کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔ وہ سائیکل ہی سے گئے تھے۔ اختتام جلسہ کے بعد مٹھائیاں تقسیم کی گئیں اور رسم کے مطابق ان کو لڑکوں نے دو چار پیکٹ فاضل دینا چاہا اور ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے صرف ایک ہی پیکٹ لیا، اور ان کا جملہ مجھے یاد ہے کہ میں اسلامی اشتراکیت کو پسند کرتا ہوں، جو سب کو دیا ہے وہی مجھے دیجئے اور میں ایک ہی لوں گا۔

تقویٰ اور پرہیزگاری

ڈاکٹر صاحب سراپا تقویٰ اور پرہیزگاری کے مجسمہ تھے۔ میں نے ہمیشہ دیکھا کہ وہ اپنے اعزاء واقرباء، احباب واصدقاء کے یہاں کھانے پینے میں بھی محتاط رہتے تھے اور حلت وحرمت کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ ان کے اور میرے بہت سے اعزا شاکی رہتے تھے اور ان کی اس غایت پرہیزگاری پر نکتہ چیں بھی رہتے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنے رشتہ مندوں سے کم آمیز تھے۔ نہیں بلکہ عید، بقرعید، شادی بیاہ اور بیماری دکھ میں تمام لوگوں کے یہاں ملنے جلنے اور مزاج پرسی کے لئے چلے جاتے تھے۔ چائے، پان اور سگریٹ سے پرہیز تھا، کھانے پینے سے بھی کوئی عذر نکال کر انکار کر بیٹھتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کی بات ہے جب زمینداری کا خاتمہ ہوا تو لوگوں کے گزر بسر کے لئے وقتی اور عارضی معاوضہ دیا گیا جو تھا تو Interim Compensation مگر سرکار نے اس کا نام Interest رکھ دیا۔ بہت سے زمیندار جو فاقے سے دوچار ہو رہے تھے یہ رقم لینے لگے اور تمام زمینداروں کے گھر کا خرچ اسی Interest سے چلنے لگا۔ میرے والد صاحب علیہ الرحمہ نے یہ رقم کبھی نہیں لی، اور وہ خود ایک بڑے طبیب تھے اور میری ملازمت بھی ہو چکی تھی اور میرے گھر کے سارے اخراجات مطب اور ملازمت ہی کے پیشے سے چلتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا آنا جانا میرے والد صاحب کے پاس برابر ہی ہوتا تھا، لیکن جب بھی ناشتہ یا کھانے کے لئے دسترخوان بچھایا جاتا تو وہ کوئی عجلت کا اظہار کر کے چلے جاتے تھے۔ میرے والد صاحب علیہ الرحمہ کو ہمیشہ اس کا قلق رہتا تھا کہ وہ ہمارے یہاں دسترخوان پر نہیں بیٹھتے۔ ایک دن کی بات ہے جب دسترخوان چنا جا چکا تھا اور وہ جانے کے لئے تیار ہو گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے تو میرے والد صاحب نے ان سے مخاطب ہو کر کہا "سلوٗ (ان کا گھریلو نام

سلیمان عرف سلو تھا) کہاں جارہے ہو، یہ تو ناشتے کا وقت ہے، دسترخوان بچھ چکا ہے، ناشتہ کھا کر جاؤ''۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول کوئی عذر پیش کیا اور جانے کی اجازت مانگی۔ میرے والد صاحب بہت ہی متاسف ہوگئے اور گلوگیر آواز اور نم آلودہ آنکھوں کے ساتھ کہا، سلو! تم میرے یہاں کھانے پینے سے ہمیشہ بھاگتے ہو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے مطب کی کمائی اور میرے بیٹے علن سلمہ (یعنی میں خود) کی ملازمت کی کمائی حلال پیسے کی ہے اور اس میں کوئی حرمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے''۔ ڈاکٹر صاحب بھی ان کے اس جملے سے بہت ہی متاثر ہوگئے اور کسی قدر انہوں نے بھی بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''نہیں بھائی جان نہیں بھائی جان'' اور یہ کہتے ہوئے دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ پھر اس کے بعد سے جب والد صاحب، میں نے، میری والدہ اور میری اہلیہ نے کھانے کے لئے کچھ پیش کیا تو انکار نہ کیا۔ بلکہ بیسنی روٹی کو مرچ کے کوچے کے ساتھ وہ بہت ہی شوق سے کھاتے تھے اور کبھی وہ خود ہی میری والدہ مرحومہ سے بیسنی روٹی پکانے کی فرمائش کر بیٹھتے تھے۔ بلکہ جب کبھی بیسنی روٹی پکتی تھی تو میرے والد صاحب علیہ الرحمہ مجھ سے کہتے تھے کہ سلو کو بلا کر لے آؤ۔

یوں تو تقویٰ اور پرہیزگاری کی، ان کی زندگی کے اندر، بہت سی مثالیں ملتی ہیں لیکن صرف ایک واقعہ نکاح کے سلسلے میں ان کی پرہیزگاری کا پیش کر کے اس عنوان کو چھوڑتا ہوں۔ وہ جہاں کہیں بھی نکاحوں میں شرکت کرتے تھے یا نکاح پڑھانے جاتے تھے سوائے نقل اور چھوہارے کے اور کچھ نہیں لیتے تھے۔ لڑکی والوں کی جانب سے ناشتہ اور کھانا کھانے یا لڑکے والوں کی طرف سے بارات کے کھانے کو بالکل ہی معیوب بلکہ ناجائز سمجھتے تھے۔ دعوت ولیمہ کے کھانے کو (اگر لڑکے والوں کی طرف سے جہیز لی اور ولیمہ کی رقم طلب نہ کی گئی ہو) تو مسنون سمجھ کر کھا لیتے تھے۔ میں خود اپنے گھر ہی کا واقعہ مثالاً پیش کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی تمام لڑکیوں کی شادی میں انہیں دعوت دی۔ وہ میرے یہاں کی تمام تقریبات میں شریک رہے، دعائیں دیں، نقل اور چھوہارے لے کر رخصت ہوگئے۔ میں نے کبھی ان کو کھانے کے لئے نہیں کہا۔ لیکن صرف اس لئے کہ میرے گھر والوں کی دل شکنی نہ ہو، میری والدہ مرحومہ کو جب مبارکباد دینے کو آئے تو مبارکباد پیش کرنے کے بعد یہ کہا کہ ''لائیے بھابھی اس خوشی میں کچھ کھلائیے پلائیے'' یا میری اہلیہ سے کہا ''دلہن لاؤ کچھ تحفہ تحائف سمدھیانہ سے آیا ہو تو کھلاؤ پلاؤ''۔ غرض یہ کہ میں نے اس طرح کا تقویٰ اپنے بہت سے بزرگوں میں نہیں پایا، اور یہ بے مثال نمونہ ہے جس پر ضرورت ہے کہ آج کی نوجوان نسل کو چلایا جائے اور تلک جیسی مذموم رسم سے لوگوں کو بچایا جائے۔

صلۂ رحمی

وہ بہت ہی مخیّر تھے اور بہت سے نادار اور مفلس لوگوں کی پوشیدہ امداد کیا کرتے تھے۔ اپنے اعزا و اقربا کے ساتھ بھی خصوصی طور پر صلۂ رحمی کرتے تھے۔ مختلف قومی اور ملی چندے کا اعلان جب بھی میں نے عالم گنج جامع مسجد میں کیا تو وہ میرے گھر پر آ کر چندہ دے جاتے تھے اور میں یہ رقم مستحقین تک پہنچوا دیتا تھا۔ اپنے لوگوں کا جو میرے بھی رشتہ دار تھے خاص خیال کرتے تھے۔ ایک بار عید کے موقع پر جب کہ ایک ہمارے بزرگ جو میرے والد صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے بھی رشتے میں بھائی تھے بہت ہی ناداری اور افلاس کے شکار ہوگئے تھے۔ وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے، لیکن کچھ G.P.Fund نکلوانے اور پینشن ملنے میں قانونی پیچیدگی اور گڑبڑی پیدا ہوگئی تھی اور تقریباً سال دو سال سے وہ بہت ہی عسرت سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ کھانے پکانے کا جب کوئی ٹھکانہ نہ تھا تو عید کے لئے نئے جوڑے کہاں سے آتے۔ جو کپڑے ان کے تن پر تھے وہ بھی گویا پھٹے چیٹے تھے۔ میرے والد صاحب نے میرے سامنے ہی ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب سے ان کی زبوں حالی کا تذکرہ کیا۔ دوسرے دن عید تھی، ڈاکٹر صاحب نے میرے والد

صاحب سے کہا کہ ''میں ایک جوڑا کپڑا دے دیتا ہوں۔مگران سے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں کہ میں نے دیا ہے۔آپ ہی اپنے نام سے بھجوا دیجئے تا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ کہیں سے خیرات آئی ہے''۔میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ ان کے گھر گیا، انہوں نے وہ اپنا نیا سلا ہوا جوڑا جو انہوں نے عید کے لئے سلوایا تھا مجھے دے دیا اور میں وہ جوڑا لے کر اسی شب میں اپنے ان بزرگ کو یہ کہتے ہوئے دے دیا کہ میرے ابا جان نے بھیجا ہے۔انہوں نے لے لیا اور یہی نیا کپڑا پہن کر وہ دوسرے دن عید گاہ گئے اور اسطرح انہوں نے عید منائی۔حقیقت یہ ہے کہ کسی موقع سے کسی کی خدمت کر دینا اور کسی کے دکھ درد میں کام آ جانا نماز و روزے سے کم نہیں ہے۔

عبادت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

قناعت پسندی وصبر و رضا

جب انہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا تو بڑی عسرت اور بدحالی سے زندگی گزارنے لگے۔کبھی کبھی فقر و فاقہ کی نوبت آتی رہی۔وہ G.P.O. Office میں Telegraphist تھے۔اگر برسر ملازمت رہتے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر PMG نہیں ہوتے تو Superintendent ہو کر ضرور ریٹائر ہوتے اور گھر میں خوشحالی ہوتی مگر انہوں نے نہ صرف ملازمت پر لات ماردی بلکہ وہ زمانہ تھا جبکہ زمینداری کا معاوضہ لوگوں کو ملنا شروع ہوا اور وقتی طور پر ان کو بھی عارضی معاوضہ کی رقم ملنے کی امید ہوئی یا جو رقم کچھ آئی تو اس کو انہوں نے ٹھکرا دیا اور صرف مطب ہی سے چار پیسے حاصل کرنے لگے، اور میں یہ بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ انہوں نے کس طرح سے تنگی اور معاشی ابتری میں مبتلا ہو کر زندگی کاٹی۔مگر ان کی ذات صبر و رضا کی پیکر مجسم تھی۔کبھی کسی کے سامنے اپنی کلفت اور مصیبت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔کئی کئی وقت سوکھی روٹیاں کھا کر رہ جاتے تھے۔مگر باہر کا کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کھاتے اور کیا پیتے تھے۔وہ اگر بیمار بھی پڑتے تھے یا کسی درد وکرب میں مبتلا ہو جاتے تھے تو اپنی بیماری اور دکھ درد کا تذکرہ کسی سے نہیں کرتے تھے۔ہم لوگ اگر اپنی گھریلو پریشانیوں کا اظہار دوسروں کے سامنے کر بیٹھتے ہیں اور یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ گھر کیلئے آج راشن کا انتظام نہیں ہوا ہے اور گھر میں جلاون کا سامان میسر نہیں ہے، پانی اور بجلی کی کمی ہے، گرانی اور مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے، فلاں فلاں چیز بازار سے نایاب ہو چکی ہے یا ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں تو اس قسم کی باتوں کا تذکرہ بھی وہ فضول سمجھتے تھے اور ایسی باتوں کے کرنے سے بھی وہ گریز کرتے تھے۔میں نے ان کی زبان سے کبھی آپ بیتی سنی نہ کبھی جگ بیتی۔وہ دنیا سے الگ تھلگ ایک نرالے اور بے مثال انسان تھے۔ان میں صبر و رضا و توکل کی جو شان تھی وہ صحابہ کرامؓ اور قدیم صوفیائے عظام ہی کے جیسی تھی۔

سماءالفقر فخری کا رہا شان عمارت میں!
بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

ایک بار جب ان کی علالت کے دوران مزاج پرسی کی تو کچھ باتیں میں نے دریافت کی تو بہت ہی ہلکے پھلکے انداز میں اپنی بیماری کا حال بتایا اور مزید کچھ وضاحت چاہی تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ اپنی بیماری و دکھ، تکلیف و پریشانی کا اظہار دوسروں کے سامنے کرنے سے صبر و شکر ادا کرنے کا جو اجر و ثواب ملتا ہے اس سے آدمی محروم ہو جاتا ہے، اپنی بیماری و دکھ کو مریض یا تو اپنے معالج سے بیان کرے یا معالج حقیقی جو خدا ہے اس کے روبرو پیش کرے۔جس قدر صابر و شاکر رہ کر انہوں نے زندگی بسر کی میں نے اپنی زندگی میں کسی اور کے اندر یہ بات نہیں دیکھی۔

سعی وعمل

وہ بہت ہی جفاکش اور مرد آہن تھے۔ محنت ومشقت سے نہیں بھاگتے تھے۔ شب وروز کسی نہ کسی فنی کتاب کے مطالعہ میں منہمک رہتے تھے یا دواسازی اور کیمیاوی تجربات میں مصروف نظر آتے تھے۔ ان کو قدیم علم کیمیا سے بڑی دلچسپی تھی اور کشتہ سازی سے خاص لگاؤ تھا۔ جدید کیمسٹری سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ایک زمانے میں علم کیمیا، خاص طور پر سونا بنانا جس کو علم اکسیر کہتے ہیں، میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے پرانی پرانی قلمی کتابیں، قلمی نسخہ جات اور سفینے ان کو دیئے اور اس طرح تقسیم ہند سے پہلے جو کتابیں لاہور سے چھپ کر شائع ہوئی تھیں اور جو پرچے اس فن پر چھپتے رہتے تھے وہ سب ان کو میں نے فراہم کردیئے۔ خود میرے گھر میں ایک بھٹی تیار کی گئی اور طرح طرح کے تجربات اس بھٹی میں کیئے جاتے تھے۔ کشتہ سازی تو ہوتی ہی رہتی تھی، لہذا سونا تیار کرنے میں ڈاکٹر صاحب اور میرے والد حکیم سید شاہ تقی حسن بلخی لگ گئے۔ میرے والد صاحب جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ایک بڑے طبیب تھے، دواسازی اور کشتہ سازی پر ان کو عبور تھا۔ کچھ پرانے نسخوں کو حاصل کرکے اور مختلف قسم کی دھاتوں کو جمع کرکے وہ ڈاکٹر صاحب کی معاونت میں لگے رہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بڑے بڑے کیمیاداں جب سونا تیار نہیں کرپاتے تو یہ کہہ اٹھتے کہ ''ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی''۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ان دونوں نے مل کر پارا اور مختلف دیگر دھاتوں کو جلا کر سونا تیار کرلیا اور اس سونے کو جب ایک سونار کو دکھانے کے لئے مجھے دیا گیا تو اس نے کسوٹی پر پرکھ کر کہہ دیا کہ یہ اصلی سونا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی بار یہ سونا تیار کیا، پھر دوبارا اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ ان کے تجربات کے لئے میں مختلف دوائیں اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزا لاکر دیتا رہتا تھا۔ اور وہ بڑے مہنگے پڑ جاتے تھے۔ اور کبھی کسی طرح تجربے میں ان کو ناکامیابی ہوتی تھی تو اس کا کوئی صدمہ اور ملال نہ ہوتا تھا۔ اور جب میں یہ سوال کردیتا کہ اتنے روپئے ضائع ہوئے تو وہ مسکراتے ہوئے جواب دیتے کہ ضروری نہیں ہے کہ ہر تجربے میں کامیابی حاصل ہوجائے، ہمارا کام محنت کرنا اور تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو۔ اگر کامیابی حاصل کرنے میں صرف لگے رہیں گے تو پھر محنت اور سعی وعمل کا دروازہ بند ہوجائے گا۔

تصوف سے وابستگی

ان کو اپنی آخری زندگی میں تصوف وطریقت سے بہت ہی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ صوفیائے کرام کی بہت سی کتابیں مکتوبات وملفوظات، مطبوعہ اور قلمی نسخے انہیں پڑھنے کے لئے میں دیتا رہتا تھا۔ شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مخدوم شرف الحق والدین احمد یحییٰ منیری فردوسی رحمتہ اللہ علیہ کی کتابیں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ مجھ سے مانگ کر پڑھتے تھے۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ادعیہ، نقوش اور تعویذات بھی لوگوں کو لکھ کر دینے لگے۔ مگر ان سے کبھی اجرت ومعاوضہ حاصل نہیں کیا بلکہ اجرت ومعاضہ کے حاصل کرنے کو غیر پسندیدہ فعل سمجھتے تھے۔ وہ اس کے قائل تھے کہ ہندوستان کے اندر صوفیائے کرام نے تبلیغ واشاعت دین کا کام کیا ہے اور غیر مسلموں میں بغیر تصوف کی راہ اپنائے ہوئے ہم تبلیغ دین کا کام نہیں کرسکتے ہیں۔ انہوں نے بارہا مجھ سے کہا کہ جس طرح یونان کے فلسفے نے جب عربوں کو متاثر کیا اور الحاد ودہریت کا سیلاب امنڈ آیا تو ہمارے بہت سے عرب فلاسفہ نے اسکی کاٹ کے لئے علم کلام کی ایجاد کی اور علم کلام سے یونانی فلسفے کی کاٹ کی گئی اور اس معاملہ میں ہمارے علمائے کرام کو بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اسی طرح ہندوستان میں چونکہ ہندو ویدانت پھیلا ہوا ہے اور اہل ہنود اسی ویدانت سے متاثر ہیں تو اس کی کاٹ کے لئے اسی رنگ میں ہم تصوف ہی کے ذریعہ ویدانت فلسفے کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان کے صوفیائے کرام نے ہندو ویدانت کا جواب اسی شکل میں تصوف سے دیا

تو لاکھوں لاکھ ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کردیا۔ انہوں نے خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ جب میں جیل میں تھا، وہ زمانہ ایمرجنسی کا تھا، میرے ساتھ بہت سے انند مارگی بھی جیل میں داخل تھے۔ روزانہ میری انکے ساتھ نشست و برخاست ہوتی تھی اور ہندو فلسفہ خاص طور پر اپنے ویدانت کی تبلیغ و اشاعت کرتے تھے اور مجھ کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا نہ تو اسلام کو خالص عقلی شکل میں پیش کرنے سے کام چلے گا اور نہ سائنسی حیثیت سے صرف تبلیغ کی جاسکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے سوالات کے جوابات بھی اسی طرح اور اسی رنگ میں پیش کروں جس کے وہ طالب ہیں۔ میں نے جب ان کے ویدانت کا جواب اپنے علمی اور عملی تصوف سے پیش کیا۔ انکے بہت سے بنائے ہوئے جنتر کا جواب میں نے نقوش لکھ کردیئے تو وہ بھی لاجواب ہوگئے اور ان کو اعتراف کرنا پڑا کہ ہمارے یہاں کا علم تکسیر ان کے جنتر کے علم سے زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھیں۔ جہاں علمی اور سائنسی دلائل کی ضرورت ہے وہاں وہ پیش کریں اور جہاں قدیم یونانی فلسفہ یا جدید نظریات کا سامنا ہو وہاں جدید سائنٹفک انداز بیان اختیار کیا جائے۔ اسی طرح ہمارے برادران وطن جو بہت ہی توہم پرست ہوتے ہیں اور دیوی دیوتاؤں کے قائل ہوتے ہیں، خوارق، اور خلاف فطرت باتوں سے وہ متاثر ہوتے ہیں تو ان ادعیہ، نقوش اور تعویذات وغیرہ چیزوں کو ان کے سامنے پیش کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جو ہندوستان کے صوفیائے کرام کا شیوہ تھا۔ انہوں نے اپنی کرامات اور خوارق سے لوگوں کو متاثر کیا اور مشرف بہ اسلام کیا۔

تتمہ کلام: میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو پیش نہیں کیا اور ان کی سوانح عمری کچھ بھی نہیں لکھی۔ اس لئے کہ اور لکھنے والے ان کے حالات زندگی کو لکھیں گے، انکی تصنیفات و تالیفات پر لوگ تبصرہ کریں گے اور انکے عادات وخصائل اور اخلاقیات کو بھی پیش کریں گے۔ میں نے اپنی سمجھ میں ان ہی چیزوں کو سپرد قلم کرایا ہے جو مفید اور کارآمد ہیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

سید شاہ علیم الدین بلخی ندوی صاحب، ڈاکٹر صاحب کے بھتیجا، گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے سابق پرنسپل، سجادہ نشیں خانقاہ بلخیہ فردوسیہ فتوحہ، عالم دین اور خطیب۔ (مقام: پٹنہ)

ماموں جان
جن سے قریب ہو کر بھی میں دور رہا

ریحان غنی

کسی بزرگ کے بارے میں کچھ لکھنا اور اظہار خیال کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ وہ بھی ایسے بزرگ کے بارے جن کی زندگی کا ایک نصب العین تھا اور مشن تھا، جنہیں ایک ایسے معاشرے کے قیام کی تمنا تھی جس کی داغ بیل نبی کریمؐ نے ڈالی تھی۔ ایسے صالح افراد تیار کرنے کی آرزو تھی جو مسلم معاشرے کے لئے نمونہ بن سکیں۔ ایسی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنے کی جراءت نہیں ہو رہی تھی۔ قلم اٹھاتا تھا پھر رکھ دیتا تھا۔ اسی میں کافی وقت گذر گیا۔ اس دوران جناب شاہد انور صاحب کا اصرار بھی بڑھتا گیا کہ میں ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ علیہ رحمہ کے بارے میں کچھ لکھوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے تعلق سے میں جو باتیں قلمبند کر رہا ہوں وہ شاہد صاحب کے پیہم اصرار کا ہی نتیجہ ہے۔ ورنہ من آنم کہ من وانم۔

ڈاکٹر صاحب میرے منجھلے ماموں تھے۔ ان کی اکلوتی بہن رشیدہ میری والدہ تھیں۔ میں اپنی والدہ کی شفقت سے ۱۹۸۶ء میں محروم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے دو اور بھائی تھے۔ بڑے بھائی کا نام شمس الہدیٰ تھا اور چھوٹے بھائی سراج الہدیٰ جو میری والدہ ماجدہ مرحومہ سے دو گھنٹے چھوٹے تھے۔ دونوں بھائی تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ بڑے بھائی کا کراچی میں انتقال ہوا۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی یعنی میرے چھوٹے ماموں سید سراج الہدیٰ حیات ہیں اور ان دنوں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے والد کا نام سید نور الہدیٰ تھا۔ آپ ایک اچھے شاعر تھے اور نور تخلص تھا۔ بہار شریف کے محلّہ مرار پور کے رہنے والے تھے۔ تذکرہ مسلم شعرائے بہار کے مصنف حکیم سید احمد اللہ ندوی کہتے ہیں کہ ''جناب نورؔ نے انگریزی میں ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی شادی شاہ درگاہی صاحبؒ سجادہ نشیں خانقاہ فتوحہ کی چھوٹی سالی عالیہ مرحومہ سے ہوئی تھی۔ شادی کے بعد جناب نورؔ اپنی اہلیہ کی حیات تک پٹنہ کے محلّہ کشمیری کوٹھی میں سکونت پذیر رہے''۔ ایک مرتبہ میرے بڑے ماموں سید شمس الہدیٰ نے کراچی سے مجھے ایک کیسٹ بھیجا تھا جس میں انہوں نے اپنے والد ماجد کے بارے میں کچھ باتیں مجھے بتائی تھیں۔ میں نے ان کی باتیں تفصیل سے اپنے ایک مضمون ''بہار کے ایک گمنام شاعر سید نور الہدیٰ نورؔ بہاری'' میں درج کی ہیں جو میری کتاب ''قوس قزح'' میں شامل ہے۔ یہاں میں ان کی کچھ باتیں تحریر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں؛

''جناب نورؔ کے خاندان کی سخاوت اور فیاضی مشہور تھی۔ چنانچہ اسی دریا دلی کا نتیجہ تھا کہ جب ریل کی پٹری بچھائی جانے لگی اور مرار پور اسٹیشن (مرار پور بہار شریف کے ایک محلّہ کا نام ہے) کے قیام کا منصوبہ بنا تو اسٹیشن کے لئے جتنی زمین درکار تھی وہ بلا کسی معاوضہ کے دے دی۔ یہاں تک کہ جب کمپنی نے معاوضہ کی پیشکش کی تو اسے قبول نہیں کیا۔ وجہ یہ بتائی کہ ریل چونکہ عوام کے فائدے کے لئے ہے اس لئے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ جب ریل گاڑی چلنے لگی تو رات کا دسترخوان اس وقت تک نہیں بچھتا جب تک آخری ریل نہیں آجاتی اور آنے والا مسافر دسترخوان پر ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول نہیں کر لیتا۔ نیز کافی تعداد میں طلبا کی کفالت کی جاتی۔ اس کے علاوہ گھر میں اتنا سامان تھا کہ بہ یک وقت چار چار شادیوں کا سامان لوگوں کے لئے مہیا کر دیا جاتا اور اس کا معاوضہ بھی نہیں لیا جاتا تھا۔ جناب نورؔ کے والد کا نام سید لیاقت حسین تھا۔''

ڈاکٹر صاحب اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کی سخاوت اور فیاضی کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ میری والدہ ماجدہ اپنے

خسر مولانا مفتی سید شاہ محمد عثمان غنیؒ ، اپنی دو نند اور تین دیوروں کے ساتھ پھلواری شریف میں رہتی تھیں اور میرے والد محترم سید شاہ نعمان غنی دیوروں سرکاری ملازمت کی وجہ سے باہر رہا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر صاحب پٹنہ سے بذریعہ سائیکل اپنی بہن سے ملاقات کرنے اکثر پھلواری شریف جایا کرتے تھے اور ہم بھائی بہنوں کے لیے لیمون چوس کا پیکٹ ضرور لاتے تھے۔ میری والدہ کے عادات واطوار ڈاکٹر صاحب کے عادات واطوار سے بہت ملتے جلتے تھے۔ وہی خدا ترسی، وہی عبادت گذاری۔ بڑی محبت تھی دونوں میں۔ اللہ تعالیٰ ہر بھائی بہن کے دلوں میں ایسی ہی محبت بھر دے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا ڈاکٹر صاحب کو عالم گنج میں مقیم دیکھا۔ بہت ہی سادہ زندگی، بہت ہی سادہ رہائش۔ ممانی جان بھی سادگی کا پیکر تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کو اپنے شوہر کی زندگی سے بہت حد تک ہم آہنگ کرلیا تھا۔ میری والدہ دو چار مہینے پر ڈاکٹر صاحب کے یہاں ضرور آتیں اور کچھ دن اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہتیں۔ یہی ان کا مائکہ تھا۔ مجھے بھی اچھا لگتا۔ اس وقت پھلواری شریف کی حیثیت قصبہ کی تھی۔ دیہات کی طرح زندگی تھی۔ جبکہ پٹنہ میں بجلیاں تھیں۔ سڑکوں پر ہلچل تھی۔ چالیس پینتالیس سال پہلے اماں کے ساتھ میری پٹنہ آمد میرے لیے پکنک ہوتی۔ ۱۹۶۶ء یا ۱۹۶۷ء میں جب والدہ نے اپنی موجودگی میں اپنی دونوں نند اور تینوں دیوروں کی شادی کردی تو وہ والد کے ساتھ رنگڑا (رانچی کا ایک بلاک) چلی گئیں جہاں والد محترم ملازمت کرتے تھے۔ چونکہ دادی اماں کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے والدہ ہی گھر کی سرپرست تھیں۔ میری پھوپھی اور میرے عم بزرگوار بھی والدہ کی بے حد عزت کرتے تھے۔ والدہ کی ہی طرح بھاوج کی کیسے عزت کی جاتی ہے یہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا۔ والد کے ساتھ ملازمت پر پٹنہ سے باہر چلے جانے کے بعد والدہ کے پٹنہ آنے جانے کا سلسلہ تقریباً بند ہوگیا۔ پھر یہ سلسلہ غالباً ۱۹۷۸ء میں اس وقت شروع ہوا جب ہم تمام لوگ پھلواری شریف سے شاہ گنج منتقل ہوگئے۔ اس وقت میں پٹنہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں ایم اے کا طالب علم تھا اور روزنامہ سنگم میں ملازمت کرتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جماعت اسلامی کا دفتر سلطان گنج میں ہوا کرتا تھا۔ ماموں جان اکثر ٹہلتے ہوئے شام میں شاہ گنج چلے آتے۔ اماں نے پٹنہ سے باہر جاتے وقت مجھے تاکید کی تھی کہ میں اپنے ماموں سے ضرور ملتا رہوں۔ چونکہ میں پھلواری شریف میں زیر تعلیم تھا اس لیے میرا پٹنہ آنا جانا برابر جاری رہا۔ جب جی چاہتا ماموں جان اور ممانی جان سے ملنے عالم گنج چلا جاتا۔ دونوں تنہا رہتے تھے۔ کیونکہ انہیں اولاد نہیں تھی۔ بعد میں انہوں نے ایک بہت چھوٹی لڑکی کو گود لیا اور والدین کی طرح اس کی پرورش کی میری والدہ اسے اپنی بھتیجی کی طرح مانتی تھیں اور ہم لوگ بھی اسے ماموں زاد بہن سمجھتے تھے۔ لیکن یہ لڑکی زیادہ دنوں تک ڈاکٹر صاحب اور ان کی اہلیہ کا ساتھ نہیں دے سکی اور عین جوانی میں ایک سڑک حادثہ میں وہ جاں بحق ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ بندہ لاکھ سمجھنے کی کوشش کرے سمجھ نہیں سکتا۔ اس کے لیے بینا آنکھیں چاہیے لیکن ایسی بینا آنکھیں کتنے لوگوں کے پاس ہیں؟ ماموں جان اور ممانی جان کو اس لڑکی کی موت کا صدمہ ایک عرصہ تک رہا۔ میرے تینوں چچا اشتراکی نظریہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے خود کو اشتراکیت کے زیر سایہ پایا۔ میرے دادا علیہ رحمہ عالم بھی تھے اور مفتی بھی۔ انہوں نے ایک عرصہ تک امارت شرعیہ کے دارالقضاء میں قاضی کے فرائض بھی انجام دیے۔ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے انتقال سے کچھ مہینے قبل 'فتاویٰ امارت'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب ترتیب دے کر شائع کروائی جس میں میرے دادا مولانا مفتی سید شاہ محمد عثمان غنی کے فتاوے بھی شامل ہیں۔ لیکن عالم ہونے کے باوجود پتہ نہیں کیوں کمیونسٹوں کے سلسلے میں وہ نرم گوشہ رکھتے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب ہندوستان میں کمیونسٹ معتوب تھے۔ مسلمان انہیں ووٹ نہیں دیتے تھے۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے یاد ہے کہ الکشن کے زمانے میں لوگ مجھے رکشہ پر بیٹھا دیتے اور ہاتھ میں مائیک دے دیتے اور میں پھلواری شریف کی گلیوں میں ''کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دیں کانگریس کو بھول جائیں'' کا نعرہ لگاتا رہتا۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ کمیونسٹوں

نے میرے دادا ابا علیہ رحمہ کے ایک فتویٰ کی لاکھوں کاپیاں چھپوا کر تقسیم کرائی تھیں جس میں کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دینا جائز قرار دیا گیا تھا۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔لیکن اس حقیقت کے باوجود مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میرا جو بھی مذہبی ذہن بنا وہ میرے دادا ابا علیہ رحمہ کی قربت کی وجہ سے ہی بنا اور میں ’حلقہ بگوش اشتراکیت‘ ’’نہیں ہو سکا۔ غالباً یہی وجوہ تھے کہ ڈاکٹر صاحب بچپن میں مجھ سے اکثر پوچھتے تھے (ان کی ہی زبان سے)’’تے کیمونسٹ نہیں نے بنے گا؟‘‘ اس وقت میں اتنا چھوٹا تھا کہ یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آتا اور میں کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے دل ہی دل میں سوچتا، ماموں جان یہ سوال کیوں کرتے ہیں؟ پتہ نہیں اس سوال کے پیچھے ماموں جان کی وہ تڑپ تھی جو میرے سلسلے میں ان کے دل میں چھپی ہوئی تھی یا میری والدہ کی دعائیں یا ان کی نیکیاں تھیں کہ کمیونسٹوں کے درمیان رہ کر بھی میں کمیونسٹ نہیں بن سکا۔

ڈاکٹر صاحب نے پوری زندگی ایک نصب العین کے تحت گذاری اور وہ تھا صالح معاشرہ کا قیام۔ اسی نصب العین کی تکمیل کے لیے وہ سرکاری ملازمت چھوڑ کر جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے اور جب اس پلیٹ فارم سے انہیں اس کی تکمیل ہوتی نظر نہیں آئی تو وہ جماعت سے خاموشی کے ساتھ الگ ہو گئے۔ نہ کوئی شکوہ کیا اور نہ کوئی گلہ۔ دوسروں کی طرح جماعت سے الگ ہو کر اپنی کوئی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بھی نہیں بنائی۔ ان کے دل میں صالح افراد بنانے کی تڑپ تھی۔ ایسے افراد جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کریں۔ اسی تڑپ کی وجہ سے انہوں نے ایک خاموش تحریک شروع کی جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ یہ بے نام تحریک دراصل اللہ سے ڈر اور خوف پیدا کرنے کی ایک ایسی سنجیدہ کوشش تھی جس کے بطن سے صالح افراد پیدا کیے جاسکیں کیونکہ صالح معاشرے کے لیے افراد سازی کی حیثیت بنیاد کے پتھر کی ہوتی ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی اس تحریک کو ’’قومی آواز‘‘ پٹنہ اور ’’افکار ملی‘‘ دہلی کے توسط سے متعارف کرایا۔ ہر ذی شعور شخص یہ جانتا ہے کہ صالح معاشرے کے لیے خدا ترس اور صالح افراد کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ ماموں جان صاحب نظر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ نبی کریمؐ کے مشن کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی وہ افراد سازی کا ہی نتیجہ تھی۔ نبی کریمؐ نے ایسے صالح افراد اور خدا ترس انسان بنائے جن کی بدولت صالح معاشرہ بنا اور پھر صالح حکومت عالم وجود میں آ گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریک دراصل نبی کریمؐ کی تعلیمات اور آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کی ایک بہترین کوشش تھی۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس طرح افراد سازی کی جس طرح ایران میں امام خمینی نے افراد سازی کی۔ ایسی افراد سازی کا یہ ثمرہ ہے کہ ایران میں صالح معاشرہ قائم ہوا اور اللہ تعالیٰ نے وہاں ظالم و جابر شاہ ایران کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کہ پورے کا پورا معاشرہ بدل جائے۔ یہ اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں اور اللہ کی مدد اسی وقت ہوتی ہے جب انسان کی نیت میں خلوص اور اللہ کے آگے خود سپردگی کا جذبہ ہوتا ہے۔ میرے اس خیال سے کچھ لوگ اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ایرانی معاشرے اور نظام حکومت میں تبدیلی اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھی ایرانی انقلاب سے متاثر تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی اس تحریک سے اور ذاتی طور پر ان سے اس طرح نہیں جڑ سکا جس طرح جڑنا چاہئے تھا۔ لیکن اب افسوس کر کے کر بھی کیا سکتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے صالح معاشرے کے قیام کے لئے بنیاد کی جو اینٹ رکھی ہے لوگ اس اینٹ پر اینٹ رکھتے جائیں اور اللہ تعالیٰ اس پر ایسے صالح معاشرے کی عمارت تعمیر کرادے جو بے چین اور کراہتی انسانیت کے لیے چین وسکون کا ضامن بن سکے اور جو لوگ بھی اس میں معاون بنیں وہ ڈاکٹر صاحب کے لیے صدقہ جاریہ بن جائیں۔ (آمین)

ریحان غنی، معروف صحافی، الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا سے وابستہ، ڈاکٹر صاحبؒ کے بھانجہ (مقام: پٹنہ)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم کی شخصیت: کچھ یادیں

ڈاکٹر احسن احمد

سادگی

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ نہ کوئی لمبا کرتا نہ شیروانی۔ ویسے اونچی قمیض پائجامے میں ہر جگہ سائیکل سے جاتے تھے۔ ان کی شخصیت میں جو جاذبیت اور کشش تھی وہ ان کی سادگی صاف اور سیدھی گفتگو سے تھی۔ مرصع اور مسجع گفتگو سے انہوں نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ بہت کم بولتے تھے، کبھی لمبی تقریر نہیں کرتے تھے لیکن جو بولتے تھے عملی بات ہوتی تھی اور اس کے اندر بہت ہی وزن ہوتا تھا۔ ایک داعی کی حیثیت سے ان کی باتوں میں اثر ان کے عملی نمونے اور شخصیت سے تھا۔ وہی بات کوئی دوسرا شخص کہتا تو لوگ انکا کوئی اثر نہ لیتے تھے مگر ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم کی زبان سے جو بات نکلتی تھی اسکا بڑا وزن ہوتا تھا۔ ان کی زبان میں تاثیر ان کے خلوص وللّٰہیت اور تقویٰ کی وجہ سے تھی۔ ان کی شخصیت پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

بہ آب ورنگ خال وخد چہ حاجت روئے زیبارا

اکثر مجالس میں دوسرے مقررین جوسج بن کر ڈائس پر تشریف لاتے وہ ڈاکٹر صاحب کے فقیرانہ ٹھاٹ سے مرعوب رہتے۔

قرآن مجید سے تعلق

داعی کی حیثیت سے وہ مسلکی وفقہی اختلاف سے مکمل پرہیز رکھتے تھے۔ لوگوں کو زیادہ تر قرآن سے نصیحت کرتے تھے۔ قرآن سے شغف اور قرآن کے گہرے مطالعے کی وجہ سے ان کی شخصیت پٹنہ میں منفرد تھی۔ عالم گنج میں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ وہی ان کا مطب تھا، وہی ان کا ڈرائنگ روم اور بیڈ روم۔ جب بھی میں ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا وہ اپنی کھٹیا پر بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت میں غرق رہتے۔ قرآن سے وابستگی اور قرآن سے انہاک ہی وہ چیز تھی جس نے انہیں تمام مسلکی اختلافات اور گروہی عصبیت سے بالکل دور رکھا تھا۔ تمام دینی جماعتوں اور تمام تنظیموں کے اکابرین ان کی کٹیا میں حاضر ہوتے۔ ان کی نماز جنازہ میں پٹنہ کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کے افراد عقیدت مندی کے ساتھ ٹوٹ پڑے اور بہت بڑا مجمع ہوا۔ کوئی شخص کوئی پریشانی لے کر پہنچتا تو اسے قرآن کی کوئی آیت بتاتے تھے کہ اس کا ورد کرو جو اس کے حالات کے مناسب ہوتی اور اس سے سائل کو تسلی ہو جاتی۔

تربیت کا طریقہ

ان کا خود جیسا انہماک قرآن میں تھا ویسا ہی ان کے شاگردوں میں قرآن سے تعلق پیدا ہو جاتا تھا۔ ان کی زندگی خود قرآنی نظام زندگی کا نمونہ تھی اور وہ اپنے متبعین میں بھی قرآن کا رنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ قرآن پڑھانے کا ان کا انداز بھی بالکل انوکھا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو یا جماعت اسلامی کے افراد کو قرآن فہمی اور قرآن پر ریسرچ پر ابھارتے تھے اور ہر فرد خود سے اپنے حاصل مطالعہ کو پیش کرتا تھا اور جہاں نہیں سمجھ میں آتا سوال کرتا۔ جماعت سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اصلاح معاشرہ کی تحریک قائم کی۔ اس میں بھی انہوں نے ہفتہ وار اجتماع میں ہر شخص کو ایک آیت اور اس کی تشریح پیش کرنے اور سوالات کرنے پر ابھارا۔ یوں تو تحریک میں مشرقی ہند کے بیشتر افراد ڈاکٹر صاحب مرحوم کے محبت یافتہ وتربیت یافتہ ہوئے جنہوں نے بنگال اور آسام میں بھی تحریک کو پھیلایا مگر ان کے تربیت یافتہ شاگردوں میں قیم جماعت اسلامی ہند محمد جعفر صاحب اور امیر حلقہ بہار قمر الہدیٰ صاحب کا نام خاص طور پر قابل ذکر

ہے۔تربیت پرتوجہ کا یہ عالم تھا کہ تحریک کے لوگوں کو اکثر نصیحت کیا کرتے کہ اپنا جانشین تیار کرنے کی کوشش کرو۔ایک دفعہ حسنین سید صاحب تشریف لائے اور ڈاکٹر صاحب سے اپنے قائم کردہ اسلامک سنٹر اسلام نگر دربھنگہ کا تذکرہ کیا۔ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ سب سے ضروری یہ ہے کہ اپنا جانشین تیار کیجئے۔وہ امیر کی حیثیت سے اپنے مامور کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور ہر شخص کے ذاتی حالات سے واقف رہتے تھے جو بیمار ہوتا اس کو مفت دوا دیتے۔

معالج کی حیثیت سے

ڈاکٹر صاحب مرحوم ایک نہایت کامیاب طبیب تھے۔اکثر ایسا ہوا کہ میں نے کسی تکلیف کا ذکر کیا تو انہوں نے دوا بنوا کر خود میرے گھر پہنچوا دیا۔دوا کا ارکان جماعت اور ہمدردان جماعت اور شاگردوں سے انہوں نے کبھی کوئی دام نہیں لیا۔میں نے کئی بار کوشش کی کہ دوا کی قیمت پیش کردوں مگر انہوں نے سختی سے انکار کیا۔حالانکہ یہی ان کا پیشہ تھا اور اسکے سوا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔اپنی ڈاکٹری کی آمدنی سے وہ تین سو روپے مکان کا کرایہ اور تین سو روپے ماہانہ کھانے کا خرچ بھی دیتے تھے۔اتنی غربت اور قلیل آمدنی کے باوجود خودداری کا یہ عالم تھا کہ رؤسا اور عمائدین شہر سے بھی بعض دفعہ فیس یا دوا کی قیمت لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میرے ایک ماموں جو بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہ چکے تھے اور پٹنہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے اپنے کچھ مرض کا ڈاکٹر صاحب مرحوم سے تذکرہ کیا۔ان دنوں ڈاکٹر صاحب کا قیام اکزبیشن روڈ پر واقع میرے غریب خانہ میں تھا۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک شاگرد کے ذریعے دوائیں منگوا کر میرے ماموں مرحوم کو پیش کیا۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے بے انتہا اصرار کے باوجود بھی اس وجہ سے دوا کی قیمت بھی بتانے سے انکار کر دیا کہ آپ نے تو مجھ سے فرمائش دوا کی نہیں کی تھی تو یہ تو میں خود آپ کو اپنی طرف سے پیش کر رہا ہوں۔میں اس کی قیمت نہیں لے سکتا۔میرے ماموں کئی دن آئے اور بے حد اصرار کے بعد کچھ رقم ڈاکٹر صاحب کی جیب میں ڈال دی مگر اسے بھی ڈاکٹر صاحب نے لوٹا دیا۔ایسی حالت میں میرے ماموں مرحوم نے یہ پیش کش کی کہ یہ رقم آپ اپنے ہاتھ سے کسی مستحق کو خیرات کر دیجئے اور اس پیشکش کو بھی نہ قبول کرنے کی وجہ کر میرے ماموں ٹیبل پر رقم چھوڑ گئے اور مجھے حکم دیا کہ تم اسے مستحق کو دے دینا۔گویا اپنے شاگردان جماعت کے ارکان و ہمدردان کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے امیر غریب کو دوا بھی دیتے اور دعاء بھی۔اوراد و وظائف بھی بتاتے۔اور زیادہ تر مریض بھی شفایاب ہوتے اور جسمانی امراض کے علاوہ ذہنی اور دماغی الجھنوں کے شکار بھی تسلی حاصل کرتے۔

ایک دفعہ میری آنکھ میں Vitreous haemorhage کی شکایت ہوگئی اور ''آل انڈیا انسٹی چیوٹ آف میڈیکل سائنس دلی'' کے ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اس بیماری کا کوئی علاج نہیں ہے۔مگر میں نے جب ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم سے ذکر کیا تو انہوں نے ایک ہومیو پیتھک دوا جرمنی کی بنی ہوئی ایک شخص کے ذریعہ جو عرب میں رہتے تھے مجھے منگوا کر دیا جس سے مرض میں کافی افاقہ ہو گیا اور میڈیکل انسٹی چیوٹ کے ڈاکٹروں نے بھی اس علاج کے بعد جب میرا معائنہ کیا تو Vitreous haemorhage کو پہلے سے بہت کم پایا گرچہ مرحوم کوئی سند یافتہ ڈاکٹر نہیں تھے مگر طب یونانی، آیورویدک، ہومیو پیتھک اور بایو کیمک وغیرہ کا بہت گہرا مطالعہ تھا اور کئی دوائیں انہوں نے خود تیار کی تھی۔مثلاً ان کی اپنی تیار کردہ ''سنہری دوا'' مشہور تھی اور نہایت کمزور مریض بھی اس دوا کو کھا کر تندرست ہو جاتا تھا۔

دنیا سے بے رغبتی

ڈاکٹر صاحب صوفی منش، عابد و زاہد، اللہ والے اور صبر کا پیکر تھے۔باوجود غربت و افلاس کے انہوں نے اپنی آمدنی سے حج

کیا۔ گرچہ سعودی عربیہ کی طرف سے ایک سال بیس اشخاص بادشاہ کے مہمان کی حیثیت سے حکومت سعودیہ کے خرچ پر بلائے گئے۔ان بیس لوگوں میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم اوران کی اہلیہ بھی مدعو تھیں مگر ڈاکٹر صاحب کے فقر غیور نے اس کو گوارہ نہ کیا کہ بادشاہ کے دیئے ہوئے پیسے سے حج کریں۔انہوں نے حکومت سعودیہ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کئی سال بعد خود اپنی کمائی سے حج کیا۔ جماعت کے ہمدردان نے ایک کوآپریٹو بنایا جس کے صدر ڈاکٹر صاحب مرحوم مقرر کئے گئے مگر جب پلاٹ کی Booking کے لئے لوگ آئے تو معلوم ہوا کہ کسی فلیٹ کے مالک کو ٹی وی لگانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ڈاکٹر صاحب نے صاف کہہ دیا کہ کوئی شخص ٹی وی لگائے گا تو میں ایسے کوآپریٹو کی صدارت نہیں قبول کرسکتا۔اسی طرح جب دفتر حلقہ کا پختہ مکان انہیں رہنے کے لئے پیش کیا گیا تو انہوں نے عالم گنج میں اپنی کھپریل چھت والی کوٹھری ہی میں رہنا پسند کیا۔ یہ ان کا اختیاری فقر تھا ورنہ اگر تحریک کے واسطے سرکاری نوکری نہ چھوڑتے تو بہت اونچے عہدوں پر فائز ہوتے اور عیش کی زندگی گزار سکتے تھے۔مگر آخرت کے لئے زندگی بھر مسکین کی طرح زندگی گزارنے کو آپ نے ترجیح دی۔اپنے رفقاء اور شاگردان کو بھی وہ دنیا سے بے رغبتی کی نصیحت کرتے رہتے۔چنانچہ ایک بار ایک ساتھی جو حج میں بھی ان کے رفیق سفر تھے بڑے خوش خوش آئے کہ مجھے الکشن میں کھڑے ہونے کی ٹکٹ ملنے والی ہے، ڈاکٹر صاحب نے انہیں الکشن میں کھڑا ہونے سے منع فرمایا اور کہا کہ ٹکٹ نہ ملے تو اچھا ہے۔کچھ دنوں بعد یہ صاحب پھر حاضر ہوئے کہ میرے بجائے کسی اور شخص کو ٹکٹ مل گئی۔اس پر ڈاکٹر صاحب نے خوب خوب مبارک باد دی کہ اللہ نے تمہیں اپنی خاص رحمت سے نوازا کہ تم اس گندی سیاست میں کودنے سے بچا لئے گئے اور انہیں اپنی عاقبت کی درستگی کی نصیحتیں کیں اور دعائیں دیں۔جس پر ہر شخص متحیر تھا کہ ایک شخص کو اتنی بڑی چیز سے محرومی پر ڈاکٹر صاحب مبارکباد دے رہے ہیں۔مگر لوگ کیا جانیں کہ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں دنیا کی حقیقت متاع غرور یا متاع قلیل کے سوا کچھ نہ تھی۔ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ''بالا صاحب دیورس'' جو R.S.S. کے سنگھ سرچالک تھے پٹنہ میں گاندھی میدان میں ایک عام جلسے سے خطاب کرنے والے تھے۔اس میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم کو بالا صاحب دیورس کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنے کے لئے پٹنہ کے R.S.S. لیڈروں نے کافی خوشامد کی مگر ڈاکٹر صاحب نے اس پیش کش کا بالکل بے لاگ اور دوٹوک جواب دیا کہ بحیثیت مسلمان جب بھی خطاب کروں گا تو اللہ کی تعریف سے شروع کروں گا کیوں کہ یہی طریقہ نبی ﷺ نے مسلمانوں کو سکھلایا ہے۔اور تمام خوبی اور فضل و کمال تو اللہ جل شانہ کی وجہ سے ہے اس لئے میں کسی بھی انسان کی بے جا تعریف نہیں کرسکتا۔یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اندرا گاندھی کو الکشن میں شکست فاش ہو چکی تھی اور R.S.S. والے اور جماعت اسلامی والے تمام قید و بند سے رہا ہو چکے تھے اور تمام R.S.S. کے لیڈروں کی تعریف کے پل باندھے جارہے تھے۔چونکہ جیل میں ساتھ رہنے کی وجہ سے R.S.S. کے افراد ضیاء الہدیٰ مرحوم کے درس قرآن میں شریک رہا کرتے تھے اس لئے ان سے قریبی روابط پیدا ہو چکے تھے جس کی بناء پر ان لوگوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب بالا صاحب دیورس کو مجمع سے متعارف کرائیں اور اس کے بعد بالا صاحب خطاب فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ غیر مسلموں کی دعوت کے سلسلے میں بھی مداہنت سے بالکل پرہیز کیا اور دعوت کے لئے صاف اور سیدھی بات کہا کرتے۔انہیں بڑے سے بڑے اور کسی بھی فرقے یا گروہ کے کسی شخص سے صاف صاف توحید و رسالت اور آخرت کی بات پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں محسوس ہوتی۔ان کے زہد و استغناء، تقویٰ، خلوص اور سادگی کا یہ اثر تھا کہ بڑے سے بڑا لیڈر ہو وہ ان سے مرعوب رہتا۔

غیر مسلموں میں دعوتی کام

میں نے جب خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی کے ساتھ غیر مسلموں میں دعوت کا کام شروع کیا اور اس کے لئے ''المعهد الاسلامی للدعوة و التربية'' پٹنہ میں قائم کیا گیا تو خصوصی مشورے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی تشریف لائے اس میں یہ طے پایا کہ مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی لکھنؤ سے اور سید عبداللہ طارق کانپور سے تشریف لائیں گے اور کچھ لوگوں کو دعوتی کام کی تربیت دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اس دس روزہ تربیتی پروگرام میں شرکت کے لئے دعوت قبول کی۔ لیکن دوسرے دن انہیں کچھ الجھن ہوئی کہ اگر غیر مسلم کو بتایا جائے گا کہ ویدوں میں بھی توحید و رسالت اور آخرت کا ذکر ہے تو کہیں وہ اس کو وحدت ادیان یعنی ''سرودھرم سد بھاؤ'' کی دعوت نہ سمجھ لیں۔ اس لئے انہوں نے استخارہ کیا اور مجھے ایک خط لکھ کر بھیجا کہ میں اس اجتماع میں شریک نہیں ہوسکتا ہوں اس لئے کہ مجھے اللہ کی طرف سے منع کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم جماعت سے مستعفی ہو چکے تھے اور انہوں نے ایک نئی تحریک برائے اصلاح معاشرہ بھی قائم کر لی تھی۔ انہوں نے اپنی تحریک کے رفقاء کو اس تربیتی اجتماع میں بھیجا اور میں نے جو غیر مسلموں میں دعوت کا کام کیا اسے بھی پسند کیا۔ مگر ہمیشہ مجھے تاکید کرتے تھے کہ دعوت اس ڈھنگ سے دی جائے کہ غیر مسلم کو ایسا خیال نہ ہو کہ ''یہ بھی اچھا اور وہ بھی اچھا'' اس سلسلے میں ایک خاص واقعہ مجھے یاد آتا ہے جب میں ایک نومسلم کو لے کر ان کے پاس حاضر ہوا۔ یہ نومسلم نوجوان الحمدللہ تہجد گزار، باریش اور متشرع مسلمان ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ التحیات کے بعد کون سی دعاء پڑھتے ہو اور ربنا اغفر لی ولوالدی ۔۔۔۔۔۔ پڑھنے سے منع کیا اور بتایا کہ چونکہ تمہارے والدین مشرک ہیں اس لئے تم التحیات کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت نہیں کر سکتے ہو۔ لہذا تمہارے لئے نماز میں مناسب دعاء یہ ہے ربنا آتنا فی الدنیا حسنة الخ۔ ایک دفعہ میں اور عبداللہ طارق آئی جی پولیس بہار میکورام کو دعوت دینے گئے اور انہیں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم کی دعوت پر شریف کالونی پٹنہ میں ایک اجتماع میں بھی بلایا گیا۔ میکورام ڈاکٹر صاحب کی سیدھی اور صاف بات اور شخصیت سے کافی متاثر ہوئے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے سیاسی وجوہات سے بودھ دھرم اختیار کیا۔ حالانکہ انہوں نے خود بتایا کہ حق تو اسلام ہی ہے۔

گھریلو معاملات

بڑے سے بڑے مقرر اور داعی حق کے لئے اپنے گھریلو معاملات میں بہتر ہونا اس کی شخصیت کا معیار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ جب بیمار پڑیں اور تقریباً چھ مہینہ بالکل مفلوج ہو گئیں تو ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی سے فرصت لے کر اپنے کو اہلیہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

واضح ہو کہ ڈاکٹر صاحب لاولد تھے اور ایک بچی کو متبنیٰ رکھا تھا۔ وہ بھی اٹھارہ سال کی عمر میں ایک سڑک حادثے میں انتقال کر گئی۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد کا یہ حال ہوا کہ 'نو جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناطہ' مگر ڈاکٹر صاحب نے کبھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بیٹی کی اچانک موت، اس کے بعد بیوی کی علالت اور ان کے انتقال کے بعد تنہائی کی زندگی، اپنی بیماری اور چار بار بڑے بڑے آپریشن کا جس طرح انہوں نے صبر و استقامت سے سامنا کیا وہ بے مثال ہے۔

اصلاح معاشرہ

معاشرہ کی اصلاح کے لئے بھی ڈاکٹر صاحب نے عملی نمونہ پیش کرنے پر برابر زور دیا۔ جس کسی شادی بیاہ میں بلائے جاتے تو نکاح پڑھا کر واپس چلے جاتے۔ بارات کے ساتھ ہرگز کھانا نہیں کھاتے۔ خود میری بڑی لڑکی کے نکاح کی تقریب میں نکاح

پڑھانے کے بعد واپس چلے گئے اور باراتیوں سے علیحدہ میرے غریب خانہ پر بہت اصرار کے باوجود بھی ایک پیالی دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر صاحب چائے کے عادی نہیں تھے اور ان کے تربیت یافتہ افراد بھی اکثر چائے، کافی، سگریٹ وغیرہ سے مکمل پرہیز کرتے ہیں۔ اور جب بھی میرے یہاں تشریف لاتے اور لوگوں کو چائے پیش کی جاتی تو انہیں ایک پیالی دودھ پیش کیا جاتا تھا۔ مگر اس دن انہوں نے دودھ سے بھی انکار اس لئے کیا کہ مسلمانوں میں بارات کی غلط رسم اور باراتیوں کی طرف سے انواع واقسام کے کھانوں کی فرمائشوں کو وہ مسلم معاشرے سے اپنے عملی نمونے کے ذریعے سے ختم کرنا چاہتے تھے۔

جب انہوں نے اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی تو میرے گھر کے سات آٹھ افراد ان کی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں میرے لڑکے ڈاکٹر خالد احمد کا نکاح انہوں نے خود مسجد میں پڑھایا۔ اس نکاح میں قاضی مجاہدالاسلام قاسمی مرحوم سابق صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ، مولانا نظام الدین صاحب موجودہ امیر شریعت بہار واڑیسہ بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نکاح کا خطبہ دیا اور رخصتی بھی بالکل شرعی طریقے سے کرانے کا حکم دیا۔ تقریب کے بعد انہوں نے لڑکوں کو مبارکباد دی کہ یہ ''تحریک کا پہلا ثمرہ ہے''۔

مریض کی حیثیت سے

۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ مرحوم کو Prostate کے مرض کی وجہ سے پیشاب رک گیا۔ مجھے جماعت اسلامی کے کچھ رفقاء نے بلایا اور میں نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو داناپور اپنی کلنک میں لے گیا اور وہیں ان کا آپریشن بے ہوش کر کے کیا گیا۔

مریض کی حیثیت سے کسی مریض نے ایسی فرمائش نہیں کی تھی جیسی ڈاکٹر صاحب نے کی۔ وہ بضد ہوئے کہ ظہر کی نماز اول وقت پڑھ کر آپریشن کرائیں گے تاکہ عصر سے قبل ہوش آ جائے اور کوئی فرض نماز فوت نہ ہونے پائے۔ میں نے کہا کہ کوشش کروں گا لیکن اگر ہوش نہ آ سکا تو چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کر لیجئے گا۔ آپریشن میں اور ہوش آنے میں اتنا وقت لگا کہ عشاء کے وقت تک کا عرصہ گزر گیا۔ ہوش آنے پر مریض کا پہلا سوال یہ نہیں تھا کہ آپریشن کیسا ہوا، کامیاب ہوا یا نہیں، بلکہ انہوں نے مجھ سے ایک ہی سوال کیا کہ عصر کی نماز کا وقت ختم تو نہیں ہو گیا۔ میں نے بتایا کہ عشاء کا وقت ہو چکا ہے اور عصر اور مغرب کی قضاء پڑھ کے آپ اطمینان سے عشاء پڑھیں مگر ان کے چہرے سے عصر اور مغرب کے قضا ہونے کی وجہ سے اداسی نظر آئی اور وہ خاموش رہے۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے خاموشی توڑتے ہوئے بتایا کہ اللہ کے فضل سے آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ یہ پہلا اور آخری کیس تھا جو میں نے ۴۵ سالہ تجربہ کے دوران پایا کہ مریض کو اپنی جان سے بڑھ کر نماز کی فکر ہے۔

آپریشن سے پہلے اور آپریشن کے بعد ڈاکٹر صاحب کو پیشاب کے راستے بہت خون آیا اور شدت کا درد بھی ہوتا تھا مگر وہ مجسم صبر کا پیکر بنے رہتے اور مسکراتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن بے ہوش ہو گئے تو میں نے ڈاکٹر مسعود الرحمٰن مرحوم کو، جو پٹنہ کے معروف ترین ماہر قلب ڈاکٹر تھے، بلایا۔ انہوں نے ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم کا معائنہ کیا اور ہارٹ کا .E.C.G کرنے کا حکم دیا مگر ڈاکٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے فرمایا کہ ''آپ لوگ اتنا گھبرا کیوں رہے ہیں میرے ہارٹ میں کوئی مرض نہیں اور مزید مجھ سے کہا کہ اتنی زحمت کر کے ہارٹ اسپشلسٹ (Heart specialist) کو بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ۱۵ دنوں تک آپ کلنک میں رہے اور دوران قیام آپ کا معمول تبلیغ و دعوت بنا رہا۔ آپ سے ملنے کے لئے داناپور اور کھگول علاقے کے اکثر .B.J.P اور .R.S.S کے لیڈران بھی آئے اور ان سے بھی دینی اور سیاسی باتیں ہوتی تھیں۔ چونکہ آپریشن سے چند دن قبل آپ پھلواری جیل میں تھے، لہذا آپ کے جتنے بھی جیل کے ساتھی تھے وہ آپ سے ملنے اور عیادت کو روزانہ حاضر ہوتے تھے۔ اس سے آپ کے حسن سلوک کا

پتہ چلتا ہے۔ نیز یہ کہ آپ نے کس طرح ان کو اپنا معتقد بنالیا تھا۔ غیر مسلمین آپ کا پاؤں چھونا چاہتے تھے مگر آپ منع فرماتے تھے۔

دوسری بار ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہرنیا کا آپریشن مجھ سے کرایا اور اکزبیشن روڈ میں میرے امین کلینک میں آپریشن کے بعد پندرہ دنوں تک ان کا قیام رہا۔ یہاں بھی مریض کے کمرے میں جماعت کے رفقاء اور ہمدردان خصوصاً طلباء ان کے بیڈ کے چاروں طرف جھرمٹ لگائے رہتے اور دعوت وتبلیغ کا کام اور ایس آئی او کا اجتماع وغیرہ مریض کے کمرے میں ہی ہوتا رہتا۔ اس آپریشن کے دوران بھی اور پھر تیسرے اور چوتھے آپریشن میں جو صدیقی نرسنگ ہوم میں ہوا ڈاکٹر صاحب اسی طرح صبر کا پیکر بنے رہے اور ان کے شاگردوں نے بھی اسی طرح کی عقیدت مندی اور بے انتہا خلوص ومحبت سے ان کی تیمارداری اور خدمت کی۔ خصوصاً نوجوان اور طلباء ان کی خدمت میں بڑے ذوق وشوق سے منہمک رہتے۔ ان کا تیسرا آپریشن Prostate کا تھا جس میں چھ بوتل خون چڑھانے کی ضرورت پیش آئی اور پچاسوں نوجوان اپنا خون Donate کرنے کے لیے پیش پیش تھے۔ لڑکوں نے اپنی اپنی ڈیوٹی باندھ لی تھی اور ہر وقت کئی لڑکے خدمت میں مشغول رہتے تھے۔ چوتھا آپریشن نہایت ضعیفی کے عالم میں ہوا اور یہ جانگھ کی ہڈی کا آپریشن تھا جو ڈاکٹر بشیر عالم (ہڈی کے سرجن) نے کیا اور اس دفعہ بھی ڈاکٹر صاحب صدیقی نرسنگ ہوم میں ایڈمٹ رہے۔ یہ آپریشن سب سے زیادہ مشکل اور سخت تھا اور اتنی کمزوری اور خون کی کمی اور بے انتہا تکلیف کے باوجود بھی ڈاکٹر صاحب کا حوصلہ، صبر اور ہمت عجیب وغریب تھا جس کی وجہ سے بہت جلد افاقہ ہوا اور ہڈی ٹھیک جٹ گئی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر بشیر عالم کو مریض کو زیادہ ورزش کرنے سے روکنا پڑا۔ ایسی کمزوری اور تکلیف کی حالت میں بھی صدیقی نرسنگ ہوم کے جس کمرے میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم بھرتی تھے وہ دینی اور دعوتی کاموں کا مرکز بنا ہوا تھا اور بے انتہا لوگ استفادے کے لئے اور عیادت کے لئے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ کلینک کے تمام اسٹاف اور خود ڈاکٹر صدیقی صاحب بھی عقیدت مندی سے ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر رہا کرتے تھے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ جو شخص عیادت کے لئے حاضر ہوتا ڈاکٹر صدیقی صاحب کی طرف سے چائے وغیرہ لے کر نرسنگ ہوم کا ایک اسٹاف حاضر ہوتا۔ جب تک ڈاکٹر صاحب کلینک میں رہے ڈاکٹر صدیقی کی پریکٹس میں بڑی برکت ہوئی۔ یہاں تک کہ مکمل طور سے شفایاب ہوجانے کے باوجود ڈاکٹر صدیقی انہیں نرسنگ ہوم سے Discharge کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب نے مجھ سے کہا کہ کل کار لے کر آ ؤ کل میں یہاں سے گھر واپس جاؤں گا۔ چونکہ صدیقی نرسنگ ہوم میرے غریب خانے سے قریب ہی واقع ہے۔ میں روزانہ شام میں چہل قدمی کرتے ہوئے ملاقات کے لئے حاضر ہوتا تھا۔ اس دن کار لے کر پہنچا کہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کو گھر لے چلوں مگر ڈاکٹر صدیقی مجھے دیکھ کر آئے اور مریض سے عرض کیا کہ ''مجھ سے کیا غلطی ہوگئی کہ آپ یہاں سے جارہے ہیں''۔ چنانچہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم نے ان کی محبت اور خلوص کو دیکھتے ہوئے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ اس کے بعد کئی ہفتے اور نرسنگ ہوم میں رہے۔ انہیں بے انتہا خوشی تھی کہ اپنے گھر واپس جائیں لیکن خلوص ومحبت سے کی گئی پیش کش کو ٹھکرانا بھی مشکل تھا۔ علماء تو بہت ہیں مگر یہ خلوص ومحبت کہاں ؎

اے صبا اے پیک دور افتادگاں اشک ما برخاک پاک و رساں

ڈاکٹر احسن احمد، پٹنہ کے معروف سرجن، ڈاکٹر صاحبؒ کے خاص معالج اور معتقد، ایام جوانی میں ہی ڈاکٹر صاحبؒ کے گرویدہ ہوئے اور ان سے فکری اور تحریکی تعلق آخر تک قائم رہا۔ نالندہ میڈیکل کالج کے وائس پرنسپل رہے۔ امین ویل فیر ٹرسٹ کے روح رواں۔ (مقام: پٹنہ)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ کا ذہن و کردار

پروفیسر عبدالمغنی

۱۹۴۹ء میں جب میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے درجہ مولوی میں داخلہ کے لئے پٹنہ آیا تو ایک جوان رعنا کو نیلی شیروانی میں اکثر سائیکل پر گھومتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ضیاء الہدیٰ صاحب ہیں جو جنرل پوسٹ آفس میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں اور ماسٹر شمس الہدیٰ صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں، جو مدرسے میں ہم لوگوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ اس وقت مولانا سید احمد عروج قادری اور مولانا تقی الدین نعمانی بھی مدرسے میں علی الترتیب حدیث اور عربی ادب کے اساتذہ تھے۔ ان دونوں سے ضیاء الہدیٰ صاحب کے قریبی تعلقات تھے اور یہ لوگ اکثر شام میں مولانا تقی الدین نعمانی کے ''مکتبہ دین و دانش'' مکھنیاں کنواں روڈ میں بیٹھتے تھے، جہاں کچھ ہی دنوں پہلے اس وقت خدا بخش لائبریری کے کٹلاگر مولانا مسعود عالم ندوی بھی، جو بعد میں غیر منقسم ہندوستان کے ایک مشہور ترین عربی ادیب کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، بیٹھا کرتے تھے۔ یہ لوگ بہت باشعور اور صاحب علم اسلام پسند تھے، جو جماعت اسلامی کے دور اول کے رکن و کارکن بھی تھے۔

تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہوا کہ ضیاء الہدیٰ صاحب نے سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا اور اپنے آپ کو جماعت اسلامی کے کاموں اور خدمت دین کے لئے وقف کر دیا۔ یہی کام مولانا عروج قادری نے بھی کیا اور انھوں نے اس وقت جماعت کے مرکز رام پور جا کر ماہنامہ ''زندگی'' کی ادارت سنبھال لی، جب کہ ضیاء الہدیٰ صاحب پٹنہ ہی میں رہے اور انھوں نے سلطان گنج میں ایک مطب کھول کر ہومیوپیتھی کی پریکٹس باضابطہ شروع کر دی۔ اسی وقت سے وہ ڈاکٹر کہلانے لگے اور ان کے مطب کی عمارت ہی میں جماعت اسلامی پٹنہ کا دفتر قائم ہو گیا، جس کے وہ امیر مقرر کئے گئے۔

۱۹۵۳ء میں مدرسہ سے عالم اور ۶۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کے امتحانات پاس کر کے ۶۱ء میں میرا تقرر انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ ۵۴ء سے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگا تھا اور اس وقت تک ان کی لکھی ہوئی سب تحریریں پڑھ چکا تھا۔ میرے ذہن میں دین پسندی کا جذبہ گہرا ہو چکا تھا، جس کا اظہار میں بکثرت مضامین اور تقریروں میں کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب اس بات سے واقف تھے اور اس کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ میری ان کی ملاقاتیں اکثر و بیشتر ان کے مطب واقع سلطان گنج میں ہونے لگیں۔ ہم دونوں بعض اوقات دیر تک حالات حاضرہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے تبادلۂ خیال کرتے۔ اس کے بعد انیس الدین احمد صاحب مرحوم، سابق امیر جماعت اسلامی بہار، پٹنہ آ گئے اور سلطان گنج میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کا مطب پورے مکان کے ساتھ حلقہ بہار کی جماعت کا دفتر بن گیا، جب کہ پٹنہ کی جماعت کا دفتر، جس کے امیر ڈاکٹر صاحب تھے، رمنہ روڈ منتقل ہو گیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے وہاں اپنا مطب قائم نہیں کیا۔ وہ خود پہلے ہی سے عالم گنج میں رہتے تھے جہاں ۶۹ء میں میں بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ لال باغ سے منتقل ہو گیا۔

اس وقت عالم گنج کی جامع مسجد میں جمعہ اور عیدین کی امامت و خطابت مولانا حکیم علیم الدین بلخی کے ساتھ ساتھ بلکہ زیادہ تر ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کرتے تھے۔ میں مسجد کے قریب ہی وارثی گنج میں رہتا تھا اور نماز اسی مسجد میں پڑھتا تھا۔ اب دونوں مذکور بالا بزرگوں نے مل کر مجھ جیسے نوجوان کو امامت و خطابت کے لئے آگے بڑھا دیا۔ چناں چہ ۸۹ء تک تقریباً بیس سال بالعموم میں ہی

یہ فرض انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد میں پٹنہ سائنس کالج کے یونیورسٹی کوارٹر میں منتقل ہوگیا۔ عالم گنج کے بیس سالہ قیام کے دوران بھی میری ملاقات بات ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب سے وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔ اسی زمانے میں متحدہ سیرت کمیٹی قائم ہوئی تو اس کے زیر اہتمام عوامی جلسوں میں بارہا میں نے مولانا علیم الدین بلخی اور مولانا شاہ محمد اسمٰعیل مرحوم کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم کے ساتھ بے شمار تقریریں کیں۔ انیس الدین احمد صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب جماعت اسلامی بہار کے امیر مقرر ہوئے اور انہی کے دور امارت میں حلقہ بہار کی جماعت کا، لیڈی امام ہاؤس، پتھر کی مسجد میں، موجودہ دفتر میرے توسط سے جماعت نے خریدا۔ یہاں بھی جب کبھی میں جاتا اور ڈاکٹر صاحب موجود ہوتے تو اکثر ان کے ساتھ میری گفتگو مختلف مسائل پر ہوتی۔

اس وقت تک میرے اور ان کے درمیان ملک وملت کو پیش آنے والے واقعات اور اصولی ونظریاتی موضوعات پر اتفاق رائے ہوتا۔ لیکن سب سے پہلے فلسطین میں مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی اور عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر میرا ان کا اختلاف رائے منظر عام پر آیا۔ وہ جمال عبدالناصر کو امیر جہاد ہونے کے لائق تسلیم نہیں کرتے تھے، جب کہ مصر کے صدر ہونے کی وجہ سے عربوں کی طرف سے اسی کی قیادت میں جنگ لڑی جارہی تھی۔ میرا اختلاف تھا کہ جس طرح فاسق وفاجر بھی بعض حالات میں جماعت نماز کا امام ہوسکتا ہے، جمال عبدالناصر بھی امیر جہاد ہونے کے قابل ہے اور جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے اس کی سربراہی کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے موقف کو مسلمانوں میں عام طور پر کوئی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کے ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ عوام کی مخالفت کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے۔ ایک طرح سے انھوں نے اجتہاد کیا اور مسلمہ روایات سے اختلاف کی ہمت کی۔ یہ ان کا کوئی جذباتی ردعمل تھا یا فکری نقطہ نظر؟ اس سوال کا جواب بہت آسان نہیں۔ ان کا دینی مطالعہ اسلامی علوم پر محیط نہیں تھا۔ عربی میں تفسیر وحدیث اور فقہ سے ان کی براہ راست اور مکمل واقفیت کا حال مجھے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں اجتہاد کی اہلیت کا سوال نہیں اٹھتا۔

ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں ایک مبالغہ آمیز شدت پسندی تھی، لہٰذا ان کی ذاتی پسند وناپسند بہت سخت ہوتی تھی۔ اپنے شخصی تصورات کے تحت یہ سختی انھوں نے اپنے آپ پر بھی کی۔ ان کی طبیعت غلو کی طرف مائل تھی۔ انھوں نے ایثار وقربانی حد سے زیادہ کی۔ ان کا زہد وتقویٰ استثنائی انداز کا تھا۔ اس کا سب سے نمایاں مظاہرہ یہ ہوا کہ الکشن میں ووٹ دینے کے مسئلے پر وہ جماعت اسلامی سے علاحدہ ہوگئے اور ان کے آخری ایام غیر جماعتی کیفیت میں گزرے۔ ذہن وکردار کا یہ نمونہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ جماعت کی شوریٰ نے ان کی موجودگی میں کل ہند سطح پر ارکان کو ووٹ کی کھلی اجازت دی۔ اس اجتماعی فیصلے کو اس میں شرکت کے باوجود انہوں نے تسلیم نہیں کیا اور صرف اپنے انفرادی خیال کی بنیاد پر جماعت کی رکنیت تک سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح جس دینی تنظیم کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی اور جس کی رکنیت کو ایک مدت تک نجات کے لئے ضروری سمجھتے تھے صرف اپنے ذاتی خیال کی بنا پر وہ اس سے بالکل الگ ہوگئے۔ اس سلسلے میں ان کے ساتھ میرا قطعی اختلاف رائے لوگوں کو معلوم ہے اور سب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب ہی اس کو محسوس کرتے تھے بلکہ ایک روایت کے مطابق الکشن میں جماعت کی طرف سے ووٹ کی اجازت کے لئے مجھ کو بھی ذمے دار سمجھتے تھے، حالاں کہ جماعت سے میرا کوئی تنظیمی تعلق کبھی نہیں رہا اور میں صرف ایک اسلام پسند کی حیثیت سے جماعت کے رسالوں میں مضامین لکھتا اور اس کے اکابر نیز عام رفقاء سے گفتگو کرتا رہا۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب ایک خوش مزاج اور خوش خلق انسان تھے۔ میرے یا دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات میں کوئی تلخی شاید کبھی نہیں آئی۔ اگرچہ ۸۹ء کے بعد جب میرا قیام عالم گنج کی بجائے پٹنہ سائنس کالج کے یونیورسٹی کوارٹر میں ہوگیا میری

ان کی ملاقات بہت کم ہوئی، نہ کبھی میں ان کے گھر عالم گنج جاسکا نہ کبھی وہ میرے یہاں یونیورسٹی کوارٹر میں آئے، جب کہ مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب، مولانا علیم الدین بلخی، جناب عبدالفتاح اور جناب حسنین سید جیسے ہم خیال بزرگان گاہے گاہے میرے غریب خانے پر آتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب ہمدرد اور غم خوار بھی تھے۔ وہ خاص کر غریبوں کی مدد اور نوجوانوں کی ہدایت و تربیت کے لئے فکر مند رہتے تھے۔ ارکان جماعت کی شروع میں وہ کڑی نگرانی کیا کرتے تھے اور انھیں جماعتی آداب سکھاتے تھے۔ اس میں محنت و مشقت بھی ہوتی تھی۔ یہ ایک طرح کا ریاض تھا، جس میں بعض اوقات وہ حد سے بڑھ جاتے تھے۔

موصوف کی تعلیم بہت اعلیٰ نہیں ہوئی تھی، مگر اپنے مطالعے سے وہ زندگی اور کائنات کے حقائق کو وسعت اور گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مختلف موضوعات پر اظہار خیال کے لئے انہوں نے مضامین بھی لکھے۔ جو کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئے۔ طب سے انہیں جو دلچسپی تھی اس کے سلسلے میں وہ ہومیوپیتھی کے علاوہ یونانی تجربات بھی کرتے رہتے تھے۔ نسخے کے ساتھ وہ رجوع کرنے والے مریضوں کو دوائیں بھی بنا کر دیا کرتے تھے۔ نوجوانوں کے معاشی فائدے کے لئے بعض اوقات انہوں نے چھوٹے موٹے تکنیکی ادارے بھی قائم کئے، جو زیادہ دنوں نہیں چل سکے۔

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کے ذہن وکردار کا تجزیہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان کے اندر بصیرت مندی اور شدت پسندی کا امتزاج تھا۔ وہ بہت سمجھدار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت بے لچک بھی تھے۔ بہ ظاہر وہ نرم تھے مگر بہ باطن سخت۔ وہ اپنے خیالات میں پختگی سے بڑھ کر ایک قسم کی کرختگی اختیار کئے ہوئے تھے۔ ان کی انفرادیت تنہائی تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی عام وضع داری بھی ان کی انتہا پسندی میں حائل نہیں تھی۔ میرا احساس ہے کہ وہ توازن کے قائل نہیں تھے اور دین میں غلو کرتے تھے، جس کی تکلیف وہ خود اٹھاتے تھے اور دوسروں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔

بہر حال، صبر و تحمل ڈاکٹر صاحب کا شیوہ تھا، جب کہ بسا اوقات انہیں سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی ذاتی زندگی کے دو المیے کہے جاسکتے ہیں۔ وہ لاولد تھے اور ان کی اہلیہ دائم المریض تھیں جن کی تیمارداری وہ تاعمر کرتے رہے، یہاں تک کہ آخری دنوں میں وہ داغ مفارقت دے گئیں۔ ایک بچی کی انھوں نے بہت محبت سے پرورش کی، مگر وہ سیانی ہو کر ایک جاں کاہ حادثے کی نذر ہوگئی۔ معاشی اعتبار سے ڈاکٹر صاحب خوش حال نہیں تھے، مگر وہ کبھی پریشان حال نہیں دیکھے گئے۔ سادگی، قناعت اور توکل ان کے معمولات تھے۔ ہر ابتلا پر وہ آخر تک صابر و شاکر رہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور انہیں اپنے دامن رحمت میں جگہ دے۔

پروفیسر عبدالمغنی، سابق وائس چانسلر متھلا یونیورسیٹی، دربھنگہ، انگریزی کے پروفیسر اور مصنف، اردو کے صاحب طرز ادیب اور ناقد، انجمن ترقی اردو بہار کے صدر۔ (قیام: پٹنہ)

جناب ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم

پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی شخصیت اتنی ہمہ گیر اور جملہ خوبیوں اور صلاحیتوں سے مرصع ہوتی ہے کہ وہ اپنے کارناموں سے ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جنہیں آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب ایک شخص نہیں بلکہ ایک تحریک اور انجمن تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی رضائے الٰہی کے حصول میں لگادی۔ دین حق کی اشاعت وترقی کیلئے وہ ہمہ تن سرگرداں اور مستعد رہے۔ ان کی سادگی، شرافت، نیکی، خوش اخلاقی، بلندنظری اور حق گوئی سے ہر وہ شخص واقف ہے جو ان سے ایک بار بھی مل چکا ہو۔ گورا رنگ، مسکراتا ہوا نورانی چہرہ، نہ ذرا غرور وتکبر، نہ کسی کی زبان وعمل سے دل آزاری، ایک مخلص، ہمدرد اور قابل بھروسہ انسان۔ ان کی تعلیم کچھ بہت زیادہ نہ تھی، شاید میٹرک پاس تھے لیکن اردو، انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں سے بڑی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں ٹیلی گرافسٹ کا کام کرتے تھے۔ ضیاء الہدیٰ صاحب کی پیدائش ۱۹۱۸ء میں محلہ مرار پور بہار شریف میں ایک سادات خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد اور بھائی ماسٹر سید شمش الہدیٰ صاحب بھی بڑے مذہبی باعمل اور متقی پرہیزگار لوگ تھے۔ سید شمش الہدیٰ صاحب مدرسہ شمس الہدیٰ میں مدرس تھے اور اپنی علمی صلاحیتوں اور زہد وتقویٰ کیلئے مشہور تھے۔ دین سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ایک بار مدرسہ کے پرنسپل سے کسی اعتقادی معاملہ میں شدید اختلاف ہوگیا اور انہوں نے مدرسہ کی سرکاری نوکری کو خیر باد کہا۔ جان جائے پر ایمان نہ جائے کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

ضیاء الہدیٰ صاحب بڑے ہی متقی، سادگی پسند اور اشاعت دین کے جذبہ سے سرشار تھے۔ نوکری کے زمانہ میں بھی وہ زیادہ سے زیادہ وقت جماعت کے کاموں میں لگاتے۔ رفقاء سے ملنا، دعوت وتبلیغ کا کام کرنا، قرآن شریف کی تفسیریں بیان کرنا، ہمدردوں کی تربیت وتزکیۂ نفس پر خصوصی توجہ دینا، جماعت کے ہفتہ وار اور سالانہ جلسوں میں شریک ہونا دوست واحباب کی دلجوئی اور حاجت روائی کرنا، نمازوں اور دوسرے دینی احکام کی بڑے اہتمام وانہاک سے پابندی کرنا اور دین کا شعور اجاگر کرنے میں ہمہ تن سرگرداں رہنا ان کا وظیفہ زندگی تھا۔ ان کی سادگی، شرافت، صداقت، امانت، دیانت، خداترسی، اللہ پر کامل اعتماد، دنیا سے بے نیازی، تبلیغ دین کے لئے غایت درجہ کا اخلاص اور جہد پیہم ایسی روشنی تھی جس سے سینکڑوں افراد نے اکتساب فیض کیا۔ نہایت عسرت وتنگ حالی کے باوجود رشتہ داروں اور اہل خاندان کے حقوق ادا کرنا، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کردینا اپنی ایمان افروز باتوں سے غم زدوں کے دل کا بوجھ ہلکا کردینا، کسی کی ملازمت اور کسی کی شادی کے لئے فکرمند رہنا اور ان سب کے ساتھ دین کی سربلندی اور دین کے غلبہ کے لئے انتھک جدوجہد کرتے رہنا ہی ان کے دن رات کے مشاغل تھے۔ اور ان سارے کاموں کو انجام دیتے ہوئے ان کی پیشانی پر کبھی شکن نظر نہیں آتی۔ ایسا لگتا کہ سارے کاموں میں انہیں خاص لذت ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے ایک مومن کی جو صفتیں بتائیں ہیں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں وہ شفاف آئینے کی طرح نظر آتی تھیں:

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم، پاک دل و پاکباز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز

ان کا ذکر آتے ہی بے شمار باتیں اور واقعات جوان کی شخصیت اور زندگی سے متعلق ہیں ایک تصویر کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ ان سے اور ان کے اہل خاندان سے میرا میرے گھر والوں کے بہت دیرینہ اور قریبی تعلقات رہے ہیں۔ تقریباً نصف صدی کے طویل عرصہ پر محیط گہرے تعلق کی ناقابل فراموش یادیں آج بھی میرے ذہن پر مرتسم ہیں۔

میرے سینئر ساتھی جناب عبدالرب صاحب مسلم اسکول پٹنہ کی گیارہویں جماعت یعنی میٹرک کے طالب علم تھے اور میں دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ ان سے برابر ملاقاتیں ہوتیں رہتی تھیں۔ بہت ہی نیک، ملنسار، شریف اور سنجیدہ انسان تھے۔ پڑھنے لکھنے میں بھی بہت اچھے تھے۔ کلاس میں اکثر اول آتے تھے۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ابھی ان کا رزلٹ بھی نہیں نکلا تھا کہ ایک دن میرے پاس آئے یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے، اور حسب معمول بڑے تپاک سے ملے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ان کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی پیدا ہوگئی اور انہوں نے بڑے اچھے انداز میں دعوت اسلامی کو پیش کیا اور ایک چھوٹا سا کتابچہ 'نشان راہ' جو مولانا مودودی صاحب کی تصنیف تھی، ہمیں دے کر چلے گئے۔ ان کی باتوں کا مجھ پر کافی اثر تھا۔ ہم نے اس کتاب کو تھوڑا تھوڑا کر کے کئی دنوں میں ختم کیا۔ ایسا لگا کہ دل ودماغ میں روشنی پھیل گئی۔ میری دلچسپی بڑھتی گئی اور عبدالرب کبھی پندرہ دن پر اور کبھی ایک مہینہ پر دوسری اور تیسری کتاب دیتے رہے جیسے خطبات، دینیات وغیرہ۔ ان کتابوں کے مطالعہ نے میرے خیالات میں بڑی تبدیلیاں پیدا کردیں۔ پھر اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا۔ نومبر میں ہملوگ میٹرک امتحان کیلئے Sent-up ہوئے اور بڑے پیمانے پر تشدد اور ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ بڑی مشکلوں سے میٹرک کا امتحان دیا۔ لیکن ان چھ آٹھ مہینوں میں عبدالرب صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع سا ہوگیا اور ان کی کتابیں بھی بہت کم ہی پڑھ سکا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد جب حالات سازگار ہوئے تو میں اپنے دوست عبدالرب کے ساتھ دفتر جماعت اسلامی میں گیا۔ اس وقت غازی عبدالجبار صاحب امیر جماعت تھے۔ کئی مہینوں کے بعد جب میں دوبارہ دفتر گیا تو اس وقت ضیاء الہدیٰ صاحب امیر تھے اور یہ محلہ سلطان گنج میں شفیق الرحمٰن کے مکان کی بالائی منزل میں واقع تھا۔

میری ملاقات جب ان سے ہوئی تو میں آئی اے کا طالب علم اور وہ پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں سرکاری نوکری پر فائز تھے اور عدالت گنج میں سرکاری کواٹر میں رہا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے والد محترم، شریک حیات اور ایک ہمشیرہ رہا کرتی تھیں۔ ہم لوگ محلہ گولکھپور، انجینئرنگ کالج کے پاس رہا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کے تعلقات بڑھتے گئے اور گھر کے لوگ ان کے یہاں کبھی کبھی جایا کرتے اور ان کے گھر کے لوگ بھی آیا کرتے تھے۔ میری ملاقات شروع میں جماعت اسلامی کے دفتر سلطان گنج میں جو جناب شفیق صاحب مرحوم کے مکان میں واقع تھا، ہفتہ میں ایک بار ضرور ہوا کرتی۔ لیکن وہ وقت نکال کر عدالت گنج سے ہفتہ میں ایک دو بار ہم لوگوں کے گھر آتے۔ میرے بھائیوں اور خاندان کے سب لوگوں سے ارتباط رکھتے۔ ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے۔ رفقاء ہفتہ بھر کی رپورٹیں پیش کیا کرتے۔ تبلیغ کے کاموں کیلئے مشورے ہوتے اور نوجوان رفقاء تقریری مشقیں کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بڑی خوش اسلوبی، خلوص اور لگن سے ہفتہ وار ملاقاتوں میں شریک ہوتے۔ رفقاء سے بڑی گرمجوشی اور محبت سے ملا کرتے۔ جو ان سے ایک بار مل لیتا اور ان کی باتیں سن لیتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رفقاء پٹنہ شہر کے محلوں میں مختلف علاقوں کے عوام میں جماعت اسلامی کا لٹریچر پہونچاتے، لوگوں سے گفتگو کرتے اور انہیں دعوت اسلامی سے روشناس کرتے۔ پھر ماہانہ جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔ جہاں رفقاء کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے۔ درس قرآن ہوا کرتا، تفسیر بیان کی جاتی اور تقریریں ہوتیں۔ بہار کے دوسرے شہروں اور علاقوں میں بھی اسی طرح دعوت تبلیغ کا کام ہوا کرتا تھا۔ ہفتہ وار جلسوں میں ضیاء الہدیٰ صاحب، مولانا تقی الدین نعمانی صاحب، مولانا عروج قادری صاحب، مولانا عبدالباری صاحب، حافظ صاحب محمد وسیم اللہ صاحب، شفیق صاحب اور شبیر صاحب رفقاء تھے اور نوجوانوں

میں خاکسار، معز منظر صاحب، عبدالوہاب صاحب، حسنین سید صاحب، نسیم احمد صاحب اور دوسرے رفقاء حاضر ہوا کرتے اور انتہائی خلوص سے ملا کرتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ جماعت کے باقاعدہ ارکان تھے۔ باقی رفقاء اور ہم جیسے صرف ہمدرد کہے جاتے تھے۔ ان کے تعلقات گہرے اور قریبی ہوتے تھے۔ ہفتہ میں کم از کم ایک بار وہ میرے یہاں آتے اور ہم بھی ان کے کواٹر میں جایا کرتے تھے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے کہ ہم لوگ رشتہ دار ہیں، ہر اچھے برے وقت میں وہ کام آتے اور ہمیشہ خوش اور بشاش نظر آتے۔ کبھی اپنی ذاتی پریشانیوں کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ ان کے پاس بے شمار مسائل تھے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ حکومت نے جماعت اسلامی کے ارکان پر پابندیاں لگانی شروع کر دیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ سرکاری نوکری میں رہنا چاہتے ہیں یا جماعت سے وابستگی رکھیں گے۔ انہوں نے بلا تاخیر سرکاری نوکری سے استعفاد ے دیا، کواٹر چھوڑ دیا اور اپنے خاندان کے ساتھ عالم گنج محلّہ کی ایک تنگ گلی میں ایک نہایت چھوٹے اور جھونپڑی نما مکان میں رہنے لگے۔ یہ ایک کھپڑ پوش مکان تھا۔ باہر ایک چھوٹی سے کوٹھری جس میں ایک چوکی تھی اور دو کرسیاں۔ ضیاء الہدیٰ صاحب اسی چوکی پر سوتے تھے۔ ایک دیوار میں چھوٹی سی الماری تھی جس میں کچھ کتابیں اور دوائیں رہا کرتیں۔ نوکری سے دستبردار ہونے کے بعد انہوں نے ہومیوپیتھی ڈاکٹری کی پریکٹس شروع کی اور اس کے بعد سے لوگ انہیں محبت اور احترام سے ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کہنے لگے۔ کچھ یونانی دواؤں کے نسخے ان کے پاس تھے اور کچھ لوگوں کا علاج ان دواؤں سے بھی کرتے۔ یہ تھی ان کے گذر اوقات کی حالت۔ لیکن چہرے پر وہی مسکراہٹ ذرہ برابر پریشانی کا اظہار نہیں۔ جماعت کے کاموں کے لئے زیادہ تندہی اور زیادہ وقت دیتے تھوڑا وقت اپنی ڈاکٹری اور حکیمی کے لئے دیتے۔ قرآن کی آیت کے وہ بدرجہ اتم مصداق تھے کہ اہل ایمان کو غم اور ملال نہیں ہوتا۔

ان کی گفتگو بڑی سنجیدہ، متوازن، زود اثر اور منطقی ہوا کرتی تھی اور سننے والے پر زبردست اثر ڈالتی تہذیب اور خوش مزاجی کی وجہ سے بات کرنے والے پر لازوال اثرات مرتب ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں مولانا عبدالخبیر صاحب، مولانا عون احمد صاحب (پھلواری شریف) اور مولانا منت اللہ رحمانی صاحب علماء تھے ان کی الگ خوبیاں تھیں اور سبھی بڑی معتبر ہستیاں تھیں۔ لیکن جو سادگی، شیرینی اور پزیرائی ضیاء الہدیٰ صاحب کی شخصیت میں تھی وہ بہت ہی غیر معمولی تھی۔ جماعت کے جلسوں میں ان کی تقریریں ہوا کرتیں تو لوگ ہمہ تن گوش ہو جایا کرتے۔ بہت سالوں تک انہوں نے انجمن اسلامیہ ہال (پٹنہ) میں رمضان کے مہینہ میں جمعہ کی نماز پڑھائی۔ ان کا خطبہ سننے کیلئے پٹنہ شہر کے دور دراز علاقوں سے لوگ آتے اور بڑی گرویدگی سے خطبہ سنتے۔ وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسلمانوں کو موجودہ زمانہ کے مطابق زندگی گذارنے اور اسلام کی سربلندی کیلئے تندہی سے کام کرتے رہنے کی تلقین کرتے۔ نماز کے بعد لوگوں کا تانتا بندھ جاتا، ان سے مصافحہ کرنے کیلئے اور ضیاء الہدیٰ صاحب اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ہشاش بشاس اور سنجیدہ انداز میں سب سے ملا کرتے۔ امت کی انتہائی مایوس کن حالات میں بھی، روشن مستقبل کی بشارت دیتے اور بڑے پرامید انداز میں فرماتے کہ پندرہویں صدی ہجری اسلام اور مسلمانوں کا عروج لے کر آئی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم لوگ عقیدے اور اعمال کو درست کرلیں اور دین حق کو پھیلائیں۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب جماعت اسلامی سے انہوں نے علیحدگی اختیار کرلی۔ کبھی کھل کر تو نہیں بتایا لیکن اتنا معلوم ہوسکا کہ انہیں اکابرین کی نئی پالیسیوں سے اختلاف ہوگیا تھا۔ اس کے بعد بھی ان کا تبلیغی اور تعلیمی سفر جاری رہا۔ وہ انتہائی صبر وضبط کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور رضائے الٰہی کیلئے اپنی جدو جہد جاری رکھی۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی

پچھلے چند سالوں سے ان کی صحت کمزور ہوتی جارہی تھی۔کئی طرح کی بیماریاں انہیں لاحق ہوگئی تھیں۔ان کی شریک حیات کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک بچی جس کی انہوں نے پرورش کی تھی وہ بھی عین عالم شباب میں اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ان کی چھوٹی بہن بھی داغ مفارقت دے گئی تھیں پھر بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔کبھی کسی سے اپنی ضرورت نہ کہی اور نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا۔وہ تن تنہا بڑے ہی صبر آزما دور سے گذرے لیکن وہی خندہ پیشانی ہنستا ہوا چہرہ اور تبلیغ کا ذہن۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے   وہ مرد درویش جسکو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

ادھر مجھ سے ان کی کم ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔کئی سال میں ہندوستان کے باہر رہا۔پھر کئی سالوں تک دو یونیورسٹیوں کی وائس چانسلری نے میری صحت پر بھی گہرا اثر ڈالا۔پھر جب ملاقات ہوئی میری اور میرے گھر کے ایک ایک فرد اور بھائیوں کی خیریت پوچھتے۔لیکن اس دور تنہائی اور امراض میں بھی ان کے ہمدردوں اور عقیدتمندوں اور دوستوں میں کوئی کمی نہ رہی۔جب بیمار ہوئے ڈاکٹر صدیقی نے اپنی کلینک میں انہیں رکھا۔ہر طرح سے ان کی دیکھ بھال کی۔شہر کے مختلف علاقوں سے مرد، بچے یہاں تک کہ عورتیں بھی ان کی خدمت گذاری اور دلجوئی میں لگی رہیں۔

بالآخر جون ۱۹۹۸ء بروز جمعہ میرے بزرگ متقی دوست، پیکر صدق ووفا اور مرد مومن ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔بدقسمتی یہ کہ ان کی بیماری کے زمانہ میں تو میں انہیں دیکھنے جایا کرتا لیکن جب انہوں نے رحلت فرمایا تو میں پٹنہ میں موجود نہیں تھا۔میرے لڑکے عزیزم ڈاکٹر فیصل احمد تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے تھے۔دو دنوں بعد جب میں آیا تو ان کے قبرستان پر فاتحہ پڑھنے کی غرض سے عالم گنج محلّہ کے شمالی قبرستان میں حاضر ہوا اور افسردہ دل اور نمناک آنکھوں کے ساتھ دعائے مغفرت کی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء کی کہ خدا اس عظیم، نیک دل، فرشتہ صفت داعی حق اور متقی دوست کے چھوٹے بڑے گناہوں کو معاف فرمائے انہیں عذاب قبر اور عذاب جہنم سے دور رکھے اور جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ ترین مقام عطاء فرمائے۔آمین

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو تیرا   نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے   سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان کی موت سے ان کے دوستوں، احباب اور عقیدتمندوں کو گہرا صدمہ وغم پہونچا ہے۔اسکے علاوہ تحریک اسلامی کو عمومی طور پر ہندوستان میں اور خصوصی طور پر بہار میں ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔اللہ اپنے رحم وکرم سے پھر کسی دانائے راز اور حکیم ملت کو امت کی رہنمائی کیلئے بھیج دے تاکہ ایک بار پھر لوگوں میں خیر امت بن کر دعوت وتبلیغ کا کام مستعدی اور تندہی سے کرنے کا جذبہ بیدار ہو جائے۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید   نسیم از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے   دگر دانائے راز آید کہ ناید

پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب، سابق وائس چانسلر، باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر، یونیورسیٹی، مظفرپور اور مگدھ یونیورسیٹی، گیا،۔زمانہ طالب علمی سے ڈاکٹر صاحبؒ سے ذاتی قربت اور ان کے حلقۂ علم سے وابستگی۔(قیام: پٹنہ)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم

خواجہ افضل امام

زبان پہ بارخدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

حضرت ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ اسم بامسمیٰ تھے۔ میری ملاقات ان سے اس وقت سے تھی جبکہ جماعت اسلامی کا دفتر رمنہ روڈ سے اٹھ کر سعید منزل، گھگا گھاٹ روڈ سلطان گنج میں منتقل ہوا۔ اسی محلّہ میں پیر علی کی مسجد بکسریہ ٹولہ میں ان کی پانچوں وقت کی جماعت ہوتی تھی۔ اور یہیں سے میری ملاقات کی ابتداء ہے۔

جماعت اسلامی کے تمام ارکان بلاناغہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھتے تھے جس کی امامت جناب عبدالودود صاحب مرحوم یا شہاب الدین صاحب کیا کرتے تھے۔ خود ضیاء الہدیٰ صاحب نے کبھی امامت نہیں کی۔ جب کوئی آدمی ایسا نہ رہتا تھا تو ضیاء الہدیٰ صاحب ہمیں آگے بڑھا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ رمضان المبارک کے موقع پر بغل کے ہوسٹل کے لڑکے تراویح میں شریک ہوتے تھے مگر فجر میں نہیں آتے تھے۔ دوسرے روز ان لڑکوں سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے دریافت کیا۔ ان لڑکوں نے کہا کہ یہ ہوسٹل جس میں ہم لوگ رہتے ہیں غیر مسلموں کا ہے اور وہ لوگ اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں کہ سحری کے بعد اتنا سویرے ہوسٹل کا پھاٹک کھولا جائے چنانچہ نماز فجر میں اسی وجہ سے ہم لوگ شریک نہیں ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہماری طرف مخاطب ہوئے۔ کہا، یہ مسجد سے ملحق جو افتادہ زمین ہے اس میں ہوسٹل بنوا دیجئے۔ ہم نے کہا، آپ دعا کیجئے ہم ہاتھ لگاتے ہیں۔ چنانچہ ہم پھلواری شریف گئے اور مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب مرحوم سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا، چنانچہ انہوں نے تیس ہزار روپے مسجد تعمیر فنڈ سے ہمیں دیا اور اس افتادہ زمین میں ہوسٹل کی بنیاد پڑ گئی۔ سنگ بنیاد مولانا عبدالسمیع صاحب نے رکھا، اس طرح لوگوں نے تعاون کیا اور عظیم الشان مسجد بن گئی۔ اگرچہ اس وقت تک جماعت اسلامی کا دفتر منتقل ہو کر لیڈی امام ہاؤس پتھر کی مسجد میں چلا گیا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے گذارش کی کہ جس مسجد کی تعمیر کے آپ محرک تھے وہ مکمل ہو چکی ہے، اب آپ اس میں ایک روز خود امامت فرما دیں۔ چنانچہ وہ وقت مقرر کر کے تشریف لائے اور امامت فرمائی۔

ڈاکٹر صاحب عام طور پر نماز کی امامت نہیں کرتے تھے۔ اور ہم نے کبھی بھی ان کو امامت کرتے نہیں دیکھا الا رمضان المبارک کے مہینہ میں جمعہ کے روز انجمن اسلامیہ ہال میں جمعہ کی امامت فرماتے تھے۔ خطبہ میں ایسی جاذبیت تھی کہ لوگ دانا پور اور پھلواری شریف سے آتے تھے۔

یہ اپنے لباس، قمیص، پائجامہ اور سائیکل سے لوگوں کو اتنا متاثر کرتے تھے کہ لوگ ان کے سامنے بہت مؤدب ہو جاتے تھے، ہم نے کبھی ان کو بگڑتے یا ڈانٹتے کسی کو نہیں دیکھا، اگر کسی کو تلقین کرنا ہوتا تو وہ کہتے کہ نہیں معلوم لوگ ایسا کیوں کرتے۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے کہ اس جملہ کا مخاطب کون ہے۔ ایک مرتبہ رمنہ روڈ کے دفتر میں ایک میٹنگ تھی جس میں راقم الحروف بھی مدعو تھا۔ ہم دور بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنے قریب بلایا اور کہا کہ آپ نقص سماعت کے مریض ہیں ہمارے نزدیک بیٹھئے۔ نجی گفتگو میں ایک مرتبہ انہوں نے بتایا کہ ہم پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے، کسی متعصب آفیسر نے انہیں کچھ سخت سست سنایا، انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ چلے آئے، ساتھیوں نے مجبور کیا کہ اس سلسلہ میں P.M.G. کو رپورٹ کرو، آپ نے اپنے

ساتھیوں کوکہاان اللہ مع الصابرین ۔چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر ہی وہ آفیسر اپنی کسی غلطی کی وجہ سے سسپنڈ ہو گیا۔دوسرے روز وہ آفیسر ان کے پاس آیااوران سے معافی مانگی اور کہا،آپ پر ہم نے ظلم کیا تھا جس کی ہمیں یہ سزا ملی ہے۔آپ بڑی فراخدلی کے ساتھ اس سے گلے ملےاور کہا کہ میں نے قصور معاف کر دیا۔

جب حکومت نے یہ تجویز پیش کی کہ یا تو حکومت کی نوکری کرو یا جماعت اسلامی کے ممبر رہو آپ نے نوکری سے استعفیٰ دینا قبول کیا مگر جماعت سے بےتعلقی نہیں کی اور امیر جماعت رہے بقول مولانا حسنین سید صاحب (دربھنگہ) ڈاکٹر ضیاالھدیٰ صاحب جماعت سے کوئی وظیفہ نہیں لیتے تھے اور ہومیو پیتھک پریکٹس سے اپنی کفالت کرتے تھے۔اپنی تمام نیکیوں کو فکسڈ ڈپوزٹ میں جمع کر دیا تھا تاکہ مرنے کے بعد اس سے استفادہ کریں،وہ اسی ہومیو پیتھک کی پریکٹس سے حج میں بھی تشریف لے گئے۔

اکثر ہماری آمد ورفت ان کے گھر پر ہوتی تھی۔چھوٹا سا کمرہ ایک چوکی اور ایک ٹیبل،کرسی جس میں سما سکتی تھی۔گرمی کے زمانہ میں ہاتھ میں پنکھا اور اپنے ہر ملنے والے سے اسی عالم میں ملتے تھے۔ایک مرتبہ ہماری موجودگی میں ڈاکٹر احسان احمد صاحب آئے اور اسی کوٹھری میں کرسی پر بیٹھ گئے ڈاکٹر صاحب نے ان کی طرف ایک پنکھا بڑھا دیا۔ڈاکٹر صاحب کو کوئی اولاد نہیں تھی۔رشتہ دار کی کسی لڑکی کو متبنّیٰ لیا تھا وہ بھی کسی سڑک حادثہ میں شہید ہو گئی،اللہ نے انہیں ہر طرح آزمایا اور وہ ہر حال میں صابر رہے۔

انجمن اسلامیہ ہال میں جمعہ کی امامت رمضان المبارک کے مہینہ میں وہ ہمیشہ سے کرتے آئے تھے،ایک جمعہ میں وہ وضو کر رہے تھے کہ گر گئے اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی،ڈاکٹر صدیقی باقر گنج کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنی کلنک میں لے آئے جہاں ایک سال ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ ڈاکٹر صدیقی کے مہمان رہے۔جب تندرست ہو گئے تو صدیقی صاحب سے اصرار کر کے جانے کی اجازت مانگی اور پھر اپنے کلبۂ احزاں میں چلے آئے۔عالم گنج مسجد میں ایک کرسی رکھ دی گئی تھی جس پر بیٹھ کر بلاناغہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔

ان کی دیانتداری کی مثال بتاتے ہیں کہ ایک انجینئر صاحب جو پی ڈبلو ڈی سے رٹائر کر کے ایک عظیم الشان مکان کنکر باغ میں بنا کر رہتے تھے،ڈاکٹر صاحب سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے التجا کی کہ دہلی کے کسی ادارہ نے کسی مسلمان لڑکے کو جو انجینئرنگ کا طالب علم بشرط غربت پڑھ نہ سکتا ہو اسے دو ہزار روپے وظیفہ ماہانہ دیا جائے گا بشرطیکہ کسی مسلم ادارہ سے اپنی کم مایئگی کی سرٹیفکیٹ پیش کرے،ڈاکٹر صاحب نے انجینئر صاحب سے پوچھا کہ کیا واقعی آپ کا لڑکا اس ادارہ سے تعاون کا مستحق ہے اور حلفیہ بیان دے سکتے ہیں کہ آپ محتاج ہیں،انجینئر صاحب بہت سٹپٹائے اور شرمندہ ہو کر ڈاکٹر صاحب کے پاس سے اٹھ گئے۔

صوبہ تمل ناڈو یا کہیں اور کسی بستی کی تمام ہریجن آبادی مسلمان ہو گئی اور ان کی تعلیم کے لئے جماعت اسلامی نے پانچ پانچ سو کی ٹوکن اپنے تمام دفتروں میں تقسیم کرائی ہر ٹوکن کی قیمت پانچ سو روپیہ،چنانچہ ایک ٹوکن پٹنہ میں بھی آیا،ڈاکٹر صاحب نے مسجد میں ہم سے کہا کہ میرے ساتھ دفتر چلئے،چنانچہ ہم ان کے ساتھ دفتر آئے اور انہوں نے پھر واقعہ دہرایا۔اور پانچ سو کی ایک ٹوکن ہمیں دے دیا اور کہا پانچ آدمی آپ مہیا کیجئے جو ایک ٹوکن لے لے۔چنانچہ ہم نے اپنے احباب اور عزیزوں میں سے پانچ آدمیوں کا نام لکھوایا اور ہم نے ان سے کہا کہ جا کر ٹوکن لے لو۔

ڈاکٹر صاحب خلوص ومحبت کے پیکر تھے،جب ملاقات ہوتی تو دعا دیتے کہ اللہ خوش رکھے۔اللہ انہیں جزائے خیر دے اور اپنی جوار رحمت میں جگہہ عنایت فرمائے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

خواجہ افضل امام صاحب،شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسیٹی کے پروفیسر،محقق،ڈاکٹر صاحبؒ کے ہم عصر اور رفاقت کا رشتہ۔ (قیام:پٹنہ)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ

فقر غیور کا ایک مثالی کردار

طیب عثمانی ندوی

مجھے یاد نہیں، میں نے جناب ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ کو کب اور کیسے دیکھا؟ اپنے دور طالب علمی میں، جب میں تحریک اسلامی سے قریب ہوا اور ندوہ سے چھٹیوں میں گھر آنا ہوتا تو کبھی کبھی پٹنہ بھی جانا ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کا نام اکثر سنتا۔ پھر تحریک اسلامی کی قربت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور ان کے درس قرآن کی شہرت سے واقفیت بڑھتی گئی۔ میں نے ان کو جب بھی دیکھا ایک طرح پایا، قمیص، چوڑے مہری کا پاجامہ، کشتی نما ٹوپی، سادگی کا پیکر، چہرہ روشن، پاک دل و پاکباز، یہ تھا ڈاکٹر صاحب کا سراپا۔ ان کی شخصیت کی ایک اور شناخت ان کی سائیکل بھی تھی۔ جس پر وہ اپنے پاجامہ کے ایک پائنچہ میں کلپ لگائے عالم گنج سے انجمن اسلامیہ تک اور جانے کہاں کہاں رواں دواں ہوتے۔ مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ ابتدا میں اکثر ان کو اسی طرح سائکل ہی پر دیکھا تھا، یہ انداز بے نیازانہ اور طرز قلندرانہ میرے لئے باعث کشش ہوتا۔ پھر تحریکی دلچسپی کے باعث اکثر ان سے ملنے، باتیں کرنے، ان کے درس قرآن میں شریک ہونے اور تقریروں کو سننے کا موقع ملا۔ جیسے جیسے قربت بڑھتی گئی ان کی محبت وعقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ خصوصاً ان کے درس قرآن میں جی لگتا، قرآنی نکتے، سائنسی انداز بیان اور حالات حاضرہ پر ان کا انطباق، ان کے درس قرآن کی خصوصیت تھی۔ جس نے ہر مکتب فکر میں ان کی مقبولیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ خصوصاً طلبا اور نوجوانوں میں وہ بیحد مقبول تھے۔ ان کی سیرت کے موضوع پر تقاریر اور انجمن اسلامیہ کے جمعہ کے خطبے میں تو دور دور سے لوگ سننے کے لئے آتے۔ وہ جس ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال تھے، اس کا اثر نئی نسل پر بیحد پڑتا، ان کے ذہن وفکر میں جلا پیدا ہوتا، تشکیک وتذبذب کے اندھیرے دور ہوتے اور ان کے اندر ایمان ویقین کی قندیلیں روشن ہو جاتیں۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کی فقر ودرویشی تھی، جو موجودہ معاشرہ اور اپنے ہم عصروں میں انہیں بہت ممتاز کر دیتی تھی۔ یہ فقر، ''فقر خود اختیاری'' تھا۔ حکومت کی اعلیٰ ملازمت اور دنیاوی ترقی کے امکانات کو چھوڑ کر ہومیو پیتھ ڈاکٹری کے پیشہ کو اختیار کیا تھا، جس سے انہیں بڑی مناسبت تھی۔ جو ان کی بقدر کفاف زندگی کا ذریعہ تھا، صاف ستھری اور سادہ رہن سہن ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ تحریک اسلامی کے کاموں میں وہ ہمہ وقت مشغول رہتے، پھر امیر حلقہ بھی ہوئے لیکن جماعت کے ضابطہ کے مطابق بقدر کفاف، کوئی رقم اپنی ذات کے لئے قبول نہیں کی۔ ڈاکٹر صاحب کے اندر تحقیق وجستجو اور نئی نئی ایجادات کا شوق اور فطری جذبہ تھا، نئی نئی دوائیں بنانے کے تجربے کرتے، عطر سازی کا خاص ذوق اور مشغلہ بھی تھا۔ طبابت وتجارت بھی بس اتنا ہی کرتے، جو ان کے لئے بقدر کفاف ہوتے۔ جلب منفعت ان کا مطلوب ومقصود نہ تھا، وہ کبھی کسی کے مالی طور پر ممنون احسان نہیں ہوئے، اپنے مخلص، عقیدت مند اور قریبی رفقاء جو ان سے محبت رکھتے تھے، اس معاملہ میں ان سے بھی محتاط رہتے، فقر ودرویشی کا مزاج تھا اور یہ چیز ان کے لئے باعث لذت ومسرت ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ''فقر غیور'' کے مثالی کردار تھے۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت اور زندگی کا یہ ایسا روشن وتابناک پہلو ہے جو اس مادہ پرستانہ اور پر تعیش معاشرہ کے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کا تحریک اسلامی کے کاموں، سیرت کے جلسوں اور جماعت کے خطاب عام کے سلسلہ میں اکثر گیا بھی آنا

ہوتا، اجتماعات کے علاوہ بھی ان کی صحبت میں مجھے بیٹھنے، ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا، وہ زاہد خشک نہ تھے، شائستہ اور پر مزاح گفتگو کرتے، بڑے، بوڑھے اور بچے سبھی ان کی بصیرت افروز گفتگو سے لطف اندوز ہوتے، ان کے خطبے اور تقریریں سادہ اور دلنشیں ہوتیں، وہ اپنی باتوں کو بڑے یقین اور اعتماد سے کہتے۔ ان کا ایک یقین، لاکھوں شک پر بھاری ہوتا۔ میں جب بھی ان کی تقریریں سنتا، مجھے اس بات کا بڑا احساس ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کا یقین اس رومانی انقلابی تصور سے زیادہ ہم آہنگ ہے، جس کا تعلق زمینی عملی زندگی سے دور اور ایک خیالی رومانس سے قریب تر ہے۔ وہ اکثر اپنی تقریروں میں اس مغربی تہذیب اور مادی دنیا کا نقشہ اس طرح کھینچتے جیسے یہ تہذیب مغرب، اقبال کی زبان میں اپنے ہاتھوں آپ خودکشی پر تلی بیٹھی ہے، شب تاریک کے بعد، نمود سحر کے آثار نمایاں ہیں اور اب اسلامی انقلاب کا سورج بس طلوع ہی ہونے والا ہے۔ اس بات کو وہ جس ایمانی اور نبوی یقین و مشاہدے کے انداز سے کہتے کہ کچھ دیر کے لئے سامعین کھو جاتے اور وہ محسوس کرتے کہ اب اسلام کا اجالا پھیلنے ہی والا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب ملت اور مسلم مسائل سے ہٹ کر، وہ براہ راست غیر مسلموں میں دعوت اسلام کے قائل تھے۔ میرے خیال میں اسی باعث اپنے آخری دور میں تحریک اسلامی کے بعض عملی پہلو اور ملکی حالات کے تناظر میں حکمت عملی سے خاصا اختلاف ہو گیا تھا۔ جس جماعت اور تحریک سے وہ زندگی بھر وابستہ اور پیوستہ رہے، اس کی مخالفت تو کبھی نہیں کی لیکن عملاً خموش بیٹھ گئے۔ میں اس کی وجہ ان کا وہی رومانی انقلابی تصور سمجھتا ہوں، جو ان کے جذبۂ صادق اور یقین کامل سے ہم آہنگ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ایمان ویقین کی یہ وہ منزل تھی، جس کے لئے ملکی حالات اور وقت درکار تھا اور موجودہ تحریک اسلامی کی اجتماعی قیادت فکر کی ان دو انتہاؤں کے درمیان پھونک پھونک کر جس طرح قدم بڑھا رہی تھی، ڈاکٹر صاحب اس سے مطمئن نہیں تھے اور واقعہ یہ ہے کہ آج ملک کے حالات اتنے تشویشناک، پر خطر اور سنگین ہو گئے ہیں کہ اب ضرورت عملی اقدام کی ہے۔ غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت کے ساتھ ساتھ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج مسلم ملت جن تہلکوں سے دوچار ہے، اور پورا ملک فسطائیت کے جس شکنجہ میں کسا جا رہا ہے، اس کے تدارک کے لئے اجتماعی فکر و عمل درکار ہے، خدا ہماری قیادت کو حکمت و بصیرت سے نوازے۔

اخیر عمر میں ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی ذوق تصوف کی طرف بھی مائل تھا۔ صوفیائے کرام کے اذکار و اشغال، مشاہدہ و مراقبہ کی وہ سائنسی تحقیق و جستجو کرنا چاہتے تھے۔ مجھ سے انہوں نے صوفیاء کے پرانے بیاض اور اذکار و اوراد و وظائف کی کتابوں کی فرمائش کی، میرے پاس جو کچھ تھا، ان کے حوالہ کیا، کچھ دنوں کے بعد انہیں مجھے واپس کر دیا اور کہنے لگے، میں جو چاہتا تھا وہ اس میں نہیں ہے۔ وہ دراصل قدیم صوفیاء کے ان مشاہدوں اور مراقبوں کی سائنسی توجیہہ و تعبیر کر کے ان کا سائنٹفک تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ نہ جانے وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہو سکے۔

بہر حال، ڈاکٹر صاحب کی روشن و پاکیزہ زندگی اور قرآنی فکر و بصیرت ہمارے لئے آج بھی شمع راہ ہے۔ وہ دل روشن، فکر ارجمند اور زبان ہوشمند کے مصداق تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب و درجات کو بلند فرمائے۔ اور ان کی دینی و اجتماعی کوششوں کو قبول فرمائے۔ اور ے

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

طیب عثمانی ندوی صاحب، معروف ادیب، متعدد کتابوں کے مصنف، معتبر ناقد، اسلامی ادب کے ترجمان 'نئی نسلیں' کے سابق مدیر، عالم دین، حلقہ طلبہ اسلامی کے ابتدائی مطبوعات 'اقبال کا پیام مسلم طلبہ کے نام' کے مصنف۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے معترف، تصوف کے اہم خانوادے سے تعلق۔ (قیام: گیا)

باتیں ان کی یاد رہیں گی

محمد مفیض خاں

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰؒ کی زندگی عام انسانوں سے بہت مختلف تھی۔ اس میں تہ در تہ پیچیدگی اور گونا گوں نزاکتیں نہیں تھیں۔ ان کی شخصیت ایک کھلی کتاب تھی جس کی جلی ونمایاں حروف والی عبارت کو کوئی بھی پڑھ سکتا تھا۔ بالکل سادہ اور عام فہم عبارت والی کتاب۔ مرحوم کی زندگی دور اور قریب سے آسانی سے سمجھ میں آ جاتی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ زیادہ سے زیادہ اس زندگی کو جاننے اور سمجھنے کی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اس طرح گزاری کہ اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے عظیم کردار کے گرویدہ ہو گئے۔ ان کی عظمت نہ تو دنیاوی جاہ وجلال اور شان وشوکت کی وجہ سے تھی اور نہ ہی مذہبی رعب داب کی وجہ سے بلکہ ان کی عظمت صرف ان کے اس کردار کی وجہ سے تھی جو سادہ مگر حسین و پرکار تھا۔ جس میں قول وفعل کا تضاد نہ تھا۔ ان کی خلوت وجلوت کی زندگی اس کھلی کتاب کی مانند تھی جس کے ہر صفحہ پر مختلف جہتوں سے ایک ہی مضمون درج تھا اور وہ مضمون تھا 'اسلام اور اسلامی نظام کے احیاء کے لئے جدوجہد'۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ اسم بامسمیٰ تھے۔ خدا نے انہیں اندھیروں میں بھٹکنے والوں کے لئے ہدیت کی روشنی بننے کی سعادت بخشی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے: ''جو شخص بھی ایمان کے ساتھ نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے'' (النحل: ۹۷) ڈاکٹر صاحب کی زندگی کو دیکھتے ہوئے اس آیت نے میرے ایمان کو اور پختہ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب زندگی کے آخری ایام میں برسوں بیمار رہے۔ پٹنہ شہر میں آپ کا کوئی خونی رشتہ دار نہ تھا لیکن ان کے ماننے والے سب اپنے تھے۔ کچھ لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کی مستقل رات دن ایسی خدمت کی کہ شاید کچھ گھرانوں کو چھوڑ کر اپنے والد کی بھی ایسی خدمت لوگ نہ کرتے۔

ڈاکٹر صدیقی صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ کی دلی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب بقیہ زندگی ان کے ساتھ گزارتے۔ میری بھی دلی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صدیقی کے گھر پر رہتے کیوں کہ ان کا گھر کشادہ اور کمرے سے منسلک باتھ روم تھا۔ عالم گنج جہاں ڈاکٹر صاحب نے مستقل اپنی زندگی گزاری وہاں ان کا گھر آرام دہ نہیں تھا بلکہ بہت ہی تنگ کمرہ، چھوٹا سا آنگن جس سے اتر کر باتھ روم جانا پڑتا تھا۔ دن میں بھی روشنی کی ضرورت پڑتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے میں نے پوچھا ''آپ کمزور ہیں اس جگہ آپ کو باتھ روم کی تکلیف ہے۔ سخت سردی میں اٹھ کر جانا پڑتا ہے، ڈاکٹر صدیقی صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ کی دلی خواہش تھی کہ آپ وہاں سے نہ جائیں، کیوں چلے آئے''؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا، صاحب مکان اور ان کے گھر والوں کی خواہش ہے کہ اب آخری لمحہ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر نہ جاؤں۔ پہلے سے میں یہیں رہتا آیا ہوں اس لئے پہلا حق ان کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ جذبہ ایثار کا اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا درجہ ہے۔ قرآن خود اہل ایثار کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ خود حاجت مند ہونے کے باوجود دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں۔ (الحشر، آیت ۹)

میرے ایک عزیز دوست جو ان دنوں امریکہ میں رہ رہے ہیں پٹنہ آئے تو ڈاکٹر صاحب سے میں نے ملوایا۔ ڈاکٹر صاحب سے مل کر وہ کافی متاثر ہوئے۔ بہت سارے سوالات کئے اور کافی مطمئن بھی ہوئے۔ ہم نے اس گفتگو کا کچھ حصہ صدا بند کر لیا تھا اور

باقی باتیں میری یادداشت پر مبنی ہیں:

سوال ہندوستان و پاکستان کے علاوہ دنیا کے بیشتر ممالک کے مسلمان پریشان حال ہیں۔کہیں معاشی پریشانی کہیں آپس میں نفرت۔ دوسری قوم انہیں نیچی نگاہ سے دیکھتی ہے جب کہ قرآن پاک میں ہے کہ مسلمان دنیا کی افضل قوم ہے؟

ڈاکٹر صاحب: قرآن ایسی کتاب ہے جس میں آپ کے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔مگر اس کے لئے نگاہ بصیرت رکھنی پڑے گی۔آپ نے پرنٹنگ ٹکنالوجی کی تعلیم امریکہ سے حاصل کی ہے اور پرنٹنگ کے نشیب وفراز سے خوب واقف ہیں۔آپ جس تصویر کو پرنٹ کرنا چاہتے ہیں اور ریزلٹ حسب خواہ نہیں آرہا ہے تو فوراً آپ کے دماغ میں یہ بات آئے گی کہ یا تو رنگ کی خرابی ہے یا فلم کی خرابی ہے یا پلیٹ بنانے میں خرابی ہے یا مشین کی خرابی ہے یا مشین چلانے والے آدمی کی خرابی ہے۔اگر ان سب میں سے ایک بھی خرابی ہوگی تو ریزلٹ ویسا نہیں ملے گا جیسا آپ چاہ رہے ہیں۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے جنتی نعمتوں کا ذکر کیا ہے وہ اس کے مومن بندوں کے لئے ہیں۔بشرطیکہ ایمان نام نہاد نہ ہو اور مومن بندوں کی زندگی کے شب وروز واقعی قرآن وحدیث کے بتائے ہوئے اصولوں پر گزرتے ہوں۔آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ اسلام ایک مذہب نہیں ہے، ایک دین ہے۔ دین سے مراد وہ ضابطہ حیات اور نظام زندگی ہے جو خدا اور رسول نے ہمیں دیا ہے۔آج لوگ نماز میں رو رو کر دعاء کر رہے ہیں کہ مسلمانوں میں اتحاد ہو، آپس میں لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں لیکن دور دور تک یہ چیز نظر نہیں آتی، وجہ؟ لوگوں نے اسلام کو مذہب کے روپ میں اختیار کیا ہے دین کے روپ میں نہیں۔اگر وہ دین کے روپ میں اختیار کرتے تو یہ مسلمان قرآن وحدیث کے احکام کو عمل میں لانے پر مجبور ہو جاتے کیوں کہ وہ سمجھ پاتے کہ اس بنیادی چیز کو عمل میں لائے بغیر وہ خدا اور اس کے رسول کے نزدیک مسلمان نہیں رہیں گے۔

اسلام کو قبول کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ خدا کی کتاب کو بنیادی ضابطہ زندگی بنا کر اپنی پوری زندگی اس کے رسول کی رہنمائی میں بسر کی جائے ورنہ خدا اور اس کے رسول کی عملی اطاعت اور پیروی کے بغیر توحید کا محض اقرار ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔اگر کوئی خیال کرتا ہے کہ محض چلوں، مراقبوں اور مجالس وعظ ومیلاد کے انعقاد یا اصلاح رسم کا کام کر کے یا کوئی مدرسہ یا مسجد یا یتیم خانہ قائم کر کے خدمت دین کا حق ادا کر دے گا اور مومن ومسلم کی حیثیت سے اقامت دین کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سے وہ سبک دوش ہو جائے گا تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔چند احادیث پیش کرتے ہوئے اپنی بات کو واضح کرنے کی غرض سے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم مومنوں کو آپس کے رحم، حمیت اور ہمدردی کے معاملے میں ایک جسم پاؤ گے۔اگر ایک عضو میں تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔(بخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اس کی مدد سے باز آتا ہے۔جو شخص اپنے بھائی کی حاجت کو پورا کرنے میں لگا ہوگا اللہ اس کی حاجت پوری کرنے میں لگ جائے گا اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی عیب پوشی کرے گا۔(بخاری ومسلم)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مزید وضاحت کی: قرآن پاک میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ شخص اللہ کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے جو اپنے رشتہ داروں سے سرد مہری اور طوطا چشمی کا معاملہ کرے۔رسول ﷺ نے فرمایا تین قسم کے آدمی جنتی ہیں۔ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو رشتہ دار اور مسلمان کے لئے رحیم اور رقیق القلب ہو (مسلم)

پڑوسی کے سلسلے میں رسول ﷺ کی یہ مشہور حدیث ہے: ''خدا کی قسم وہ مسلمان نہیں جو خود بھر پیٹ کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے''۔قرآن کے مطالعہ سے دین کی اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا کے بندوں میں خدا کی خدمت کا عکس نمایاں ہو۔خدا

کی صفات میں جو صفت بنیادی اور مقدم ہے وہ صفت رحمت ہے۔ آپ بتائیں جس معاشرہ میں مندرجہ بالا صفت عمل میں آجائے وہ معاشرہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں بن جائے گا؟ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی صفت یہ ہے کہ کوئی لاکھ چاہے اینٹوں کو الگ کرنا الگ نہیں ہوں گی۔ چور چور ہو جائیں گی مگر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ ایسے معاشرے کے اتحاد میں دنیا کی کوئی بھی طاقت پھوٹ نہیں ڈال سکتی۔ لیکن اس دور کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ جس کے پاس روشنی کا چراغ تھا وہی رتوند کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ دوسروں کو راستہ دکھلانا در کنار خود اندھوں کی طرح بھٹک رہا ہے اور ایک ایک بھٹکنے والے کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔ کبھی اس پارٹی کو کبھی اس پارٹی کو نجات دہندہ سمجھتا ہے۔ اگر ہم لوگوں نے قرآن وحدیث کے مطابق جینے کا سلیقہ سیکھ لیا ہوتا تو لوگ ہمیں دیکھنے کے لئے دور دور سے آتے۔ آپ نفرت کرنے کی بجائے اپنی سوچ کو ایسا بنائیں کہ جب آپ دوسروں کو گناہوں میں مبتلا دیکھیں تو خود کو بھی اس جرم سے بری نہ سمجھیں اور خود اپنے آپ پر نظر رکھیں۔ یہ دیکھیں کہ اس کے اندر خیر پیدا کرنے اور اس کی برائی چھڑانے کے لئے آپ نے کیا کوشش کی ہے۔ دل و دماغ میں یہ بات بٹھا لیجئے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ پڑوسی والی حدیث پر عمل کر کے ایک انسان نے دوسرے انسان کو جہنم سے جنت کے دروازے میں داخل کر دیا۔

ایک انگریز نے اپنے مسلمان ہونے کے سلسلے میں لکھا کہ اس نے ایک شخص کے کردار سے متاثر ہو کر اسلام کی عظمت کو جانا اور پھر اسلام قبول کر لیا۔ اس انگریز نے ریسرچ کے سلسلے میں مصر میں کچھ ماہ قیام کیا، اپنے ریسرچ کے کام کو پورا کرنے کے بعد وہ اپنے وطن یورپ لوٹ رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ بچوں کے لئے کچھ تحفہ خرید لوں۔ وہ وہاں کے ایک مارکیٹ میں گیا۔ اسے ایک دوکان میں کچھ سامان پسند آیا اور دوکاندار سے قیمت پوچھنے کے بعد اس سے کہا کہ یہ سب چیزیں پیک کر دیجئے۔ دوکاندار نے کہا بھائی صاحب! یہی سامان بازو والی دوکان میں دستیاب ہے۔ آپ وہیں سے لے لیں۔ انگریز نے کہا میں آپ کی دوکان میں آیا ہوں بازو والی دوکان میں کیوں جاؤں؟ کچھ بحث مباحثہ کے بعد اس انگریز نے بازو والی دوسری دوکان سے وہی سامان خرید لیا۔ خریدنے کے بعد اس دوکاندار سے پوچھا کہ یہ بازو والی دوکان تمہارے رشتہ دار کی ہے؟ دوکاندار نے کہا نہیں صاحب! کوئی رشتہ داری نہیں ہے، صرف مارکیٹ کی دوستی ہے۔ وہ انگریز سامان لے کر پہلی والی دوکان میں آیا اور اس نے دوکاندار سے کہا کہ میں اب واپس اپنے وطن یورپ جا رہا ہوں۔ میرے دل و دماغ میں اس بات کی خلش رہے گی کہ آپ نے اپنی دوکان کا سامان ہم سے کیوں نہیں فروخت کیا؟ جب کہ اس دور میں لوگ زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھا کرنے کے چکر میں ہیں۔ آخر آپ نے یہ قربانی کیوں دی؟

جناب! میں نے صبح سے اب تک کسی حد تک دوکانداری کر لی ہے۔ پڑوسی کی دوکان نے ابھی تک بونی بھی نہیں کی ہے۔ ہمارے پیارے رسول ﷺ کی ہدایت ہے کہ اپنے پڑوسی کا ہر طرح خیال رکھا کرو۔ اسی جذبہ کے تحت میں نے آپ کو ان کی دوکان سے سامان خریدنے پر آمادہ کیا۔ یہ ایثار و قربانی کی تعلیم دی تمہارے رسول ﷺ نے؟ بہت ہی اعلیٰ قسم کی مثال قائم کی ہے۔ آدمی کو انسان بنانے کے لئے یہ زبردست نسخہ ہے۔ تمہارے رسول ﷺ نے اور کیا فرمایا ہے؟ دوکاندار نے کہا، صاحب جی! آپ پڑھے لکھے ہیں کسی بھی کتاب کی دوکان سے حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ پر کتابیں لے لیجئے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اس دور میں بھی سب سے عظیم شخصیت رسولؐ کی ہے اور تا قیامت رہے گی۔ اس واقعہ کے پہلے میں نے اسلام کے بارے میں سنا ضرور تھا لیکن ایک اجنبی نامانوس چیز کی طرح۔ مطالعہ کے بعد میں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور میں مسلمان ہو گیا۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

اصل میں امریکہ کے ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ دیکھئے امریکہ کا سب سے اہم اور طاقتور اخبار "نیویارک ٹائمز" ایک یہودی خاندان کی ملکیت ہے۔ بیشتر اخبار اسی سے اپنی خبریں حاصل کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر ان کو اسلام کی حقیقت شائع

کرنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ہاں ان کو اسلام کے بارے میں یہودی نقطہ نظر کی اشاعت سے غرض ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اسحٰق شامیر اسرائیل کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے امریکہ کی زیارت کے موقع پر ایک عام جلسہ میں کہا تھا کہ اب ہمارا اور مغرب کا صرف ایک تنہا دشمن اسلام ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اسرائیل کی ہر بات وہاں سنی جاتی ہے اور اس کو وزن دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے میرے دوست سے کہا کہ مسلمانوں کو بڑی محنت کی ضرورت ہے کہ وہ ابلاغ عامہ کے رسائل میں اپنے خیالات کو اسلامی نقطہ نظر سے پیش کریں نیز اسلام اور مسلمانوں کی حقیقی تصویر نمایاں کریں۔

نیت کے سلسلے میں ایک مرتبہ دوران گفتگو ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''جس شخص میں جتنا علم ہوگا اور جیسی معرفت ہوگی نیت کی درستگی اسی مرتبہ پر ہوگی'' ایک شخص کے دل میں اس کی خواہشات اور محبت دنیا غالب ہے اس صورت میں جو فعل جو عمل اس سے صادر ہو گا دنیاوی ہوگا۔ کچھ نہ کچھ اس میں ضرور دنیاوی غرض پوشیدہ رہے گی ہر چند کہ وہ نمازیں بھی پڑھے قربانی بھی کرے، یہاں تک کہ تہجد کے لئے شب بیداری بھی کرے۔ دوسرا شخص وہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ کی رضا، محبت اور آخرت غالب ہے، اس صورت میں اس سے جو بھی فعل وجود میں آئے گا اخروی ہوگا۔ اس درستگی نیت کے باعث اس کا کھانا پینا سونا بیٹھنا ملنا جلنا اور کاروبار کرنا بھی عبادت سے خالی نہ ہوگا۔

میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک شخص رات کی تنہائی میں جب کہ سارے افراد سور ہے ہیں خاموشی سے اٹھتا ہے، وضو کرتا ہے اور نماز تہجد پڑھتا ہے اس کا یہ عمل دنیاوی کیسے ہوگا؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا الا ماشاء اللہ۔ زیادہ تر لوگ اس نیت سے نماز تہجد کے لئے نہیں اٹھتے ہیں کہ اللہ کا شکر ادا کریں، اس کی محبت و رضا حاصل کریں بلکہ دنیا، دنیا ہی حاصل کرنے کی غرض ہوتی ہے۔ دنیا حاصل کرنے کی شکل مختلف ہوتی ہے۔ کوئی کاروبار کی ترقی کے لئے، کوئی مقدمہ جیتنے کے لئے، کوئی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے، کوئی اولاد کے لئے، کوئی شفا حاصل کرنے کیلئے وغیرہ وغیرہ۔ یاد رکھئے سچی خدا پرستی انسان کو با اخلاق، کریم، اور فیاض بناتی ہے۔ اللہ کی بندگی اختیار کرنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کی راہ میں جو چیز انسان کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے وہ اللہ سے ناواقفیت ہے۔ اس کا علاج اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح علم حاصل کرنا ہے اور اس کا ذریعہ خدا کی کتاب اور رسول ﷺ کی تعلیمات ہیں، اس کے علاوہ خدا کی رضا حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ یاد رکھئے: اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اس کی طرف سچے دل سے متوجہ ہوتے ہوں۔ قرآن صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت اسے بخشتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوں۔

شادی کے سلسلے میں ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''اسلام نے شادی کا مسئلہ بڑی حکمت سے بہت ہی آسان بنایا تھا۔ ہم نے وسائل اور رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ کر اسے سب سے مشکل بنا دیا ہے''۔ آج کا زیادہ تر مسلمان اسلامی تہذیب، تقویٰ اور پرہیز گاری نہیں دیکھتا۔ سب سے پہلے ہڈی یعنی status دیکھتا ہے ہڈی تو کتا دیکھتا ہے۔ ہمیں قرآن پاک کی سورہ اعراف کی آیت ۱۷۵۔۱۷۶ یاد آ گئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا، مگر وہ پابندی سے نکل بھاگا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا، لہذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی''۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے فرمایا:

''وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے آیات الٰہی کا علم رکھتا تھا یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اس رویہ سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرز عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے۔ اسی عمل مطابق علم کی بدولت اللہ تعالیٰ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا، لیکن وہ دنیا کے فائدوں اور لذتوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا۔ خواہشات

نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس نے اس کے آگے سپر ڈال دی ۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کی حالت کو کتے سے تشبیہ دیتا ہے جس کی ہر وقت لٹکتی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال، ایک نہ بجھنے والی آتش حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتہ دیتی ہے۔ بنائے تشبیہ وہی ہے جس کی وجہ سے اردو زبان میں ایسے شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو دنیا کا کتا کہتے ہیں۔

دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسی تڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا، ہمہ تن پیٹ ہمہ تن شرمگاہ۔

میرا بھی مشاہدہ ہے کہ احسن تقویم پر پیدا ہونے والا انسان قرآن وحدیث کے فرمان کو چھوڑ کر اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو اپنے نفس کے حوالے کر دیتا ہے تو خود غرضی، حرص، طمع، شہوت پرستی، کمینہ پن اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے او راخلاقی حیثیت سے سب نیچوں سے نیچے ہو کر رہ جاتا ہے۔اس لئے اس دور میں لوگ دیکھ رہے ہیں کہ حرام ذرائع اور طاقت کے بل بوتے پر دولت لوٹنے والوں کے چونچلوں کا اب یہ عالم ہے کہ منگنی کی بھی مہندی ہونے لگی ہے۔ہم ایک ایک رسم پر لاکھوں لٹائے جا رہے ہیں۔امیروں نے سمجھ لیا ہے کہ دنیا صرف ان کی ہے اور ان کے عیش وطرب کے لئے وجود میں آئی ہے۔غریب متوسط گھرانے والے حسرت بھری نگاہوں سے روشنیوں اور پیسوں کا بے رحم کھیل دیکھ رہے ہیں کہ ان کی بیٹی کا رشتہ کون مانگے گا اور جہیز کہاں سے آئے گا۔روز بہ روز ان کے عذاب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ان کے لئے کہیں بھی جائے امان نہیں ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ صاحب نے کہا کہ سارے مسائل کا حل یہ ہے کہ آپ لوگ اطاعت قرآن اور سنت رسول کو اپنا مقصد حیات بنائیں کیوں کہ انہیں کو اختیار کرنے پر ہماری زندگی کا نظام درست طور پر چل سکتا ہے اور اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی۔یاد رکھئے اسلام زبان سے ادا کئے جانے والے کسی کلمہ کا نام نہیں، وہ زندگی کا نظام اور ایک طریق عمل ہے، اسکے کسی ایک جز کا انکار کل کے انکار کی طرح ہے۔رسول ﷺ جب دنیا سے تشریف لے جانے لگے آپؐ نے فرمایا تم کو ایسا نسخہ بتا کر جا رہا ہوں کہ جس پر عمل کروگے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں گمراہ نہیں کرے گی۔آپؐ نے فرمایا، میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں، جو ان سے الگ ہوگا اور کمزوری دکھائے گا وہ جہنم میں جائے گا۔آپ ایک ایک مسلمان کے ذہن میں یہ بنیادی بات اتار دیجئے۔اسلام اللہ ورسولؐ کی بے چوں چرا اطاعت وفرماں برداری کے سوا کسی چیز کا نام نہیں۔صرف نماز ادا کر دینے کا نام اسلام نہیں ہے۔صبح سے شام تک بھوکے رہنے کا نام اسلام نہیں ہے۔خانہ کعبہ میں جا کر طواف کرنے کا نام اسلام نہیں ہے۔اسلام نام ہے اللہ اور رسولؐ کی بے چوں چرا فرماں برداری کا۔آپ تہجد گزار ہوں، دس بار حج کر چکے ہوں، ہر سال زکوٰۃ نکالتے ہوں، روزہ پر روزہ رکھتے ہوں لیکن جب اللہ ورسولؐ کی کوئی بات صاف صاف آپ کے سامنے آجائے تو پھر آپ انکار کریں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے دل میں اسلام نہیں دھوکا ہے۔

یہ بات سب کے دماغ میں آجانی چاہئے کہ کوئی چیز، کوئی مسئلہ جب تمہارے سامنے آئے تو پہلے دیکھو اللہ کیا کہتا ہے، اس کی کتاب کیا کہتی ہے، اس کے رسولؐ نے اپنی سنت میں کیا رہنمائی کی ہے۔وہاں سے جو ملے ٹھیک ٹھیک اسے خوشی سے قبول کر لو۔تمہارے لئے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی اسی میں ہے۔اور جو چیز وہاں نہ ملے اسے رد کر دو چاہے پیش کرنے والا کتنا ہی بڑا بزرگ آدمی ہو۔اصل اہمیت دنیا کی عزت وذلت کی نہیں بلکہ اس ذلت وعزت کی ہے جو خدا کے ہاں کسی کو نصیب ہو، اس لئے انسان کو ساری فکر اس امر کی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے اندر وہ حقیقی اوصاف پیدا کرے جو اسے اللہ کی نگاہ میں عزت کے لائق بنا سکتے ہوں۔

ایک موقع پر ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ صاحب نے کہا تھا: ’’اچھی اور اونچی باتیں اس زمانے میں کوئی نایاب چیز نہیں ہے۔البتہ حسن عمل ضرور ایک کمیاب اور نایاب شئے ہے اور دنیا کو اس وقت اسی نایاب شئے کی تلاش ہے۔مومن کو اعلیٰ کردار کا حامل ہونا چاہئے،

کیونکہ اعلیٰ کردار عقل ہی کو نہیں جذبات انسانی کو بھی اپیل کرتا ہے۔ یاد رکھئے کہ جس شخص کے دل میں جس قدر خدا کی محبت ہوگی اتنا ہی وہ خدا کی اطاعت وفرماں برداری کرنے والا ہوگا، کیوں کہ محبت کی علامت دراصل فرماں برداری ہے۔

اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری زندگیاں اسلام کی سچی شہادت دیں۔ اس کے بعد ہی لوگوں کے اندر وہ ایمانی قوت پیدا ہوگی جو آدمی کو بلند حوصلہ اور بلند کردار بناتی ہے۔ جو قوم بلند کردار ہو اسے کوئی بھی چیز شکست نہیں دے سکتی۔ آج کل ہمارے سامنے بہت سارے مسائل ہیں اور روز بروز انہیں ہم خود سنگین بنا رہے ہیں۔ اشاعت اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہم خود ہیں۔ اسلام اور اسلامی کلچر کا جتنا مذاق ہم نے اڑایا ہے شاید اتنا کسی اور نے نہیں اڑایا۔ یاد رکھئے اسلام ایک ایسا نظام عدل ہے جس میں اونچ نیچ، ذات پات کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے'' (سورہ الحجرات ۱۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا اللہ کے ہاں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو''۔ اس کے قوانین جس طرح ایک غریب کے لئے ضروری ہیں اسی طرح ایک بادشاہ کے لئے بھی ان پر عمل کرنا فرض ہے۔ اسلام میں نہ تو کوئی شخص خود کسی کا غلام ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی غلام ہوتا ہے۔ مومن کے لئے کسی ایسے شخص کے ایسے حکم کی تعمیل جائز نہیں جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی ہوتی ہو۔

یاد رکھئے! دولت، بادشاہت نہ قارون کے پاس رہی نہ فرعون کے پاس۔ پہلی فرصت میں دعوت اسلامی کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔ معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنانے کی اپنی پوری کوشش جاری رکھیں۔ کیونکہ اسلام کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرنا ہر مسلمان مرد عورت کا دینی فریضہ ہے جو کسی بھی حالت میں معاف نہیں۔ خدا کے سامنے ہر فرد کو اپنی ایک ایک سانس کا حساب دینا ہے۔ آپ تنہائیوں میں ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اور اس وقت کو یاد رکھئے:

جب آپ غسل نہ کر سکیں گے، غسل کرایا جائے گا
خود کپڑا پہن نہ سکیں گے، کپڑا پہنایا جائے گا
خود سے خوشبو نہ لگا سکیں گے، خوشبو لگائی جائے گی
خود سے چل کر نہ جا سکیں گے، بلکہ لے جایا جائے گا
خود سے نماز نہ پڑھ سکیں گے، نماز پڑھائی جائے گی

اور پھر۔

آغوش لحد میں ڈال دیا جائے گا جہاں صرف آپ اور آپ کا نامۂ اعمال ہوگا

اس گفتگو سے مرحوم ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کے اسلامی افکار روشن ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں اشاعت اسلام اور دعوت اسلام کا جو درد تھا وہ ہی ان کے اعمال اور طرز زندگی سے واضح تھا۔ ان کی زندگی کے بہت سارے واقعات آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو آئندہ لکھا جائے گا۔ ہم ابھی اسی پر بس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن پر انبیاء اور شہدا اور صدیقین رشک کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ کو بھی ایسے لوگوں میں شامل فرمالے۔ آمین!

محمد مفیض خاں طلبہ تحریک کے قیام میں ڈاکٹر صاحب نے جن ابتدائی چار پانچ نوجوانوں کو منظم کیا اس میں سے ایک اہم نام۔ ایک زمانہ میں کلکتہ سے 'عالمی ڈائجسٹ' کے نام سے ایک مقبول رسالہ کا اجراء کیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے تقاریر، خطبوں اور درس کے آڈیو کیسٹ کا ایک بڑا Collection موصوف کے پاس ہے۔ (قیام: پٹنہ)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ: چند یادیں

ڈاکٹر اختر حسین آفتاب

ہمارے سماج میں انسان کی کمی نہیں ہے، لیکن ایسے لوگوں کی کمی ضرور ہے جو اپنے اعتقاد کے ساتھ انسانی قدروں کے پابند ہوں۔ لوگ بہت ہیں، لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی زندگی میں لوگ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور مرنے کے بعد بھی یاد کریں۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب ایسے ہی بلند مرتبہ لوگوں میں تھے جن کا احترام لوگوں نے ان کی زندگی میں کیا اور ان کے مرجانے کے بعد بھی انہیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

میرا تعلق ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب سے تقریباً ۲۵ سالوں تک رہا۔ وہ جب تک زندہ رہے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور وہ مجھے اپنی شفقت اور دعاؤں سے نوازتے رہے۔ آج میں ان چند یادوں کا تذکرہ ذیل میں کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میں اچھے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کے سامنے ترقی کے مواقع تھے۔ مگر ان کا تعلق جماعت اسلامی ہند سے بھی تھا۔ جب ان کے سامنے یہ سوال آیا کہ آپ کو دو میں سے ایک کو چننا ہے یعنی یا تو ملازمت یا جماعت کی خدمت، تو آپ ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ ہمارے سماج میں کتنے لوگ ہیں جو ایسا فیصلہ لے سکتے ہیں؟ اس فیصلے سے ڈاکٹر صاحب کے کردار کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی جاتی اور ان کے پاس وقت ہوتا تو وہ نکاح پڑھانے کی غرض سے کیسی کیسی جگہ چلے جایا کرتے تھے۔ جانے کے لئے وہ سواری کا مطالبہ نہیں کرتے، بلکہ خود سائیکل پر جاتے، نکاح پڑھاتے اور صرف ایک گلاس پانی پی کر وہاں سے سائیکل پر گھر لوٹ آتے۔ آج کے دور میں کتنے لوگ ایسا کرتے ہیں؟ کیا یہ ان کے بڑاپے کی دلیل نہیں ہے؟

ایک دن کا واقعہ ہے کہ سفارشی خط کے لئے ایک شخص ان کے پاس آیا۔ مدعا یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس شخص کے رشتہ دار کے نیک کردار کی تصدیق کرتے ہوئے اسے سفارشی خط دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف صاف کہا کہ جس شخص کو انہوں نے کبھی دیکھا تک نہیں، اسے وہ باکردار ہونے کی سرٹیفکیٹ کیسے دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے خط لکھ کر دے دیا مگر اس کے رشتہ دار کے باکردار ہونے کی تصدیق نہیں کی۔ یہ تھا ڈاکٹر صاحب کا اصول! وہ ہمیشہ سچ بولے اور سچ بولنے کی تلقین کرتے رہے۔

ایک بار ہماری بہن (مرحومہ) میرے بچے کو لے کر عورتوں کے اجتماع میں گئیں۔ بچہ چھوٹا تھا۔ اس نے پاجامہ میں پاخانہ کر دیا۔ ہماری بہن نے اس کا پاجامہ بدل دیا اور گندے پاجامہ کو کسی کونے میں ڈال دیا۔ واپسی کے وقت وہ گندے پاجامہ کو اپنے ساتھ لانا بھول گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب میری بہن ڈاکٹر صاحب کے یہاں گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ بچہ کا پاجامہ الگنی پر لٹک رہا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ یہ پاجامہ تو گندا تھا۔ پھر یہ یہاں کس طرح آ گیا؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ انہوں نے اس پاجامہ کو دھو کر الگنی پر اس لئے لٹکا دیا تھا تاکہ جس کا یہ ہو وہ اسے دیکھے اور لے جائے۔

غور کریں! یہ کتنی بڑی بات ہے۔ میرے ذہن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ ابھر آیا جبکہ انہوں نے اپنے دست مبارک سے اپنے اس دشمن کا پاخانہ صاف کیا تھا جو انہیں پریشان کرنے کی غرض سے رات بھر ان کا مہمان رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سچ مچ مومن تھے۔ انہوں نے وہی کیا جو ہماری اسلامی تعلیم کا تقاضہ ہے۔

ایک دن میں ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ میری والدہ کا تذکرہ آگیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میری والدہ کلام پاک برابر اور دیر تک پڑھتی ہیں مگر وہ معنی کے ساتھ نہیں پڑھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ انہیں کلام پاک معنی کے ساتھ (یعنی اردو ترجمہ) پڑھنا چاہئے تا کہ خداوند کریم کے احکام پوری طرح ذہن میں واضح ہو سکیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی۔ اب میں بھی لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ کلام پاک بامعنی پڑھیں۔ عرب کے لوگوں کی زبان عربی ہے اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ ہماری زبان چونکہ عربی نہیں ہے اس لئے کلام پاک کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی زبان میں اس کا ترجمہ ضرور ضرور پڑھنا چاہئے۔

جب جماعت اسلامی ہند پر پابندی لگی تو ڈاکٹر صاحب کو گرفتار کر کے پٹنہ کے ایک جیل میں بند کر دیا گیا۔ جیل میں انہیں کھانے کے لئے جو کچھ بھی ملتا اس کا تقریباً دو تہائی حصہ وہ قیدیوں کے بیچ تقسیم کر دیتے۔ سبھی قیدیوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ جیل کے افسروں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیل میں قیدیوں نے انہیں ''باوا'' کہنا شروع کر دیا۔ جیل کے افسران بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ جیل کے اندر ان کی حیثیت ایک قیدی جیسی نہیں بلکہ ایک بزرگ جیسی تھی۔ یہ تھا ان کے خلوص کا اثر۔

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب محلّہ عالم گنج کی ایک گلی میں ایک چھوٹے سے کمرے میں رہا کرتے تھے۔ کمرے کی زمین بوسیدہ تھی۔ چھت نہ تھی، بلکہ چھپر تھا جس کی چھاؤنی کھپڑے سے ہوا کرتی تھی۔ مکان پرانا اور فرسودہ تھا۔ اسی کمرے میں ایک چوکی لگی رہتی تھی جس پر ڈاکٹر صاحب کا بستر لگا رہتا تھا۔ ایک چھوٹا سا ٹیبل تھا جس پر ڈاکٹر صاحب کا ہومیوپیتھک دواؤں کا بکس ہوا کرتا تھا۔ ایک پرانی کرسی تھی جس پر بیٹھ کر وہ مریضوں کو دوا دیا کرتے تھے۔ مریضوں سے جو پیسے ملتے وہی ڈاکٹر صاحب کے معاش کا ذریعہ تھے۔ غریب مریضوں سے وہ دوا کی قیمت یا تو نہ لیتے یا انتہائی کم لیتے۔ میں آج تک ان کی کشادہ قلبی کا ممنون ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کا آپریشن دانا پور میں ایک پرائیوٹ کلینک میں ہوا تھا۔ اس کے بہت دنوں بعد جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں صدیقی نرسنگ ہوم باقر گنج میں بھرتی کر دیا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے دانا پور بھی گیا تھا اور صدیقی نرسنگ ہوم میں بھی ان سے برابر ملتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب بیمار تھے۔ انہیں تکلیف تھی لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ صبر و شکر کا نمونہ تھے۔

ڈاکٹر صاحبؒ زندگی کے آخری سالوں میں جماعت اسلامی سے ان کا اختلاف ہو گیا تھا اور وہ جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ جماعت اسلامی کو انتخاب (چناؤ) میں حصہ نہیں لینا چاہئے۔ جماعت کو صرف تبلیغ کے کاموں سے وابستہ رہنا چاہئے۔ جماعت سے الگ ہونے پر بھی ڈاکٹر صاحب وہی رہے جو وہ پہلے تھے۔ ان کا وقار اپنی جگہ قائم تھا، ان کی عزت اپنی جگہ پر بنی ہوئی تھی، عوام کی نگاہ میں ان کا وہی مقام تھا جو کہ پہلے تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب ایک فرد نہیں بلکہ اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا جب انتقال ہوا تو میں بھی ان کے جنازہ میں شریک تھا۔ اس نیک اور خداترس انسان کی دعائے مغفرت کے لئے لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں، ان کے رخسار پژمردہ تھے، ان کو سپرد خاک کیا گیا اور ان کی مغفرت کے لئے سیکڑوں ہاتھ بارگاہ الٰہی میں اٹھ گئے۔

ہم خداترس بنیں، نیکی کریں، انسانی قدروں اور دوسروں کے کام آئیں۔ یہی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سچا خراج عقیدت ہوگا۔

ڈاکٹر اختر حسین آفتاب صاحب، محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سیٹی کے سابق استاد، معروف قلم کار، سماجی کارکن۔ ڈاکٹر صاحبؒ سے نیازمندانہ تعلق۔ (قیام: پٹنہ)

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ

ایک شخص ایک کارواں

محمد مصطفیٰ خاں

تحریک اسلامی کے بزرگ راہنما ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ، پٹنہ بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے دنیا سے چل بسے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ " تقسیم ہند کے قبل ہی سے تحریک اسلامی کے کارواں میں شامل رہے اور پھر عمر بھر زندگی کے اسٹیج پر کامیاب معلم ومربی اور مردخدا مست کی حیثیت سے اپنا رول ادا کیا۔ کئی برس تک امیر حلقہ بہار اور مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے آخری چند سالوں میں جماعت سے علحدگی اختیار کرلی تھی لیکن تاحیات ان کی زندگی کا عنوان تحریک اور تحریکیت ہی رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال پر دہلی میں منعقدہ ایک تعزیتی نشست میں بیان کئے گئے تاثرات یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔

میں نے اپنے طالب علمی کا پورا دور ڈاکٹر صاحب کی رفاقت میں گذارا ہے۔ ان کو بہت ہی قریب سے دیکھا، پرکھا اور جانا ہے۔ پٹنہ میں میرا گھر ان کے گھر سے دوکلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جس وقت میں ان سے متعارف ہوا تھا اس وقت وہ امیر مقامی پٹنہ تھے اور پھر انیس الدین احمد مرحوم کے بعد وہ امیر حلقہ بہار بھی ہوئے۔ جماعت اسلامی کا ہفتہ وار اجتماع پٹنہ میں رمنہ روڈ کے دفتر میں ہوا کرتا تھا۔ ہم لوگ اس میں شریک ہوتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی نگرانی میں حلقہ طلبہ اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ شروع کے چند ارکان میں میں بھی حلقہ طلبہ اسلامی کا ممبر تھا جو بعد میں ایس آئی او میں ضم ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب طلبہ پر خصوصی توجہ دیتے اور ان کی تربیت نہایت ہی پیار اور محبت وشفقت سے کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تربیت یافتہ اور تحریک اسلامی سے متاثر ہونے والے لوگوں میں ڈاکٹرس، انجینئرس، پروفیسرز واعلیٰ عہدوں پر فائز بہت سارے لوگ آج بھی ہندوستان وبیرون ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی جگہوں پر تحریک اسلامی کے کاز کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی نہایت ہی سادہ اور پاکیزہ تھی۔ عالم گنج کے ایک خستہ حال کھپریل کے مکان میں اپنی پوری زندگی گذاردی۔ ان کے کمرے میں چوکی اور دوتین کرسیاں ہوتی تھیں جس میں وہ اپنی گذراوقات کے لئے مریضوں کو دیکھتے تھے اور تھوڑا بہت عطر بھی بناتے تھے۔ زیادہ تر جماعت کے اور ان سے محبت کرنے والے رفقاء ان سے علاج کراتے وعطر کی شیشیاں خریدتے اور اسی کمرہ میں جماعتی کام سے ملاقات کرنے والے رفقاء بھی آتے تھے۔ ان کے کمرے میں پنکھا نہیں تھا۔ رفقاء کے بے حد اصرار پر چند سالوں سے ٹیبل فین وہاں رہنے لگا تھا ورنہ تو تاڑ کے بنے ہوئے دوتین پنکھے ان کے پاس ہوتے، ایک سے وہ خود جھلتے۔ باقی آنے والے مہمانوں کو دے دیتے اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے اس تقویٰ میں بالکل بناوٹ نہیں تھی، وہ بے حد مطمئن رہتے۔ جب کوئی کہتا

کہ ڈاکٹر صاحب پنکھا لگا لیجئے تو وہ نہایت شفقت اور محبت سے کہتے ۔ جب میرا کام یونہی چل رہا ہے تو پھر کیا ضرورت ہے۔ جب دیکھوں گا کہ کام نہیں چل رہا ہے تو دیکھا جائے گا۔

دعوتی کام کرنے کا انداز بھی ڈاکٹر صاحب کا بہت ہی متاثر کن تھا۔ اجتماع میں جب کوئی رفیق غیر حاضر رہتا تو دوسرے رفقاء سے معلوم کرتے کہ کیا بات ہے، فلاں صاحب نہیں آئے؟ جب معلوم ہوتا کہ بیمار ہیں یا کچھ گھریلو پریشانی ہے تو وہ خود ان کے گھر تشریف لے جاتے۔ مزاج پرسی کرتے۔ کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو پوچھتے اور ان کے بس میں ہوتا تو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر کوئی رفیق یا رکن تساہلی یا بے رغبتی کی وجہ سے اجتماع میں شریک نہیں ہوتا تب بھی ان کے گھر ضرور جاتے اور بہت ہی شفقت سے پوچھتے کیوں میاں خیریت تو ہے؟ آپ سے تو ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ براہ راست وہ کبھی نہیں کہتے ، تم اجتماع میں شریک کیوں نہیں ہو رہے ہو۔ لیکن سامنے والا سمجھ جاتا کہ ڈاکٹر صاحب کے آنے کا کیا مقصد ہے۔ البتہ ارکان کو نظم کی پابندی کی سختی سے تلقین کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں ایک عجیب طلسماتی کشش تھی۔ ان کے پاس رہ کر ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا تھا، جس کی لذت صرف محسوس کی جا سکتی ہے بیان نہیں کی جا سکتی۔ جماعت کے لوگ تو ڈاکٹر صاحب کے دیوانے تھے ہی، وہ لوگ بھی دیوانے تھے جو جماعت کو کسی وجہ سے پسند نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن دینے کا انداز منفرد تھا۔ ان کے درس میں گہرائی اور گیرائی ہوتی تھی۔

انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں رمضان المبارک کے تمام جمعوں کی نماز وہ اکثر پڑھاتے تھے، ان کا خطبہ سننے کے لئے لوگ دور دراز سے کئی میل کا سفر کر کے آتے تھے۔ اس وقت کے دانشور سے لے کر ہر مکتبہ فکر کے لوگ ان کے خطبہ میں شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹرس، انجینئرس، جج، وکلاء، پروفیسرس کی بہت بڑی تعداد ان کا خطبہ سننے کے لئے شریک ہوتی تھی۔ کبھی کسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نہیں آتے تو لوگ بے چین ہو جاتے اور کوشش کرتے کہ انجمن اسلامیہ ہال میں ڈاکٹر صاحب ہی خطبہ دیں۔

ڈاکٹر صاحب تقویٰ کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ان کو اپنے نفس پر غیر معمولی قابو حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی ایسی پگڈنڈی پر چل کر گزار دی جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں تھیں لیکن انہوں نے اپنے دامن کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اس طرح سے زندگی کا سفر طے کیا کہ ان کا دامن خاردار جھاڑیوں سے الجھنے نہیں پایا۔ اسی کو تو تقویٰ کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتے تھے کہ کہیں کوئی بات اسلامی حدود سے تجاوز تو نہیں کر رہی ہے۔ لڑکی کی شادی میں وہ کبھی کھانا نہیں کھاتے۔ شرکت ضرور کرتے۔ لیکن ماحول کو اتنا خوشگوار بنا دیتے کہ نہیں کھانے پر بھی لوگ برا نہیں مانتے۔ بلکہ ان کے شریک ہونے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ ایک بار ان کے بہت ہی قریبی دوست کے لڑکے کی شادی تھی، ان لوگوں نے ضد کر لی کہ آپ کو شادی میں چلنا ہی ہے۔ بارات دوسرے شہر میں جانی تھی۔ جب ان لوگوں نے بہت ضد کی تو ڈاکٹر صاحب راضی ہو گئے۔ لیکن کہا کہ ایک شرط پر چلوں گا۔ اور وہ یہ کہ تم لوگ باراتیوں کے کھانے کا خود انتظام کرو گے آخر کار ان لوگوں نے لڑکی والوں کو باراتیوں کے کھانے کا سارا خرچ دیا اور اس طرح اس شادی میں ڈاکٹر صاب شریک ہوئے۔

جنت کے درجات اللہ تعالیٰ نے یوں ہی تو نہیں بنائے ہیں۔ تقویٰ کا اعلیٰ مقام پانے والوں کو تو ہی جنت الفردوس میں جگہ ملے گی۔

ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی مفلوک الحالی میں گذری۔ کئی بڑی بڑی آزمائشوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ایمرجنسی میں دوسرے ذمہ داران جماعت وارکان کی طرح پوری مدت تک جیل میں رہے۔ پٹنہ کے پھلواری شریف جیل میں ان کو رکھا گیا تھا۔ ہم

لوگ ان سے ملنے کبھی کبھی جیل جایا کرتے، ان کے تروتازہ اور نورانی چہرہ کو دیکھ کر کسی طرح سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ جیل کی صعوبتوں سے دوچار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لاولد تھے، انہوں نے ایک چھوٹی بچی کو گود لیا تھا۔ بڑے ہی پیار و محبت سے اس کی پرورش کی۔ دہلی مجلس شوریٰ یا مجلس نمائندگان میں جب وہ آتے تو مجھ سے اس بچی کے لئے کھلونا ضرور منگواتے۔ وہ بچی جب جوان ہوئی اور ڈاکٹر صاحب اس کی شادی کرنے ہی والے تھے عین عالم شباب میں ایک حادثہ میں اس بچی کی موت ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مردمومن کی طرح صبر کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھا اور راضی بہ رضا ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ مستقل مریضہ تھیں۔ انتقال سے چند سال پہلے تو وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکی تھیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے آخری دم تک اپنی اہلیہ کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہر لحاظ سے حق رفاقت ادا کیا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب بھی کئی سالوں سے مستقل بیمار چلے آرہے تھے۔ کئی بار آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر احسن احمد صاحب اور ڈاکٹر صدیقی صاحب پٹنہ کے ایک مشہور سرجن ان کے مداحوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے علاج کے لئے انہوں نے اپنی پوری صلاحیت لگادی تھی۔ لیکن موت کا کوئی علاج نہیں ہوتا آخر آزمائش کی گھڑی مکمل ہو چکی اور وہ اپنے رب سے جاملے۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کا خاتمہ ایمان کی حالت میں ہو۔

قیم جماعت اسلامی ہند جناب محمد جعفر صاحب جو ان کے بہت ہی عزیز شاگرد ہیں کا تعزیتی بیان جو ۱۶/جون ۹۸ء کے سہ روزہ دعوت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تاثرات پیش کرتے ہوئے جو جملے کہے ہیں کہ ''میں ذاتی طور سے انہیں اپنا سب سے بڑا محسن، مربی و مشفق سمجھتا ہوں''۔ ڈاکٹر صاحب کے لئے اس سے بہتر خراج عقیدت اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

(بشکریہ سہ روزہ ''دعوت'' دہلی)

مصطفیٰ خاں صاحب، سہ روزہ دعوت دہلی کے شعبہ اشتہارات کے ذمہ دار، ایام جوانی میں اور قیام پٹنہ کے دوران ڈاکٹر صاحبؒ سے قربت اور طلبہ تحریک سے وابستگی۔ (قیام: دہلی)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ

ایک ولی صفت بزرگ

صلاح الدین احمد

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے پانچ سال گذر چکے لیکن اب بھی اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں موجود ہیں۔ ان کے عقیدت مندوں کی تعداد کا اندازہ لگانا میرے لیے مشکل ہے کہ کہاں کہاں پھیلے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک بڑی تعداد ہے جو ان کی خدمات اور خوبیوں کی معترف ہے۔

میری ملاقات ان کے آخری دور میں اس وقت ہوئی جب میں اپنے آبائی محلہ سے خاندانی بٹوارے کے بعد ۱۹۸۸ء میں عالم گنج میں آباد ہوا اور ان کا پڑوسی بنا۔ میں ان کے اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر ان سے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ واقعی وہ علم وعمل اور ظاہر و باطن ہر دو اعتبار سے ایک ایسی شخصیت تھے کہ ان کے رابطے میں آیا ہوا کوئی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

میری نظر میں ان کا سراپا کچھ ایسا تھا: سرخ وسپید تبسم ریز چہرہ، بڑی بڑی پرنور آنکھیں، شرعی داڑھی، نہ بہت چھوٹی نہ بہت بڑی، لباس بہت سادہ۔ نہ جبہ نہ دستار، بس قمیص پاجامہ، پھر بھی ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔

ڈاکٹر صاحب دین کے بے لوث خادم تھے۔ ان کی زندگی میں خودداری اور انکساری کا حسین امتزاج تھا۔ وہ اخلاق کریمانہ کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے۔ میں ان سے ملنے جاتا، دروازے پر آواز دیتا تو ایک پر جلال آواز سنائی دیتی ''کون ہے۔ اندر آجایئے یا تشریف لایئے''۔ میرے ہی ساتھ نہیں، ہر آنے والے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا یہی سلوک ہوتا۔ پھر وہ سراپا محو گفتگو ہو جاتے۔ ایسی دلچسپی کہ مخاطب یہ سمجھے کہ بس ساری محبت سارا پیار اسی کے لیے ہے۔ یہی ان کا مزاج تھا ہر کسی کیلئے۔ ڈاکٹر صاحب تحریک اسلامی کے قائدین میں تھے۔ اشاعت دین کی فکر، اصلاح معاشرہ کی فکر، بے کار مسلم نوجوانوں کے روزگار کی فکر، مسلم بچیوں کے لیے رشتے کی فکر، ساری فکریں ڈاکٹر صاحب کو تھیں۔ ان کے عقیدت مندوں میں اہل ثروت بھی تھے اور غریب بھی مگر خودداری کا یہ عالم کہ لوگ ہزار چاہیں کہ ڈاکٹر صاحب کچھ لیں مگر مالی عسرت اور پریشانی کے باوجود کیا مجال کہ قبول کرلیں۔ ہاں کھانے کی کوئی چیز کسی نے تحفہ میں لاکر دی تو قبول کرلیا۔ وہ بھی اکیلے نہیں کھاتے تھے، حاضرین کو ساتھ کھلاتے۔ مگر حلال وحرام کی بہت فکر تھی اسلئے تحقیق کرلیتے تھے۔ دوسری طرف ان کا حال یہ تھا کہ ضرورت مند احباب کی ضرورتیں بہ اصرار پوری کرتے۔ بقول شخصے 'وہ دے کر خوش ہوتے تھے لے کر نہیں'۔

جب میں نورانی دواخانہ میں ملازمت کرتا تھا تو ڈاکٹر صاحب بعض ادویات مثلاً شربت محلل، حب کبد نوشادری، معجون، خمیرے اکثر منگواتے۔ ہم انہیں پہنچا کر ان کی محبت وشفقت اور دعاؤں سے نوازے جاتے۔ نورانی دواخانہ کے ناظم حکیم خلیق الزماں صاحب بھی ان کے بڑے شیدائی اور عقیدت مندوں میں ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی کہ ڈاکٹر صاحب کوئی بھی دوا بلا قیمت قبول کرلیں مگر افسوس کہ ان کی یہ تمنا ڈاکٹر صاحب نے کبھی پوری نہ ہونے دی۔ دوا آئی، قیمت پوچھا اور قیمت دے دی۔ خلیق الزماں صاحب نے بارہا ہم سے کہا کہ دوا دے کر نکل جایئے گا، قیمت نہ لیجئے گا، مگر ڈاکٹر صاحب کہاں موقع دینے والے تھے۔ قیمت لینے سے انکار کیا تو دوا لینے سے بھی انکار ہوا۔ اللہ اللہ! یہ تھی پرہیزگاری اور احتیاط۔ انتقال سے شاید ایک دو ماہ قبل ہزاروں روپے کی قیمتی ادویات، قیمتی دھات، مفردات سب نورانی دواخانہ کو میرے توسط سے بھجوادیا۔ خلیق الزماں صاحب نے اس کی قیمت دریافت کرایا تو محبت اور

خلوص کے شیرہ میں بھگویا ہوا جواب ملا ''ارے تم ہی لوگ تو میرے اپنے ہو'' اور پھر ماہ جون ۹۸ء میں لو لگنے کا بہانہ ہوا، کئی روز تک پی ایم سی ایچ میں بے چینی کے عالم میں گذرا، محلّہ اور شہران کی خدمت اور خیریت کے لیے ٹوٹ پڑا مگر انہیں جانا تھا چلے گئے، انتقال کی خبر مشہور ہوتے ہی لوگ سیلاب کی طرح دوڑ پڑے۔ کہاں کہاں سے لوگ آئے۔ قبرستان چند قدم پر اور کاندھا دینے والے بے شمار۔ چنانچہ بانس باندھا گیا کہ سبھوں کو سعادت حاصل ہو۔ پانچ منٹ کی راہ دو گھنٹے میں طے ہوئی۔ نماز جنازہ ان کے قریبی عزیز حکیم سید شاہ علیم الدین بلخی سابق پرنسپل طبیہ کالج پٹنہ نے پڑھائی۔ اس کے بعد ایسا لگا کہ ہم پھر سے یتیم ہو گئے۔ ذہن پر بڑا اثر ہوا۔ کئی روز تک عالم جنون میں ان کی قبر پر بیٹھنا، آہستہ آہستہ پکارنا ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب، کبھی کمرے کے دروازے پر پکارنا اور پھر آبدیدہ ہو جانا۔ لوگ سمجھا بجھا کر گھر چھوڑ جاتے۔ وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ ہم نارمل ہو گئے مگر ان کی یادوں کی قندیل اب بھی دل میں روشن ہے۔

ہمارا ان سے آخری دور کا ساتھ ہوا۔ شاید آٹھ سال کا عرصہ رہا، مگر بہت کچھ ان سے سیکھا۔ یہ آٹھ سال کی بجائے اگر ساٹھ سال بھی ہوتا تو کم ہوتا کہ وہ علم کا سمندر اور کردار کی بہت بلندی پر مسند نشیں تھے۔ ان کے عزیزوں کو ان کے قریب کبھی نہ دیکھا۔ ان کے عزیز، ان کے رشتہ دار سب کچھ ان کے عقیدت مند ہی تھے جو آخری وقت تک ان کی خدمت میں لگے رہے۔ محلّہ ہی کے ایک نیک دل عبدالحلیم صاحب نے اپنے مکان میں ایک کمرہ دے رکھا تھا جہاں وہ اور ان کی اہلیہ رہتی تھیں۔ صاحب خانہ کو بھی ان سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ گھر کے افراد بھی ان کو گھر کا فرد سمجھتے، خدمت کرتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اہل خانہ کے ساتھ شفقت و محبت کا سلوک رکھا۔ ان کی دو بچیاں تھیں جنہیں علم اور تربیت سے آراستہ کیا۔ ایک ابینہ خاتون تو باضابطہ تحریک اسلامی کی رکن بنیں اور حلقہ طالبات کی انچارج، اس کے علاوہ دفتر حلقہ کی ہمہ وقتی کارکن بن کر حلقہ خواتین میں دورے وغیرہ کی خدمات انجام دیں۔ چھوٹی صاحب زادی کو ہومیوپیتھ کا علم بھی سکھایا۔

ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بولے خیر تو ہے، پریشان سے نظر آرہے ہو۔ شاید بیٹے کے یہاں سے خرچ نہیں آیا ہے۔ لو یہ رکھو اور پانچ سو روپے عنایت کر دیے۔ ضرورت نہ تھی۔ انکار کیا تو بولے رکھ لو، بیٹا کے یہاں سے آئے تو دے دینا، قرض دے رہے ہیں۔ احتراماً رکھ لیا، چند روز کے بعد لوٹا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد واقعتاً ایک ہزار روپے کی شدید ضرورت پڑ گئی۔ ذکر کیا تو بولے ایک گھنٹہ کے بعد آؤ۔ دوبارہ حاضر ہوا۔ دیکھا مٹھی میں روپے لئے انتظار کر رہے ہیں۔ لے لیا، پھر کام ہونے پر واپس کر دیا۔ ایسا رشتہ بن گیا تھا ان سے۔ اب ایسے مہربان لوگ کہاں ہیں۔ بقول شاعر

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

ایک بار میں نے عرض کیا، میری بچی کے مونڈھے میں اکثر درد رہتا ہے، ذرا چل کر دیکھ لیتے اور افراد خانہ کو کچھ نصیحت بھی کر دیتے۔ از راہ شفقت گھر پر آئے، بچی کو دیکھا، گھر والوں کو نصیحت کیا۔ بچی نے فرنی پیش کیا۔ کہنے لگے کرائے کا مولوی سمجھا ہے کیا، اصرار کیا تو دلجوئی کیلئے ایک دو چمچہ لے لیا۔ پھر اصرار کیا تو کہنے لگے، بیٹے کی شادی پر ولیمہ کھلا دینا، کھالینگے۔ پھر ساتھ لے کر کمرے پر آئے اور ایک شیشی دوا دی اور ہدایت کی، پانچ پانچ گولیاں ایک دن ناغہ کر کے کھلاؤ، انشاء اللہ شفا ہوگا۔ اور شفا ہو گیا۔ میں نے ہمت کر کے پچاس کا ایک نوٹ دینا چاہا تو کہنے لگے واہ میاں، ایک طرف تو محبت و دوستی کا دعویٰ کرتے ہو دوسری طرف غیروں کی طرح دوا کی قیمت بھی دیتے ہو، میں نے اصرار کیا مگر ڈاکٹر صاحب نے قبول نہ کیا۔ ایک دن میرے برادر نسبتی مظاہر الدین انجینئر جو ڈاکٹر صاحب سے ان کی کتابیں وغیرہ پڑھ کر عقیدت رکھتے ہیں میرے توسط سے محبوبی پکوا کر ڈاکٹر صاحب کیلئے بھجوائی۔ ڈاکٹر صاحب بیٹھے

کے شوقین تھے۔ میں لے کر پہنچا تو خوش ہو کر دعائیں دیں مگر جب میں نے اپنے برادر نسبتی مظاہر الدین صاحب کا غائبانہ تعارف کرا کر یہ بتایا کہ انہوں نے بھجوائی ہے تو اچانک خاموش ہو گئے۔ پھر پوچھا، ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ کہیں ناجائز تو نہیں؟ اللہ اللہ! کتنا خیال تھا جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا۔ بہر حال جب میں نے کسب حلال کا یقین دلایا تو قبول کر لیا۔ میری بچی کے رشتہ کیلئے بہت فکر مند رہا کرتے تھے۔ آنے جانے والوں سے کہتے رہتے۔ ایک دن ہنس کر کہا، یہاں تو لڑکی ہی والے آتے ہیں، لڑکا والا کوئی نہیں آتا۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک نمایاں خوبی یہ دیکھی گئی کہ ان کی شخصیت آخر تک غیر متنازعہ رہی۔ موصوف نے کبھی بھی فروعی اور اختلافی موضوع کو اپنے قریب نہ آنے دیا۔ ہمیشہ دین کی اصل اور بنیاد کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے رہے اور اسی پہلو سے قریب آنے والوں کی فکری و اخلاقی تربیت بھی کرتے رہے۔

بہت سے واقعات ہیں، بطور نمونہ میں نے چند کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ولی صفت انسان تھے، بے ریا اور مخلص خادم دین اور حقیقت یہ ہے کہ صاحب علم اور صاحب کردار شخصیت تھے۔ ایسے انسان روز روز نہیں پیدا ہوتے بلکہ فلک کی برسوں گردش کے بعد جنم لیتے ہیں۔ شاد نے کہا تھا

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کا شمار بھی ایسی ہی ہستیوں میں تھا جو نایاب تو نہیں مگر کمیاب ضرور تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ہمیں بھی ان کے نقش قدم کی پیروی میں دین کا مخلص خادم بنائے۔ آمین!

صلاح الدین صاحب، ڈاکٹر صاحبؒ سے عقیدت کا رشتہ اور ان سے دیرینہ رفاقت۔ (قیام: پٹنہ)

نذر ضیاء الہدیٰ

حرف و صوت

تقریباً تین سو (۳۰۰) صفحات پر مشتمل ڈاکٹر صاحبؒ کی تحریر و تقریر کے اس حصہ میں قبل شدہ طبع شدہ اور غیر طبع شدہ مضامین ہیں۔ انہیں موضوع کے اعتبار سے چھ ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان تحریروں کو زمانی ترتیب دی گئی ہے، تا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے فکری سفر کا بھی ایک اندازہ ہو جائے۔

تفكر في القرآن

تدبر فی القرآن

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

(یہ مضمون حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے مجلّہ 'میزان' کے ستمبر ۱۹۷۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

ہمیں تعجب ہے امت مسلمہ پر جس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہے تاہم ۸۰۰ برسوں سے وہ آخرت اور دنیا دونوں کے معاملے میں مسلسل انحطاط کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس نے قرآن سے استفادہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ قرآن سے بنیادی استفادہ تو یہ ہے کہ آدمی زندگی گذارنے کا طریقہ اس سے معلوم کرے، مگر وہی قرآن دیگر علوم کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے اور ان کے حصول کے لئے گائڈ لائنس دیتا ہے۔

جہاں تک نظام حیات کا تعلق ہے اللہ کا شکر ہے کہ ربع صدی سے بلکہ کچھ زیادہ سے اس کے لئے قرآن کی طرف رجوع کیا جانے لگا ہے۔ اور اب غالباً قرآن کو اپنے ماننے والوں سے اس معاملے میں بے توجہی کی شکایت نہیں ہوگی۔ لیکن جہاں تک علوم کا تعلق ہے ان کے حصول کے لئے اب بھی قرآن سے نہ تو وہ کوئی Incentive لے رہے ہیں اور نہ ہی Guide Lines۔ قرون اولیٰ میں اسلام کو بحیثیت نظام زندگی غالب کرنے کے بعد دوسرے تمام علوم میں جو مقام مسلمانوں نے پیدا کیا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اب جبکہ اسلام کو پھر بحیثیت نظام زندگی غالب کرنے کی جدو جہد کی جا رہی ہے تو اس دوسرے رخ پر بھی کام کی ابتداء ضروری ہونی چاہئے۔

ہمارے اسلاف کو یہ دشواری درپیش تھی کہ ان کو تمام علوم کو ایک حد تک ابتداء سے لے کر چلنا پڑا۔ لیکن آج ہمارے لئے یہ سہولت میسر ہے کہ بہت سارے علوم بڑی حد تک ان کے مدون کیے ہوئے موجود ہیں اور ان میں دور جدید میں اضافے بھی ہوئے ہیں۔ ہم کو نئے سرے سے ابتداء نہیں کرنی ہے بلکہ ان تمام دریافتوں کو بنیاد بنا کر آگے کی طرف پیش قدمی کرنی ہے۔ بعض مسلم ممالک اتنے خوش حال ہیں کہ وہ اس کام کو انجام دینے کے لئے تمام سہولتیں فراہم کر سکتے ہیں۔ اور علوم وفنون کے ارتقاء کی طرف جس حد تک ان کا رجحان ہے مجھے امید ہے کہ وہ ایسا کرنے میں ہرگز دریغ نہیں کریں گے۔ میں اپنی نئی نسل کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اٹھے اور اس تاریخی خلاء کو پر کرنے کی کوشش کرے۔

قرآن پاک میں بعض علوم کی طرف بالکل واضح اشارہ ملتا ہے اور بعض کی طرف لطیف۔ Biochemistry کے سلسلے میں انسانوں کو شروع سے ہی ماء الحیات..... (Elixir of life) کی تلاش رہی ہے۔ اور ساری ادویہ کی دریافت اسی تلاش کے نتیجے میں ہوسکی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ وہ ہر قسم کے میووں اور پھلوں کے رس جمع کرے چنانچہ اس کے پیٹ سے ایک پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ریسرچ کرنے والوں کے لئے بعض واضح نکات بیان فرمادئے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مختلف بلندیوں Altitudes کا ذکر کیا ہے۔ فضا سے Cosmic Rays یعنی فضائی لہریں آتی ہیں جو زندگی بخش توانائیوں سے بھرپور ہوتی ہیں۔ ان کا سب سے زیادہ حصہ وہ شہد جذب کرتا ہے جو پہاڑ کی بلندیوں پر بنائے ہوئے چھتوں سے نکلتا ہے۔ اس سے کم حصہ اس شہد میں ہوتا ہے جو درختوں میں لگائے ہوئے چھتوں سے نکلتا ہے۔ اور اس سے بھی کم اس شہد میں ہوتا ہے جو گھروں کے چھتوں سے نکلتا ہے۔ اس طرح مختلف بلندی سے حاصل ہونے والے شہد کی مختلف قسمیں ہوجاتی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر طرح کے پھول اور پھل سے رس چوس۔ یہ بات خود واضح کرتی ہے کہ ہر بیماری کی دوا شہد میں ہونا چاہئے۔ کون شہد کس بیماری کے لئے مفید ہوگا اس کے لئے اللہ نے مزید اشارہ فرمایا کہ شہد کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں پر یکجا غور کرنے سے یہ بات سمجھ

میں آتی ہے کہ ریسرچ کرنے والوں کو مختلف بلندیوں، مختلف پھولوں اور پھلوں اور مختلف رنگوں کو اپنے ریسرچ کی بنیاد بنانا چاہئے۔

قرآن میں اللہ نے فرمایا: ''قسم ہے آسمان کی اور طارق کی۔ طارق کیا ہے؟ روشن ستارہ ہے۔ ہر نفس کے اوپر نگراں ہے''۔ والسماء والطارق وما ادرک ماالطارق النجم الثاقب ان کل نفس لما علیها حافظ ۔(الطارق:۱تا۴)۔

کیا روشن ستارے گواہی میں پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے مسلمان سائنسدانوں کو ادھر توجہ نہیں دلائی کہ مذکورہ روشن ستارہ کس طرح لوگوں کی رات کی تاریکیوں میں نگرانی کرتا ہے۔ کس طرح گھروں اور کھوہوں کے اندر رہنے والوں کی حرکات وسکنات کی Reading لیتا ہے۔ مثلاً کن ستاروں سے کون کون سی شعاعیں آتی ہیں جو ہر جگہ پہنچ کر انسان کے اعمال کو Record کر لیتی ہیں۔

اس طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کے جنس سے بھی انہیں کے مثل''۔ کیا یہ بھی کوئی غیب کی یا متشابہات کی قسم سے کوئی بات ہے۔ جس پر تدبر کی ضرورت نہیں تھی؟ آخر آسمانوں کی طرح یہ زمین بھی تو اس کائنات کے اندر ہونگی اور مادی ہونگی۔ ان کے سلسلہ میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرنا کیا مسلمانوں کا کام نہیں ہے؟ کیا یہ کام بھی غیر مسلم ماہرین ہی کو کرنا ہے؟

قرآن میں اللہ نے یہ بات بتانے کے لئے کہ قرآن کی یہ وحی ایک رسول کریمؐ یعنی جبرئیل امینؑ کا قول ہے اور س کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے شہادت کے طور پر یہ قسم کھائی: فلا اقسم بالخنس. الجوار الکنس. واللیل اذا عسعس. والصبح اذا تنفس. انه لقول رسول کریم. ''پس نہیں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو سیدھے چلتے چلتے پیچھے ہٹنے لگے ہیں۔ اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ رخصت ہوئی اور صبح کی جب وہ آنے لگے یہ قرآن اللہ کا کلام ہے ایک معزز فرشتہ یعنی جبرئیل کا لایا ہوا''۔(عبس:۱۵تا۱۹)

کیا اس میں کسی علم کی طرف اشارہ نہیں ہے وہ علم جس کا تعلق آواز یعنی Sound یا اشارہ یعنی Signal سے ہو۔

اسی طرح ایک سائنس (علم) اور ہے جس کو اب تک چھوا نہیں گیا ہے۔ اور جس کا اشارہ ان آیتوں سے ملتا ہے:

''اور وہ ایسا ہے جس نے دریاؤں کو ملایا جن میں ایک کا پانی تو شیریں تسکین بخش ہے اور ایک کا پانی شور اور تلخ ہے اور ان کے درمیان میں اپنی قدرت سے حجاب اور مانع قوی رکھ دیا ہے اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے یعنی (نطفہ) سے آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا''۔ وهو الذی مرج البحرین هذا عذب فرات وهذاملح اجاج وجعل بینهما برزخاو حجرا محجورا. وهوالذی خلق من الماء بشرا فجعله نسبا وصهرا. (الفرقان:۵۳،۵۴)

ان آیتوں میں ایک ایسے علم کی دریافت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں رشتہ ازدواج کو بہت مفید بنیادوں پر قائم کرنا ممکن ہو جائے گا۔ جس طرح ایسے سمندر ہوتے ہیں جن کا پانی ایک دوسرے میں نہیں ملتا اسی طرح بعض دو خاندان یا مرد اور عورت پر مشتمل دو افراد کے خون میں بھی کچھ ایسا تضاد پایا جاتا ہے کہ ان دونوں کے خون کو ملا دینا مفید نتائج نہیں پیدا کرتا۔ اس لئے خون کی کوئی ایسی جانچ ہونی چاہئے جس کے بعد یہ فیصلہ آسان ہو جائے کہ پیش نظر لڑکا اور لڑکی کے درمیان، زن وشوہر کا رشتہ مفید ہوگا یا غیر مفید۔

خون کی اب تک جتنی قسمیں دریافت کی گئی ہیں وہ طبی مصالح کے پیش نظر کی گئی ہیں۔ میرا منشاء خون کی ایسی جانچ اور ایسی تقسیم سے ہے جو اخلاقی اثرات کو واضح کر سکے۔ یہ اس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایسی غذائیں جو مفسد اخلاق ہیں یا ایسے اعمال جو مخرب اخلاق ہیں، دیکھا جائے کہ ان کے بعد یا ان کے زیر اثر آدمی کے خون میں کس طرح کی خوردبینی یعنی Micro تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اس نہج پر اگر کوشش کی جائے تو مجھے توقع ہے کہ خون کی کوئی ایسی جانچ ہو سکتی ہے اور ایسی قسمیں دریافت ہو سکتی ہیں جن کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ اخلاقی لحاظ سے دو شخصوں کے درمیان ازدواجی رشتہ کا قیام مفید ہوگا یا مضر۔

یہ سارے ہی علوم مادی اور طبعی ہیں، روحانی اور غیب سے متعلق نہیں ہیں جو بطور مثال ناظرین کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ بے شمار علوم ہیں جن کی طرف ہماری نسلوں کو توجہ کرنی ہے۔ اس سلسلے میں ایک آخری بات یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اللہ کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے اس کائنات میں تصرف کی صلاحیت انسان کے اندر کس حد تک ودیعت کی گئی ہے۔ تو مطالعہ قرآن کے نتیجہ میں میں نے یہ سمجھا ہے کہ اللہ جس مشیت کے تحت اس کائنات کو چلا رہا ہے اس کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جس کے فاعل کی حیثیت سے وہ اپنے لئے واحد متکلم کی ضمیر استعمال کرتا ہے۔ یہ سارے کام بالکل اس کے لئے مخصوص ہیں کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرے وہ کام جن کے فاعل کی حیثیت سے وہ اپنے لیے جمع متکلم کی ضمیر لاتا ہے۔ اس ضمیر کے استعمال کی موٹی موٹی دو غرض ہے۔ ایک غرض تو اپنی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور دوسری غرض بے شمار مقامات پر یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سارے کاموں کو اپنی بنائی ہوئی فطرت کے متعین قوانین کے تحت چلا رہا ہے۔ اس کا جس حد تک بھی انسان کو علم حاصل ہو جائے وہ بھی ان کی پابندی کرتے ہوئے اس کائنات میں تصرف کرسکتا ہے۔

بطور مثال ایک مسئلہ انسان کے نفس میں پیدا ہونے والے خیال کو معلوم کرنے کا ہے۔ Psychology اور Thought Reading وغیرہ قسم کے بعض علوم پہلے سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان سے بھی زیادہ قابل اعتماد ذریعہ دریافت ہوسکتا ہے۔ اور میرے اس خیال کی بنیاد قرآن کی اس آیت پر ہے۔ ولقد خلقنا الانسان ونعلم ماتوسوس به نفسه۔ ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔'' (ق:١٦)۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی فوق الفطرت طاقت کا اظہار نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہاں فطری عوامل کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور اگر مجھے قیاس کی اجازت ہو تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سائکوریڈیولوجی یا اس قسم کے کسی نئے علم کی دریافت اس حقیقت پر سے پردہ اٹھادے گی۔

اس طرح سورہ لقمان کی آیت۔ وانزلنا من السماء ماء فانبتنا فيها من كل زوج كريم۔

''اور ہم نے آسمان سے بارش برسایا پھر اس زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں''۔ (سورہ لقمان:١٠)

اس میں آسمان سے بارش برسانے کے کام کے لئے جمع متکلم کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ بارش کا برسنا اللہ کے متعین فطری قوانین کے تحت ہوتا ہے، جن کا علم حاصل کر کے انسان بھی بارش برسانے کے لائق ہوسکتا ہے۔ یا مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے سلسلے میں یہ فرمایا کہ میں نے اپنی روح اس میں پھونکی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اللہ کی خصوصی قدرت کے تحت ہوئی جو کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلے میں وہ فرماتا ہے کہ ہم نے اپنی روح مریم کے رحم میں پھونکی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے یہ کام اپنے ان فطری قوانین کے تحت کیا جن کے مطابق عام طور پر آدم زاد ہوئے ہیں۔ اور اگر انسان ان قوانین کو جان لے تو وہ بھی بغیر مرد کے ملاپ کے عورت کے رحم میں بچہ پیدا کرسکتا ہے۔ یہ تو انسان کی تخلیق کے سلسلے کی بات ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ عام حیوان کو زندگی کس طرح عطا ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں انسان کے تصرف کی آخری حد کیا ہوسکتی ہے۔ تو قرآن کہتا ہے: ''ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے بنایا ہے''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حیات یعنی زندگی کا معاملہ فوق الفطری طاقت سے نہیں بلکہ فطرت کے لگے بندھے طریقوں سے ہی اللہ تعالیٰ انجام دیتا ہے۔ اس لئے انسانوں کے لئے عمل کا میدان بھی اپنی حیرتناک وسعتوں کے ساتھ کھلا ہوا ہے کہ وہ اس علم کو حاصل کر کے خلیہ کا کیڑا بھی بنا سکتا ہے اور پیچیدہ ترین حیوان یا جانور بھی پیدا کرسکتا ہے۔ بس اس کی قدرت سے جو باہر ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ نہیں بنا سکتا، اور میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے کمال کی یہ آخری حد ہے۔ کیا مسلمان اس کمال کو خود نہ حاصل کر کے غیر مسلموں ہی کے لئے چھوڑ رکھیں گے؟

آیات اللہ

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ رحمۃ اللہ

یہ مضمون سلسلہ وار ماہنامہ 'رفیق' پٹنہ میں شائع ہوا

قرآن اللہ کی کتاب اور اس کا کلام ہے۔ اللہ وہ ہے جس نے ساری کائنات کو، جس میں ان کے خواص بھی شامل ہیں، وجود بخشا ہے۔ جو کچھ اس نے پیدا کیا وہی پیدا ہوا، اور جو اس نے پیدا نہیں کیا وہ پیدا نہیں ہوا، اس لئے کائنات سے متعلق علم کا کوئی گوشہ یا کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے جو اللہ کو معلوم نہ ہو۔ اس کے برعکس اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی، فرداً فرداً بھی اور تمام مخلوقات بحیثیت مجموعی بھی، ایسی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جس کا علم ہمہ جہتی اور محیط کل ہو، اس لئے اللہ کی کتاب ہی ایسی کتاب ہو سکتی ہے جس کی ہر بات حقیقت کے عین مطابق اور اٹل ہو، ایسی کتاب بھی موجود دنیا میں صرف قرآن ہی ہے، کیونکہ اس کے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو ان کے ماننے والوں نے ضائع کر دیا۔ کتنی تو گمنام ہو چکیں، اور جن کا نام موجود ہے وہ اللہ کا Original کلام نہیں ہے۔ اس لئے قرآن کا مطالعہ کرنے والے کے لئے پہلی ضروری بات یہی ہے کہ اس پر مکمل اعتماد اور یقین کے ساتھ مطالعہ کرے۔

قرآن سے صحیح استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کا براہ راست علم ہو۔ ترجمہ سرسری ہدایت کے لئے تو کافی ہے، لیکن علمی دقائق تک ترجموں کے ذریعے پہنچنا ناممکن ہے۔ اسی طرح جب علم کے کسی شعبے سے متعلق قرآن سے استفادہ کرنا ہو تو مفسرین کی رایوں کو بنیادی اہمیت دینے کے بجائے براہ راست قرآن کے الفاظ اور اس کی آیتوں سے استفادہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ مفسرین کی رائیں اپنے اپنے زمانے کے رجحانات، نظریات اور ہر آن بدلتی چلی جانے والی معلومات سے متاثر ہوتی ہیں۔ جب کہ قرآن براہ راست حقیقت کو بیان کرتا ہے، جس تک رسائی انسان کو بتدریج حاصل ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اگر انسان اگلوں کی رایوں کو بنیاد بنائے گا اور ان کی کھینچی ہوئی لکیروں کی فقیری کرے گا تو آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

قرآن ہدایت کی کتاب ہے۔ ہدایت اس بات کی کہ انسان اللہ کا پیدائشی غلام ہے۔ لہٰذا اس کو اپنے خالق اور رب کی اس طرح اور ایسی عبادت یعنی غلامی کرنی چاہیے جس طرح اور جیسی اس کا رب اس سے چاہتا ہے، جس کے لئے اس نے اسے پیدا کیا۔ وہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ انسان کو اس زمین میں اس نے اپنا خلیفہ بنایا، یعنی اس سے وہ بندگی مطلوب ہے جو بحیثیت خلیفہ انجام دینی ہے۔ لہٰذا ایک طرف تو بحیثیت غلام اسے اپنے آقا کے ساتھ قلبی اور روحانی اور وفاداری کا تعلق نبھانا ہے اور دوسری طرف بحیثیت خلیفہ کائنات میں وہ تصرف کرنا ہے، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے۔ اور یہی اس کی پیدائش کی اصل غرض ہے جس کو وہ انجام نہ دے تو وہ اپنے مقصد وجود کو کھو بیٹھتا ہے، اور ہر سمجھدار آدمی جانتا ہے کہ جو چیز جس مقصد کے لئے بنائی جائے اگر اس مقصد کو وہ پورا نہ کرے تو وہ ردی میں ڈال دی جاتی ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو مبعوث کیا تو ان کی دو حیثیت ہوتی تھی، ایک عبد کی اور دوسرے رسول کی۔ اگر وہ صرف عبدیت کا حق بجالاتے اور رسالت کی ذمہ داریاں ادا نہ کرتے تو اپنا مقصد وجود کھو بیٹھتے، جیسا کہ اللہ نے کہا: یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک. وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ (المائدہ:٦) "اے رسول جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے، آپ کے رب کی طرف سے اسے پہنچائیے، اگر آپ نے

ایسا نہیں کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا''

اس طرح ہر انسان اللہ کا بندہ اور خلیفہ ہے۔ اگر وہ صرف غلامی کے مراسم ادا کرے اور خلافت کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی برتے تو وہ اپنا مقصد وجود کھو دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو مخاطب کر کے فرمایا یا داؤد انا جعلنک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس با لحق (ص:۲۶) ''اے داؤد ہم نے تجھ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر''

چنانچہ آدم کی خلافت کے اعلان پر فرشتوں کو جو حیرت ہوئی کہ جب وہ، یعنی فرشتے، اللہ کی تسبیح و تقدیس کر ہی رہے ہیں تو پھر ایک خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت پیش آئی، تو ان کو سمجھانے کے لئے ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ مشاہدہ نہیں کرایا کہ آدم ان سے زیادہ اور ان سے بڑھ کر تسبیح و تقدیس کرنے والا ہے، بلکہ ان کو یہ مشاہدہ کرایا کہ آدم کو سارے اسماء کا علم دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خلافت کا حق ادا کرنے کے لئے اسماء کا علم درکار ہے۔ تسبیح و تقدیس تو عبدیت کے مراسم ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے قلبی، روحانی، جذباتی اور وفاداری کے رشتے کو مضبوط کرنا مطلوب ہے تا کہ خلافت کا نشہ اس کو اللہ سے بے تعلق نہ کر دے۔ چنانچہ قرآن نے جہاں مراسم عبدیت کے لئے ہدایتیں دی ہیں وہیں عدل و قسط کے قیام کے لئے شریعت اور منہاج Law and Procedure بھی دیا ہے: لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا (مائدہ:۴۸)

ہر انسان بحیثیت خلیفہ کچھ اختیار یعنی Power لے کر پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ بیشتر انسان طاقت کے نشے میں بہہ گئے اور اپنے رب کے وفادار ہونے کے بجائے غدار اور نمک حرام ہو گئے، اور ان دونوں قسم کے خلفاء نے مل کر دنیا میں ظلم و ستم اور فتنہ و فساد مچائے رکھا اور مچاتے رہیں گے۔ جب انسانی تمدن ترقی کرتے کرتے انفرادیت کے دور سے نکل کر اجتماعیت کے دور میں داخل ہو گیا تو حق اور باطل کے لئے کشمکش افراد کے بجائے گروہوں اور قوموں کے درمیان شروع ہو گئی۔ پہلے افراد افراد کے امام ہوتے تھے، اب گروہ گروہوں کے امام ہونے لگے۔ اس دور کی ابتداء حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ کی گئی، جنہیں دنیا کا پہلا امام بنایا گیا، جو اپنی ذات میں تنہا ایک امت تھے۔ ان ابراھیم کان امۃ (سورہ نحل:۱۲۰) ''بے شک ابراہیم ایک امت تھا)''۔

امامت کے لئے رسہ کشی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی اور ہوتی چلی جائے گی۔ اس کشمکش میں کائنات کی چھپی ہوئی طاقتوں کا استعمال بڑھنے لگا اور بڑھتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ موجودہ نظام کائنات کی توانائیاں ختم یعنی Exhaust ہو جائیں گی، جس کے بعد کائنات کا ایک نیا نظام (Order) قائم ہو گا جس کا نام آخرت ہے۔ چنانچہ کائنات کی ان پوشیدہ توانائیوں کو استعمال میں لانے میں جو قومیں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں، عملاً دنیا میں انہیں کو امامت ملتی ہے۔ اس لئے قرآن نے طاقت کے سرچشمے کی بھرپور نشاندہی کی، اور اس پر قبضہ کرنے کے لئے پوری قوت سے ابھارا۔ وہ سرچشمہ ہے اللہ کی نشانیوں پر تدبر اور غور۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابراہیمؑ نے اپنی نسل کے ذریعہ امامت کی تکمیل کی دعاء ☆☆ کی تو آنجنابؑ کی دعاء کا اولین جز یتلوا علیھم ایا تک (البقرہ:۱۲۹) تھا، یعنی جس نبی کے ذریعہ امامت کی تکمیل ہو وہ ان پر، یعنی اپنے ماننے والوں پر، تیری آیتوں کی تلاوت کرے۔ اس کے بعد فرمایا، اور انہیں کتاب

☆☆ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی تکمیل قرآن کی شکل میں ہوئی جو ان چار مضامین پر مشتمل ہے۔

(۱) قرآن کے وہ حصے جن میں اللہ نے اپنی نشانیاں بیان کی ہیں، یا جن پر غور و تدبر کرنے کے لئے اکسایا گیا ہے جن کو آیت یا آیات کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲) وہ حصے جن میں فرائض بیان کئے گئے ہیں جن کے لئے کتب یا کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (۳) وہ حصے جن میں احکام الٰہی سے متعلق حکمتیں بتائی گئی ہیں۔ (۴) تزکیہ سے متعلق ہدایتیں۔

یعنی فرائض کی، اوران احکام میں پوشیدہ حکمت کی تعلیم دے اوران کا تزکیہ کرے۔ چنانچہ تلاوت آیات کے ضمن میں وہ ساری قرآنی آیتیں آگئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کو بطور اپنی نشانیوں کے پیش کیا، یا ان پر غور کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ ان میں اہم ترین اور بنیادی آیتیں یہ ہیں :

ان فی خلق السمٰوت و الارض و اختلاف الیل و النھار لایات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیٰما و قعودا و علی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوت و الارض۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا ۔ سبحنک فقنا عذاب النار (آل عمران:۱۹۱۔۱۹۰)

’’زمین اور آسمان کی پیدائش میں، اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں، ان ہوش مند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں (آیات) ہیں جو، اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں، خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) ’’پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے‘‘

ان آیتوں کی اس بنیادی اہمیت کے پیش نظر ان پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالوں گا:

قرآنی آیتوں پر غور وتدبر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے ہر لفظ کو پوری اہمیت دی جائے اور کسی سے بھی سرسری طور پر نہ گذر جایا جائے، کیوں کہ تیس پارے کی اس کتاب میں علم وحکمت کے وہ بے پایاں ذخیرے جمع ہیں جن کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کے لئے نہ معلوم کتنے لمبے چوڑے دفتر کی ضرورت ہوگی۔ پھر ہر لفظ کے متعدد معانی ہوتے ہیں۔ ہر معنی کو پیش نظر رکھ کر غور کرنا چاہئے کہ وہ اس آیت کے یا اس کی جیسی دوسری آیتوں کے یا بحیثیت مجموعی پورے قرآن کے Frame work میں فٹ Fit ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر فٹ ہوتا ہو تو اس کو زیر غور لانا چاہئے، کیوں کہ ایسا ہوتا ہے کہ ایسے علمی انکشافات سامنے آتے جاتے ہیں جن تک اگلوں کی ذہنی رسائی، بشر ہونے کی وجہ سے، نہیں ہوتی تھی، اس لئے وہ انہیں نظر انداز کر دیتے تھے یا ان کا ذہن ادھر نہیں جاتا تھا۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو اپنے Original الفاظ کے ساتھ محفوظ رکھنے کی ذمہ داری لی ہے تا کہ قیامت تک آنے والی نسلیں اپنے اپنے زمانے کے علوم کی روشنی میں قرآن کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔ چنانچہ زیر غور آیت میں تدبر کرنے کے لئے چند اشارے میں کرتا ہوں، جن پر غور کرنے کا حق ادا ہونا چاہیئے۔

۱۔ اللہ نے فرمایا: ’’ان فی خلق السمٰوت و الارض‘‘ اس میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے سلسلے میں سماوات کا ذکر پہلے کیا اور ارض کا ذکر بعد میں، اور اس طرح کی جتنی بھی آیتیں ہیں سبھوں میں یہی ترتیب رکھی ہے بجز دو ایک آیتوں کے۔ جب کہ فی الواقع تخلیق کے عمل میں قرآن کے مطابق ترتیب اس کے برعکس رہی ہے۔ یعنی ارض پہلے بنائی گئی اور سمٰوات بعد میں آخر ایسا کیوں؟

۲۔ اختلاف لیل ونہار میں لفظ اختلاف کے مفہوم میں کیا کیا داخل ہے، ان تمام پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے، مثلاً طبیعی، اخلاقی سیاسی وغیرہ۔

۳۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’اولوا الالباب‘‘ یہ اولوا الالباب کون لوگ ہیں؟ ضمناً یہ بات اس میں خود پوشیدہ ہے کہ جو لوگ ان آیات پر غور نہیں کرتے ہیں وہ قرآن کے نزدیک اولوا الالباب میں سے نہیں ہیں۔ یہ اولوا الالباب ذہنی طور پر کون ہوتے ہیں اور عملی لحاظ سے کیسے ہوتے ہیں، اس اعتبار سے قرآن نے اس کو خود واضح کر دیا ہے، مثلاً سورہ الرعد میں فرمایا: نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کرتے ہیں، اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش

یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دئے ہوئے رزق میں سے اعلانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہیں لوگوں کے لئے ہے۔ (الرعد:۲۲۔۱۹)

اور دوسری جگہ فرماتا ہے:

الذین یسمعون.........ھم اولوا الالباب ''جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین (حسین) پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے، اور یہی دانشمند ہیں''۔

اور تیسری جگہ سورہ آل عمران والی یہ زیر غور آیتیں ہیں، جن میں ان کی ذہنی اور عملی دونوں کیفیتوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تدبر کی شاہراہ کھول دی ہے۔ جس پر نشانات لگے ہوئے ہیں تاکہ انسان تدبر کرتے ہوئے بھٹکنے نہ پائے۔ جہاں وہ محسوس کرے کہ وہ نشانات راہ نہیں مل رہے ہیں، وہیں وہ سمجھ جائے کہ وہ شاہراہ سے بھٹک گیا ہے۔

آیات پر غور دو پہلو سے کیا جاتا ہے اور کیا جانا چاہئے۔ ایک پہلو یہ کہ کس طرح ہے، اور دوسرا یہ کہ کس لئے ہے۔ پہلا پہلو سائنس سے متعلق ہے اور دوسرا پہلو اخلاق سے متعلق ہے۔

واضح رہے کہ اخلاق سے میری مراد وہ محدود معنی نہیں کہ جو اردو میں مستعمل ہے۔ بلکہ زندگی کے وہ تمام پہلو اس کی گرفت میں آتے ہیں جو خالص Technology کے علاوہ ہیں۔ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کا طریقہ سکھایا اور اس کو مطمح نظر بنا کر کائنات پر غور کرنے کا ڈھنگ بتایا ہے۔ یعنی ایک طریقہ تو وہ جوگیوں کا ہے کہ اللہ کے بارے میں کچھ خود ساختہ تصور قائم کر کے اس کے دھیان گیان میں کھو جایا جائے جس کو آج کل بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن صرف اللہ کے تصور میں گم ہو جانے کے بجائے اس کی پیدا کی ہوئی کائنات پر غور کرنے کو بھی فرمایا ہے، اور اس غور و فکر کے لئے کوئی نشست یا کوئی مخصوص آسن نہیں بتایا بلکہ فرمایا کہ کھڑے بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے ہر حال میں اس غور و فکر میں ان کا ذہن مشغول رہتا ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذہن کی یہ مشغولیت ہمہ وقتی ہونی چاہئے نہ کہ جز وقتی۔ چنانچہ کائنات پر سائنس کے جس شعبے سے بھی متعلق ہو غور کیا جائے اس میں یہ بات ضرور ملحوظ رہنی چاہئے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے، اور وہ تنہا ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے اس کائنات کو باطل نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اس کا ایک مقصد ہے۔ اگر غور کرنے والے کی فکر اس مقصد کی طرف لے جا رہی ہو تو اسے اطمینان سے آگے بڑھنا چاہئے، ورنہ رک کر پھر نشان منزل کو تلاش کر کے اپنا سمت سفر بدل لینا چاہئے۔ وہ مقصد بھی متعین ہے یعنی یہ کہ موجودہ کائنات ایک دوسری کائنات کی طرف رواں دواں ہے جو اس کے بعد آنے والی ہے، اور اس لئے اس کا نام آخرت ہے۔ وہ کائنات دوامی ہوگی اس لئے اس کے ناموں میں سے ایک نام قیامت بھی ہے۔ جب وہ قیامت آ جائے گی تو انسان کے سامنے اس کا آخری اور ابدی انجام سامنے آ جائے گا۔ پھر اگر اس نے اس منزل کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق تیاری کی ہوگی تو وہاں سرخرو اور بامراد ہوگا ورنہ ذلت اور نامرادی سے ہمیشہ کے لئے دو چار ہوگا۔ یہ منزل مقصود اور اسکی طرف بڑھنے کے لئے نشانات راہ اس لئے نہیں بتائے گئے ہیں کہ انسانی فکر کو محدود کر دیا جائے بلکہ اس لئے بتائے گئے ہیں کہ وہ اپنی نادانی کی وجہ سے غلط راہ پر نہ پڑے۔ کائنات پر غور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے عمل تخلیق کے بر عکس زمین کے بجائے آسمان کا تذکرہ پہلے کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مصنوعات کی حقیقت جاننے کے لئے ان کے ظاہر ہی سے ابتدا کرتا ہے اور بتدریج باطن تک پہنچتا ہے، خواہ وہ یہ کام عملاً کرے یا نظری طور پر۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ

سمٰوات کا ذکر پہلے رکھا ہے تا کہ کائنات کی حقیقت جاننے کے لئے انسان اپنے غور وفکر کی ابتداء آسمانوں سے کرے۔ دوسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو بات کو سنتے ہیں اور توجہ سے سنتے ہیں، پھر اس کے حسین ترین مفہوم کے پیچھے چلتے ہیں۔ قرآن میں حسن کا لفظ جو استعمال کیا گیا ہے اس کی حقیقت کو اگر آدمی سمجھ نہ لے تو بہت سے مواقع پر دھوکا کھا سکتا ہے۔ عام طور پر لوگ عجمی زبان میں حسن کا جو سرسری مفہوم ہوتا ہے اسے صحیح سمجھ لیتے ہیں اور اس کے حقیقی مفہوم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے حسن اور زینت کے فرق کو جاننا ضروری ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں فکر اور عمل کے تمام دائروں میں پائی جاتی ہیں۔ حسن کسی چیز کی ذات میں ہوتا ہے جو ہر وقت اس سے وابستہ ہوتا ہے، اور کسی وقت اس سے جدا نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے زینت ایک خارجی اور عارضی چیز ہوتی ہے، مثلاً ایک آدمی اپنی ذات سے حسین ہوتا ہے۔ اس کا حسن چوبیس گھنٹہ اور ہر وقت اپنی جگہ پر برقرار رہتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی جو حسین نہ ہو وہ اوپر سے میک اپ کے ذریعہ اپنے کو خوش نما بنا لیتا ہے۔ ظاہر بیں نگاہ اس سے بے حد متاثر ہوتی ہے لیکن جب یہ میک اپ اتر جاتا ہے تو اس کی اصلی اور کریہہ صورت سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے رکھ رکھاؤ میں بھی کہیں حسن ہوتا ہے اور کہیں زینت۔ ضروری نہیں ہے کہ زینت لازماً بدصورتی ہی کے ساتھ ہو۔ خوبصورتی کے ساتھ زینت ہو سکتی ہے جو خوبصورتی کو دو بالا کر دیتی ہے، مگر بہر حال وہ عارضی اور نمائشی ہی ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح بات کا بھی حال ہے کہ اگر کوئی بات کہی جائے وہ بجائے خود حسین ہو اور دوسری بات ایسی کہی جائے جو بجائے خود تو بری ہو لیکن اس پر زینت کا ملمع چڑھایا ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ اولوالالباب کی صفت میں یہ نہیں بیان فرما رہا ہے کہ بات کی زینت کا وہ اتباع کرتے ہیں، بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ اس کے حسن کا اتباع کرتے ہیں، نہ صرف حسن کا بلکہ حسین ترین مفہوم کا۔ بات کا حسن کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے پھر مجرد حسن کی طرف لوٹنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں فرماتا ہے الذی احسن کل شئ خلقه (السجدہ: ۷) ''ہر چیز جو اس نے بنائی حسین بنائی'' عملاً اللہ کی مخلوقات میں بعض چیزیں ہم کو کریہہ النظر بھی دکھائی دیتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کا حسین یا کریہہ دکھائی دینا اس کے حسین یا کریہہ ہونے کا معیار نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے اندر بعض قوموں کے نزدیک جو چیزیں حسن میں داخل ہیں وہ دوسری قوموں کے نزدیک کراہت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ فطرت میں وہ کون سا قدر مشترک ہے جسے حسن کہا جائے۔ تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جو چیز جس غرض کے لئے بنائی گئی وہ اس غرض کو بخوبی پورا کرے۔ مثلاً کپڑا سینے کی مشین اپنی بنیادی غرض کپڑا سینے کے کام کو بخوبی انجام نہ دے تو وہ حسین شمار نہیں ہوگی، باوجود کہ رنگ و روغن اور Tip top کے لحاظ سے بہت بھلی لگے۔ ایسا ہی کچھ حال قول کا ہوتا ہے کہ اس کا ایک مفہوم تو اس کے اندر موجود ہوتا ہے جو اس کا حسین مفہوم ہوتا ہے، جس کے لئے اس قول میں استعمال ہونے والے سارے الفاظ موزوں ہوتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرا مفہوم کوئی آدمی کھینچ تان کر نکالتا ہے اور سننے والے کو مطمئن کرنے کے لئے شاندار الفاظ اور ادھر ادھر کے دلائل کا غازہ اس پر چڑھا دیتا ہے، تا کہ سرسری نظر رکھنے والا آدمی اس مفہوم پر فریفتہ ہو جائے، تو اس مفہوم کو اس قول کا حسن نہیں بلکہ زینت کہیں گے۔ اور پہلے مفہوم کو حسین کہیں گے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قول کے کئی مفہوم ہوں، اور سب کے سب حسین ہوں تو ان میں جو سب سے زیادہ حسین ہوگا اس کو احسن کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو کسی قول کے مزین مفہوم کے پیچھے نہیں چلتے ہیں بلکہ حسین مفہوموں میں سے احسن یعنی حسین ترین مفہوم ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اس کے پیچھے چلتے ہیں۔

یہی ہیں وہ اولوالالباب جن کے لئے آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور دن اور رات کے الٹ پھیر میں بے شمار نشانیاں ہیں، جن کے ذریعے وہ حقائق تک پہنچ سکتے ہیں۔ رہے دوسرے لوگ تو ان کی رسائی نہ حقائق تک ہوتی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکے گی۔ وہ تو

اپنے مزعومہ خیالات اور تصورات کے پیچھے چلتے ہیں اور اللہ کی باتوں کے حقیقی یعنی حسین مفہوم کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو اللہ کے کلام کا معروضی objective مطالعہ کرتے ہیں، اس لئے وہ تو حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں اور ان کے اخذ کردہ نتائج غیر حقیقی اور غیر علمی یعنی superstitious یا unscientific ہوتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کا مطالعہ کرنے والے کو چاہئے کہ اس کے ایک ایک لفظ کو، اور الفاظ کی ترکیب کو اور ایک طرح کی آیات کے اندر الفاظ کی کمی بیشی یا تبدیلی کو، پوری پوری اہمیت دے۔

زیرِ غور آیات آل عمران، ۱۹۱-۱۹۰، الرعد، ۲۲-۱۹، الزمر، ۱۸ میں کل کائنات پر غور کرنے کے لئے مومنوں کو جو رہنما خطوط (Guide lines) دئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱ ان کو اولوالالباب میں سے ہونا چاہئے جس کی تفصیل قبل گذر چکی ہے۔

۲ کائنات پر غور اور اللہ کا ذکر، دونوں ساتھ ساتھ ہونا چاہئے، اور یہ غور اور ذکر مسلسل ہوتے رہنا چاہئے، کھڑے بیٹھے اور لیٹے، بہ الفاظ دیگر اسی ذکر و فکر میں ڈوبے رہنا چاہئے۔ (تصوف میں حقیقی مراقبہ یہی ہے)

۳ یہ کائنات ازلی نہیں ہے بلکہ کسی کے عمل تخلیق کے نتیجے میں عدم سے وجود میں آئی ہے۔

۴ تخلیق کا یہ عمل تنہا ایک ہستی کا مرہونِ منت ہے جس کا نام اللہ ہے۔

۵ اللہ نے اس کائنات کو باطل نہیں بلکہ حق بنایا ہے۔

۶ اس کا ایک انجام ultimate end بھی ہے۔

۷ یہ انجام موجودہ کائنات کا ہے لیکن اس کے بعد ایک دوسرا سلسلۂ کائنات شروع ہوگا جو ابدی ہوگا اور کبھی ختم نہ ہوگا۔

۸ موجودہ کائنات کے ختم ہونے سے ہم انسان ختم نہیں ہو جائیں گے بلکہ آئندہ سلسلۂ کائنات میں منتقل کر دئے جائیں گے۔ اس لئے ہمارے ذکر و فکر کا اصل ہدف یہی ہونا چاہئے کہ مستقبل کی اس دنیا میں ہم بہتر سے بہتر مقام حاصل کر سکیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ان میں سے ہر ایک نکتے کو ٹھیک سے سمجھ لینا چاہئے۔ پہلی بات یہ کہ اولوالالباب نہ ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ آدمی حقیقت تک نہ پہنچ سکے گا، اور چونکہ قرآن اسی اللہ کا کلام ہے جس نے اس کائنات کو بنایا ہے، اس لئے قرآن کے صحیح مفہوم کو نہیں پانے کے نتیجے میں کائنات پر غور کرتے ہوئے انسان لازماً حقیقت سے دور ہو جائے گا، کیونکہ دونوں کا ماخذ ایک ہونے کی وجہ سے دونوں کا مزاج اور اسلوب ایک ہے۔ اسی طرح دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ کا ذکر اور کائنات پر غور و خوض خود ساختہ ہو تو اس ذکر یا فکر کے نتیجے میں آدمی یا تو رہبانیت کی طرف مائل ہو جائے گا یا ظاہر پرستی کی طرف۔ پہلی صورت میں وہ اپنے مقصد وجود یعنی خلافت کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جائے گا، اور دوسری صورت میں وہ مفسد اور غلط کار خلیفہ بن کر رہے گا، پھر یہ ذکر اور فکر مسلسل نہ ہو تو ذہن کے اندر ارتقاء کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے، اور آدمی پر کائنات کا کوئی راز منکشف نہیں ہو پاتا۔ کائنات کے راز کے انکشاف سے ذہن کی یکسوئی اور طویل یکسوئی ایک ناگزیر شرط ہے۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ کائنات اگر اصلاً ازلی ہوتی تو کس کے لئے، بالخصوص انسان کے لئے اس کا مسخر ہونا ناممکن ہوتا۔ اور ایسی صورت میں ہمت مرداں ایک کار عبث ہوتا۔ لیکن چونکہ کسی نے اس کو وجود میں لایا ہے اس لئے یہ پیدائشی طور پر اپنے موجد کی مسخر ہے۔ اور اس موجد نے اس کو جس جس کے لئے، جس جس حد تک، جن جن

شرطوں کے ساتھ، مسخر کیا ہے یہ مسخر ہونے پر مجبور ہے۔ اسی لئے انسان جب عمل کرتا ہے اور اس عمل کا حق ادا کرتا ہے، تو جس حد تک وہ عمل کا حق ادا کرتا اس حد تک کائنات اس کے تابع ہو جاتی ہے۔ چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ تخلیق خود بخود حادثاتی طور پر ہو گئی ہوتی تو یہ اسی وقت ممکن ہوتا جب کہ کائنات کا بنیادی شیرازہ ابدی ہوتا۔ ایسی صورت میں اس کائنات کے وجود کا نہ کوئی سر پیر ہوتا، اور نہ اس میں کوئی مقصدیت ہوتی اور نہ حکمت، پھر ایسی اوٹ پٹانگ کائنات میں غور کا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر اس کائنات کے خالق ایک سے زیادہ ہوتے تو اس کائنات کے اندر ہم آہنگی نہ ہوتی، اس کے ایک حصے مین ایک طرح کے اصول کارفرما ہوتے، وراس کے دوسرے حصے میں دوسرے حصے کے خالق کے تجویز کردہ کچھ دوسرے اصول کام کرتے ہوتے۔ ایسی صورت میں سائنس کا ارتقاء ممکن ہی نہ ہوتا، کیونکہ انسان فطرت کے کسی قانون کو جاننے کے بعد اس کی بنیاد پر آگے قیاس کرتا ہے اور اپنے تجربات ومشاہدات اور معلومات کے دائرہ میں اضافہ کرتا ہے۔ اگر پوری کائنات میں ہم آہنگی نہ ہوتی تو زمین پر کیا ہوا تجربہ فضاؤں میں جا کر ناکام ہو جاتا، کیوں کہ زمین کسی ایک کی تخلیق ہوتی تو فضائیں کسی دوسرے کی، اور دونوں کے مزاج اور فطری قوانین علیحدہ علیحدہ ہوتے۔ اس لئے ایک سائنس داں کو لازمی طور پر موحد ہونا پڑتا ہے۔ پانچویں بات یہ کہ کائنات کو بنایا تو ہونا اللہ ہی نے مگر باطل بنایا ہوتا، تو جس طرح بے ضمیر لوگوں میں فتنہ فساد کی آگ بھڑکتی رہتی ہے، اس لئے کہ وہ حق سے دور ہوتے ہیں، اسی طرح پوری کائنات فتنہ وفساد سے بھری ہوتی، اور فتنہ وفساد ہی یہاں پھلتا پھولتا اور باطل طریقہ زندگی ہی میں انسان کو آسودگی میسر ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور جب ایسا نہیں ہے تو لازماً اللہ نے اس کائنات کو حق بنایا ہے اور حق کی بنیاد پر پیدا کیا ہے، جس کے مطابق اگر انسان زندگی گذارے تو امن اور سکون سے دوچار ہوتا ہے اور اسے آسودگی میسر ہوتی ہے۔ باطل کا جہاں کوئی سر پیر نہیں ہوتا ہے وہیں اس کی کوئی ایک، اور متعین شکل بھی نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے حق ایک واضح متعین اور شروع سے آخر تک مربوط (systematic) ہوتا ہے۔ اور یہ کائنات ظاہر ہے کہ ایسی ہی ہے۔ اب انسان کا یہ کام ہے کہ اس متعین حق کو معلوم کرے۔ جتنا بھی اس پر منکشف ہوتا جائے اس کو بنیاد بنا کر آگے کی معلومات حاصل کرتا چلا جائے، اور غلط یعنی باطل کے فریب میں مبتلا ہو کر اپنے ذہن اور اپنے وجود کے شیرازے کو بکھرنے نہ دے۔ چھٹی بات یہ ہے کہ غور وفکر کرنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جس کائنات میں وہ رہ رہا ہے، آیا وہ لامحدود (infinite) ہے یا محدود (finite)۔ اگر لامحدود ہے تو اس کی جس طرح مکان کے لحاظ سے کوئی حد نہیں ہونی چاہئے اسی طرح زمان کے لحاظ سے بھی اس کا اختتام نہیں ہونا چاہئے۔ اگر یہ کائنات لامحدود ہے تو ایک محدود انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ لامحدود کو مسخر کر سکے، اس لئے سائنس کو پہلے ہی قدم پر سپر ڈال دینا چاہئے۔ چنانچہ سائنس نے لامحدود کے آگے عملاً سپر ڈال دیا ہے، اور وہ کہتی ہے کہ یہ ہمارے دائرہ (scope) سے باہر کی چیز ہے۔ مثلاً خدا۔ اسی لئے ایک مفکر کو بنیادی طور پر یہ مان کر آگے بڑھنا چاہئے کہ یہ کائنات محدود ہے، اور اس لئے اس کا ایک اختتام ہے۔ اور چونکہ یہ کائنات حق ہے اس لئے اس کا اختتام یونہی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے پیچھے بھی ایک مقصد ہونا چاہئے۔ ساتواں نکتہ یہ ہے کہ حق چونکہ محدود نہیں ہے، اس لئے اس کائنات کے خاتمے کے بعد حق کی بنیاد پر قائم کئے ہوئے وجود کا سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ موجودہ کائنات محدود ہے، اس لئے اس میں ارتقا کی صلاحیت بھی محدود ہے اسی لئے اس کو ختم ہو جانا ہے اور اس کے بعد ایک دوسرا سلسلۂ کائنات شروع ہونا ہے جس میں حق کی بنیاد پر قائم شدہ وجود ارتقاء کے آگے کے مراحل ابدا لآباد تک طے کرتا چلا جائے خواہ یہ ارتقاء مثبت (positive) ہو یا منفی (negative)[1]۔ آخری بات یہ کہ ہم کو یہاں اللہ کے کلام اور کائنات میں پھیلی ہوئی نشانیوں پر تدبر اس حیثیت سے کرنا ہے کہ اس آنے والے آخری لامتناہی ارتقائی مرحلہ میں ہم مثبت ارتقاء کے اہل ثابت ہوں نہ کہ منفی ارتقاء کے۔

---

[1] مثبت ارتقا جنت کی زندگی میں ہوگا اور منفی ارتقا جہنم کی زندگی میں ہوگا۔

یہ ہیں وہ بنیادی نکات جو قرآن اپنے ماننے والے کو دیتا ہے تاکہ وہ اپنے غور وفکر کے مرحلے میں غلط سمتوں میں بھٹکنے نہ پائے، اور اگر کبھی اس کا غور وفکر غلط رخ پر پڑ جائے تو وہ کسی نہ کسی نشان راہ کو دیکھ کر سنبھل جائے اور اپنے فکر کی گاڑی کو صحیح پٹڑی پر واپس لے آئے اللہ الذی خلق سبع سمٰوت ومن الارض مثلھن (سورہ الطلاق)

(اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہیں کے مانند)

اس آیت میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بارے میں بہت سی بنیادی باتیں بتادی گئی ہیں۔ اس غرض کے لئے ہم کو اس کے حسین ترین مفہوم کو سمجھنا ہوگا۔ یعنی اس کے ایک ایک جز کی اہمیت اور ان اجزاء کے باہمی ربط کو دیکھنا ہوگا۔

(۱) قرآن میں سبع سمٰوت عام طور پر طباقاً کے لفظ کے ساتھ استعمال ہوا ہے، لیکن یہاں طباقاً کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے ؟ (۲) سبع سے کیا مراد ہے ؟ (۳) سمٰوت جو سماء کی جمع ہے اس کا مفہوم کیا ہے ؟ (۴) ارض سے کیا مراد ہے ؟ (۵) من کس لئے ہے ؟ (۶) مثلھن میں مثل کا کیا مفہوم ہے ؟ (۷) ان سب باتوں کے پیش نظر آسمان کی ماہیت اور زمین کی ماہیت کیا سمجھ میں آتی ہے ؟

(۱) طباقاً بمعنی طبق بہ طبق (layer upon layer) جہاں آسمانوں کی اس کیفیت کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے وہاں طباقاً استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں پر اس کیفیت کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے، اس لئے اس لفظ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہاں آسمانوں اور زمین میں جو مشابہت (مماثلت) ہے وہ بیان کرنا مقصود ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی بتانا ہے کہ اگر چہ زمینیں بہت سی ہیں جو اپنی ساخت کے اعتبار سے آسمانوں ہی کی مثل ہیں، یا اپنی تعداد کے لحاظ سے بھی آسمانوں ہی کی مثل ہیں، لیکن بہر حال یہ زمینیں ایک دوسرے کے اندر تہہ بہ تہہ یعنی طبق بہ طبق نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک دوسرے سے علیحدہ اپنے اپنے مقامات پر موجود ہیں۔

(۲) سبع کے معنی سات ہیں لیکن کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں کہ عربی اور عبرانی میں سبع کثرت کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ اس کے مطابق سات کی تعداد میں آسمان محدود نہیں ہو جائے گا۔ اگر یہ معنی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمان بھی بے شمار ہیں، اور زمین بھی اسی طرح بے شمار۔ اور اگر پہلا معنی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمان گنتی کے لحاظ سے صرف سات ہیں اور زمینیں بھی انہیں کی طرح صرف سات ہیں۔ میرا اپنا خیال یہی ہے کہ یہی مفہوم صحیح ہے۔

(۳) سماء کے معنی ہیں بلندی، چنانچہ زمین کی سطح سے اوپر جو کرہ ہوا ہے، اس کے لئے بھی قرآن نے سماء کا لفظ استعمال کیا، جیسا کہ فرمایا:

مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابۃ وفرعھا فی السماء

''کلمہ طیبہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمانوں تک پہنچی ہوئی ہیں''۔ (سورہ ابراہیم آیت ۲۴)

اسی طرح کرۂ ہوا سے اوپر جہاں تک سوچا جا سکتا ہے وہ سب اس زمین کے مقابلے میں سماء ہے۔ چنانچہ جو ستارے، سیارے اور چاند ہم کو نظر آتے ہیں، اور وہ بھی جو نظر نہیں آتے ہیں، وہ سب سماء اور سمٰوات کے اندر ہیں۔ اس کو ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو بات کچھ عجیب سی نظر آئے گی۔ وہ یہ کہ جب انسان چاند پر اتر گیا تو چاند اس کے قدموں کے نیچے ہو گیا، اور زمین جس کو ہم زمین (ارض) کہتے ہیں یہ آسمان میں ہو گئی۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آسمان کا لفظ ایک حیثیت سے اضافی (Relative) ہے۔ بہر حال یہاں پر آسمان سے مراد کائنات کا وہ حصہ ہے جو زمین کے دائرہ کشش سے باہر ہے۔ چنانچہ ان سمٰوات میں ایک سماء کا ذکر

قرآن میں سماء الدنیا کے نام سے ہوا ہے۔ دیکھنا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے، اور پھر اس کے اوپر جو سمٰوات ہیں ان کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے۔ یہ سورج، چاند اور سیارے جو ہمارے نظام شمسی کے خاندان کے ارکان ہیں یہ سب اسی آسمان میں ہیں جو سات طبقوں پر مشتمل ہے، اور ان میں سے بھی ان کا تعلق آسمان دنیا سے ہے۔ آسمان دنیا دراصل زمین سے اوپر بلندیوں کا وہ رقبہ ہے جو ہمارے اس نظام شمسی کے جیسے کھربوں نظامہائے شمسی پر مشتمل ہے، جس کو ہم انگریزی کے لفظ milky way سے تعبیر کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس بات پر غور کر لینا چاہئے کہ ہمارا نظام شمسی چند اکائیوں پر مشتمل ہے، جیسے سورج، مریخ، زمین، چاند وغیرہ۔ یہ چند اکائیاں مل کر ایک اکائی یعنی نظام شمسی قرار پائی ہے۔ اب آگے اس طرح کی بے شمار اکائیاں، یعنی نظام ہائے شمسی مل کر ایک اس سے بڑی اکائی بنی، جو کہکشاں کہلاتی ہے۔ ہماری کہکشاں (milky way) سے باہر ہماری کہکشاں کی طرح، کہکشائی اکائیاں(glaxial unit) پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ اکائیاں بھی نظام شمسی کی طرح چھوٹے چھوٹے جھنڈ (clusters) کی شکل میں ہوں گی اور پھر اس طرح کے بے شمار جھنڈ (clusters) مل کر ایک بڑا جھنڈ (super clusters) بناتے ہیں۔ اس طرح ان کہکشاؤں کے جھنڈ (clusters) کی بے شمار تعداد پر مشتمل بڑے جھنڈ کا جو رقبہ ہے وہ دوسرا طبق آسمان ہوگا۔ پھر اسی طرح اس دوسرے طبق آسمان کو اگر ہم ایک اکائی مان لیں، تو ایسی ایسی کئی ایک اکائیوں کا مجموعہ ہماری کہکشاں(milki way) کی طرح کا ایک نظام ہوگا، اور ایسے ایسے بے شمار نظاموں پر مشتمل دوسرے طبق آسمان سے باہر آسمان کا تیسرا طبق ہوگا۔ اس طرح پر ہر آسمان ایک اکائی بن جاتا ہے، اور اس اکائی کے جھنڈ سے بنے بڑے جھنڈ پر جو رقبہ مشتمل ہوتا ہے وہ آسمان کا اگلا طبق ہوتا ہے اس طرح پر آسمان کے سات طبقات ہیں۔

(۴) اب ہم ارض پر غور کریں۔ عربی کا ارض انگریزی کا earth ہے، جو اس سیارے کا نام ہے جو ہمارے نظام شمسی کا ایک رکن ہے جس پر ہم زندگی گذار رہے ہیں۔ مـــن الارض میں جو من کا لفظ آیا ہے اس کا ایک معنی ہے ارض کی جنس سے، اور اس کا دوسرا مفہوم ارض کے وہ اجزا اور شیرازے ہو سکتے ہیں جن سے یہ بنی ہوئی ہے۔ پہلے مفہوم کے مطابق بات یہ ہوگی کہ جیسی زمین یہ ہے جس پر ہم بس رہے ہیں ویسی ہی سات زمینیں ہیں۔ اگر سبع سے مراد گنتی سات لی جائے تو گنتی میں سات زمینیں ہیں، اور اگر کثرت لی جائے تو مطلب ہوگا بے شمار زمینیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ دابہ (biological beings) صرف زمین ہی پر نہیں ہیں بلکہ آسمانوں میں بھی ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہماری جیسی آباد زمینیں آسمانوں میں بھی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آسمانوں میں جو زمینیں ہیں آیا وہ اب تک کی بیان کردہ اکائیوں میں سے زمین کی جیسی چھوٹی اکائی ہے، یا نظام شمسی جیسی، یا آسمان دنیا جیسی، یا اسی طرح پر کسی طبق کے آسمان جیسی اکائیاں ہیں، یا ان میں سے ہر طرح کی اکائیاں ہیں۔ اس کو ٹھیک سے سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ ارض کے معنی کیا ہیں۔ سیبویہ ارض کے معنی موضع اور مکان بتاتا ہے۔ ابن برا کے نزدیک ہر وہ چیز جو نیچے ہے وہ ارض ہے۔ یعنی یہ حیثیت کائنات کے اندر جس مادی گولے کی ہو، یعنی یہ کہ ہم اس پر قیام کر سکیں اور وہ ہمارے قدموں کے نیچے ہو، ارض قرار پائے گا۔ ظاہر ہے کہ نظام شمسی کو ایک کل مان لیا جائے یا آسمان دنیا (کہکشاں) کو ایک اکائی مان لیا جائے تو وہ ہمارے لئے ایک ایسا ٹھوس گولہ نہیں ہوگا جس پر ہم قیام کر سکیں۔ ہم تو اس بڑے گولے کے اندر ایک بہت ہی چھوٹے سے گولے کے اندر قیام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح زمین جن چھوٹے چھوٹے اجزاء سے بنی ہوئی ہے، یعنی جوہر(Atom)، ہم اس کے لئے اتنے بڑے ہیں کہ اس پر قیام نہیں کر سکتے۔ اب اگر آسمان دنیا کو ایک گولہ مان لیا جائے تو وہ ایک ایسی مخلوق ہی کے لئے ٹھوس گولہ ہوگا جو اتنی بڑی اور لمبی چوڑی ہو کہ وہ اس کے اوپر قیام کر سکے، لیکن اس کے اندر ہماری زمین یا دوسرے ستاروں وغیرہ پر قیام نہ کر سکے۔ اسی طرح، جیسا کہ آگے آئے گا زمینی عناصر کے جوہروں (atoms) کے اندر کوئی ٹکڑا ایسا ہو جس پر زندگی پائی جاتی ہو، اور اس پر زندہ مخلوق آباد ہو تو وہ کتنی چھوٹی ہوگی

اس کے بارے میں تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اگر اس مخلوق کے لئے وہ جوہر جہاں ایک ٹھوس گولہ ہوگا وہیں ہماری زمین اس کے لئے ویسی ہی ہوگی جیسی ہمارے لئے آسمان ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اس زمین کے اوپر قیام نہیں کر سکے گی۔ اس طریقے پر مثبت رخ پر سات طبق آسمان تک قیاس کر لیں، اور منفی رخ پر کائنات کی بنیادی اکائیوں سے بنی ہوئے کسی چھوٹے سے چھوٹے گولے تک۔

مِـن کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے بات یہ ہوگی کہ جس چھوٹی اکائی کو ہم اب تک زمین کہتے آرہے ہیں، یا اس کی جیسی دوسری اکائیاں، جو ہمارے نظام شمسی یا آسمان دنیا کے اندر واقع کسی نظام شمسی کی رکن ہوں، جن پر پہنچنے کے بعد اس کی حیثیت بھی زمین کی جیسی ہو جاتی ہے، خود ان کی ساخت سات آسمانوں جیسی ہو۔ اس کو ہم یوں سمجھیں کہ ہم کائنات کے اندر ان کی ساخت کے لحاظ سے جس مقام پر ہیں وہ zero (صفر) ہے۔ ہم نے اب تک آسمان کا تجزیہ کیا اور دیکھا کہ ہر اکائی پہلی اکائی سے بڑی ہوتی چلی گئی ہے۔ ہم اسے کائنات کا ظاہر اور اس کا مثبت (positive) رخ کہیں گے۔ اب ہم باطن کی طرف جا رہے ہیں اور کائنات کا منفی تجزیہ کریں گے۔ تو جس طرح ظاہر کی طرف ہم نے دیکھا کہ اکائیاں بڑی سے بڑی ہوتی چلی گئی ہیں اسی طرح جب ہم باطن میں جھانک کر دیکھیں گے تو ہمیں نظر آئے گا کہ اکائیاں چھوٹی سے چھوٹی تر ہوتی چلی گئی ہیں۔ مثلاً ہماری زمین کا گولہ، اسے بڑی اکائی مان لیا جائے جو ان منفی اکائیوں کے لئے ساتویں طبق آسمان کی حیثیت رکھتا ہے، تو یہ گولہ جن ان گنت اجزاء سے بنا ہوا ہے، یعنی جوہر (Atom) ان میں سے ہر ایک بجائے خود ہمارے نظام شمسی کے مشابہہ ہے۔ جوہر (Atom) کی ساخت میں جو چھوٹا جز برقیہ (Electrone) ہے وہ خود آسمان کے ایک طبق کے مشابہہ ہے، جو ان گنت چھوٹے چھوٹے جوہری ذرات (Atomic Particles) پر مشتمل ہے۔ اور پھر یہ جوہری ذرات جوہر کی طرح بے شمار اور چھوٹے ذرات سے بنے ہیں، جن میں سے ہر جز ایک اکائی ہے اور جو آسمان کے دوسرے نچلے طبق کے مشابہہ ہے۔ اسی طرح کائنات کے باطن کی طرف تحلیل کرتے ہوئے ہم دیکھیں گے کہ اس کے بھی سات طبقات ہیں، اور آخر میں ہم اس اکائی پر پہنچ جائیں گے جو زمینی گولے کی قائم مقام ہوگی، یہ آخری گولہ ایسے اجزاء پر مشتمل ہوگا جو کسی حیثیت سے مرکب نہیں ہے۔ ان بنیادی اکائیوں کو ہم کائنات کی بنیادی اکائیاں کہہ سکتے ہیں، اور یہ اکائیاں دو طرح کی ہیں: مثبت اور منفی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ومن کل شیئ خلقنا زوجین (اور ہر چیز ہم نے جوڑا جوڑا بنائی ہے) چنانچہ کائنات کی یہ بنیادی اکائیاں دراصل اللہ تعالیٰ کی ابتدائی تخلیق ہیں، اس لئے ان کو جوڑوں کی شکل میں ہونا ہی چاہئے۔ اور پھر انہیں جوڑوں سے مرکب در مرکب ہوتی ہوئی پوری کائنات بنی ہے۔

کائنات کی تخلیق کا عمل (Process) مختلف ادوار پر مشتمل ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں بنایا۔ دن سے مراد ہمارا یہ چوبیس گھنٹے کا دن نہیں بلکہ عربی میں دور کے لئے بھی یوم بولا جاتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

ان یوما عند ربک کالف سنۃ مما تعدون

''تیرے رب کے یہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے''۔ (الحج، آیت ۴۷)

اسی طرح سورہ السجدہ آیت ۵ میں فرمایا: 'اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے'۔

اور سورہ المعارج، آیت ۴ میں فرمایا: 'ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے'۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی اکائی سے تخلیق کی ابتدا کرتے ہوئے ارض بننے تک دودن لگے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو سات آسمان بنا دیئے۔ یعنی زمین کے گولے سے اوپر جو سلسلۂ کائنات ہے وہ دودن میں بنا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جہاں پر ہیں وہاں سے منفی (Negative) رخ یا کائنات کے باطن کی تخلیق دودنوں میں، اور مثبت (Positive) رخ پر کائنات کے ظاہر کی تخلیق دودنوں میں ہوئی۔ اس کے بعد آسمان اور زمین کے باہمی تعامل کے نتیجے میں زمین اس لائق بنائی گئی کہ اس پر حیوانات بس سکیں اس میں بھی دودن صرف ہوئے۔

یہ ساتوں آسمان جو کل کائنات میں محدود ہیں، اس معنی میں محدود نہیں ہیں کہ جتنی اس کی وسعت ابتداء میں تھی اتنی ہی پروہ محدود ہیں بلکہ ان کی وسعت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

والسماء بنینها بایدوانا لموسعون

''ہم نے آسمان کو ہاتھ سے بنایا اور ہم موسع ہیں''۔ (سورہ الذاریات آیت ۴۷)

اس میں موسع کے معنی مترجمین نے وسیع القدرت وغیرہ لکھا ہے لیکن بہر حال اس لفظ کا بنیادی مفہوم وسعت دینے والا ہے، یعنی ہم آسمان کو وسعت دینے والے ہیں۔ آسمان نرے بے جان مادی گولوں سے بنے ہوئے مجموعوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ان کے بے شمار کام ہیں جن کو انجام دینے میں وہ لگے ہوئے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

واوحی فی کل سماء امرها

''اور ہر آسمان میں اس کے احکام وحی کر دیئے''۔ (حم سجدہ: ۱۲)

ذی حیات (Biological) مخلوق صرف ہماری زمین پر نہیں بلکہ آسمانوں (صرف ایک آسمان نہیں) میں بھی موجود ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ولله یسجد ما فی السموت و ما فی الارض دابة و الملئکة و هم لا یستکبرون

''اور اللہ کو سجدہ کرتے ہیں جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہیں دابہ میں سے''۔ (سورہ نحل: ۴۹)

سورہ شوریٰ میں فرمایا:

ومن آیاته خلق السموت و الارض و ما بث فیهما من دابة

''اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی بناوٹ ہے اور وہ دابہ ہیں، جن کو اس نے ان دونوں یعنی آسمانوں اور زمین میں پھیلا رکھا ہے''۔ (شوریٰ: ۲۹)

دابہ کے بارے میں فرمایا:

و الله خلق کل دابة من ماء فمنهم من یمشی علی بطنه . ومنهم من یمشی علی رجلین۔ و منهم من یمشی علی اربع. یخلق الله ما یشاء

''اور اللہ نے سارے ہی دابہ کو پانی سے پیدا کیا چنانچہ ان میں سے وہ ہے جو پیٹ کے بل چلتا ہے یعنی رینگتا ہے اور ان میں وہ ہے جو دو ٹانگوں پر چلتا ہے اور ان میں وہ ہے جو چار پر چلتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے'' (یعنی ان کے علاوہ قسم کا دابہ ہو سکتا ہے)۔ (سورہ النور: ۴۵)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ دابہ ذی حیات مخلوق ہے جو زمین اور آسمانوں میں بالفعل پائی جاتی ہے۔ جہاں تک ذی حیات

مخلوق کا تعلق ہے، اللہ نے اس آیت میں فرمایا کہ ہر دابہ کو پانی سے پیدا کیا۔ دوسری جگہ فرمایا:

وجعلنا من الماء کل شئ حی

''اور ہم نے پانی سے ہر جاندار کو پیدا کیا''۔ (سورہ انبیاء:۳۰)

اس سے معلوم ہوا کہ پانی صرف ہماری زمین پر نہیں ہے، بلکہ اس کے علاوہ دوسرے کرّوں پر بھی ہے جو ساتوں آسمان میں موجود ہیں۔

پچھلی باتوں سے یہ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ مادہ جسے کچھ دنوں قبل تک ٹھوس سمجھا جاتا تھا وہ حقیقتاً ٹھوس نہیں تھا۔ چنانچہ مادے کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔ دخانی (Gaseous) ، سیال (Liquid)، ٹھوس (Solid)، دخان ہی ایک خاص کیفیت میں سیال بن جاتا ہے، اور سیال ایک خاص حالت میں ٹھوس بن جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ثم استویٰ الی السماء و ھی دخان (حٰم السجدہ ۱۱)

اس کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ زمین کا گولا بنانے کے بعد زمین کے اطراف کی طرف اللہ نے توجہ کی، اس حال میں کہ وہ دخان یعنی (Gas) تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چھوٹے ذرات سے سب سے پہلا بڑا گولا جو بنا وہ زمین کا تھا، اور کائنات کے دوسرے ذرات اب تک دخانی حالت میں تھے جن کے بڑے گولے نہیں بنے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد آسمانوں کی وسیع فضا میں بے شمار چھوٹے بڑے گولے بنا کر کہکشاؤں کی شکل میں مختلف طبقات میں تقسیم کر دیئے گئے۔ دوسرا مطلب اس کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آسمان اب بھی دخانی ہی حالت میں ہے۔ ایسی صورت میں اس کا ایک مفہوم تو یہ ہوسکتا ہے کہ زمین کی طرح اسی کے ساتھ ساتھ بے شمار گولے تو اسی کے ساتھ بن گئے تھے جو اس دخانی فضا میں بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں دخانی فضا کے ساتھ ساتھ سات طبقات میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس مفہوم کے مطابق جس چیز کو خلاء کہتے ہیں حقیقتاً وہ خلاء نہیں ہے بلکہ بہت ہی لطیف گیس ہے جس میں بے شمار ستارے اور سیارے محو گردش ہیں۔ یہ گیس اتنی لطیف ہے کہ سیاروں کی رفتار میں اس سے ادنیٰ سی بھی رگڑ (Friction) پیدا نہیں ہوتی ہے۔ اس کا تیسرا مفہوم ایک اور بھی ہوسکتا ہے۔ اور وہ اس بنیاد پر ہوگا کہ دخان کو ہم اضافی حیثیت دے دیں، یعنی ہم اس زمین کے باشندے جس چیز کو دخان کہتے ہیں وہ دراصل مادے کے وہ چھوٹے چھوٹے اجزاء ہیں جو کسی خاص ترکیب کے بغیر فضا میں بکھرے ہوئے ہیں جیسا کہ دوسری بحثوں میں بات گذر چکی ہے۔ یہ چھوٹے اجزاء جہاں ہمارے لئے چھوٹے چھوٹے ذرات کی حیثیت رکھتے ہیں وہیں کسی دوسری انتہائی چھوٹی مخلوق کے لئے یا تو زمین کے گولے کی حیثیت رکھتے ہیں یا پھر کہکشاں کی۔ لیکن اس چھوٹی مخلوق کے لئے اس کی زمین کے چاروں طرف کی فضا اس کے حق میں آسمان کی حیثیت رکھتی ہے جو ہم کو دخان نظر آتے ہیں۔ اسی پر اگر قیاس کیا جائے تو جتنا ہم کائنات کی گہرائی میں اترتے جائیں گے، ایک سطح والوں کے لئے جو چیز آسمان ہوگی وہ اس سے اوپر کی سطح والوں کے لئے دخان کی حیثیت رکھے گی۔ ٹھیک اسی طرح جب ہم کائنات میں باہر کی طرف سیر کریں تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ آسمان دنیا پر جو عظیم الجثہ مخلوق پائی جاتی ہوگی، اس کو ہمارے ان سیارے اور ستاروں کا جھرمٹ دخان جیسا ہی نظر آئے گا۔ اس پر ساتویں طبق آسمان تک قیاس کرتے چلے جایئے۔

اب آیئے ایک پہلو سے اور دیکھا جائے۔ سورہ نمل میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وتری الجبال تحسبھا جامدۃ و ھی تمر مر السحاب ''اور تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے تو انہیں جامد سمجھتا ہے اور یہ چلیں گے بادل کی چال''۔ (سورہ نمل:۸۸) دوسرا مفہوم ہوگا ''اور یہ چل رہے ہیں بادل کی چال''۔

عام طور پر لوگوں نے پہلا مفہوم لیا ہے، اور اس سے وہ مراد لیتے ہیں قیامت کے وقت کو۔ لیکن تمر مضارع کا صیغہ ہے جس کے معنی مستقبل کے بھی ہوتے ہیں اور حال کے بھی۔ حال کے معنی لئے جائیں تو پہاڑوں کی موجودہ ماہیت اور کیفیت سمجھ میں آ جائے گی۔ اس کے دوسرے پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ایک پہلو کو لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح بادل دور سے دیکھنے میں ٹھوس ہی نظر آتا ہے مگر ہر آدمی جانتا ہے کہ یہ ہماری نظر کا فریب ہے۔ حقیقتاً وہ ٹھوس نہیں ہے بلکہ گیس یعنی دخان ہے، جو اپنے خاص حساب سے اپنے اجزا کے ساتھ مختلف انداز میں متحرک ہے۔ اسی طرح پہاڑ جس کو پہلے زمانے میں لوگ مادیت کی مثالی شکل سمجھتے تھے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو اسے جامد (ٹھوس) سمجھتا ہے، حالانکہ وہ بدلی کی چال چل رہا ہے، یعنی اس کے اجزائے ترکیبی (Constituent Parts) اور ان کے ساتھ بذات خود یہ، بدلی ہی کی طرح مختلف انداز میں متحرک ہیں، واضح رہے کہ یہ آیت اسی سورہ کی ہے جس میں بلقیس کے تخت کو آن واحد میں ہزاروں میل کے فاصلے سے اٹھالائے جانے کا ذکر ہے۔ سورہ النبا میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وسیرت الجبال فکانت سرابا ''اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریگ ہو جائیں گے'' عام طور پر اس کا یہی مفہوم لیا جاتا ہے حالانکہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے لفظ سراب استعمال کیا ہے جس کے معنی ریگ نہیں ہیں۔ اس لئے اس کا اصل مفہوم دور قیامت سے متعلق تو یہی ہے کہ مادہ پرستوں نے پہاڑ سے، جو ان کے نزدیک ٹھوس مادہ کا معیاری نمونہ تھا، جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ غلط ثابت ہوں گی، جس طرح سراب سے وابستہ کی ہوئی توقع غلط ثابت ہوئی ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح سراب ہمارے احساسات میں سے ایک حس یعنی بینائی کا فریب ہے، اس طرح پہاڑ کا ٹھوس پن بھی ہمارے احساسات کا فریب ہے۔

پانی کے لئے عربی میں لفظ ماء استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں کہیں یہ ''ماء'' آیا ہے اور کہیں ''الماء'' نکرہ ہے، اس کا مطلب کوئی پانی لیکن 'الماء' معرفہ ہے جس کا مطلب ہوگا خاص پانی۔ اس خاص پانی سے کیا مراد ہے، یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ لیکن قرآنی آیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ اشارات ملتے ہیں۔ میں چند متعلق آیتوں کو یہاں پر بیان کروں گا، جیسے اللہ نے کہا: واللہ خلق کل دابۃ من ماء (النور: ۴۵) ''یعنی اللہ نے سارے ہی دابہ یعنی حرکت کرنے والے جانور کو پانی سے پیدا کیا''۔ اور ہماری زمین کے علاوہ دوسری جگہوں پر جو دابہ کا ذکر ہے وہاں صرف دابہ ہی کا ذکر ہے۔ اس سے یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ کرّوں میں انسان کے جیسا دابہ نہیں ہے۔ انسان کے بارے میں اللہ نے فرمایا: وھو الذی خلق من الماء بشراً (الفرقان: ۵۴) اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق میں الماء استعمال کیا گیا، جبکہ دوسرے دابہ صرف ماء سے بنائے گئے ہیں۔ دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وجعلنا من الماء کل شئ حی (الانبیاء: ۳۰) یعنی ''ہر زندہ چیز کو میں نے الماء سے بنایا'' اگر حی یعنی زندہ چیز کے مفہوم میں انسان کے علاوہ دوسری جاندار مخلوقات بھی مراد ہیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ سارے دابہ الماء سے بنائے گئے ہیں۔ اس صورت میں جو بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ الماء سے مراد خالص پانی ہے، جس میں پانی کے مخصوص اجزاء کے سوا کسی اور چیز کی آمیزش نہ ہو، اور ماء میں سب طرح کے پائے جانے والے پانی داخل ہیں، اس سے جو بات بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ نفس حیات یعنی زندگی تو الماء سے بنتی ہے لیکن مختلف زندہ چیزیں الماء میں مختلف آمیزشوں سے مختلف خواص رکھنے والے پانیوں سے بنتی ہیں۔ مثلاً انسان کے بارے میں اللہ نے کہا: الم نخلقکم من ماء مھین (المرسلت: ۲۰) دوسری جگہ فرمایا: من سللۃ من ماء مھین (السجدہ: ۸) یعنی ''ایک ایسے ست سے جو حقیر پانی ہے''۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کے سلسلے میں جہاں جہاں بھی ذکر آیا ہے ہر جگہ ''الماء'' استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ زمین میں روئیدگیوں کے اپجنے کا بھی

جہاں جہاں ذکر ہے، ان میں جہاں مردوں کو زندہ کئے جانے کا ذکر ہے وہیں الماء کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اللہ نے فرمایا:

فانزلنابه الماء فاخرجنابه من كل الثمرت كذلك نخرج الموتى

''اور وہاں مینھ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم مردوں کو سامنے نکالتے ہیں''۔ (الاعراف:۵۷)

دوسری جگہ فرمایا:

وترى الارض هامدة فاذا انزلنا عليها الماء اهتزت وربت و انبتت من كل زوج بهيج ۔ ذلك بان الله هو الحق و انه يحى الموتى و انه على كل شئ قدير

''اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینھ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کردی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے، اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ (الحج: ۵۔۶)

ورنہ ہر جگہ صرف ماء ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ الماء چاہے جو کچھ بھی ہو وہ ہے کہاں، تو آیتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زمین پر صرف ہے ہی نہیں بلکہ وافر ہے۔ اللہ نے فرمایا: انا صببنا الماء صبا (عبس:۲۵) یعنی ''ہم نے خوب پانی لنڈھایا''۔ اسی طرح طوفان نوح میں جو بارش ہوئی اس کا جہاں جہاں بھی ذکر ہے ہر جگہ ''الماء'' کہا گیا ہے، چنانچہ وہ موسلا دھار نازل کیا گیا تھا۔ یہ تو سب ماضی کی شکل میں بیان ہوئے ہیں۔ اب اس کے مستقبل میں حصول کا جو ذریعہ ہے وہ بیان کیا گیا ہے: و ان منها لما يشقق فيخرج منه الماء (البقرہ:۷۴) ''پتھروں میں سے ایسا پتھر بھی ہوتا ہے جو پھٹتا اور ان میں سے پانی نکلتا ہے''۔

■ ■ ■

سورہ الفرقان کی آیت ۵۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وهو الذى خلق من الماء بشرا فجعله نسبا و صهرا ۔ (وہی ہے جس نے الماء سے بشر کو پیدا کیا پھر اسے نسب اور سسرال والا بنایا)۔

اس سے قبل والی آیت ۵۳ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اور وہ ہے جس نے دو دریاؤں کو ملایا جن میں ایک کا پانی تو شیریں، تسکین بخش ہے اور ایک کا پانی شور تلخ ہے اور ان کے درمیان ایک حجاب اور ایک مانع رکھ دیا'' آیت ۵۳ سے آیت ۵۴ کو ملا کر دیکھنے سے ایک اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح دو دریا یا سمندر ہوتے ہیں جن میں سے ایک کا پانی میٹھا اور دوسرے کا تلخ ہوتا ہے اسی طرح انسان کے نسب کا ایک سمندر اور سسرال کا دوسرا سمندر ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی میٹھا اور کوئی شور بھی ہو سکتا ہے اور دونوں میٹھے اور دونوں شور بھی ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی نسل کے یہ دونوں سمندر ذائقہ کے لحاظ سے شیریں یا شور نہیں ہونگے بلکہ اخلاقی خصوصیت کے لحاظ سے شیریں یا شور ہوں گے اسی طرح اللہ تعالیٰ سورہ فاطر کی آیت ۱۲ میں فرماتا ہے۔ ''دو سمندر برابر نہیں ہیں ایک شیریں پیاس بجھانے والا ہے جس کا پینا بھی آسان، اور ایک شور تلخ ہے اور تم ہر ایک سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور زیور نکالتے ہو جس کو تم پہنتے ہو'' ان تینوں آیتوں کو سامنے رکھنے سے یہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ انسانی نسل کے دونوں سمندر یعنی اخلاقی لحاظ سے میٹھے یا کھارے نسل انسانی کے لئے مفید ہی ہیں۔ دونوں ہی سے قیمتی افراد میسر آتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کو آپس میں گڈمڈ نہیں ہونا چاہئے ان دونوں کے درمیان بھی فطرت نے ایک پردہ رکھا ہے جس کو اگر زبردستی نظر انداز (Violate) کیا جائے تو اس سے آئندہ نسل میں طرح طرح کا بگاڑ پیدا

ہوسکتا ہے۔ یہاں (Physiology) کے ماہرین کے لئے ایک اشارہ ملتا ہے جس پر انہیں تحقیق کرنا چاہیئے۔ وہ یہ کہ انسانی خون یا انسانی نطفہ یا دونوں ہی پر اس انداز سے تحقیق کرنا چاہیئے کہ خونوں یا نطفوں یا دونوں کی گروپنگ (Grouping) ہوسکے اور یہ گروپنگ اخلاقی لحاظ سے ہونی چاہئے اور یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ کون گروپ کس گروپ کے ساتھ میل (Match) کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر رشتۂ ازدواج قائم کیا جائے تو نسلی اخلاقی انحطاط (Degeneration) کا امکان کم سے کم تر ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ اسلام نے جن غذاؤں اور مشروبات کو حرام ٹھہرایا ہے ان کے استعمال سے نیز جن اعمال اور خیالات کو گناہ قرار دیا ہے ان کے ارتکاب سے خون میں کس قسم کی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں ایسے خون اور متقیانہ زندگی بسر کرنے والے کے خون میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس طرح مرد اور عورت کے خون کی جانچ کے ذریعہ اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ رشتۂ ازدواج ایک ہی طرح کے خون والے مرد اور عورت کے درمیان قائم ہو۔ مثلاً جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نور آیت ۳ میں فرمایا ''زانی کسی کے ساتھ نکاح نہیں کرتا بجز زانیہ یا مشرکہ کے اور زانیہ کے ساتھ بھی کوئی نکاح نہیں کرتا بجز زانی یا مشرک کے اور یہ مومنین پر حرام کیا گیا ہے'' یہ تو حرمت والی بات ہے لیکن عام مفاد انسانی کے لئے اگر خون کی گروپنگ مندرجہ بالا انداز میں کی جائے تو بہت سے موقعوں پر علت اور حرمت کا سوال گرچہ نہیں ہوگا لیکن نسلی و اخلاقی فساد اور بگاڑ سے انسانیت محفوظ ہو جائے گی۔

■ ■ ■

اب میں موت اور حیات کے موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں، میں سالہا سال سے خواب کا ایک سلسلہ دیکھتا آرہا ہوں جس میں ابتداء تو یہاں سے ہوئی کہ کوئی مردہ لاش ہے اس کے جسم میں پھڑکن دکھائی دی اس کے بعد خوابوں میں اس میں ارتقاء ہوتا چلا گیا۔ پھڑکن کے بعد حرکت، حرکت کے بعد اٹھ بیٹھنا، کھڑے ہو جانا یہاں تک کے واپس اپنے اہل و عیال میں چلے آنا اس تدریج سے خواب میں ارتقاء ہوتا چلا گیا۔ بہت دنوں تک میں اس کی تعبیر یہ لیتا رہا کہ انشاء اللہ غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی توفیق نصیب ہوگی لیکن جس طرح تسلسل سے یہ خواب سالہا سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے اس نے مجھے اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ شائد قدرت کا منشا یہ ہے کہ میں اس موضوع پر غور و فکر کروں چنانچہ بالآخر میں نے کام شروع کر دیا اور اس غور و فکر کا ماحصل آئندہ سطروں میں انشاء اللہ آپ کے سامنے آرہا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا ہے کہ زندگی اور موت سے کیا مراد ہے۔ ایک ہے نفس زندگی اور نفس موت یہ دونوں اللہ کی مخلوقات کی طرح دو مخلوق ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی دوسرا وجود میں نہیں لاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک یعنی زندگی کو اللہ نے ابدی بنا دیا ہے لیکن آخرت میں ایک خاص مرحلے میں موت کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ زندگی اور موت کے اس پہلو پر مجھے کوئی گفتگو نہیں کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كيف تكفرون بالله وكنتم امواتا فاحيا كم ثم يميتكم ثم يحييكم ثم اليه ترجعون ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے مراد جسم اور روح کا اتصال ہے۔ روح یعنی روح حیوانی چنانچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہم مردے تھے یعنی ہماری روحیں ہمارے جسموں کے ساتھ وابستہ نہیں تھیں۔ پھر اللہ نے زندہ کیا تو وہ روحیں جسموں سے وابستہ ہوگئیں اور پھر اللہ مارڈالتا ہے تو روح اور جسم کا تعلق ختم ہو جاتا ہے اور پھر زندہ کرے گا تو روح اور جسم یکجا ہو جائیں گے۔ گفتگو دراصل اس پہلو سے کرنی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ سے نمرود نے جب جھگڑا کیا اور حضرت ابراہیمؑ نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو نمرود نے کہا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں گویا اگر یہی دلیل ہے تو تم مجھے اپنا رب مانو۔ تو وہ مار تو سکتا تھا لیکن زندہ تو کر نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بے قصور کو مارڈالا اور موت کے مستحق مجرم کو رہا کر دیا اسی دوسرے کام کو اس نے مردہ کو زندہ کرنا قرار دیا۔ ظاہر ہے یہ بالکل بھونڈی سی بات تھی اور حضرت ابراہیمؑ کہہ سکتے تھے کہ زندہ کرنے سے یہ منشا تو

نہیں ہے بلکہ کسی مرے ہوئے آدمی کو زندہ کردو تو جانیں۔ لیکن انہوں نے ایسا کہنے کے بجائے اپنی دلیل کا رخ بدل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ نمرود دراصل مناظرے پر اتر آیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ کی شان پیغمبری کے خلاف تھا کہ مناظرے میں الجھتے یہ بات بھی صحیح ہو سکتی ہے لیکن میرے خیال میں ایک بات اور تھی اور وہ یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ملکوت السموت والارض کا مشاہدہ کرا دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ جان گئے تھے کہ کبھی نہ کبھی انسان مردے کو زندہ کرے گا۔ جیسا کہ بعد میں حضرت عیسیٰؑ نے کیا اور آئندہ دجال کرنے والا ہے۔ اگر اسی بنیاد پر حضرت ابراہیمؑ زور دیتے تو آگے چل کر دنیا والے یہ کہہ سکتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کو رب ہونے کا حق حاصل ہو گیا اور اسی طرح دجال کے لئے بھی گنجائش نکل آتی کہ وہ اپنی خدائی کا دعویٰ کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھے۔ چنانچہ اس سے بچنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی ربوبیت کے لئے ایسی دلیل پیش کی جو تنہا اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

آدمی کے مرجانے کے بعد اس کے جسم کے تین مراحل ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ جبکہ اس کے cells زندہ رہتے ہیں۔ دوسرا مرحلہ جب گوشت ختم ہو جائے صرف ہڈی رہ جائے۔ تیسرا مرحلہ جب ہڈی بھی سڑ گل کر مٹی ہو جائے جہاں تک فطری قوانین کا تعلق ہے تینوں مرحلے میں مردہ زندہ ہو سکتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس سلسلے کی تکنیک (Technology) کس حد تک اللہ تعالیٰ فراہم فرماتا ہے اور کب۔ پہلے مرحلے کو لیجئے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ایک شخص نے اپنے چچا کو مار ڈالا۔ اور دوسرے محلّہ میں دوسرے شخص کے مکان کے سامنے رات کی تنہائی میں اس کی لاش کو ڈال آیا۔ دن کے وقت ہنگامہ ہوا اور معاملہ حضرت موسیٰؑ تک پہنچا۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا جب حضرت موسیٰؑ نے گائے ذبح کرنے کے لئے کہا تو بنی اسرائیل کے لوگ طرح طرح سے حیلہ بہانہ ڈھونڈھنے لگے۔ چنانچہ ہر بار وہ جب سوال کرتے تھے تو بیل کہتے تھے۔ اور ہر بار حضرت موسیٰؑ کہتے تھے گائے۔ یہ بات قابل غور ہے۔ بہر حال بالآخر انہوں نے گائے ذبح کی تو اللہ نے فرمایا فقلنا اضربوہ ببعضھا (بقرہ آیت ۷۳) یعنی لاش کو ضرب لگاؤ گائے کے بعض حصے سے، اور پھر فرماتا ہے کذلک یحی اللہ الموتی (بقرہ آیت ۷۳) اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے یا کرے گا۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب تک خلئے (Cell) زندہ ہوں اس وقت تک انسان کو زندہ کرنے کے لئے دوائیں ایجاد ہو سکتی ہیں، جہاں تک ضرب کا تعلق ہے اس میں بڑی وسعت ہے۔ مارنے، چھلانے، انجکشن دینے اور اس کے علاوہ اور کوئی دوسرے طریقے بھی جو دریافت ہو جائیں سب ضرب میں داخل ہیں۔ اسی طرح گائے کا ایک حصہ اس میں بھی بڑی گنجائش ہے۔ تجربے کے بعد ہی یہ بات معلوم ہو سکے گی کہ گائے کی کون سی چیز، کون سا جوہر essence اپنے اندر ایسی خاصیت رکھتا ہے کہ اگر مردہ جسم میں اس کو داخل کر دیا جائے تو وہ زندہ ہو جائے یہ تو کافی دیر کے بعد ہوا تھا جب کہ اس کا بھی امکان ہے کہ خلئے مر چکے ہوں لیکن جسم پر گوشت باقی ہو۔ خلئے کے زندہ ہوتے ہوئے حادثات یا حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ کر مرجانے والے کو دوبارہ زندہ کیا جانے لگا ہے۔ اس لئے یہ کوئی اچنبھے کی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ البتہ ابھی یہ آلہ (Device) عام نہیں ہو سکا ہے اور اس کے ماہرین ہر جگہ نہیں فراہم ہو سکے ہیں۔ عنقریب ایسا وقت آ سکتا ہے کہ عام طور پر جو لوگ مرجاتے ہیں جب تک ان کے خلئے زندہ ہوں اس وقت تک ان کو سکتے کے مریض کی طرح تصور کیا جائے اور اگر وسائل فراہم ہو جائیں تو ان کے ذریعہ اسے دوبارہ زندہ کر دیا جائے جس طرح سانپ کے کاٹے ہوئے کو لوگ دفن کر دیتے ہیں حالانکہ وہ مرا نہیں ہوتا ہے مگر جہاں سانپ کاٹے کا علاج دستیاب نہیں ہو وہاں اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ شریعت انسان کو اتنے ہی کا مکلّف ٹھہراتی ہے، جتنا اس کے بس میں ہو۔ میں یہ گفتگو سائنس کے اس پہلو سے کر رہا ہوں جس کا تعلق کیمیا اور طبیعات سے ہے ورنہ سائنس کا دوسرا شعبہ جس کا تعلق روحانیات سے ہے اس سے بھی مردے زندہ ہو سکتے ہیں جیسے عیسیٰؑ نے کیا یا جیسے حضرت موسیٰؑ کی تلی ہوئی مچھلی خود زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔

اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب گوشت پوست ختم ہو جائے اور صرف ہڈی رہ جائے سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۵۹ میں اللہ تعالیٰ نے

اپنے جس بندے کا ذکر کیا ہے ان کو سو سال مردہ رکھنے کے بعد زندہ کیا اور پھر مردہ کو زندہ کرتے ہوئے مشاہدہ کرایا یعنی ان کے گدھے کی ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں اور گوشت پوست نابود ہو چکے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا دیکھ (سر کی آنکھوں سے) ہڈیوں کی طرف کس طرح ہم انہیں کھڑا کرتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جب گوشت بھی ختم ہو جائے اور صرف ہڈی رہ جائے اس وقت بھی قانون فطرت کے مطابق نہ کہ اس سے بالاتر ہو کر مردہ زندہ کیا جاسکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس ہڈی پر گوشت کیسے چڑھایا جائے گا تو یہ کسی اچنبھے کی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ روزانہ یہ کام کر رہا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے فخلقنا المضغة عظما فکسونا العظم لحما (مومنون) یعنی ہڈی پر گوشت اللہ تعالیٰ آئے دن چڑھا رہا ہے وہاں جو فطری Process اختیار کیا گیا ہے اس کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ Technology ہاتھ آسکتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام مادر رحم کے اندر ایک خاص ماحول میں خاص درجہ حرارت پر انجام دیتا ہے وہی کام اس نے گدھے کی ہڈی پر گوشت چڑھا کر کھلی فضا میں انجام دیا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آخر کھلی فضا کو بھی تو Air-conditioned بنایا جاسکتا ہے۔

اب آیئے آخری مرحلہ میں جب کہ ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو چکی ہوں، کفار کہتے تھے من یحی العظام وھی رمیم (یٰسین) ہڈیوں کو کون زندہ کریگا جب کہ وہ سڑ گئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ. وھو بکل خلق علیم (یٰسین) یعنی آپ کہہ دیجئے کہ ایسی سڑی گلی ہڈیوں کو وہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا اور وہ پیدا کرنے کے ہر ڈھنگ سے واقف ہے۔ یا ہر طرح پیدا کرنا جانتا ہے۔ اتنا جواب کافی تھا اور اس قسم کا جواب بہت سے موقعے پر دیا بھی گیا ہے۔ جہاں صرف تذکیر و نصیحت مقصود ہے۔ لیکن یہاں پر اللہ تعالیٰ مزید فرمایا ہے الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا فاذا انتم منه توقدون یعنی وہ جس نے تمہارے لئے سبز پیڑ سے نار یعنی آگ پیدا کی۔ پھر تم اس سے آگ سلگاتے ہو۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو تر و تازہ ہڈیوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے جس کے بعد ان پر گوشت اور پوست چڑھایا جاسکے۔ ان سڑی گلی ہڈیوں کو تازہ ہڈیوں میں تبدیل کرنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہوگی وہ ہرے بھرے درخت سے ہونے والی آگ ہے۔ ہرے بھرے درخت سے کوئی خاص درخت مراد ہے یا عام اور نار سے کیا مراد ہے۔ فاسفورس بھی ہوسکتا ہے، آکسیجن ہوسکتا ہے۔ اور معمولی آگ بھی ہوسکتی ہے یا ان تینوں کے علاوہ کوئی اور جوہر بھی ہوسکتا ہے۔ جس کا علم اب تک انسان کو نہ ہوا ہو۔ ویسے یہاں آکسیجن مراد ہوسکتی ہے کیوں کہ وہی سلگاتی بھی ہے اور وہی ہڈی میں نشونما کا باعث بھی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی خاص درخت سے حاصل ہونے والی آکسیجن اپنے اندر کچھ خصوصیتیں رکھتی ہو جو دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والی آکسیجن میں نہ پائی جاتی ہو۔ یہ سارے پہلو امکانی ہیں۔

ہوسکتا ہے انسانی دسترس کبھی ہو جائے اور ہو جائے تو محض محدود پیمانے پر ہو یا سرے سے اللہ تعالیٰ اس کو یہ مواقع فراہم ہی نہ کرے۔ یہاں ایک بات اور سمجھ لینے کی ہے وہ یہ کہ آکسیجن ہو یا کوئی دوسرا جوہر وہ آخر سری گلی ہڈیوں پر Apply کیسے کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں حدیث ہماری رہنمائی کرتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی دمچی کی ہڈی کو بہر حال محفوظ رکھے گا چنانچہ اس سے انسان کا سارا جسم دوبارہ اگے گا۔ اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اگر چہ انسان کے اعضاء کٹ جانے کے بعد دوبارہ نہیں نکلتے جس طرح چھپکلی کی دم کٹنے کے بعد دوبارہ نکل آتی ہے لیکن اگر اس پر انسان لگاتار محنت کرے اور دمچی کی ہڈی کو بنیاد (Base) بنا کر Research کرتا رہے تو ہوسکتا ہے کہ کٹے ہوئے اعضاء نئے سرے سے اگنے لگیں۔ اب رہی بات کہ دمچی کی ہڈی کے کون سے حصہ پر مذکورہ جوہر کو استعمال کیا جائے گا بادی النظر میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دمچی کی ہڈی بھی تو بظاہر سڑ ہی جاتی ہے اور جہاں جلایا جاتا ہے وہاں راکھ بھی ہو جاتی ہے لیکن نہیں۔ اس کا مرکزہ Nucleus بہر حال محفوظ رہتا ہے۔ اور وہی Nucleus ہے جس پر تحقیق کرنے والوں

تفسیر القرآن

سید ضیاء الہدیٰ

حلقۂ طالبات اسلامی بہار سے وابستہ بعض طالبات مثلاً ذاکرہ کوکب، افروز انجم، رفعت عائشہ وغیرہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم سے باضابطہ تفسیر قرآن کا درس لیتی تھیں۔ انہیں مجالس میں قلم بند کی گئی تفسیر کا ایک حصہ درج ہے۔

سورۃ الفاتحہ

(۱) یہ سورہ 'الفاتحہ' ہے یعنی افتتاح ہے۔ کلام کا آغاز اس سے ہوا ہے۔ قرآن کا دیباچہ ہے۔

(۲) یہ سورہ دعا ہے۔ اس میں بندے کو بتایا گیا ہے کہ جب تمہیں کچھ مانگنا ہو تو کس طرح مانگو؟ بتایا گیا کہ پہلے اللہ کی صفات کا اقرار کرو، اس کی حمد بیان کرو، اس کی نعمتوں اور احسانات کا اعتراف کرو، اس کے بعد مانگو۔ بندہ اس سورہ میں سوال کرتا ہے اپنے رب سے ہدایت کا اور اللہ اس کے جواب میں قرآن دے دیتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العلمین. الرحمن الرحیم. ملک یوم الدین. ایاک نعبد وایاک نستعین. اھدنا الصراط المستقیم. صراط الذین انعمت علیھم. غیر المغضوب علیھم ولا الضالین.

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

''تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے، رحمان اور رحیم ہے، روز جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم اس آیت میں رحم کے لئے دو الفاظ رحمٰن اور رحیم آئے ہیں۔ اس کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مگر کلام ربانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا ہر جملہ، ہر ہر لفظ اپنے اندر ایک الگ معنی رکھتا ہے۔ رحمٰن، کے ساتھ ساتھ لفظ 'رحیم' کا بھی استعمال ہوا ہے۔ رحمٰن اور رحیم ان دو الفاظ کے رحم میں یہ فرق ہے کہ رحمٰن کا رحم ساری نوع انسانی کے لئے ہے اور رحیم کا رحم فرماں برداروں کے لئے ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن کا رحم ماں کے رحم کی طرح ہوتا ہے، جس طرح ایک ماں اپنی سبھی اولاد کو مانتی ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ اور بدمعاش بچے کو ماں کچھ زیادہ ہی مانتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن کے رحم کی صفت کے تحت اپنے ہر بندہ پر یکساں رحم کرتا ہے، باغیوں پر اس کا رحم کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ خود وہ اپنے کلام میں ارشاد فرماتا ہے:

''اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقہ کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالا خانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکئے لگا کر بیٹھتے ہیں۔ خوب آرائش و زیبائش اور یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے اور آخرت تو آپ کے رب کے پاس پرہیزگاروں کے لئے ہے۔ (الزخرف: ۳۳۔۳۵) مگر یہ بھی ہے کہ ایک ماں جس طرح اپنے شریر بچے کی غلطیوں کو معاف کئے جاتی ہے اور اس پر

رحم کرتی ہے مگر جب وہ اس کی غلطی پر سزا دیتی ہے تو جلانے سے بھی گریز نہیں کرتی ہے۔ اسی طرح رحمٰن کا رحم ہوتا رہتا ہے کہ درگذر کرتے کرتے ایک بار وہ ایسی سزا دے گا کہ پھر اس سے پناہ نہیں۔

رحیم کے رحم کی مثال باپ کے رحم کے جیسی ہے۔ باپ ماں کی طرح اندھا پیار نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے بدمعاش بچے کے مقابلے میں نیک کو زیادہ مانتا ہے اور بدمعاش کی بدمعاشی پر سزا بھی دیتا رہتا ہے یا بدمعاش کی بدمعاشی سے اچھے کو بچاتا ہے۔ اگر کسی گھر میں چار شرارتی بچے ہوں اور ایک بچہ بے چارہ نیک ہو تو سارے مل کر اس کا ناطقہ بند رکھیں، اس کا جینا دوبھر کر دیں مگر باپ کے خوف کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو باپ ضرور نیک اولاد کا حمایتی بن جاتا ہے۔ جب دنیا میں اللہ کے فرماں برداروں کو ستایا جانے لگتا ہے تو رحیم کا رحم اس کو بچالیتا ہے۔ اگر رحمٰن کے رحم کے ساتھ ساتھ رحیم کے رحم کی صفت بھی اللہ میں نہ ہوتی تو آج ایک بھی فرماں بردار روئے زمین پر نہ ملتا۔

'الحمدللہ' 'تعریف اللہ ہی کے لئے ہے'۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ کسی کی تعریف ہی نہ کی جائے، کوئی اچھا ہے تو اس کو اچھا نہ کہا جائے، کوئی برا ہے تو اس کو برا نہ کہا جائے۔ بلکہ یہاں پر جس تعریف کا ذکر ہے وہ یہ کہ انسان خوشامد میں جو تعریف کرتا ہے اس امید پر کہ اگر اس کی تعریف کی جائے تو وہ خوش ہو کر کچھ بخش دے گا تو اس طرح کی تعریف انسانوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ لہٰذا جب کسی کی خوبی بھی بیان کی جائے اور اس کی نوازش کی امید بھی رکھی جائے تو یہی حمد ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اللہ کے سوا انسانوں کی تعریف آخر کیوں نہیں کی جاسکتی؟ تو بتایا گیا کہ وہ :

'رب العالمین' یعنی سارے جہان کا آقا ہے صرف میرا ہی نہیں۔ وہ تمام چیزوں کو ترقی دینے والا اور پرورش کرنے والا ہے۔ اس لئے دوسروں کی حمد نہیں کی جاسکتی۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی سب سے بڑی نشانی ہمارے ماں باپ ہیں جن کے دل میں اللہ نے ہمارے لئے شفقت اور محبت رکھی ہے۔ والدین گویا ربوبیت الٰہی کا ایک پرتو ہیں۔ وہ مجازی رب ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ حقیقی رب ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اگر وہ سارے جہان کا رب اور آقا ہے پھر بھی وہ تنہا تعریف کا مستحق کیسے رہا۔ اگر ہم کسی کے غلام ہو جائیں، کوئی ہمارا آقا ہو تو ہم آقا تو اس کو مان سکتے ہیں مگر ہم آقا ہی کی تعریف کریں اور کسی کی تعریف نہ کریں یہ حکم آقا دے نہیں سکتا اور نہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ صرف آقا ہی نہیں:

'الرحمن' بھی ہے۔ وہ تمہاری نافرمانیوں اور کوتاہیوں کے باوجود تم پر رحم کرتا ہے اور تم کو دنیا کی ساری نعمتوں سے نوازتا ہے۔ پھر بھی صرف اللہ کی تعریف کئے جانے کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ رحمٰن کا رحم تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے نافرمان بندے زیادہ اختیار واقتدار اور Power والے ہوتے ہیں، جس کی بنا پر فرماں برداروں کو تکلیف دیتے رہتے ہیں۔ تو اس طرح تو وہ تعریف کا مستحق نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ الرحمٰن کے ساتھ الرحیم بھی ہے۔

الرحیم کا رحم اس کے نیک بندوں کو بچاتا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ظالم نے جو ظلم کیا اور مظلوم پر جو ظلم ہوا اس کا بدلہ تو ملا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

'مالک یوم الدین' بدلے کے دن کے مالک ہیں۔ یعنی وہ دن جب کہ ظالم کو اس کے ظلم کا اور مظلوم کو اس پر مظلومیت کا بدلہ دیا جائے گا اس دن کے بھی ہم مالک ہیں۔

تب آگے ارشاد ہوتا ہے

ایاک نعبد "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" ۔تو یہاں پر عبادت کا مطلب صرف ظاہری عبادت نہیں ہے بلکہ عبادت کا مطلب ہے مکمل فرماں برداری۔ جب بندہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اللہ کے اندر وہ صفات ہیں کہ صرف اسی کی تعریف کی جائے تب وہ فوراً اس کی فرماں برداری پر راضی ہو جاتا ہے۔

ایک بات یہ کہ مالک یوم الدین تک پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بندہ غائبانہ کچھ کہہ رہا ہے، یا یوں کہیے کہ اللہ کی صفات کو گنا رہا ہے۔

مگر ایاک نعبد سے سلسلۂ کلام بدل جاتا ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب آمنے سامنے بات ہونے لگی۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بے ربط بات ہوگئی ہے۔ ایسا نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص شکل تو ہے نہیں کہ جس کو دیکھ کر پہچانا جاسکے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی صفات میں پوشیدہ ہے۔ یہاں پر بھی یہی بات ہے۔ ایاك نعبد سے پہلے تک تو اللہ کی صفات بتائی گئیں، اب جبکہ بندے کے دل میں اس کی صفتیں بیٹھ گئیں تو اس نے محسوس کیا کہ گویا اللہ سامنے ہے اور یک بیک اس نے کہنا شروع کیا کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ جب بات سمجھ میں آگئی تو جملے کی بے ربطی ختم ہوگئی۔

آگے بندہ کہتا ہے وایاک نستعین "اور ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ مطلب یہ کہ ہم تیری عبادت کرنا چاہتے ہیں تیری فرماں برداری کرنا چاہتے ہیں تو کیسے کریں؟ یہ تو معلوم نہیں ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے، کیا تجھ کو پسند ہے، کیا ناپسند ہے؟ تو اس سلسلے میں ہمیں تیری مدد کی ضرورت ہے اور یہ مدد ہم دوسروں سے نہیں صرف تجھ سے چاہتے ہیں۔

آگے بندہ کہتا ہے

اھدناالصراط المستقیم ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ایسا راستہ جس میں گھماؤ پھراؤ نہ ہو، پر پیچ نہ ہو، جس کو بدلنا نہ پڑے۔ راستہ ایسا ہونا چاہیے یعنی طریقۂ زندگی کہ جس پر چلتے ہوئے ہم اپنی منزل پالیں۔ سیدھا راستہ بندہ اس لئے مانگتا ہے کہ سیدھے راستہ پر انسان آنکھ بند کر کے بھی چل سکتا ہے۔ اس کو بھٹکنے کا خدشہ نہیں رہتا ہے۔ تو حقیقتاً بندہ ایسے طریقۂ زندگی اور ایسے راستہ کا متلاشی ہے کہ جس پر چلنے کے بعد کسی دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو صراط مستقیم کی مانگ اس لئے بھی ہے کہ جس طرح خط مستقیم ہی سب سے مختصر لائن (Short) ہوتی ہے اسی طرح صراط مستقیم بھی اسے جلد از جلد منزل تک پہنچا دے گی۔ نیز یہ کہ صراط مستقیم جب بھی ہوگا ایک ہی ہوگا۔

پھر بندہ یہ صراحت کرتا ہے کہ وہ صراط مستقیم کیسا ہونا چاہیے؟ کہتا ہے

صراط الذین انعمت علیھم غیرالمغضوب علیھم والاالضالین صراط مستقیم والا راستہ ایسا راستہ ہونا چاہیے جن پر چلنے والوں پر تیرا انعام ہوا، جو معتوب نہ ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ راستہ ایسا ہونا چاہیے کہ یہودیوں کی طرح ہم پر عتاب نازل نہ ہو، پوری شریعت پانے کے بعد ہم گمراہ نہ ہو جائیں اور نہ عیسائیوں کی طرح بھٹکے ہوئے رہ جائیں۔ کیونکہ عیسائیوں پر تو شریعت مکمل ہوئی ہی نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام تو نبوت کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی اٹھا لیے گئے تھے، تو بندہ اس سے بھی پناہ مانگ رہا ہے اور وہ مکمل شریعت کا خواہش مند ہے۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے۔ اس سورہ کو "سبع مثانی" کہا جاتا ہے یعنی سات بار دہرائی جانے والی۔ گویا کہ اس میں سات آیتیں ہیں۔ کچھ مفسرین بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ایک آیت مان لیتے ہیں اور اس کو ملا کر سات آیت کہتے ہیں، کچھ اس کو یعنی بسم اللہ کو چھوڑ کر۔

سورۃ البقرہ

سورہ الفاتحہ میں جب بندہ اپنے رب سے ہدایت مانگتا ہے تو اللہ پاک اس کے جواب میں پورا قرآن شریف اس کو دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ہے ہدایت ہدایت اللہ تعالیٰ کو ساری نوع انسانی کو دینا تھا۔ کسی ایک قوم کو نہیں اور نہ اس کو شریعت محمدی کے علاوہ کوئی دوسری شریعت بھیجنا تھا۔ تو اس کے لئے ضرورت اسکی تھی کہ اس کو اسی شکل میں بھیجا جائے کہ لوگ ان باتوں کو صحیح تسلیم کریں۔ جس وقت عرب میں قرآن کا نزول ہوا جب کہ لکھنا پڑھنا بہت کٹھن کام تھا خاص کر 'لکھائی' اس وقت آج کی طرح روشنائی کاغذ نہیں تھا۔ اسلئے لوگ بالکل سچی باتوں کو لکھ کر رکھتے تھے۔

رکوع:۱

کلام کا آغاز بے معنی لفظ سے ہوا۔ 'الم' قرآن میں جگہ جگہ پر اس طرح کے الفاظ ملتے ہیں۔ اس کو حروف مقطعات کہا جاتا ہے۔ اس وقت عربوں کا یہ دستور تھا کہ جب ان کو کچھ لکھنا ہوتا تو وہ اسی طرح کے بے ربط جملے کہا کرتے تھے اور لوگ اکھٹا ہو جایا کرتے تھے۔ مفسرین کے درمیان اس میں بہت اختلاف رہا ہے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ یہ کوڈ ورڈ ہے جو صرف رسول اللہ کے لئے ہوتا تھا، اس کا اپنا الگ معنی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

حروف مقطعات کے سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ کی سچائی کا نمونہ ہے۔ ان پر جو کچھ بھی اللہ نے وحی کیا آپؐ نے بنا کمی اور بیشی کئے اس کو جوں کا توں پہنچایا۔

ذلک الکتب لاریب فیه یہ کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ کتابی شکل میں ہے جیسا کہ اس وقت سمجھا جاتا تھا کہ لکھی باتیں سچی ہوتی ہیں اس لئے اس کلام میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب یہ کہ یہ کتاب ہے تو کس قسم کی کتاب ہے تو بتایا گیا کہ

ھد ی للمتقین 'ہدایت ہے'۔ جس کا مطالبہ ابھی سورہ الفاتحہ میں تم نے کیا تھا۔ کن لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور کس قسم کے لوگ ہدایت پاسکتے ہیں تو بتایا گیا کہ المتقین یعنی پرہیز گار لوگ۔ جس طرح ایک آدمی اگر چاہے کہ وہ I.A. میں داخلہ لے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ میٹرک پاس ہو اور میٹرک کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی چاہے کہ وہ انگلش جانے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے وہ اس کے حروف کو پہچانے اگر وہ اس کے حروف ہی کو نہ پہچان سکے گا تو وہ انگلش سیکھ ہی نہیں سکتا ہے۔ I.A. کے ایڈمیشن کے لئے ضروری ہے کہ وہ میٹرک پاس ہو تو ہدایت پانے کے لئے ضروری ہے کہ پرہیز گار ہو۔ اس کے اندر بھلائی اور برائی کو سمجھنے کی تمیز ہو وہ برے کاموں سے بچنا چاہتا ہو اور بھلے کاموں کو کرنے کا خواہش مند ہو جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بتایا کہ پرہیز گاری یہ ہے کہ جس طرح انسان جب ایک ایسی پگڈنڈی سے گذرتا ہے جس کے دونوں طرف خار دار جھاڑیاں ہوں ہوتو وہ کرتے کا دامن سمیٹ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور اپنی منزل کو پالیتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں تم اس طرح رہو کہ دنیا کی ساری چمک دمک اور رونق سے منہ موڑ کر بس اسلام کی سیدھی شاہراہ پر آگے بڑھتے رہو۔ تو سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہوئی کہ پرہیز گاری یعنی بچنے کی صفت تمہارے اندر پائی جائے۔ اس پر ہدایت کا حاصل ہونا موقوف ہے۔ تقویٰ کی صفت کے ساتھ ہدایت پانے کے لیے پانچ شرطیں بتائیں گیں:

پہلی شرط یہ بتائی گئی کہ الذین یومنون بالغیب غیب پر ایمان لانے والے ہوں اللہ کو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ فرشتوں کو، جنت اور جہنم کو انسانی نظروں نے نہیں دیکھا ہے تو اللہ تعالیٰ کے کہنے کا مطلب ہے کہ جو شخص ان پوشیدہ حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار ہو جائے وہی قرآن سے ہدایت پاسکتا ہے۔

دوسری شرط بتائی گئی ویقیمون الصلوٰۃ نماز قائم کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب اس نے ایمان لایا تو ہدایت پانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف مان ہی نہ لے بلکہ عملی اطاعت کے لئے راضی ہوجائے اور عملی اطاعت کا سب سے اچھا طریقہ نماز ہے۔ لیکن ایک بات اور غور طلب ہے اور وہ یہ کہ اللہ پاک نے نماز پڑھنے کو نہیں کہا بلکہ نماز قائم کرنے کو کہا ہے۔ مطلب یہ کہ خود بھی نماز پڑھے اور دوسرے کو بھی پڑھنے کی تلقین کرے۔ پورے خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز پڑھے اور نماز میں جن باتوں کا اقرار کرے ان پر سختی سے کاربند ہوجائے۔

تیسری شرط یہ بتائی گئی کہ ومما رزقنا ھم ینفقون جو رزق بھی دیا گیا ہے انہیں سے خرچ کرتے ہیں۔ پیسہ، علم، طاقت، ذہن غرض جس شکل میں بھی اللہ نے اس کو دولت دی ہے وہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا ہوتا ہے۔ تنگ دل نہیں ہوتا بلکہ قربانی دینے کا جذبہ ہوتا ہے۔

چوتھی شرط والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک ان سب کتابوں پر ایمان لانا جو وحی کے ذریعہ نبیوں پر نازل کی گئی ہیں قرآن سے ہدیت پانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب کتابوں کو مانے جوان کو ماننے سے انکار کردے گا وہ قرآن سے ہدایت نہیں پاسکتا۔

پانچویں شرط وبالآخرۃ ھم یوقنون آخرت کا یقین۔ یعنی اس کو یہ یقین ہو کہ اس دنیا سے ایک روز چلے جانا ہے اور دوسری دنیا میں اس دنیا میں کیے کا بدلہ پانا ہے۔ اور وہاں ہمارے اعمال کے مطابق ہی جزایا سزا ملے گی۔ آخرت کا یقین ہی انسان کو ذمہ دار بناتا ہے۔ اس کے اندر بھلائی کو کرنے اور برائی سے بچنے کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ یہ پانچویں اور آخری شرط ہے ہدایت پانے کیلئے۔

تب اللہ تعالیٰ ان کو بشارت دیتا ہے اولئک علی ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون کہ ایسے ہی لوگ سیدھے اور سچے راستے پر ہیں جس کی دعا بندے نے سورۃ الفاتحہ میں کی۔ اور فلاح پانے والے بھی ایسے ہی لوگوں کو کہا گیا ہے۔ دنیا میں فلاح کا لفظ ایسے ہی لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جن کی آخری زندگی یعنی بڑھاپا آرام سے گذرتا ہے۔ دنیا والوں کے نزدیک تو یہی زندگی سب کچھ ہے اسلئے وہ بڑھاپے کی زندگی کو ہی آخری زندگی سمجھ کر آرام کھوجتے ہیں۔ مگر ایمان لانے والوں کے نزدیک اور اللہ کے نزدیک آخری زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ آخرت ہی کے بارے میں فرمارہا ہے کہ اس دن وہ فلاح پائیں گے، آرام اور سکون میں ہونگے۔ اتنی دور میں اللہ پاک نے ایک قسم کے لوگ کا کردار پورا کردیا۔ ان کے دل کے اندر اگر ایمان ہوتا ہے تو ان کے ظاہر میں بھی ایمان ہوتا ہے یعنی ظاہر باطن یکساں ہوتا ہے۔

ان الذین کفروسواء علیھم ء انذر تھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون. ختم الله علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم. اب آگے ان لوگوں کے خصوصیت بتائی جارہی ہے جو نہ دل سے ایمان لاتے ہیں اور نہ ظاہر میں ان کے ایمان ہے۔ جو لوگ یہ پانچ صفتیں نہیں رکھتے ہیں اور مذکورہ پانچ شرطیں نہیں پوری کرتے ہیں ان کے لئے برابر ہے خواہ انہیں خبردار کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے سرے سے اللہ کو مانا ہی نہیں ہے اور اللہ ہی کا انکار کردیا ہے اسلئے وہ اب کسی بات کا اقرار نہیں کرسکتے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کوئی بات اگر آدمی شروع میں مان لے تو آگے کی ساری باتیں بھی وہ سمجھتا جائے گا اور مانتا جائے گا اور اگر کوئی شخص شروع ہی میں انکار کردے تو آگے کی بات بھی وہ نہ سمجھے گا اور نہ مانے گا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ان کے کانوں پر مہر ہے اور آنکھوں پر پردہ، کیونکہ انہوں نے قرآن کے سوا دوسری چیزوں سے ہدایت پانا چاہا ہے۔ قرآن کے راستہ کے خلاف دوسرا راستہ پسند کیا ہے تو اللہ نے ان کے کانوں پر مہر اور آنکھوں پر

پردہ ڈال دیا۔

ہم خود دیکھیں، اگر کسی کی کوئی بات ہم رد کر دیتے ہیں تو ہمارا ذہن مخالف سمت چل پڑتا ہے، اس کی کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی اس کی دعوت کے لئے ہمارے کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ تو یہی مثال انکار کرنے والوں کی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جس نے انکار کر دیا ہے وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔

اس رکوع میں ایک قسم کے لوگوں کا کردار بیان کیا گیا ہے۔ جن کے ظاہر، باطن یکساں ہوتے ہیں۔ اگر وہ انکار کرنے والے ہیں تو ظاہر اور باطن دونوں طریقے سے، اور اگر ماننے والے ہیں تو ظاہر اور باطن دونوں طریقے سے ماننے والے ہیں۔ اس ایک طرح کے کردار میں بھی دو کردار ہوا (۱) انکار کرنے والا (۲) اقرار کرنے والا۔

رکوع:۲

ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وماھم بمؤمنین. آگے کی آیات میں ان لوگوں کا کردار اللہ پاک نے پیش کیا ہے جو منافق ہوتے ہیں جن کا ظاہر اور باطن یکساں نہیں ہوتا ہے۔

ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس کے دل میں ایمان ہو مگر اس کے اندر ایمان کی ظاہری صفت نہ پائی جاتی ہو تو وہ بھی مومن ہے۔ انسانوں میں سے جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر آخرت کے دن پر تو اللہ پاک ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ظاہر اور باطن میں یکسانیت ہونی چاہئے۔ محض دعویٰ کرنے سے کوئی شخص ایمان والا نہیں ہوسکتا اور نہ بظاہر ایمان والوں کا رنگ ڈھنگ اختیار کرنے سے مومن ہوسکتا ہے بلکہ اس کے لیے دل سے ایمان لانا شرط ہے۔

پھر کہا گیا یہ منافق سمجھتے ہیں یخدعون اللہ والذین امنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون کہ ہم ایمان لانے والوں کو اور اللہ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ اللہ کو اور ایمان لانے والوں دھوکا نہیں دیتے ہیں اور نہ دے سکتے ہیں۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ عالم الغیب ہے۔ مگر ایمان لانے والے کیسے دھوکا نہیں کھا سکتے کیونکہ وہ تو انسان ہیں غیب کی باتوں کو جاننا انسان کے بس کا روگ نہیں ہے، اسلئے وہ دھوکا کھا سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ نہیں وہ دھوکا نہیں کھا سکتے۔

مومن بندوں کی مثال فوج کی سی ہے۔ جس طرح ایک فوج جب تک اپنے کمانڈر کے حکم کے مطابق چلتی ہے تو وہ ناکام نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ کمانڈر کو جتنی باتوں کا علم ہوتا ہے فوج کو نہیں۔ مومن بندوں کا کمانڈر اللہ پاک ہے۔ جب آدمی اللہ کے حکم کے مطابق اپنی زندگی گزارے گا تو دھوکا نہیں کھا سکتا۔ مگر بات یہ ہے کہ فوج کا کمانڈر تو ہر وقت ان میں موجود ہوتا ہے، جس وقت جیسی ضرورت ہوتی ہے اس وقت وہ ویسا ہی حکم دیتا ہے۔ مگر اللہ پاک فرداً فرداً حکم دینے سے رہا، اس لئے اس نے قرآن کی شکل میں اپنا حکم دے دیا کہ جو اس پر چلتے رہیں گے وہ دھوکا سے بچتے رہیں گے۔

زمانے کے لحاظ سے بھی انسان دھوکا کھا سکتا ہے۔ ہر زمانے میں مختلف طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی بروقت مدد کرتا ہے۔ جیسا کہ جنگ احد میں نماز کا حکم۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں خطبہ دیتے دیتے ان کے منہ سے یہ نکلنا یاساری الجبل پہاڑ پر چڑھ جاؤ وغیرہ۔ تو اللہ تعالیٰ بروقت بھی مدد کرتا ہے کبھی الہام کے ذریعہ تو کبھی فرشتوں کو انسانی شکل میں بھیج کر۔

اللہ پاک منافقوں کے بارے میں کہتا ہے کہ نہ خدا کو دھوکا دے سکتے ہیں وہ جو کرتے ہیں چھپے اور کھلے اس کو اللہ جانتا ہے

اور نہ مومن ہی دھوکا کھا سکتے ہیں کیونکہ وہ ان کی بروقت مدد کرتا ہے۔ بلکہ دھوکا تو یہ خود کھا رہے ہیں مگر ان کو سمجھنے کا شعور نہیں ہے۔

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا. ولھم عذاب الیم. بما کانو یکذبون. ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے اس میں اور اضافہ کر دیا اور ان کے لئے دکھ دینے والا عذاب ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں) منافقت کی روش کو اللہ تعالیٰ بیماری کہہ رہا ہے، اور ظاہر بات ہے کہ بیماری کسی کو بھی ہو سکتی ہے اسلئے انسان کو ہر وقت اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے کہ کہیں ہم کو منافقت کی بیماری تو نہیں لگ گئی، اور اگر محسوس کرے تو فوراً توبہ کرنا چاہئے۔ صحابہ کرامؓ دل کی بیماری سے بڑے چوکنا رہتے، ہر وقت وہ اپنا محاسبہ کرتے رہتے تھے، کوئی خیال دل میں آیا اور فوراً وہ گھبرا کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔

ان کے دلوں میں بیماری ہے جسے اللہ نے اور بڑھا دیا۔ اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو اور زیادہ منافق کر دیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقوں کی منافقت کی سزا فوراً نہیں دیتا بلکہ وہ ڈھیل دیتا ہے، اور منافق اپنی چال کو کامیاب ہوتے دیکھ کر یا سزا نہ ملنے کی صورت میں اور زیادہ منافقت کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔

اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے بہ سبب اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ منافقوں کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ منہ دیکھی بات کرتے ہیں۔ اگر کافروں کے طرف گئے تو مومنوں کی برائی اور اگر مومنوں کی طرف گئے تو کافروں کی برائی، تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ان کی صفت کی بنا پر ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں۔ ان سے جب کہا جاتا ہے کہ منافقت کی روش چھوڑ دو اور ادھر کی ادھر کر کے جو لگائی بجھائی کرتے ہو اور فساد پھیلاتے ہو اس سے باز آجاؤ تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں۔

منافق جو بات بھی بولتے تھے تو اس کا دو مطلب ہوا کرتا تھا، ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ مومن جب پوچھتے، یہ کیا بولے کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں تو وہ کہتے، دیکھو ہم سب آپس میں رشتہ دار ہیں، تو ہم ان سے بھی ملتے ہیں تم سے بھی ملتے ہیں، ہم تو جھگڑا ختم کرتے ہیں۔

اصل میں ان کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ جنت اور جہنم کا تصور اللہ اور آخرت کا تصور لوگوں کو دلا کر تو تم فساد پھیلائے ہوئے ہو آپس کے رشتہ دار کو دشمن بنائے ہوئے ہو۔

اللہ تعالیٰ کہتے ہیں الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون. خبردار! بیشک یہی فساد کرنے والے ہیں مگر کوئی شعور نہیں رکھتے کہ دیکھو ان کی ظاہری باتوں پر نہ جانا، حقیقت یہ ہے کہ یہ خود مفسد ہیں مگر ان کو شعور نہیں ہے۔

واذا قیل لھم امنوا کما امن الناس قالوا انؤ من کما امن السفھاء الا انھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون. اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایمان لاؤ جیسا کہ یہ لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا کہ یہ بیوقوف لائے ہیں۔ خبردار! دراصل یہی بیوقوف ہیں مگر نہیں جانتے۔ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں۔ منافقوں کے اس قول کے اندر بھی دو معنی ہوتا____ ظاہر اور باطن کچھ۔

یہاں 'سفہا' کا لفظ جو استعمال ہوا اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک درخت ہے جس کا ایک پتہ جھڑ چکا ہے، ایک اسی سے لگا ہے۔ درخت سے جھڑا ہوا پتہ جدھر کی ہوا چلتی ہے اسی طرف اڑ جاتا ہے اور یہ مضمون اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ مگر درخت سے جڑا ہوا پتہ صرف ہل کر رہ جاتا ہے، جدھر کی ہوا ادھر نہیں جاتا ہے۔

تو مومن اور منافق کی مثال ایسی ہی ہے۔ مومن بندہ اپنے اللہ رسول کی ہدایت سے اس قدر جڑا رہتا ہے کہ اس کو کسی قسم کی ہوا بہا نہیں سکتی خواہ وہ خاندان کی ہو، سماج کی، قبیلے کی، حکومت کی، زمانے کی، ہر حالت میں وہ ثابت قدم رہتا ہے، چاہے اسلام کی مغلوبیت کا دور ہو چاہے غلبے کا، ہر حالت میں وہ ایک طرح سے رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کے سرد و گرم سے وہ کچھ گھبرا جاتا ہے مگر ٹوٹتا نہیں ہے۔

مگر منافق زمانے کے سرد و گرم سے ٹوٹ جاتے ہیں اور زمانے کی ہوا کے ساتھ بہتے ہیں اگر اسلام کا اقتدار ہو تو اس کے حامی ہو جاتے ہیں، اگر کفر کی ہوا ہو تو اس کے حامی ہو جاتے ہیں۔ مگر سفہا یعنی بیوقوف یا یوں کہئے درخت سے ٹوٹے ہوئے پتے یہ مومنوں کو بتا رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ درخت سے ٹوٹا ہوا پتہ منافقوں کو کہتا ہے اور یہ بھی کہ وہ شعور نہیں رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ منافقوں کی ایک اور صفت بتاتا ہے۔ واذالقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا و اذا خلوا الیٰ شیطینھم قالوا انا معکم انما نحن مستھزء ون. جب وہ ایمان لانے والے مومنوں سے ملتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں یعنی ہم مسلمان ہیں اسلام پر چلنے والے ہیں اور جب اکیلے میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شیطانوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ شیطان سے مراد وہ انسان ہیں جن کے اندر شیطانی صفت پیدا ہوگئی ہے۔ دراصل سرداران مکہ کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کی مخالفت میں آگے آگے تھے۔

کافر لوگ جب منافقوں کی یہ حرکت دیکھتے کہ وہ مسلمانوں سے بھی ملتے ہیں اور ہمارے پاس بھی آتے ہیں تو سوچتے ضرور یہ شخص خطرناک ہے، اس کو ہمراز نہیں بنایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی باتوں پر یقین کیا جاسکتا ہے۔ منافق کافروں کو یقین دلانے کے لئے کہ ہم پورے کے پورے تمہارے ساتھ ہیں جب ان سے تنہائی میں ملتے تو کہتے کہ حقیقت میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں سے جو ہم ملتے ہیں تو ہم ان کا مذاق اڑاتے ہیں یعنی ان کو بیوقوف بنا کر ان کی باتیں معلوم کرتے ہیں اور تم تک پہنچا دیتے ہیں۔ تو میرا ملنا تو ضروری ہے، اگر ہم نہ ملیں تو ان کی باتوں کی خبر تم تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ اللہ یستھزئ بھم ویمدھم فی طغیانھم یعمھون. اللہ ان سے مذاق کرتا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں بڑھاتا ہے وہ اندھے ہو رہے ہیں۔ ایک بات تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے براہ راست نہیں کہا کہ اللہ تم سے مذاق کر رہا ہے بلکہ کہا کہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ منافق اس لائق نہیں ہیں اللہ کی نظر میں کہ ان سے براہ راست بات کی جائے۔ اب ایک بات اور کہ قرآن میں آگے تو اللہ نے کسی کا مذاق اڑانے کو سختی سے منع کیا ہے اور ناپسند کیا ہے۔ مگر یہاں خود اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ تو اس کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر انسان چاند پر تھوکنا چاہے تو وہ تھوک خود اسی آدمی پر پڑے گا۔ اگر کوئی پہاڑ کو مارے تو چوٹ بھی خود اسی کو لگے گی۔ اسی طرح منافقوں کو اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ یہ جو سمجھ رہے ہیں کہ ہم اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں تو یہ ان کی بیوقوفی ہے۔ وہ مذاق تو خود انہیں پر پلٹ رہا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ ان کو چھٹھر اینایا جا رہا ہے۔ اور اپنی سرکشی میں وہ بھٹک رہے ہیں۔

اولئک الذین اشتروا الضللۃ بالھدیٰ فماربحت تجارتھم وما کانوا مھتدین. یہی لوگ جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی تو انکی تجارت نے کوئی فائدہ نہ دیا اور نہ وہ ہدایت پانے والے تھے۔ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس ہدایت آئی اور انہوں نے اس کو قبول کیا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ہدایت پر چلنا بہت مشکل ہے اور اس پر چلنے کے لئے ہم کو بہت کچھ چھوڑنا ہوگا، قربانیاں دینی ہونگی تو انہوں نے ہدایت پر چلنا چھوڑ دیا اور گمراہی کی راہ اختیار کرلی۔ پھر اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ نہیں نفع پہنچایا ان کی تجارت نے۔ منافق کی یہ خاصیت کہ وہ ہر کام کو نفع اور نقصان پر تولتے ہیں۔ ہدایت اور گمراہی کو بھی منافق اسی طرح دیکھتے تھے کہ کس

راہ پر چلنے میں ہم کو فائدہ ہے انہوں نے دیکھا کہ یہ زمانہ گمراہی کا ہے، کفر کا ہے اسلئے کافروں کی ہی حمایت کرو، اسی میں فائدہ ہے۔ اور جب اسلام کا غلبہ ہو جائے گا، اسلام کی حکومت ہوگی تو اسلام کی طرف ہو جائیں گے۔ انہوں نے تجارت کی طرح اس کو بھی لیا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں کا حال بھی جانتا ہے۔ اسی لئے ان سے کہا کہ ان کی یہ تجارت ان کے لئے نفع بخش نہ ہوئی۔ اور نہ وہ ہدایت پانے والے تھے۔ (تجارت پیشہ کی طرح انہوں نے اپنا راستہ اختیار کیا کہ جدھر فائدہ ہوگا اسی طرف رہیں گے۔)

ابھی تک تو ان حقیقتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو منافقین کے اندر پائی جاتی تھیں۔ آگے اللہ پاک مثال کے ذریعہ ان کے کردار کو واضح کر رہا ہے مثلھم کمثل الذی استوقدنارا فلما اضاء ت ماحوله ذھب الله بنورھم وترکھم فی ظلمٰت لایبصرون. ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے آگ بھڑکائی پھر آگ نے اس کا اردگرد روشن کر دیا تو اللہ چھین لی ان کی روشنی اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا وہ نہیں دیکھتے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے ''ان لوگوں کی مثال اس کی طرح ہے جس نے سلگائی آگ۔ یہاں ان لوگوں سے مراد منافقین ہیں اور 'اس کی طرح' سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منافقوں کے سامنے اللہ کے رسولؐ نے ہدایت کی راہ بتانا شروع کی۔ اور جب آگ نے یعنی ہدایت نے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے چھین لی ان کی روشنی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب منافقوں کے پاس صاف صاف ہدایت پہنچ گئی اور ان لوگوں کو اس ہدایت میں کچھ فائدہ نظر نہ آیا تو انہوں نے ہدایت کا راستہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ان کا نور بصارت ہی سلب ہو گیا۔ چونکہ اللہ کے رسول نے کھلی کھلی ہدایت بتا دی تھی اور منافق ہدایت کی راہ کو اپنانے کے بجائے گمراہی میں ہی ڈٹے رہے تو اللہ نے نور بصارت ہی سلب کر لیا اور ان کو اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔

ایک بات جو یہاں سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اللہ نے 'نور' اور 'ظلمات' استعمال کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہدایت کا راستہ۔ جو روشنی ہے وہ ایک ہی ہے، ایک ہی طریقہ کو اختیار کر کے اگر انسان زندگی گذارے گا تو وہ کامیاب ہوگا۔ اسی لئے پورے قرآن میں نور ہمیشہ واحد ہی استعمال کیا گیا ہے اور ظلمت جمع۔ گمراہ کن راستہ بہت سارا ہو سکتا ہے اور ہے۔ تو منافقین انہیں اندھیروں میں۔ ہدایت کھوج رہے ہیں اور بھٹک رہے ہیں۔ کبھی ایک طریقے کو اپناتے ہیں تو کبھی دوسرے طریقے کو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

صم بکم عمی فھم لایرجعون. کہ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، وہ لوگ نہیں لوٹیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ منافقوں کا رویہ حق کے معاملے میں اس شخص کا سا ہے جس کے اندر یہ تینوں صفتیں پائی جاتی ہیں مثلاً اگر کوئی انسان صرف اندھا ہو اور کسی راستہ سے جا رہا ہو اور کوئی اس کو بتائے کہ تم غلط راستہ پر جا رہے ہو تو وہ سیدھے راستہ کی طرف آ سکتا ہے نہ دیکھنے کے باوجود۔ کوئی شخص اگر اندھا اور بہرا دونوں ہو تو وہ صحیح راستہ نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ کسی کے بتانے پر سن سکتا ہے۔ مگر وہ پوچھ سکتا ہے اسلئے کہ وہ گونگا نہیں ہے اور صحیح راستہ پا سکتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اندھا، بہرا، گونگا تینوں خامیاں رکھتا ہو تو وہ کبھی بھی سیدھا راستہ نہیں پا سکتا۔ اسلئے کہ نہ وہ دیکھ سکتا ہے۔ بہرا ہونے کی وجہ کر نہ سن سکتا ہے اور گونگا ہے اسلئے پوچھ بھی نہیں سکتا۔ منافقوں کا حال ایسا ہی تھا۔ ہدایت کے لئے وہ اندھے، بہرے اور گونگے تھے۔

او کصیب من السماء فیه ظلمٰت ورعدوبرق یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت. والله محیط بالکفرین. 'یا آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو، اس میں اندھیرا، کڑک اور چمک ہو'۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے تمثیلی انداز اختیار کیا ہے۔ موسلا دھار بارش سے مراد وحی ہے اس کے بعد کہا گیا کہ اس میں اندھیرا ہے۔ یعنی 'ظلمت' وحی کے ذریعہ اللہ کے جو احکامات بھی آئے تو منافقوں کو اس میں اپنا حال اور مستقبل دونوں تاریک نظر آیا۔ کہیں حکم آیا جو کچھ ہے اللہ کی

راہ میں خرچ کرو، حرام کھانا چھوڑ دو، ہجرت کرو وغیرہ۔ اس کے علاوہ اپنے رشتہ داروں کو چھوڑنا اور مسلمانوں پر ڈھایا جانے والا جور وستم وغیرہ انہیں سب کو اللہ تعالیٰ نے ظلمات کہا ہے۔ پھر کہا گیا 'رعد' کڑک ہے۔ تو وحی کے ذریعہ ایسے مشکل احکام بھی آتے جیسے جہاد کا حکم اور جو کچھ مال ہے وہ سب کا سب اللہ کی راہ میں دے دو وغیرہ۔ تو یہ سب سخت احکام تھے جن کا کرنا مشکل معلوم ہوتا۔ وحی کے ذریعہ ایسے بھی احکام آئے جن میں مسلمانوں کو خوش خبری دی گئی دنیا میں بھی آخرت میں بھی، تو اس کو اللہ تعالیٰ نے 'برق' کہا۔ آگے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وحی کے ذریعہ ہم جو احکامات بھیجتے ہیں تو منافق ٹھونس لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک سے، موت کے ڈر سے۔ کی مثال اس بیوقوف آدمی کی طرح ہے کہ جب بادل کی کڑک ہوتی ہے تو وہ اپنے کانوں میں انگلیاں کر لیتا ہے اس لئے کہ آواز ہی نہ جائے اور ہم بچ رہیں۔ چنانچہ منافق کا رویہ سخت احکام میں جب کہ انہیں اپنی موت ناچتی نظر آتی، مستقبل تاریک نظر آتا تو وہ سوچتے کہ ان احکام کو سنا ہی نہ جائے تو ہم جواب دہی سے بچ جائیں گے۔ آگے اللہ تعالیٰ کہتا ہے 'اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے' اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم جو طریقہ اپنائے ہوئے ہو وہ کافروں کا طریقہ ہے۔ تو یہ سن لو کہ کافروں کو تو اللہ گھیرے ہوئے ہے وہ اللہ کی پکڑ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم کافروں کے خوف سے اس طرز عمل کو اختیار کیے ہوئے ہو تو جان لو کہ کفار تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔

منافقین کے سامنے جو ہلکے پھلکے احکام اترتے جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ وہ ان کو کر لیتے تو اسی کے لئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوافیہ. واذا اظلم علیھم قاموا. ولوشاء اللہ لذھب بسمعھم وابصارھم. ان اللہ علی کل شیٍ قدیر. عنقریب ہے کہ چمک ان کی بصارت اچک لے۔ آسان احکام پر تو عمل کر لیتے ہو اور مشکل احکام سے منہ موڑ جاتے ہو تو اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سے اتنی توفیق بھی چھین لیتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ شیوہ نہیں ہے۔ اسنے انسانوں کو اختیار اور خیالات کی آزادی دی ہے اگر وہ چاہے تو ہدایت کی راہ پر چلے یا گمراہی کی راہ پر۔ اور جو جتنی ہدایت پانا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اتنی ہی عنایت کرتا ہے اور اس کے لئے راہ ہموار کرتا جاتا ہے زبردستی کرانا اللہ کا کام نہیں ہے۔ جو کامل ہدایت چاہتا ہے اس کو کامل عطا کرتا ہے جو تھوڑا چاہتا ہے اس کو تھوڑا عطا کرتا ہے۔

☆☆☆

درس قرآن

ضیاءالہدیٰ

(ڈاکٹر صاحبؒ کے اس درس کو وقارانور صاحب نے آڈیو کیسٹ سے ترتیب دیا)

قالت الاعراب آمنا ۔ قل لم تؤمنوا و لکن
قولوا اسلمنا ولما ید خل الایمان فی قلوبکم (الحجرات:۱۴)

محترم ساتھیو! سورہ حجرات کی یہ آیت جو میں نے پڑھی ہے مکمل نہیں، اس کا ایک حصہ ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ،اے نبیؐ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کر لی ،فرماں برداری کرر ہے ہیں، ایمان تو ابھی تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا ہے۔یہ آیت ہر اس شخص کو چونکا دینے والی ہے جو اپنے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ ہم صاحب ایمان ہیں۔پہلی بات تو یہ کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ ایمان کا تعلق قلب سے ہے۔اللہ نے فرمایا کہ تمھارے قلب میں، تمھارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے اور دل کا حال تو اللہ ہی سب سے زیادہ جانتا ہے۔اس کے بعد کوئی جان سکتا ہے تو آدمی خود جان سکتا ہے۔یہاں اللہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ تمھارے دلوں میں ایمان داخل ہی نہیں ہوا ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم لوگ جو سمجھتے ہیں کہ صاحب ایمان ہیں کہیں خدانخواستہ ہم بھی انہیں میں سے تو نہیں ہیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان داخل نہ ہوا ہو۔خاص کر اس وجہ سے بھی کہ وہ دیہاتی جنہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا، جہاں تک داخلی طور پر اللہ اور اس کے رسولؐ کو ماننے کا تعلق ہے اس میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔چنانچہ قرآن نے خود کہا کہ کہو کہ ہم نے فرماں برداری اختیار کر لی ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ اس معاملہ میں بھی کوتاہ ہیں۔ہم میں سے کون آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہم اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کرر ہے ہیں، ہاں اپنے من کے مطابق جہاں پر یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی زیادہ خطرہ نہیں ہے،کوئی زیادہ ایثار و قربانی نہیں ہے تو عمل کر لیتے ہیں اور جہاں یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں ہمارا دنیا کا کوئی نقصان ہے یا مستقبل کے لئے خطرہ ہے تو پھر ہم وہاں معلوم نہیں کتنی بار یہ سوچتے ہیں کہ اس کو کریں یا نہ کریں۔اس معاملہ میں تو ہم ان دیہاتیوں سے بھی پیچھے ہیں۔پھر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم صاحب ایمان ہیں۔یہ ہے بڑے خطرے کی بات، چنانچہ آپ دیکھئے کہ سورہ بقرہ کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت جو شروع ہوتی ہے یہ کہہ کر کہ ومن الناس من یقول آمنا باللہ و بالیوم الاخر وما ھم بمؤمنین وہ کہتے ہیں ہم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے۔حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔اللہ تعالیٰ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ وماھم مومنون کہ وہ ایمان نہیں لائے ہیں صرف دعویٰ کرر ہے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نفی نہیں کی کیونکہ منافق بھی جو تھے ان کے ایمان کی نفی نہیں کی گئی ہے۔نفی یہ کی گئی ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ایمان لانا ایک چیز ہے اور مومن ہونا دوسری چیز۔ایمان لانا تو یہ ہے کہ ایک شخص کہے کہ ہم نے مانا اللہ کو، ہم نے مانا رسول کو، ہم نے مانا آخرت کو، ہم نے مانا کتاب کو وغیرہ وغیرہ تو ایمان لے آیا۔مومن ہوا یا نہیں یہ معاملہ الگ ہے۔چنانچہ دیہاتی جن کے بارے میں قرآن کہہ رہا ہے کہ ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے بظاہر تو یہ کہہ کر مسلمان ہو چکے تھے۔اللہ نے یہ نہیں کہا کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہا کہ تمھارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔اس نزاکت کو محسوس کیجئے نہیں تو اس کا بڑا خطرہ ہے کہ ہم اس

فریب میں مبتلا رہیں کہ ہم صاحب ایمان ہیں اور اللہ ہمیں مومن کے طور پر قبول نہ کرے۔ ہمارے جو کچھ اعمال ہیں ان اعمال کے بارے میں صورت حال یہ ہے کہ سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا۔ الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا و ھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ کہہ دیجئے کیا میں تمہیں بتاؤں ان لوگوں کے بارے میں جو اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹے میں ہیں۔ عمل کرتے ہیں وہ مگر اس عمل کے باوجود وہ سب سے زیادہ گھاٹے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں، جن کے اعمال دنیا میں بھٹک کر رہ گئے ہیں اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑا حسین عمل کر رہے ہیں تو ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا دنیاوی زندگی میں ان کے اعمال بھٹک گئے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جو مہلت ملی ہے دنیا میں رہنے کی، جتنی بھی مہلت ہو جس کو ملی ہو۔ یہی ایک مہلت ہے۔ تو یہ دنیوی زندگی کی جو مہلت ہے اس مہلت میں جو عمل کیا انہوں نے وہ صحیح عمل نہیں کیا، دیکھنے میں اچھا تھا لیکن وہ صحیح تھا نہیں۔ دوسرا یہ مطلب ہے کہ ان کے جو بھی اعمال تھے بظاہر اللہ کی عبادت اور فرماں برداری کے تھے، لیکن تھے وہ دنیا ہی کی زندگی کے لئے۔ آخرت سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ دونوں مفہوم کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے وہ اس خوش فہمی میں ہیں کہ بڑا اچھا عمل کر رہے ہیں حالانکہ ان کا یہ عمل اللہ کے یہاں رائیگاں ہو گیا اور وہ سب سے زیادہ گھاٹے والے ہو گئے۔ یہ گھاٹا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یہ وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالیں گے اور اپنے اہل وعیال سے بھی محروم ہو جائیں گے اور یہ ہے اصل گھاٹا، اور اس گھاٹے میں سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ ہیں جو سمجھ رہے ہیں کہ ہم تو عبادت کر رہے ہیں، ریاضت کر رہے ہیں، تہجد گزاری کر رہے ہیں، نماز پڑھ رہے ہیں، خیرات کر رہے ہیں مگر یہ سب جو کچھ بھی ہے اللہ کو راضی کرنے اور آخرت بنانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے دنیا ہے۔ ذرا ہم اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ اول تو جو کچھ ہم سے مطالبہ ہے اور جو کچھ ہم کر سکنے کی پوزیشن میں بھی ہیں اسی کو نہیں کر پا رہے ہیں، پھر جو کچھ ہم کرتے ہیں اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ واقعی خدا کی رضا مندی کے لئے ہے؟ کیا یہ واقعی آخرت کی کامیابی کے لئے ہے؟ یا اس کے پیچھے کچھ اور چھپا ہوا ہے۔ اگر ان دو چیزوں کے علاوہ کچھ اور چھپا ہوا ہے تو یہی ہے جو عمل کو برباد کرنے والا ہے۔ اور یہ فیصلہ ہر آدمی اپنے بارے میں خود کر سکتا ہے دوسرا کوئی کسی کے بارے میں نہیں کر سکتا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ یہ ایمان کا معاملہ ایسا معاملہ ہے کہ اسی پر آخرت میں کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے۔ جس کے پاس ایمان ہے اس کے لئے جہنم حرام اور جس کے پاس ایمان نہیں ہے اس کیلئے جنت حرام۔ اس کو سمجھ لیجئے اچھی طرح۔ جس کے پاس ایمان نہیں ہے چاہے کتنے ہی اچھے اعمال ہوں اس کے، جنت اس کے لئے حرام ہے اور جس کے پاس ایمان ہے اس کے لئے جہنم حرام ہے۔ ایمان کا معاملہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ قیمتی معاملہ ہے اسی کی طرف سے ہم غافل ہیں۔

قیامت میں تین گروہ ہوں گے۔ ویسے تو دو ہی ہوں گے، فریق الفی الجنۃ اور فریق الفی السیہ، ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک گروہ جہنم میں جائے گا۔ جنت میں جانے والا گروہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگا۔ ایک وہ جو بغیر حساب کے جنت میں جائے گا، دوسرے وہ جن سے حساب و کتاب لیا جائے گا۔ حساب کتاب والے بھی دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جن سے آسان حساب لیا جائے گا اور دوسرے وہ جن سے باز پرس ہوگی یعنی باضابطہ اللہ تعالیٰ ان سے صفائی مانگے گا۔

اس طرح آپ دیکھیں کہ ایمان والوں کا حال تین ہو گیا۔ ایک وہ جو بغیر حساب جنت میں چلے جائیں گے۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ دوسرے وہ ہیں جن سے حساب لیا جائے گا۔ ان میں دو طرح کے ہوں گے۔ ایک وہ جن سے آسان حساب لیا جائے گا یعنی اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تم نے یہ کیا تھا، وہ جواب دیں گے کہ

ہاں خداوندا، ہم سے یہ ہو گیا تھا۔ بس ہو گیا۔ ان کو بری کر دیا جائے گا۔ اور دوسرے وہ جن سے سخت حساب لیا جائے گا یعنی ان سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ کیوں کیا؟ اور کاہے کیا؟ اور چناں وچنیں تو ان کا معاملہ سخت ہے۔ جو لوگ بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔ ان کو قرآن نے السابقون اور مقربون کہا ہے۔ والسابقون السابقون و اولئک المقربون۔ یہ ایمان میں سبقت لے جانے والے لوگ ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہر طرح کی تکلیفوں اور ہر طرح کی آزمائش جھیلیں اور کبھی ان کو دنیا کا اتنا سا بھی ذرہ برابر خیال نہیں آیا، نہ یہ کہ کیا گھاٹا ہوگا نہ یہ کہ کیا فائدہ ہوگا۔ دنیا کے گھاٹے اور فائدے دونوں سے بے نیاز، جو مصیبت بھی آئی اللہ کی راہ میں سب کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔ چنانچہ یہ اتنے پختہ ہو گئے، ٹھوک ٹھکا کر اتنے درست ہو گئے کہ نفس مطمئنہ حاصل ہو گیا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ نفس تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک نفس مطمئنہ، ایک نفس امارہ، ایک نفس لوامہ۔ نفس مطمئنہ وہ ہے کہ ایمان اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر گیا ہے کہ اب اس سے گناہ کا کام نہیں ہوتا ہے۔ نفس لوامہ وہ ہے کہ آدمی جو گناہ کرتا ہے اس پر اس کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ اور نفس امارہ وہ ہے جو آدمی کو گناہ پر اکساتا رہتا ہے اور آدمی یا تو اس کا شکار ہو جاتا ہے یا اس کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ تو نفس مطمئنہ والے عرش کے سامنے ہونگے۔ ایمان میں سبقت لے جانے والے۔ ایمان میں سب سے آگے بڑھ جانے والے۔ جنہوں نے ایمان کی خاطر سب طرح کی قربانی دی اور دنیا کا ذرا سا بھی شائبہ ان کی نیت میں نہیں داخل ہوا، یہ ہیں وہ لوگ جو مقربون ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو عرش کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے اور جن کو بغیر حساب کتاب کے اللہ تعالیٰ جنت میں لے جائے گا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

یہ وہ مومن ہیں کہ ان کا جو طریقہ ہے اس طریقہ سے جو رخ موڑے گا اور اس طریقہ سے ہٹ کر دوسرے طریقے پر چلے گا اس کو ہم ادھر ہی پھیر دیں گے جدھر وہ جا رہا ہے اور جہنم میں جھونک دیں گے۔ یعنی ان کا وہ مقام ہے کہ جیسے نبی کا اسوہ ہمارے لئے ضروری ہے ویسا ہی ان کا اسوہ ہمارے لئے ضروری ہے۔ انہی کے طریقہ پر ہم کو چلنا ہے، یہ ہے ان کا مقام۔ تو یہ تو بڑے اونچے لوگ ہوئے۔ اب ان کے بعد آتے ہیں وہ لوگ جو عرش کی داہنی طرف ہوں گے۔ نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں ملے گا۔ ان ایک میں وہ لوگ ہیں جن سے آسان حساب لیا جائے گا۔ حساب تو لیا جائے گا لیکن آسان ہوگا اور اسی میں انبیاء علیہم السلام بھی رہیں گے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے حساب تو لیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی کہا ہے کہ ہم تو پوچھیں گے نبیوں سے کہ تم نے پیغام پہنچایا تھا یا نہیں؟ پھر یہ اس گروہ میں نہیں رہیں گے جو بغیر حساب کے چلا جائے گا جنت میں۔ اس گروہ میں رہیں گے جن سے حساب لیا جائے گا اور عام صالحین ہوں گے اللہ کے سارے بندے۔ تو جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ آج بھی ان کو غلطی پر ٹوکا جائے گا تو شرمسار ہو جاتے ہیں اور مان لیتے ہیں یہی عادت وہاں بھی رہے گی اور جن کی عادت دنیا میں یہ ہے کہ غلطی پر ٹوکئے تو برا مان جاتے ہیں اور دس تاویلیں کرتے ہیں اور نہ معلوم کیا کیا داؤ پیچ چلتے ہیں تو وہاں بھی یہی کریں گے۔ جس عادت پر آدمی مرتا ہے اسی عادت پر قیامت میں اٹھایا جائے گا۔ تو ہم کو اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ ہماری عادت کیا ہے۔ سابقون الاولون میں تو ہم ہیں نہیں، وہ صفت تو ہم میں ہے ہی نہیں۔ اب رہا یہ کہ اصحاب یمین میں ہیں یا نہیں اور ہیں تو کس میں۔ آیا ہم ان میں سے ہیں جو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اور ہم یہ دیکھیں صاحب کہ ہماری غلطی پر کوئی ٹوکتا ہے تو ہم جھنجھلا تو نہیں جاتے؟ برا تو نہیں مانتے ہیں؟ اور ہم تاویل تو نہیں کرنے لگتے ہیں اور داؤ پیچ تو نہیں کھیلنے لگتے ہیں اور اگر یہ کر رہے ہیں تو ہم ان میں نہیں ہیں جن سے آسانی سے حساب لیا جائے گا۔

یہیں سے اب کردار سازی شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ آتے ہیں جن سے سخت حساب لیا جائے گا۔ باضابطہ باز پرس

ہوگی۔ یہ وہی لوگ ہیں جو چونکہ اور چنانچہ کرتے ہیں۔ اپنی غلطی پر جمے رہتے ہیں۔ دنیا میں بھی اپنی غلطی کے لئے دس تاویلیں کرتے ہیں بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ بھائی یہ غلطی ہے، گناہ ہوگیا ہے ہم سے، اس کی تاویل کرتے ہیں۔ تو وہی وہاں بھی کریں گے۔ اللہ کے سامنے تاویل کریں گے جیسے ابلیس نے تاویل کی۔ جب ابلیس سے اللہ نے پوچھا کہ تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ اس نے تاویل کی کہ میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ اور یہ کہا کہ تو نے مجھے فتنہ میں ڈال دیا۔ ویسے ہی اس قسم کے مسلمان آپ کو بہت ملیں گے جو یہ کہیں گے ہم کیا کریں، اللہ نے ایسے حالات میں ہم کو مبتلا کر دیا۔ یہ وہی ابلیسی انداز ہے بجائے اس کے کہ وہ اعتراف کرلیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ اگر یہ صاحب ایمان ہیں، اصحاب یمین میں ہیں تب تو خیر وہی ہوگا یعنی ڈانٹ ڈپٹ پھٹکار۔ اور آگے جو معاملہ ہوگا وہ آگے رکھوں گا۔ اور اگر صاحب ایمان نہیں ہیں تو اصحاب یمین میں نہیں ہوں گے بلکہ اصحاب شمال میں ہوں گے جن کے بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال ملے گا۔ جس کا ذکر ابھی نہیں ہو رہا ہے تو اب دیکھئے کہ ایک وہ ہوئے مسلمانوں میں، جو بے حساب جنت میں جائیں گے میں نے بتا دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان میں سب سے آگے نکل گئے۔ جن کا نفس مطمئن ہو چکا، اب ان سے گناہ کا کام نہیں ہوتا ہے، اب ان کے نفس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ گناہ پر ان کو ابھارے۔ آپ نے سنا ہی ہوگا کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں تو یہ ہے کہ ان کے ڈر سے شیطان بھاگتا تھا۔ جس راستے پر وہ چلتے تھے اس راستہ پر شیطان نہیں چلتا تھا۔ وہ کیا آکر کے ان کو پچھاڑے گا اور کیا ان کو ابھارے گا۔ ڈر کے مارے وہ خود بھاگتا تھا۔ تو مومن ایسا ہو جاتا ہے کہ شیطان اس سے ڈر کے بھاگتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کے پاس آوے اور اس کو اکساوے اور اسکو ورغلاوے۔ تو سابقون الاولون میں سب ایسے ہی نہیں ہوئے ہیں لیکن بہر حال نفس ان کا مطمئن ہو جاتا ہے اور اب وہ گناہ کی طرف راغب نہیں ہوتا ہے۔ رہے دوسرے لوگ جن سے گناہ ہوتا ہے اور اس گناہ پر وہ شرمسار ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ ہوگا کہ حساب لیا جائے گا۔ ایک ایک گناہ کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ کیا تھا؟ وہ کہتے جائیں گے ندامت کے ساتھ ہاں خداوندا ہم سے یہ غلطی ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں ایک قصہ ہے جو بہت مشہور ہے کہ محمود بادشاہ گزرا ہے جس کا ایک غلام تھا ایاز، جس کو وہ بہت مانتا تھا۔ چنانچہ جتنے درباری تھے سب رشک کرتے تھے، حسد کرتے تھے اس سے۔ یہاں تک اخیر میں شکایت کی محمود سے کہ آپ اس کو کاہے اتنا مانتے ہیں؟ کہا ٹھیک ہے، پھر سب درباریوں کو بلایا اس کا ایک گلاس تھا فیروزہ کا۔ سوچئے کہ فیروزہ کا گلاس کتنا قیمتی ہوگا، اور اس کو بہت محبوب بھی تھا۔ اس نے ایک ایک درباری کو بلایا اور کہا کہ اس کو لو اور پٹک دو زمین پر۔ کسی کی ہمت نہیں ہوئی۔ پٹکیں گے تو ٹوٹ جائے گا۔ یہ اس کو بہت محبوب ہے۔ غصہ ہوگا بہت۔ سبھوں نے یہ کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہوگا۔ ایاز کو اخیر میں بلایا۔ دیا گلاس ہاتھ میں، کہا پٹک دو۔ پٹک دیا، چور ہوگیا تو ڈانٹ کر کہا کہ تم نے تو توڑ دیا تو بجائے اس کے کہ یہ کہے کہ صاحب میرا اس میں کیا قصور تھا، آپ نے پٹکنے کے لیے حکم دیا تھا میں نے پٹک دیا۔ یہ نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ غلطی ہوگئی۔ تو محمود نے اس کو گلے لگا لیا۔ اور کہا کہ یہ ہے اس کی وفاداری جس کی وجہ سے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ تو ایک مومن جو ہوتا ہے کتنا ہی گیا گزرا ہو اپنی غلطی پر تاویل نہیں کرتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ ہاں ایسا ہوگیا ہے۔ لیکن دوسرا وہ ہوتا ہے جو بجائے اس کے کہ غلطی مانے اس کی تاویل کرتا ہے۔ وہی پھنسے گا۔ سابقون الاولون تو بغیر حساب جنت میں چلے جائیں گے اور دوسرے اصحاب یمین کا پہلا گروہ ہے جس سے آسانی سے حساب لیا جائے گا۔ آسان حساب لینے کے بعد اسے وہاں بھیج دیا جائے گا جہاں پر میزان ہوگا۔ وہاں نامۂ اعمال تول تول کر فیصلہ ہو جائے گا، جنت میں لے جاؤ اس کو۔ لیکن یہ تیسرا گروہ جو ہے تو صاحب ایمان مگر تاویل کرنے والا چونکہ ایمان اس کے پاس ہے اس لیے اس کے گناہوں کی سزا حشر کے میدان میں ہی دی جائے گی۔ جہنم کی آگ تو ایمان کی وجہ سے اس پر بھی حرام ہے۔ تو حشر کا میدان جتنا دن بھی رہے گا، اب وہ ہزار

سال ہو، پچاس ہزار سال ہو، قرآن میں تو دونوں طرح کی باتیں آتی ہیں۔ اللہ کے یہاں ایک دن تمھارے حساب سے ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اللہ کے یہاں ایک دن پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے۔ بہر حال جتنے دن کا وہ حشر کا میدان ہوگا اتنے دن تک یہ لوگ حشر کے میدان میں روک لئے جائیں گے اور وہیں ان کو سزا دی جائے گی جس سزا کے وہ مستحق ہوں گے۔ لیکن جہنم میں نہیں بھیجے جائیں گے کیونکہ جہنم حرام ہے ایمان والوں کے لئے۔

اب انہیں سے ملتے جلتے ایک ہوتے ہیں جن کو منافق کہا جاتا ہے۔ منافق میں اور ان میں کیا فرق ہے؟ منافق بھی ایمان کے تقاضے پورے کرتا ہے اور کچھ اس کے خلاف کرتے ہیں۔ اس فرق کو سمجھ لیجئے کیونکہ اس پر دارومدار ہے ہم جیسے مسلمانوں کا۔ ہم لوگ نہ سابقون الاولون ہیں جو بے حساب جنت میں جانے والے ہیں اور نہ ان اصحاب یمین (داہنے ہاتھ والے) میں ہیں جن سے آسان حساب لیا جائے گا کیونکہ ہم سب تاویل کرنے والے لوگ ہیں اپنی برائی اور اپنے گناہ پر الا ماشاءاللہ۔ تو ہمارے لئے خطرہ تو یہی ہے۔ ہم شاید خوش قسمت ہوں، ان میں سے ہوں جو تیسری قسم ہے آسان حساب، داہنے ہاتھ والے۔ ان میں اور منافقین میں کیا فرق ہے؟ تو فرق یہ ہے کہ منافق جو بھی نافرمانی کرتا ہے وہ سوچی سمجھی بات ہوتی ہے۔ وہ طے کر لیتا ہے کہ اس کام میں ہمارا فائدہ ہے اور اس کام میں ہمارا نقصان ہے۔ لہذا جس کام میں نقصان ہے وہ ہم کو نہیں کرنا ہے۔ اور جو مومن ہوتا ہے، جس کا عمل بظاہر منافق جیسا ہوتا ہے اس کی سوچی سمجھی رائے نہیں ہوتی ہے کہ ہم کو یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا ہے۔ نفس کا غلبہ ہوتا ہے اور کر بیٹھتا ہے۔ سوچی سمجھی بات نہیں ہے۔ وہ ایمان کے دائرے میں داخل ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو شرمسار ہو جاتے ہیں اور ایک تاویل کرتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ نفس کا غلبہ ہو جاتا ہے، وقتی طور پر غلطی کر جاتے ہیں لیکن مستقل یہ نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ منافقین کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو یہی کرنا ہے۔ نماز ہم کو نہیں پڑھنا ہے، روزہ ہم کو نہیں رکھنا ہے، خیرات ہم کو نہیں کرنا ہے۔ یا جو بھی کام ہے کہ ہم کو نہیں کرنا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا اس دنیا میں گھاٹا ہے خواہ اسلام کا جو تقاضہ بھی ہو۔ آپ جانتے ہی ہیں اسلام ساری زندگی پر حاوی ہے، صرف نماز روزہ تک محدود نہیں ہے۔ تو جس شعبہ سے متعلق جو تقاضہ اسلام کا ہو اس تقاضہ کو ایک آدمی پورا نہیں کرتا ہے بلکہ وقتی طور پر اپنے نفس سے مغلوب ہو جاتا ہے تو وہ بہر حال ایمان کے دائرے میں ہے۔ اور ایک آدمی اس کو پورا نہیں کرتا ہے یہ سوچ سمجھ کر کہ اس کو پورا کرنے میں ہمارا دنیا کا گھاٹا ہے۔ تو ایسا شخص منافق ہے۔ اور منافق کفار اور مشرکین سے بھی زیادہ اللہ کے یہاں مبغوض ہے، اس لئے جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں رکھا جائے گا جہاں کفار اور مشرکین بھی نہیں رکھے جائیں گے۔ ان کے لئے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہے جیسے کفار اور مشرکین کے لئے۔ تو کم از کم اس بات کا تو لحاظ رکھیں کہ ہم منافقین کی صف میں نہ پہنچ جائیں۔ ہم سے بڑی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں، بڑا بڑا گناہ ہوتا ہے، بار بار ہوتا ہے لیکن وہ ہوا وقتی، نفس کے غلبہ کی وجہ سے نہ کہ سوچے سمجھے ہوئے فیصلے کے تحت۔ چنانچہ جو وقتی طور پر نفس کے غلبہ کی وجہ سے کام کر بیٹھتے ہیں۔ بڑا سے بڑا کام ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے رسولؐ کو کہ ان کے اموال میں سے صدقہ لیجئے اور قبول کیجئے اور ان کے لئے اللہ سے دعاء کیجئے، اور جو منافقین ہیں ان کے لئے صاف کہہ دیا کہ ان کے لئے دعائیں نہیں کرنا ہے آپؐ کو، کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ ان کو جہنم میں جانا ہی ہے۔ یہ فرق ہے۔ ہم کو اپنا جائزہ لینا چاہئے۔ کوشش تو ہو کہ ہمارا نفس مطمئنہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے ان خوش نصیب بندوں میں ہم داخل ہو جائیں۔ جو بغیر حساب جنت میں چلے جائیں گے۔ منتہائے نظر تو یہی ہونا چاہئے۔ مطمح نظر تو یہی ہونا چاہئے۔ نصب العین یہ ہے کہ حساب تو ہوگا۔ نفس مطمئنہ تو نہیں ہے، گناہ پر فوراً شرمسار ہوں گے اور پھر توبہ کریں گے، استغفار کریں گے اور جو توبہ اللہ نے طے کیا ہے، رسولؐ نے طے کیا ہے کفارہ کریں گے، ہوتے ہوتے یہ ہوسکتا ہے کہ نفس مطمئنہ ہو جائے اور نہیں تو اس مرتبہ پر تو رہیں گے کہ بھائی آسان حساب ہوگا۔ لیکن خدا

نخواستہ ہم وہاں پر بھی نہیں ہیں تو یہ نہ ہو کہ ہم منافقین میں داخل ہو جائیں۔ رہیں تو ہم مومنین میں ہی۔ گناہ ہوتا ہے ہم سے اور پھر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نہیں کرنا چاہئے اور ہم تائب ہو جاتے ہیں، گناہ پر ڈھیٹ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ہمارا سوچا سمجھا فیصلہ نہیں ہوتا ہے۔ اسلام کے احکام کو ٹالنے کی نیت نہیں ہوتی ہے بلکہ نیت تو یہی ہے کہ گناہ نہ ہو۔ یہ چیز ایسی ہے کہ جس پر ہم کو خاص طور پر اپنی نگاہ رکھنی چاہئے اور اپنی کے معنی یہ ہیں کہ اپنے لئے۔ دوسروں کے بارے میں تو ہم نہیں جانتے ہیں کہ اس کا کیا معاملہ ہے۔ دوسروں کی جو غلطی ہے اس پر تو ہم ٹوکیں گے، یہ ہمارا فرض ہے لیکن وہ منافقین کے زمرہ میں ہے کہ مومنین کے زمرہ میں یہ ہم نہیں جانتے۔ اللہ جانتا ہے۔ مگر اپنے بارے میں تو یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم کس زمرہ میں ہیں۔ آیا ہم ہیں انہیں گئے گزرے مسلمانوں کے زمرہ میں جن کی نجات ہوگی ہی، جن کے لئے جہنم حرام ہے یا خدانخواستہ ہم منافقین کے زمرہ میں آ گئے۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ بہت باریک سا فرق ہے دونوں میں، اس کو آسانی کے ساتھ سمجھنا بھی مشکل ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ انسان اس سرحد پر نہ رہے کیونکہ اس سرحد پر رہنے میں اس کا خطرہ موجود ہے کہ ہم بجائے اس کے کہ ایمان کے دائرے میں ہوں ہم منافقین کے زمرے میں چلے جائیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ:

'لوگوں میں سے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں کنارہ کھڑے ہو کر'۔ کنارے کھڑے ہونے میں اس کا بھی احتمال ہے کہ ہم ادھر ہوں یا ادھر۔ اس لئے اس زمرے میں جانے سے بچنا چاہئے یہ خطرناک ہے۔ کوشش یہ کیجئے کہ کم سے کم اس زمرہ میں ہوں کہ جیسے ہی گناہ ہو فوراً شرمندہ ہوں تاکہ ہم کم از کم ان میں داخل ہو جائیں جن سے حساب لیا جائے گا مگر آسان۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم کو اور ان کو جو مسلمان رہ کر جینا چاہتے ہیں، رہنا چاہتے ہیں اس دنیا میں، کم سے کم تو اصحاب یمین کے اس زمرہ میں رکھے جن سے آسان حساب لیا جائے گا۔

☆☆☆

تدبر آيات

قانون مکافات

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

اس کتاب کو محمد عبداللہ، مالک مکتبہ دین ودانش، ملکھنیا کنواں، پٹنہ نے مئی ۱۹۵۰ء
میں برقی پریس، بانکی پور، پٹنہ سے چھپوا کر شائع کیا۔

فہرست مضامین قانون مکافات

ہدیۂ تشکر

"گیسوئے اردو ابھی منت پزیر شانہ ہے"۔ یہ کب کی بات ہے؟ ہزار دو ہزار برس کی نہیں۔ سو دو سو سال کی نہیں۔ شاید صرف پچاس ساٹھ برس قبل کی بات ہے۔ اب گیسوئے اردو منت پزیر شانہ ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ زبان وادب سے ذوق رکھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں تک دامن اردو کے آب دار موتیوں سے خالی ہونے کا تعلق ہے کہا جاسکتا ہے کہ ابھی اسکے بہتیرے گوشے اگر یکسر خالی نہیں تو بھر پور بھی نہیں ہیں۔

انسان کے تمام شعوری اعمال وکردار کے عقلی و منطقی نتائج اور بنی نوع آدم کے تمام حرکات وسکنات کے فطری ولازمی ثمرات کیا ہیں؟ اس موضوع پر جہاں تک راقم سطور کی معمولات کا تعلق ہے اردو میں کوئی مستقل رسالہ موجود نہ تھا۔

شکر ہے کہ اسکے دامن دراز کا ایک گوشہ اس کتابچہ کی اشاعت سے پُر ہو رہا ہے۔ اور اسکی اولیت کا شرف مکتبہ دین ودانش کو حاصل ہو رہا ہے۔ یہ کتاب نہیں کتابچہ ہے۔ یہ اپنے موضوع بحث اور اسکے تمام گوشوں پر حاوی ہے یا نہیں، یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ قارعین ہی کے کرنے کا ہے۔

ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق بخشی پر ہزار ہزار شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ایک قلیل مدت، چھ سات سال کی مدت میں اپنے ایک بندۂ کم مایہ کو چار کتابوں کی اشاعت کے لائق بنایا۔ اور اسکی توفیق ارزانی کی۔

اس کتابچے کی اشاعت کے سلسلے میں ہم اپنے محترم دوست مولانا ضیاء الہدیٰ صاحب امیر جماعت اسلامی پٹنہ اور مخدوم محترم حضرت مولانا نصر اللہ خاں عزیز مدیر 'کوثر' و 'تسنیم' لاہور کے بھی تہہ دل سے شکر گذار ہیں کہ ہماری درخواست پر اول الذکر نے اپنی کتاب کی اشاعت کی اجازت دی اور ثانی الذکر نے اس پر مقدمہ تحریر فرما کر اسکی معنویت میں گراں قدر اضافہ فرمایا۔

محترمی ضیاء الہدیٰ صاحب نے اپنے طویل مقالے پر ذیلی عنوانات نہیں لگائے تھے، ہم اپنے رفیق محترم مولانا سید احمد صاحب قادری کے ممنون ہیں کہ رفیق قوم نے اپنی علمی مصروفیات کے باوجود میری فرمائش پر اس کتابچہ کے ذیلی عنوانات قائم کئے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اجر جزیل سے نوازے۔

آخر میں ہم اپنے قارعین سے گذارش کرتے ہیں کہ ہماری اس پیش کش میں جو بھی صوری خرابی نظر آوے اسے ہماری معذوری پر محمول فرما کر ہمیں مطلع فرمائیں۔

یہ نقش اول ہے، انشاء اللہ نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہوگا اور آپ کے ذوق کے شایان شان۔

وبيد الله التوفيق وله الحمد اولاً و آخراً

خادم
محمد تقی الدین نعمانی
مہتمم مکتبہ دین ودانش

پیش لفظ

یہ پیش نظر مقالہ جماعت اسلامی پٹنہ کے ماہانہ اجتماع کے لئے لکھا گیا تھا مگر اندازہ سے زیادہ طویل ہو جانے کی وجہ سے دو قسطوں میں پڑھا گیا۔ یوں تو یہ مضمون ایک کتاب کی وسعت چاہتا ہے مگر کتاب مرتب کرنے کی فرصت کہاں میسر ہے۔ یہ بھی جتنا کچھ لکھا گیا ہے اپنے مشاغل کے درمیان ہی لکھ سکا ہوں۔ کام کرتا رہا اور بیچ بیچ میں چند سطریں لکھ ڈالا۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ یہ کام اس نے مجھ سے لے لیا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا اسی وقت سے احیائے دین کا جذبہ مجھے بے چین رکھنے لگا۔ میں سوچتا تھا کہ کس طرح یہ بگڑی ہوئی امت پھر سے اپنے مقام کو پا سکے گی؟ مگر یہ سوچ کر افسردہ ہو جاتا تھا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ انبیاء علیھم السلام تو شخصاً مامور من اللہ ہوتے تھے۔ پھر ان کی تائید وحی و ملائکہ سے ہوتی تھی۔ غیب پر خدا خود انہیں مطلع کر دیتا تھا اور وہ سچی پیشین گوئی کے زور پر اپنی دعوت پیش کرتے تھے۔ میرے پاس کیا ہے جس کے بل پر میں بھی بے دھڑک بشارت و نذارت سے کام لوں۔

یہ سب کچھ میری ناقص معلومات اور مذہب کے بھونڈے تصور کا نتیجہ تھا۔ جوں جوں عمر گزرتی گئی خدا رہنمائی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ میرے اندر یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ قرآن کی ایسی تفسیر لکھی جائے جو بتائے کہ یہ خارجی دنیا سے بے جوڑ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بات خدا نے ذہن میں اتا دی کہ خدا جب وحدہ لاشریک ہے تو زندگی بھی ایک وحدت ہونی چاہئے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خدا نے عقائد و مراسم عبودیت سے آگے بڑھ کر معیشت و معاشرت، تمدن و تہذیب اور ملکی و بین الاقوامی مسائل سے متعلق اپنے قطعی احکام و قوانین کیوں دیئے؟ نیز خدا کی یہ کائنات ایک ہمساز اکائی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسکے اخلاقی قوانین اور طبعی قوانین ایک دوسرے کے مخالف یا ایک دوسرے سے بے نیاز ہوں۔ اور اگر ایسا ہے تو اخلاقی ذمہ داریاں انسان کے جسم اور طبعی وسائل پر کیوں ڈالی گئی ہیں؟ جن کو ادا کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں مادی اور طبعی قوانین ہی حرکت میں آتے ہیں۔ بالآخر قرآن نے دستگیری کی اور نہ صرف یہ بتایا کہ اخلاق اور طبیعت کے دو الگ الگ ایک دوسرے سے بے تعلق شعبے نہیں ہیں بلکہ اسکے مطالعہ سے یہ بات صاف صاف نکھر آئی کہ انسان کی معیشت اور معاشرت اور پوری مادی زندگی پر حکمراں مادی اور طبعی قوانین اخلاقی قوانین کے ساتھ بالکل متوازی اور بستہ و پیوستہ ہیں۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کے نکھر آنے کے بعد نبی کے جیسی قطعی بصیرت تو بہر حال حاصل نہیں ہو سکتی مگر ایک حکیم کی نظر ضرور پیدا ہو جاتی ہے جس کے بعد حالات کے جائزے میں غلطی کی وجہ سے معاملات کے تمام رخ پر حاوی نہ ہو سکنے کی بنا پر اندازے میں خامی کی وجہ سے اور دوسرے عوامل کی وجہ سے آنے والے نتائج کا پیشگی پورا پورا علم نہ ہو سکے یہ تو ظاہر ہے مگر بالکل تاریکی باقی نہیں رہ سکتی۔

میرے دل نے کہا کہ جو کچھ سرسری طور پر میں قرآن سے سیکھ سکا ہوں وہ دوسرے بھائیوں پر بھی واضح ہو جائے تا کہ جن کو تنبیہ حاصل ہو وہ خود کو سنواریں اور جن کو تنبیہ حاصل نہیں ہے ان کے سامنے بھی اس روشنی کو رکھیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس مختصر سے رسالے میں تاثیر عطا فرمائے اور مالک و مہتمم مکتبہ دین و دانش کی اس ہمت کا بہترین اجر عطا فرمائے جو انہوں نے اس کو شائع کرنے کے لئے دکھائی ہے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

خادم قوم

ضیاء الہدیٰ

مقدمہ

از جناب مولانا نصر اللہ خاں عزیز مدیر ''کوثر'' لاہور

انسانی زندگی کے محکم حقائق میں سے ایک بہت بڑی حقیقت 'قانون مکافات' ہے۔ اس قانون کے بغیر اس کائنات کا نظام خوش اسلوبی سے کبھی نہیں چل سکتا۔ یہ قانون انسانی فطرت کی عین پکار ہے۔ انفرادی طور پر ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ اس کے اچھے کام کی جزا ملے اور دوسرے شخص نے اس کے ساتھ جو زیادتی کی ہے اس کی سزا اسے بہر حال حاصل ہو۔ ان دو باتوں کے بغیر انسان کے دل کو نہ تسکین ہوتی ہے اور نہ اس کا جی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اجتماعی لحاظ سے ہر قوم کی تمنا یہ ہے کہ اس کی کوششوں کا اسے پھل ملے اور اگر کوئی قوم یا گروہ اس کی حریف ہے اور برسر ناحق ہے تو اس کو اس ظلم و فساد کی سزا دی جائے۔ ان ہی دو جذبوں کی بنا پر ایک فرد اور ایک اجتماع جدوجہد کرتا اور مظالم کا سدباب کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ طبعی طور پر اس قانون کو قبول کرنے کے باوجود انسان سب سے زیادہ اسی قانون سے غفلت برتتا ہے۔ اور انسانی تاریخ میں انسانی شقاوت کا جتنا سامان ہمیں ملتا ہے وہ اسی قانون مکافات سے بے نیازی اور بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ برائی کا انجام برا ہے یا کم از کم اسے برا ہونا چاہئے۔ مگر جب خود اس دریا کے دھارے میں کھڑے ہوتے ہیں تو نہیں سمجھتے کہ انجام کیا ہوگا؟ کنارے پر کھڑے ہو کر وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بہتے ہوئے دریا کے اندر کھڑے ہونے کا انجام کیا ہوگا۔ مگر جب خود اس میدان میں اترتے ہیں تو سب کچھ فراموش کر جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی میں جہاں اپنی ربوبیت رحمانی اور رحیمی کا یقین اپنے بندوں کو دلایا وہاں مالک یوم الدین کے الفاظ میں صراحت کے ساتھ فرمادیا کہ میں اعمال کی جزا اور سزا بھی دیتا ہوں اور اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ چنانچہ امم سابقہ کی تاریخ کے جو واقعات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں وہ اسی حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ حیات انسانی قانون مکافات کی تیغ بے زنہار کی زد میں ہے۔ کوئی فرد یا جماعت کبھی یہ محسوس نہ کرے کہ اسکے اعمال کا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ وہ یہاں بھی نکلے گا اور وہاں بھی نکلے گا۔

قرآن مجید میں اس قانون کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے متعدد اقوام کے آغاز و انجام کی حکایتیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض پر آسمان سے عذاب نازل ہوا۔ بعض کو زلزلے نے ہلاک کیا۔ بعض کو دریا کے پانی کے نرم و حقیر قطروں نے ٹھکانے لگایا۔ بعض کو زمین میں دھنسا دیا گیا۔ اور ان سب داستان کو بیان کر کے آخر میں ارشاد ہوا کہ وما ظلمهم الله ولكن كانوا انفسهم يظلمون۔

پھر یہ قانون مکافات صرف منکرین حق ہی پر نافذ نہیں ہوتا، بلکہ داعیان حق کو بھی ان کے اعمال کا بدلا دیا جاتا ہے اور ان کی جدوجہد کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔

آج جبکہ دعوت حق کی پکار پھر بلند ہوئی ہے اور خدا کے دین کو بندگان خدا تک پہنچا کر ان کی پیشانیوں کو معبود حقیقی کے سامنے جھکانے کا بلاوا دیا جارہا ہے تو ضروری ہے کہ اس قانون مکافات کی تفصیلات پر اچھی طرح غور کر لیا جائے۔ اور معلوم کر لیا جائے

کہ اس منزل میں کون کون سے سنگ میل آتے ہیں اور کیسے کیسے مرحلوں سے سابقہ پڑتا ہے۔

مولوی ضیاء الہدیٰ صاحب نے اس اہم ضرورت کو اس کتابچے میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اس نیک مقصد میں شریک ہو کر داخل حسنات ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان حوادث زمانہ اور اتفاقات روزگار نے جغرافی تو نہیں مگر سیاسی دیواریں ضرور کھڑی کر دی ہیں۔ مگر وحدت مقصد کے سامنے یہ دیواریں تو کیا شئے ہیں پہاڑوں کے سلسلے بھی حائل نہیں ہو سکتے اور میں یہ چند سطور بطور مقدمہ لکھ کر اس دعوت حق میں شریک ہوتا ہوں جو نہ شرقی ہے نہ غربی، بلکہ آفاقی ہے۔

اللہ تعالیٰ مصنف موصوف کی اس فکری اور قلمی کاوش کو شرف قبول عطا فرمائے۔

خاکسار

نصر اللہ خاں عزیز

مدیر کوثر، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

دنیاوی حکومتیں جرائم کی روک تھام سے کیوں عاجز ہیں؟

جس طرح بھلائی اور برائی کو ساری دنیا جانتی ہے اسی طرح سب یہ بھی جانتے ہیں کہ دونوں کا بدلہ ایک جیسا نہیں ہوتا، بلکہ نیکی کا بدلہ اچھا اور برائی کا بدلہ برا ہوتا ہے۔ مگر یہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود دیکھنے میں یہی آ رہا ہے کہ دنیا کی دنیا یا تو صرف برائیوں سے اپنا دامن بھر رہی ہے، یا نیکی اور بدی دونوں کو اندھا دھند اس طرح کمائے جاری ہے جیسے دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی جماعت یا کوئی ادارہ ایسا ہے جس نے نیکی اور بدی کے درمیان واضح خط امتیاز کھینچا ہو اور صرف نیکی کو اپنے لئے اختیار کرلیا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ آدمی جان بوجھ کر برے انجام کو پسند کرتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو آپ یہ بھی دیکھتے کہ کوئی آدمی کسی فائدے کے لئے آگ میں کود جانے سے، یا زہر کھا لینے سے اور دوسرے مجرمانہ کام کر گزرنے سے نہیں چوکتا۔ دنیا میں بسنے والوں کی بہت بڑی اکثریت ایسے کاموں کو آخر اسی لئے تو نہیں کرتی ہے کہ ان کاموں کی سزائیں فوراً بھگتنی پڑ جاتی ہیں۔ وہی اکثریت جسے ایسی کوئی امید نظر آتی ہے کہ اپنی کی ہوئی برائیوں کی سزا سے بچ جانا ممکن ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ضروری احتیاط کے ساتھ ان برائیوں میں بے باکانہ مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں رشوت لینے اور دینے کا بازار خوب گرم رہتا ہے۔ جھوٹ بولنا، بدکاری کرنا اور دنیا بھر کے گندے کاموں میں پڑنا کوئی عیب باقی نہیں رہتا۔ پوری کی پوری سوسائٹی برائیوں کا اس طرح شکار ہو جاتی ہے جس طرح وبا کے دنوں میں آبادی بیماریوں کا شکار ہوا کرتی ہے۔

برے کاموں سے بچ نکلنے کا یہ تصور ملکی اور سماجی قوانین کے مقابلے میں اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ان قوانین کو جاری کرنے والے ہمارے ہی جیسے انسان ہوتے ہیں۔ اس لئے کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے مجبور اور اپنے جذبات اور خواہشات سے متاثر ہوتے ہیں، اور کچھ اس وجہ سے کہ اگر وہ بذات خود نیک ہوں بھی تو ہر جگہ حاضر و ناظر (Omnipresent) اور بے پناہ قوت اقتدار کے مالک (Omnipotent) نہیں ہو سکتے۔ اس لئے جب قانون کی حرمت دلوں سے نکل جائے اور اس کی خلاف ورزی کا رجحان عام ہو جائے تو وہ اپنے قانون کے نفاذ اور قوت کے استعمال سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ یہ وہ بشری کمزوری ہے جو کسی طرح انسان سے دور نہیں ہو سکتی، اور جس کے ہوتے ہوئے کوئی اسٹیٹ کہیں بھی اور کبھی بھی جرائم پر قابو پا ہی نہیں سکتا۔ ہر مجرم کے جرم سے پورا پورا باخبر ہونا، ہر مجرم اور تمام مجرموں کو ٹھیک ٹھیک جرم کے مطابق سزا دینا، اور اس سزا کے دینے کے لئے قوت کے حصول اور اس کے استعمال میں دوسروں سے بے نیاز ہونا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ باتیں تو صرف خدا کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی لئے خدا کے تصور سے خالی یعنی لادین ریاست خواہ امریکہ کی ہو یا انگلستان کی، روس کی ہو یا ترکستان کی، جاپان کی ہو یا افغانستان کی، سب کی سب اس بارے میں سراسر ناکام ہیں۔ اسی لئے ہر جگہ انسانیت یکساں دکھی ہے۔ ہر جگہ زندگی سے چین اور سکون ایک ہی طرح چھن گیا ہے۔

ایک شبہہ اور اس کا جواب

اسی موقع پر یہ شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایسی حالت صرف لامذہب لوگوں کی ہی تو نہیں ہے بلکہ مذہبی لوگوں کی زندگی بھی اسی کی آئینہ دار ہے۔ یہ شبہہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر کسی فیصلہ سے پہلے ان اسباب کا کھوج لگا لینا ضروری ہے جو مذہب کے ان دعویداروں کی زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ پھر اگر یہ اسباب مذہب ہی کی بنیاد یا اس کے اجزائے ترکیبی ہوں تو بلاشبہہ مذہب بھی اسی طرح

غلط ہے جس طرح لا مذہبیت ۔ اور اگر حقیقت یہ نہیں ہے تو پوری فراخ دلی کے ساتھ سمجھنا چاہیئے کہ قصور مذہب کا نہیں بلکہ مذہب کے غلط تصور، غلط استعمال یا مذہب سے باہر دوسرے بے جوڑ عوامل کا ہے ۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ کیا یہاں بھی ویسی ہی بنیادی خامیاں، کوتاہیاں اور خرابیاں ہیں جیسی لادین سیاست میں ہیں؟ کیا یہاں بھی خدا کے بنائے ہوئے قوانین میں کوئی نقص، کوئی بے ربطی، کسی قسم کا فتور (Loop Holes) ہے جس سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہو؟ کم از کم اسلام میں ایسی کوئی چیز نہیں مل سکتی ۔ اور اگر کسی مذہب میں ہے تو وہ یقیناً مذہب کے نام پر انسان کا اپنا گھڑا ہوا ضابطہ ہے ۔ پھر کیا خدا کی حکومت بھی دوسروں کے بل بوتے پر قائم ہے؟ ہرگز نہیں، وہ جب چاہے کائنات کے پورے کارخانے کو توڑ پھوڑ دے، جب چاہے اس کے کسی گوشے کو مٹا دے، یا اس میں حسب ارادہ تغیر کر دے ۔ تمام انسان فرداً فرداً بھی، اور بحیثیت مجموعی کل کے کل بھی، اس کے قبضے میں ہیں ۔ اگر سب کے سب مل کر بغاوت بھی کر دیں تو اس کے اقتدار میں کچھ بھی کمی نہ آوے، اور وہ سبھوں کے ناپاک وجود سے اپنی زمین کو پاک کر دے تو اس کی سلطنت کی رونق میں کچھ فرق نہ آئے ۔ ایسے قانون اور ایسی حاکمیت کا علم ہو جانے کے بعد کون انسان ہے کہ مجال جرم رکھتا ہے؟ تاہم انسان گناہ میں اس لئے مبتلا ہو جاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو برے اعمال کی سزا فوراً نہیں دیتا ۔ اس لئے کہ انسان کو اختیارات نیابت (Power of Vicegerency) دے کر اس نے اس کا پورا پورا موقع دے رکھا ہے کہ یہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی صلاحیتوں کو نشو ونما دے سکے اور خود پس پردہ ہو کر اس کے لئے موقع فراہم کر دیا ہے کہ یہ اپنے اندر عزم و وقار کو راسخ کر سکے کیونکہ عزم و وقار کے دل میں راسخ ہوئے بغیر اور انتظامی صلاحیتوں کے اجاگر ہوئے بغیر نعیم اور ملک کبیر کا کامیاب وارث نہیں ہو سکتا، جو موت کے بعد کی دائمی زندگی میں اس کے چارج میں دیا جانے والا ہے ۔ دراصل یہ نیابت کا زمانہ انسان پر، پرتو الوہیت کا دور ہے جو اس وقت سے شروع ہوا جب اس نے اپنے خدا کی امانت داری کا اقرار کیا تھا ۔ اور اس وقت ختم ہوگا جب وہ دوبارہ اس کے حضور میں حاضر کیا جائے گا اور اس کی امانت داری کا جائزہ لیا جائے گا ۔

جزا و سزا کا قانون کلّی

اب اگر اس میں اہلیت، صلاحیت اور امانت ثابت ہوگئی تو ظاہر ہے کہ اس کا صلہ یہی ہونا چاہیئے کہ الوہیت کے اس پرتو کی اس پر تکمیل کر دی جائے اور نیابت کے بعد خود مختاری اسے عطا کر دی جائے ۔ اور واقعتاً یہی انعام اسے دیا بھی جائے گا، جب کہ ساری کائنات کے بے نیاز بادشاہ کی بارگاہ میں مقصد صدق (Seat of Truth) اسے حاصل ہو جائے گا ۔ اور جب اس میں اہلیت، صلاحیت اور امانت ثابت نہ ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو جیسی زندگی کے لئے تیار کیا ہو ویسی ہی زندگی اس پر مسلط کر دی جائے ۔ اس موقع پر اللہ کے اس کرم کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ انسان جب نعمت کا حق ادا کر کے اس کی ذمہ داریوں اور لذتوں کی سہار کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تو اللہ اس پر مزید انعام فرماتا ہے اور نعمت کی تکمیل کر دیتا ہے ۔ مگر جو انسان خود پر ظلم کر کے بری زندگی کا خوگر ہو جاتا ہے تو جیسی زندگی وہ اپنے عمل کی زبان سے مانگتا ہے بس ویسی ہی زندگی خدا اسے دیتا ہے ۔ اس سے زیادہ بری زندگی اس پر مسلط نہیں کرتا ۔ اس سلسلے میں خدا کا بنیادی قانون ایک یہ ہے کہ نیک عمل کا بدلہ اسی کے مثل دس گنا سے سات سو گنا تک، بلکہ اس سے زیادہ بھی ہے، اور برے عمل کا بدلہ اسی کے مثل اور اسی کے برابر ہے ۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جس کے مطابق انسان کے اعمال کے اثرات دنیا میں بھی مترتب ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ۔ اسی کی بنیاد پر قوموں کا عروج و زوال ہوتا ہے ۔ اور اسی کی بنیاد پر جنت و دوزخ ملنے والی ہے ۔ پھر اس عروج و زوال کے مختلف مراحل اور جنت و دوزخ کے مختلف منازل، عروج و زوال کی تفصیلی کیفیتیں اور جنت و دوزخ کی تفصیلی حالتیں، سب کی سب ایسی ہی ہیں کہ انسان

کے کردار واعمال سے انہیں بدرجۂ اتم مناسبت ہے۔اوران اعمال اوران کے فطری اثرات پر گہری نظر رکھنے والا آدمی آسانی سے ان دونوں کے درمیان تلازم کو معلوم کرسکتا ہے۔انسانی فطرت کا فیصلہ یہی ہے کہ جو امن کا طالب ہو اسے امن نصیب ہو، جو توڑ پھوڑ اور انتشار میں کوشاں ہو اسے انتشار ہی کے حوالہ کر دیا جائے۔جو دوسروں کو سکھ پہنچائے اسے سکھ ملنا چاہئے، جو دوسروں کا سکون چھینے اس کا سکون سلب ہو جانا چاہئے۔جو صلاحیت بہم پہنچائے اسے انتظام سونپ کر سرفراز کیا جائے۔جو صلاحیت کھودے اسے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے۔جو امانت دار ثابت ہو اسے انعام وترقی دی جائے اور جو خیانت کرے اسے رسوا کیا جائے۔

پس ایک مومن جب اللہ کو مرکز اطاعت تسلیم کر لیتا ہے تو اس کا اپنا پورا نظام نفسی انتشار سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس طرح اپنی تمام صلاحیتوں کو یکسوئی کے ساتھ جب وہ اللہ کے نظام اطاعت کی پابندی میں لگا دیتا تو اس کے ماحول کا پورا نظام زندگی امن و سلامتی سے بھر پور، صحیح رخ پر پوری ہمواری کے ساتھ چلنے لگتا ہے، جس میں لوگوں کے تمام فطری تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں اور ان میں تصادم بھی رونما نہیں ہوتا۔تمام صلاحیتیں بروئے کار بھی آتی ہیں اور ان میں ٹیڑھ بھی واقع نہیں ہوتی۔بخلاف اس کے جو خدا سے انکار کرتا ہے وہ یا تو بے دین (Anarchist) ہو جاتا ہے۔اور اس طرح ضبط ونظم کے فقدان کے بعد اس کا اپنا نفس خود اپنی متضاد خواہشوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے، جن کے تصادم سے وہ خود فساد عظیم کا شکار اور بالآخر خوگر ہو جاتا ہے اور اس کے باہر کی دنیا میں جنگل کا قانون چل پڑتا ہے، اور پورا ماحول طمانیت کو ترس جاتا ہے۔یا پھر منکر خدا تقاضائے تمدن سے مغلوب ہو کر اور اپنے اندر کے جذبۂ اطاعت سے مجبور ہو کر ایک خدا کے سوا دوسروں سے بھی ہدایت اور قانون لینے لگتا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود اپنے نفس میں بھی انتشار برپا ہو جاتا ہے اور ان مختلف فرماں رواؤں یا خود ان مختلف فرماں برداروں کے اغراض آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں اور بیرونی دنیا فتنہ وفساد سے بھر جاتی ہے۔

اخروی عذاب و ثواب دنیوی اعمال و کردار کا آئینہ ہیں

ظاہر ہے کہ ان مختلف طرز ہائے فکر وعمل پر زندگی گزارنے والوں کی صلاحیتیں مختلف ڈھب پر پروان چڑھیں گی۔جس کے بعد ان کے نفوس لازماً مختلف نظامہائے زندگی ہی میں فٹ ہو سکتے ہیں۔غیر مومن خواہ وہ منکر خدا ہو یا مشرک اپنے نفس کے اندر اور اپنے ماحول میں انتشار پیدا کرنے اور انتشار ہی میں اپنے لئے جگہ بنانے کا خوگر ہو جاتا ہے۔اس لئے وہ جہاں بھی جائے گا ایسا ہی کچھ کرے گا۔اور انتشار پیدا کرنے والا سب سے زبردست عنصر آگ ہے۔اس لئے کفر کی بنیادی سزا آگ ہی مقرر کی گئی ہے۔پھر یہ آگ ہر فرد اور گروہ کے تفصیلی اعمال کے مطابق اپنی تفصیلی کیفیتوں میں بہت متنوع ہوگی۔کسی کو آگ کا جنگل ملے گا، کسی کو آگ کی کھائی۔کسی کو آگ کا پہاڑ ملے گا، کسی کو آگ کی وادی۔کسی کو آگ کا دریا ملے گا اور کسی کو آگ کا بیابان۔الغرض آگ بہر حال اس کا اوڑھنا بھی ہوگی اور بچھونا بھی۔

پھر کفر کی بنیادی غلطی کی بناء پر اپنی زندگی میں انتشار، طغیانی اور ظلم کا جو لامتناہی سلسلہ اس نے جاری کیا، جو افراد سے سوسائٹی تک اور سوسائٹی سے عام نسل انسانی تک، پھر انسان سے گذر کر بے حد و شمار کائنات تک پھیلا اور پھیل کر المضاعف (Multiply) ہوتا رہا، اس کا بدلہ یہی ہونا چاہئے کہ عذاب کے لامتناہی چکر میں اسے مبتلا کر دیا جائے۔پھر اس کا ظلم دنیا میں جس جس تک منتقل ہوا، ہر نئے شکار کو تازہ اذیت دیتا رہا، اس کا بدلہ یہ ہوگا کہ وہ دوزخ کے عذاب کا خوگر نہ ہونے پائے گا۔اس لئے اس کی کھال بار بار بھسم ہو ہو کر گرے گی اور ہر بار نئی کھال اس کے جسم پر پیدا کی جائے گی تا کہ ہر بار عذاب کا تازہ مزہ چکھے۔دنیا میں ہر ظالم معاشرہ اور ہر کافرانہ زندگی کی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ اس کے اندر افراد کی زندگی گھٹی گھٹی سی رہتی ہے۔مظلوم طبقہ زندگی

اور موت کے درمیان معلق رہتا ہے۔ نہ وہ جیتا ہے اور نہ وہ مرتا ہے۔ اس کی معاشی حالت اتنی پتلی ہوتی ہے کہ اسے نہ مرفع الحالی نصیب ہوتی ہے اور نہ اس کی ضروریات ہی رفع ہوتی ہیں، اور ایسے ظالمانہ اور کافرانہ نظام کے مسلط ہونے اور مسلط رہنے کی ذمہ داری تمام تر ان افراد اور جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جو یا تو خود ہی اس نظام کے چلانے والے ہوں، یا اس کے کل پرزے بن کر اس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہوں، یا اسے یونہی گوارا کر رہے ہوں، اور اس کی جگہ صالح نظام زندگی کو برپا کرنے کی نہ جدوجہد کر رہے ہوں اور نہ ایسی جدوجہد کے لئے اپنے اندر جذبۂ تعاون رکھتے ہوں۔ ایسے تمام لوگوں کے لئے وہ آتشیں ماحول منتظر ہے جو نہ تو انہیں سالم رہنے دے گا اور نہ انہیں اپنی گرفت سے چھوٹنے دے گا۔ جہاں انہیں زیست پر مجبور کرنے کے لئے ایسی غذا ان کے اندر اتاری جائے گی جو نہ تو ان کے بدن کو لگے گی اور نہ انہیں بھوک سے بے نیاز کرے گی۔ پھر جس طرح دنیا میں ظالم لوگ اور ان کا برپا کیا ہوا ماحول مظلوموں کی فریاد کے لئے اندھا بہرا ہے، اسی طرح اس آتشیں جیل خانہ کے داروغہ اور سنتری ان ظالموں کی فریاد کے مقابلہ میں بے رحم ہونگے۔ اور ان کے نالہ وبکا پر وہ کامل بے نیازی کے ساتھ اس دارالفاسقین کی حقیقت اس طرح بیان کریں گے کہ تم نالہ وشیون کرو یا صبر، تمہارے لئے دونوں برابر ہیں۔ یہاں تو تمہیں اپنے کئے کا بدلہ پانا ہے۔ اس طرح انہیں اس حالت میں دائماً پڑے رہنے کا یقین ہو جائے گا اور یاس وقنوط اس عذاب کو جس میں یہ ظالم گھرے ہوں گے سہ آتشہ کر دے گا۔ (اے غفلت میں زندگی گزارنے والو! اپنے چاروں طرف دیکھو تو سہی، کہیں اس عذاب کا ہلکا سا پرتو تمہیں آج ہی گھیرے ہوئے تو نہیں ہے)

اس کے مقابلے میں ایک مومن اپنے آپ کو اپنے خالق کی ہمہ وقتی غلامی میں دے کر اپنے نفس کو بے شمار اطاعتوں سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو غلط رہبری سے بچا لیتا ہے اور اس طرح اس کے اعمال اس مصلحت کل سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں جس پر اس کارخانۂ عالم کی بنا ہے۔ پھر ایمان واطاعت کی اس بنیادی راستی کی بنا پر جو سکون وثبات، جو عدل وانضباط اور جو رحمت ورافت کا سلسلہ اس سے شروع ہوتا ہے اور شروع ہو کر افراد تک اور پھر افراد سے سوسائٹی تک، اور سوسائٹی سے عام نسل انسانی تک، اور بالآخر کائنات کے ذرہ ذرہ تک ممتد ہوتا ہے، اس کا بدلہ اس کے لئے ابدی راحت کا گہوارہ ہے۔ سرسبز وشاداب جو نہر بھری جنت کہلاتا ہے، جو ظاہر ہے کہ اس کی تربیت یافتہ خودی کے لئے، جو افراط وتفریط کے بیچ بیچ عدل واستقامت کے نصاب کے ذریعہ پروان چڑھی ہے، بہترین اور موزوں جائے قرار ہے۔

پل صراط کی ایک لطیف تعبیر

اس جنت تک پہنچنے کے لئے ایک پل کو عبور کرنا ناگزیر ہے، جسے عرف عام میں پل صراط کہا جاتا ہے۔ یہ بڑی کٹھن راہ ہے۔ مشہور ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور دوزخ پر سے گزرتی ہے۔ اس پر کوئی حیرت نہ ہونی چاہئے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ مشاہدہ کریں گے کہ ایک مومن جو رضائے الٰہی کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا ہے، وہ اپنے رب کے بتائے ہوئے جس راستے پر گامزن ہے، وہ اس پل صراط سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ آپ اسلامی شریعت کے مجموعہ اوامر ونواہی کو غور سے دیکھ جایئے تو آپ محسوس کریں گے اس کے اوامر کا مجموعہ ایک ایسا محکم راستہ ہے جو انسانی فطرت اور اس کے تقاضوں کے افراط وتفریط کے درمیان اقلیدس کے ایک خط کی طرح واقع ہے، جس پر پیش قدمی کر کے انسان اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اس کے نواہی کا مجموعہ اس کے توازن کو برقرار رکھنے والا ہے جو اس باریک خط مستقیم پر اس کے گامزن ہونے کے لئے ضروری ہے، جس کے بغیر انسان ادھر ادھر ڈگمگا کر گمراہی کی گھاٹی میں گرنے سے بچ نہیں سکتا۔ چنانچہ الٰہی حدود کی پابندی وہ مشق ہے جو آخرت کے اس پل صراط سے صحیح سلامت گزر جانے کے لئے ضروری ہے۔ جس نے یہ مشق بہم نہیں پہنچائی اور اپنے سبیل رب سے بھٹک کر افراط وتفریط کی

طرف مائل ہوگیا وہ یقیناً اس پل صراط سے دوزخ کی کھڈ میں گرنے لگا۔ پس اے پل صراط کا علم رکھنے والو! اپنے قدم پر اسی دنیا میں نگاہ رکھو کہ وہ کہاں پڑ رہا ہے، کیونکہ جو قدم حدود الٰہی کے اندر ہے وہ پل صراط پر جما ہوا ہے اور جو اس سے باہر پڑتا ہے وہ اس پل صراط سے تمہیں گرا رہا ہے۔ پھر جب تم اپنی لغزش کی وجہ سے نیچے گرنے لگتے ہو تو تمہارے رب کی رحمت تمہاری دستگیری کے لئے تمہاری توبہ کی منتظر وہیں موجود ہوتی ہے۔ جب تم توبہ کر کے حدود الٰہی کے اندر خود کو لوٹا لاتے ہو تو تمہارا رب تمہیں پھر سے پل صراط پر جما دیتا ہے۔

ہاں، اے پل صراط سے بخیر و خوبی گزر جانے کی طمع رکھنے والو! حدود الٰہی کی پابندی میں رضائے الٰہی کی طرف تیز تیز قدم بڑھاؤ۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ باریک سیدھا راستہ اس طرح طے کرنے کے لئے کہ توازن قائم رہے تیز رفتاری ضروری ہے۔ ورنہ سست روی سے کام لینے والا ادھر ادھر مائل ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

پل صراط سے گزرنا کیوں مشکل ھے ؟

اے پل صراط کی حقیقت سے بے خبرو! تمہیں کچھ معلوم ہے کہ یہ پل صراط ایسا کٹھن کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ انسانوں کو جنت میں لے جاتا ہے۔ اگر تم جنت کی حقیقت جانتے ہوتے تو تمہیں پل صراط پر تعجب نہ ہوتا۔ تم نے تو جنت کا مطلب ایک باغ سمجھ رکھا ہے۔ دیواروں سے گھرا ہوا ویسا ہی باغ جیسا تمہارے عیاش رئیسوں کا ہوتا ہے، جو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ ہوس نفس کے لئے تسکین حاصل کرنے کا ایک محفوظ مقام ہوتا ہے اور بس۔ اگر جنت بھی ایسی ہی کچھ ہے تو بلا شبہ پل صراط اور اس کی کٹھنائیاں سراسر بے جوڑ ہیں۔ اور یہ سارا نظام ہست و بود اور اس کے اندر کار فرما ربط، نظم اور حکمت سب مہملات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر یہ تمہاری بھول ہے جس میں تمہارے ازلی دشمن نے تمہیں مبتلا کر رکھا ہے تاکہ تم ضروری تیاری سے غافل رہو اور جنت کی اہلیت پیدا نہ کر کے ہمیشہ کے لئے اس سے محروم رہ جاؤ۔ سنو! جنت باغ ہے، مگر اس معنی میں نہیں کہ درختوں اور نہروں بھرا ایک احاطہ ہے بلکہ اس معنی میں کہ اللہ کے نظام اطاعت (دین) کی پابندی کرتے ہوئے تم نے اسے لگایا ہے۔ وہ کوئی خودرو جنگل یا بے آب و گیاہ بیابان نہیں ہے جہاں یا تو کوئی نظم ہی نہ ہو یا پھر تمدن کا فقدان ہو، بخلاف اس کے وہ آراستہ و پیراستہ جنت ہے۔ وسعت میں آسمان و زمین جیسی تمدن کا گہوارہ۔ اس کی زندگی میں لطافت و نظم ہے اور فی الجملہ وہ نعیم اور ملک کبیر ہے۔ جہاں ایک طرف انسان کے اختیارات لامحدود ہوں گے، اور دوسری طرف اس کی خواہش نفس پر کوئی پابندی بھی نہ ہوگی، اور پھر بھی وہ امن وسکون عدل واحسان اور طہارت و پاکیزگی کا مسکن ہوگی۔

اب سوچو تو سہی، کہ موجودہ آسمان و زمین کے نظام کا جب یہ حال ہے کہ ایک اللہ کے سوا اگر کسی دوسرے کا غیر مسئول اقتدار یہاں چلے تو فتنہ و فساد برپا ہو جائے تو اس جنت کا امن وسکون انسان کی مطلق العنان فرماں روائی میں کیسے باقی رہے گا۔ مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ جنت ابدالآباد تک باقی رہے گی۔ اور وہ ہمیشہ امن و راحت کا گہوارہ ہی رہے گی، اور وہاں کا اقتدار بھی لازوال ہو گا۔ اسی لئے اللہ نے تمہاری تربیت (Training) کے لئے وہ نصاب (Course) مقرر کر دیا ہے جو تمہیں ایسا بنا دے کہ تمہارا مزاج اللہ کے مزاج کے مطابق ہو جائے۔ تمہارا اخلاق اللہ کا اخلاق ہو جائے اور فی الجملہ تمہارا حال ایسا ہو جائے کہ تم دیکھو تو اللہ کی نظر سے، بولو تو اللہ کی زبان سے اور کام کرو تو اللہ کے ہاتھ سے، تاکہ جنت کا انتظام جب تمہیں سونپا جائے تو تم اسے اسی طرح کامیابی سے چلا سکو جس طرح خدا چلاتا ہے۔ یہی پرتو الوہیت کی تکمیل ہے۔ یہی مالک مقتدر کے نزدیک مقصد صدق کا حصول ہے اور اسی کا نام لقائے الٰہی ہے۔ ذرا تم اپنے رنگ ڈھنگ کو دیکھو جس کو تم اپنی دنیا کے اندر چلا رہے ہو۔ ذرا اس رویہ کو دیکھو جو تم اپنے نفس اور اس کی صلاحیتوں اور قوتوں کے ساتھ اور اپنے باہر کی دوسری مخلوقات کے ساتھ برت رہے ہو اور اندازہ لگاؤ کہ تمہارے اندر کیسے اوصاف

پرورش پا رہے ہیں۔تم اپنی دن رات کی اس مشق اور تمرین کے ذریعے اپنے آپ کو کیسا بنا رہے ہو؟ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ پل صراط سے تمہارے گزر جانے کی توقع کتنی ہے اور لڑکھڑا کر جہنم میں لڑھک جانے کا امکان کتنا؟

یہ تو تھا سرسری جائزہ اللہ کے قانون مکافات کے اس باب کا جو انسان کے معاد یعنی زندگی بعد موت سے متعلق ہے۔اب میں اس قانون کے اس باب کو چھیڑوں گا جو اس کی معاشرتی زندگی کی دنیا پر حکمراں ہے۔

دوسرا باب

انسان کی خلافت اور اس کے بنیادی انتظامات

یہ تو معلوم ہی ہے کہ اللہ نے انسان کو اس دنیا میں خلیفہ بنا کر بھیجا ہے،اس لئے انتظام دنیا چلانے کی تمام ضروری استعداد پوری کائنات پر اقتدار، اچھے اور برے کی تمیز، ان میں سے ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے کی آزادی، اور جیسا کچھ یہ چاہے ارادہ کرنے کی طاقت اسے دی گئی ہے۔اور اسی لئے اللہ خود غیب کے پردے میں چھپ گیا ہے تاکہ نظروں کے سامنے اور اس کے خود موجود ہونے کی وجہ سے یہ انسانی خلافت بے معنی نہ ہو جائے۔ان باتوں کے بعد اس کا امکان بالکل ظاہر تھا کہ یہ انسان غفلت میں پڑ کر کہیں من مانی نہ کرنے لگے اور انتظام دنیا کو بگاڑ کر اس حد تک پہنچا دے کہ یہ دنیا ہی سرے سے برباد ہو جائے۔اس لئے اللہ نے ایک طرف تو ہر ہر انسان کو اس خلافت میں برابر کا حصہ دار بنا دیا تاکہ انہیں ایک دوسرے کے ذریعہ بے اعتدالی کی ایک خاص حد سے آگے بڑھنے سے روکا جائے، اور دوسری طرف اس دنیا کا مزاج کچھ ایسا بنایا کہ یہ انسان اگر اپنے اختیارات کا غلط مصرف لے تو اس حد تک نہ بڑھ سکے کہ اس دنیا ہی کو تباہ کر ڈالے۔اس کے لئے کچھ لگے بندھے ضابطے مقرر کر دئے جن کی یہ دنیا بہر حال پابند ہے۔ان تدبیروں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ نظروں سے خدا کے اوجھل ہو رہنے کی معنویت باقی رہتی ہے۔کیونکہ اگر وہ ہر حال میں اپنے اختیارات خصوصی (VETO) کو استعمال کرنے کا طریقہ جاری کرتا تو اس کا نظروں سے پوشیدہ ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جاتا۔اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اسی وجہ سے کائنات پر قابو حاصل ہے۔دنیا کے اس مزاج کو ہم اس کی فطرت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان لگے بندھے ضابطوں کو ہم طبیعی قوانین کہتے ہیں۔اس طرح دنیا کو اس کی عمر طبیعی تک باقی رکھنے کا انتظام کرنے کے بعد خود انسانوں کو اس پر قیامت تک آباد رکھنے کے لئے اس نے انہیں یہاں قسط وار بھیجنے کا دستور جاری کیا تاکہ اگر کسی زمانے کے لوگوں کی اپنی بے راہ روی ان کی پوری آبادی کے خاتمہ کا موجب بن جائے تو پھر دوسری نسل اس دنیا کو آباد کر سکے۔

ھدایت وحی

یہ تھے وہ بنیادی انتظامات جو اس نے اس دنیا کو خلیفہ کے تصرف میں دینے کے لئے کئے۔اب اپنے اقتدار اعلیٰ (ربوبیت) کا تمام انسانوں سے اقرار لینے کے بعد انہیں یہ ہدایت دے کر رخصت کیا کہ جب میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو اس کے مطابق اپنے رویہ کو درست (Adjust) کر لینا۔ایسا کرو گے تو تم خوف اور رنج سے بچے رہو گے۔کیوں کہ میری ہدایتوں کی پابندی کی وجہ سے غلط بینی اور غلط کاری سے اور ان غلطیوں کے نقصانات سے بچتے رہو گے، اور وقت اور محنت کے زیاں اور اس زیاں سے پیدا ہونے والے رنج و ملال کی کوئی وجہ ہی باقی نہ رہے گی۔اس کے بعد انہیں خلافت سے سرفراز کر کے یہاں بھیجنے کا سلسلہ قائم کر دیا۔اپنے سب سے پہلے خلیفہ کو عملی تربیت بھی دی اور نبی بھی بنا کر بھیجا، تاکہ وہ اپنے بعد آنے والوں کی تربیت بھی کریں اور خدائی ہدایت بھی ان تک پہنچا دیں۔مگر اس انسان اول کے بعد اس کی اولاد غافل ہوتی گئی۔یہاں تک کہ خدا کی راہ سے بیگانہ ہو گئی، اور خوف اور حزن کے راستوں پر سرپٹ دوڑنے لگی، اور تباہی کے چکر میں پھنس گئی تو اللہ نے ایک نبی کو ان میں پیدا کیا تاکہ وہ

انہیں بھولی ہوئی حقیقت یاد دلائے ،اوران کی فطری راہ یعنی خدائی ہدایت کی پابندی کی طرف بلائے ۔ان میں سے کچھ لوگ سنبھل گئے اور بہت سے انکاری ہو گئے ۔تو انکار کرنے والے اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے مٹ گئے ۔ اور سنبھل جانے والے دنیا کے وارث بنے ۔پھر ایسا ہی معاملہ ان کی نسل کے ساتھ ہوا۔الغرض انسانی تاریخ قوموں کے اسی اتار چڑھاؤ کا نتیجہ ہے۔ جب قوموں نے الٰہی قانون کی پیروی کی تو ترقی کرنے لگیں اور جب انہوں نے اس کی پیروی چھوڑ دی تو گرتی گئیں ،اور موت کی نیند سو گئیں ۔

قانون الٰھی کی پیروی میں امن اور ترقی کیوں منحصر ھے؟

یہ الٰہی ضابطے کی پابندی ہی میں امن وترقی کا منحصر ہونا اوراس کے بغیر زندگی گزارنے میں تباہی سے کسی طرح بچ نہ سکنا اس وجہ سے ہے کہ پوری دنیا اور ہر ہر چیز کا بنانے والا اکیلا اللہ ہے ۔اس لئے اس کو ذرہ ذرہ کا پورا علم ہے جو دوسرے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے ۔اس لئے اس کی ہدایتوں میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے ۔اوراس کی ہدایت سے جو کچھ اور جتنا کچھ بھی مختلف ہے وہ یقیناً حقیقت سے مختلف ہے،اس لئے غلط ہے اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔پھر حقیقت کو چھوڑ کر غلط رہبری قبول کرنے کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جو بھلائی تمہیں پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے، یعنی اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنے کی وجہ سے ہے، اور جو برائی تمہیں لاحق ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے ہے، یعنی اس کے اندھے مطالبوں کی پیروی کرنے کی وجہ سے ہے ۔ یہی بات ہے جو اللہ نے یوں بیان فرمائی ہے کہ ”میں نے انسان اور جن کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت (اطاعت) کریں“ ۔اس بات میں انسان کی صحیح فطرت کو واضح کیا گیا ہے کہ اس کا پھلنا پھولنا صرف خدا کی عبادت (اطاعت) پر موقوف ہے ۔یہ جملہ دو جملوں کے مقابلے میں ہے ۔ایک تو یہ، جیسے کہا جائے کہ انسان صالح غذا کھانے کے لئے بنایا گیا ہے اور دوسرے یہ، جیسے کہا جائے کہ انسان کھانے پینے اور عیش کے لئے بنایا گیا ہے ۔ پہلا جملہ زندگی کی نہج کو متعین کرتا ہے اور دوسرا جملہ اس کے مقصد کو ۔ یہ دوسری حیثیت میرے موضوع سے خارج ہے، اس لئے میں پہلی حیثیت پر روشنی ڈالوں گا ۔اس حیثیت میں انسان کی مجبوری دو طرح کی ہے ایک لحاظ سے تو وہ مجبور محض ہے کہ اگر کچھ نہ کھائے تو زندہ ہی نہیں رہ سکتا ۔اسی طرح اگر وہ کوئی اطاعت نہ کرے تو اس کی زندگی ناممکن ہو جائے ۔دوسرے لحاظ سے اس کی مجبوری اعتباری ہے یعنی ایک اعتبار سے وہ مجبور ہے اور دوسرے اعتبار سے مختار ۔ جیسے وہ اگر غیر صالح غذا کھائے تو وہ کھا سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کی زندگی بے سکونی میں گزرے ۔اور مجبور وہ اس اعتبار سے ہے کہ غیر صالح غذا کے ذریعے وہ اپنے نظام جسمانی (Physical System) کے فطری توازن (Balance) کو کسی طرح قائم نہیں کر سکتا ۔اور اپنی زندگی سے کسی طرح دکھوں کو دور نہیں کر سکتا ۔اسی طرح انسان چاہے تو خدا کے سوا دوسروں کی اطاعت کر کے بھی زندہ رہ سکتا ہے اور اس بارے میں بے بس نہیں ہے کہ دوسروں کی اطاعت کرنا چاہے تو نہ کر سکے ۔مگر مجبور اس اعتبار سے ہے کہ دوسروں کی اطاعت کر کے وہ کسی طرح اپنے نظام زندگی کو متوازن نہیں بنا سکتا ۔اور اپنی زندگی کو کسی طرح بے چینیوں اور نقصانات سے بچا نہیں سکتا ۔اس لئے جس طرح نظام جسمانی کے صحیح نشو ونما اور عوارض سے پاک زندگی کے لئے صالح غذا ضروری ہے اسی طرح پورے نظام زندگی کے صحیح نشو وارتقا اور ڈر اور رنج سے پاک زندگی کے لئے تنہا اللہ کی عبادت (اطاعت) ضروری ہے ۔ پھر جس طرح غیر صالح غذا نوعیت کے لحاظ سے بہت مختلف ہوتی ہے اور ہر ایک کا اثر نظام جسمانی پر مختلف پڑتا ہے، کوئی فوری ہلاکت کا سبب بنتی ہے، کوئی دیر میں ہلاکت لاتی ہے اور کوئی بتدریج نظام جسمانی کو مضمحل کرتی ہے اور گھلا گھلا کر غیر طبعی موت کا شکار بنا دیتی ہے ۔اسی طرح غیر اللہ کی اطاعت بھی مختلف ہوتی ہے اور ہر ایک کا اثر نظام اجتماعی پر مختلف پڑتا ہے، کسی نظام اطاعت کا نتیجہ فوری ہلاکت ہے ۔کسی سے ہلاکت دیر میں واقع ہوتی ہے اور کوئی بتدریج نظام زندگی کو مضمحل کرتا اور قوموں کو گھلا گھلا کر

غیر طبعی (Un-natural) موت کا شکار بنا دیتا ہے۔

شکر گزاری اور ناشکری کی حقیقت

اسی طرح نبی عربیؐ کے رب نے ایک بنیادی اور ہمہ گیر قانون کا یوں اعلان فرمایا:

''اگر تم شکر گزاری کا رویہ اختیار کرو گے تو البتہ میں تمہیں بڑھاؤں گا اور اگر ناشکری کا رویہ اختیار کرو گے تو یقیناً میرا عذاب سخت ہے''۔

اب اس قانون کے نفاذ کے بعد نبی عربیؐ کی معرفت بتائے ہوئے رویہ زندگی ہی میں لوگوں کیلئے ترقی اور بڑھوتری ہے۔ اور اس کے برخلاف رویہ زندگی میں سختی اور تکلیف کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس قانون کے مطابق شکر گزاری کے رویہ کو سمجھنے کے لئے ناشکری کی حقیقت کو جان لینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر آنکھ کو لے لیجئے۔ اس آنکھ کے سلسلے میں ناشکری کی صورتیں کیا ہیں؟ اس کی ناشکری ایک تو یہ ہے کہ ہم آنکھ دینے والے کا احسان ہی نہ مانیں۔ دوسری ناشکری یہ ہے کہ ہم آنکھ کا کوئی مصرف ہی نہ لیں۔ تیسری یہ ہے کہ اس کا مصرف تو لیں، مگر وہ نہ لیں جس کے لئے یہ دی گئی ہے۔ چوتھی یہ ہے کہ لیں تو وہی مصرف، مگر جتنا لینا چاہئے اتنا نہ لیں بلکہ کم لیں یا زیادہ لیں۔ پانچویں یہ کہ مصرف کا طریقہ، موقع اور محل غلط اختیار کریں وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ان میں سے کوئی بھی صورت اختیار کرتے ہیں ان کی آنکھ نقصان سے نہیں بچتی۔ اور جس حد تک اور جس قسم کی ناشکری کرتے ہیں اسی حد تک اور اسی قسم کی اذیت اور خسارے میں وہ مبتلا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض حرکتوں کے نتائج بدفوراً ظاہر ہو جاتے ہیں اور بعض کے نتائج لطیف اور دیرپا ہونے کے سبب آسانی سے محسوس نہیں ہوتے۔ جیسے کسی کو بری نگاہ سے دیکھنے کا نتیجہ بہر حال برا ہی ہوتا ہے۔ اس کا اثر نہ صرف اخلاق پر پڑتا ہے، نہ صرف اجتماعی زندگی پر پڑتا ہے، بلکہ انسان کے اپنے قوائے طبعی پر بھی پڑتا ہے۔ قلب کی دھڑکن، خون کے ہیجان اور اعصاب کی اکساہٹ کے ذریعہ بہت سی انرجی ضائع ہو جاتی ہے۔ ان میں سے کسی نقصان کا احساس فوراً نہیں ہوتا مگر مآل کار یہ نقصان ناقابل تلافی ہوتا ہے۔ ان گنے چنے غلط رویوں سے بچ کر جو لوگ دنیا کے اور زندگی کے وسیع میدان میں، اور ان گنت چیزوں میں اپنی آنکھوں سے مصرف لیتے ہیں ان کی آنکھیں نہ صرف باقی رہتی ہیں بلکہ ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے بے شمار فائدے جو حاصل ہوتے ہیں وہ مزید انعامات ہیں۔

یہ قانون مادی اور غیر مادی، ہر طرح کی نعمت پر یکساں حاوی ہے، یہاں تک کہ جو سب سے بڑی نعمت اس کے پاس ہے یعنی اللہ کی یاد اور اس کا تصور اس پر بھی یہ اسی طرح لاگو ہوتا ہے۔ جب لوگ تصور خدا اور یاد خدا کا حق ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو یہ تصور اور یہ یاد بھی ان سے چھین لی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر تازہ ترین واقعہ روسی ترکستان کا ہے جہاں آج سے تیس پینتیس سال پہلے کٹر مذہبی مسلمان بستے تھے، جن کی مسجدیں بھری رہتی تھیں اور جہاں علماء کی پرستش ہوتی تھی۔ چند سال کے اندر اس قوم سے خدا کا تصور سلب کر لیا گیا، اس لئے کہ اس نے نماز کے بے جان ڈھانچہ کو اور دوسری کچھ شرعی اور کچھ غیر شرعی باتوں کو اصل ایمان سمجھ رکھا تھا اور اسی پر اسے اصرار تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور خدا اور دین اسلام جیسی عظیم الشان نعمت کی شکر گزاری کا طریقہ نہیں تھا بلکہ توہین اور ناشکری کا طریقہ تھا۔ آج وہ تمام قومیں جو کسی نہ کسی حد تک خدا کو مانتی ہیں اور خدا کے ساتھ اپنی عقیدت کو بھی قیمتی چیز سمجھتی ہیں کان کھول کر سن لیں کہ اگر انہوں نے اپنے خدا کے اس تصور کا جو انہیں ورثے میں ملا ہے، شکر ادا نہ کیا تو وہ وقت دور نہیں ہے جب انہیں بھی خدا کی یاد سے بہ جبر روک دیا جائے گا، اور اپنی نسل تک خدا کے تصور کو منتقل کرنے کے خیال کو ان کے لئے خواب بنا دیا جائے گا۔ اگر خدا انہیں واقعی محبوب ہے اور اس کی یاد انہیں عزیز ہے، تو پھر ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ اللہ کے آخری نبیؐ کے بتائے ہوئے تصور خدا

کواور طریق شکر گزاری کو پورا پورا اپنالیں۔ اگر انہوں نے یہ کرلیا تو پھر اللہ کا کلمہ ان کے ہاتھوں بلند ہو جائے گا اور اس کے نتیجہ میں یہ بھی پھلتی پھولتی رہیں گی۔

مختصر یہ کہ زندگی کے ہر میدان میں انسان ہر دم اس قانون کی زد میں ہے۔ اسی لئے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کس قدر صحیح رہنمائی کا محتاج ہے، اور ظاہر ہے کہ صحیح رہنمائی اور کوئی نہیں کر سکتا بجز اس کے جس نے خود انسان کو اور ساری کائنات کو بنایا ہے۔ اس کے لئے اس نے دو طریقے مقرر کیے ہیں۔ ایک تو ان قوانین کے لئے جن کے مطابق انسان کے کاموں کے فائدے یا نقصانات لگے بندھے قاعدے کے مطابق فوراً ظاہر اور محسوس ہو جاتے ہیں، اور دوسرا ان قوانین کے لئے جن کے مطابق وہ لگے بندھے ضابطے کے مطابق فوراً ظاہر نہیں ہوتے بلکہ وہ لطیف، وسیع اور دیر پا ہوتے اور دیر میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ محسوس قسم کے بھی ہوتے ہیں اور غیر محسوس بھی۔ پہلے قسم کے قوانین کی رہنمائی کے لئے صرف یہ چیزیں کافی نہیں ہیں۔ ان کے ناکافی ہونے کو عوام اور افراد کی حد تک تو ہر انسان تسلیم کرتا ہے، جو اس بات سے ظاہر ہے کہ حکومتوں اور ریاستوں (States) کے قیام پر سب یکساں راضی اور متفق ہیں۔ رہے خواص اور جماعتیں تو تاریخ کا ریکارڈ خود ہی گواہ ہے کہ محض عقلی تجربہ اور تاریخی ریکارڈ نے کبھی بھی انہیں راہ راست پر نہیں لگایا ہے۔ بلکہ ان تمام انسانوں کے لئے ان تین چیزوں کے علاوہ کچھ اور ضابطوں اور ہدایتوں کی بھی ضرورت ہے، اور ان کو نافذ کرنے والے ایک اقتدار اعلیٰ کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اس لئے اللہ نے براہ راست اپنی طرف سے پیغمبروں کے ذریعے ہدایت نامے بھیجے اور اپنے اقتدار اعلیٰ کی اطاعت کرنے کو انہیں کہا۔ سچ یہ ہے کہ اس کی ہدایت ہی صحیح ہدایت ہے۔ اور اسی کا اقتدار حقیقی اور واقعی اقتدار ہے۔

بے امنی، انتشار اور بے چینی غلط کاریوں کے اثرات ہیں

یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ انسان جیسے اعمال کرتا ہے ویسے ہی اثرات ظاہر ہوتے ہیں، مگر یہ اثرات اس کے اعمال کا پورا بدلہ نہیں ہیں۔ بلکہ جس طرح بیماریاں اور ان سے پیدا ہونے والی تکلیفیں غلط تغذیہ کے محض اثرات ہیں، جن کے پیدا کرنے سے قدرت کی غرض یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی پر متنبہ ہو۔ اسی طرح تمدنی زندگی میں بگاڑ، بے امنی اور انتشار بھی انسانوں کی غلط کاریوں کا پورا بدلہ نہیں ہیں بلکہ غلط اطاعتوں کے اثرات ہیں، جن کی غرض بھی یہی ہے کہ لوگ اپنی غلط روی پر متنبہ ہوں اور پھر سے دوسروں کی اطاعت سے باز آ کر اپنے خالق کی اطاعت اختیار کریں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں انضباط (Discipline) نہ رہا ہو، یا اس کے افراد امن و سکون کو ترس رہے ہوں، یا اپنی ضروریات کی تکمیل سے عاجز ہو رہے ہوں، یا کسی اور طرح اس کی مجموعی زندگی کا توازن بگڑا ہوا ہو تو یہ ایک طرف اس کی تباہی کا الارم ہے، اور دوسری طرف اس کی اجتماعی غلط کاریوں کی طرف فطرت کے اشارے ہیں، جو کسی مزمن مرض کی علامت کی طرح اس کے نظام (سسٹم) میں چھپی ہوئی خرابیوں کی طرف اس کی توجہ کو پھیرنا چاہتے ہیں تاکہ بے چینی اور نقصانات سے تنگ آ کر یہ اصل مرض کے دور کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ یہ واقعی کوششیں کرتی ہے، مگر اس کوشش میں زیادہ تر یہ ہوا و ہوس اور سہولت اور عجلت پسندی کو راہ دیتی ہے، اور اس طرح صحیح طریقۂ علاج کو چھوڑ کر الٹی سیدھی تدبیروں پر اعتماد کر لیتی ہے، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرض سخت سے سخت تر ہو کر اس کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

انسانی تاریخ کے دو دور

قوموں کی ہلاکت کی تاریخ تمدن کے ارتقاء کی وجہ سے دو دوروں (Ages) پر مشتمل ہے۔ ایک طفولیت کا اور دوسرا بلوغیت کا۔ یہ دوسرا دور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے، جبکہ ان کی معرفت انسان کو عالمگیریت (Universality) کا ہلکا سا تصور اور عالمگیر تہذیب و تمدن (Universal Civilization) کی ضروری بنیادیں عطا کی گئیں۔ پھر یہ دور پختگی کے عہد میں پیغمبر

آخرالزماں ﷺ کے وقت داخل ہوا، جبکہ دین اور شریعت کی تکمیل کردی گئی۔ پہلے دور کی قوموں پر بچپن کی کیفیت غالب تھی، اس لئے وہ صرف مشاہدات حسی سے متاثر ہوئی تھیں۔ اس لئے اس دور کے انبیاء کی دعوت زیادہ سے زیادہ مشاہدات سے استشہاد پر مبنی ہوتی تھی۔ بچوں ہی کی طرح وہ قومیں اس دعوت کو حق سمجھنے کے لئے محسوس نشان بطور ثبوت طلب کرتی تھیں، اور جب وہ طلب کرتی تھیں تو پیش بھی کردیا جاتا تھا جسے ہم اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ معجزہ جیسی چیز طلب کرنا یا تو بلادت کی وجہ سے ہوسکتا ہے یا شیطنت کی وجہ سے۔ جو لوگ صرف بلادت کی وجہ سے طلب کرتے تھے وہ اس کو دیکھ کر ایمان لے آتے تھے، مگر ان کی بلادت طبع (مزاج کی بے وقوفی) کی وجہ سے ان میں فطری ذکاوت (Intelligence) پیدا نہیں ہوتی تھی، اس وجہ سے وہ تمدن کو فروغ دینے میں سربراہ کاری کا پارٹ ادا کرنے سے قاصر ہوتے تھے۔ تاہم وہ اس میں ممد ضرور ہوتے تھے۔ اور سربراہ کاری کا کام ان کے نبیؑ اور وہ معدودے چند مومنین انجام دیتے تھے جو معجزہ طلب کیے بغیر صرف دلائل سے ایمان لے آتے تھے۔ باقی رہے وہ لوگ جو معجزہ دیکھنے کے بعد بھی اپنے انکار پر ہی جمے رہتے تھے، ان کا یہ جمنا یا تو اپنے جاہلانہ عقیدے اور رویے سے محبت کی بناء پر ہوتا تھا، یا پھر شرارت نفس کی بنا پر۔ ظاہر ہے کہ غلط رویے پر اصرار کر کے وہ تمدن کو فائدہ تو پہنچاتے نہیں تھے البتہ اس میں روڑے اٹکاتے اور اسے خراب کرتے تھے۔ اسی لئے دنیا کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کیا جانا ضروری تھا۔

اس کے لئے قدرت نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ اپنے اعمال کے چکر میں پڑ کر عمل اور ردعمل (Action and Re-action) کا تختۂ مشق بنیں، اور اس طرح تباہ ہوئیں کہ ان کی تباہی کے طبعی اسباب وعلل (Physical Causes) کا سراغ لگایا جا سکے۔ کیونکہ ایسی ہلاکت سے تو ایسی ہی قومیں عبرت حاصل کرسکتی تھیں جو عقل وشعور رکھتی ہوں۔ اس دور طفولیت کی قوموں کی عبرت پذیری کے لئے ضروری تھا کہ ان کی بیشتر وغلط کار قوموں کو اسی طرح معجزانہ طور پر ہلاک کیا جائے تاکہ ان کے طفلانہ ذہن پر یہ نقوش ثبت ہوجائیں، اور وہ ایسی غلطی کی جرأت نہ کریں۔ چنانچہ ان میں سے کسی کو طوفان کے ذریعہ، کسی کو تیز وتند زہریلی ہوا کے ذریعہ، کسی کو کرخت آواز کے ذریعہ، غرض اسی طرح عوامل فطرت کے ہاتھوں انہیں ملیامیٹ کیا گیا۔ ہر چند کہ اس طرح تباہ کئے جانے میں بھی خدا کے قانون کی روح بھی یقیناً پائی جاتی ہوگی جو اعمال اور ان کے اثرات میں مماثلت (یکسانی) کا سبب ہے۔ مگر ہمیں اس کا کھوج لگانے کی یہاں اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ اولاً تو ان قوموں کی تفصیلی حالتیں ہمیں بتائی نہیں گئیں۔ دوسرے یہ کہ اب اس قسم کے عذاب آنے والے بھی نہیں ہیں، اور شاید اسی لئے ان قوموں کی بدکرداریوں کی تفصیلات نہیں بتائی گئیں، کیونکہ اگلوں کے کردار پچھلوں تک اسی لئے پہنچائے جاتے ہیں کہ پچھلے لوگ ان سے نصیحت حاصل کریں۔

دور بلوغیت کا پہلا عہد

اس دور کے بعد دوسرے دور کا پہلا عہد (Period) آتا ہے۔ اس عہد کی مثال ایک فرد کی عمر شباب کی ہے۔ جب وہ تعلیمات اور تجربوں کے ذریعے کافی عقل وشعور حاصل کرچکتا ہے، مگر ایک طرف اس کی عقل پختہ نہیں ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کے اندر جذبات کی فراوانی اسے بڑی حد تک بچوں کے جیسا بنائے رکھتی ہے۔ اس وقت وہ معقولات کے مقابلہ میں محسوسات ہی سے زیادہ متاثر اور بسا اوقات مغلوب ہوجایا کرتا ہے۔ تقریباً یہی کیفیتیں اس دور ثانی کے عہدوں کی قوموں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ پچھلے تجروں سے بہت کچھ سیکھ چکی تھیں۔ محسوسات کے ساتھ ساتھ معقولات کا بھی ان کی زندگی میں عمل دخل تھا، اور فی الجملہ وہ اجتماعی شعور و ارادہ کے اعتبار سے ایسی تھیں جیسا انفرادی شعور وارادہ کے اعتبار سے ایک جوان انسان ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے اس عہد کے انبیاء کی تعلیم ودعوت کا انداز پہلے دور کے انبیاء سے مختلف ہے۔ پھر اس عہد میں بھی پہلے دور کی طرح تدریجی ارتقاء (Gradual Evolution) پایا

جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے ہی کی طرح اب بھی فہم وشعور ناقص ہے، اور پختگی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے عہد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عالمگیر تمدن وشریعت کے صرف بنیادی پتھر رکھ دیتے ہیں، جس کے بہت بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر عمارت کھڑی کرتے ہیں، اور خود کفیل نظام زندگی دنیا کو دیتے ہیں۔

اس عہد کے انبیاء کی دعوت میں دلائل و براہین اور مشاہدات حسی دونوں پائے جاتے ہیں، مگر دلائل کا جزء بتدریج غالب اور غالب تر ہوجاتا ہے۔ نیز اس عہد میں کوئی قوم تو ایسی نظر آتی ہے جو معقولات ہی کے ذریعے راہ راست پر آجاتی ہے، اور کوئی محسوسات کی طالب ہوتی ہے، اور کوئی قوم دونوں کے ذریعے راہ راست قبول کرتی ہے اور کوئی کسی طرح نہیں۔ یہ کیفیت ایک جوان فرد کی اس کیفیت سے مشابہ ہے جو مختلف وقتوں میں اس کے اندر پیدا ہوتی رہتی ہے، کیوں کہ اس کی زندگی شعور اور جذبات دونوں کی آماجگاہ بنی ہوتی ہے۔ کبھی وہ جذبات سے مغلوب ہوکر ناسمجھی کی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ کبھی اس کی عقل اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ سمجھدار آدمی کا رویہ اختیار کرلیتا ہے۔ اور کسی وقت شعور وجذبات دونوں کا مخلوطہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ اس عہد میں اللہ کا قانون مماثلت بالکل بے نقاب ہوکر سامنے آجاتا ہے اور ان قوموں کے حالات بڑی تفصیل سے ہم تک پہنچائے گئے ہیں تاکہ ہم اپنے کردار پر گہری نگاہ رکھیں۔ کیونکہ اگرچہ ہمارا عہد، طفولیت کی بلادت اور خالص جذبات کی زد سے باہر ہوچکا ہے، پھر بھی جذبات وشعور کے مخلوطہ میں فساد کے دورے اور فہم وشعور میں فتور کے دورے اس میں پڑا ہی کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم پہلی قوم ہے جس کے لئے انہیں محسوس شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ صرف عقلی استدلال پر دونوں فریق نے اکتفا کیا اور جب ان کی قوم اس میدان میں عاجز ہوجانے کے باوجود اپنے غلط رویے پر اڑی رہی تو اس کو عوامل فطرت کے ذریعہ ہلاک نہیں کیا گیا، بلکہ اسے تمدنی، سیاسی واقتصادی عوامل (Cultural, Political & Economical Factors) کے سپرد کردیا گیا۔ اور وہ اپنے اجتماعی کرتوتوں کے ردعمل کا شکار ہوکر ہلاک ہوگئی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایسے شواہد دکھانے بالکل ہی نہ پڑے۔ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی قوم بھی کسی فوق الفطرت شہادت اور کسی خرق عادت کا مطالبہ نہیں کرتی ہے، بلکہ محض ان کی سیرت سے متاثر ہوکر اپنی اجتماعی زندگی کی باگ ڈور ان کے سپرد کردیتی ہے۔ اس کے بعد قوم شعیب، پھر دور طفولیت کا نمونہ پیش کرتی ہے اور عوامل فطرت کے ذریعے ہلاک کی جاتی ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے حالات پھر نسبتاً اختصار کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

بالآخر یہ عہد اپنے شباب کو پہنچ جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ عقل وجذبات کا ایسا مخلوطہ قوموں پر اثر انداز ہورہا ہے کہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ ممیز کرنا دشوار نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں مصر میں دو قومیں آباد تھیں ایک بنی اسرائیل اور دوسری قبطی۔ اس وقت وہاں سحر، ساحری کا بڑا چرچہ تھا جو عقل وحواس کو فریب دینے کا دوسرا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا دلچسپ مشغلہ ہی فریب کھانا رہا ہو، اور فریب بھی صرف عقلی نہیں بلکہ حسی بھی، وہ عقل وتمیز اور جذبات واخلاق کی کس سطح پر ہونگے۔ اور مزید برآں بنی اسرائیل تو سیاسی غلامی کے سبب، جو ان کے عزائم کو پیہم پامال کرتی رہی تھی اور جس نے ان کے جوہر انسانیت کو بری طرح خاک میں ملا دیا تھا، اور بھی گئے گزرے ہوگئے تھے۔ ایسی آبادی تباہی سے کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی۔ اسی لئے اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو نبی بنا کر ان میں بھیجا کہ غلط بینیوں اور غلط کاریوں کے چکر سے انہیں نکالنے کے لئے شاہ راہ فطرت کے نشانات انہیں دکھائیں، شاید کہ اپنی حقیقت انہیں یاد آجائے، یا اپنی تباہی کا اندازہ انہیں ہوجائے اور وہ راہ نجات کو اختیار کرلیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کی ابتدا اسی عقلی استدلال سے کی، مگر فرعون قائل ہونے کی بجائے اپنی بات پر اڑا

رہا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اسے حسی دلائل دکھائے جائیں، جس کے بعد وہ مرعوب تو ہو گیا مگر اپنی ڈینگ سے باز نہ آیا۔ اس طرح مصر کی آبادی میں بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے اور زیادہ لوگ خود اپنے نفس کی ٹیڑھ کی وجہ سے، یا فرعون کی سیاسی طاقت کے ڈر سے اپنی اسی تباہی کی راہ پر جمے رہے۔ ان جمنے والوں نے اپنی ذہنی پستی کا ثبوت بار بار دیا۔ اس لئے بار بار انہیں محسوس نشانات دکھائے گئے۔ کبھی عصائے موسیٰ ؑ کے کرشمے پیش کئے گئے، کبھی ید بیضا کی روشنی، کبھی کھٹملوں اور مینڈکوں وغیرہ کی باری باری یورش ہوئی، تو کبھی ہر طرف خون ہی خون پھیل گیا۔ مگر ان کی آنکھیں تھیں کہ پھر بھی نہ کھلیں۔ ہر بار جب مصیبتوں سے تنگ آ جاتے تو حضرت موسیٰ ؑ سے دعا کراتے اور جب وہ آفت ٹل جاتی تو وعدۂ ایمان فراموش کر جاتے، اس لئے اس قوم کو اسی طرح عوامل فطرت کے ذریعے ہلاک کیا گیا اور وہ معجزانہ طریق پر دریا میں غرق ہو گئی۔ ایسا اس لئے بھی کیا گیا کہ اس کی جگہ لینے والے بنی اسرائیل جو اپنے ایمان کی بدولت بچ رہے تھے وہ ذہنی طور پر ایسے ہی پست تھے۔ وہی ہیں جنہوں نے مطالبہ کیا کہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ انہی نے دوسری بت پرست قوموں کی دیکھا دیکھی بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ ان کی یہی ذہنی پستی ہے جس کے پیش نظر خدا بار بار انہیں معاف کرتا رہا اور بچوں کی طرح ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتا رہا۔ چنانچہ عصائے موسیٰ تو دن رات اپنے کرشمے دکھاتا ہی رہتا تھا، انہیں کتاب بھی ملی تو لکھی لکھائی۔ انہیں تنبیہ کی ضرورت ہوتی تو صرف ڈانٹ پر اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ طور کو ان کے سروں پر اٹھا دیا جاتا کہ شرارت کی تو اس کے نیچے بس دبا دیئے جاؤ گے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم فرعون کو اس طرح غرق کیا گیا کہ یہ اس سے عبرت لے سکیں، چنانچہ اپنی انتہائی احمقانہ شیطنت کے باوجود زمانہ دراز تک یہ خدا کے باغی نہ بنے۔ مگر شرارت ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، جو ان کی نسل میں بھی متوارث ہوتی رہی۔ یہ سب کچھ اس شیطانی تمدن کا اثر و نتیجہ تھا جو فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں مصر میں پروان چڑھا تھا، جس کے کڑوے کسیلے پھل دنیا کو بنی اسرائیل اور ان کی شرارتوں کی شکل میں ہزاروں سال کھانے پڑے۔ مگر اس کے باوجود دنیا کی امامت کے لئے اس قوم کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ ان تمام شرارتوں کے کرتے ہوئے بھی وہ دوسری تمام قوموں کے مقابلہ میں کم مفسد تھی، جیسا کہ اس کی بار بار گراوٹ کے وقت دوسری قوموں کے عارضی غلبہ کے دوران میں ان کی تباہ کاریوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

اللہ کے دین اور اس کے قوانین کو قبول کر لینے کی وجہ سے بڑی حد تک اس قوم کی اصلاح ہو گئی، اور تمدن کو فروغ دینے میں اس نے بہت کچھ حصہ لیا۔ لیکن شرارت جو اسے ورثہ میں ملتی رہی بار بار اس کے اندر ابھرتی رہتی۔ یہاں تک کہ جب جب اس عظیم الشان قوم کے کسی حصہ پر غفلت طاری ہوئی، اور اس نے شرارت سے آگے بڑھ کر بغاوت کا رویہ اختیار کیا تو اگلی قوموں کو بھی یہ مات دیتی رہی۔ اس نے کتاب اللہ سے تمسخر کیا۔ اس نے انبیاء کو قتل کیا۔ اللہ کی ذات و صفات کا تفصیلی علم و عقیدہ رکھتے ہوئے اس نے اللہ پر بہتان باندھے۔ اور اپنے کرتوتوں کے بدلے کیفر کردار کو پہنچتی رہی، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہاں تک کہ یہ پوری کی پوری قوم باغی ہو گئی اور اپنی تمام صلاحیتیں کھو بیٹھی تو اس پر ذلت و مسکنت مار دی گئی، تا کہ دنیا میں غضب الٰہی کا زندہ نمونہ بن کر دوسری قوموں کے لئے عبرت پذیری کا سامان بنی رہے۔

دور بلوغیت کا دوسرا عہد

اب انسانیت ایسے عہد میں داخل ہوتی ہے جسے فرد کے لئے پختگی کی عمر کہتے ہیں۔ جب اس میں مصلحت اندیشی کا مادہ پیدا ہونے لگتا ہے، جب عقل بتدریج غالب ہوتی جاتی ہے، اور جذبات آہستہ آہستہ اپنی گرفت ڈھیلی کرنے پر مجبور ہوتے جاتے ہیں۔ جب ان کے قصوروں پر انہیں مارا پیٹا نہیں جاتا بلکہ اس کے احساس خودی کو براہ راست ٹھیس لگائی جاتی ہے، اور جب اس کے حسن عمل سے خوش ہو کر پیسے اور مٹھائیاں اسے نہیں دی جاتیں بلکہ اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی سبق اس کی سمجھ

میں نہ آتا ہو تو بچوں کی طرح شکلیں بنا کر گ سے گدھا، ب سے بیل اور ر سے روٹی کی طرح اسے سکھایا نہیں جاتا، بلکہ فطری ہی طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ زندگی کی بلند قدروں سے متعلق عقلی باتیں بتائی جاتی ہیں، اور براہ راست اس کی عقل وجدان سے اپیل کی جاتی ہے۔ یہی بات ہے جو پیغمبر آخرالزماں کی تعلیم میں ہم دیکھتے ہیں۔ ان کی قوم بھی محسوس علامات کا مطالبہ کرتی ہے مگر اس کے دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے اور آثار کائنات سے استشہاد، قرآن کے اعجاز اور رسول اور اصحاب رسول کے کردار پر ان کی بصیرت افروزی کے لئے اکتفا کیا جاتا ہے کہ اب پہلی قوموں کی طرح صورتوں کے مسخ کرنے کا، آفات ارضی و سماوی سے قوموں کو ہلاک کرنے کا عذاب نہیں آئے گا۔ اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ ''جس کو زندہ رہنا ہے وہ واضح علامات کے ذریعے زندگی حاصل کرے، اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ انہی علامات کے ذریعہ ہلاک ہو''۔ اور اس ہلاکت کی صورت یہ قرار دی گئی کہ لوگوں کے کرتوتوں کے باعث انہیں گروہوں میں بانٹ دیا جائے اور ان گروہوں کو ایک دوسرے کی سختیوں کا مزا چکھایا جائے۔

چنانچہ یہ فیصلہ خود ہی اپنے اندر یہ شہادت رکھتا ہے کہ اب انسانیت غلبہ شعور کی عمر کو پہنچ گئی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد تجربہ اور تمدن کی ارتقاء کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی رشتہ تیزی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قریبی اور مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اب کسی جگہ کوئی قوم یا گروہ اگر بری طرح ادھم مچاتا ہے تو پوری انسانی آبادی میں ہلچل مچ جاتا ہے، اور انسانیت کا اجتماعی شعور اس کو دفع کرنے کی کوشش کرنے لگ جاتا ہے۔ اب انسانی آبادی کے سواد اعظم کو بتدریج اپنی حیثیت کا اندازہ ہونا جا رہا ہے جو ابھی اسی حد تک ہے کہ ان کے عوام کی حیثیت اس کے خواص کے مقابلہ میں کیا ہے۔ اگرچہ یہ پوری طرح اجاگر نہیں ہوا ہے مگر حالات بتا رہے ہیں کہ بہت جلد یہ چیزیں بالکل واضح ہو جائیں گی۔ اس کے بعد دوسری منزل کے مرحلے طے ہونے کے لئے باقی رہ جائیں گے۔ اور وہ اس شعور کی منزل ہے کہ انسان کی اصلی و فطری حیثیت اس کارگاہ حیات کے مقابلے میں اور خالق کائنات کے مقابلے میں کیا ہے۔ جس شعور کے حاصل ہونے کے بعد ہی انسان کو متوازن زندگی نصیب ہوگی۔ یہ منزل ابھی اس کی نظروں سے اوجھل ہے، مگر اللہ کی مصلحت کلی اسے اس طرف بڑھائے لئے جاری ہے، اور زندگی کا کارواں اس سمت میں قدم بڑھا چکا ہے۔ چنانچہ یہ اس کے آثار ہیں جو آپ دیکھتے ہیں کہ اب بچے بھی بوڑھوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ اس شعور کی صلاحیت سن رشد کے بعد آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہے جو اس سے پہلے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اب میں جاتا ہوں، اور میرا جانا تمہارے لئے بہتر ہے، کیونکہ میرے بعد ہی وہ آنے والا آئے گا جو تمہیں وہ باتیں بتائے گا کہ اگر آج میں تمہیں بتا دوں تو تم برداشت نہ کر سکو گے۔

اس حیثیت کی اور اس کو قبول کر لینے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کی پوری پوری نشان دہی پیغمبر آخرالزماں کے ذریعہ کر دی گئی ہے۔ اور ان کی قوم نے اور پھر بہت سی قوموں نے اس حیثیت کو اور ان ذمہ داریوں کو قبول کر کے یہ ثابت بھی کر دیا کہ انسانیت اب سن شعور کو پہنچ گئی ہے، مگر بعد کی صدیوں میں پھر خلاء نظر آتا ہے، اور دنیا کی بیشتر آبادی اس سے بیگانہ دکھائی دیتی ہے، اور خود وہ لوگ جو انہیں قبول کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں راستے سے بھٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شعور ابھی پوری طرح اجاگر نہیں ہوا ہے لیکن اب حالات یہ بتا رہے ہیں کہ وہ مرحلہ بہت جلد آ رہا ہے جب دنیا کی پوری آبادی اس پوزیشن اور ان ذمہ داریوں کو قبول کر لے گی، اور دنیا کا نظام امن اور برکت سے بھرپور ہو جائے گا۔ یہ تو وہ حالات ہیں جو اللہ کی مشیت اور اس کی مصلحت کلی کے تحت اپنے وقت پر رونما ہوں گے۔

مگر پیغمبروں کے آنے کا اور ان کے مشن کا منشاء یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے ارادے سے خود کو اللہ کے سپرد کر کے اس معتدل نظام زندگی کو اختیار کر لیا کریں تا کہ انسانیت صحت مند زندگی گزارتی ہوئی اس زندگی کے

نقصانات سے بچتی ہوئی اور اس کے فوائد حاصل کرتی ہوئی اپنے مراحل طے کر سکے۔

انسانی تاریخ کا آخری عھد

اس کے بعد پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آئے گا جب انسانیت اپنی عمر طبعی کے آخری مراحل میں داخل ہوگی، اور اس پیر فرتوت جیسی ہو جائے گی جو علم کے بعد پھر لاعلم ہو جاتا ہے، اور اپنی زندگی کے خاتمہ کا ہر لحظہ منتظر ہوتا ہے۔ یہ علم کے بعد لاعلمی، اسے دوبارہ بچہ کے جیسا بنا دے گی، جب وہ دنیا کی ظاہر فریبیوں میں کھو کر رہ جائے گی اور خدا کی آخری ہدایت کو بھلا کر ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو جائے گی۔ پھر اپنی پیش رو قوموں کی ترقیوں کی ناخلف وارث بن کر انتہائی ترقی یافتہ اسباب زندگی کا غلط استعمال کرے گی، اور اس طرح اپنی ہلاکت کا آپ ہی سبب بن جائے گی اس کے بعد پھر اس دنیا کی بھی کوئی ضرورت نہ رہے گی، اور یہ توڑ پھوڑ کر ختم کر دی جائے گی تا کہ اس کی جگہ دوسرے قوانین پر ایک دوسری دنیا بسائی جائے جہاں ان تمام انسانوں کے کارناموں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے۔

انسانی تاریخ کی اس تفصیل کا گھرا مطالعه

یہ تو تھا سرسری جائزہ انسانیت کے بچپن سے موت تک کے مراحل اور اتار چڑھاؤ کا۔ اس سرسری جائزے کا اگر آپ بغور نہیں بلکہ صرف سرسری مطالعہ کریں گے تو آپ اسی قسم کے نتیجے پر پہنچیں گے جس پر ملحد مفکرین اور گمراہ فیلسوف پہنچا کئے ہیں، اور آپ کے ذہن پر یہ اثر مرتب ہوگا کہ انسان اپنے سے بالاتر کسی ارادے کا تابع ہے۔ جو جس طرح چاہتا ہے اسے زندہ کرتا ہے، زندہ رکھتا ہے، اس کی زندگی میں تصرف کرتا ہے اور مار ڈالتا ہے، نیز یہ کہ ہر دور پہلے دور سے بہتر اور ترقی یافتہ ہے، اور یہ ارتقا اس کے اپنے ارادہ و اختیار سے بے نیاز اسی بالاتر ارادہ کے تحت وجود پا رہا ہے۔ لیکن اگر آپ غور سے مطالعہ کریں گے تو حقیقت کچھ اور نظر آئے گی۔ اس پورے جائزے میں کچھ چیزیں تو یقیناً ایسی نظر آئیں گی جو انسان کے اپنے ارادے کے تحت واقع ہوتی ہیں۔

آپ ایک فرد کو دیکھتے ہیں وہ پیدا ہوتا ہے، پھر اگر اس کو زندگی میسر ہوتی ہے تو اس پر بچپن، جوانی اور بڑھاپا طاری ہوتا ہے اس درمیان میں وہ نشو ونما پاتا ہے، اور اس کے بعد وہ مر جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز اس کے اپنے ارادہ پر موقوف نہیں ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے، ان حالتوں کا اس پر طاری ہونا ناگزیر ہے۔ اسی طرح انسانیت کی ابتدا اور اس کی بقا، اس پر طفولیت، شباب، ضعیفی اور موت کا طاری ہونا اس کے اپنے ارادۂ اختیار سے باہر کسی بالاتر ارادہ کا تابع ہے۔ پھر ایک فرد میں مختلف جذبات ومیلانات اور مختلف صلاحیت کار بھری ہوتی ہیں اور اندر سے زور لگاتی ہیں تو انسان حرکت وعمل کرتا ہے، لیکن ان میں سے کسی کو بھی اس نے نہ اپنے ارادے سے اپنے اندر بھرا ہے، نہ انہیں زور لگانے کو اس نے کہا ہے۔ اس طرح انسانیت کی ارتقاء، اس ارتقاء کے لئے اس کے اندر تقاضے، اور تقاضوں کا اجتماعی زندگی میں زور لگانا بھی انسان کے اپنے ارادۂ اختیار سے بے نیاز ہیں۔ لیکن ایک فرد جس طرح اپنے اندرونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے غفلت یا غلو، تفریط یا افراط یا اعتدال کی روش اختیار کرنے کی آزادی رکھتا ہے، اسی طرح انسانیت جو عبارت ہے نسل در نسل اور قوم در قوم اجتماع انسانی سے، اپنے اجتماعی اور عمرانی داعیات کے جواب میں غفلت یا غلو، تفریط یا افراط یا اعتدال کا طریقہ اختیار کرنے کی آزادی رکھتی ہے اور اسے استعمال کرتی رہی ہے۔ لیکن اس آزادی کے بعد پھر ایک مجبوری آتی ہے، وہ یہ کہ جس طرح فرد تفریط یا افراط کے رویوں سے اپنی زندگی کو تکالیف کی آماجگاہ بنا ڈالتا ہے، اور اپنے اس غلط روئے پر ہوتے ہوئے کسی طرح ان اثرات بد کو مرتب ہونے سے روک نہیں سکتا، اور اس روش پر اصرار کرتے ہوئے زندگی کی لذتوں سے کسی طرح مستفید نہیں ہو سکتا، اسی طرح نسلیں یا قومیں اپنی اجتماعی وعمرانی زندگی میں افراط یا تفریط کی راہ چل کر اپنی زندگی کو پرسکون بنانے پر کسی طرح قادر ہو ہی نہیں سکتیں، اور اپنی زندگی سے دکھ اور انتشار کو کسی طرح دور کر ہی نہیں سکتیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ مطالعہ سے یہ نظر آتا ہے کہ ہر دور پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا چلا جاتا ہے تو اس ترقی کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی ایک فرد کے بچپن کے بعد جوانی، اور جوانی کے بعد مصلحت بینی کی عمر میں داخل ہونے کی ہے۔ اس صورت میں آدمی کے اندر ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت اور قوت ضرور زیادہ سے زیادہ تر پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، لیکن اس کے معنی یہ کہاں ہیں کہ وہ ازخود ہدایت یافتہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ کیا آپ ایسے لوگوں کی اکثریت نہیں دیکھتے ہیں جو انسانیت، شرافت اور ہدایت کی راہ سے بھٹکی ہوئی ہے۔ ٹھیک ایسا ہی انسانیت کا حال ہے جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کی صلاحیتیں بھی اجاگر ہوتی جاتی ہیں۔ مگر یہ کہ قومیں ازخود ہدایت کو پالیں یا لازماً آئندہ نسل اپنی گزشتہ نسل کے مقابلہ میں زیادہ ہدایت یافتہ ہو، یہ کہاں پایا جاتا ہے؟ لوگ اس کی تمدنی ترقیوں کو اور اسباب زندگی کی گونا گونی میں اضافوں کو، اور کائنات پر اس کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور اس کے طبعی ارتقاء اور روحانی واخلاقی ترقی میں امتیاز نہ کرسکنے کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہر نیا دور پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہدایت پر ہے۔ اس لئے انسان کو اپنے وقت کے رجحانات کا ساتھ دینا چاہئے۔ حالانکہ اس کی حقیقت بالکل ایسی ہے جیسے ایک آدمی کی زندگی کا ہر عہد پہلے کے مقابلہ میں جسمانی اور عقلی قوتوں کے لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ وہ اپنی ہر موجودہ حالت میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ متنوع زندگی گزارتا ہے، زیادہ اسباب زندگی پر اپنی حکومت چلاتا ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں رہنے والے بیشتر آدمی ایسے ہیں جو متنوع زندگی گزارنے میں اور اسباب زندگی پر تصرف کرنے میں طرح طرح کی زیادتی اور ظلم کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آج سے پہلے ہمیشہ لوگ کرتے رہے ہیں۔

انبیاء کا مشن

چنانچہ اللہ نے جو انبیاء بھیجے ان کا مشن یہ کبھی نہیں رہا کہ وہ انسانوں کو ورزشیں سکھائیں۔ انہیں ظروف و آلات بنانا سکھائیں۔ انہیں مادی سائنس اور طبیعات کی تسخیر کے فارمولے سکھائیں۔ کیونکہ ان چیزوں کا سیکھنا انسان کی جبلت (Instinct) میں اس طرح بھر دیا گیا ہے، کہ یہ تجربہ کرے اور یہ سب چیزیں ازخود سیکھ لے۔ اسی لئے انبیاء نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ یہ کہ ان کاموں پر انسان کو اپنی مقدس اور محترم تعلیمات کے ذریعے ابھارا تاکہ یہ اپنی غفلت سے تمدن کو فروغ دینے میں کوتاہی نہ کریں۔ رہا ان کا اصل مشن تو وہ ان کے اپنے وقت کے موجودہ تمدن اور آئندہ کے فروغ یافتہ تمدن کے برتنے کے لئے صحیح طریقہ سکھانا تھا جو نہ کبھی انسانوں نے ازخود سیکھا اور نہ اس کا ازخود سیکھ جانا انسان کیلئے ممکن تھا۔

اسی لئے اللہ نے یہ اپنے ذمہ لے لیا کہ ہدایت وہ خود بھیجے گا۔ اور جب کوئی قوم اس ہدایت کو بھلا بیٹھے اور بالآخر تباہی کی ڈھال پر تیزی سے لڑھکنے لگے تو اسے سہارا دے، اور پھر سے ایک مرد حق آگاہ کو اس میں پیدا کرے جو اسے انجام سے باخبر بھی کرے اور وہ بھولی ہوئی ہدایت بھی دوبارہ اس کے سامنے لے آئے۔ لیکن دنیا والوں نے ہمیشہ یہی کیا کہ اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اور تباہی کے آغوش فریب ہی کو اپنے لئے پسند کیا۔ چنانچہ ہوتا یہی رہا ہے کہ جب کوئی قوم دنیا کے نظام میں خرابی پیدا کرنے والا رویہ اختیار کرتی ہے تو اللہ اپنے دیئے ہوئے اختیارات نیابت کی بنا پر اسے مہلت دیتا ہے، اور وہ اپنے پسند آئے ہوئے رویہ پر بڑھنا شروع کر دیتی ہے۔ ابتداءً اس کے پاس اللہ کا ہدایت نامہ ہوتا ہے جو اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا ہے، مگر وہ دنیا کی لذتوں کی طالب ہوتی ہے اس لئے اپنا رویہ بدلنے پر تیار نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے یہ مزاحمت بڑھتی جاتی ہے اس کے اندر الجھن بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اندر ایک جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور بچے کھچے آثار ہدایت کو بھی وہ مٹا دیتی ہے، اور پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی خواہشات کے پیچھے سرپٹ دوڑنے لگتی ہے، اور اس طرح جب اس کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے تو اللہ پھر اسے سہارا دیتا ہے۔ مگر دنیا کے عشق میں مگن قوم اس سہارے کو

بھی ٹھکرا دیتی ہے چنانچہ اللہ فرماتا ہے کہ کسی پیغامبر کو بھیجے بغیر اور جن چیزوں سے اس قوم کو بچنا چاہیئے ان کی نشان دہی کیئے بغیر ہم کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتے۔ اور جب ہم نے کسی آبادی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرلیا تو اس کے کھاتے پیتے لوگوں کو ہم نے حکم دیا اور انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی تو اس آبادی کا معاملہ صاف ہوگیا اور ہم نے اسے ملیا میٹ کر دیا۔"

قوموں کے عروج و زوال کا طریقہ

اس چڑھاؤ اتار اور پھر سامان دنیا کی بارش اور اس کے بعد کامل تباہی کا طریقہ (Process) یہ ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کو مرکز اطاعت تسلیم کرلیتی ہے تو اس کی ہدایتوں پر چلنے کی وجہ سے ترقی کرنے لگ جاتی ہے۔ اور اس کی زندگی کو جب دوسری قومیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہیں تو اس کا احترام ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ان کی آنکھوں کا تارا ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے نظام حیات کو اپنا لیتی ہیں، اور اگر نہیں بھی اپناتیں تو اپنی زندگی کی باگ ڈور اس کے حوالہ کر دیتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں اس الٰہی نظام کی بدولت تقسیم دولت کا ایسا متوازن انتظام قائم رہتا ہے کہ خوش حالی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ خوش حالی بعد کی نسلوں کو مدہوش کر ڈالتی ہے اور وہ سہل انگار اور لذت پسند ہو جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ لوگ ضوابط خداوندی کی ان دفعات کی پابندی چھوڑنے لگتے ہیں جو انہیں گراں محسوس ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ قوم کچھ تو خدا کی مطیع رہ جاتی ہے اور کچھ غیر اللہ کی مطیع ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ ایسا کرنے لگتی ہے تو اس کی رفتار میں فرق آجاتا ہے۔ کیونکہ اپنی یکسوئی ختم کر کے خود کو دو مخالف سمتوں میں کھینچنے والے عوامل (Factors) کے حوالہ کر چکی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ضوابط خداوندی کی گرفت کو خود ڈھیلی کرتے کرتے اس حد کو پہنچ جاتی ہے جب دونوں طاقتیں برابر اثر ڈال رہی ہوتی ہیں۔ اس وقت اس کے تمام اجتماعی قویٰ مفلوج ہو جاتے ہیں اور اس پر کامل تعطل (Suspense) طاری ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ بالکل بے بس ہوتی ہے اور ہر دشمن کا آسانی سے شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں اس کے بہت سے دشمن جو اس کی طویل گراوٹ کے زمانے میں اس کی اغراض پرستی اور ظلم وزیادتی کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے اور موقع کی تاک میں تھے اس پر تاخت (چھاپا مارنا) شروع کر دیتے ہیں، اور بالآخر ان میں کا کوئی اس پر پوری طرح قابو پالیتا ہے جو اب اسے تعطل سے نکال کر خدا کی ہدایت کے مخالف سمت میں بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اب اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی کھوئی ہوئی دنیا پھر واپس ملنے والی ہے، کیونکہ اب تعطل سے نکل کر پھر ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔ گو اس کی رفتار اب کفر کی طرف ہوتی ہے۔ اس کا یہ فریب نظر اسے تیز گام ہونے کو کہتا ہے، اور اس کے ایمانیات کے بچے کھچے عناصر اس کے ضمیر میں کھٹک کھٹک کر اس کی رفتار میں بریک لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر اس کے اندر غصہ اور جھنجھلاہٹ سی پیدا ہوتی ہے اور وہ ان باقی ماندہ بے جوڑ مذہبی بندھنوں کو بھی جدا کر دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور متاع دنیا لوٹنے پر دوسری کافر قوموں کی طرح مسابقت (Competition) شروع کر دیتی ہے۔

ایسے وقت میں اللہ اپنے کسی حق آگاہ بندے کو اشارہ کر دیتا ہے اور اسے اس کے فریب نظر سے آگاہ کر کے حقیقی فلاح کی راہ دکھاتا ہے تو یہ کسی طرح اسے باور کرنے کو تیار نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اپنے خیال میں ترقی و کامرانی کی منزل کی طرف جارہی ہوتی ہے۔ جب وہ انکار کر دیتی ہے تو اس کی یکسوئی کی وجہ سے اسے سامان دنیا سے وافر حصہ ملنے لگتا ہے، اور یہ اپنے حال میں مگن ہوکر خوب داد عیش دینے لگتی ہے۔ مگر یہاں جو سامان قدرت نے پیدا کیا ہے وہ محدود ہے، اور جو قوتیں قدرت نے انسان کے اندر بھر دی ہیں وہ بھی محدود ہیں جو زندگی کی ضروریات کی تکمیل کیلئے تو کافی ہیں مگر اندھادھند لذتیں بٹورے چلے جانے کے لے بالکل ناکافی ہیں۔ اب چونکہ یہ اپنے منصب خلافت کو فراموش کر کے ہدایت الٰہی کو ٹھکرا کر دنیا میں اعتدال اور نظم برقرار رکھنے کی بجائے اسباب زندگی کو اپنی بے لگام خواہشوں کی تسکین میں استعمال کرنے لگتی ہے تو ایک طرف بیرونی سامان سے دوسرے لوگ اور خود اس کی اپنی قوم کے بہت سے

لوگ بھی محروم ہونے لگتے ہیں، اور دوسری طرف اس کی اندرونی قوتوں میں گھن لگتا جاتا ہے اور یہ بیرونی اور اندرونی بگاڑ یکایک اس کی استعماریت کو منہدم کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب وہ انکار کر دیتے ہیں تو ہم ڈھیل دیتے ہیں، اور ہر چیز کا دروازہ ان پر کھول دیتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ مگن ہو جاتے ہیں تو یکایک ہم انہیں پکڑ لیتے ہیں۔

بدی و بد کرداری پر خاموشی مہلک ہے

قوموں کی یہ ہلاکت انفرادی قسم کی نہیں بلکہ ہمیشہ اجتماعی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس لئے اس ہلاکت کا شکار وہ تمام لوگ ہوتے ہیں جو ان بدکاروں میں گھلے ملے ہوتے ہیں، خواہ وہ بجائے خود بدکردار نہ ہوں۔ ان کا ایک اخلاقی جرم تو یہی ہے کہ لوگ اللہ کے قانون کو ان کے سامنے توڑتے رہتے ہیں اور ان کی رگ حمیت تک نہیں پھڑکتی۔ دوسرا یہ کہ اپنے بھائیوں کے لئے ان کے اندر جذبۂ خیر خواہی بھی نہیں ابھرتا کہ جس انجام بد کا انہیں علم ہے اس سے بچانے کے لئے انہیں سمجھائیں۔ دوسری طرف جو خدا کے وفا شعار بندے قوانین الٰہی کی حرمت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور خدا کے ملک میں فساد و بغاوت کو فرو کرنے میں ان کی تائید کے ضرورت مند ہوتے ہیں یہ ان کو طاقت نہیں پہنچاتے، اور اپنے رویۂ خاموشی سے مجرموں ہی کی معنوی تائید کرتے رہتے ہیں۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ جب یہ لوگ ان مجرموں کے ساتھ گھلے ملے ہوئے ہوں اور حق کے لئے ان سے علیحدگی کے لئے تیار نہ ہوں تو قوانین طبیعی کے تحت اس قوم پر جو عذاب بھی آئے گا، خواہ وہ ارضی ہو یا سماوی، یا گروہوں میں تصادم کے ذریعہ ان کی تباہی، اس میں ان کا ابتلا ہونا ناگزیر ہے۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ بچو اس فتنہ سے جو صرف ان لوگوں ہی کو لاحق نہ ہوگا جو تم میں ظالم ہیں، اور یہ کہ ایسے لوگ کیوں نہ ہوئے جو لوگوں کو خدا کے قانون کی خلاف ورزی سے روکتے، بجز تھوڑے سے آدمیوں کے، صرف جنہیں ہم بچا لیتے رہے۔

نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے والے ہلاکت سے بچا لئے جاتے ہیں

اس فساد و منکر سے روکنے والوں کے بچا لئے جانے کی اخلاقی وجہ تو بالکل ظاہر ہے، مگر قوانین طبیعی کے تحت ان کے بچائے جانے کی جو صورت اللہ نے مقرر کی ہے وہ بڑی بصیرت افروز ہے۔ ہلاکت خواہ ارضی وسماوی عذاب کے ذریعہ ہو، خواہ تمدنی بگاڑ اور اجتماعی ظلم وزیادتی کے ذریعہ اس سے بچائے وہی جاتے ہیں جو خود کو ان نافرمانوں سے ممیز کر لیں جن کے اخلاق و کردار کا ان سے مختلف ہونا تو ظاہر ہے۔ نہیں، اس فساد و منکر کو روکنے میں جن کی امکانی جدوجہد اس حد تک شدید ہو گئی ہو کہ وہ اپنی قوم کے لئے یا اپنی قوم کے خود ساختہ متکبر اور نابکار لیڈروں کے لئے ناقابل برداشت ہو گئے ہوں، اور قوم یا وہ لیڈر ان کے دشمن ہو گئے ہوں۔ یہی وقت اس قوم کی ہلاکت کا ہوتا ہے، اور جب ہلاکت کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے تو ان بندگان خاص کو اس قوم سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور قوم کو تباہی آ دبوچتی ہے۔

جب تک یہ لوگ اپنی قوم میں موجود ہوتے ہیں اس پر عذاب نہیں آتا، اس لئے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے کی وجہ سے یہ اپنی قوم میں ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے ایک فرد کے اندر اس کا ضمیر ہوتا ہے۔ جب تک یہ ضمیر زندہ رہتا ہے وہ شخص اپنی مجرمانہ روش میں بالکل بیباک اور بے لگام نہیں ہونے پاتا۔ مگر جب وہ ضمیر مر چکتا ہے تو پھر یہ شخص چھوٹ کر بداعمالیاں کرتا ہے اور خود کو تباہی کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب تک ایسی ایک چھوٹی سے چھوٹی جماعت بھی کسی قوم میں موجود ہوتی ہے وہ اپنی تنقیدوں سے اس قوم کی یا اس کے سربراہ کاروں کی تخریبی کارروائیوں میں رکاوٹ ڈالتی رہتی ہے، اور انہیں جی کھول کر داد عیش دیتے اور فرعونی ٹھاٹھ جماتے ہوئے رائے عامہ کے بیدار ہو جانے کا اور اس کے احتساب کا ڈر لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ قومی وسائل زندگی کا توازن بگڑتے بگڑتے ایسے نازک مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے کہ دو چار قدم کے بعد اس کا جیون رس سوکھنے لگے گا، اور پوری قوم کو، بغیر کسی نشان دہی کرنے

والے کے بھی، خود ہی اپنی یاس انگیز حالت اور موت کا یقین ہونے لگے گا تو اس کے اکابر انہیں فنا کر دینے کی تدبیر کرنے لگتے ہیں۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر یہ قوم صفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتی ہے، اور اگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے تو پھر یا تو قید کر کے انہیں عوام کے حلقۂ احساس سے باہر کر دیتے ہیں یا جلاوطن کر کے ان کی تنقیدوں سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں، اور اس طرح اللہ انہیں اس ناپاک ماحول سے نکال لاتا ہے۔

ان کے نکل جانے کے بعد یا قید کر دیے جانے کے بعد اکابرین قوم اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اپنی کامیابی کے نشہ میں سرشار ہو کر اپنے ارادوں کو بے روک ٹوک بروئے کار لانے لگتے ہیں۔ اب جیسے جیسے جیون رس سوکھتا جاتا ہے عام لوگوں کو ہوش آنے لگتا ہے۔ مگر اب کیا ہوتا ہے۔ یہ تو وہی بیوقوف لوگ ہیں جو موقع ہاتھ سے کھو چکے۔ ان زندہ دل لوگوں کا اس وقت ہاتھ بٹاتے جب اکابرین قوم ان پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہچکچاتے تھے تو یہ برے دن دیکھنے ہی نہ پڑتے۔ چنانچہ ان متکبرین کی اس ظاہری فتحمندی کے بعد ان کو جرأت نہیں ہوتی کہ ان کی تخریبوں پر آواز اٹھا سکیں۔ یہ سہمے سہمائے ان تمام بے راہ رویوں اور بے انصافیوں کو جھیلے چلے جاتے ہیں، تا آنکہ خود ہلاک (Collapse) ہو جائیں یا باہر کی کوئی طاقت ان پر حملہ کر کے ان کو تہس نہس کر دے۔

اس وقت ایک اور صورت بھی رونما ہوتی ہے، اگر ان نکالے ہوئے لوگوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ اس وقت اس قوم کی مدد کو آ سکیں تو وہ آ کر ان کی دستگیری کرتے ہیں، یا یہ کہ اس قوم کی آنکھیں خود ہی کھل جاتی ہیں اور یہ اپنے اکابرین کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالتی ہے۔ اور ان جیل میں بند کئے ہوئے، جلاوطن کئے ہوئے لوگوں کو دعوت دیتی ہے کہ آئیں اور اس کی اجتماعی زندگی کی باگ ڈور سنبھالیں۔

اس کے بعد آپ پر یہ بات بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ اجتماعی زندگی کو چلانے والے، خصوصاً ہلاکت سے قریب زمانوں میں، قوم کے وہی افراد ہوتے ہیں جو ذرا کھاتے پیتے قسم کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ قوم تباہی کی طرف چلتی ہی اس وقت ہے جب اس کے نزدیک عزت و برتری کا معیار دولت دنیا ہو جائے۔ چنانچہ ان کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے قوم طوعاً و کرہاً انہیں کی پیروی کرتی ہوتی ہے۔ اسی لئے ایسے وقت میں اللہ انہیں سرغنوں کو مامور ٹھہراتا ہے، اور جب وہ اللہ کے امر کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو پوری قوم پکڑ لی جاتی ہے کیونکہ وہ انہیں کی پیروی کر رہی ہوتی ہے___ حالانکہ اسے اللہ کے پیغام کا علم ہوتا ہے، اور وہ اللہ کی قدرت وطاقت کا علم اور اس پر عقیدہ رکھتے ہوئے بھی ان اکابرین کے ڈر سے اس حق کی تائید وحمایت نہیں کرتی۔

طاغوتی حکومت کا غلبہ اور اس کی غلامی

ان مختلف صورتوں میں سے ایسی صورت بہت کم قومیں اختیار کرتی ہیں کہ وہ ان صالح لوگوں کو اپنی سربراہ کاری کا کام سونپیں، کیونکہ وہ خود بھی اپنی نفسانی خواہشوں کے چکر میں پھنسی ہوتی ہیں جس سے نکلنا وہ خود پسند نہیں کرتیں۔ چنانچہ ایسی قوم کو طاغوت کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ پھر وہ طاغوت اپنے قہر وغضب کا مضبوط پنجہ اس میں گاڑ دیتا ہے، اور یہ اس کی چاکری کرنے کیلئے بے آبروئی اور ذلت ومسکنت کی زندگی گزارنے کے لئے اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے زندہ نمونہ عبرت بنی رہنے کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے۔ پھر یہ اپنی حکمران قوم اور دنیا کی دوسری جابر اور قاہر قوموں سے اس درجہ مرعوب ہو جاتی ہے کہ انہیں کے رنگ ڈھنگ اور طور طریقے اختیار کرنے میں اپنی سعادت سمجھنے لگتی ہے۔ پھر انسانی شرافت اور قومی مجد (بزرگی) سے بالکل تہی دامن ہو جاتی ہے۔ اور جسم و ذہن کی دہری غلامی میں مبتلا ہو کر جوہر انسانی کو کھوتے کھوتے وہ جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ روٹی اور اپنے آقاؤں کی خوشنودی اس کا مطمح نظر ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس میں قوت ارادی بالکل مفقود ہو جاتی ہے جو انسان اور حیوان میں ایک ہی امتیاز پیدا

کرنے والی چیز ہے۔ اس طرح اقتدار سے محروم ہو کر اور سطح انسانی سے بھی گر کر جب اس کا نصب العین روٹی اور بظاہر برتر دکھائی دینے والی قوموں کی نقالی ہو جاتا ہے تو اس ذلت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

اگلی قوموں میں سے یہودیوں کی حالت یہی ہو گئی تھی کہ وہ جھوٹ بولنے اور حرام کھانے میں پکے ہو گئے تھے، اور ان کے راہبوں کی نقالی تو آپ کو یاد ہی ہو گی کہ انہوں نے دوسروں کو بت پرستی کرتے دیکھا تو اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کر ڈالی کہ ہمارے لئے بھی ایسا ہی ایک معبود بنا دو جیسے ان کے معبود ہیں۔ چنانچہ اس عظیم الشان قوم کا کوئی حصہ کسی علاقہ میں خود کو جب جانوروں کی سطح پر لے آیا اور بندروں کی طرح نقالی کرنا اس کی طبیعت ثانیہ ہو گئی، یا سوروں کی طرح کھانے میں پاک اور ناپاک میں امتیاز سے عاری ہو کر ناپاک ہی غذا میں اسے مزا ملنے لگا، اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی کتاب کی عبارتوں کو اس نے بگاڑ ڈالا تو اللہ نے اس کو صورتاً اور سیرتاً بندر اور سور بنا دیا۔

مسخ معنوی اب بھی ہوتا ہے

اللہ کے اس عذاب میں اب بھی لوگوں کے لئے سامان عبرت ہے۔ ہاں چونکہ اب اللہ کی آخری کتاب کی عبارتوں کو مسخ کر دینے سے لوگ مجبور کر دئے گئے ہیں اس لئے وہ انہیں نہیں بگاڑتے، تو اللہ بھی ان کی ظاہری صورتوں کو نہیں بگاڑتا ہے۔ مگر چونکہ قرآن کے معنی مسخ کرنے کی قدرت ان سے سلب نہیں کی گئی ہے اس لئے اس کے معنی و مفہوم کو توڑتے مروڑتے اور خوب خوب بگاڑتے ہیں اور دوسری قوموں کی نقالی اور ناپاک خوری ہی پر فخر کرتے ہیں۔ اس لئے سیرتاً اب بھی ایسے لوگ بندر اور سور بنائے جاتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ وہ بندروں کی طرح اغیار کی نقل اتارنے میں ملکۂ راسخ رکھتے ہیں۔ دوسروں کو چھکانے میں، اچکنے اور پھرتی دکھانے میں بڑے تیز ہیں۔ ڈینگیں ہانکنے اور گھڑکی دکھانے میں تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، مگر ڈٹ جاؤ تو ہٹ جائیں گے۔ اور تم دیکھو گے کہ سور کی طرح جو غلیظ کھاتا ہے یہ ایسے ذرائع سے حاصل کی ہوئی اور ایسی غذائیں کھاتے ہیں جو حرام بھی ہیں، اور طبع انسانی کے لئے مکروہ بھی۔ وہ سور ہی کی طرح قومی حیثیت میں سخت جان بھی ہوتے ہیں کہ برے سے برے عذاب وہ پیہم جھیلتے رہتے ہیں اور ان کو موت نہیں آتی۔

خاتمہ کلام

حضرات! تمام کے تمام قوانین کا بیان اور ہر ایک پر پوری تفصیلی روشنی ڈالنے کی اس مقالہ میں گنجائش نہیں ہے، تاہم قوانین کی اہم دفعات کو اس حد تک روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اوسط ذہنی صلاحیت رکھنے والے آدمی کی سمجھ میں ان قوانین کی حقیقت اور ان کے نفاذ کی طبعی صورتیں آجائیں تاکہ ان کی آنکھیں بروقت کھل سکیں اور قومی گاڑی کی سمت سفر کو معلوم کر کے اسے صحیح سمت کی طرف موڑنے کی وہ کوشش کریں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنی ہی نجات کی فکر کریں اور گاڑی سے خود کو اتار لیں۔ اور نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے کا فریضہ انجام دینے لگیں اور دیتے رہیں۔ وما علینا الا البلاغ

خیر وشر کا معیار

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

(یہ مضمون ماہنامہ ''زندگی'' کے ستمبر ۱۹۵۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

خیر وشر، اچھائی اور برائی دو ایسے لفظ ہیں جن سے دنیا کا کوئی آدمی اور قوم ناآشنا نہیں ہے۔ پھر جن جن چیزوں اور جن جن کاموں کو اچھا اور برا کہا جاتا ہے وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک تو اصولی و بنیادی جو اٹل ہیں اور مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے تفصیلی اور فروعی جو مستقل بھی ہوتے ہیں اور اضافی (Relative) بھی۔ جو اچھائیاں اور برائیاں بنیادی ہیں ان پر تمام دنیا کے کل انسان متفق ہیں۔ البتہ اختلاف جن میں پایا جاتا ہے وہ دوسری قسم پر مشتمل ہیں۔ لیکن جن اچھائیوں اور برائیوں کو تسلیم کرنے میں تمام انسان متفق ہیں، ان کے بارے میں بھی شدید اختلاف اس وقت رونما ہو جاتا ہے جب انہیں اپنی عملی زندگی میں نافذ (Apply) کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت آپ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز برٹش قوم کے مظالم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو وہ غدار کہلاتا ہے، اور جرمن قوم کی چیرہ دستیوں کا ڈھنڈھورا سو جھوٹ کے ساتھ پیٹتا ہے تو قوم کا ہیرو قرار پاتا ہے۔ ایک شخص اگر سچ بولنے کی وجہ سے اپنے آپ کو خطرے میں مبتلا کر ڈالتا ہے تو بیوقوف سمجھا جاتا ہے اور اگر جھوٹ بول کر اپنی بلا دوسرے کے سر تھوپ دیتا ہے تو عقلمند کہلاتا ہے۔ حالانکہ ظلم اور جھوٹ ایسی برائیاں ہیں جن کے بدی ہونے سے دنیا کا کوئی آدمی بھی انکار نہیں کرتا اور انصاف اور سچ ایسی اچھائیاں ہیں جن کا نیکی ہونا ہر آدمی تسلیم کرتا ہے۔

اس نقطہ نظر سے اگر آپ دنیا کے مختلف مذاہب فکر (School of Thought) کا جائزہ لیں اور مختلف نظام ہائے عمل کو کھنگال کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سب کے سب صرف دو اصل سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں۔ ایک احساس کی بندگی یا مادہ پرستی (Materialism) دوسرے تخیل پسندی (Idealism)۔

مادہ پرستی جب انسانوں پر حاوی ہو جاتی ہے تو فرد اور فرد میں اور قوم اور قوم میں مادی فائدوں کے لئے کشمکش کا رونما ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور یہ کشاکش جوں جوں بڑھتی جاتی ہے استحصال اور استحفاظ (Exploitation & safeguard) کے نت نئے طریقے بروئے کار آتے جاتے ہیں، انہی طریقوں میں سے قبیلہ پرستی، پھر نسل پرستی پھر قوم پرستی ہے۔ انہی طریقوں میں سے بادشاہت (Kingship)، جمہوریت (Democracy) اور آمریت (Dictatorship) ہے اور انہی طریقوں میں سے جاگیرداری (Feudalism)، سرمایہ داری (Capitalism)، اشتراکیت (Communism)، بین الاقوامیت (Internationalism) اور جہانی حکومت (World Government) کا نظریہ ہے۔ چونکہ ان سبھوں کی اصل مادہ پرستی (Materialism) پر مبنی ہے اس لئے ان کے آپس میں تنازع اور کشاکش بطور روح کے کارفرما ہے۔ اگر یہ تنازع اور یہ کشاکش کسی طرح دور کر دی جائے تو ان کے سارے بندھے ہوئے شیرازے (Element) ایک دم سے بکھر جائیں۔ اسی لئے چونکہ تمدن کی بقا کے لئے شیرازہ بندی ناگزیر ہے اور شیرازہ بندی کے لئے وہ تنازع کو بطور ریڑھ کی ہڈی اور روح رواں کے محسوس کرتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ تنازع (Struggle) ایک فطری حقیقت ہے۔ اس بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جانے کے بعد وہ زندگی کے لئے جو تفصیلی پروگرام بھی بناتے ہیں لامحالہ اس میں اسپرٹ اسی تنازع کی ہوتی ہے۔

ان میں سے کسی نظام زندگی(System of life) کو لے لیجئے۔ خیر اور شر کا معیار ہر ایک میں یہی ہوگا کہ جو چیز یا جو کام مادی منفعت کا موجب ہو وہ خیر ہے اور جو مادی نقصان کا موجب ہو وہ شر ہے۔ پھر یہ مادی نقصان بجائے خود معیار نہیں ہیں بلکہ ان کی معیاریت اس وقت مکمل ہوتی ہے جبکہ اس کے ساتھ فرد کی انفرادیت اور قوم کی اجتماعی حیثیت کو بطور اساس کے تسلیم کر لیا جائے۔ اس طرح فرد کے لئے کوئی چیز اس وقت بھلی قرار پاتی ہے جب وہ خود اس فرد کو مادی نفع پہنچائے اور قوم اور جماعت کے لئے جب بھلی شمار ہوتی ہے کہ اس قوم یا جماعت کو مادی نفع پہنچائے۔ اسی طرح جو چیز فرد کو مادی نقصان پہنچائے وہ فرد کے لئے اور جو جماعت کو مادی نقصان پہنچائے وہ جماعت کے لئے شر قرار پاتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں رہی جو بجائے خود خیر اور شر تو کیا ہوتی کم سے کم دو شخصوں اور دو قوموں یا دو جماعتوں کے درمیان بھی ایک ہی قدر کی حامل ہوتی الا یہ کہ ان دونوں کے مادی اغراض ہی ایک ہوں۔ لیکن مادی اغراض کا یہ اتحاد کوئی دائمی اور پائدار چیز نہیں ہوتی اس لئے لامحالہ ان کے معیارات آئے دن ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں خیر و شر بے معنی چیزیں ہو کر رہ گئی ہیں۔

خیر و شر کے اس عدم استقلال اور ان کے اس طرح بے معنی ہو جانے کے بعد طاقت اپنی مطلق العنانی کا دعویٰ بے دھڑک کرتی ہے اور کمزوری ظلم و ستم کا تختۂ مشق بننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ پھر تو سوسائٹی میں بے اطمینانی اور بغض و حسد کی آگ سلگنے لگ جاتی ہے اور نتیجہ میں بدامنی، فساد اور انقلاب اپنی بھیانک صورتوں کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔

اس کے خلاف دوسرا گروہ تخیل پسندوں(Idealist) کا ہے جنہیں مادہ پرستی کے ساتھ ساتھ مادہ اور زندگی میں اس کی کارفرما طاقتوں سے بھی انکار ہے۔ وہ خیر و شر سے جب بحث کرتے ہیں تو قدرتی طور پر تصوریت ان پر غالب ہوتی ہے اور وہ زندگی کے مادی اور طبعی پہلوؤں اور ان کے تقاضوں کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ وہ اچھائیوں کو اس لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بجائے خود اچھائیاں ہیں اور برائیوں کو اس لئے ترک کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بجائے خود برائیاں ہیں۔ ایسے انسان اب تک دو طرح کے پائے گئے ہیں۔ ایک مذہبی دوسرے بے مذہب۔ مذہبی قسم میں راہب اور جوگی اور غیر مذہبی قسم میں شاعر اور فلسفی وغیرہ داخل ہیں۔ اور یہ دونوں قسم کے لوگ آج تک کسی تمدنی زندگی کی بنا نہیں ڈال سکے۔ وہ جب ساری دنیا کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے تو نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ اسی مادہ پرستی اور تنازع للبقا کے اصول پر زیادہ سے زیادہ طاقت فراہم کرتے گئے جس کے ساتھ ساتھ ان کی حرص بھی بڑھتی گئی اور وہ زیادہ سے زیادہ استحصال کرتے رہے، یہاں تک کہ خود یہ تصور پسند لوگ بھی ان کی جفا شعاریوں سے بچ نہ سکے۔ اول اول تو یہ لوگ ترک علائق کی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ اگر تعلقات بڑھاتے تو ذمہ داریاں بڑھتیں اور ان کو پورا کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے تو مادہ پرستوں کی ناکہ بندیاں راہ روکتیں۔ چنانچہ مجبوراً انہیں اپنی اپنی انفرادیت کے خول میں سمٹنا پڑا۔ اور اگر زندگی کے تقاضوں کو دبا نہ سکے اور دنیاوی تعلقات میں پھنس گئے تو اپنے اصول کو سو حیلوں اور بہانوں سے اپنے ہاتھوں ذبح کر ڈالا۔ اس طرح عیسائیت کے دس اصول، بودھ مت کا اہنسا، راہبوں، جوگیوں اور خانقاہیوں کا ترک دنیا، فلسفیوں کا خیر برائے خیر کا نظریہ اور شاعروں کی معصوم شاعرانہ باتیں کوئی بھی زمین پر اقتدار حاصل نہ کر سکیں جو ظلم کو مٹانے اور انسانوں کو فلاح کی راہ پر چلانے کے لئے ضروری ہے۔

اسلام کا نقطہ نظر

اسلام کی راہ ان دونوں کے درمیان ایک متوسط راہ ہے۔ وہ اس مادی زندگی کو ایک حقیقت تسلیم کرتا ہے، اس میں پیدا ہونے والے مسائل کو حقیقی اہمیت دیتا ہے، بلکہ ان مسائل کے فطری اور مکمل حل کے لئے خود کو پیش کرتا ہے۔ یہاں مادہ پرستی کی جگہ مادہ کا اثبات (Assumption) اور اس کے ساتھ حق پسندی اساسی اہمیت رکھتی ہے اور تصوریت کی بجائے حقیقت پسندی

(Realism)اور تمدن پروری کے محور پر اس کا سارا نظام چلتا ہے۔ یہاں خیر کل ایک خدا کی ذات ہے جو زندۂ جاوید ہے اور زندگی کا سرچشمہ (Source of life) بھی ہے۔ اس کے اوصاف(Attributes) کو اختیار کرنا معیار خیر (Standard of good) ہے اور ایسے اوصاف کو اپنے اندر پیدا نہ کرنا معیار شر (Standard of evil) ہے۔ اس طرح خیر اور شر ایک ایسی ہستی سے وابستہ ہیں جس پر کسی انسان کا اور بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کا کسی طرح بس نہیں چلتا بلکہ وہی سبھوں پر غالب ہے۔ نہ ہی اس کا رشتہ کسی انسان یا کسی گروہ سے قریب اور کسی سے دور کا ہے بلکہ سبھوں کے ساتھ برابر کا ہے، اس لئے انسانیت کی جو چیزیں ان کے درمیان مشترک ہیں ان سے متعلق خیر اور شر دونوں کا معیار بھی تمام انسانی آبادی کے لئے ایک ہی ہے مثلاً انسان عبارت ہے متمدن ہستی سے جو کھانے اور پہننے کے لئے مجبور ہے، افزائش نسل اور حفاظت خود اختیاری کا داعیہ رکھتا ہے اور اسی جیسی دوسری بنیادی حاجتیں رکھتا ہے۔ ان مجبوریوں، ان داعیوں اور ان حاجتوں کی تکمیل اور ان کے احترام کا جہاں تک تعلق ہے وہ تمام انسانوں اور تمام گروہوں کے لئے یکساں ہے۔ اسلام میں پیٹ کے لئے غذا، جسم کے لئے لباس، جان، مال، آبرو اور اولاد کے لئے حفاظت کا انتظام خدا کے نزدیک دوسروں کا بھی ویسا ہی حق ہے جیسا ان اصولوں پر ایمان لانے والوں کا۔ کیونکہ خدا ہی نے دونوں کو پیدا کیا اور دونوں کو یکساں مہلت دی ہے کہ مرتے دم تک وہ چاہیں تو اس کے بتائے ہوئے طریقے پر زندگی گزاریں اور چاہیں تو اس کے خلاف رویہ اختیار کریں۔

پھر ان بنیادی امور کا ٹھیک ٹھیک انجام پانا اس کے بغیر ناممکن ہے کہ انسان سچ بولے، انصاف میں کسی کی پاسداری نہ کرے۔ جو خود اپنے لئے پسند کرے وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرے۔ اس لئے سچ بولنا، عدل کرنا، عہد کا پورا کرنا اور فی الجملہ وہ تمام مراعات جو اسلام نے دوسروں کے لئے متعین کر دیئے ہیں انہیں دینا غیر مشروط طور پر ان لوگوں کے ذمہ فرض ہے جو ان اصولوں کے پابند ہیں۔ یعنی یہ چیزیں بجائے خود نیکیاں ہیں، اضافی نیکیاں نہیں۔ اس لئے دوسرے لوگ خواہ جھوٹ بولیں، بدعہدی کریں بے انصافی کو راہ دیں، اس گروہ کو بہر صورت ان اصولوں پر ثابت قدم رہنا ہے۔ نہ کہ مادہ پرستوں اور قوم پرستوں کی طرح ان معاملات میں بھی اپنے اور غیر کا فرق کرنا اور اپنوں کے لئے جائز و ناجائز ہر طرح انتفاع کا اور دوسروں کے لئے ہر طرح نقصان پہنچانے کا طریقہ اختیار کرنا۔

پھر ان بنیادی حقوق کی ادائیگی میں خلل ڈالنے والی جو صورتیں ہیں ان کی حیثیت مستقل بدی کی ہے، اضافی بدی کی نہیں۔ یعنی خواہ دوسرے لوگ ان برائیوں کے مرتکب ہوں تو ہوں، اسلام کے علم برداروں کے لئے ان میں پڑنا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ مثلاً گالی بکنا، عصمت دری کرنا، سود لینا اور دینا، جوا اور سٹہ، نشہ کا استعمال اور دوسروں کے لئے وہ کچھ پسند کرنا جو اپنے لئے پسند نہ ہو۔

لیکن ان بنیادی امور کا پابند ہونے میں انسان کو ابتداءً مادی نقصانات سے بہت زیادہ، اور تمام عمر مادی ایثار سے بڑی حد تک دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو بیشتر لوگ ان اصولوں کو اپنانے سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ اس لئے اگر ان نقصانات کی تلافی نہ کی جائے اور اس کے ایثار کا خاطر خواہ بدلہ نہ ملے تو کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ انسان اپنی زندگی کے بظاہر ان چند لمحوں میں زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانے سے باز رہ سکے اور لطف اندوزی کی خاطر دوسروں کے حقوق تلف نہ کرے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے اس کے ان نقصانات کا بدلہ اتنا دیا ہے اور اس کے ایثار کی قدر افزائی اتنی کی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ وہ سب سے اول خدا کی خوشنودی عطا کرتا ہے۔ پھر مرنے کے بعد ابدی راحت کی زندگی بخشتا ہے۔ اور اتنے ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ خود اس دنیا کی زندگی کو اس درجہ سنوار دیتا ہے کہ جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اگر اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کیا جائے تو وہ وعدہ کرتا ہے کہ ان کے لئے آسمان سے رزق برسے اور زمین سے رزق ابلے (کس طرح یہ مستقل بحث ہے جو میرے اس موضوع سے خارج ہے)۔

اسلام صرف ان عقائد پر ہی بس نہیں کرتا بلکہ ان عقائد کونشو ونما دینے اور زندگی میں ان کے ایک کارفرما قوت بن جانے کے لئے وہ عملی مشق وتمرین کے طور پر کچھ فرائض بھی عائد کرتا ہے۔ جیسے نماز، زکوٰۃ وغیرہ جن کا کام یہ ہے کہ اگر صحیح جذبے اور شعور کے ساتھ انجام دیے جائیں تو خدا کی محبت اور اس کے منشا کو دنیا میں پورا کرنے کا زبردست جذبہ ابھرتا ہے۔ اس لئے یہ فرائض بھی مستقل نیکیوں کے حکم میں ہیں جن کا بجالانا ہر ایک پر فرداً فرداً اور تمام اسلامی سوسائٹی کے لئے جماعتی طور پر لازمی ہے۔ خواہ کچھ یا بہت سے افراد یا کچھ یا بہت سے گروہ انہیں نہ بجالاتے ہوں۔

ان سب کے بعد جب خیر وشر کے یہ اٹل معیار عملاً قائم ہو جائیں تو اضافی قدروں (Relative Values) کی طویل فہرست سامنے آتی ہے جن کے بارے میں اسلام نے کچھ اصول مقرر کر دیے ہیں جن کی مدد سے زندگی کے گوناگوں مسائل میں خیر وشر کی تعیین کی جاسکے۔ اس سلسلے میں جو موٹے موٹے اصول اس نے بتا دیے ہیں وہ یہ ہیں:

۱) کسی مخلوق کی اطاعت اسی حد تک جائز ہے جب تک اس اطاعت سے خالق کی نافرمانی نہ ہوتی ہو۔
۲) اگر کسی چیز کے بارے میں یہ نہ معلوم ہو کہ وہ خیر ہے یا شر تو چاہئے کہ آدمی اپنے ضمیر سے پوچھے۔
۳) جس چیز کے بارے میں اشتباہ ہو تو چاہئے کہ اس کو چھوڑ کر اسی چیز کو اختیار کیا جائے جس میں شبہ نہ ہو۔
۴) اگر کسی کے سامنے ایسی صورت پیش آجائے کہ چار و ناچار دو برائیوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ہی پڑے تو جو کم درجے کی برائی ہو اسے اختیار کرے۔
۵) برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے (بشرطیکہ اساسی خیر وشر کی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے) اور اگر تم معاف کر دو تو یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے اور اس کا اجر اللہ کے پاس ہے۔

خیر وشر کا یہ معیار ہے جو اسلام انسانوں کے لئے پیش کرتا ہے۔ یہ معیار بجائے خود بالکل مکمل ہے اگر انسان اسے اپنا لے۔ مگر تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تمام انسان کسی اچھی سے اچھی بات پر عملاً متفق ہو گئے ہوں۔ بلکہ ہمیشہ یہی ہوا کیا کہ مادہ پرستوں نے اچھی باتوں کو زندگی میں نافذ ہونے سے روکا ہے۔ اس لئے اسلام تمام قوموں کے نیک لوگوں کو جن کی فطرت کو یہ اصول اپیل کریں چند مزید اصولی ہدایتوں کا پابند بناتا ہے تاکہ بدی نیکی کے مقابلے میں دب کر رہے۔ وہ ہدایتیں یہ ہیں:

۱) یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے تو تم اسی کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، ورنہ وہ تمہیں تمہارے خالق کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔
۲) تم میں کا ہر ایک راعی و چرواہا ہے اور تم میں کے ہر ایک کو اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔
۳) نیکی اور خدا ترسی میں تم ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مذمت کرو۔
۴) جب کہیں تم برائی کو دیکھو تو اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دو۔ اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو کم سے کم دل میں اسے برا سمجھو اور یہ ایمان کی کمزوری کا آخری درجہ ہے۔

یہ ہیں وہ اصول جو زندگی کی کل کو ٹھیک چلانے کے لئے اسلام ہمیں دیتا ہے۔

⑩⑩⑩

خلائی دور

ضیاءالہدیٰ

شعبہ مطبوعات، حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی بہار، رمنہ روڈ، پٹنہ۔۴
نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

عزیز محترم ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ کا ایک مضمون جو رسالہ کی شکل میں سامنے ہے۔ میری نظر سے بھی گزرا۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ وقت کی اہمیت کو دیکھ کر انہوں نے جس قدر سیر کن اور تشفی بخش بحث کی ہے۔ ماشاء اللہ ان کی گہری صلاحیت اور گہرے مطالعے کا پتہ دیتی ہے۔ اس وقت جبکہ اس قمری سفر نے کتنے دماغوں میں ہلچل مچا دی ہے اور خود مجھ سے اس خصوص میں مختلف لوگوں نے سوال کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس رسالہ سے لوگوں کی کافی تشفی و تسلی ہو جائے گی۔

فقیر تقی حسن بلخی
۷/ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ
۱۸/ نومبر ۱۹۶۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی بارکنا حوله لنریه من اٰیٰتنا انه هو السمیع البصیر۔ ماکذب الفؤاد ما رأیٰ۔ افتمرونه علی ما یریٰ۔ و لقد رأه نزلة اخریٰ۔ عند سدرة المنتهیٰ۔ عند ها جنة المأویٰ ۔ اذ یغشی السدرة مایغشیٰ ۔ما زاغ البصر و ما طغیٰ۔ لقد رأیٰ من اٰیٰت ربه الکبریٰ۔

حضرات! اس سال کے اہم واقعات میں سے ایک اہم واقعہ انسان کا چاند پر پہنچ جانا ہے۔ اسلام اور کائنات کی حقیقت سے ناواقف لوگوں کے لئے یہ واقعہ جتنا حیرت انگیز ہے اس سے زیادہ تعجب مجھے ان مسلمانوں پر ہوا، جو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح یا تو اس واقعہ کو صحیح ماننے کے لیے ہی تیار نہیں تھے اور مہمل قسم کے اعتراضات کر رہے تھے، یا پھر اپنے موقف کی کمزوری محسوس کرتے ہوئے لچر تاویلوں پر اتر آئے تھے۔ مجھے امید تو یہی ہے کہ جن حضرات نے اب سے تقریباً بارہ تیرہ سال پیشتر اسی انجمن اسلامیہ ہال کے میدان میں معراج پر میری تقریر سنی تھی اور پھر دو سال پیشتر خلائی دور سے متعلق اسلامی رہنمائی کے سلسلے میں اسی ہال میں میرا خطبہ سنا تھا وہ بدحواسی کا شکار نہیں ہوئے ہوں گے، البتہ ان کے دلوں میں اس واقعے سے مزید انشراح ہوا ہوگا۔ جیسا

کہ میں نے کہا تھا کہ آپ نے جس مقام پر مجھے کھڑا کردیا ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کے متعلق اسلامی ہدایات بیان کردوں اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے سلسلے میں قرآن وحدیث کے مطالعہ سے جو روشنی مجھے ملی ہے اس سے آپ کو بھی مطلع کردوں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی واقعہ کے بعد دفاعی پوزیشن اختیار کرکے دور یا نزدیک کی تاویلات شروع کردیتے ہیں یہ میرے نزدیک یہ احساس کمتری ہے۔ یہ بھی احساس کمتری ہے کہ دوسروں کے گڑھے ہوئے نظریات اور ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر آدمی معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرے۔ یہ بھی احساس کمتری ہے کہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے اپنی تعلیمات سے انکار کرے یا ان میں کتر بیونت شروع کردے۔ اور یہ بھی احساس کمتری ہے کہ جہاں کوئی نئی بات رونما ہوئی یا کوئی نیا انکشاف ہوا بس یہ کہنا شروع کردیا کہ یہ تو میرے یہاں پہلے سے موجود ہے۔ مگر میرے نزدیک کمتری کی ان تمام قسموں سے بڑھ کر احساس کمتری یہ ہے کہ احساس کمتری کا طعنہ سننے کے خوف سے صحیح تعلیمات اور واقعی پوزیشن کو سامنے نہ لایا جائے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس کی بنیادی کتاب قرآن اور اس کی سرکاری تشریح یعنی حدیث، میری سمجھ کے مطابق صرف اس لئے نہیں نازل ہوئی کہ انسان کو اخلاقی وانتظامی ہدایات وقوانین دے، بلکہ اس کے نزول کے مقاصد میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آدم زاد کی ان کوششوں کو بھٹکنے اور ضائع ہونے سے بچایا جائے جو وہ تمدن کو فروغ دینے اور آگے بڑھانے نیز فلسفہ اور سائنسی علوم کی دریافت کے لئے کرے گا۔ کم از کم یہ کہ ان راہوں کے سنگہائے میل کی نشاندہی کردی جائے۔ آئندہ سطروں میں، میں اپنے غور وفکر کا اب تک کا ماحصل آپ کے سامنے رکھوں گا، مگر وہ صرف خلائی تسخیر اور خلائی دور سے متعلق باتیں ہوں گی، جن کا بیشتر حصہ میں اپنے متذکرہ خطبوں میں پہلے ہی بیان کرچکا ہوں۔

ہم سب پہلے وہ سوالات متعین کرلیں، جن پر خلاء سے متعلق علمی وعملی پیش رفت کا دارومدار ہے۔ پھر دیکھیں گے کہ اسلام ان کے کیا جواب دیتا ہے اور ان جوابات سے کیا فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ قرآن وحدیث دونوں وحی کی زبان میں ہم سے باتیں کرتے ہیں۔ وحی کے معنوں میں سے ایک معنی اشارہ ہے، یعنی یہ اشارے اور استعارے میں باتیں کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم کو صحیح جواب سمجھنے کے لئے اشارے کی اس زبان کو جاننا ہوگا۔

خلا اور کائنات سے متعلق زیر بحث موضوع کی حد تک جو سوالات بنیادی ہیں اور جن کے صحیح جواب سنگ میل کا کام دے سکتے ہیں، یہ ہیں:

۱۔ خلا کیا ہے؟
۲۔ خلا اور کائنات لامحدود ہے یا محدود؟
۳۔ انسان کے مقابلے میں کائنات کی حیثیت کیا ہے؟
۴۔ انسان کے لئے کائناتی سفر ممکن ہے یا نہیں؟
۵۔ ممکن ہے تو اس کی غرض وغایت کیا ہے؟
۶۔ کائنات کی وسعتوں میں انسان زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں؟
۷۔ وہاں ذی روح مخلوق کا وجود ہے یا نہیں؟
۸۔ کائنات کا سفر کرنے کے ذرائع کیا ہیں؟
۹۔ یہ سفر انسان کب کرے گا؟
۱۰۔ کہاں تک یہ سفر ممکن ہے؟
۱۱۔ اس خلائی یا کائناتی دور کی تہذیب کیا ہوگی اور اس کا تمدن کیسا ہوگا؟
۱۲۔ اس دور کی انتہا کہاں ہوگی اور اس کے بعد کیا ہوگا؟

یہ ہیں وہ مسائل جن کا جواب اگر انسان کو پیشگی معلوم ہو تو وہ بیجا تذبذب اور بہت سی بے ضرورت کوششوں سے بچ جائے اور اس کی سعی کے لئے ٹھیک رخ متعین ہوجانے کی وجہ سے وقت، صلاحیت، محنت اور دولت ضائع نہ ہونے پائے۔ ان سوالوں کے

جواب قرآن وحدیث میں مفصل یا مجملاً، وضاحتاً یا اشارۃً آج سے تقریباً چودہ سوسال پیشتر جو کچھ دے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں جن کو سمجھ لینے سے انسان کو یہ اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ اسلام واقعی خالق کائنات کا نازل کیا ہوا دین ہے جو غیب اور شہادت کا، نیز ماضی اور حال و مستقبل سب کا علم رکھتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کو کب کس قسم کی ہدایتوں کی کس حد تک ضرورت ہے۔ پہلے ہم ان آیات واحادیث کو یکجا جمع کر دیں گے، پھر علیحدہ علیحدہ ان سوالوں کے جوابات کی وضاحت کریں گے۔

۱۔ الله خالق کل شئ وهو الواحد القهار (الرعد:۱۶) ''اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ تنہا غالب ہے۔''

۲۔ بديع السمٰوت و الارض (البقرہ:۱۱۷) ''آسمانوں اور زمین (کائنات) کا موجد ہے۔''

۳۔ الا يعلم من خلق (الملک:۱۴) ''سنو، جو پیدا کرے وہ جانتا ہے۔''

۴۔ ان ربكم الله الذى خلق السمٰوت و الارض فى ستة ايام ثم استوىٰ على العرش يغشى الليل النهار يطلبه حثيثاو الشمس و القمر و النجوم مسخرت بامره الا له الخلق و الامر تبرك الله رب العلمين۔ (اعراف:۵۴)

''بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے رات سے دن کو اس طرح کہ رات جلدی سے دن کو آ لیتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ہے ایسے کہ سب اس کے حکم کی وجہ سے مسخر ہیں۔ سنو پیدا کرنا اسی کا کام ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے، بڑی برکت والا ہے اللہ ساری کائنات کا رب۔''

۵۔ فسبحان الذى بيده ملكوت كل شئ (یٰس:۸۳)

''پس پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں پوری کائنات کی حکومت ہے۔''

۶۔ لا تبديل لخلق الله (الروم:۳۰) ''اس کی پیدائش یا فطرت کو بدلا نہیں جا سکتا''

۷۔ لا مبدل لكلماته (الانعام:۱۱۵) ''اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے''

۸۔ ان الامر كله لله (ال عمران:۱۵۴) ''حکم سب کا سب اللہ ہی کے لئے ہے''

۹۔ يخلق مالا تعلمون (النمل:۸) ''وہ پیدا کرے گا جو کچھ کہ تم نہیں جانتے ہو''

۱۰۔ ولدينا مزيد (ق:۳۵) ''اور ہمارے پاس مزید ہے (اور زیادہ)''

۱۱۔ يوم تبدل الارض غير الارض و السمٰوت (ابراھیم:۴۸)

''جس دن کہ بدل دی جائے گی زمین دوسری زمین سے اور سب آسمان بھی''

۱۲۔ احصى كل شئ عددا (الجن:۲۸) ''اس نے ہر چیز کی تعداد کو شمار کر رکھا ہے''

۱۳۔ الا انه بكل شئ محيط (السجدہ:۵۴) ''سن لو وہ ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے''

۱۴۔ كل شئ عنده بمقدار (الرعد:۸) ''ہر چیز اس کے نزدیک خاص مقدار میں ہے''

۱۵۔ لا تقف ما ليس لك به علم (بنی اسرائیل ۳۶) ''جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ''

۱۶۔ سخر لكم ما فى السمٰوات و الارض جميعا منه (الجاثیہ:۱۳)

''اس نے مسخر کر رکھا ہے تمہارے لئے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے۔''

۱۷۔ يا معشر الجن و الانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوات

و الارض فانفذوا: لا تنفذون الا بسلطن (الرحمٰن:۳۳)
''اے گروہ جن وانس اگر تم سے ہوسکے تو آسمانوں اور زمین کی حدود سے باہر نکل جاؤ۔ تم بغیر سلطان کے نہیں نکل سکتے۔''
۱۸۔ سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی..................انه هو السمیع البصیر۔ (بنی اسرائیل:۱)
''پاک ہے وہ جس نے رات کے مختصر حصے میں سیر کرائی اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک..............بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''
۱۹۔ اینتنا فی الافاق و فی انفسهم حتی یتنبین لهم انه الحق (حم السجدہ:۵۳)
''عنقریب ہم دکھائیں گے ان کو اپنی نشانیاں ان کے نفس میں بھی اور (ان کے نفس سے باہر) کائنات میں بھی یہاں تک ان پر واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔''
۲۰۔ لترکبن طبقا عن طبق (انشقاق:۱۹) ''یقیناً تم سواری کرو گے طبق بہ طبق''
۲۱۔ ومن اینه خلق السموت و الارض و مابث فیهما من دابة وهو علی جمعهم اذا یشاء قدیر (الشوریٰ:۲۹)
''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور جو کچھ ان دونوں میں دابہ کے قسم سے اس نے پھیلا رکھا ہے، اور وہ جب چاہے ان کو اکٹھا کر لینے پر قادر ہے۔''
۲۲۔ والله خلق کل دابة من ماء (النور:۴۵) ''اور اللہ نے پیدا کیا ہے ہر دابہ کو پانی سے۔''
۲۳۔ فلا اقسم بالشفق و الیل وما وسق و القمر اذا تسق لترکبن طبقا عن طبق۔ (انشقاق:۱۶تا۱۹)
''چنانچہ میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے یقیناً تم سواری کرو گے طبق بہ طبق''
۲۴۔اذالسماء انشقت.........واذاالارض مدت و القت ما فیها وتخلت (انشقاق:۱۔۴)
''جب کہ آسمان پھٹ پڑے گا .... اور زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کہ اس میں ہے سب باہر اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔''

اس کائنات سے متعلق سب سے پہلی بات تو اسلام یہ بتاتا ہے کہ یہ ازلی اور ابدی نہیں ہے، یعنی یہ نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ اسی طرح رہے گی۔ بلکہ پہلے ایک اللہ کے سوا کوئی چیز بھی نہیں تھی، ساری چیزیں معدوم محض تھیں۔ ان کو اس عدم محض سے وجود میں اور پھر ایک خاص تدریج کے ساتھ موجودہ شکل میں اللہ ہی نے لایا ہے، وہی ہر شئے کا بدیع ہے، یعنی کسی سابق نمونے کے بغیر سب کو جامۂ وجود اسی نے بخشا ہے۔ ''بدیع السمٰوت و الارض'' وہی سب کا خالق ہے ''خالق کل شئ''

دوسری بات اسلام یہ بتاتا ہے کہ چونکہ سب کچھ اللہ ہی کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئی ہے اور کوئی چیز از خود وجود میں نہیں آئی ہے اس لئے تمام چیزوں کا اور ان کی تمام جزئی وکلی خاصیتوں کا اس کو مکمل علم ہے۔ اس کے علم سے کچھ بھی باہر نہیں ہے، اس لئے تمام چیزیں اس کی تابع فرمان ہیں۔ پوری کائنات میں اسی کا حکم، اسی کا قانون اور اسی کا فیصلہ نافذ ہے اور نافذ ہوسکتا ہے۔ اس لئے

ساری کائنات ایک خدا کی اور ایک ہی مملکت ہے۔ "فسبحن الذی بیده الملکوت کل شئ" اور اس لئے پوری کائنات ایک ہم آہنگ کل (Harmonious whole) ہے جس کا کلی مزاج ایک ہے اور جو یکساں قانون اسباب وعلل کی پابند ہے۔ چنانچہ اس حقیقت پر ایمان وہ روشنی تھی جس نے مسلم سائنسدانوں کو یہ سمجھایا کہ وہ کیمیا اور دوسرے شعبوں میں نظم وربط اور تسلسل کو دریافت کریں۔ اور اسی دریافت کے نتیجے میں عمل اور ردعمل کے فطری اصول معلوم ہوئے اور فارمولے وضع کیے گئے اور اس طرح جدید سائنس (Modern Science) وجود میں آئی۔

تیسری بات وہ یہ بتاتا ہے کہ چاہے ہم انسانوں کی محدود قوت ادراک کی وجہ سے یہ کائنات لامحدود نظر آئے، مگر حقیقتاً یہ محدود، جس کو اللہ نے اپنے علم اور اپنی قدرت سے احاطہ کر رکھا ہے۔ "الا انه بکل شئ محیط" اور جس کی ہر چیز اس کے نزدیک متعین مقدار اور خاص شمار کے اندر ہے۔ "وکل شئ عنده بمقدار" "واحصی کل شئ عددا" لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ پیدا کیا جا سکتا تھا بس پیدا کیا جا چکا اور اب اللہ کچھ مزید پیدا نہیں کر سکتا اور اس کی قوت تخلیق (Creative Power) ختم ہوگئی۔ نہیں، اس کی ذات بابرکت ہے "تبارك الله رب العلمین" چنانچہ آئندہ بھی وہ نئی نئی چیزیں پیدا کرے گا جس کا آج انسان کو علم اور اندازہ بھی نہیں ہے۔ "ویخلق مالا تعلمون" نئی تخلیق کا یہ کام موجودہ نظام کائنات میں بھی وہ کرے گا اور خاص کر آئندہ وجود میں آنے والے نظام کائنات میں کرے گا جس کو آخرت کہتے ہیں جو عملاً برپا ہونے والا ہے اور جو کلی تبدیلی کے ساتھ برپا ہوگا۔ جب یہ سارے آسمان وزمین یعنی پوری کائنات بدل ڈالی جائے گی "یوم تبدل الارض غیر الارض و السمٰوت" پھر اس نئے ترقی یافتہ نظام کائنات کے وجود میں آنے کے بعد بھی عمل تخلیق کا سلسلہ رک نہیں جائے گا۔ بلکہ انسان اپنی وسیع ترین قوت فکر سے جو کچھ بھی سوچ سکے گا وہ سب اس کو وہاں ملے گا اور اس پر اللہ کی طرف سے اس کے علاوہ مزید بھی عطا ہوگا۔ "ولدینا مزید"۔

چوتھی بات وہ یہ بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ ہم انسانوں ہی کے لئے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ساری کائنات اپنی مجموعی تاثیر کے ذریعے ہمارے ارادے اور کوشش کے بغیر ہم کو فائدہ پہنچانے میں لگی ہوئی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ نے اپنی خلافت (Vice gerency) سے ہم کو نوازا ہے، اس لئے کائنات کے اندر اپنی صوابدید (Initiative) سے کام لے کر کسی حد تک تصرف کرنے کا اختیار اور قدرت بھی اس نے ہم کو دیا ہے۔ یہ قدرت اگر ایک طرف فطرت کے اٹل قوانین سے محدود کر دی گئی ہے، (لا تبدیل لخلق الله : لا مبدل بکلماته: ان الامر کله لله) تو دوسری طرف کائنات کی آخری وسعتوں تک وسیع بھی کی گئی ہے۔ "وسخر لکم ما فی السمٰوت و ما فی الارض جمیعا منه"

اپنی صوابدید سے کام لینے کی یہی استعداد جب اندر سے زور لگاتی ہے تو انسان اپنے اپنے رجحان کے مطابق کائنات اور زندگی کے مختلف میدانوں میں فکر وعمل کی جولانی دکھاتا ہے۔ اس کی اس جولانی کے لئے اس کے فکر وعمل کی اگر تربیت نہ کی جائے، اس کے لئے کوئی نہج متعین نہ کیا جائے اور اس کو نشانات راہ بتا نہ دئے جائیں تو لامتناہی جہتوں (Infinite Dimensions) والی اکائیوں پر مشتمل اس عظیم کائنات میں پراگندگی کے سوا انسانی کوششوں کا کوئی دوسرا انجام سامنے نہ آسکے۔ اسی لئے اللہ نے ایک مشفق ترین مربی (رب) کی حیثیت سے فرمایا کہ کسی ایسی چیز کے پیچھے مت پڑ جس کا تجھے حقیقی علم نہ ہو۔ "لا تقف ما لیس لک به علم" اور چونکہ مخلوقات میں سے کوئی بھی لامتناہی جہتوں پر مطلع ہو کر کسی چیز کے حقیقی علم کا احاطہ کر نہیں سکتا اس لئے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا تقاضہ یہ بھی ہوا کہ وہ اپنی تشریعی (Legal) علوم کی کتاب اور معلم کے ذریعہ سے دوسرے اعلیٰ علوم کے سنگہائے

میل کی بھی نشاندہی کر دے۔

اس اندرونی استعداد کے زور کے نتیجے میں انسان نے خلا کی تسخیر کی طرف پہلا قدم رکھ دیا ہے۔ یہ خلا کائنات کی حدود سے باہر نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے باہر عدم محض ہے۔ لہذا خلا (Space) بہ معنی جگہ بھی مخلوق ہے اور محدود بھی، ان حدود کے اندر خلوء ناممکن محض ہے۔ خلا کا لفظ خلوء محض کے لئے نہیں استعمال ہوتا ہے، بلکہ حدود کائنات کے اندر کے وہ حصے جن میں مادی اشیاء نہیں پائی جاتی ہیں، خلا کہلاتے ہیں۔ مادی اشیاء کے نہ پائے جانے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ وہاں کچھ ہے ہی نہیں۔ کم از کم طبیعی توانائیوں، ان کے باہمی تعامل (Inter action) اور عمل و ردعمل (Actions & Reactions) اور ان کے اثرات سے تو وہ خلا بالکل اٹا ہوا اور بھرا ہوا ہے۔ لہذا Space میرے نزدیک کائنات ہی کا ایک جزء ہے۔

یہ خلا چونکہ عدم محض نہیں ہے بلکہ خود ایک وجود ہے اور موجودات سے بھر پور ہے، اس لئے اس کے حدود کے اندر کہیں بھی انسان کا جانا امکان سے باہر نہیں ہے۔ لیکن اس خلا کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ جو ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے جس کے اندر مادی اور طبیعی اشیاء پائی جاتی ہیں، اور اس کو ہم طبیعی خلا، اندرونی خلا، نزدیکی خلا، متصل خلا، وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔ اور خلا کا دوسرا حصہ وہ ہے جو اس طبیعی خلاء کے ماوراء ہے جہاں ماوراء طبیعیات اشیاء پائی جاتی ہیں۔ اس خلا کو ہم بیرونی خلا (Outer Space)، ماوراء طبیعی خلا (Metaphysical Space)، بعید خلا (Distant Space)، یا روحانی خلا (Spiritual Space) کہیں گے۔ انسان جا تو سکتا ہے اس دوسرے خلا میں بھی مگر وہاں جانے کے وسائل اس کو یہاں میسر نہیں آسکتے۔ اس کا پاسپورٹ اور ویزا (سلطان) اور وہاں تک سفر کے ذرائع حمل و نقل وہیں سے درآمد ہونے پر ہی وہاں جانا ممکن ہو سکتا ہے۔

یا معشر الجن و الانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار
السمٰوت و الارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان

(اے گروہ جن و انس اگر تم سے ہو سکے تو آسمانوں اور زمین کی حدود سے نفوذ کر کے نکل جاؤ۔ تم بغیر سلطان کے نہیں نکل سکتے)

رہا پہلے حصۂ خلا میں سفر کرنا تو اس کا اذن (Sanction) اللہ کی طرف سے اسے ملا ہوا ہے جبکہ سلبی انداز میں اس نے یہ کہا کہ آسمانوں اور زمین کی حدود سے تم باہر نہیں جا سکتے اور ایجابی طور پر اس نے یہ کہا:

سخر لکم ما فی السمٰوت و ما فی الارض جمیعا منہ

(اس نے تمہارے لئے تابع کر رکھی ہے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں)

اس اذن (Sanction) کے اشارے کا ہی کرشمہ تھا کہ چاند میں جانے کا تذکرہ افسانوی انداز ہی میں سہی جابر بن حیان ہی کے زمانے میں یعنی چھٹی صدی ہجری میں شروع ہو گیا تھا۔ اور ابن مقنع نے تو ایک نقلی چاند بنا بھی دیا تھا جو ایک میدان کے ایک کنارے کے کنویں سے نکل کر دوسرے کنارے کے کنویں میں ڈوب جاتا تھا اور شب بھر اس میدان کو روشن رکھتا تھا۔ (بحوالہ غیاث اللغات وقران السعدین)

اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ کائناتی سفر میں انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ دو انسان بشر ہوتے ہوئے بھی اپنی مادی زندگی کے ساتھ سفر کر بھی چکے ہیں۔ ایک تو حضرت عیسیٰؑ ہیں جن کو اللہ نے مکمل جسمانی وجود کے ساتھ اوپر اٹھا لیا اور اب تک وہ وہیں زندہ ہیں اور اخیر زمانے میں (جو بقرینۂ غالب اب بہت قریب آ گیا ہے، اتنا قریب کہ محض چند برسوں کی بات معلوم ہوتی ہے) وہ دوبارہ اسی زندگی کے ساتھ ہمارے درمیان اتر کر آنے والے ہیں۔ اور دوسرے حضرت محمد ﷺ ہیں، جو جامہ بشری میں خلا کے دونوں حصوں کا سفر کر

کے زندہ سلامت واپس تشریف لے آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے یہ کائناتی سفر نہ تو اپنے ارادے اور کوشش سے کیا اور نہ ہی اس کے لئے مادی اسباب فراہم کئے۔ جو کچھ ہوا وہ فوق الفطری طریقے پر ہو گیا، جس سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ فوق الفطری طور پر نہ تو ہمارے لئے ذرائع حمل ونقل فراہم ہوں گے اور نہ وسائل زندگی۔

لیکن اسلام اپنی اس بات کو بنیادی اہمیت دیتا ہے کہ انسان کو اس طبیعیاتی کائنات کے ماوراء کائنات میں جانا ہی ہے۔ اور وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس عالم ہست و بود میں جو کچھ کام اور جو تغیرات ہوتے ہیں، تدریج کے ساتھ (درجہ بدرجہ) ہوتے ہیں۔ تو اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ طبیعیاتی کائنات اسے عبور کرنا ہے، یعنی زمینی دور کے بعد خلائی یا کائناتی دور میں یا بالفاظ دیگر طبیعی خلا کے دور میں اسے داخل ہونا ہے، جس کی تکمیل کے بعد ہی وہ ماوراء الطبیعی دور میں داخل ہو سکے گا۔ لہذا اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس طبیعی خلا کے دور کے خدوخال اور راہ ونشانات راہ کی نشاندہی کر دے۔

چنانچہ سب سے پہلے یہ مسئلہ کہ خلا میں تو ہم جائیں، مگر وہاں ہماری طرح مادی مخلوق بستی بھی ہے یا نہیں کہ ہم وہاں جا کر زندہ رہ سکیں، اس کا جواب واضح طور پر وہ دے چکا ہے (جب کہ ہمارے سیکولر ماہرین علوم اب تک اس سلسلے میں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں) کہ وہاں ہماری طرح مادی مخلوق بالفعل موجود ہے اور ایک ہی جگہ نہیں، بلکہ بہت سے مقامات پر موجود ہے۔ ومن اٰیتہ خلق السمٰوت و الارض وما بث فیھما من دابۃ وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں دابہ پھیلے ہوئے ہیں اور اللہ جب چاہے گا ان سب کو اکٹھا کر لینے پر قادر ہے۔ دابہ کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ وہ حیاتیاتی مخلوق (Biological Beings) ہے۔ چنانچہ خلا میں یا کائناتی سفر پر انسان کا جانا اسلام کے نزدیک ایسا قطعی مسئلہ تھا کہ اس نے اس بنیادی سوال کا جواب بھی ساتھ ہی ساتھ دے دیا کہ اگر انسان کائنات کے دوسرے گوشوں میں، خواہ خلا میں یا کسی دوسرے ستارے یا سیاروں میں، پہنچ کر مر جائے تو اس کا حشر ونشر اور حساب وکتاب اس زمین پر کیسے ہوگا، جیسا کہ اس نے کہہ دیا کہ اللہ جب چاہے گا ان کو اکٹھا کر لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے فہم کے لئے بھی کچھ بہت بڑی بات نہیں ہے۔ ہم آسانی سے اس بات کا تصور کر سکتے ہیں کہ خلا کے کسی گوشے میں انسانی جسم کے اجزاء کو شہابوں کے ساتھ بھی زمین پر پہنچایا جا سکتا ہے، یا قیامت کے وقت جب سارا ہی کارخانہ توڑ پھوڑ دیا جائے گا ان ذروں کو دنیا کے ذروں کی طرف منجذب بھی کیا جا سکتا ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں سفر کرنے اور وہاں ہمارے زندہ رہنے کے امکان کا علم ہو جانے کے بعد ہمارے اندر خواہش کے بعد ہمت کو بھی انگڑائی لینا چاہئے۔ مگر نری ہمت سے تو کچھ ہو نہیں سکتا، اس کے لئے تو اسباب ووسائل کا مہیا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اگر کائناتی سفر اور اس سفر میں زندہ رہنا ہمارے لئے ممکن ہے اور اس کی طلب بھی ہمارے اندر پیدا کی گئی ہے تو یقینی بات ہے کہ اس کے ذرائع ووسائل بھی پیدا کئے گئے ہوں گے۔ لہذا اب ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اسباب کہاں ہیں اور کس طرح میسر آ سکتے ہیں۔ ان معلومات کو فراہم کرنے میں بھی اسلام نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، بلکہ دراصل یہی کچھ بتانے کے لئے واقعۂ معراج اجمال اور تفصیل کے ساتھ قرآن اور حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ معراج کا یہ واقعہ دراصل کائناتی دور (Space Age) کی ایک علامت (Symbol) ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس واقعے پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ یہاں پر میں اس واقعے کی صرف ان کڑیوں کو بیان کروں گا جن کا تعلق میرے اس موضوع سے ہے، یعنی کائناتی سفر اور دور سے متعلق انتہائی ضروری رہنمائی فراہم کرنا۔

قرآن کہتا ہے ''پاک ہے وہ ذات جس نے رات کے ایک مختصر سے حصے میں اپنے بندے کو سیر کرائی مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک۔۔۔۔۔۔ بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے''۔ اس کے مفہوموں میں سے ایک

مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حیرت انگیز کام یہ بتاتا ہے کہ وہ سمیع اور بصیر ہے۔ یعنی سمیع و بصیر ہونے کی وجہ سے اس نے یہ کام کیا۔ یہ دو صفت سننے اور دیکھنے کی وہ صفت ہے جو اس نے انسان کو بھی عطا کی ہے اور انہیں بنا پر اس کو ذمہ دار مخلوق بنایا ہے انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا (سورہ دہر:۲) (ہمیں نے انسان کو پیدا کیا حقیر سے نطفے سے تاکہ ہم اسے آزمائیں پس ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا) سمع اور بصر یہی وہ دو طاقتیں ہیں جن کے ذریعہ انسان اعلیٰ سائنسی علوم (Advance Sciences) تک رسائی پاتا ہے، اس غرض کے لئے یہ دونوں طاقتیں الگ الگ استعمال ہوتی ہیں اور یکجا بھی۔ لیکن خلائی دور کے لئے جس قسم کی اعلیٰ سائنسی معلومات کی ضرورت ہوگی وہ ان دونوں طاقتوں کے علیحدہ علیحدہ استعمال سے نہیں، بلکہ متحدہ استعمال سے حاصل ہوسکیں گی اور اسکے بعد ہی وہ ذرائع میسر آسکیں گے جو ان کو کامیاب خلائی تمدن کے لائق بناسکیں۔

مسجد اقصیٰ تک سیر کا تذکرہ کر کے قرآن خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد وہ اس واقعے کی دوسری کڑی کا ذکر دوسرے مقام پر یوں کرتا ہے۔ ''اور بے شک اس نے (رسول اللہ ﷺ نے) اس کو (جبرئیلؑ کو) دوسری بار اترتے ہوئے دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جہاں جنت الماویٰ ہے جبکہ اس سدرۃ پر چھائی ہوئی تھی ایک چیز جو چھائی ہوئی تھی، نظر نہ تو اچٹی اور نہ چوندھیائی۔ بے شک اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ سفر مسجد اقصیٰ پر ختم نہیں ہوگیا، بلکہ ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ تک دراز ہوا بلکہ مزید اوپر اس سفر کا دوسرا سلسلہ بھی چلا جہاں سے واپسی پر اترتے ہوئے حضور ﷺ نے جبرئیل امین کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس موجود پایا۔ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے کے سلسلے کو علیحدہ سے بیان کرنے کے بعد اس موقع پر اپنی کسی صفت کا تذکرہ نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا اشارہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سفر خالص فوق الفطری ذرائع سے ہی ہوسکتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر بھی ہے کہ خلا میں یہ میسر نہیں آسکتے، لہٰذا ان کی نشاندہی کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔

قرآن کے اس اجمالی بیان کی تفصیل ہم کو حدیث میں کچھ اس طرح ملتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ حطیم (کعبہ) میں لیٹے ہوئے تھے کہ ایک فرشتہ آیا۔ آپؐ کے سینے اور شکم کو چاک کیا، سونے کا طشت لایا۔ زمزم کے پانی سے آپؐ کے دل اور پیٹ کو دھو کر پھر حسب معمول کر دیا گیا۔ اس میں ایمان اور حکمت کو بھرا گیا، سواری کا جانور لایا گیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا، اس کا رنگ سفید تھا، اس کا چہرہ آدمی کے چہرہ جیسا تھا، اس کا نام ''براق'' تھا، اس کا قدم حد نظر تک اٹھتا تھا، اس پر آپؐ کو سوار کیا گیا۔ پھر جبرئیلؑ آپؐ کو لے کر چلے۔ ساتوں آسمانوں کے دروازے یکے بعد دیگرے کھلوائے گئے اور ان سے ہوتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ کی طرف آپؐ لے جائے گئے۔ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے۔ آپؐ نے دیکھا کہ سدرۃ المنتہیٰ کے پھل یعنی بیریاں مقام حجر کے مٹکوں کے برابر ہیں اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں جیسے۔ آپؐ نے وہاں پر چار نہریں دیکھیں۔ دو پوشیدہ اور دو ظاہر۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ دو طرح کی نہریں کیسی ہیں؟ بتایا گیا کہ دو پوشیدہ نہریں بہشت کی نہریں ہیں اور دو ظاہر نہریں دنیا کی۔ سدرۃ المنتہیٰ کو جو چیز ڈھانکے ہوئے تھی وہ سونے کے پروانے تھے۔ زمین کی کوئی چیز اس (سدرۃ المنتہیٰ) تک پہنچ سکتی ہے۔ اس سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنت الماویٰ ہے جس کی چہار دیواری چاندی اور سونے کی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ یہ واقعہ قمری مہینے کی ستائیسویں شب میں پیش آیا۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد مکہ میں مسلمانوں کا رہنا ناممکن ہوگیا اور پھر اس کے کچھ دنوں بعد مکہ سمیت پورے عرب پر اسلام ہی اسلام چھا گیا، یعنی تکوینی حکومت کے علاوہ سیاسی حکومت بھی صرف اللہ کی رہ گئی۔ یہ تفصیلات میرے نزدیک آرائش بیان

کے لئے نہیں ہیں، بلکہ اس میں خلائی سفر اور خلائی دور سے متعلق تکنیکی (Technical) نہیں بلکہ ضروری علمی رہنمائی (Scientific Guidance) مہیا کی گئی ہے، جو حسب ذیل ہے:

☆ جس طرح آدمی زمین پر معمولاً رہتا ہے اور سفر کرتا ہے اسی حالت میں وہ بس اٹھے اور خلائی سفر پر روانہ ہو جائے، یہ ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لئے اس کو تیار کیا جانا چاہئے۔

☆ بہت ممکن ہے کہ اس دور میں بالآخر ایسے ذرائع بھی دستیاب ہو جائیں جن سے آدمی کے اندر ایسی قوت مدافعت (Resistance) پیدا کر دی جائے کہ خاص قسم کے خلائی لباس اور بھاری بھر کم خارجی تدبیروں کے بغیر خلائی اثرات کا مقابلہ کر سکے۔

☆ نبی ﷺ کو چونکہ خلا کے اس حصے میں بھی جانا تھا جو ماوراء طبیعیات ہے اس لئے آپریشن کے لئے جو طشت لایا گیا وہ سونے کا تھا۔ کیونکہ کائنات کے اس حصے میں سونے کو زرِ مبادلہ (Medium of exchange) کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ وہاں اس کا مقام دھاتوں اور اینٹ پتھر کا ہے۔

☆ شاید خلائی سفر کے لائق بنانے کے لئے سونے کے کیمیاوی یا ایٹمی خاصیت کو بھی کوئی دخل ہو۔

☆ اس دور یعنی خلائی دور میں آدمی کے نازک اور پیچیدہ آپریشن کئے جائیں گے یہاں تک کہ دل و دماغ کا آپریشن بھی ہونے لگے گا۔

☆ انسان کی نفسیاتی تطہیر (Brain washing) کی جائے گی۔

☆ انسان کے اندر علم اور حکمت کو داخل بھی کیا جا سکے گا۔

☆ اس دور میں پانی کی وہ خاصیتیں دریافت ہوں گی جن کا علم آدمی کو پہلے نہ رہا ہوگا۔ اس کی غذائی قدر و قیمت، اس کی حیات آفریں صلاحیت اور اس کی تطہیری قوتوں کا ادراک انسان کو ہوگا۔

☆ طبیعی خلا کے اندر سفر کرنے کے لئے آدمی کو انتہائی تیز رفتار سواری کی ضرورت ہوگی۔ ایسی تیز رفتار سواری ایندھن (Fuel) سے کسی طرح نہیں چل سکتی۔ اس کے لئے برق (Electricity) سے کام لینا ہوگا۔

☆ وہ بجلی ہماری یہ بجلی بھی نہیں ہوگی جس سے ہم اب تک واقف ہو سکے ہیں۔ کیونکہ ایسی وسیع و عریض کائنات کا سفر کرنا معمولی بجلی اور روشنی کی رفتار سے بھی ممکن نہیں ہے جو اگر چہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے، بلکہ وہ بجلی اور بھی بہت زیادہ مبالغہ کی حد تک طاقتور ہوگی اور ساتھ ہی تیز رفتار بھی۔ اس کو آپ فوق البرق (Super Electricity) کہہ لیجئے۔

☆ معراج کے اس واقعہ سے بھی اور قرآن و حدیث کے دوسرے قطعی اشارات سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات میں روشنی اور بجلی سے بھی زیادہ تیز رفتار قوتیں موجود ہیں۔

☆ انسان کو چاہئے کہ اپنی مہم پسند امنگ سے کام لے اور روشنی اور بجلی کی رفتار کو آخری چیز سمجھ کر مطمئن نہ ہو بیٹھے۔

☆ معراج کی سواری کا نام براق تھا اور اس کا رنگ سفید بتانے کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ نہ صرف یہ کہ سفید تھی بلکہ برق یعنی بجلی کی سواری تھی اور اس کا رنگ سفید چمکیلا بھی تھا۔ یعنی بہت زبردست طور پر کائناتی تابکاریوں سے محفوظ رکھنے والی (Radiation Proof) تھی۔

☆ چنانچہ شاید اسی وجہ سے جنتوں میں جو ماوراء الطبیعیاتی خلاء میں ہیں انسانوں کو جو لباس پہنائے جائیں گے وہ سبز استبرق کے ہوں گے۔ استبرق کا مادہ بھی برق یعنی بجلی ہے۔ استبرق میں جو مفہوم پایا جاتا ہے، وہ کچھ یوں ہے کہ وہ کپڑا جو بجلی ہو جانا چاہتا ہے۔ ہم لوگ کسی درجے میں اس مفہوم کو زرق برق سے ادا کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ کپڑا بجلی کی طرح چمکدار ہوگا۔ مگر بخلاف طبیعیاتی خلا کے وہاں تابکار شعاعیں نہ ہونگی جن کی مدافعت سفید رنگ کرتا ہے۔ وہاں جو شعائیں ہیں ان سے حفاظت سبز رنگ کے ذریعے ہوتی ہے۔

☆ براق جانور تھا اور اس کا چہرہ آدمی کے چہرے جیسا تھا بتا کر یہ رہنمائی کی گئی ہے کہ اپنی خلائی سواریوں کو عام سواریوں جیسی مت بنانا جو محض انجن اور دوسرے پرزوں سے چلتی ہیں اور اندھی بہری ہوتی ہیں۔ بلکہ کم از کم جانوروں کے جیسے احساسات رکھتی ہو اور اس کے اندر انسانی دماغ جیسا دماغ ہو جو اس کو چلائے بھی اور کنٹرول بھی کرے۔

☆ خلائی سفر میں آسمان کا مسئلہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ سائنسدانوں کے خیال میں آسمان کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ سائنسداں جو صرف ان چیزوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں جو ان کے ادراک اور مشاہدے میں آ جائیں۔ وہ آسمان کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ ابھی تک ان کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی ہے کہ آسمان ان کے احاطہ ادراک و مشاہدات میں آ سکے۔ ورنہ آسمان کا وجود ایک حقیقت ہے اور اس کے طبقات میں بہر حال انسان کو گزرنا ہی ہوگا۔ اس کے سلسلے میں اسلام جو اشارات دیتا ہے وہ یہ ہیں کہ آسمان ابتداءً دھواں تھا، پھر اللہ نے ان کی طرف توجہ کی، اس کو سات طبقوں میں موزوں اور ہموار کر دیا۔ اس موزونیت اور ہمواریت کے بعد اس کی ماہیت کیسی ہے اس سلسلے میں وہ بتاتا ہے کہ اس میں دروازے ہیں اور یہ کہ اگر اس کا ٹکڑا گرنے والا ہو اور اس کو آدمی دیکھ لے تو کہتے ہیں کہ یہ تہہ بہ تہہ جما ہوا بادل ہے۔ ان اشارات سے جو کچھ میری سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ آسمان ابتداءً گیس کی شکل میں تھا جس میں ترتیب نہیں ہوتی اور اب وہ سیال کی شکل میں ہے جس کے ذرات میں ترتیب ہوتی ہے۔ البتہ گرنے سے پہلے اس کا سیالی حالت سے انجمادی حالت میں بدل جانا ضروری ہے۔ آسمانوں کے سیالی حالت میں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ اس میں نفوذ کر جانا آسان ہے۔ وہاں کے طبیعی حالات کیسے ہیں اس کا ہمیں ابھی علم نہیں ہے۔ یہ علم حاصل ہوگا مگر اس وقت جب ہم آسمان کے خارجی وجود سے واقف ہو چکیں گے۔ چونکہ یہ علم ہمیں تجربات کے ذریعہ حاصل ہو جائے گا، اس لئے وحی نے اس سلسلے میں رہنمائی بہم پہنچانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔

☆ اس طرح آسمانوں سے گزر کر خلائی سفر سدرۃ المنتہیٰ پر ختم ہوگا۔ سدرہ جھر بیر کو کہتے ہیں جو کھانے کا ایک معمولی سا پھل ہے۔ منتہیٰ کے معنی ہیں جس پر کوئی چیز ختم ہو۔ سدرۃ المنتہیٰ کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ ایک طرف تو طبیعیاتی خلا کی یہ آخری حد ہے اور دوسری طرف خلائی دور کی بھی آخری حد یہی ہے۔ معراج کے اس واقعہ میں کہ رسول اللہ ﷺ کو براق کے ذریعہ سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا، یہ اشارات دئے گئے ہیں کہ حضورؐ کی نبوت کا دائرہ کار مکان (Space) کے لحاظ سے پوری طبیعی کائنات ہے اور زمان کے لحاظ سے خلائی دور

(Space Age) کا وہ مرحلہ ہے جب انسان ایٹمی توانائیوں کے تعمیری استعمال کے ذریعے اپنی غذا کی تمام ضروری اجناس بہت بڑی بڑی پیدا کرنے لگے گا۔ مثلاً گیہوں اتنا بڑا کہ جیسے چھوہارا۔ انار اتنا بڑا کہ ایک انار کے عرق سے ایک کنبہ سیراب ہو جائے اور اس کے چھلکے کی ایک چھتری سی بن جائے۔ یہاں تک کہ وہ ان سے فارغ ہو کر دوسرے درجہ کی اجناس کی طرف متوجہ ہوگا اور ان کو اسی طرح بڑی بڑی پیدا کرنے لگے گا تا آنکہ بالآخر جھربیر جیسے غیر ضروری پھل بھی مٹکے کے برابر پیدا کیے جانے لگیں گے۔ جب ایسی جھربیر وجود میں آ جائے گی تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ اب خلائی دور کی انتہا ہو گئی۔ اور اب ماورائے طبعیاتی دور کا آغاز ہونا چاہئے۔

☆ اس سفر کی ابتدا سے انتہا تک براق ہی کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ وہی فوق البرق (Super electricity) جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے وہی اس دور کی تمام ترقیوں کا ذریعہ ہوگی۔ یہیں سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ چونکہ اس دور کے بعد طبیعی توانائیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، اس لئے لامحالہ یہ ایٹم کے ذرات کو توڑنے کے بعد الکٹرون اور پروٹون کو بھی توڑ کر مزید چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑوں کا سلسلہ جہاں تک چلتا ہے ان کو توڑنے سے ہی (Super electricity) حاصل ہو سکے گی۔ اس لئے کہ مادہ کے ٹکڑے کو توڑنے سے طبیعی دور کا آغاز ہوا۔ اور جب طبیعی توانائیوں کے ماخذ کے توڑنے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور اب کوئی چیز توڑنے کی نہیں بچ رہے گی، بالفاظ دیگر ارض (Dimensions) ختم ہو جائے گا اور صرف جوہر (Essence) رہ جائے گا تو ماورائے طبیعی دور کا آغاز ہوگا۔

☆ سدرۃ المنتہیٰ کو سونے کے پروانے ڈھانکے ہوئے تھے اور سدرہ کے قریب جنت الماویٰ ہے جس کی چہار دیواری کی اینٹیں سونے اور چاندی کی ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں سونے اور چاندی کی قدر و قیمت ختم ہو جائے گی۔ یہ انقلاب میرے خیال میں اس طرح آئے گا کہ Nucleus کو توڑنے کے بعد پھر نظام شمسی کی طرح پر یا Nuclear نظام کی طرح مزید چھوٹا نظام دریافت ہوگا۔ اور اس طرح ہر چھوٹے نظام کو توڑنے پر اس سے زیادہ چھوٹے نظام کی دریافت کا سلسلہ ایک خاص حد تک چلے گا۔ جس کے نتیجے میں ایک طرف تو Super Electricity حاصل ہوگی اور دوسری طرف انسان اس بات پر قادر ہو جائے گا کہ مادہ کے چھوٹے سے چھوٹے اجزائے ترکیبی کو حسب خواہ جوڑ سکے۔ پھر انسان کے لئے دھاتوں کی تبدیلیٔ ماہیت بالکل معمولی سا کام ہو جائے گا اور اس طرح سونے اور چاندی کی قیمت لوہے اور اینٹ سے زیادہ نہیں رہ جائے گی۔

☆ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دو دنیوی اور دو جنتی نہریں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مٹکے کے برابر جھربیری پیدا ہونے کا زمانہ دنیوی دور اور اخروی دور کا سنگم ہے، وہیں سے اخروی زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگیں گے۔

یہاں تک کہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ آخرت کی جو تصویر اسلام نے پیش کی تھی جس کا دنیا پرست لوگ مذاق اڑایا کرتے تھے، وہ دنیا والوں ہی کے ہاتھوں اب ممکن بلکہ یقینی نظر آنے لگے گی۔ اس دور کی تمدنی ترقی کا اجمالی اندازہ لگانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آنے والی آخرت کی زندگی کا جو نقشہ حدیثوں میں کھینچا گیا ہے اس کو سامنے رکھا جائے، اس سے

کسی حد تک یہ سمجھا جا سکے گا کہ آخرت کی ان ترقیوں سے پہلے جو کچھ ہو چکنا چاہئے وہ اسی طبیعی خلائی دور میں ہو چکے گا۔ اس لئے کہ کائنات میں تبدیلیاں تدریج کے ساتھ درجہ بدرجہ ہی ہوتی ہیں۔

آخرت یا ماورائے طبیعی دور (Metaphysical Age) کا مختصر سا تعارف قرآن وحدیث کی روشنی میں درج ذیل ہے:

☆ جنت کی وسعت آسمان وزمین کی وسعت جیسی ہے۔
☆ بعض جنت ساتوں آسمانوں اور زمین جیسی وسیع ہے۔
☆ جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لیے جنتی کا دل چاہے گا۔
☆ ایسی وسیع وعریض جنت کے جس گوشے کی چیز کو جنتی دیکھنا چاہے گا، اپنی جگہ سے دیکھ لے گا۔ جس بات کو سننا چاہے گا سن لے گا۔
☆ جنت کے جس مقام پر یا جس بلندی تک پہنچنا چاہے گا اس کا تخت آن واحد میں اسے پہنچا دے گا۔
☆ جنت کے بالا خانے ایسے بلند ہوں گے جیسے مغرب کے بعد اور فجر سے پہلے ظاہر ہونے والا روشن ستارہ۔
☆ کوئی جنتی خواہش کرے گا کہ وہ زراعت کرتا تو ہل جوتنے سے غلہ کے تیار ہو کر پہاڑی کی طرح انبار لگ جانے تک کے سارے مراحل ایک ساعت میں انجام پا جائیں گے۔
☆ اس دور میں انسان کی پانچوں قوتیں یعنی سننے، دیکھنے، چھونے، چکھنے اور سونگھنے کی قوتیں غیر محدود ہو جائیں گی۔ بس اتنا فرق ہوگا کہ ناپسندیدہ احساسات سے جنتی محفوظ رکھے جائیں گے اور پسندیدہ محسوسات سے جہنمی محروم کر دیے جائیں گے۔
☆ جہنم میں ایسے مشروبات ہوں گے کہ ان کا ایک ڈول زمین پر انڈیل دیا جائے تو ایک ذی روح زندہ نہ بچ سکے۔
☆ جہنمی کی جلد جب گل کر گر جائے گی تو فوراً دوسری نئی کھال اس کے جسم پر پیدا کر دی جائے گی۔ آخرت کی اس زندگی میں آدمی نہ بوڑھا ہوگا نہ مرے گا وغیرہ وغیرہ۔

ان مختصر سی تفصیلات سے یہ اندازہ لگانا اب مشکل نہیں رہا کہ اس دور کے آنے سے پہلے دنیا کے خلائی دور میں کس حد تک ترقی ہو چکنی چاہیے، چنانچہ وہ یہ ہیں۔

☆ انسانوں کے تمدن کو زمین کی تنگنائیوں سے نکل کر ساتوں آسمان تک وسیع ہو جانا چاہئے۔
☆ طبیعی خلا کے آخری حصے تک کے مناظر کو انسان دیکھ سکے اور آوازوں کو سن سکے۔
☆ اپنی خلائی سواریوں کے ذریعہ کائنات کی وسعتوں تک جا سکے، اگرچہ یہ سب کام آن واحد میں نہ ہو سکیں گے جس طرح کہ جنت میں ہوں گے۔
☆ حقیقی یا مصنوعی سیاروں کو اپنے خلائی بالا خانے یا مستقر بنا سکے۔
☆ ایک ہی ساعت میں نہ سہی چند ساعتوں میں وہ زمین میں بیج بو کر اس کا پھل کھا سکے۔
☆ اپنی منشاء کے مطابق پانی برسا سکے۔
☆ اپنے حواس خمسہ پر عائد حد بندیوں کو کسی نہ کسی حد تک توڑ سکے۔
☆ انسان ایسے مہلک زہر اور تیزاب گیس وغیرہ تیار کر سکے جو بڑی بڑی آبادیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔

☆ طبی اور جراحی سائنس اس حد تک ترقی کر جائے کہ کسی حد تک موت اور بڑھاپے پر قابو پالیا جا سکے اور مہلک سے مہلک زخم کو مندمل کر دیا جائے۔

چنانچہ اس دور کے تمدن کے سلسلے کی جو پیشین گوئیاں اسلام میں ہیں ان کا ایک سرسری تعارف درج ذیل ہے:

☆ قیامت نہ آئے گی جب تک کہ عرب کی زمین (جو ریگستان ہے) سبز وشاداب، باغ و بہار اور نہروں والی نہ بن جائے گی (مسلم)

☆ قیامت نہ آئے گی جب تک درندے آدمیوں سے باتیں نہ کر لیں گے اور جب تک چابک کی رسی کا پھندنا اور جوتی کا تسمہ اس سے کلام نہ کرلے گا یہاں تک کہ آدمی کی ران اس کو یہ بتائے گی کہ اس کے اہل وعیال نے اس کی عدم موجودگی میں کیا کیا ہے (ترمذی)

☆ زمین اپنے جگر کے ٹکڑوں کو نکال کر پھینک دے گی جو سونے چاندی کے ستونوں کے مانند ہوں گے۔۔۔۔۔ اور ان کی قدر و قیمت باقی نہ رہے گی (مسلم)

☆ قیامت نہ آئے گی جب تک مال ودولت اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ چاروں طرف پانی کے مانند بہتی پھرے گی (مسلم)

☆ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ زمانہ قریب نہ ہو جائے۔ یعنی سال مہینہ کے برابر اور مہینہ ہفتہ کے برابر اور ہفتہ ایک دن کے برابر۔ اس وقت دن ایک ساعت کا ہوگا اور ساعت آگ کا ایک شعلہ اٹھنے کے برابر ہوگی۔

☆ دجال کے سلسلے کی حدیث میں ہے کہ اس کا ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا، ایک دن ایک مہینہ کے برابر اور ایک دن ایک ہفتہ کے برابر اور باقی دن ہمارے دنوں کے برابر ہوں گے۔ ان طویل دنوں میں ایک دن میں ایک ہی نماز کافی نہیں ہوگی بلکہ ایک ایک دن کا اندازہ کر کے نماز پڑھنی ہوگی (مسلم)

☆ دجال انتہائی تیز رفتار ہوگا (مسلم)

☆ وہ اپنی مرضی کے مطابق پانی برسائے گا اور زمین کو سرسبز وشاداب بنادے گا (مسلم)

☆ جب گانے والی عورتیں ظاہر ہوں گی اور جب باجے ظاہر ہوں گے (ترمذی)

☆ قیامت کا صور پھونکنے کی ابتدا ایک از حد سریلی آواز سے ہوگی جس سے ہر آدمی لطف اندوز ہونے کا ارادہ ہی کرے گا کہ یکایک وہ آواز مہیب ہو جائے گی اور لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔

چنانچہ اس زمانے کا تمدن انتہائی تیز رفتار ہوگا، کہ جو ترقیاں برسوں میں ہوا کرتی تھیں وہ مہینوں میں انجام پا جائیں گی اور جو کام گھنٹوں میں ہوتے تھے وہ منٹوں میں ہونے لگیں گے۔ اس تیز رفتاری کی وجہ یہ ہوگی کہ سائنس اور ٹکنالوجی جس کو مسلمانوں نے آج سے تقریباً آٹھ سو سال پیش تر کائنات سے نظام توحید سے آشنا کیا تھا اور جس کو پابند نظام (Formulate) کر دیا تھا اس وقت تک ان کے تمام بنیادی امور سے انسان واقف ہو چکے گا، اور اب کسی نئے انکشاف کا مطلب کسی نئے قانون طبعی یا کیمیاوی کی دریافت نہیں ہوگا، بلکہ دریافت شدہ قانون کے مطابق ترقی یافتہ وسائل سے کام لے کر نئی نئی چیزوں کی دریافت یعنی Exploitation ہی کا نام انکشاف ہوگا۔ یہاں تک کہ اس زمین میں جو جو قوتیں ودیعت کی ہوئی ہیں اور جو جو استعداد اس میں مہیا کی ہوئی ہیں وہ سب کی سب سامنے آجائیں گی اور ان کا مصرف لے لیا جائے گا۔ یہاں تک کہ زمین خالی ہو جائے گی، کیونکہ اللہ نے کوئی چیز بے مصرف رہنے کے لئے پیدا نہیں کی ہے و القت ما فیھا و تخلت۔ اور یہ امت محمدیہ کی یا انسان کی دنیوی زندگی کی آخری حد یعنی

معراج ہوگی جس میں تمدن کی تمام ترقیوں اور بوالعجبیوں کے باوجود اسی توحید پر اور خالق کائنات کے وضع کئے ہوئے انہی ازلی قوانین پر اور اسی بے پایاں آخرت پر ایمان اس دور کی روح یعنی تہذیب ہوگی۔ اور یہ حقیقت چودہ سو سال پیشتر کی بہ نسبت زیادہ واضح ہو جانے کے سبب اسلام ہی ساری دنیا کا دین ہو جائے گا۔

اس وقت خلائی سفر میں مسلسل روشنی رہنے کی وجہ سے طویل دن ہوا کریں گے اور زمین کی گردش کے نظام میں خلل واقع ہونے کے سبب عارضی طور پر طلوع و غروب کا نظام بگڑ جائے گا جس کی وجہ سے سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا اور دن اور رات کے لمحات بھی طویل ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ ان غیر معمولی حالات میں امت مسلمہ حیرانی کا شکار نہ ہو اس کو ہدایت دی گئی کہ وہ وقت کا اندازہ لگا کر اپنے مراسم عبودیت کا نظام الاوقات بنالے گی۔ اس سلسلہ کی مزید رہنمائی اس حدیث میں بھی ملتی ہے جس کو بخاری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ بغیر کسی عذر یا ظاہری وجہ کے پانچوں وقتوں کی نمازوں کو بیک وقت ادا کر لیا تھا۔ پھر قابل غور بات یہ بھی ہے کہ صحابہؓ کرام جو آپؐ کی ہر سنت کی اتباع کا غیر معمولی جذبہ رکھتے تھے ان میں سے کسی نے بھی اس سنت پر کبھی عمل نہیں کیا۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دراصل آں حضور ﷺ کا یہ عمل اس دور کے لئے نہیں تھا بلکہ آپؐ خلائی دور کے لئے ایک نظیر کے طور پر اپنی امت کو یہ سنت دے جانا چاہتے تھے۔ اور اس قیاس میں مزید وزن اس بات سے پیدا ہوتا ہے کہ امت پر چوبیس گھنٹے میں پانچ بار نماز پابندیٔ وقت کے ساتھ فرض ہے، مگر بین الاقوامی دور کا لحاظ کرتے ہوئے فریضہ حج کے ضمن میں، جو بین الاقوامیت کی ایک دینی علامت (Symbol) ہے پانچ نمازوں کو پانچ مرتبہ کر کے نہیں بلکہ صرف تین مرتبہ کر کے ادا کرنا سکھایا گیا۔ اور پھر مزید سہولت فراہم کرنے کے لئے اپنے سفروں میں بھی اس کی اجازت دی گئی۔ اب خلائی دور چونکہ بین الاقوامی دور سے زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ طویل اور زیادہ دشوار گزار ہوگا، اس لئے اس دور کے واسطے مزید رعایت دینے کی غرض سے پانچ وقتوں کی نمازوں کو ایک ہی وقت میں ادا کر لینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ نے چونکہ اس دور کو پایا نہیں اس لئے اس حدیث پر عمل بھی نہیں کیا۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ کائناتی سفر کب ممکن ہوگا تو قرآن پیشین گوئی کرتا ہے کہ لا اقسم بالشفق و الیل و ما وسق و القمر اذا اتسق لترکبن طبقا عن طبق (ترجمہ: چنانچہ میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے یقیناً تم سواری کرو گے طبق بہ طبق)۔ یہاں قرآن قطعی انداز میں یہ کہہ رہا ہے کہ تم یقیناً طبق بہ طبق سواری کرو گے اور یہ سفر اس وقت کرو گے جب شفق ہوگی اور ہمہ گیر رات ہوگی اور بدر کامل ہوگا۔ قرآنی استعارہ کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب شفق یعنی خونی انقلاب کے بعد ہمہ گیر رات یعنی کلیت پسند نظام باطل آئے گا جس کو حدیث میں ظلم و جبر کا دور کہا گیا ہے اور اس مکمل تاریکی کو دور کرنے کے لئے آفتاب رسالت کی پوری روشنی کو منعکس کرنے والا بدر کامل یعنی امام مہدی کا ظہور ہوگا، وہی دور ہوگا جب تم طبق بہ طبق سواری کرو گے۔

مگر اس کے بعد تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے گی اور اسلام کی بدولت فراہم شدہ آسائش کے گہوارہ میں پلی ہوئی آئندہ نسل نفس پرستی کا شکار ہو کر اسی تیزی کے ساتھ باطل کو اپنائے گی اور دنیا پھر ظلم و جور کی تاریکیوں سے بھر جائے گی اور پھر نیا قمر یعنی مہدی پیدا نہیں ہوگا جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرے۔ مسلمان ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔ زمین بھی کھوکھلی ہو کر بانجھ ہو چکے گی، طبیعی کائنات کی وسعتوں کے اندر مزید ارتقا کی گنجائش ختم ہو جائے گی۔ لہذا یہ کائنات پھٹ (Burst) پڑے گی۔ اذا السماء

انتشـقـت ۔اور پھراس کی جگہ لامحدود کائنات موجود ہوجائے گی جہاں ارتقا کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا اور کبھی ختم نہ ہوگا۔اور وہاں حکومت ایک اللہ کے سوا کسی کی نہ ہوگی۔ لمن الملک الیوم للہ الواحد القھار۔

☆☆☆

'خلائی دور' پر ایک تبصرہ

مصنف: ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مطبع: مطبوعات حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی پٹنہ بہار

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ایک بہت ہی ذہین وفطین صاحب علم ہیں اور یہ مختصر پمفلٹ ان کی ذہانت وفطانت کا ایک تازہ ثبوت ہے۔وہ بہت دنوں سے انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں۔ان کے خطبوں سے استفادے کے لئے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہوتی ہے۔یہ پمفلٹ بھی ان کا ایک خطبہ ہے جو انہوں نے انجمن میں دیا تھا۔چاند پر انسان کے قدم رکھ دینے کے بعد ناواقف مسلمانوں میں جو ایک بے چینی سی پیدا ہوئی تھی اسے دور کرنے کے لئے یہ خطبہ دیا گیا تھا۔انہوں نے اسلامی تعلیمات کے اشارات سے انسان کی سائنسی ترقیوں اور خلائی بلند پروازیوں کا ایک پورا خاکہ مرتب کر کے دکھایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا چاند پر قدم رکھنا تو آئندہ ترقیوں کے لحاظ سے ایک ابتدائی قدم ہے۔ظاہر ہے کہ آئندہ کیا واقعات رونما ہوں گے اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ڈاکٹر صاحب کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر انسان چاند سے بھی بلند سیاروں میں پہنچ جائے تو ہمیں نہ کسی تاویل کی ضرورت ہے اور نہ ہمارے لئے انکار کی کوئی وجہ ہے۔جو لوگ سائنس اور قرآن دونوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ پمفلٹ ایک تحفہ ہے۔

واقعۂ معراج کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ حضورؐ کا سفر سدرۃ المنتہیٰ تک براق پر ہوا تھا۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔اس سلسلے میں جو احادیث آتی ہیں وہ اپنے درجے کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں اور ان کے اندر بیان واقعات میں تقدم وتاخر بھی بہت ہے۔حافظ ابن کثیر نے تفسیر قرآن میں اس سلسلے کی تمام احادیث کو جمع کرنے کے بعد اپنی جو تحقیق لکھی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل حضورؐ کو براق پر سوار کر کے بیت المقدس تک لے گئے اور وہاں براق کو ایک خاص چٹان کے ساتھ باندھ دیا۔پھر وہاں سے وہ حضورؐ کو کسی سواری کے بغیر آسمانوں پر لے گئے۔یہاں تک کہ حضورؐ سدرۃ المنتہیٰ پہنچے اور پھر وہاں سے حضورؐ بیت المقدس واپس آ گئے۔انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت کی اور پھر براق پر سوار ہو کر مکہ معظمہ واپس تشریف لائے۔غرض یہ کہ براق پر آپ کا سفر صرف بیت المقدس اور وہاں سے واپسی میں ہوا تھا۔واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ براق کا چہرا آدمی کے چہرے جیسا تھا۔یہ بات کسی بھی صحیح ماخذ سے ثابت نہیں ہے۔یہ محض قصے کہانی کی بات ہوگی۔جیسا کہ لکھا گیا بحیثیت مجموعی یہ پمفلٹ لائق مطالعہ ہے۔

(تبصرہ ماہنامہ زندگی رام پور مارچ ۱۹۷۰ عروج قادری)

فطرت کے اشارے

ضیاء الہدیٰ رح

حلقہ متفقین جماعت اسلامی نے ادارہ اشاعت اسلام،
سلطان گنج، پٹنہ سے غالباً ۱۹۷۰ء میں شائع کیا

باسمہ تعالیٰ

فطرت اشاروں میں بات کرتی ہے۔ اسی لیے اس کے اندر حقیقت کے بہت سے پہلو سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں اشاروں کو سمجھنے کی کوششوں کے نتیجے میں فلسفہ، سائنس اور تصوف وجود میں آئے اور انہی کو سمجھنے میں غلطی کے نتیجے میں انسان ہر میدان میں ٹھوکریں بھی کھاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں انسان نے علمی میدان میں جو پیش رفت کی ہے، جن کوتاہیوں کا شکار ہوتا رہا اور جن خطرناک انجاموں سے دوچار ہوتا رہا ہے اس کی تاریخ یہاں بیان کرنی نہیں ہے، نہ ہی اس مقالے میں اس موضوع سے بحث کررہا ہوں کہ فطرت کے اشاروں کو سمجھنے کا واقعی صحیح طریقہ کیا ہے اور نہ ہی اشاروں کی اس زبان کی لغت یا قواعد لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ اس مختصر رسالے میں اس کی گنجایش نہیں ہے۔ اس رسالے میں تو میں فطرت کے Code میں سے صرف دو لفظ 'رات' اور 'دن' پر گفتگو کرنے جارہا ہوں اور یہ گفتگو بھی اس کے بہت سے پہلوؤں میں سے صرف ایک پر ہوگی۔

فطرت نے ہماری ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کردی ہیں اور جو چیز جتنی زیادہ ضروری ہے اتنی ہی وافر پیدا کی ہے۔ یہاں زہر بھی ہے اور تریاق بھی۔ مگر یہ زہر اور تریاق سب اضافی چیزیں ہیں۔ حقیقتاً یہاں نہ کوئی چیز محض زہر ہے نہ محض تریاق۔ اس کا صحیح یا غلط استعمال ہی اسے تریاق یا زہر بناتا ہے۔ چنانچہ خطرناک سے خطرناک زہر صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو بہترین تریاق ہے اور مجرب ترین تریاق غلط استعمال سے بدترین زہر ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے فطرت نے رہنمائی کا بندوبست بھی کیا ہے مگر یہاں بھی وہی معاملہ ہے۔ رہنمائی کو اگر رنگین عینک سے دیکھا جائے تو انسان غلط راستوں پر پڑ جاتا ہے اور فطری سادگی سے قبول کیا جائے تو سیدھے کامیابی کی منزل تک پہنچادیتی ہے۔ رنگین عینک خواہش پرستی، تعصب، ہٹ دھرمی اور اپنے دائرۂ اختیار سے متعلق غلط اندازہ ہے جس کے نتیجے میں انسان افراط اور تفریط میں مبتلا ہوجاتا ہے، پھر تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوکر بے عملی کو راہ دیتا ہے یا غلط پندار کا شکار ہوکر حقایق سے ٹکرانا شروع کردیتا ہے اور بالآخر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس فطری سادگی یہ ہے کہ اپنے دل ودماغ کو ان چیزوں کی گرفت سے آزاد رکھ کر فطرت کے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، اور اس طرح جو مدعا بھی سمجھ میں آئے اسے بے چون وچرا اسی طرح قبول کیا جائے۔

رہنمائی ایک غیر محدود چیز ہے۔ اس وقت میری مراد صرف اس رہنمائی سے ہے جس کا تعلق انسان کے نظام زندگی (Life Order) سے ہے۔ اس کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اس معاملے میں غلطی کرنے کے نتیجے میں افراد ہی نہیں، قوموں کی قومیں تباہ ہوتی رہی ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر فطرت اس رہنمائی کے لیے اپنی نشانی کو مسلسل اور جلد جلد دوہراتی رہتی ہے۔ یہ نشانی رات اور دن کا الٹ پھیر ہے۔

نظام ہائے زندگی اپنی جزوی تفصیلات کے لحاظ سے بہت نوع کے ہوسکتے ہیں لیکن بنیادی اعتبار سے صرف دو قسم کے ہیں۔ ایک صحیح جو ایک ہی ہوسکتا ہے یعنی فطرت کے مطابق۔ دوسرے غلط جو بہت سارے ہوسکتے ہیں یعنی فطرت سے منحرف (Perverted)۔ صحیح نظام نے اپنے اپنانے والوں کو کبھی دغا نہیں دی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے مخالفین نے اپنی کثرت تعداد اور مادی برتری کے زور پر انہیں پنپنے نہ دیا ہو۔ بخلاف اس کے غلط نظام زندگی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے وفاداروں کے ساتھ ٹھیک اس وقت بے وفائی اور غداری کرتا رہا ہے جب کہ وہ اپنے انتہائی عروج (Climax) پر ہوتا ہے، درانحالیکہ اس کو چیلنج کرنے والی

کوئی قابل لحاظ مخالف طاقت بھی نہیں ہوتی اور بظاہر اسباب اس قوم یا ان قوموں کے مٹنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ پھر جب یکا یک اس تہذیب کی قیامت(Annihilation) سامنے نظر آنے لگتی ہے تو بڑے بڑے مدبر اس کو ٹالنے کی تمام ممکن تدبیریں بھی کرتے ہیں، ایسی تدبیریں جن کو دیکھ کر ان کی عقل و دانش کا لوہا بھی ماننا پڑتا ہے اور جن کے پیش نظر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس تہذیب کی قیامت اب واقعی ٹل گئی۔ مگر زیادہ دیر نہیں لگتی کہ یکا یک وہ تہذیب، وہ تمدن، وہ نظام زندگی آبادی کو ویرانے میں اور عمارتوں کو ملبوں میں تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے اور خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ فطرت کے ان اشاروں کی جو رات اور دن کی شکل میں دن رات ہمیں مل رہے ہیں ہم سمجھنے کی کوشش کریں۔

رات اور دن اپنی ماہیت میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دن اصلاً روشن ہے اور ضمناً گرم۔ اور رات فی الاصل تاریک ہے اور ضمناً سرد۔ یہ دونوں یکے بعد دیگرے آتے اور جاتے رہتے ہیں اور ان کی اس آمد ورفت میں نور وظلمت کے مناظر سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ دونوں بذات خود اگرچہ طبعی مظاہر (Physical Phenomena) ہیں۔ مگر ساتھ ہی فطرت کی اشاراتی زبان میں صحیح اور غلط نظام ہائے زندگی اور ان کی باہمی کشمکش کی علامتیں(Symbols) بھی ہیں۔

دن کی طبعی روشنی میں نظر آنے والی چیزیں اپنی اصلی شکل وصورت میں نظر آتی ہیں، جیسی کہ فی الواقع وہ ہیں۔ وقت اور جگہ کے فاصلے میں بھی ہمیں اشتباہ نہیں ہوتا۔ حرکت و عمل کے سلسلے میں بھی مغالطہ نہیں ہوتا۔ اور ان وجوہ کی بنا پر ہم اندازے (Calculations) اور نشانے(Targets) مقرر کرنے میں غلطی نہیں کرتے اس لیے دن صحیح نظام زندگی کی علامت ہے۔ نظام زندگی کا تعلق انسانی شعور سے ہے، اس لیے یہاں روشنی سے مراد علم کی روشنی ہے جس میں نظر آنے والے معاملات صحیح شکل وصورت میں نظر آتے ہیں۔ احوال وظروف کا حقیقی مقام نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور اخلاق وکردار کی واقعی قدر وقیمت معلوم اور متعین ہوتی ہے، اس لیے منصوبے بنانے اور ہدف مقرر کرنے میں غلطی نہیں ہوا کرتی۔

رات غلط نظام ہائے زندگی کی علامت ہے۔ نظر آنے والی چیزیں بھی اس کی طبعی تاریکی میں یا تو نظر ہی نہیں آتیں یا نظر آتی بھی ہیں تو اپنی اصلی شکل وصورت میں نہیں۔ بلکہ تاریکی میں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز حقیقتاً موجود نہیں ہوتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر ہے، اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز موجود ہوتی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر کچھ نہیں ہے۔ تاریکی دراصل اسی کیفیت کا نام ہے جس میں نظر کام ہی نہ کرے یا دھوکا کھائے۔ چنانچہ تاریکی کی موٹی موٹی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، اس کو تو ہر آدمی تاریکی سمجھتا ہے۔ مگر دوسری ایک اور تاریکی ہے، جس کو لوگ تاریکی نہیں سمجھتے۔ یہ سراب کی تاریکی ہے۔ سیکڑوں میلوں میں پھیلی ہوئی ریگستان کی چمکیلی ریت کو ایک پیاسا مسافر دھوپ کی روشنی میں کھلی آنکھوں سے بہتا ہوا پانی دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ فاصلہ کا اندازہ لگاتا ہے اور وہاں پہنچ کر پیاس بجھانے کا یقین کر لیتا ہے مگر پانی ہے کہاں؟ جب وہ اپنے مقرر نشانے پر پہنچتا ہے تو روشنی کا فریب اور اندازے کا بھرم کھل جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی کا حساب چکا دیا جاتا ہے یعنی اسے آب حیات کے بجائے موت کا جام پینا پڑتا ہے۔

جہالت کی تاریکی کی بنیاد پر قائم نظام غلط نظام زندگی ہوتا ہے جس میں مسائل اپنی اصلی اور صحیح شکل میں بہر حال نظر نہیں آتے۔ ایسے نظام کی بھی موٹی موٹی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو خالص جہالت کے خالص تاریکی والے طرز ہائے زندگی ہیں، جیسے تاریک دور (Dark age) کی زندگی کے طریقے تھے یا جیسے آجکل کے زمانے میں جنگلی وحشی قوموں کی زندگی کے طریقے ہیں جو اپنی تاریکی

میں نہ مسائل کو دیکھ پاتی ہیں اور نہ ان کے حل کے لیے کوئی دوررس منصوبہ بناسکتی ہیں۔ دوسرا وہ چمکتا ہوا نظام ہوتا ہے جس کے اندر رہنے والا روشنی اور علم کے فریب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کو زندگی کی وسعتیں اور اس کے مسائل کے حل صاف صاف دکھائی دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ منصوبہ بند پروگرام بناتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ مرحلہ بہ مرحلہ وہ اپنی دنیا کو بالآخر جنت بناڈالے گا، مگر ٹھیک اس وقت جبکہ اس کے اندازے اور تخمینے کے مطابق زندگی کو آسودگی اور امن کا گہوارہ ہونا چاہئے، وہ نظام زمیں بوس ہوکر اپنے جاں نثاروں کو صفحۂ ہستی سے مٹاڈالتا ہے۔

رات کے وقت چور اور اچکے دندناتے پھرتے ہیں۔ سماج دشمن عناصر متحرک (Active) ہوجاتے ہیں۔ شریف النفس شہری اپنے گھروں کی چہار دیواری میں بند ہوجاتے ہیں۔ اخلاق باختہ طبقے ٹھاٹھ جماتے ہیں۔ اخلاق سوز محفلیں گرم ہوجاتی ہیں اور بدکردار لوگوں کا راج ہوتا ہے۔ یہی ساری علامتیں غلط نظام زندگی کی ہوتی ہیں جس میں بلیک مارکیٹنگ اور اسمگلینگ روکے نہیں رکتی۔ رشوت اور ہر طرح کا استحصال یعنی (Exploitation) عام ہوتا ہے۔ امن پسند اور قانون کے پابند شہری دبے دبائے (Suppressed) رہتے ہیں۔ اخلاق کی قدر و قیمت گھٹائی (Devalue) جاتی ہے۔ اور بداخلاق (Amoral) سوسائٹی پر چھا جاتے ہیں۔ کلب اور کلچرل پروگراموں کی گرم بازاری ہوتی ہے اور بدکردار لوگ پروپیگنڈا اور پبلسٹی کے زور پر بدکرداری کا لائسنس حاصل کرکے عوامی ضمیر کو خوابیدہ (Hypnotise) کردیتے ہیں۔ اس کے بعد لیڈری چمکا کر اقتدار کی گدی پر قابض ہوجاتے ہیں۔ پھر تو وہ سب کچھ آسان سے آسان تر ہوتا چلا جاتا ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔ اور جو ہونا چاہئے وہ روز بروز دشوار سے دشوار تر ہوتا جاتا ہے۔

دن کے وقت صورت حال اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ چور اور اچکے جاکر سورہتے ہیں یا اپنے بھٹوں میں چھپ رہتے ہیں یا شرافت کا لبادہ اوڑھ کر عوام کے سامنے آتے ہیں۔ سماج دشمن سرگرمیاں بند ہوجاتی ہیں۔ شریف النفس لوگ ہر طرف سرگرم نظر آتے ہیں۔ اخلاق باختہ طبقے اپنی دکان بڑھادیتے ہیں۔ اخلاق سوزی کی محفلیں سرد پڑ جاتی ہیں اور بدکردار لوگوں کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے۔ اس طرح صحیح نظام زندگی میں کاروبار امانت اور دیانت کی بنیاد پر چلتے ہیں۔ خدمت کرنے کا جذبہ عام ہوتا ہے۔ بداخلاقی سے لوگوں کو گھن آتی ہے اور حسن اخلاق میں مسابقت ہوتی ہے۔ محفلیں شائستگی اور سنجیدگی کی درس گاہیں ہوتی ہیں۔ کھیل اور کود بھی صرف تضیع اوقات (Mere Pastime) کے لیے نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر بھی زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے ہم آہنگی ہوتی ہے۔ قانون کا احترام پایا جاتا ہے اور قانون کی حکومت عوام اور خواص پر یکساں ہوتی ہے۔ بدی کی راہیں تقریباً بند ہوجاتی ہیں اور افراط وتفریط کے بجائے توازن واعتدال کی روش آسان ہوجاتی ہے۔

دن اور رات یکے بعد دیگرے آتے جاتے ہیں۔ نہ تو رات ہی کو دوام نصیب ہے نہ دن کو قرار ہے۔ دن ہونے کا مطلب یہ کہ اس کے بعد رات آنی ہے۔ اسی طرح رات کے ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے بعد دن نمودار ہوگا۔ اسی طرح صحیح اور غلط نظام زندگی بھی یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔ نہ تو صحیح نظام زندگی کو دوامی پٹہ مل گیا ہے کہ آنے کے بعد کبھی نہ جائے اور نہ ہی غلط نظام زندگی ہمیشہ جمے رہنے کا ٹھیکہ لے کر آتا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ رات اور دن چونکہ طبیعی مظاہر میں سے ہیں اس لیے ان کی آمد ورفت کا وقت بھی طبیعی ہے جو مقرر ہے، لیکن نظام زندگی کا تعلق چونکہ انسانوں کے شعور اور ارادہ سے ہے اس لیے ان کے الٹ پھیر میں طبیعی وقت مقرر نہیں ہے بلکہ اس کا حساب کچھ اور ہے۔ اس کا وقت بتانے والی گھڑی مادی نہیں بلکہ علمی اور شعوری ہے اور جس کو اس گھڑی کا دیکھنا آتا ہو وہ اندازہ لگاسکتا ہے کہ غلط یا صحیح نظام زندگی کی رات یا دن کے کس لمحے سے وہ گذر رہا ہے۔ پیش نظر مضمون کو پڑھنے والا صفحۂ تاریخ (Dial of History) پر مراحل کی سوئیوں کو چلتے دیکھ کر ہر وقت بتاسکتا ہے کہ کس دور سے اور دور کے کس مرحلہ سے گذر رہا ہے۔

رات اور دن کی آمد ورفت یونہی کوئی سادہ سا عمل نہیں ہے بلکہ اس میں دو متضاد نظاموں کی باہمی آمیزش اور کش مکش کی پوری داستان چھپی ہوئی ہے، اگر چہ چوبیس گھنٹے میں ان کی آمد ورفت کا ایک چکر مکمل ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ ممکن نہیں کہ رات کے بعد دن یا دن کے بعد رات یکا یک آ جائے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ابھی تو دن کا نصف النہار ہو اور ابھی پلک جھپکتے ہی کالی رات اپنا نصف سفر طے کر رہی ہو۔ یہاں تبدیلی تدریج کی پابند ہے۔ ہر کام دھیرے دھیرے انجام پاتا ہے۔ یہی حال دو متضاد نظاموں کا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ لوگ رات کو سوئیں تو ایک نظام کے تحت مگر صبح کو اٹھیں تو دوسرا متضاد نظام چھایا ہوا ہو۔

دن اور رات کی یہ تبدیلی دو نوعیت کی ہوتی ہے۔ ایک چوبیس گھنٹوں میں واقع ہونے والی، جس کے نتیجے میں زمین کے ایک خطے پر دن کو بتدریج ہٹا کر رات چھا جاتی ہے یا رات کو ہٹا کر دھیرے دھیرے دن چھا جاتا ہے۔ دوسری وہ ہے جو سال بھر میں واقع ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں دن کبھی رات سے بڑا ہو جاتا ہے اور کبھی رات دن سے بڑی ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں قسم کی تبدیلیاں دو نوعیت کے انقلاب کی نشانیاں ہیں۔ پہلی تبدیلی مقامی یا قومی نوعیت کے انقلاب کی داستان ہے تو دوسری تبدیلی بین الاقوامی انقلاب کی۔ اب ہم ہر قسم کی تبدیلی کا علیحدہ علیحدہ تفصیلی جائزہ لینے کے موقف میں آ گئے ہیں۔

دن کا بنیادی حربہ (Primary Weapon) روشنی ہے اور ثانوی حربہ حرارت۔ بخلاف اس کے رات کا بنیادی ہتھیار تاریکی ہے اور ثانوی ٹھنڈک۔ انہی دو قسموں کے ہتھیاروں سے دن اور رات کی جنگ جاری ہے۔

رات کے آنے سے کچھ پہلے ہی روشنی (دھوپ) پھیکی اور رنگین ہو جاتی ہے۔ پھر آسمان پر کالی لکیریں پچھم سے پورب لمبائی میں نمودار ہوتی ہیں اور پورب سے افق کے کنارے کنارے پوری چوڑائی میں سیاہی اٹھتی اور آگے بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد روشنی اور تاریکی آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ پھر بتدریج اندھیرا غالب ہو جاتا ہے اور اجالا مغلوب۔ یہاں تک کہ دن کی سفیدی کو پوری طرح بے دخل کر کے رات کی سیاہی ہر چہار طرف چھا جاتی ہے۔ اسی درمیان میں آسمان پر بسا اوقات شفق بھی نظر آتی ہے جو اس بات نشانی ہے کہ رات کا انقلاب خونی ہے، پرامن نہیں ہے۔ اس کشمکش کے دوران جب دن کا بنیادی حربہ ناکام ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی شکست کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ اپنا ثانوی حربہ میدان میں لے آتا ہے۔ فضا کا درجہ حرارت اتنا بڑھ جاتا ہے جتنا دن میں کسی وقت نہیں ہوا تھا۔ جس کے زیر اثر تھوڑی دیر کے لیے زمین پر چہل پہل بہت بڑھ جاتی ہے۔ مگر تھکا ہوا فریق ہری ہوئی بازی کتنی دیر لڑ سکتا ہے۔ رات اپنی تاریک چادر میں پورے خطے کو ڈھانک لیتی ہے۔ دن بھر تمدن کی خدمت میں لگے رہ کر تھکے ماندے لوگ نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں جو بہر حال موت کی سوتیلی بہن ہی ہے اور دن کو بے فکری کے ساتھ گذارنے والے لوگوں کی بن آتی ہے۔ رات بھیگتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اس کو کبھی زوال نہ ہوگا اور یہ کبھی نہ جائے گی۔ ٹھیک اسی وقت دن ایک چیلنج پیش کر دیتا ہے۔ صبح کاذب کی سفیدی پورب کی طرف افق پر ابھرتی ہے۔ رات کے ابرو پر شکن پڑ جاتی ہے، وہ اپنی پوری قوت سے اس سپیدی کو دبا دیتی ہے اور اپنی تاریکی کو انتہائی گہری کر دیتی ہے۔ ایسی گہری کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد دن دوبارہ حملہ شروع کر دیتا ہے۔

دن اپنی روشنی کو دو منظم دستوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ایک ہراول دستہ پورب سے پچھم لمبائی میں رات کی تاریکی میں گھس کر اس کو چیرتا چلا جاتا ہے۔ دوسرا دستہ پیچھے پیچھے افق پر چوڑائی میں پھیلی ہوئی سفیدی کی شکل میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر روشنی اور تاریکی گڈمڈ ہو جاتی ہیں، لیکن شام کے برخلاف اس وقت روشنی بتدریج تاریکی پر غالب ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ آفتاب نکل آتا ہے۔ رات اب شکست کے یقین کے بعد اپنا آخری حربہ استعمال کرتی ہے یعنی درجہ حرارت کو ممکن حد تک گرا دیتی ہے مگر اس کے

لیے اب ٹکنا ممکن نہیں رہتا۔ دن مکمل طور پر اس خطے پر چھا جاتا ہے، آفتاب کی روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ درجہ حرارت گرنے سے لوگوں پر نیند اور کسل مندی کا جو حملہ شدید ہو گیا تھا بتدریج ختم ہو جاتا ہے، اور نیند کے متوالے پوری طرح ہوشیار ہو کر اپنے کام کاج میں لگ جاتے ہیں۔ آفتاب جیسے جیسے چڑھتا جاتا ہے اس کی کرنوں کو زمین تک پہنچنے کے لیے ہوا کی کم سے کم تر دبازت سے گزرنا پڑتا ہے، اس لیے روشنی تیز سے تیز تر اور صاف سے صاف تر ہوتی جاتی ہے، لیکن نصف النہار کے بعد صورت حال الٹنے لگتی ہے۔ ہوا کی دبازت بڑھنے لگتی ہے اور روشنی مدھم اور رنگین ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے۔

اسی سے ملتی جلتی صورت کسی قوم کے اندر انقلاب کی پیش آتی ہے۔ غلط یعنی باطل نظام زندگی جس وقت اپنے پورے شباب (Climax) پر ہوتا ہے اور کسی گوشے اور کسی پہلو سے اس کا امکان نظر نہیں آتا کہ یہ ہٹ بھی سکتا یا ہٹایا بھی جاسکتا ہے۔ عین اس وقت صحیح نظام یعنی حق کی طرف سے علمی نشاۃ ثانیہ کی ہلکی سی کوشش ہوتی ہے جسے غالب نظام باطل بزور دبا دیتا ہے۔ اور کچھ وقفہ کے لیے حق کے ماننے والے ایسے پسپا ہوتے ہیں کہ وہ بدترین قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن پھر نظام حق اپنے علمی دستوں کو منظم کر کے حملہ آور ہوتا ہے۔ ایک دستہ علم کی روشنی لے کر باطل پرستوں کے درمیان نفوذ شروع کر دیتا ہے اور دوسرا دستہ پیچھے سے زندگی کے ہر میدان سے متعلق حقیقی علم کی صاف صاف روشنی لیے پیش قدمی کرتا آتا ہے۔ حقیقی علم اور باطل کی علم نما جہالت کے درمیان دونوں کے علمبرداروں کے فرد فرد میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ فرسودہ جہالت تازہ دم علمی یلغار کی تاب نہیں لاسکتی۔ اس کے کیمپ سے افراد نکل نکل کر حق کے کیمپ میں آنے لگتے ہیں۔ اس طرح ماحول پر نظام حق کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب باطل کو یقین ہو جاتا ہے کہ علمی مقابلے میں اس کی شکست مقدر ہو چکی تو ظلم، زیادتی اور کالے قانون کا سہارا لے کر حق کے علمبرداروں کو عملاً معطل کر دینے کی تدبیر اختیار کرتا ہے مگر اس سے ہوتا کیا ہے۔ بالآخر اسے اپنا بوریا بستر لپیٹنا پڑتا ہے اور نظام حق اس کی جگہ لے کر رہتا ہے۔

اس کے بعد علم کی روشنی تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ تعمیری ہماہمی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ انسانیت تازہ دم صالح جذبے اور قوت عمل کے ساتھ تمدن کی خدمت میں لگ جاتی ہے۔ توازن اور اعتدال کے ساتھ ہر میدان میں ارتقاء ہوتا ہے۔ علم اپنے ساتھ قوت اور دولت کے خزانے لا کر انسانیت کے علمبرداروں کے قدموں میں ڈال دیتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی آیندہ نسلیں پھر عیش پرستی اور آرام طلبی کا شکار ہونے لگتی ہیں۔ اجتہاد اور انکشاف سے دست کش ہو جاتی ہیں۔ اس طرح حقیقی علم اب ان کی خواہشات نفس کے پردوں سے چھن کر آنے لگتا ہے۔ اور یہ پردے دن بدن دبیز ہوتے جاتے ہیں، اور اسی رفتار سے یہ پسماندگی کی طرف لڑھکتے جاتے ہیں تا آنکہ حقیقی علم کی روشنی اپنے اصلی رنگ میں ان تک پہنچنے ہی نہیں پاتی اور ان کی خواہش پرستی کا رنگ بالکل غالب ہو جاتا ہے۔

اس وقت باطل دیکھتا ہے کہ اب وار کرنے کا وقت آ گیا، اس لیے کہ نفس پرستی، تو ہم پرستی اور جہالت کی تاریکیاں اس قوم پر پوری طرح حاوی ہو چکی ہیں۔ چنانچہ باطل اپنی تاریکی کے دو دستوں کو منظم کر کے نظام حق پر بھرپور حملہ شروع کر دیتا ہے۔ چند دستے حق کے ماننے والوں کے درمیان گھس جاتے ہیں اور دوسرا عظیم دستہ پیچھے سے بڑھتا چلا آتا ہے۔ حق اور باطل گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ ایسا کہ اگر کوئی شخص اس وقت خواب سے بیدار ہو تو پہلی نظر میں اس کو پتہ ہی نہ چل سکے کہ آیا اس نے باطل کے جانے اور حق کے آنے کے وقت آنکھیں کھولی ہیں یا حق کے جانے اور باطل کے آنے کے وقت۔ البتہ کچھ دیر توقف کرے اور عقل پر زور دے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ حق ہر لحہ مسلسل پسپا ہو رہا ہے اور باطل کی پیش قدمی مسلسل جاری ہے۔ یعنی یہ کہ اس دور سے گزر رہا ہے جب حق جا رہا ہے اور باطل چھا جانے والا ہے۔ باطل کا یہ انقلاب عموماً خونریز ہوتا ہے، پرامن نہیں ہوا کرتا ہے۔

حق اپنے دوسرے حربے کے ذریعہ سنبھالا لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جذبۂ عمل یکا یک اٹڈ آتا ہے اور آخری بار ہاتھ پاؤں مار کر اس کے ماننے والے میدان عمل سے باطل پرستوں کے مقابلے میں دست بردار ہوجاتے ہیں۔ باطل اپنی جہ[illegible] تمام تاریکیوں کے ساتھ ماحول پر پوری طرح مسلط ہوجاتا ہے۔ علم کے نام پر جہالت اور جاہلیت کا، سا[illegible] کے نام پر بدلتے ہوئے نظریات کا، ٹکنالوجی کے نام پر انسانوں کو بے دست وپا کرنے کا، امن کے نام پر فساد اور جنگ کا، قانون کے نام پر حکمرانوں یا عوام کی خواہشات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا، انصاف کے نام پر اپنے وضعی قانون (Man Made Laws) کا مذاق اڑانے کا اور انتظام ملکی کے نام پر جان ومال کے عدم تحفظ کا دور دورہ ہوتا ہے اور اخلاق، شرم وحیا اور عصمت وغیرہ تو بھولی بسری باتیں ہوجاتی ہیں۔

اب بین الاقوامی انقلاب کو لیں تو اس سلسلے کے عمل کی پوری عکاسی ہمیں دن اور رات کے گھٹنے اور بڑھنے میں نظر آتی ہے۔ دونوں کے گھٹنے اور بڑھنے کی یہ کشمکش سال بھر مسلسل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی دن بڑا ہوجاتا ہے تو رات چھوٹی اور کبھی رات بڑی ہوجاتی ہے تو دن چھوٹا۔ ان کا بڑا اور چھوٹا ہونا دراصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ چوبیس گھنٹے کے بیشتر حصے پر جو چھاجاتا ہے وہ بڑا ہوجاتا ہے اور دوسرا چھوٹا۔ ایسا ہی حال بین الاقوامی سطح پر حق اور باطل کا بھی ہے۔ ان کے درمیان بھی کشمکش مسلسل جاری رہتی ہے جس کے نتیجے میں کبھی حق بڑا ہوجاتا ہے اور کبھی باطل۔ ان کا بڑا اور چھوٹا ہونا بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی آبادی کے بیشتر حصے کو ذہنی طور پر جو متاثر کرلیتا ہے وہی بڑا ہوجاتا ہے اور بالآخر اسی کا اقتدار قائم ہوجاتا ہے اور دوسرا چھوٹا اقتدار سے بے دخل ہوجاتا ہے۔

دن اور رات کی جنگ بیک وقت دو محاذوں پر جاری رہتی ہے، یعنی دن اور رات کے دونوں کناروں..... صبح وشام کے محاذوں..... پر۔ جب دن پوری طرح مغلوب ہوجاتا ہے اور اس کو اپنی اس مغلوبیت کا احساس ستانے لگتا ہے تو وہ اپنی بچی کھچی اصلی طاقت یعنی روشنی کو دن بھر سمیٹ کر شام کے محاذ پر زور لگانا شروع کردیتا ہے۔ چنانچہ ابھی صبح کے محاذ پر رات کی پیش قدمی جاری رہتی ہے کہ شام کے محاذ پر دن اسے پیچھے ڈھکیلنا شروع کردیتا ہے۔ اس محاذ پر کامیابی سے اس کے حوصلے بلند ہوجاتے ہیں اور صبح کے محاذ پر بھی زور لگا کر بالآخر رات کو پسپا کرنے لگتا ہے۔ دونوں محاذوں پر پسپائی کے نتیجے میں رات کے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ ہرتی ہوئی بلکہ ہری ہوئی جنگ کو جاری رکھتے ہوئے اب رات اپنی دوسری قوت یعنی ٹھنڈک کو میدان میں لے آتی ہے۔ برف باری کے ذریعہ اور دوسرے دوسرے علاقوں سے سرد لہروں کو درآمد کرکے درجہ حرارت اتنا گرادیتی ہے کہ حرکت وعمل کی قوت منجمد ہوجائے۔ مگر دن اپنی روشنی کے ساتھ ساتھ گرم کرنیں بھی لاتا ہے اور کچھ دنوں ٹھنڈک اور گرمی کی یہ لڑائی بھی چلتی ہے مگر اب رات کے حوصلے بالکل جواب دے دیتے ہیں۔ دن اس کے اسی مضبوط مورچے یعنی صبح ہی کی طرف پورا زور لگا دیتا ہے جس کے نتیجے میں اس محاذ پر رات کی طرف بھگدڑ مچ جاتی ہے جبکہ شام کی طرف دن کی پیش قدمی سست ہوتی ہے۔

اس کے بعد ٹھیک ایسی ہی صورت اب الٹی سمت میں پیش آنے لگتی ہے۔ یعنی اب رات کو جب اپنی کمتری کا احساس ستانے لگتا ہے تو وہ اپنی اصلی طاقت یعنی تاریکی کو رات بھر سمیٹ کر دن پر جارحانہ حملہ شروع کردیتی ہے، اور ابھی دن کی پیش قدمی شام کے محاذ پر جاری رہتی ہے کہ صبح کے محاذ پر دن کے قدم پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ پھر رات کے حوصلے بلند ہونے لگتے ہیں تو شام کے محاذ پر بھی ہمت کرکے زور لگاتی ہے اور یہاں بھی دن کو پسپا ہونے پر مجبور کردیتی ہے۔ اب دن اپنے دوسرے ہتھیار یعنی گرمی کو میدان میں لے آتا ہے۔ درجہ حرارت انتہائی حد تک بڑھ جاتا ہے مگر ہری ہوئی جنگ کب تک لڑی جاسکتی ہے۔ اس کے ہمت ہارنے کا اندازہ لگا کر رات شام ہی کے محاذ پر مزید زور لگادیتی ہے۔ بالآخر دن کے قدم پوری طرح اکھڑ جاتے ہیں اور وہ تیزی سے پسپا ہونے لگتا ہے۔ ان دونوں محاذوں پر دن اور رات کی لڑائی ویسی ہی ہے جیسے کسی شہر میں دو سمتوں سے دشمن کی فوج داخل ہونے کی کوشش کرے اور شہر کا

دفاع کرنے والی فوج کے قدم کسی ایک محاذ پر اکھڑ جائیں۔

بین الاقوامی رزمگاہ میں حق اور باطل نظاموں کی آویزش بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب پورے کرۂ ارض پر باطل نظام چھایا ہوا ہو اور اس کے جانے کے تمام امکانات ناپید ہوں اس وقت نظامِ حق کو ایک مہمیز لگتی ہے۔ اس کے ماننے والوں کو دنیا میں اپنی پستیٔ مقام کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ان کے اندر سے کچھ اولوالعزم افراد منظم ہو جاتے ہیں۔ علم کے نام پر نظام باطل نے جہالت کا جو طلسم پھیلا رکھا ہے اسکی حقیقت ان پر منکشف ہو چکی ہوتی ہے۔ انکے اپنے پاس جو حقیقی علم ہے اسکی واقعی قدر و قیمت اور اسکی مکمل افادیت پر انہیں ایمان ہوتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ دنیا کے عوام کو بھی وہ باتیں سمجھا دی جائیں۔ چنانچہ وہ اسی حقیقی علم کی طاقت کو سمیٹ کر باطل کی جہالت پر (جو اسکا اصل مورچہ ہے) حملہ شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے تو باطل انہیں خاطر میں نہیں لاتا مگر جب فطری علم لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنے لگتا ہے تو وہ چونکتا ہے اور پھر جلد ہی محسوس کرنے لگتا ہے کہ علمی میدان میں اسکی اقدامی صلاحیت ختم ہو چکی ہے اور دفاعی لڑائی کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس دفاع میں جب اسکی پسپائی بڑھتی جاتی ہے تو پھر وہ لوگوں کی قوتِ عمل کو شل اور مفلوج کر دینے والے قوانین بنا کر انکے سہارے جینے کی کوشش کرتا ہے۔ جیل اور سیاسی قتل کے ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے۔ عوام فریبی کیلئے جھوٹے اور منگھڑت پروپگینڈے کرتا ہے۔ بین الاقوامی سازشوں کے جال بچھاتا ہے۔ لیکن یہ ساری تدبیریں دراصل ایک ہی حقیقت پر سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ حق کی قوت کا مقابلہ کرنیکی طاقت اب باطل میں نہیں رہی ہے۔ بالآخر حق دنیا پر چھا جاتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک کسوٹی بھی لاتا ہے جو کھرے اور کھوٹے کو علیحدہ کر دیتی ہے۔ اسکی بدولت حق کے علمبردار سائنس کو جو الل ٹپ تجربات کا پٹارا ہوتا ہے صحیح معنوں میں علم بنا دیتے اور اسکی اشاعت عام کر دیتے ہیں۔ فلسفہ کو لوگوں کے مزعومات سے پاک کر کے فطری سادگی عطا کرتے ہیں۔ فنون کو زندگی کے بلند تر مقاصد سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ سیاست کو اصول کا پابند بنا دیتے ہیں۔ معیشت میں اعتدال پیدا کر کے لوگوں کے معاشی مسائل حقیقتاً حل کر دیتے ہیں۔ اور معاشرے کو سادگی اور پاکیزگی کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔

پھر جب نظامِ حق کے علمبردار باطل پرستوں کو پسپا کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور انکی بعد کی نسلیں حق کی علمبرداری چھوڑ کر صرف اسکی ماننے والی ہو کر رہ جاتی ہیں تو زندگی کے ہر میدان میں اجتہاد اور اکتشاف سے دستبردار ہو جانے کی وجہ سے انکی پیشقدمی سست ہونے لگتی ہے، اس وقت باطل اندازہ لگاتا ہے کہ جوابی کاروائی کرنے کا موقع اب آ گیا۔ چنانچہ وہ اپنی علم نما جہالت کی پوری قوت کو سمیٹ کر حق پر حملہ شروع کر دیتا ہے۔ حق کے ماننے والوں میں آرام طلبی کے سبب اب مقابلے کا یارا باقی نہیں رہتا ہے کہ وہ میدان میں ڈٹ سکیں۔ انکے نفوس اس نئی سج دھج سے سامنے آنیوالی پرانی جہالت پر مفتون ہونے لگتے ہیں، اور اسطرح باطل انکے خاصے حصے کو متاثر کر کے اپنا دائرۂ اثر بڑھاتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ہر طرف اب اسی کا ڈنکا بجنے لگتا ہے۔ ہر آواز اسکی آواز کے آگے دب جاتی ہے۔ ہر ذہن اس کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے۔ سیاست اسکی چلتی ہے، معیشت پر اسکا قبضہ ہو جاتا ہے۔ معاشرت اس کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ علم پر اس کے توہمات کی چھاپ ہوتی ہے۔ فلسفہ اس کے مزعومات کا پلندا بن جاتا ہے۔ فنون اس کے ہاتھ کا کھلونا ہو جاتا ہے۔ غرض پوری انسانی زندگی باطل کے علمبرداروں کی خواہشات کے تابع ہو جاتی ہے۔

یہ تو ہوئی فطرت کی اشاراتی زبان میں حق و باطل کی آویزش کی داستان۔ اب سوال یہ ہے کہ حق واقعی کون ہے اور باطل کون؟ کیونکہ ہر نظام یہاں حق ہی ہونے کا دعویدار ہے۔ فطرت ان ہی اشاروں کے ذریعہ اس حقیقت پر سے بھی پردہ اٹھا رہی ہے۔ دن اور رات کی ماہیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ زمین پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو دن ہوتا ہے اور جب نہیں پڑتی تو رات ہوتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ سورج کبھی روشنی دیتا ہو اور کبھی نہیں۔ سورج تو مسلسل روشنی بھیجے چلا جارہا ہے۔ یہ زمین ہے کہ جب وہ اپنا رخ سورج کی طرف کر دیتی ہے تو اس پر اس کی روشنی پڑنے لگتی ہے اور دن ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ سورج سے منہ موڑ لیتی ہے تو اسکی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے اور اس پر رات چھا جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ زمین کے پاس اپنی روشنی نہیں ہے۔ زمین اپنی مصنوعی روشنی کتنی ہی فراہم کرے، سورج کی روشنی کا بدل نہیں بن سکتی بلکہ زمین سورج کی محتاج ہے۔ سورج آسمان میں ہے۔ اس لیے زمین والوں کو دن کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے آسمانی روشنی کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

جس طرح طبیعی دن کی روشنی کے لیے ایک مادی سورج ہے اسی طرح شعوری دن کے لیے بھی ایک سورج ہے۔ اس سورج کو اللہ کا رسول کہا جاتا رہا ہے۔ اس سے ملنے والی ہدایت ہی اس سے حاصل ہونے والی روشنی ہے۔ ہدایت کا یہ سورج ہمیشہ سے روشنی مسلسل دیے جارہا ہے۔ یہ دراصل انسانی آبادی ہے جو کبھی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو نظام حق اپنی نعمتوں اور برکتوں کے ساتھ اس پر سایہ فگن ہوتا ہے، اور جب اس سے منہ موڑ لیتی ہے تو ان نعمتوں سے محروم ہو کر نظام باطل کے شکنجے میں کس جاتی ہے جو بالآخر اس دنیا کو جہنم بنا کے چھوڑتا ہے۔ اتنی بات غنیمت ہے کہ باطل اپنے کو علم اور روشنی تو کہتا ہے مگر آسمانی نہیں کہتا ہے جبکہ حق ہمیشہ سے اپنے کو آسمانی کہتا آیا ہے۔

☆☆☆

طلبہ کا ایک تربیتی اجتماع

کچھ عرصہ ہوا پٹنہ کمشنری کے طلبہ کا ایک تربیتی اجتماع، پانچ دنوں کا (۱۹۶۹ء)، شمالی محلّہ شیر گھاٹی ضلع گیا میں منعقد ہوا تھا۔ اس پنج روزہ اجتماع میں ایک خاص ترتیب سے تلاوت آیات، مطالعۂ حدیث، مطالعہ سیرت اور مطالعہ لٹریچر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ان سب پروگراموں کی ابتدا نماز تہجد سے کی جاتی تھی، خطاب عام اور مذاکرے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اس تربیتی اجتماع کے نگراں اور مربی ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب امیر جماعت اسلامی ہند پٹنہ تھے۔ اس تربیتی اجتماع کی مفصل روداد محمود عالم صاحب متعلم مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ نے مرتب کر کے ہمارے پاس بھیجی تھی۔ ہم پروگراموں کی جزئیات کو حذف کر کے اس کے ایسے حصے یہاں دے رہے ہیں جو قارئین زندگی کے لئے بھی مفید ہوں گے۔

(سید احمد عروج قادری، ماہنامہ زندگی رام پور)

ضیاء الھدیٰؒ کی افتتاحی تقریر: محترم ساتھیو ! آج ہم اپنی تربیت کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ مگر یہ سمجھ لیجئے کہ ہم میں سے کوئی مربی نہیں ہے اس لئے کہ کوئی کامل نہیں ہے۔ بلکہ ہم سب اپنی تربیت کے خود محتاج ہیں اور اسی تربیت کے ذریعے باہمی تعاون سے اپنے تمام پہلوؤں کے نقائص پر بتدریج قابو پا سکتے ہیں۔ تربیت کے مقاصد بہت ہیں اور جو مقصد پیش نظر ہوتا ہے، اس کی مناسبت سے تربیت کے پروگرام اختیار کئے جاتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہئے کہ ہمارے پیش نظر اپنی تربیت کا کون سا مقصد ہے؟ ہم اسلام کو لے کر اٹھے ہیں اور اسلام کے مکمل نظام کو برپا کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ہمیں خود سب سے پہلے علمی و عملی طور پر اسلام کا نمونہ ہونا چاہئے۔ اسی طرح ہم اللہ کی رضا حاصل کر سکتے اور دوسروں کو اسلام کے اس نظام کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں جو فلاح دارین کا واحد ضامن ہے۔ ہمارے پیش نظر اپنی تربیت کا یہی مقصد ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی امامت دی تو انہوں نے اپنی ذریت کے لئے بھی اس منصب جلیلہ کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اس کے مستحق ظالم نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ظلم کی تمام قسموں سے ہمیں بچنا ہوگا۔ اس کے بعد امامت کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے جو ایجابی پروگرام یا لوازم ہیں ان کی نشاندہی کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ایک نبی مبعوث کیجئے جو اس پروگرام کے ذریعے اس آئندہ امت کو منصب امامت کا اہل بنا دے۔ دراصل وہی پروگرام ہماری تربیت کا پروگرام ہے اور وہی اجزا ہمارے تربیتی پروگرام کے اجزا ہو سکتے ہیں۔ آپ پانچ دنوں کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے پانچ دنوں میں تربیت تو نہیں ہو سکتی۔ وہ تربیت جو ہمہ وقت، پیہم اور مسلسل ہی ہونی چاہئے۔ اس لئے ان پانچ دنوں میں تربیت کی سمت میں ایک قدم بڑھا کر آگے راہ کی نشان دہی کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جس پر ہم کو تا زندگی چلتے رہنا ہے۔ البتہ وقتاً فوقتاً راہ کے ہر موڑ پر یا گزرتے ہوئے وقت کے مختلف وقفوں پر ہم کو باہم مل کر اپنا جائزہ لیتے رہنا ہے کہ اس راہ میں ہم کتنا آگے بڑھے اور کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں۔

تربیت دراصل نام ہے اس کا کہ آدمی کی فکر کو منضبط کر دیا جائے۔ فکر کو جو حقیقی سرچشمہ ہے آدمی کے تمام ذمہ دارانہ افعال

کا۔اس کے بعد اس کے جوارح کو اس فکر کے تابع ہو کر پوری ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا عادی بنا دیا جائے۔ چنانچہ ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنی فکر کو اسلامی اقدار کے مطابق منضبط کریں اور ان کے تقاضوں کو پورا کرتے رہنے میں تساہل کو راہ دیئے بغیر پوری تندہی کے ساتھ وقت پر انجام دینے میں لگے رہیں۔ انشاء اللہ اس طرح ہم اپنی اپنی ہمتوں کے مطابق تربیتی مدارج طے کرتے جائیں گے۔ اللہ ہمارا مددگار ہے۔ وھو المستعان

تلاوت آیات کیا ھے ؟: صبح میں تلاوت آیات وتزکیہ کا پروگرام تھا۔ چنانچہ ہمارے مربی محترم ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ صاحب نے، جن کو ہم طلباء ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، تلاوت آیات وتزکیہ کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا: امامت کے لائق بنانے کے لئے ایک نبی کے مبعوث کئے جانے کی دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ اس پروگرام کے اجزاء آپ نے حسب ذیل بتائے۔(۱) تلاوت آیات۔(۲) تعلیم کتاب وحکمت اور (۳) تزکیہ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخش کر جب اس نبی کو مبعوث کیا تو اس کے پروگرام کا ذکر ذرا ترتیب بدل کر کیا اور تزکیہ کو تلاوت آیات کے بعد رکھا جس کی دیگر مصلحتوں پر گفتگو اس وقت موضوع سے باہر ہے۔ اس لئے صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ حقیقی تزکیہ دراصل تلاوت آیات ہی سے حاصل ہوتا ہے اور تعلیم کتاب وحکمت کو اس کے بعد رکھ کر ترقی پذیر تمدن کیلئے جس وسیع علم احکام کی ضرورت ہے اس کی راہ نکال دی۔

اس وقت تلاوت آیات سے ہمارا مقصد ہے آسمان وزمین یعنی کائنات پر اور اس کے اندر واقع ہونے والے تغیرات و حالات پر غور وفکر کرنے پر ابھارنے والی اور غور وفکر کے لئے صحیح ڈھنگ بتانے والی آیات قرآنی پر تدبر کرنا۔ اس سلسلے کی سب سے بنیادی آیات ہیں: ان فی خلق السموات و الارض و اختلاف اللیل و النھار (آل عمران:۱۹۰)

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کی بناوٹ میں اور دن اور رات کے اختلافات میں نشانیاں ہیں اولوالالباب کے لئے۔ آیت یعنی نشانی اس چیز کو کہتے ہیں جس کو دیکھ کر یا محسوس کر کے کسی دوسری چیز کو ہم معلوم کریں، جس کو دیکھ نہ رہے ہوں یا محسوس نہ کر سکتے ہوں۔ لیکن یہ نشانیاں صرف اولوالالباب کے لئے ہیں۔ اولوالالباب کے بارے میں قرآن بتاتا ہے: والذین اجتنبوا الطاغوت (الزمر:۱۷۔۱۸)۔ یعنی اولوالالباب کی چار خصوصیات ہوتی ہیں:

(۱) طاغوت کی غلامی سے بچنے والے (۲) اللہ کی طرف رجوع کرنے والے
(۳) بات توجہ سے سننے والے (۴) بات کے احسن مفہوم پر عمل کرنے والے

آخری دو خصوصیتیں تو ایسی ہیں جو ادنیٰ حقیقتوں کی دریافت کے لئے بھی ناگزیر ہیں۔ جن کے بغیر ایک مادہ پرست سائنس داں بھی کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ رہیں اعلیٰ حقیقتیں تو ان تک رسائی پانے کے لئے ان کے ساتھ پہلی دو شرطیں بھی ناگزیر ہیں اور ان کا ناگزیر ہونا واضح ہے۔

صرف آسمان وزمین کی بناوٹ اور اختلاف شب وروز پر غور وفکر میں جب وہ ہمہ تن مشغول رہتے ہیں، ایسے مشغول کہ بیداری کے لمحے اور حرکت وسکون کی ہر حالت میں یہی غور وفکر ان کا اوڑھنا اور بچھونا ہوتا ہے اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس عمل میں وہ منہمک رہتے ہیں تو یہ نشانیاں ان کو اس حقیقت تک پہنچا دیتی ہیں کہ یہ سب کچھ یوں ہی آپ سے آپ اندھی بہری فطرت سے نہیں بن گیا ہے بلکہ وجود بخشنے والا ایک علیم وحکیم خلاق یعنی اللہ ہے، اور اب جب اللہ کے ذکر کے ساتھ پھر وہ اس پر غور کرتے ہیں اسی انہاک کے ساتھ تو یہ حقیقت ان پر منکشف ہوتی ہے کہ اللہ نے اسے باطل اور مہمل نہیں پیدا کیا ہے بلکہ حق کی بنیاد پر پیدا کیا ہے۔ اس لئے حق کا ساتھ دینے ہی میں امن وطمانیت حاصل ہو سکتی ہے اور باطل کو اپنانے کے بعد انتشار کا شکار بنے بغیر چارہ نہیں ہے، وہی انتشار جس کا

علامتی پیکر آگ ہے۔ رہی حق کی ماہیت اور اس کی تفصیل تو وہاں تک رسائی محض غور وفکر سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ اس کیلئے براہ راست اللہ کی طرف سے معلم کا آنا ضروری ہے اور جب وہ آجائے تو اس کی تعلیمات کو قبول کر لینا بھی ناگزیر ہے۔

یہ ہے وہ انتہا جہاں تک غور وفکر کے نتیجے میں آدمی کو پہنچنا چاہئے۔ اس طرح قرآن نے کائنات پر غور کرنے کیلئے ایک Impetus بھی دیا ہے۔ غور وفکر کے لئے ضروری شرائط بھی بتائیں اور اس کے لئے خطوط بھی دے دئے اور منتہائے مقصود بھی بتا دیا، اور اس طرح اس نے ہماری کوششوں کو غلط زاویوں سے چل کر غلط راہوں میں بھٹک کر ضائع ہونے سے بچالیا۔

یہاں پر ایک قرآنی حکمت کر مزید سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کسی راہ کے مسافر کے لئے یا کسی بھی کام کو انجام دینے والے کے لئے صرف اس چیز کو نصب العین، منتہائے مقصود اور اپنا ہدف قرار دینے کو کہتا ہے جو ارادہ اور شعور کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہو۔ رہیں درمیان راہ یا دوران عمل میں خود بخود بغیر ارادہ حاصل ہو جانے والی چیزیں تو وہ ان کو مقصود بنانے سے منع کرتا ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ احمقانہ فعل ہے بلکہ اپنے ارادے اور شعور کا ضیاع بھی ہے۔ ایسا کرنے سے اصل منزل کھوٹی بھی ہوتی ہے اور وہ ذیلی چیزیں انسان کے لئے وبال بن جاتی ہیں۔ اس لئے جب قرآن کے بتائے ہوئے خطوط پر ان کے حدود میں رہتے ہوئے ہمارے اسلاف نے آیات کی تلاوت کی تو وہ نہ صرف یہ کہ اخلاق وروحانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچے بلکہ مادی علوم واکتشافات میں، ایجادو اختراعات میں اور تسخیر کائنات میں بھی وہ اپنے دور کے امام ہوئے، لیکن جن لوگوں نے ان خطوط میں سے صرف آخری دولائن پر چل کر اور قرآنی حدود سے بے نیاز ہو کر آیات یعنی کائنات پر غور کیا وہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تو دیوالیہ ہیں ہی، تسخیر کائنات کے سلسلے میں جو پیش قدمی انھوں نے کی ہے وہ ان کے اور بنی نوع انسان کے لئے مصیبت اور بلا بن گئی ہے اور خود ہمارا حال تو اور بھی گیا گزرا ہے کہ نہ روحانی واخلاقی برتری حاصل ہے اور نہ ہی مادی بلکہ دنیا میں ہم پسماندگی کا نشان بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اپنے اسلاف کے صرف نام لیوا تو ہیں مگر تدبر آیات کے سلسلے میں ہم نہ ان خطوط پر چلتے اور نہ حدود کو جانتے ہیں۔

بطور مثال میں اسی کائنات کی روشنی میں طبیعیات کا ایک مسئلہ حل کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔ آفرینش کی اصل کیا ہے؟ روشنی یا تاریکی؟ یعنی عدم سے وجود میں آنے والی چیز روشنی ہے یا تاریکی؟ قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی اساس حق پر ہے اور حق کی علامت (Symbol) روشنی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ عدم سے وجود میں آنے والی چیز فی الاصل روشنی ہے اور تاریکی اس کا منفی پہلو ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ تخلیق سے پہلے یہاں نہ روشنی تھی نہ تاریکی بلکہ روشنی اور تاریکی کے بین بین ایک کیفیت تھی جسے Cosmus کہہ لیجئے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ جب آپ قرآنی خطوط پر اپنی فکر سے اور اس کے بتائے ہوئے فطری حدود کے اندر اپنی جولانی طبع سے کام لیں گے تو یہ آپ کے فطری ارتقاء پر ناروا پابندی نہیں ہوگی بلکہ یہ پابندی فکر کو حیران اور آوارہ ہونے سے بچائے گی۔ اس طرح کم سے کم وقت میں آپ صحیح نتیجے تک پہنچ جائیں گے اور مادی وطبعی عوامل دوران غور وفکر ضمناً خود بخود آپ کے احاطہ علم میں آجائیں گے اور اس علم سے حاصل ہونے والے مادی فوائد بھی از خود آپ کو میسر آتے جائیں گے۔

اب آپ کو ان پانچ دنوں میں لیل ونہار کے اختلاف سے متعلق آیات قرآنی کو مختلف مقامات سے یکجا کرنا ہے، پھر ان میں سے ان آیات کو لے کر جن میں دن اور رات کے گھٹنے بڑھنے کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ان کو اس طرح ترتیب دینا ہے جس سے آپ اس منتہا کی سمت میں آگے بڑھکر مطلوبہ نتیجہ کو اخذ کرسکیں اور علمی استدلال کی بنیاد پر مخاطب کو مطمئن کرسکیں کہ اس کائنات میں حق کا مقام اور اس کا انجام کیا ہے۔ قرآن میں حق کو روشنی اور باطل کو تاریکی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس طرح وہ دن کو حامل روشنی اور

رات کو حامل تاریکی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

بقیہ پروگرام: اسی طرح تزکیہ، تعلیم کتاب وحکمت، مطالعۂ حدیث، مطالعۂ سیرت، مطالعۂ لٹریچر، مذاکرے اور خطاب عام کے پروگرام بھی پابندیٔ اوقات کے ساتھ چلتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان مطالعات میں درس وتدریس اور افہام وتفہیم کا انداز اختیار کیا تھا۔ طلبہ سے ہر موضوع پر وہ تیاری کراتے اور پھر ان کی رہنمائی کرتے تھے اور ہر مطالعے کا حاصل طلبہ کو لکھوا دیا جاتا تھا۔ امید ہے کہ اس طرح طلبہ کو بہت فائدہ پہنچا ہوگا۔ خطاب عام بھی ڈاکٹر صاحب نے طلبہ ہی سے کرایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان پانچ دنوں میں طلبہ کو ہر طرح تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خطاب عام کے پروگرام میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے ذمے سوالات کے جوابات رکھے تھے۔

اجتماع کے چوتھے دن ناظم حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''دوستو! ہم جس راہ کے مسافر ہیں اس میں ہر جگہ اور ہر موڑ پر خطرات ومصائب سے سابقہ پیش آئیگا ہمیں اللہ کے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے ہر مرحلہ پر صبر وتحمل سے کام لینا ہے۔ اسلام کے غلبہ کے لیے جدوجہد کرنا اور اقامت دین کے لیے کوشش کرنا کوئی اخلاقی بندش نہیں ہے لیکن تحریک اسلامی کے علمبرداروں کو ہر جگہ اور ہر وقت اخلاقی حدود کی پابندی کرنی لازمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نوجوانوں کی طبیعت کچھ نہ کچھ رنگین ہوتی ہے لیکن ہم اپنی رنگینیٔ طبع کے ساتھ اس تحریک کو ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ لہذا ہمیں سنجیدگی اور شائستگی کو اپنا شعار بنانا چاہئے اور ہماری حرکات وسکنات، گفتار وکردار غرض کہ ہر چیز سے ظاہر ہو کہ ہم تحریک اسلامی کے کارکن ہیں اور اعلیٰ عقائد ونظریات کے حامل بلند وبرتر اصولوں کے مالک اور بہترین نظام حیات رکھنے والے ہیں۔

بفضلہ تعالیٰ جماعت اسلامی نے دعوت کے لیے ایک وسیع لٹریچر فراہم کر دیا ہے۔ ضرورت ایسے ہاتھوں کی ہے جو اس لٹریچر کو گھر گھر پہنچا دیں۔ ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلامی لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

دوستو! چار دن کے قیام کے دوران میں ہم میں جو ربط قائم ہوا ہے اسے اور بڑھانے کی ضرورت ہے، کیونکہ جب تک آپس میں محبت کے گہرے تعلقات نہ قائم ہوں بنیان مرصوص بن کر اللہ کی راہ میں کیسے پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ لہذا ہم میں سے ہر رفیق کو چاہیے کہ ہر ایک رفیق کا پتہ لکھ لے تاکہ ہم خط وکتابت کے ذریعے ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب ہو سکیں۔ خدا پھر ہمیں جلد ہی ملائے۔ آمین!

اس کے بعد ناظم صاحب نے حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی (ہند) پٹنہ کے دستور کا تعارف اور اس کے کاموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مجلس برخاست کر دی۔

آخری دن صبح کو تلاوت آیات کے پروگرام میں تمام طلبہ نے اپنے اپنے حاصل مطالعہ کو تحریری شکل میں پیش کیا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے سب کی اصلاح کی اور تلاوت آیات کے سلسلے میں مزید رہنمائی فرماتے ہوئے کہا:

تلاوت آیات: کائنات کو جس نے پیدا کیا ہے اس نے قرآن کو نازل کیا ہے۔ اس لئے کائنات اور قرآن دونوں کا مزاج ایک ہے۔ کائنات ایک ایسا کل ہے جس میں ہم آہنگی ہے۔ اس طرح قرآن بھی ایک ہم آہنگ کل ہے۔ اس لئے کائنات کے اجزاء کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو وہی نتیجہ صحیح ہوتا ہے جو کائنات کے کلی مزاج کے مطابق ہو نہ کہ اس سے مختلف۔ کائنات ایک ہم آہنگ کل ہے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مزاج توحید ہے، یعنی اس کا ذرہ ذرہ ایک قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سائنس کی راہ میں ایک قدم بھی بڑھایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے کوئی ایسا تجربہ جو اس حقیقت کے خلاف نشان دہی کرنے والا ہو غلط ہوتا ہے۔ اسی طرح

قرآن کے کسی جزء پر غور کرنے کے بعد اگر کوئی ایسا نتیجہ سامنے آجائے جو قرآن کے بنیادی مزاج سے متصادم ہوتا ہو تو وہ صحیح نہیں ہو گا۔ قرآن کا بنیادی مزاج تین قسم کا ہے۔ توحید۔ رسالت۔ آخرت۔

مادی دنیا میں جب ہم اس کے اجزاء پر تجربہ کرتے ہیں تو اس کے اجزاء کی ترکیب اور تحلیل سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے تجربے میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو آپس میں ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو غیر مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ مشابہ چیزوں کو ترکیب یعنی کمپوزڈ کیا جاتا ہے اور غیر مشابہ چیزوں کو ترکیب نہیں دیا جاتا ہے اور ترکیب دینے میں سائنس داں کسی تعصب کو دخل نہیں دیتا ہے بلکہ مشابہ چیزوں کو ملانے سے جو نتیجہ بھی نکلتا ہے اس کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر اپنے نظریات قائم کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن کے اجزاء بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ محکمات اور متشابہات۔ ان میں سے محکمات ہی کو سامنے رکھ کر کسی نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ اور ان کی ترکیب سے جو نتیجہ بھی سامنے آئے اس کو عالمانہ ظرف کے ساتھ تسلیم کرلینا چاہئے اور کسی تعصب کو راہ نہیں دینا چاہئے۔

اختتامی پروگرام: اس کے بعد وقفہ تھا جس میں تمام رفقاء نے ایک دوسرے کے پتے حاصل کئے۔ مطالعۂ حدیث و لٹریچر اور مطالعہ سیرت و کتاب و حکمت کے پروگرام میں حسب معمول مشقی سوالات دئے گئے اور طلبہ کے جواب کی غلطیوں کی اصلاح کی گئی۔

شام کو بعد نماز مغرب ڈاکٹر صاحب نے خطاب فرمایا۔ حاضرین کی تعداد پانچ سو تھی۔ خواتین سامنے والے مکان میں جمع ہو کر تقریر سن رہی تھیں۔ مردوں میں غیر مسلم کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے تقریباً سوا گھنٹہ خطاب فرمایا۔ حاضرین بڑے سکون کے ساتھ تقریر سن رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر نے شیر گھاٹی کی فضا میں صدائے حق کو اور زیادہ بلند کردیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں جس بات پر روشنی ڈالی وہ یہ ہے کہ دنیا آج انسانوں کے ہاتھوں تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔ اس کو بربادی سے بچانے کی واحد صورت اسلام ہے۔ خطاب عام ختم ہوا۔ نماز کے بعد ہم سب نے کھانا کھایا۔ ہمارا تربیتی اجتماع ختم ہوگیا تھا۔ ہمیں ایک نئی زندگی اور ایک نئی روشنی ملی جس کی مدد سے راہ طے کرنی ہے۔ صراط مستقیم ہماری نظروں کے سامنے ہے اور قرآن و سنت مشعل راہ کا کام دے رہے ہیں۔

⑩⑩⑩

پندرہویں صدی ہجری اور اس کی اہمیت

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ

(یہ مضمون ۱۹۸۱ء میں حلقہ طلبہ اسلامی، بہار کے مجلّہ 'میزان' میں شائع ہوا۔)

اب سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پورے کرۂ ارض پر انسان آباد رہا ہو، اس لئے دین حق کی حیثیت سے اسلام بھی پورے کرۂ ارض پر نافذ نہیں ہوا اگر چہ ایسا ہوتا رہا کہ زمین کی مجموعی آبادی وقفے وقفے سے اسلام کی علمبردار رہا کی ہے، مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کا زمانہ: اس وقت وہ اپنے بچوں سمیت مسلم ہی تھے اور کافر کوئی بھی نہیں تھا۔ یا مثلاً حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ کشتی میں سلامت رہ جانے والے لوگ، اور کچھ دنوں تک ان کی نسل سب کے سب مسلم ہی رہے اور کافر ایک شخص بھی نہیں تھا۔ لیکن انسانی تاریخ کے یہ ابتدائی زمانے ہیں جب انسانی آبادی ایک ہی جگہ سمٹی ہوئی تھی۔ بعد میں یہ زمین پر پھیلتی چلی گئی اور ایک ایک علاقہ کے لوگ ایک ایک قوم بنتے چلے گئے، اور ان قوموں کے اندر بھی ایسا ہوتا رہا کہ کبھی اس قوم میں اور کبھی اس قوم میں اسلام قومی دین کی حیثیت سے غالب ہوتا رہا مگر تمام قوموں میں بیک وقت بین الاقوامی دین کی حیثیت سے کبھی غالب نہیں ہوا۔

سب سے آخر میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جب دین حق کی تکمیل ہوگئی تو آپکے زمانے میں جزیرۃ العرب میں اسلام سارے دینوں پر غالب ہوگیا اور آپ کے بعد بہت جلد انسانی آبادی کے بہت بڑے حصے پر اس کا غلبہ اور نفاذ عمل میں آیا، پھر بھی ابتک باوجودیکہ تقریباً دنیا کی ہر قوم اور آبادی میں اس کے ماننے والے موجود ہیں، وہ پوری دنیا کا غالب دین نہیں بن سکا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ اس نے آپ کو آخری نبی بنایا اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور آپ کے ذریعہ دین کو مکمل کردیا اور آپ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث کرنے کی غرض یہ بتائی کہ اس دین حق کو سارے دینوں پر غالب کردے۔ اس کا Process یہ بتایا کہ یہ کام لازمی طور پر براہ راست آپ ہی کے ذریعہ انجام نہیں پائے گا بلکہ اس کی توسیع کا سلسلہ جاری رہے گا۔ چنانچہ اسلام کی توسیع اور اشاعت کا یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے اور قرآنی وعدے کی یہ تکمیل بھی باقی ہے۔ یہ تکمیل کب ہوگی؟ اس پر آئندہ سطروں میں ہم روشنی ڈالیںگے۔

ہم فطرت کے نظام پر غور کرتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہاں ہر کام Cyclic Order یعنی چکر میں چل رہا ہے۔ مثلاً دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا چکر ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ہمیشہ دن رہے یا ہمیشہ رات رہے بلکہ ایک کے بعد دوسرے کا آنا لازمی ہے۔ اسی طرح موسم کا ایک چکر ہے جو مسلسل چل رہا ہے۔ اس میں بھی کسی موسم کو دوام حاصل نہیں ہے۔ نظام شمسی کا ایک چکر ہے جو اپنے طور پر چل رہا ہے۔ سمندر، موسمی ہواؤں، بارش اور دریاؤں کا ایک چکر ہے جو چلا جارہا ہے۔ خزاں اور بہار کا ایک چکر ہے۔ چیزوں کے نشو ونما پانے اور پھر خاک میں مل جانے کا ایک چکر ہے۔ غرض یہ کہ ہست و بود کے اس عالم میں ہر طرف چکر ہی چکر کا سلسلہ ہے۔ چنانچہ جب ہم انسانی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ایک مسلسل چکر نظر آتا ہے اور وہ حق و باطل کے یکے بادیگرے آنے کا چکر ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ حق غالب ہوا تو ہمیشہ کیلئے غالب ہوا یا باطل چھا گیا تو ہمیشہ چھایا رہا۔ بلکہ دونوں ہی کے عروج وزوال کا ایک فطری Process ہے جس کے مطابق یہ سلسلہ چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

اس Process کو سمجھنے کیلئے کسی گاڑی کے چکے کو سامنے رکھئے۔ اس کے ایک حصہ پر نشان لگادیا جائے اس کے بعد اس کو

گھمایا جائے، چکے کا نشان زدہ حصہ جب سامنے آجائے گا یعنی ایک چکر پورا کرلے گا تو لازماً دوسرا چکر شروع ہو جائے گا۔ اس کو اور واضح طور پر سمجھنے کیلئے چکے کو دو حصوں میں بانٹ دیجئے۔ ایک حصہ سیاہ اور دوسرا حصہ سفید ہو۔ سیاہ حصہ ہلکی سیاہی سے شروع ہو کر خوب گہری سیاہی پر ختم ہونا چاہئے، بخلاف اس کے سفید حصہ ہلکی سفیدی سے بڑھتے بڑھتے انتہائی سفیدی تک لیجانے کے بعد بتدریج سفیدی کم کرتے ہوئے سیاہ حصے سے ملا دینا چاہئے۔ اب اگر چکے کو گردش دی جائے تو سیاہ حصہ جب تک نظر کے سامنے رہے گا آپ دیکھیں گے کہ سیاہی بتدریج گہری ہوتی جاتی ہے اور اپنے انتہائی کمال کو پہنچنے کے بعد یکا یک ختم ہو جاتی ہے اور سفیدی سامنے آجاتی ہے۔ لیکن سفیدی والے حصے کا معاملہ سیاہی سے مختلف ہے۔ یعنی سفیدی بھی بتدریج بڑھتی ہے مگر بہت جلد انتہائی کمال یعنی Climax پر پہنچ جاتی ہے اور Climax پر پہنچ کر اچانک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد جس طرح اسکو پہلے بتدریج عروج حاصل ہوا تھا اسی طرح بتدریج وہ زوال پذیر بھی ہوتی ہے۔ اس مثال سے انسانی تاریخ میں حق و باطل کی آمد و رفت کا قانون ٹھیک سے سمجھ میں آجائے گا۔ وہ یہ کہ حق بتدریج غالب ہوتا ہے اور اسی طرح دھیرے دھیرے زوال پذیر ہوتا ہے، لیکن باطل کا معاملہ مختلف ہے کہ وہ غالب تو ہوتا ہے دھیرے دھیرے مگر ختم ہو جاتا ہے یکا یک اور وہ بھی ٹھیک اس وقت جبکہ وہ اپنے شباب Climax پر ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ بات صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ گذشتہ تقریباً تین صدیوں سے باطل Quality اور Quantity (کیفیت وکمیت) کے ساتھ بتدریج چھاتا چلا گیا اور بالآخر ساری دنیا پر غالب ہو گیا۔ اس درمیان میں جب جب بھی اس کا چہرہ بے نقاب ہوا اور اس کی ناکامی آشکارا ہوئی تو اس نے ہر موقع پر ایک نیا چولا بدل لیا اور ایک نیا سائن بورڈ آویزاں کر لیا اور اس طرح دنیا کی رائے عامہ کو بیوقوف بنانے میں کامیاب ہوتا رہا مگر ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ اب باطل کے پاس کوئی افسوں باقی نہیں رہا ہے اور کوئی نیا (Ism) نظریہ زندگی پیش کرنے سے وہ یکسر قاصر ہو گیا ہے۔ گویا کہ نئی روپ ریکھا کے ساتھ اپنی کوئی معنوی اولاد پیش کرنے کیلئے وہ بانجھ ہو چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں حق جو گوشۂ گمنامی میں چلا گیا تھا اور اپنے آپ کو باقی رکھنے کیلئے دفاع پر مجبور ہو گیا تھا اب وہ کھلی روشنی (Lime Light) میں تقریباً آچکا ہے اور دفاع کے بجائے اقدام کی پوزیشن اختیار کر چکا ہے۔

اس صورتحال سے یہ بات بجا طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ موجودہ باطل کے مٹنے کیلئے تدریجی عمل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے طبعی تقاضے کے طور پر اسی وقت جبکہ مادی لحاظ سے وہ انتہائی عروج پر ہے جوانی کی موت مر جانے والا ہے اور انقلاب کا چکر باطل کی جگہ حق کو سامنے لے آنے والا ہے، چنانچہ پندرہویں صدی ہجری انشاءاللہ حق یعنی اسلام کی صدی ہوگی اور یقیناً ہوگی۔

اب آیئے آثار کائنات کی روشنی میں گفتگو کریں۔

ایک نشانی دن و رات کا الٹ پھیر ہے۔ جس میں دن غلبہ حق کے دور کی علامت ہے، اور رات غلبہ باطل کے دور کی۔ جب سورج کی روشنی بے کم و کاست زمین پر پڑتی ہے تو دن ہوتا ہے۔ اسی طرح جب زمین سورج کی طرف پیٹھ کر دیتی ہے تو اس پر رات چھا جاتی ہے۔ اسی طرح جب آفتاب رسالت کی ہدایت کی روشنی انسانی سماج پر پڑتی ہے تو غلبہ حق کا دور ہوتا ہے اور جب انسانی سماج آفتاب رسالت کی طرف پیٹھ پھیر دیتا ہے تو اس پر باطل کی رات چھا جاتی ہے۔ یہ دونوں دور یکا یک ایک دوسرے میں تبدیل نہیں ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ انقلاب بتدریج برپا ہوتا ہے۔ رات اور دن کے درمیان ایک وقفہ فجر کا ہوتا ہے اور اسی طرح دن اور رات کے درمیان ایک وقفہ مغرب کا ہوتا ہے۔ ان دونوں وقفوں میں دراصل دن کی مکمل روشنی اور رات کی مکمل تاریکی ایک دوسرے میں نفوذ کرتی ہے۔ چنانچہ اس وقت نہ دن ہوتا ہے اور نہ رات ہوتی ہے۔ ایسا ہی کچھ حال حق اور باطل کے دونوں دوروں کے درمیان ہوتا ہے۔ یعنی حق کی روشنی کے ساتھ باطل کی تاریکی کی آمیزش ہوتی ہے۔ سماج نہ تو آفتاب رسالت کی مکمل روشنی میں ہوتا ہے اور نہ باطل کی مکمل

تاریکی میں، اس کیفیت کو ہم نفاق سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس لئے کہ نفاق میں اسلام کی روشنی اور کفر کی تاریکی دونوں بیک وقت جمع ہوتی ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی عالم گیر جنگ سے پہلے عالم اسلام پر مشرق سے مغرب تک ایسی قیادت چھائی ہوئی تھی جو نہ تو پوری طرح سے مسلمان تھی اور نہ پوری طرح سے کافر، گویا یہ حق اور باطل کے لحاظ سے مغرب کا وقت تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے مشرق سے مغرب تک ہر جگہ ان قیادتوں کو اکھاڑ پھینکا اور پورے کرۂ ارض پر خالص کفر کی حکمرانی ہوگئی۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد یکا یک یہ دیکھنے میں آیا کے پھر انڈونیشیا سے مراکش تک کی ہر جگہ سابق ہی کی طرح منافق قیادتیں آگئیں۔ جو نام تو اسلام کا لیتی ہیں لیکن عملاً نظام کفر کی خدمت گار ہی نہیں علمبردار بھی بنی ہوئی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حق اور باطل کے اعتبار سے رات کے بعد آنے والے دن سے پہلے کا وقت یعنی یہ فجر کا وقت ہے۔ اس درمیان میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کے اسلام علمی میدان میں بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور کفر کو تقریباً شکست دے چکا ہے۔ اس کے بعد لازماً ساری دنیا پر اسی کو چھا جانا چاہئے۔

آثار کائنات میں روشنی کے تین ذرائع ہیں، ایک سورج دوسرے ستارے تیسرا چاند۔ سورج جس طرح خدا کی دی ہوئی اپنی ذاتی روشنی رکھتا ہے اسی طرح انسانوں میں رسول ہوتے ہیں۔ جن کی ہدایت کی روشنی اگرچہ خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے مگر وہ ان کی اپنی ذاتی ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے چاند کی روشنی اس کی ذات میں قطعاً نہیں ہوتی، وہ کل کی کل روشنی سورج سے لیتا ہے اور صرف اسی کو وہ منعکس کرتا ہے۔ قرآن میں رسولوں کو سورج سے تشبیہہ دی گئی ہے اور حدیث میں صحابہ کرامؓ کو ستاروں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن چاند کا اس صراحت کے ساتھ ذکر نہیں ملتا۔ البتہ حدیثوں میں یہ آتا ہے کہ امت محمدیہ میں جب گمراہی پھیلے گی تو اس کی اصلاح کیلئے اس میں مجدد دین پیدا ہوتے رہیں گے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر صدی پر ایک مجدد ہوا کریگا۔ مجدد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین کے معاملے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ صرف ہدایت نبوی کی روشنی کو پھیلاتا ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجدد دراصل چاند کے مثل ہوتا ہے۔ اب اس چیز کو سامنے رکھ کر ہم غور کریں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی ہجری تو آفتاب رسالت کی ہجری تھی۔ اس لئے اس کا شمار تو دن میں ہوگا۔ آفتاب رسالت کے غروب ہو جانے کے بعد دوسری صدی ہجری سے ہم رات کا شمار شروع کرینگے۔ گذشتہ حدیث کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ راتوں کا حساب کرنے کے لئے ہر صدی کو ایک رات قرار دینگے، اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر دی ہیں تا کہ تم سن اور تعداد کا حساب رکھ سکو، لہذا آفتاب رسالت کے پس پردہ ہو جانے کے بعد ہم صدی وار حساب لگائیں گے۔ اس نقطۂ نظر سے یعنی چاند کی منزلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے حساب لگانا چاہیں تو یہ پہلی رات دوسری صدی ہجری قرار پاتی ہے۔ صدی کے مجدد اول حضرت عمر بن عبدالعزیز قرار پاتے ہیں جنہوں نے اسلامی نظام میں جو واحد بگاڑ پیدا ہو گیا تھا یعنی خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی، اس کی اصلاح کی اور خلافت کو اپنی اصلی جگہ پر لا کر حق کی تجدید کر دی۔ اس طرح صدی بہ صدی مجدد دین پیدا ہوتے چلے گئے، اس حساب سے چودھویں صدی چودھویں صدی ہجری نہیں بلکہ پندرھویں صدی ہجری قرار پاتی ہے۔

چاند اپنی منزلیں طے کرتا ہوا مسلسل ترقی کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ چودھویں رات کا چاند بدر کامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مجدد دین کو بھی ہونا چاہئے، چنانچہ دیکھتے ہیں کہ زمانہ جیسے جیسے دور نبوت سے دور ہوتا گیا، گمراہی اسی طرح زندگی کے زیادہ سے زیادہ شعبوں میں پھیلتی چلی گئی اور ہر دور کے مجدد کو اپنے دور میں پھیلی ہوئی گمراہی کو مٹانے کی کوشش کرنی پڑی۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اس دور میں گمراہی پوری انسانی زندگی پر محیط ہوگئی ہے۔ اس لئے اس دور کے مجدد کو ہمہ گیر ضلالت کو مٹانا ہوگا، اس لئے اسے بدر کامل ہونا چاہے۔ تو اوپر کے حساب سے چونکہ پندرھویں صدی ہجری چودھویں رات قرار پاتی ہے اسلئے پندرھویں صدی

ہجری کا مجدد، مجدد کامل ہوگا گویا کہ وہ چودھویں رات کا چاند ہوگا اور چونکہ آثار وقرائن اس بات کی واضح نشاندہی کررہے ہیں کہ اب اسلام کے عملاً غالب ہوجانے کا وقت آگیا ہے، اس لئے اس متوقع مجدد کامل کے ہاتھوں اسلام کی صرف علمی تجدید ہی نہیں ہوگی بلکہ اس کا عملی نفاذ بھی ہوگا۔ یعنی مجدد اول نے جو گویا کہ ہلال تھا جس طرح اسلامی سیاست کی تجدید فقط علمی طور پر نہیں کی بلکہ اسے عملاً نافذ بھی کیا اسی طرح مجدد کامل یا بہ الفاظ دیگر بدر کامل بھی زندگی کے سارے شعبوں میں اسلام کی طرف علمی حیثیت سے تجدید نہیں کریگا بلکہ اسے عملاً نافذ بھی کرے گا اور اسلام کا یہ نفاذ صرف یہی نہیں کہ زندگی کے سارے شعبوں میں ہوگا بلکہ پورے کرۂ ارض پر ہوگا۔

مندرجہ بالا باتوں کو پیش نظر رکھ کر ہم اگر سورہ انشقاق کی ان آیتوں پر غور کریں تو قرآنی اشارات بہت واضح طور پر ہمارے سامنے آجائیں گے فلا اقسم بالشفق والیل وماوسق والقمر اذا انسق لترکبن طبقا عن طبق یعنی ''میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور اس اس چیز کی جس پر وہ رات چھا جائے، اور چاند کی جب وہ بدر کامل ہوجائے، یقیناً تم چڑھو گے یا سواری کرو گے طبق بہ طبق''۔ اس میں اشارۃً یہ بات کہی گئی ہے کہ ہمہ گیر ضلالت یا ہمہ گیر گمراہی کی رات آئے گی جس میں بدر کامل نمودار ہوگا، مگر اس سے پہلے شفق یعنی ایک خون ریز یا خوں فشاں شفق کی طرح ایک وقفہ گذرے گا۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے اسی وقفے کو حدیثوں میں جنگ عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ زمین انسانی لاشوں سے پٹی پڑتے گی یہاں تک کہ پرندہ اڑتے اڑتے تھک جائے گا یا گر جائے گا مگر لاشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ ہر آدمی بادنیٰ تامل یہ دیکھ سکتا ہے کہ پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے ساتھ ساتھ ایسی بھیانک جنگ شروع ہی ہونے والی ہے۔

اسی طرح سورہ فجر میں یہ بات کہی گئی ہے۔ ''قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت کی اور طاق کی اور رات کی جبکہ وہ چلے''۔ اس میں مندرجہ بالا باتوں کی روشنی میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ پہلی صدی ہجری ظاہر ہے آفتاب رسالت اس میں موجود تھا، اس لئے اسے رات قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ وہ لازماً دن تھی چنانچہ اس کو فجر سے تعبیر کیا گیا، اس کے بعد راتوں کی گنتی شروع ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کا ذکر کیا۔ یہ دس راتیں ظاہر ہے پہلی صدی کے بعد سے ہی شروع ہوں گی، گویا دوسری صدی سے گنتی شروع کیجئے تو گیارھویں صدی دسویں رات قرار پائے گی۔ قاعدے کے مطابق دس کے بعد گیارہ ہوتا ہے جو طاق عدد ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کا ذکر کرنے کے بعد بجائے اس کے کہ گیارھویں رات کا ذکر کرتا، گیارھویں اور بارھویں رات کا ذکر کرنے کیلئے یوں کہتا۔ والوتر والشفع ''یعنی طاق اور جفت کی قسم'' اس سے الٹ کر بیان کیا والشفع والوتر یعنی ''جفت اور طاق کی قسم'' یہ اس لئے کہ مندرجہ بالا حساب کے مطابق دسویں رات گیارھویں صدی قرار پاتی ہے اس کے بعد جو صدی آتی ہے وہ بارھویں ہے وہ طاق نہیں بلکہ جفت ہے۔ اور اس کے بعد تیرھویں آتی ہے جو طاق ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کا ذکر کرنے کے بعد طاق اور جفت نہ کہا بلکہ جفت اور طاق کہا۔ اور دس کے بعد پھر دوبارہ رات کا ذکر کیا۔ اور اس رات کے بارے میں یہ بھی کہا جب وہ چلی جائے گویا کہ یہ رات جب آئے گی تو اگر چہ اس لحاظ سے کہ آفتاب رسالت بہ نفس نفیس اس میں موجود نہیں ہوگا، وہ رات ہی ہوگی لیکن چونکہ آفتاب رسالت کی کامل روشنی اس شب میں دنیا پر چھا جائیگی۔ اس لئے وہ رات ہوتے ہوئے بھی رات نہیں رہے گی۔ بلکہ یوں کہئے کہ رات چلی جائے گی۔ اور یہ رات جو پندرھویں صدی کی ہوگی دراصل چودھویں کے رات کی قائم مقام ہوگی۔

پندرھویں صدی ہجری کی حقیقی اہمیت یہی ہے کہ یہ ہجری دراصل اسلام کی ہجری ہے اور اس لئے ہماری ہجری ہے۔ غلبۂ اسلام کی اس ہجری کے شایان شان استقبال کرنے کیلئے جو تبدیلیاں اپنے اندر لانی چاہئے اس میں کسی کوتاہی کے بغیر ہم کو پوری یکسوئی سے لگ جانا چاہئے تاکہ ہم اس کے اہل ثابت ہوسکیں۔

سچا مذہب کیا ہے؟

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

یہ کتابچہ اردو اور انگریزی میں راشد نیر صاحب اور ڈاکٹر احسن احمد صاحب کے ذریعہ امین پبلکیشنز سے شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر شاہد احمد صاحب، صدر شعبہ نباتات پٹنہ یونیورسیٹی نے کیا۔ اس کا ہندی ترجمہ ڈاکٹر سعید الحق نے کیا اور اسے 'ستیہ سندیش پرکاش' رمنہ روڈ، پٹنہ سے شائع کرایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے جب دنیا میں آنکھ کھولی تو اپنے بزرگوں کو ایک خاص مذہب پر پایا۔ بچے کی فطرت کے مطابق میں نے بھی اسی مذہب کو اپنا لیا۔ میرے چاروں طرف جو لوگ تھے، رشتہ دار اور پڑوسی، سب کے سب اسی مذہب کو ماننے والے تھے۔ میری دنیا بہت ہی محدود تھی۔ ابھی ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا شروع نہیں ہوا تھا کہ مذہب بہت طرح کا ہوتا ہے یا ایک ہی ہوتا ہے۔ بس آنکھ بند کر کے اپنے بزرگوں اور اپنے ماحول کی تقلید کرتا رہا۔ عمر جیسے جیسے بڑھتی گئی ملاقات اور تعلقات کا دائرہ بھی پھیلتا گیا۔ سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی ذہنی صلاحیت بھی ترقی کرتی گئی۔ اب یہ سمجھ میں آنے لگا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا مذہب تو وہی ہے جو ہمارا ہے لیکن اس مذہب پر عمل کرنے کا طریقہ ہمارے طریقے سے مختلف ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ملے جن کا مذہب بھی وہی تھا جو ہمارا تھا لیکن عقیدے اور عمل دونوں ہی معاملوں میں وہ ہم سے مختلف تھے۔ رفتہ رفتہ جب معلومات کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا میں یہی ایک مذہب نہیں ہے جس کو ہم مان رہے ہیں بلکہ بہت سے مذاہب ہیں اور ہر مذہب کے ماننے والوں کی بڑی تعداد ہے اور ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا مذہب سچا ہے اور باقی مذاہب غلط ہیں۔ خود جس مذہب کو میں مان رہا تھا اس کے اندر بھی وہ لوگ، جن کی سوچ اور طریقہ آپس میں مختلف تھا ایک دوسرے کو غلط اور اپنے آپ کو صحیح سمجھتے تھے۔ اور اگر دوسرے مذاہب کا معاملہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ اس معاملہ میں اور بھی سخت رائے رکھتے تھے۔ لیکن اپنے مذہب کے سچے ہونے کی دلیل ہر ایک کے پاس یہی تھی کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی مذہب پر پایا ہے۔ اب میرے دماغ میں یہ خیال آنے لگا کہ اگر کسی مذہب کے سچے ہونے کی دلیل یہی ہے کہ وہ باپ دادا سے آرہا ہے تو دنیا میں جتنے مذہب ہیں سب سچے ہیں، کیونکہ ہر ایک مذہب جو آج موجود ہے وہ اس کے ماننے والوں کے باپ دادا ہی سے ملا ہے۔ چاہے یہ باپ دادا دو تین پشت اوپر کے ہوں یا چالیس پچاس پشت اوپر کے۔ اور اگر سب مذہب سچا ہے تو پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایک دوسرے کو غلط کہنے کی بنیاد کیا ہے؟ سب مذہب سچا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس لئے کہ جتنے بھی مذہب ہیں ان کے آپس میں اختلافات بعض تو بالکل بنیادی ہیں اور ان کی بعض باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ بعض مذاہب ایسے ہیں کہ خود ان کے اندر تضاد ہے۔ اس بات نے الجھن میں مزید اضافہ کر دیا کہ ہر ایک مذہب سچا بھی ہے اور پھر ایک مذہب کے ماننے والے کے نزدیک باقی جتنے مذاہب ہیں سب جھوٹے اور غلط بھی ہیں۔ یہ ایک عجیب بات تھی جس میں میرا ذہن الجھتا رہا۔ آگے چل کر کچھ ذہین، دانشور اور ہوشیار لوگوں کو اپنے اپنے مذہب کو سچا ثابت کرنے کے لئے فلسفہ کی بھول بھلیوں، منطق کی جادوگری اور الفاظ کی شعبدہ بازی کا سہارا لیتے ہوئے پایا۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں نفس مذہب ہی پر میرا اعتماد بڑی حد تک مجروح ہو گیا اور میں یہ سوچنے لگا کہ مذہب واقعی کوئی حقیقی چیز ہے بھی یا نہیں؟ اور یہ کہ مذہب کی ہمیں سرے سے ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

اپنے غور و فکر کے نتیجے میں میں نے پایا کہ مذہب کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو خدا کا عقیدہ اور دوسرے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا یقین۔ ان دونوں چیزوں میں دوسری یعنی مرنے کے بعد کی زندگی ہی ایک ٹھوس بنیاد ہے جو مذہب کی ضرورت کو ناگزیر بنا دیتی ہے۔ مذہب کی یہ دونوں بنیادیں ان دیکھی ہیں یعنی خدا کو نہ ہم دیکھتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح موت کے بعد کی زندگی (اس کے لئے اب ہم آئندہ لفظ آخرت استعمال کریں گے) کو بھی نہ ہم دیکھتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے ہونے اور نہ ہونے کا امکان برابر ہے۔ اس پہلو سے ہم جائزہ لیں تو یہ چند شکلیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ مان لیا جائے کہ نہ خدا ہے اور نہ آخرت، دوسرے یہ کہ خدا ہے مگر آخرت نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ آخرت ہے مگر خدا نہیں ہے اور چوتھے یہ کہ خدا بھی ہے اور

آخرت بھی ہے۔

اگر پہلی بات صحیح ہو کہ نہ خدا ہے اور نہ یہ آخرت تو پھر مذہب کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ یہ خیال دہریوں کا ہے۔

اگر دوسری شکل ہو کہ خدا ہے مگر آخرت نہیں ہے تو ایسی صورت میں خدا کا وجود بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ اگر آخرت نہیں ہے اور زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے تو اس بات کا پورا امکان ہے اور یہ دیکھنے میں بھی آتا ہے کہ یہ زندگی اچھے سے بسر ہو یا بری طرح بسر ہو، اچھے یا برے عمل کا کوئی متعین نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اچھا آدمی ہر لحاظ سے اچھا ہے، لوگ اس کو اچھا سمجھتے ہیں اور وہ یا تو خوشی و عافیت کی زندگی بسر کر کے دنیا سے چلا جاتا ہے یا رنج و غم اور تکلیف ہی میں زندگی بسر کر کے دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک برا آدمی جس کا رویہ نہایت برا ہے اور دنیا والے اس کو برا سمجھتے ہیں وہ اپنی تمام برائیوں کے باوجود دنیا میں ہنسی خوشی زندگی بسر کرتا ہے اور ایک دوسرا برا آدمی تکلیفیں جھیلتا ہے اور مصیبتوں میں دن کاٹتا ہے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ اس دنیا میں کسی کام کا کوئی لگا بندھا اور متعین انجام نہیں ہے۔ اس طرح آخرت کے انکار پر مبنی مذہب کا ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔

تیسری شکل اگر یہ ہو کہ آخرت تو ہے لیکن خدا نہیں ہے تو یہ کون بتائے گا کہ آخرت میں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا؟ کیونکہ وہ تو دکھائی ہی نہیں دیتی ہے۔ خدا بتا سکتا تھا لیکن وہ تو ہے نہیں۔ اس لئے ایسی آخرت پر کوئی گفتگو کرنا ہی بے کار ہے جس کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو کہ وہاں کس کام کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ آخر ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے۔ جس میں کسی ایسی ہستی کا وجود ہی نہ ہو جس کی پرستش کی جائے۔

آخری شکل یہ ہے کہ خدا بھی ہے اور آخرت بھی ہے۔ اس عقیدے کے حامل مذہب میں خدا اور آخرت دونوں کی حیثیت با معنی ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں صرف یہ جائزہ لینا ہوگا کہ ایسے مذہب سے ہمیں کیا فائدہ ہے اور کیا نقصان ہے اور اس کے اثرات انسانی زندگی پر کیا مرتب ہوں گے۔

مذہب کا اس کی بنیاد کے پہلو سے جائزہ لینے کے بعد ہمیں مذہب کا اس کے پیش کرنے والے کے پہلو سے جائزہ لینا چاہئے۔ اس پہلو سے جب ہم غور کریں گے تو پائیں گے کہ کسی مذہب کو پیش کرنے والے کی شخصیت تین طرح کی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ شخص ہو سکتا ہے جو اس بات کا دعویٰ نہ کرے کہ میں خدا کا نمائندہ ہوں اور جو مذہب پیش کر رہا ہوں وہ خدا نے مجھے سکھایا ہے، دوسری شخصیت وہ ہو سکتی ہے جس کو خدا نے نہ اپنا مذہب سکھایا ہو اور نہ اپنا نمائندہ بنایا ہو مگر وہ جھوٹا دعویٰ لے کر دنیا والوں کے سامنے آئے کہ میں خدا کا نمائندہ ہوں اور جو مذہب پیش کر رہا ہوں وہ خدا کا مذہب ہے۔ تیسرا شخص وہ ہو سکتا ہے جس کو خدا نے اپنا مذہب سکھا کر اور اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہو کہ وہ دنیا والوں کو خدا کی طرف سے اس کا مذہب سکھائے۔

پہلی قسم کا شخص جو کچھ پیش کرے گا اس کی بنیاد عقل پر اور دلیل پر ہوگی۔ گرچہ اس کی ظاہری شکل مذہب کی ہوگی لیکن وہ دراصل مذہب نہیں ہے بلکہ ایک نظریہ (Theory) ہے۔ مذہب کی حیثیت سے اس نظریہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

دوسری قسم کا شخص جو خدا کا نمائندہ تو نہیں ہے مگر اس کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے _____ کہ اس کا یہ جھوٹا دعویٰ اس وجہ سے ہوگا کہ وہ آخرت کو نہیں مانتا ہوگا بلکہ وہ دنیا میں اپنا کچھ فائدہ چاہتا ہوگا۔ ایسا شخص دراصل استحصال (Exploit) کرنے والا ہے۔ جو لوگوں کو اپنے دام میں پھنسا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ جب ایک آدمی غور سے اس کی تعلیمات کو دیکھے گا تو خود بخود یہ بات اس کی سمجھ میں آجائے گی کہ ان باتوں میں صداقت نہیں ہے بلکہ یہ سب دنیاوی نفع حاصل کرنے کے لئے ہتھکنڈے کے طور پر گڑھی گئی ہیں۔

تیسرا وہ شخص جو خدا کا نمائندہ ہو اور خدا کی طرف سے کسی مذہب کو پیش کرے۔ یہاں ہمارے لئے یہ سوال پیدا ہوگا کہ خدا

کے نمائندے کی جو تعلیمات پیش کی جا رہی ہیں وہ حقیقی (Genuine) اور اصلی (Original) ہیں یا نہیں۔ اس میں ردوبدل کر کے کچھ کا کچھ تو نہیں کر دیا گیا ہے اور عوام کا استحصال (Exploit) کرنے اور دنیاوی فائدے کے لئے ان سچی تعلیمات میں تبدیلی کر کے حربے کے طور پر تو استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم سب سے زیادہ نازک صورت حال سے دوچار ہوں گے۔ اس لئے کہ اگر خدا کے کسی سچے نمائندہ کی تعلیمات میں ردوبدل کیا گیا ہوگا تو ایسا کرنے والے معمولی لوگ نہیں ہوں گے بلکہ بہت ذہین اور چالاک لوگ ہوں گے اور تقدس کا لبادہ اوڑھے ہوں گے۔ خدا اور خدا کے نمائندے کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہونے کا ڈھونگ رچانے والے ہوں گے۔ اس کی وجہ سے عام لوگ ان کی عقیدت میں گرفتار ہوں گے اور ان کی باتوں کے خلاف کچھ کہنا کھیل نہیں ہوگا بلکہ بھڑ کے کھوتے میں ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ مگر دوسروں سے محبت نہ کرتے ہوئے صرف اپنی بھلائی کے لئے سوچنے والے کو بہرحال اس بات پر آزادانہ غور کرنا ہی ہوگا کہ اس تک جو تعلیم پہنچی ہے وہ خدا کے سچے نمائندوں کے ذریعہ آئی ہے یا نہیں۔ اور وہ جس نتیجے پر پہنچے، اسے چاہے دوسروں کے سامنے پیش کرے یا نہ کرے اپنے لئے تو اسے فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ خدا کے سچے نمائندوں کی جو تعلیمات بدلی ہوئی شکل میں ہمارے سامنے ہوں گی ان کی اندر یہ تبدیلی دو میں سے کسی ایک وجہ سے آئی ہوگی۔ یا تو وہی خدا اور اس کے نمائندے کی جھوٹی محبت کا دعویٰ کرنے والے اور تقدس کا جامہ پہنے ہوئے لوگ ہوں گے جنہوں نے یہ تبدیلی لائی ہوگی، یا پھر عام لوگ جو اس مذہب کے ماننے والے ہوں گے دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں کے ساتھ رہتے رہتے ان سے متاثر ہو کر کچھ ان کی چیزیں انہوں نے اپنے مذہب کے طور پر اپنالی ہوں گی۔ اور یہ دونوں ہی طرح کی تبدیلیاں یا تو آخرت پر یقین نہ ہونے یا دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کے خیال کے نتیجے میں آئی ہوں گی۔ وجہ جو بھی رہی ہو یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ تبدیلیاں کون سی ہیں جواب موجود ہیں۔ اس میں کچھ بہت زیادہ دشواری نہیں ہوگی اور یہ اندازہ مل جائے گا کہ ان بدلی ہوئی تعلیمات میں مذہبی اجارہ داری یا سیاسی برتری حاصل کرنے یا برقرار رکھنے کی تدبیریں کی گئی ہیں۔

خدا کے نمائندوں کی تعلیمات میں کی گئی تبدیلی کا پتہ لگانے کے بعد ہم ان تبدیل شدہ حصوں کو چھانٹ سکتے ہیں شرط یہ ہے کہ پوری کی پوری تعلیم ہی مسخ نہ کر دی گئی ہو۔ مگر باقی حصے جو بدل دئے گئے ہیں ان کی اصل شکل کیا تھی یہ معلوم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہوگی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ خدا نے جب ہمارے لئے مذہب بھیجا تو دراصل وہ ہمارا بھلا چاہتا تھا۔ اگر لوگوں نے اس کو بگاڑ دیا تو اس نے اپنے سچے مذہب کو باقی رکھنے کا کوئی بندوبست ضرور کیا ہوگا۔ اس لئے خدا کے نمائندوں کی طرف منسوب کئے جانے والے جتنے مذہب پائے جاتے ہیں ان سب کو ہمیں کھنگالنا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کس مذہب کی تعلیمات ایسی ہیں جس سے صاف صاف معلوم ہوتا ہو کہ فلاں فلاں کام اور رویہ کا نتیجہ آخرت میں کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اور فلاں فلاں کام اور رویہ کے نتیجے میں آخرت میں نامرادی نصیب ہوگی۔ اور کس کی تعلیمات کا اثر دل و دماغ پر ایسا پڑتا ہے کہ ہم کیسا ہی کام کریں اور کیسا ہی معاملہ کریں ہم آخرت میں بہرحال کامیاب ہی رہیں گے اس لئے کہ ہم اس خاص مذہب کے ماننے والے ہیں۔ اس طرح کی تعلیمات آخرت کو بے اثر بنا دینے والی ہیں اور مذہب کے اندر تبدیلی اسی لئے اور اس طرح کی جاتی ہے تا کہ آخرت کی اہمیت ختم ہو جائے اور آدمی دنیا میں ہر طرح کا کام کرنے کے لئے مکمل طور سے آزاد ہو جائے۔ لیکن خدا کی تعلیمات میں ایسا نہیں ہوگا بلکہ وہ یہ بتائیں گی کہ کس کام کا نتیجہ آخرت میں بھلا ہوگا اور کس کام کا نتیجہ برا اور نقصان دہ ہوگا تا کہ انسان دنیا میں ویسی زندگی بسر کرے جس کا نتیجہ آخرت میں بھلا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو تو مذہب کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور خدا سے امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسا مہمل کام کرے گا۔

ہمیں اس بات کا بے لاگ جائزہ لینا چاہئے کہ کون سا مذہب اس نقص سے پاک ہے کہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے والا

اور عمل نہ کرنے والا دونوں کا انجام آخرت میں یکساں بتایا گیا ہوتا کہ آخرت اور مذہب دونوں کی ضرورت اور اہمیت واضح ہو۔ یہ اس طرح کہ ان تعلیمات کو ماننے کے نتیجے میں آخرت بنے اور نہ ماننے کے نتیجے میں آخرت برباد ہو۔ اس کے برعکس مذہب کا وہ نظریہ جس کے مطابق اچھے اور برے دونوں کام برابر ہیں ایک مہمل نظریہ ہے۔

خدا کی تعلیمات میں تضاد نہیں ہوسکتا کہ ایک طرف تو وہ آخرت کو ماننے کے لئے بھی کہے اور نیکی اور بدی کے کام بھی بتائے اور ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلا دے کہ اس کو ماننے اور نہ ماننے اور اس کے مطابق عمل کرنے اور نہ کرنے دونوں کا انجام یکساں ہوگا۔

جس مذہب کی تعلیمات کے مطابق آخرت میں متعین کام کا متعین انجام سامنے آتا ہے اور وہ انجام کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے تو اس مذہب کا انکار یا اس کی خلاف ورزی کرنا ممکن نہیں ہے۔

اگر ہر شخص اس پہلو سے بے لاگ جائزہ لے گا تو دنیا کے مذہبوں میں جو سچا مذہب ہوگا وہ اس کو مل جائے گا۔

☆☆☆

پیش بینی اور اشتباہ

'موجودہ تہذیب سے وفاداری کو ترک کردیں'

طلبہ کے نام پیغام

(ضیاءالہدیٰ'' کا بحیثیت سرپرست، حلقۂ طلبہ اسلامی، بہار یہ پیغام حلقۂ طلبہ کے مجلّہ 'میزان' کے ۱۹۷۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

وقت برف کی طرح تیزی سے پگھل رہا ہے۔ ہرلمحہ جوگذر رہا ہے، موجودہ تہذیب کی قیامت کو قریب تر کرتا جارہا ہے۔ موجودہ تہذیب اب اتنا جلد مٹ جانے والی ہے کہ جولوگ باقی رہیں گے وہ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ یہ تہذیب صرف خود ہی نہیں مٹے گی۔ بلکہ اپنے علم برداروں کے ساتھ مٹے گی اور جولوگ ان علم برداروں کے پیچھے چل رہے ہوں گے ان کا انجام بھی انہیں کے ساتھ ہوگا۔ یہ سترہویں صدی نہیں ہے جب موجودہ تہذیب اپنے بال و پر نکال رہی تھی اور اس کی علم برداری دنیا بنانے والوں کے لئے ایک بہترین نسخہ تھی بلکہ یہ بیسویں صدی کا آخری مرحلہ ہے جب کہ اس کی علم برداری اور اس کی حاشیہ برداری دونوں ہی دراصل ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔

خالص دنیاوی نقطہ نظر سے بھی عقل مندی کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی وقت کے اشاروں کو سمجھے اور مستقبل کے موڑ پر نگاہ رکھے۔ اب جب کہ یہ تہذیب مٹنے جارہی ہے۔ یقینی بات ہے کہ اس کی جگہ کوئی دوسری تہذیب لے لے گی۔ دوراندیشی کا تقاضہ یہی ہے کہ موجودہ تہذیب کے ساتھ وفاداری کو ترک کردیا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ آنے والی تہذیب کیسی ہوگی؟ اور پھر اپنے ذہن، اپنے رجحانات اور اپنی خواہشوں کو اسی کے مطابق بدلنے کی اور اپنے عملی رویوں کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع کردی جائے۔ یہ خالص Careeristic نقطہ نظر سے بھی بہت ضروری ہے۔ میں اپنے عزیز طلباء کو اس کی طرف خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ بظاہر انہیں دنیا میں زیادہ دنوں رہنا ہے۔ اور وہ ابھی Melting point میں بھی ہیں۔ انہیں چاہئے کہ جس پٹی پٹائی راہ پر وہ چلتے آرہے ہیں اسے فوراً چھوڑ دیں۔ مگر دوسری راہ کوئی بنی بنائی نہیں ہے جس پر وہ آسانی سے چلنا شروع کریں۔ یہ راہ انہیں خود بنانی ہوگی۔ اور تاریخ سازی کا رول ادا کرنا ہوگا۔

''میزان'' کے صفحات میں مجھے امید ہے کہ اس سلسلہ کے نکات اور اشارات انہیں مل جائیں گے۔ البتہ ان نکتوں اور اشاروں سے جو خاکہ بنے گا، اس میں رنگ بھرنے کا کام طلبہ کو کرنا ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے طلباء اگر ہمت اور عزم سے کام لیں تو یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے اور اللہ کی تائید انہیں ضرور حاصل ہوگی۔ (انشاءاللہ)

سازش

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ

یہ مضمون پہلی دفعہ اسرائیلیوں کے ذریعہ مسجد اقصیٰ میں آتش زدگی کے بعد ''مسجد اقصیٰ کی بازیابی'' کے نام سے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحبؒ کی نظر ثانی کے بعد ''سازش'' کے نام سے مکتبہ دین و دانش، پٹنہ سے شائع ہوا۔

پیش لفظ

جس طرح شیطان اور شرارت لازم اور ملزوم ہیں اسی طرح سازش اور یہودیت دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ یہودیوں نے اپنی قوم کو محفوظ رکھتے ہوئے دنیا بھر کے لوگوں کے خلاف جو منصوبہ بند نقشہ بنایا ہے اس کا نام صیہونی پروٹوکال ہے۔ اس کو خفیہ رکھنے کی بہت کوششوں کے باوجود ان کو پہلے ہی قدم پر ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا یعنی انہی کے اندر کی ایک خاتون نے اس کی بھنک پا کر ان کے منصوبے کو باہر فاش کر دیا اور یہ اس لئے کہ وہ یہودی النسل نہیں تھی چنانچہ اس کے اندر ضمیر موجود تھا اور انسانیت سے محبت بھی تھی۔ صیہونی پروٹوکال کا کسی غیر یہودی کے پاس ہونا اس کے قتل کے لئے کافی تھا۔ لیکن اللہ کی مرضی، اب یہ چیز بازار میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کافروں کی مثال گردن میں طوق پڑے ہوئے انسان کی طرح دیتا ہے جو انکی تھوڑی تک ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے قدم کے پاس نہیں دیکھ سکتے ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے دیوار کھڑی کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ دور کی چیز بھی نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ انکے شان و گمان میں بھی نہ ہونے پر انکے راز ظاہر ہو گئے اور دور تک دیکھنے کی بات صرف Calculation پر مبنی ہے جو دھیرے دھیرے غلط ثابت ہوتے جا رہے ہیں مگر جہاں تک اللہ نے ان کو ڈھیل دی ہے وہاں تک انکو کچھ کامیابی بھی مل رہی ہے۔

انکی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انکے عقیدے کے مطابق دنیا کے سارے انسان انکی غلامی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور یہ سارے انسان دراصل انسان کی شکل میں جانور ہیں۔ ایک حد تک یہ بات درست بھی ہے۔ کیونکہ انہوں نے انسانی نفسیات کا جو مطالعہ کیا ہے وہ انہی لوگوں کو سامنے رکھ کر کیا ہے جن کے بارے میں خود اللہ نے کہا ہے کہ وہ چوپایوں کے جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں اور ان میں خود یہودی بھی شامل ہیں۔ چنانچہ یہ سارے انسان بلکہ Sub Human Psycology ہے۔ ابھی تک انکو Human Psycology سے واسطہ ہی نہیں پڑا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے Calculation پر اتنا اعتماد رکھتے ہیں جیسے ۲ اور ۲ چار ہوتا ہے۔ لیکن جب ان کا مقابلہ Human Psycology سے ہوگا تو دنیا دیکھے گی کہ ان کے سارے منصوبوں کی عمارت یکا یک اس طرح ڈھیگی جیسے تاش کے پتوں سے بنا گھروندہ اور انکی ہزاروں سالہ منصوبہ بندی چند دنوں میں خاک میں مل جائیگی۔

لوگ ان کی فوری ترقیوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں حالانکہ اس طرح کی وقتی کامیابی ان کو تاریخ میں اللہ اور بندوں کی ڈھیل سے مل رہی ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ہٹلر نے جرمنی سے انکو نکال باہر کیا۔ اب یہ اندازہ ہے کہ اب آخری موقع ہے جو انکو فلسطین میں ملا ہے جسکے بعد یہ کرۂ ارض ہی سے نابود کر دیئے جائیں گے اور آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ وہ وقت بس آ ہی لگا ہے۔

اس کتابچہ میں مختصر طریقہ پر انکی سازش اور انکی تاریخ کا ذکر ہے جو پڑھنے والوں کی غلط فہمی دور کر سکتا ہے۔

وما توفيقنا الا بالله

ضیاء الہدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلۂ پیغمبری میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلی کڑی ہیں جن کو اقوام عالم کا امام بنایا گیا۔ اس طرح دین اسلام یعنی فطری نظام زندگی کا بین الاقوامی ایڈیشن پہلی بار آنجنابؑ کے ذریعہ سے دنیا والوں کو عطا کیا گیا۔ آپ نے اس مشن کی تکمیل کے لئے اپنا پیغام پہنچانے کی غرض سے تین مراکز پر تین نائبوں کو مقرر کیا۔ فلسطین میں اپنے صاحبزادے اسحاقؑ کو، مکہ میں بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ کو اور سدوم میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو۔ اور خود باری باری تینوں جگہ پہنچ کر ضروری رہنمائی فرماتے رہے۔ پھر اللہ کی مشیت نے اس بین الاقوامی مشن کے ابتدائی مراحل کی خدمت کے لئے حضرت اسحاقؑ کی نسل کو اختیار کر لیا۔ اور اس طرح اہل حق کے لئے مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ذریعہ تعمیر نو کے چالیس سال بعد دوسرا قبلہ بیت المقدس تعمیر کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں فلسطین کو اس کی جغرافیائی لحاظ سے بین الاقوامی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی و مذہبی (Politico Religious) یعنی دینی اعتبار سے بھی بین الاقوامی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

یہودیوں کی قومی خصوصیات:

اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا جو حضرت اسحاقؑ کے صاحبزادے تھے۔ یعقوبؑ کی اولاد بنی یعقوب کے بجائے بنی اسرائیل کہلاتی ہے، انہیں ہی یہودی کہا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام قوموں میں ابتداءً یہ کم شریر تھی۔ اس لئے اس کی تمام شرارتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کو منصب امامت کے لئے اختیار کیا تھا۔ مگر جب اقتدار کا مزہ چکھنے کے بعد شرارت میں یہ دوسری قوموں سے آگے نمبر لے گئی تو بار بار سزا اور تنبیہہ کے بعد بالآخر یہ ملعون قرار دے دی گئی۔ اس قوم کی شرارتوں کی فہرست خواہ کتنی ہی لمبی ہو سبھوں کی جڑ اصل ایک ہے جو اس کی نسلی خصوصیات بن گئی ہے۔ وہ ہے 'سازش'۔

چنانچہ جس وقت یہ نسل وجود میں آرہی تھی اسی وقت اس نے کسی غیر کے مقابلے میں نہیں بلکہ اپنے شفیق باپ اور معصوم بھائی کے خلاف زبردست سازش کی، اور اس طرح سازش اس کی گھٹی میں پڑی اور سازش ہی اس کا خمیر ہوگیا۔ ساڑھے چار ہزار سال سے اپنی نسلی خصوصیت کی اس قوم نے نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ نسلاً بعد نسلٍ اس کو پروان چڑھا کر حیرت انگیز حد تک اس میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ اس نے سازش کی حضرت سلیمانؑ کے خلاف۔ اس نے سازش کی حضرت عیسیٰؑ کے خلاف۔ اس نے سازش کی رسولؐ کے خلاف۔ اور دور نبوت ختم ہو جانے کے بعد اس کی سازش کا ہدف مذہب کا اقتدار بن گیا۔ لیکن جب اقتدار مذہب کے ہاتھ سے نکل گیا اور لامذہبیت (Secularism) نے اس کی جگہ لے لی تو اب یہ ہر نئی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تحریک میں گھس کر اپنی نسلی امنگوں اور مفادات کے لئے پانچویں کالم کا کام کرنے لگے۔ اس غرض کے لئے کہیں یہ فکری انتشار پیدا کرتے ہیں اور کہیں اخلاقی بگاڑ۔ کہیں ایک قوم میں اندر سے پھوٹ ڈال کر اس کو طبقوں اور جتھوں میں منظم کرتے ہیں، اور کہیں قوموں کے درمیان عداوت پیدا کر کے ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیتے ہیں۔ اور بالآخر جب ان کی سازش کا بھانڈا پھوٹتا ہے تو پھر مارے اور کھدیڑے جاتے ہیں جس پر ان کی تاریخ گواہ ہے۔ یہود ہر جگہ الگ تھلگ رہتے بستے ہیں، اس کو اصطلاح میں گیٹو (Getto) بنا کر رہنا کہتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جہاں ان کو سارے حقوق دیئے گئے ہیں، وہاں بھی یہ گیٹو کی زندگی ہی بسر کرتے ہیں۔ حاخام ڈاکٹر سولا بول کہتا ہے 'گیٹو کی زندگی اختیار کرنا یہودیوں کا فطری فریضہ ہے۔ یہاں انہیں اپنے قومی عزائم کی پرورش کرنے اور دنیا پر غلبہ پانے کی تدبیریں سوچنے اور ان پر عمل کرنے کے طریقے تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے۔' یہودی ہمیشہ یہودی ہی رہتا ہے خواہ وہ اپنا مذہب ہی کیوں نہ بدل ڈالے۔

امریکہ اور یورپ کے بے شمار یہودیوں نے عیسائیت قبول کر لی مگر وہ ہمیشہ یہودی مقاصد کے علمبردار اور اغیار پر یہودیوں کے غلبہ پانے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

انہوں نے اپنی نسلی خصوصیت کر مزید مستحکم کرنے کے لئے اپنی مذہبی کتاب کو اسی رنگ میں رنگ ڈالا۔ جیسا کہ ذیل کے اقتباسات سے اندازہ ہوگا تلمود میں ہے:

☆ اللہ یہود پر بدبختی مسلط کرنے پر ہر روز نادم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے رخساروں کو پیٹتا ہے اور روتا ہے۔ اور اسکی دونوں آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے سمندر میں گرتے ہیں جس کی گونج دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنائی دیتی ہے۔ پانی میں طوفان آجاتا ہے۔ کبھی کبھی زمین ہل جاتی ہے جس کی وجہ سے زلزلے آتے ہیں۔

☆ اغیار کے ساتھ فریب اور غیر معمولی سود کے ذریعہ ان کے مال و دولت پر قبضہ کرنا جائز ہے۔

☆ ایک بہت بڑے حاخام ربی سموئیل کے خیال میں غیروں کے مال کی چوری مباح ہے اور اس نے ایک غیر یہودی سے سونے کا برتن خریدا جس کو بیچنے والا تانبا سمجھتا تھا۔ اس کو صرف چار درہم کی معمولی قیمت ادا کی اور اس میں ایک درہم چرالیا۔

☆ کوئی یہودی کسی غیر کا گمشدہ سامان اس تک پہنچادے تو اللہ اس کا کوئی گناہ معاف نہیں کریگا۔

☆ کسی یہود کے لئے قطعی جائز نہیں کہ کسی غیر کو بغیر سود کے قرض دے۔

☆ غیر اسرائیلی افراد کے بہترین افراد کو قتل کردو۔ یہودی کے لئے حرام ہے کہ غیر قوم کے کسی فرد کو ہلاکت سے بچائے یا کسی گڑھے میں گرا ہو تو اسے نکال دے۔

☆ کوئی بت پرست اگر گڑھے میں گرجائے تو تمہارا فرض ہے کہ نکلنے کا راستہ پتھر سے بند کردو۔

☆ اگر کسی یہودی کو ایک پیسہ بھی امید فائدہ کی ہو تو ہر بنیاد پر منہدم کردو۔ ہر پاکیزہ چیز کو گندہ کردو۔ ہرے بھرے باغات اور کھیتوں کو نذر آتش کردو، انسانی بستیوں کے ہر مرد، عورت، بچے، بوڑھے یہاں تک کہ گایوں، بکریوں اور گدھوں تک کو تہہ تیغ کردو۔

☆ یہود کے علاوہ تمام مذہبی پیشواؤں پر دن میں تین مرتبہ لعنت بھیجو۔

☆ ان کی مذہبی کتابیں نئے سال پر یہ دعا سکھاتی ہیں:

اے اسرائیل کے معبود! جس طرح تو نے جانے والے سال میں ان گفتگو کی طاقت رکھنے والے حیوانوں کو ایذائیں پہنچانے میں میری مدد فرمائی ہے اسی طرح آنے والے سال میں بھی مجھے اپنی نعمت سے نواز اور ان کو اذیت دینے کی توفیق عطا فرما!

☆ انہی کتابوں میں ہے کہ اسرائیل نے اللہ سے سوال کیا کہ تو نے اپنی محبوب قوم کے علاوہ دوسروں کو کیوں پیدا کیا، تو اللہ نے جواب دیا:

'صرف اس لئے کہ تم ان کی پشت پر سوار ہو۔ ان کا خون چوسو۔ ان کی پاکیزہ چیزوں کو آلودہ کرو اور ان کی آبادیوں کو منہدم کردو۔'

چنانچہ یورپ میں جتنی تحریکیں (سکولرزم، سوشلزم اور کمیونزم) اٹھیں ان سب کے بانی یہودی تھے۔ ریڈیکل سوشلزم کے مرکزی دماغ بھی صیہون تھے۔ روس میں انقلاب کا طویل المیعاد منصوبہ عالمی یہودی صحافت اور زعماء نے تیار کیا تھا۔ اور اس لئے کیا تھا کہ امریکہ اور روس میں سے جو ملک بھی کبھی اسرائیل کے مفاد کے خلاف جائے تو دوسرے ملک کے ذریعہ اس کی کاٹ کرسکیں۔

اشترا کی روس کے پہلے پولٹ بیورو کے سات ارکان یہودی تھے۔ کاہال اور جیوئش ایجنسی دونوں نے روس کے اندر انقلاب برپا کرنے میں حصہ لیا۔ روسی کمیونسٹوں کو ملنے والی امداد میں غالب حصہ امریکی سونے کا تھا۔

روس کے اشتراکی انقلاب کا یہ پس منظر اور اس کے ذرائع کا انکشاف کئی خفیہ تحریروں سے ہوتا ہے۔ ان میں صیہونی پروٹوکال (Protocols of the learned elders of Zion) ایک اہم دستاویز ہے جن کا کسی کے پاس ہونا روس میں سزائے موت کے لئے کافی تھا۔ ان کتابوں پر یورپ کے دوسرے کمیونسٹ ممالک میں بھی سخت پابندی تھی۔ مبادا اشتراکیت اور اس کے پروپگنڈے کا سارا پول کھل جائے۔ یہودی خود بھی نہیں چاہتے کہ یہ تحریر کسی غیر صیہونی کے پاس رہیں۔ یہودیوں کی اس سازشی تحریک کی قوت اور وسعت کا حال یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں کوئی راز افشا کرنے والا ایڈیشن نکلتے ہی بازار سے اس طرح ناپید ہو جاتا ہے کہ اس کی ایک کاپی بھی نہیں مل سکتی۔ چنانچہ امریکہ میں ورلڈ جیوئش نامی کتاب بار بار شائع کی گئی اور ہر بار یہودی اس کے شائع ہوتے ہی تمام نسخوں کو خرید کر ضائع کرتے رہے، اور دنیا کو پتہ بھی نہیں چلنے دیا کہ اس نام کی کوئی کتاب شائع بھی ہوئی ہے۔ بسا اوقات ایک ایک نسخہ آٹھ آٹھ سو ڈالر میں خرید کر دریا برد کر دیا گیا۔ لیکن ان کی تمام کوششوں کے باوجود اب حالات دھیرے دھیرے بدل رہے ہیں اور کچھ چیزیں جستہ جستہ سامنے آرہی ہیں۔

یہودیوں نے اپنی بہت سی خفیہ تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ جن میں سے چند ہی کے ناموں سے اب تک دنیا آشنا ہو سکی ہے۔ مثلاً فری میشن، کاہال امریکن، جیوئش ایجنسی۔ کاہال کے پرچم تلے سرمایہ دار کمیونسٹ، حاخام اور قبیلوں کے لیڈر سب جمع ہوتے ہیں اور دنیا بھر میں اغیار کو سرنگوں کرنے کے منصوبے تیار کرتے ہیں۔ اگر کسی سرمایہ دار یہودی کو غیر کے ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کمیونسٹ یہودی اس کی مدد کرتا ہے۔ بظاہر یہ لوگ نظریات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں، مگر دراصل یہ ایک ہیں۔ یہی تنظیم ساری دنیا کے یہودیوں کے لئے پروگرام منظم کرتی ہے اور اس طرح بظاہر متضاد نظاموں کے علمبردار دنیا کے یہودی ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے تقسیم کار کے اصول پر کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہر نظام کی علمبردار تنظیم کے اندر انتہا پسندانہ اور جذباتی طرز عمل اختیار کر کے عوام کو مسحور کر لینے کے نسخے کو اپنا رکھا ہے اور اس طرح ہر تنظیم کے دروبست پر قابض ہیں۔ اس سے بہت ساری اسلامی تنظیمیں بھی نہیں بچی ہیں۔ تمام بڑی طاقتوں کے معاملے میں جنگ اور صلح کا فیصلہ ان کے حسب منشا اور انہیں کے ارادوں کے مطابق ہوتا ہے۔

جہاں کسی بڑے ملک کی قیادت میں خصوصی مقام پیدا کرنے میں انہیں کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی ہے وہاں یہ قومی حکومت کو الٹ دینے کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اس غرض کے لئے جہاں بادشاہی نظام ہو وہاں جمہوریت کے علمبردار بن جائیں گے۔ جہاں جمہوریت ہوگی وہاں اشتراکیت کی دعوت دینے لگیں گے اور جہاں اشتراکیت ہوگی کمیونزم کے داعی بن جائیں گے۔ چنانچہ عصر حاضر کے یہودی تین بنیاد پر جمع ہو چکے ہیں۔ دین کا استیصال، مذہب دشمنی، اقتصادی میدان میں کلی غلبہ اور صالح اجتماعیت سے نفرت۔ اس مقصد کی طرف وہ دو راہوں سے بڑھ رہے ہیں (۱) اغیار کی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی کوشش (۲) فلسطین میں یہودی حکومت کا قیام۔ وہ فلسطین کو مرکز بنا کر پوری دنیا پر حاوی ہونا چاہتے ہیں۔

یہ صیہونیت وہیں پیدا ہوئی ہے جہاں کمیونزم نے جنم لیا ہے، یعنی روس میں۔ پھر صیہونیت اور کمیونزم نے ایک گہوارے میں دوش بدوش پرورش پائی۔ روسی انقلاب کے بعد روسی صیہونیوں اور نیویارک کے کاہال کے درمیان بڑے گہرے روابط رہے ہیں، اور یہودیوں نے ایسی ہنرمندی سے کام لیا ہے کہ غیر یہودیوں کو یہ احساس تک نہیں ہوتا (کمیونزم کی حمایت کرتے وقت) کہ وہ بین

الاقوامی یہودیت کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ ان کی بین الاقوامی تنظیم جامعہ یہودا کہلاتی ہے۔ یہ تنظیم ہر جگہ ریاست کے اندر ریاست بنی ہوئی ہے اور دنیا پر چھا جانے کے لئے دوز بردست وسائل سے کام لے رہی ہے۔ دولت اور صحافت۔ جامعہ یہودا اپنے افکار اور سیاسی عقائد دوسری قوموں میں اس طرح پھیلا رہی ہے کہ سطح بیں نگاہوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان کے ملک کے اندر دینی، اخلاقی اور قومی افکار اور عقائد کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہودی سازش کا ایک حصہ ہے۔ قوموں کے درمیان جنگ کا اعلان کرنا اور پھر صلح کی مجلس منعقد کرنا، انارکی پھیلانا اور پھر امن ونظم قائم کرنے کا فرض سنبھالنا۔ یہ سارے کام جامع یہودا کے اختیار میں ہیں۔ وہ جب چاہے پوری دنیا کو کسی خوفناک بحران سے دوچار کر سکتی ہے۔

اس طرح بنی اسرائیل نے سرطان کی طرح پورے عالم انسانی میں اپنے ہلاکت خیز ریشے پھیلا دیئے ہیں، اور اب اس کا آئندہ منصوبہ یہ ہے کہ اسرائیل میں ایسی تمام تر قوتوں کو مجتمع کرنے کے بعد پوری انسانی آبادی کو ٹکرا دے۔ ظاہر ہے کہ ایٹمی بھٹی میں جھلس جانے کے بعد دنیا کی کوئی قوم اس قابل نہ رہ جائے گی کہ اسرائیل کی محفوظ طاقت کا مقابلہ کر سکے۔ انجام کار یہودی اپنے خیال میں ساری دنیا کو اپنا سیاسی غلام بنا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہودیوں کی حکمت عملی:

برادران اسلام! یہ ہے آپ کا دشمن! کیا آپ اس کے خدوخال سے واقف ہیں؟ اگر نہیں تو آپ اپنے دشمن کو پہچانے بغیر مقابلہ کس کا کر رہے ہیں؟ آپ کا دشمن تو وہ روایتی چور ہے جو خود چور ہو کر چور چور کا ہنگامہ کرتا ہے اور چور پکڑنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ آپ کا دشمن وہ روایتی غنڈہ ہے جو دوسرے غنڈہ کو پیسے دے کر کسی شریف سے چھیڑ چھاڑ کرنے کو کہتا ہے اور خود ایک مہذب انسان بن کر مداخلت کرتا ہے۔ کرایہ کے غنڈے کو ڈانٹتا پھٹکارتا ہے اور اس سادہ لوح اور شریف آدمی کو اپنا ممنون احسان بنا کر اس کی متاع پر تصرف کرنے کا حق حاصل کر لیتا ہے۔ نہیں! آپ کا دشمن اس سے بھی زیادہ ترقی یافتہ شیطانی تکنیک سے کام لے رہا ہے۔ وہ خود کھلم کھلا آپ کے سامنے دشمن بن کر آیا ہے۔ وہ کرایہ کے ایک فریق کو اپنی کھلی حمایت پر اور کرایہ کے دوسرے فریق کو بظاہر آپ کا دوست بنا کر لے آیا ہے۔ اس منصوبہ کے مطابق چت بھی اسی کی ہے اور پٹ بھی اس کی۔

اس نے ۱۹۶۷ء میں ایک جنگ چھیڑی۔ امریکہ کھلے طور پر اس کا سرپرست بن کر اپنا بحری بیڑا بحیرۂ روم میں لے آیا۔ روسی قوم کو دھوکے میں رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ روسی مفاد کی حفاظت کا ڈھونگ رچایا جائے۔ ورنہ کتنا زبردست فوجی آمرانہ سہی اس کا الٹ جانا بہرحال ناگزیر ہو جائے گا۔ اس لئے روس بھی اپنا بحری بیڑی لے کر آ دھمکا۔ اس لئے نہیں کہ مصر کی حفاظت کرنی تھی، بلکہ اس لئے کہ اس کو شکست دلوا کر روس کی فوجی سرپرستی قبول کر لینے کے لئے مصر کو مجبور بنا ڈالنا تھا۔ اس غرض کے لئے اسرائیل نے اپنے کھلے اور چھپے دونوں دوستوں کے ذریعے عربوں پر اولاً تو یہ دباؤ ڈلوایا کہ اس جنگ کو مذہبی جنگ قرار نہ دیں تاکہ عربوں کا لادین عنصر آسانی سے اس سازش کا شکار ہو کر شکست کھا جائے۔ پھر اس شکست کے بعد مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کرنے کی زبردست مہم شروع کر دی۔ حالانکہ اسلام اور مسلمانوں کو اس جنگ میں سرے سے فریق بننے ہی نہیں دیا گیا تھا۔ اور یہ دراصل اسلام اور مسلمانوں کی نہیں بلکہ عرب قوم پرستی اور سوشلسٹ طاقتوں کی شکست تھی۔

مگر دراصل یہ جنگ تھی مسلمانوں اور اسلام کے خلاف۔ اور دشمن کی جنگی تدبیروں میں سے اہم ترین تدبیر یہی ہے کہ اصل خوف یعنی اسلام اور مسلمانوں کو اس سے غافل رکھ کر ان کا صفایا کر دیا جائے یا ان کو کسی طرح مقابلے پر آنے نہ دیا جائے۔ یہ یورپ، امریکہ، روس اور اسرائیل سب کا مشترک مقصد ہے جس کے حصول کے لئے ان سبھوں نے مل کر مسلمانوں کے اندر کچھ خودغرض اقتدار

کے بھوکے اور دین کی گرفت سے آزاد رہنے کی خواہش رکھنے والوں کو تاکا، ان پر اپنے جال پھینکے اور انہیں اپنا آلۂ کار بنانے میں کامیاب ہوگئے، انہیں سنہری اور جذباتی نعرے دے کر مسلمانوں کے جذباتی عوام پر مسلط کردیا ہے اور باہر سے ان کی مالی، سیاسی اور تکنیکی سرپرستی کررہے ہیں۔ مسلمانوں کے یہ لیڈران تسمہ پا عوام کی گردن پہ سوار ہوکر ان کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور ان کے دین اور ان کی ملی خصوصیتوں کو مٹانے کی خاطر ایسے ایسے ہولناک اور انسانیت سوز طریقے اختیار کررہے ہیں جو انکے بیرونی آقا خود مسلط ہوکر نہ کرسکتے تھے اور نہ کرکے کامیاب ہوسکتے تھے۔ اور اگر مسلم عوام نے اس حقیقت کو بروقت نہ سمجھا تو ان کے یہ غلام آقا ان کے دین اور ان کے ملکی تشخص کو خدانخواستہ مٹا کر ہی دم لیں گے اور پھر کسی غفلت سے چونکنے اور پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کا سوال ہی باقی نہ رہے گا۔

اپنے دشمن اور اس کی تکنیک سے اسی ناواقفیت نے ترکی عوام کو یہودی سازش کا شکار بنایا اور ترکی ایک عرصے کے لئے اسلام سے چھنا گیا اور وہاں کا اقتدار صیہونی مفادات کا محافظ بنا رہا۔ اور اسی ناواقفیت نے عربوں کو شکار بنایا۔ اور عرب قوم پرستی اور سوشلزم کی آڑ میں صیہونی مفادات کی حفاظت کی گئی اور نوجوان عرب کو جذبات کی شراب پلا کر پورا بدمست کردیا گیا تاکہ ان کی سمجھ میں آنے ہی نہ پائے کہ وہ کس غرض کے لئے استعمال ہورہے ہیں اور انہیں کون استعمال کررہا ہے۔ حالیہ جنگ خلیج یہودی سازش کی اہم مثال ہے۔

ایک زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں جمال عبدالناصر کو اس طرح بٹھایا گیا کہ حسن زیات نے یوں لکھا 'جمال عبدالناصر نے جو انقلاب ہم کو دیا ہے وہ محمد صلعم کے لائے ہوئے انقلاب سے زیادہ جامع اور زیادہ مکمل ہے'۔

نعوذ باللہ، اس مضمون پر دنیا بھر کے مسلمانوں نے احتجاج کیا مگر مصر کی سوشلسٹ حکومت نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ شام کی سوشلسٹ فوجی سازشی حکومت تو اس سے بھی نمبر لے گئی۔ اس کا کھلا ہوا نعرہ ہے الحزب البعث معبود نا لاشریک لہ یعنی بعث پارٹی ہمارا معبود ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے مظالم کی تفصیلات تو ابھی سوشلسٹ استبداد کے آہنی پردوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ اجمالاً بیرونی دنیا کو صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ مصری حکومت کے مظالم شاہی حکومت کے مظالم کے مقابلے میں ہیچ ہوگئے ہیں۔

آخری مرحلہ:

حضرات! یہ صیہونی سازش کا مجمل سا جائزہ ہے مگر اس سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ یہ کیسی ہمہ گیر اور کیسی خطرناک منصوبہ بند سازش ہے۔ مگر دشمن اگر قوی نگہبان قوی تر است۔ اب اللہ تعالیٰ کی مشیت باطل پرستوں کی رسی مزید دراز کرنا نہیں چاہتی بلکہ اس کو کسنے کا عمل اب شروع ہوگیا ہے۔

تاریخ اب اپنے آپ کو دہرائے گی اور اقوام عالم کے خلاف صیہونی سازش کا بھانڈا اب پھوٹے گا اور یہودی ایک بار پھر اسی طرح کھدیڑے جائیں گے جس طرح تیرہویں صدی کے ابتدائی سالوں میں برطانیہ نے یہودیوں کو نکال باہر کیا تھا جو تقریباً تین سو سال تک نافذ رہا۔ پھر فرانسی قوم کے خلاف ان کی مکاریوں سے واقف ہونے کے بعد فرانس نے یہی کیا۔ لوئیس نے ان کو حدود فرانس سے نکال دیا اور تلمود نذر آتش کردیا۔ اسپین اور پرتگال کو بھی یہی کرنا پڑا۔ ۱۴۹۲ء میں شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا نے فرمان جاری کیا ...'ہم تمام یہودی مردوں اور عورتوں کو حکم دیتے ہیں۔ خواہ جس بھی سن وسال کے ہوں کہ اس ماہ جولائی کے ختم تک ملک چھوڑ دیں اور کبھی نہ واپس آئیں اور اپنے ساتھ بیٹوں بیٹیوں، خادموں، خادماؤں اور رشتے داروں کو لیتے جائیں'۔ اسی طرح ان کے جرائم سے تنگ آکر ہٹلر نے ان کو عبرتناک سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

آج وسطی اور جنوبی امریکہ میں یہودیوں کی بھاری تعداد رہتی ہے۔ اس علاقہ میں متعدد مرتبہ بغاوتیں ہوچکی ہیں اور

انقلاب در انقلاب کا سلسلہ جاری ہے۔ ان بغاوتوں اور انقلابات کے پیچھے ہمیشہ یہودی ہاتھ کام کرتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ میں تو انہوں نے ابتدا ہی سے خفیہ جماعتیں قائم کرلی تھیں ۔ یہ جماعتیں یہودیوں کو امریکہ میں داخل ہونے کی سہولت فراہم کرتی تھیں۔ پاسپورٹ لے کر داخلے کی صحت وغیرہ کی شرائط سے انہیں بچاتی تھیں ۔ ملک میں اس وقت جس قدر سیاسی تنظیمیں یا گروہ تھے یہودی ان سب میں گھس گئے تاکہ جو جماعت بھی کامیاب ہو اس سے فائدہ اٹھائیں۔

ان کی آبادی میں اضافے کے ساتھ ہی سیاسی زندگی میں ان کے اثرات گہرے ہوتے گئے۔ پھر جب صحافت اور نشرواشاعت کے دوسرے ذرائع ہاتھ آئے تو یہ ملک کے اندر فیصلہ کن طاقت بن گئے ۔اب کیفیت یہ ہے کہ یہودی ہونے کے باوجود امریکہ پر چھا گئے ہیں ۔انتہائی خفیہ مقامات تک ان کی رسائی ہے۔ جنگ عظیم کے بعد مفتوح قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے چار بڑے وارسا میں جمع ہوئے تو یہ بھی وہاں موجود تھے ۔امریکہ کا سپریم کورٹ ہو یا وہائٹ ہاؤس میں خفیہ اجلاس، عالمی مالیاتی ادارے ہوں یا بین الاقوامی سیاسی کانفرنس ، کوئی جگہ بھی ان کی رسائی سے محفوظ نہیں ہے۔انہوں نے ہمیشہ یورپی ملکوں کے باہمی تنازعات کو ہوا دی ہے۔ یہ پہلے جنگ کی آگ خود بھڑکاتے ہیں، پھر دونوں فریقوں کی حمایت کرتے ہیں۔اس طرح فتح خواہ کسی کی ہو فائدے میں یہی رہتے ہیں۔ جنگ کے بعد فاتح ومفتوح جب امن وصلح کے لئے بیٹھتے ہیں تو یہ اپنے اثر ونفوذ سے معاہدے کی شرائط اپنے حسب خواہ کرا لیتے ہیں اور یہ سب سہولتیں ان کو ملکی بنیاد پر قوم پرستی کی بدولت ہر جگہ میسر آجاتی ہیں۔

امریکی قوم کی مخالفت کے باوجود پہلی جنگ عظیم میں امریکہ کی شرکت یہودیوں کے اثرات کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ وہائٹ ہاؤس میں ایک یہودی برنارڈ باروح کے اثر ونفوذ کا یہ عالم تھا کہ اس نے کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسے ملک کے اندر جو اقتدار حاصل ہے کوئی دوسرا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ فیصلہ کرنا اس کے ہاتھ میں ہے کہ امریکہ کو جنگ میں شامل ہونا چاہئے یا نہیں۔ پانچ بڑوں کے وزراء اعظم کے جو خفیہ اجلاس ہوئے وہ ان میں بھی شریک تھا۔ باروح کے علاوہ اور بھی کئی یہودی مختلف ملکوں کی طرف سے اس کانفرنس میں موجود تھے اور خفیہ اجلاس کی نگرانی کررہے تھے۔ ''صلح کانفرنس کی مخفی داستان'' نامی کتاب کا مصنف لکھتا ہے۔

''بعض قارئین کو یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مندوبین کی بہت بڑی تعداد کو یقین تھا کہ اینگلوسکشن پالیسی کے پیچھے دراصل یہودیوں کا اثر ورسوخ کارفرما ہے۔''

اب امریکہ میں وہی صورتحال پیدا ہوگئی ہے جن کی پیشین گوئی بنیامن فرنکل نے اپنے تجزیے میں کی تھی۔

''ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ایک زبردست خطرہ کا سامنا ہے اور وہ خطرہ ہے یہودیت، کیونکہ جس جگہ بھی یہودی پہنچے ہیں، اخلاقی اقدار کی تباہی اور معاملاتی ایمانداری کے انحطاط کا سبب بنے ہیں۔ اگر ہم اپنے دستور کی وجہ سے امریکہ میں ان کے داخلے کو روک سکتے نہیں ہیں تو ایک صدی سے بھی کم مدت میں ہی حاکم بن جائیں گے، اور موجودہ نظام جس کے لئے امریکی عوام نے اپنے خون بہائے اور اپنی صلاحتیں اور جانیں قربان کیں اس نظام کو پاش پاش کردیں گے۔ اگر یہود کا داخلہ دستور کی وجہ سے ہم روکتے نہیں ہیں تو صرف دو سو سالوں کی مدت میں ہماری اولاد خادموں کی طرح ان کے کھیتوں میں مزدوری کرے گی اور یہ مزے سے اپنے گھروں میں بیٹھے ہاتھ کھجائیں گے اور آمدنی کا حساب کرتے رہیں گے۔''

چنانچہ یہ بات سرکاری طور پر ثابت ہوچکی ہے کہ امریکہ میں رونما ہونے والے تمام ہنگاموں، مظاہروں اور ہڑتالوں میں یہودیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ امریکی مزدوروں میں یہودیوں کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ وہ جب امریکی حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں، مزدوروں کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ امریکی کمیونسٹوں کی بھاری اکثریت یہودیوں پر مشتمل ہے۔

آج امریکہ میں یہودی صرف چار فی صد ہیں، لیکن ان میں ۷۷ فی صد تاجر ہیں جو وہاں کے بڑے تاجروں اور کروڑ پتیوں میں شمار کئے جاتے ہیں، اور ان کے مقابلے میں بے روزگار مزدور سو فی صد اور کھیت کے مزدور ۹۸ فی صد امریکی ہیں۔ وھسکی کی تجارت پر یہی قابض ہیں۔ اسی فی صد یہودی مختلف منشی اشیاء کے تاجر ہیں۔ ساٹھ فی صد وھسکی کی تقطیر کا کاروبار کرتے ہیں۔ اسی طرح تمباکو اور سگار کی تجارت بھی زیادہ تر انہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس طرح تجارت اور معاشیات پر قبضہ کرنے کے بعد منصوبہ بند پروگرام کے تحت شراب نوشی، قمار بازی، فحاشی، دنگل، گھوڑ دوڑ، لاٹری اور دیگر مفاسد کے ذریعے روس، رومانیہ اور پولینڈ کی طرح امریکی قوم کو بھی اخلاقی طور پر تباہ کر کے کردار کی قوت سے محروم کر رہے ہیں۔

ان کی بین الاقوامی تنظیم جامعہ یہودا جو ہر جگہ ریاست کے اندر ریاست بنی ہوئی ہے اس کا پہلا دارالحکومت پیرس تھا۔ ۱۹۱۴ء سے قبل لندن میں منتقل ہو گیا اور وہاں سے نیویارک، اور اب یہیں سے دنیا بھر میں یہودی سازش کی رہنمائی کی جاری ہے۔ اس نے ہر دارالحکومت میں اپنی حکومت نامزد کر رکھی ہے۔ جرمن سے انتقام لینے کے بعد اب اس نے دوسرے ملکوں پر اپنی نظریں گاڑ دی ہیں۔ برطانیہ پر عرصہ دراز سے مسلط چلی آتی ہے۔ فرانس اور روس پر بھی اس کے اقتدار کا یہی عالم ہے، اور اب ریاستہائے متحدہ امریکہ اس کے عزائم کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔

اس طرح یہودیوں کی بالادستی اب اپنے Climax پر ہے۔ جلد ہی اس کے ردعمل کا رونما ہونا فطری امر ہے۔ امریکی قوم غفلت سے چونکے گی اور یہودیوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھے گی جس کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لانے کی کوشش میں قوموں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑکا دیں گے۔ وہ تدبیر یہ ہوگی کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگ چھڑا دیں۔ اس جنگ کے نتیجے میں جب عرب بڑی تعداد میں شریک ہو جائیں گے اور عیسائی دنیا بھی زندہ درگور کا مصداق ہو جائے گی (بوسینا کے واقعات کو خاص طور سے اس روشنی میں دیکھنا چاہئے)۔ اس وقت یہودیوں کا سردار جس کے پاس دجل وفریب میں انتہائی مہارت کے سوا کوئی حقیقی بہت بڑی طاقت نہ ہوگی، اپنے مکر وفریب کے زور پر یہودیوں کی عالمگیر ریاست کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا سنہرا اور منتظر وقت سمجھ کر اپنے تمام وسائل اور ہتھکنڈوں کے ساتھ بساط عالم پر نکل پڑے گا۔ اور واقعی دنیا والوں میں سکت باقی نہ ہوگی کہ اس کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اپنے فیصلے کو روبکار لانے کے لئے اپنا غیبی ہاتھ بڑھائے گی اور عیسیٰؑ کے ذریعہ دجال کے فتنے کا خاتمہ ہوگا۔ اور اسلام دنیا کا دین اور نظام زندگی World order ہو جائے گا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس انجام کو لانے کے لئے آج کوشش کر رہے ہیں اور وہ جو اس وقت اس کے علمبردار ہوں گے۔

وما توفیقنا الا باللہ

☆☆☆

ظہور دجال، آمد عیسیٰؑ اور ہمارا رویہ

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ

(۱۹۹۱ء مطابق ۱۴۱۱ھ کے رمضان المبارک میں دیئے گئے ضیاء الہدیٰؒ کے خطبۂ جمعہ کے دو مرتب شدہ خطبات)

یہود ابتداء ہی سے حق کے دشمن رہے ہیں۔ خود انکی قوم میں جو نبی پیدا ہوئے ان کو اور انکی دعوت کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ حضرت موسیٰؑ نے انہیں اللہ کی مدد اور حکم سے قوم مصر کی غلامی سے آزادی دلائی۔ وہ خود اپنے آپ کو حضرت موسیٰؑ کی امت کی حیثیت سے منواتے ہیں۔ اسکے باوجود انکے خلاف بھی انہوں نے سازشیں کیں۔ ان کے خلاف طرح طرح کی گھناؤنی باتیں پھیلائیں، یہاں تک کہ اللہ نے ان کی حقیقت کو کھول دیا۔ اور حال یہ ہوا کہ حضرت موسیٰؑ نے یہ دعا کی انکے لئے کہ ''اے اللہ میرا بس ان لوگوں پر نہیں چلتا سوائے اپنی ذات کے اور اپنے بھائی ہارونؑ کے۔ لہذا ہمارے اور اس قوم کے درمیان جدائی ڈال دے''۔ کتنے انبیاء آئے ان کے اندر، کسی کو قتل کر دیا، کسی پر زنا کا الزام لگایا اور کسی کے ساتھ کچھ اور کیا۔ حضرت سلیمانؑ چونکہ بادشاہ بھی تھے اس لئے یہ کھل کر بغاوت تو نہیں کر سکتے تھے۔ اندر اندر ہی ان کے خلاف یہ چال چلائی کہ یہ پیغمبر نہیں ہیں۔ یہ تو جادوگر ہیں اور جادو کے زور پر حکومت چلاتے ہیں اور پیغمبری کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان پر بھی یہ ایمان نہیں لائے۔ ہم آپ جانتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے جہاں بہت سی چیزوں کو ان کے تابع کر دیا تھا، جنوں کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا۔ جتنے شیاطین جن تھے، بدمعاش اور اللہ کے دشمن، وہ سب جکڑ کے رکھے جاتے تھے زنجیر میں اور حضرت سلیمانؑ ان سے مزدوری کرواتے تھے۔ اس زمانے میں عام انسانوں سے بھی ان جنوں کی راہ و رسم تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں جو انسان شیاطین تھے یعنی یہودی اور وہ شیاطین جن، ان دونوں میں گٹھ جوڑ ہو گیا اس بات پر کہ آئندہ اللہ کے راستے سے روکنے کیلئے ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ تو اب ان کی سازش کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور یہ گٹھ جوڑ دونوں کا ابھی بھی چل رہا ہے۔

اس سلسلے کی موجودہ کڑی کا نام فریمسن ہے۔ یہ تحریک یہودیوں کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جو اصل لیڈر ہے ویسا ہی ہے جیسا کہ حدیث میں دجال کا ذکر ہے۔ جیسے فرعون ایک آدمی کا نام نہیں تھا وہ لقب تھا۔ اس کے تخت پر جو بیٹھتا تھا فرعون کہلاتا تھا ٹھیک اسی طریقہ پر ایک گدی اور سازش کا مرکز ہے، اس پر جو بیٹھتا ہے دجال کہلاتا ہے۔ ایک دجال ہوگا آخری جو سب سے بڑا دجال ہوگا جس کے بارے میں حدیثوں میں پیشین گوئی آئی ہے۔ اور جس کے بارے میں ہر نبیؑ نے اپنی امت کو ڈرایا ہے، اور جس کے بارے میں ہر قوم میں چرچہ ہے۔ وہ چھپا ہوا ہے سات دروازے کے اندر، اندھیرے میں رہتا ہے، وہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہوتی ہے سوائے اس کے جس کے بارے میں اچھی طرح سے اطمینان نہ کر لیا جائے کہ یہ پکا شیطان کا بندہ ہے۔ جس کے بارے میں پورا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی بھی خدا کے طرف نہیں جھکے گا، اس کو وہاں تک پہنچایا جاتا ہے اور پھر وہاں ان کے یہاں جو طریقہ ہے بیعت کا وہ لیا جاتا ہے۔ تو اب سازش کا مرکز وہاں ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ تیر چل رہا ہے کہاں سے اور آپ تیر کا جواب دے رہے ہیں کہاں اور ایسی صورت میں مار نہ کھائے گا تو کیا کیجئے گا؟ اگر آپ مصطفےٰ کمال پاشا جیسے لوگوں کو پہچان بھی لیتے تب بھی مار کھاتے۔ آپ ناصر کو پہچان بھی لیتے تب بھی مار کھاتے۔ آپ فہد کو پہچان بھی لیتے تب بھی مار کھاتے۔ جس طرح نہ پہچان کر مار کھا رہے ہیں۔ کیونکہ آپ کو پتہ نہیں کہ سازش کہاں سے رچی جا رہی ہے۔

اسکو سمجھنے کے لئے آپ یہ جانیں کہ انبیاء کے خلاف یہودیوں کی سازش اور دشمنی جاری رہی یہاں تک کہ ان کی نسل کے

آخری نبی حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ آیا۔ ان سے بھی ان کی دشمنی کا معاملہ وہی رہا۔ حضرت عیسیٰؑ سے ان کو دشمنی کسی اور بات کی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ اصلی دین کو کیوں پیش کر رہے تھے؟ چنانچہ اس وقت حکومت تو یہودیوں کی تھی نہیں۔ حکومت رومیوں کی تھی اس کے یہ لوگ غلام تھے۔ ان لوگوں نے حکومت کو ورغلایا کہ حضرت عیسیٰؑ کو وہ قتل کر دے۔ حکومت نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے قتل کیا جائے۔ مگر پھر بھی بالآخر ان لوگوں نے جب اس حد تک کہہ دیا کہ اگر قتل نہ کیا گیا تو ہم بغاوت کر دیں گے تو حکومت مان گئی، اس خیال سے کہ ایک آدمی کے لئے خواہ مخواہ ایک پوری قوم کو باغی کیوں بنایا جائے اور ایک ہنگامہ کھڑا کیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اپنے خیال میں حکومت کے ذریعہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھا دیا۔ اور ڈنکے کی چوٹ پر کہا ہم نے آخر قتل کر ہی دیا عیسیٰؑ ابن مریم رسول اللہ کو۔ حالانکہ حقیقت میں وہ قتل تو ہوئے نہیں اللہ نے ان کو اٹھا لیا اور وہ بہت جلد آنے والے ہیں دوبارہ پھر اس دنیا میں جس کام کے لئے وہ متعین ہوئے ہیں۔ مگر لوگوں کو اس شبہہ میں اللہ نے ڈال دیا کہ وہ یہ سمجھتے رہے کہ عیسیٰؑ سولی پر چڑھ گئے۔ ادھر اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ وہی رومی قوم جو حکمراں بھی تھی بحیثیت قوم کے عیسیٰؑ پر ایمان لے آئی۔ آخر یہودیوں کو بہت پریشانی لاحق ہوئی کہ ہم نے جن کے ہاتھوں عیسیٰؑ کو سولی چڑھوایا اب یہی لوگ ان پر ایمان لے آئے ہیں تو ہم سے اب یہ بدلہ لیں گے۔ انہوں نے اپنی ایک میٹنگ بلائی بہت ہی خفیہ (Confidential) اور اس میں جو بہت ہی قابل اعتماد لوگ تھے صرف ان کو بلایا وہاں ایک سازش تیار کی کہ خود ان کے فلاں فلاں لوگ بظاہر حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لے آئیں۔ ان کو رہنا ہے یہودی اور عیسیٰؑ پر ایمان لانے کا لیبل لگانے کے بعد کام کرنا ہے وہی جو یہودی قوم کے لئے مناسب ہوگا۔ یہ تو وہ چند آدمی جانتے تھے یا اللہ جانتا تھا۔ بہر حال وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس وقت عیسائی نام نہیں تھا اس وقت مسلم نام تھا۔ چنانچہ اب انہوں نے یہ کیا کہ عبادت میں غلو کرنا شروع کیا، ظاہر میں ایسی نماز اور روزہ کہ آپ دیکھ کر عش عش کریں اور کہیں کہ البتہ عبادت ہے تو اس کا نام۔ چنانچہ یہ رومی قوم جو مسلمان نئی نئی ہوئی تھی وہ بہک گئی کیونکہ وہ ابھی دین کی روح کو سمجھتی نہیں تھی، اس کو شعور تو تھا نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے جو صحابی تھے جن کو حواری کہتے ہیں اور جو خود حضرت عیسیٰؑ کے تربیت کئے ہوئے تھے صرف وہ دین کو سمجھتے تھے۔ حواریوں نے دیکھا کہ قوم تو جا رہی ہے غلط رخ کی طرف دھوکا کھا کر کے، لیکن وہ گیارہ بارہ آدمی کیا کرتے جبکہ لاکھوں لاکھ لوگ اب اسی رخ پر چلنے کو تیار تھے۔ چنانچہ جو دھوکا دینے کو مسلمان بنے تھے انہوں نے پوری قوم کو اپنا مرید بنا لیا۔ جب پوری قوم ان کی مٹھی میں آگئی تو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے دین کو مسخ کرنا شروع کر دیا۔ اللہ کے دین کی بنیاد تین ہی ہے۔ توحید، آخرت اور رسالت۔ اس تین کو ختم کر دیجئے اللہ کا دین ختم ہے۔ بلکہ کسی ایک کو بھی ختم کر دیجئے تو دین باقی نہیں رہتا۔ اب انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی شان میں بھی غلو کیا یعنی ان کا جو اصل مرتبہ اللہ نے بنایا ہے، اس کے بندے اور رسول کا، اب ان کا بندگی سے اور رسالت سے درجہ اونچا کرنا شروع کر دیا۔ حواری بہت گھبرائے اور کھلم کھلا آگئے اسکی مخالفت پر کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے خلاف بات ہے۔ لیکن سازشی لوگوں نے ان کے خلاف قوم کو بھڑکا دیا۔ جیسے آج کل کسی کو کسی کے خلاف بھڑکانا ہو تو کہہ دیں گے کہ وہابی ہو گیا ہے، ویسے ہی انہوں نے بھڑکایا حواریوں کے خلاف کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ چنانچہ قوم انہیں کے راستے پر چلنے لگی اور جو حواری اور سچے مسلمان تھے ان کو کوستی رہی۔ عیسیٰؑ کو بڑھاتے بڑھاتے خدا کا بیٹا، خدا کا اکلوتا، خدا اور تین خدا میں سے ایک خدا بنا ڈالا اور اس طرح قوم کو ان مہمل قسم کی چیزوں کے چکر میں ڈال دیا۔ توحید ختم کر دیا اور رسالت بھی ختم ہو گئی کیونکہ اب تو حضرت عیسیٰؑ خدا ہی ہیں، رسول کہاں رہا؟ پھر اب انہوں نے آخرت پر حملہ کرنے کے لئے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ انہوں نے کہا بھائی جو عبادت کا کام ہے بہر حال اچھا کام ہے۔ جس عبادت کے راستے سے یہ آئے تھے دھوکا دینے کیلئے اب اس راستہ کو بھی بند کرنا تھا۔ چنانچہ کہا عبادت تو اچھی چیز ہے جو کرے اچھا ہی ہے۔ لیکن یہ سوچنا چاہئے

کہ اللہ نے اپنے اکلوتے بیٹے عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھادیا آخر کس لئے؟ اسی لئے نہ کہ اس کی امت اور اس کے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ ہو۔ اب اگر اس کی امت گناہ نہیں کرے تو کفارہ کس بات کا ہوگا؟ اس لئے گناہ کرنا ہی ثواب ہے کیونکہ گناہ کریں گے تب نہ کفارہ ایک کام کی چیز ہوگی ورنہ بیکار چیز ہوجائے گی۔ اس لئے شراب حلال، سور حلال، زنا حلال، چوری حلال، سود حلال سب حلال۔ اس طرح سے انہوں نے توحید، آخرت، رسالت اور اعمال صالحہ کو ختم کردیا۔ اب ایک چیز رہ گئی تھی نام۔ دین کا نام ابھی اسلام تھا۔ تب انہوں نے کہا ہم لوگ کیسے بے وفا ہیں کہ جس کو ہم مانتے ہیں، دین کا نام اس کے نام پر نہیں رکھتے۔ عیسیٰؑ کے ماننے والے ہیں اس لئے اب ہم عیسائی ہیں ہمارا دین عیسائیت ہے، اسلام نہیں۔ اس طرح یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے دین کا نام ونشان مٹادیا۔ اور جو مذہب ان کے نام پر چل رہا تھا اور اسکا جو مرکز تھا اس پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ یہ تجربہ ان کا بڑا کامیاب رہا عیسائیوں کے درمیان۔

اب جب یہ نئی امت امتِ محمدیہ بنی تو یہودیوں نے اس تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اٹھایا اور اٹھا رہے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے تک تو ان کی دال نہیں گلی۔ گھسے تو یہ تمام کلیدی مناصب پر اور مسلمان بن کر قبضہ کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جیسے ہی خلافت کی باگ دوڑ سنبھالی ویسے ہی ہر ایک کو Purge کردیا، نکال دیا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد معاملہ بگڑ گیا اور اب معاملہ ان کے ہاتھ میں آگیا۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نومسلم تھی۔ نئے نئے مسلمان تھے، اسلام کو سمجھتے تو تھے نہیں، آگئے تھے گرچہ اسلام کے حلقہ میں۔ اس لئے ان یہودیوں کے لئے بہترین کھیتی تھی۔ اس پر انہوں نے اپنا کام شروع کردیا۔ اور بالآخر اپنی مٹھی میں عوام کو لے لیا۔ اب تک جہاں ان مسلمانوں کی باگ ڈور مومن بندوں کے ہاتھ میں تھی اب اس کی باگ ڈور مسلمانوں کے بھیس میں ان لوگوں کے ہاتھ میں دھیرے دھیرے کرکے پہنچنی شروع ہوگئی۔ یہ اپنا انڈا بچہ دیتے رہے اور دے رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں اللہ کے بندے اٹھتے رہے ہیں انکے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کیلئے مگر بحیثیت مجموعی ان کا اثر بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ یہ کئی ہزار سال سے اس سازش کا تجربہ کرتے کرتے ماہر سازش ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک مرکز ہے جس کی طرف میں اشارہ کرچکا ہوں یعنی فری میسن، جہاں تک بہت سے عام یہودی کی بھی رسائی نہیں ہے۔ ایک تاریک گوشے کے اندر ان کا اصل شیخ رہتا ہے۔ جس کے ساتھ ایک شیطان بھی لگا ہوا ہے۔ جو انتہائی قابل اعتماد ہوتا ہے اس کی رسائی ہوتی ہے وہاں تک۔ دنیا کی قوموں کے لئے منصوبہ وہیں سے طے ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد درجہ بہ درجہ نیچے ہوتے ہوتے وہ آتا ہے عوام تک۔ نقشہ وہیں بنتا ہے اور آج اس نقشے کے مطابق دنیا کے اندر پورا ڈرامہ کھیلا جارہا ہے۔ اس کے شکار عیسائی بھی ہیں۔ اس کے شکار ہم آپ بھی ہیں۔ مسلمانوں کا مذہبی مرکز اب ہے نہیں۔ اس لئے مرکز پر قبضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے آپ کے مرکز کو اپنی اسی سازش کے تحت ختم کیا اور اب آپ کو وہ منتشر (Decentralise) کرکے گروہوں میں بانٹ کر آپ کی طاقت کو چکنا چور کررہے ہیں۔ ہر جگہ ان کے ایجنٹ موجود ہیں۔ انکی باگ ڈور دجال کے اس مرکز کے ہاتھ میں ہے۔

دجال کے نکلنے کیلئے اسٹیج (Stage) بنایا جارہا ہے۔ یہ جتنے ازم دنیا میں چل رہے ہیں اور جتنے نظریات چل رہے ہیں سب اس مرکز سے نکلتے ہیں۔ ان کے پاس بڑے بڑے ماہرین ہیں فلسفے کے، سائنس کے، ٹکنولوجی کے، نفسیات کے۔ اسی طرح تمام میڈیا یعنی ذرائع ابلاغ پر ان کا قبضہ ہے۔ جتنے بڑے بڑے اخبارات دنیا میں ہیں سب انکے ہیں۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو انکے قبضہ میں ہیں۔ انہوں نے منصوبے پر منصوبہ بنایا ہے۔ یہ جو جمہوریت (Democracy) کا بہت چرچا ہے دنیا میں یہ وہیں کی ایجاد ہے۔ وہیں سے دنیا کو دی گئی ہے۔ دنیا سمجھتی ہے کہ ہم نے بہت بڑا تیر مارا۔ یہ یہودی سازش ہے۔ جس پر مسلمان بھی فریفتہ ہیں۔ حالانکہ یہ

ہمارے دشمنوں کی چالوں میں سے ایک چال ہے۔اس طرح کمیونزم یہودیوں کی پیداوار ہے۔آج کل آپ بہت چرچہ سنتے ہونگے ڈاٹاسسٹم کا (Data-System)، یہ بھی یہودی سازش کا ایک حصہ ہے۔مختصر یہ کہ زندگی کے ہر شعبہ میں انہوں نے اپنی سازش کا جال پھیلا رکھا ہے۔اور اپنے ذرائع ابلاغ (Media) کے زور سے وہ اس کو لوگوں کے دماغ میں اتار دیتے ہیں۔اور دنیا چلنے لگتی ہے اس پر۔وہ تو اللہ تعالیٰ کا چونکہ ایک فیصلہ ہے کہ قیامت تک ان پر عذاب آتا رہے گا۔چنانچہ ان پر عذاب مسلسل ہوتا رہا۔ابھی کچھ دن پہلے تک ہوا ہے، ہٹلر نے کیا ہے، ساری دنیا جانتی ہے۔اب بے چارے تھوڑا سانس لے رہے ہیں۔اور اب جو عذاب آرہا ہے تو ان کا نام ونشان ہی مٹا دیا جائیگا۔آخری عذاب ہوگا اسی وقت جب آخری دجال نکلے گا۔اس کے پہلے جتنا اللہ نے موقع دیا ہے اتنا کریں گے۔یہی آپ کے لئے بہت خطرناک ہے۔کیونکہ آج انکے منصوبے کے مطابق حکومتیں بنتی ہیں۔قوموں کے سربراہ چنے جاتے ہیں۔عوام بظاہر انتخاب (Election) کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ڈوری وہیں سے ہلائی جاتی ہے، کس کو حکمراں بننا ہے کس کو نہیں بننا ہے۔اس کے بعد وہی لڑاتے بھی ہیں۔ایک بات آپ جانتے ہونگے کہ یہ اسلام تبلیغی دین ہے۔یعنی وہ دوسروں تک پہنچانے کی چیز ہے۔لیکن ان کا جو یہودی مذہب ہے، وہ تبلیغی نہیں نسلی ہے۔صرف یہودی ہی اس مذہب کو مان سکتے ہیں۔اس لئے وہ تبلیغ کر کے اپنے دین کو پھیلا نہیں سکتے اور خواہش یہ ہے پوری دنیا پر حکومت کریں۔اس لئے منصوبہ یہ بنایا ہے کہ دنیا کی جتنی بڑی طاقتیں ہیں سب کو ایک دن لڑا دو تا کہ یہ چکنا چور ہو جائیں اور اپنی طاقت کو محفوظ رکھو۔اس کے بعد ہم ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ہم کو روکنے والا کون ہوگا؟ اس منصوبہ میں ایک رکاوٹ بنی ہوئی ہے کہ سب تو آجاتے ہیں ان کے جال میں، چین نہیں آرہا ہے ابھی تک، وہ ایک بڑی طاقت ہے۔چنانچہ یہ تیسری جنگ اسی دن کیلئے روکے ہوے ہیں۔جس دن چین ان کی مٹھی میں آگیا تو یہ جنگ کرادیں گے۔لیکن اندازہ یہ ہے کہ چین ان کے شیشے میں نہیں اترے گا۔چنانچہ ہوگا یہ کہ ان کی خواہش کے علی الرغم ان کے منصوبے کے پہلے ہی وہ جنگ چھڑ جائیگی۔اور اب اس میں زیادہ دیر نہیں ہے۔حدیثوں میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کے مطابق کچھ شرطیں اب پوری ہوگئی ہیں یا ہورہی ہیں، مثلاً یہ کہ شام پر قبضہ ہوگا اسلام کے دشمنوں کا۔

حدیث میں آتا ہے کہ امام مہدی جب ظاہر ہونگے تو ان کے خلاف شام سے فوج نکلے گی۔مگر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی غیبی طاقت سے مٹا دے گا، تہس نہس کر دیگا۔چنانچہ اسٹیج (Stage) تیاز ہوگیا اب اس کیلئے آپ کو تیار رہنا ہے۔حدیثوں کے مطابق جو مشرق وسطیٰ کہلاتا ہے، جنگ کا میدان وہی ہوگا۔امام مہدی بھی وہیں ظاہر ہونگے، حضرت عیسیٰؑ بھی وہیں نازل ہونگے، دجال بھی وہیں ظاہر ہوگا۔وہاں مسلمانوں کی آزمائش ہوگی جنگ کے ذریعہ۔لیکن یہ دجال کا فتنہ وہیں تک محدود نہیں ہوگا۔دنیا کے چپے چپے گاؤں گاؤں گھر گھر تک پہنچے گا۔دجال خود نہیں پہنچے گا تو اس کے ایجنٹ پہنچیں گے۔اب آپ بتایئے سوچ لیجئے اچھی طرح سے کہ اس دجال کے فتنہ سے آپ محفوظ رہ سکیں گے؟ جس کے فتنے سے ہر نبی نے ڈرایا ہے، رسولؐ نے بھی ڈرایا ہے اور ہر نماز میں پڑھنے کی دعا سکھائی ہے اس کے فتنے سے بچنے کے لئے۔اور آپؐ فرماتے ہیں کہ آدمؑ کے وقت سے لیکر اس وقت تک یعنی دجال کے ظہور تک اس سے کوئی بڑا فتنہ نہیں ہے۔بتایئے وہ کیا کرے گا؟ آسمان پر کہیں بادل نہیں ہوگا اور وہ کہے گا پانی برسنے کیلئے تو موسلا دھار پانی ہونے لگے گا۔وہ لہلہاتی کھیتی کو کہے گا سوکھ جا تو وہ سوکھ جائیگی۔گائے کے تھن میں دودھ نہیں ہے وہ کہے گا دودھ دے تو دودھ کا فوارہ پھوٹ پڑے گا۔وہ مردے کو کہے گا زندہ ہوجا، وہ زندہ ہوجائے گا۔وہ ٹیلی ویژن دکھائے گا، ریڈیو پر اناؤنس کریگا۔اسکے ایجنٹ گھر گھر پہنچیں گے۔بولیئے آپ لوگ رہینگے ایمان پر ثابت قدم۔کہے گا تمہارا خدا وہی ہے جو مردے کو زندہ کرتا ہے۔ہم بھی یہی کرتے ہیں۔اس لئے ہم خدا ہیں۔آپ یقین جانیئے جس کے دل میں دنیا کا ذرا سا بھی لالچ ہوگا وہ اس کے فتنے سے نہیں بچے گا۔بچے گا صرف وہ جس نے

اپنے دل سے دنیا کو کھرچ کر نکال دیا ہوگا۔ایسے کتنے آدمی ہونگے اللہ جانتا ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ اس کے پاس آگ ہوگی اور پانی ہوگا، دوسرے الفاظ میں جہنم ہوگی اور جنت۔ جو اس کو خدا مانے گا اس کو اپنی جنت میں داخل کر دے گا۔دنیا دیکھے گی کہ جنت میں داخل ہو گیا مگر وہ جہنم میں جل رہا ہوگا۔اور جو اس کو خدا نہیں مانے گا اس کو وہ اپنی جہنم میں داخل کر دے گا۔تو اے مسلمانو! جب یہ فتنہ تمہارے سامنے آئے تو اس کی آگ میں یعنی اسی کی جہنم میں چلے جانا۔اگر آپ اس فتنہ سے نکلنا چاہتے ہیں۔اگر آپ اپنی دنیا کو قربان کرنے کے لئے تیار ہیں ان دیکھی آخرت کے لئے، تو اس کا وقت ابھی ہے۔اس کے ظاہر ہونے کے پہلے، ظاہر ہونے کے بعد نہیں۔ امام مہدی کے آنے سے پہلے ہے۔ان کے آنے کے بعد نہیں۔تو اس کی تیاری کرنا ہے۔

آج لوگ غافل ہیں اور ہمیشہ یہی ہوا ہے۔حالانکہ اللہ کی ایک بہت بڑی نشانی آسمان میں ظاہر ہوئی ہے۔جس کو کسی نے خواب میں نہیں دیکھا، رات کو نہیں دیکھا، دن کی روشنی میں دیکھا، اپنے سر کی ان آنکھوں سے دیکھا جو دو چار منٹ نہیں قریب آدھے گھنٹے تک دیکھتے رہے۔دس بیس آدمیوں نے نہیں لاکھوں نے ضرور دیکھا۔ چونکہ وہ دنیا والے ذرا چست رہتے ہیں اس لئے اپنے ذہن کے مطابق اس کی توجیہہ بھی کر لی لیکن وہ لوگ جو اپنوں کو خدا کا بندہ سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننے والا سمجھتے ہیں ان کو کوئی احساس نہیں کہ وہ کون سی نشانی تھی؟ لوگوں نے اپنی سر کی آنکھوں سے آسمان میں دو سورج بیک وقت چمکتے ہوئے دیکھا۔یہ کس کی طرف اشارہ ہے؟ یہ کوئی پرانا قصہ یا کہانی نہیں ہے۔لیکن سوچا آپ نے اللہ نے یہ نشانی کیوں دکھائی؟ سن لیجئے! آپ کی کتاب جس کو قرآن کہتے ہیں، اس نے رسول کو سورج سے تشبیہہ دی ہے۔رسول ہر زمانے میں ایک ہوتا ہے۔اللہ کی شریعت کو لانے والا۔اس لئے آسمان پر بھی ایک ہی سورج ہے۔لیکن آپ نے سنا ہوگا کہ ایک وقت آنے والا ہے جب دو رسول اکٹھا ہو جائینگے زمین پر۔حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں جو پیغمبر پیدا ہوئے، جن کو ہم مانتے ہیں، وہ محمدؐ آخری نبیؐ ہیں۔دنیا جہاں کے لئے بھی آخری نبی ہیں اور ان کی نسل میں بھی آخری نبی ہیں۔اور دوسری شاخ حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاقؑ کی ہوئی۔اس میں نبوت کا سلسلہ چلتا رہا۔اس میں جو آخری نبی آئے ان کو حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں۔وہ دور اب آنے والا ہے جب یہ دونوں رسالت اکٹھا ہو جائے گی یعنی محمدؐ کی رسالت تو ہے ہی اور ایک دوسرا رسول پھر آ جائے گا زمین پر یعنی حضرت عیسیٰؑ تو دو رسالت جمع ہو جائے گی۔اگر نہیں سوچا تو اب سوچئے۔میں آپ کو بتا رہا ہوں۔اللہ نے اپنی جس نشانی کا اظہار کیا ہے وہ وقت آ گیا۔اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہوں گا۔کہاں دکھائی دیا کیوں دکھائی دیا؟ اس کی تفصیلات اپنی جگہ پر ہیں۔یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آئینگے تو اصل کام جو ان کے ذمہ ہوگا وہ دجال کو مار ڈالنا ہوگا۔یہ اللہ کی طرف سے سراسر طے ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اپنی تدبیریں کر رہے ہیں اور منصوبہ بنایا ہے تو ہم نے بھی منصوبہ بنایا ہے۔ان کا منصوبہ سازشی ہے، خفیہ ہے۔میرا منصوبہ علی الاعلان ہے۔ان کا منصوبہ ساز دجالی صفت کے اندر چھپا بیٹھا ہوا ہے۔اس کو دنیا والے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ پاتے ہیں۔وہاں تک رسائی نہیں ہے۔جبکہ وہ کیا منصوبہ بنا رہا ہے اس کو مٹانے کیلئے اس کے منصوبے کو نیست و نابود کرنے کیلئے اس کو اور اس کی قوم کو دنیا سے نیست و نابود کر دینے کیلئے ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ اسی کی یعنی بنی اسرائیل کی نسل کا ہی آخری پیغمبر آئے گا اور قتل کرے گا دجال کو۔اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ جو اس نے اپنے رسول برحق سے کیا تھا کہ ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے کہ اس دین کو سارے دینوں پر غالب کر دیں۔حضورؐ کے زمانے میں یہ پیشین گوئی جزوی طور پر پوری ہوئی یعنی جزیرۃ العرب سے سب دوسرا دین مٹ گیا لیکن ساری زمین سے نہیں مٹا۔یہ وقت وہی ہوگا جب اس زمین کے اوپر ایک بھی غیر مسلم نہیں رہے گا۔جتنے بھی انسان ہونگے سب کے سب مومن ہونگے۔دنیا میں مومن کے سوا کوئی نہیں بچے گا۔سب مٹا دیے جائینگے۔اس کے پہلے ہر اس شخص کو جو دنیا کیلئے جیتا ہے اور دنیا کے لئے مرنا چاہتا ہے، اس کو آخرت پر

یقین ہی نہیں ہے، اسے اللہ تعالیٰ مدد کر رہا ہے کہ دنیا سے جتنا لینا ہے لے لو۔ جب کسی قوم کی ہلاکت کا وقت آتا ہے تو اللہ نے ایسا کیا ہے کہ چند دن اور جی لیں مزے کر لیں۔ اسی طریقہ سے آج دنیا والوں کو چاہے وہ غیر مسلم ہوں اور چاہے وہ زبان سے مسلم ہوں اللہ تعالیٰ نے مہلت دے رکھی ہے۔ لیکن انجام سامنے آنے والا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ سے پہلے امام مہدی آئیں گے۔ رسولؐ فرماتے ہیں وہ میری عطرت میں سے ہوگا، فاطمہؓ کی اولاد سے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا حضرت امام حسنؓ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہ میرے اس بیٹے کی اولاد ہوگا، وہ زمین کو عدل انصاف سے بھر دے گا۔ پورے کرۂ ارض پر اسلام قائم ہوگا۔ حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد کے بعد سب یہودی مٹا دیئے جائیں گے۔ یاجوج ماجوج مٹا دیئے جائیں گے۔ اس سے پہلے امام مہدی کو جتنا علاقہ ملے گا اس علاقے میں وہ عدل وانصاف قائم کریں گے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ وہ صرف کتاب اور سنت کے مطابق کام کریں گے۔ انہیں اچھی طرح سمجھ لیجئے صرف کتاب اور سنت یعنی قرآن اور رسول کا طریقہ، اس دو کے سوا کوئی تیسری چیز نہیں ہوگی۔ اور سن لیجئے کہ وہ کن لوگوں پر قائم کرینگے۔ کیا ان لوگوں پر جو اسلام کو نہیں مانتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ تو کیا ان لوگوں پر جو نام لیتے ہیں اسلام کا اور کام کرتے ہیں اپنے من کا یہ بھی نہیں۔ تو مطلب یہ ہے کہ جس علاقہ میں اللہ تعالیٰ ان کو امامت سونپے گا۔ اس علاقے میں جو لوگ بسے ہوئے ہونگے وہ مومن ہونگے۔ لفظ مومن یاد رکھئے، بھولئے گا نہیں جو بتایا ہے۔ تو باقی لوگ کہاں ہوں گے۔ کم از کم اس علاقہ کو تو ایسے لوگوں سے پاک کر دیا جائیگا۔

حضورؐ فرماتے ہیں جب مہدی آئیگا تو مسلمان نام کے جو لوگ دنیا میں ہونگے وہ دو کیمپ (Camp) میں بٹ جائیں گے۔ ایک کیمپ ہوگا جس کے اندر ایمان ہوگا نفاق نہیں ہوگا دوسرا کیمپ ہوگا جس میں نفاق ہوگا ایمان نہیں ہوگا۔ دونوں اپنے کو مسلمان کہیں گے اور دنیا والے بھی انہیں مسلمان کہیں گے، جس کیمپ میں ایمان ہوگا وہ جنتیوں کا کیمپ ہے۔ جہاں نفاق ہوگا جہنمی کا کیمپ ہے۔ نماز بھی چل رہی ہوگی، روزہ بھی چل رہا ہوگا، حج بھی چل رہا ہوگا، تسبیح بھی چل رہی ہوگی اور تہجد گذاری بھی ہو رہی ہوگی لیکن سب نفاق کے واسطے۔ دنیا کہے گی، کیونکہ دنیا تو ظاہر کو دیکھتی ہے، کہ عابد ہیں، تہجد گذار ہیں۔ لیکن جو عالم الغیب ہے عرش پر بیٹھا ہوا ہے وہ تو جان رہا ہے کہ یہاں یعنی دنیا میں تہجد گذاری کس لئے ہو رہی ہے۔ کیا اس لئے کہ اللہ راضی ہو جائے، اس کا رسول راضی ہو جائے، اس کا دین غالب ہو جائے، اور آخرت میں جنت مل جائے؟ ان کو ان سب سے کوئی مطلب نہیں مطلب صرف اس سے ہے کہ دنیا اچھے سے چلتی رہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی کام کرنا ہے تو ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جو بالکل یقینی کامیابی کی وجہ بنے۔ لیکن جو آخرت چاہنے والے ہوتے ہیں وہ اس فکر میں لگے رہتے ہیں آخرت یقیناً مل جائے۔ اس لئے رسول اللہؐ کے وہ صحابی جو براہ راست آپکے ذریعہ تربیت پائے مکی دور میں غزوہ بدر تک، ان کے نقشہ قدم پر ہم چلیں۔ دنیا سے جیسے ان کو بے نیازی تھی ویسے ہم کو بھی بے نیازی ہو جائے۔ جو ایمان والا کیمپ (Camp) ہے وہ مومنوں کا ہے ان کو دنیا کی پروا نہیں ہے۔ دنیا ملے یا نہ ملے۔ کسی سے کٹ جانا پڑے۔ جس حال میں زندگی گزارنا پڑے۔ طعن سننا پڑے بیوی سے، شوہر سے، بھائی سے، بہن سے، بیٹا سے، بیٹی سے، باپ سے، ماں سے، پڑوسیوں سے، رشتہ داروں سے تمام دنیا والوں سے۔ باقی رہے دوسرے لوگ ان کو دنیا چاہئے۔ آخرت مل جائے تو مل جائے، نہ ملے تب بھی کوئی پرواہ نہیں۔ دنیا بہرحال چھوڑی نہیں جاسکتی اب وہ چاہے جس شکل میں ملے۔ اچھی ملازمت مل جائے، خطبہ دینے کے لئے منمبر مل جائے، گدی مل جائے، نام ونمود ہو جائے، ان کا نعرہ لگنے لگے، جہاں کہیں وہ جائیں لوگ کھڑے ہو جائیں ان کی تعظیم میں ہاتھ چومنے لگیں، تبرک حاصل کر لیں ان سے، غرض جتنے ذرائع ہیں نفس کو خوش کرنے کیلئے سب حاصل ہوں۔ یہ سب ہونگے دوسرے کیمپ میں کیونکہ اللہ تعالیٰ آزمائش ہی ایسی کریگا کہ جس کو آخرت چاہئے اس کو اس کے سوا کچھ نہ ملے۔

اس لئے اللہ کی کتاب قرآن اور رسول اللہؐ کا جو طریقہ ہے اسی کے مطابق ہم کو گزارنا ہے۔ چاہے جھونپڑی میں رہنا پڑے یا پھانسی پر چڑھنا پڑے، مجھ کو تو آخرت چاہئے۔ اس وقت صورت حال یہ ہوگی کہ یہ باطل طاقتیں چاہے وہ کھلے ہوئے کافروں کی ہوں یا مشرک یا نام نہاد مسلمانوں کی ہوں، یہ سب اسلام کی اتنی شدید مخالف ہونگی کہ اسلام کا اور محمدؐ کا نام لینا آسان نہ ہوگا۔ کون ہے جو ہمت کرے گا اسلام کی راہ میں کھڑا ہونے کی۔ آپ جانتے ہیں حضرت بلال حبشیؓ غلام تپتی ہوئی ریت پر لٹا دئے جاتے، فرعون کی بیوی حضرت آسیہ، عورت ذات، ان پر بھی ایسا ظلم ڈھایا جاتا تھا کہ زبان ان کی نکل پڑتی تھی۔ لوگ کہیں گے کہ پاگل ہو گئے ہیں یہ لوگ، خود کشی کرنے جارہے ہیں۔ آپ کی قوم والے کہیں گے کہ ان کے دین نے انہیں باولا بنا دیا ہے۔ ذرا بتایئے تو کہاں وہ سپر پاور اور دولت کی ریل پیل اور کہاں یہ؟ ان تبصرہ کرنے والوں کو دیکھیں تو چوغا بھی ہے، داڑھی بھی ہے، کہنے کو اسلامی قانون بھی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے اللہ تعالیٰ کی سنت ایسی ہی رہی ہے۔ جب بھی باطل نے کوشش کی کہ اب آخری وار کردو تو اسی وقت اللہ نے باطل کو ہلاک کر دیا۔ فرعون اپنی پوری طاقت کے ساتھ نکلا کہ آج موسیٰؑ اور اس کی قوم کا صفایا ہی کر دیں گے۔ کہاں روز روز کا جھن جھٹ پٹ پٹ کہ ان کے بچوں کو مار وان کی عورتوں کو چھوڑ دو۔ بنی اسرائیل نے بھی کہا کہ آج تو ہم ختم کر دیئے جائیں گے۔ لیکن جب اللہ نے چاہا تو سب کے سب بچ گئے اور فرعون اپنی پوری طاقت کے ساتھ مٹا دیا گیا۔ مکہ والوں نے کہا کہ بھائی اب بہت ہو گیا اب اس شخص کا خاتمہ ہی کر دیا جائے۔ سازش تیار ہوگئی رسول اللہؐ کو شہید کرنے کے لئے۔ اور اس دن اللہ کا فیصلہ ہو گیا کہ اب باطل کا خاتمہ ہو گیا۔ ٹھیک اسی طریقہ پر آج یہ مکمل سازش تیار کر لی گئی ہے کہ اسلام کو آج دنیا سے پورے طور پر نیست و نابود کر دیا جائے۔ اللہ نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ اسلام ہی رہے گا۔ اے منافقو اور کافرو! تم مٹا دئے جاؤ گے لیکن اس سے پہلے کن حالات سے گزرنا پڑیگا؟ آپ جانتے ہیں کہ دجال کے ساتھ شیطان ہے۔ ویسے دجال تو خود شیطان ہے۔ وہ جنوں کا شیطان ہے جو منصوبے بناتا ہے۔ انسانی شیطان تو نظر آتا ہے۔ جنوں کا شیطان نظر نہیں آتا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ تم کو وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہ ظاہری شیطان بھی ہر جگہ موجود ہے۔ مگر وہ بھی چھپا ایجنٹ ہے۔ تو آپ سوچئے کہ وہ دشمن جو چالاک ہے۔ اور اس کے پاس وسائل بھی اللہ نے دے دئے ہیں۔ اس کی ایجنسی بھی ساری دنیا میں چھائی ہوئی ہے۔ ان سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟ زیادہ تر مسلمان تو خائف ہو گئے ہیں۔ اب مومن کیلئے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ کے دامن میں پناہ لیں۔ نہیں تو جایئے شیطان کے جال میں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کیا ہے کہ آدمؑ سے لیکر قیامت تک جتنا بھی دور آیا ہے اور آئیگا وہ اتنا سخت نہیں ہوگا جتنا یہ دور ہوگا۔ کیونکہ قیامت کے قریب تو شیطانوں کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ کسی سے مقابلہ ہی پیش نہیں آئیگا کیونکہ اسلام کو اللہ تعالیٰ اٹھا لے گا۔ آج اسلام ساری دنیا میں غالب ہونے جارہا ہے تو شیطان کو پوری طاقت لگانی پڑ رہی ہے۔ اس وجہ سے یہ وقت بہت کٹھن ہے۔ اور اس کے پیچھے شیطان ابلیس ہے۔ وہ اپنے کارندوں سے کہے گا کہ تم آگے بڑھو ہم تمہارے پیچھے ہیں۔ یہ مسلمان تم پر کیا غالب ہونگے؟ چلو ان کو مٹا دو۔ تو ٹھیک اس وقت جب وہ مسلمانوں کو مٹانے کے لئے نکلے گا شام کے شہر دمشق میں سفید مینار والی جامع مسجد کی چھت پر صبح کے وقت عیسیٰؑ اتریں گے۔ فجر کی نماز ہوگی۔ اس کے بعد عیسیٰؑ کہیں گے مسجد کا دروازہ کھول دو۔ دروازہ کھول دیا جائیگا تو سامنے دجال ہوگا۔ اپنی پوری فوج کے ساتھ۔ حدیث میں آتا ہے کہ عیسیٰؑ کو دیکھتے ہی دجال پگھلنے لگے گا۔ جیسے پانی میں نمک پگھلنے لگتا ہے۔ وہ بھاگے گا جان بچانے کے لئے۔ لُدّ کے مقام پر عیسیٰؑ اس کو پکڑیں گے جس کا نام آج لڈہ ہے جو اسرئیل کی ہوائی فوج کا ٹھکانا ہے۔ وہاں پر عیسیٰؑ دجال کو مار ڈالیں گے۔ اور اس کے بعد ایک ایک یہودی ختم کر دیا جائیگا۔ دنیا میں ایک یہودی بھی نہیں بچے گا۔ اور وہ صلیب توڑ دیں گے۔ صلیب کا ماننے والا نہیں رہے گا۔ سور کا کھانے والا نہیں رہے گا۔ اس لئے سور بھی ختم ہو جائے گا دنیا سے، صلیب بھی ختم ہو جائے گی۔ اور

حضورؐ کے فرمان کے مطابق ساری دنیا میں اسلام پھیل جائے گا۔تو اس وقت کے آنے سے پہلے جتنا کچرا ہے اس کا صاف ہونا ضروری ہے۔اسکے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کے اندر سے وہ تمام لوگ جو ظاہر میں اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں، جو اسلام کیلئے ایک بوجھ بنے ہوئے ہیں،ان کے وجود سے زمین کو پاک کیا جائیگا اور جو اسلام کے کھلے دشمن ہیں ان کے وجود سے بھی زمین کو پاک کر دیا جائیگا کیونکہ اس کے بغیر اسلام غالب نہیں ہوگا اور دوسرے سارے دین کو مٹایا نہیں جا سکے گا۔تو اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ ہے۔اسے آپ سمجھ لیں۔اس کے بعد فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ ان حالات سے گزرنے کی لئے آپ تیار ہیں یا نہیں۔

اللہ تعالیٰ جن قوموں کو مٹاتا ہے دنیا سے تو وہ دونوں طرح کی قومیں ہوتی ہیں۔ایک وہ جو غیر مسلم سمجھی جاتی ہیں۔ایک وہ جو مسلمان سمجھی جاتی ہے۔مسلمانوں کے متعلق جو بنیادی بات ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم کے لئے جو مسلمان ہو اور اس کے پاس اللہ کی کتاب ہو اپنا قانون یہ بیان فرمادیا ہے کہ اگر وہ اللہ کی کتاب کے کچھ حصے پر عمل کرتی ہو اور کچھ حصے پر عمل نہیں کرتی ہو تو ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں شدید ترین عذاب ہے۔دیکھیئے یہودیوں کے بارے میں اللہ نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ قیامت تک ان کے اندر پھوٹ ڈالے رکھے گا اور ان کو کہیں عزت نصیب نہیں ہوگی سوائے اسکے کہ اللہ ڈھیل دے یا اللہ کے بندوں کی ڈھیل ہو۔آج وہی حال مسلمانوں کا ہے۔کہ کہیں ان کو عزت نصیب نہیں ہے۔جہاں اپنی حکومت برائے نام ہے وہاں بھی نہیں اور جہاں نہیں ہے وہاں تو ہے ہی نہیں۔ جہاں حکومت ہے آپ سب دیکھئے دوسروں کے سہارے یا امریکہ کے سہارے یا روس کے سہارے، اپنا سہارا نہیں۔دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔مسلمانوں سے کہو تم ایسا رویہ اختیار نہ کرو جس کی وجہ سے لوگ اللہ کے دین کی طرف یا تو آئیں نہیں یا آنے کے بعد پھر جانے پر مجبور ہوں۔اگر کرو گے تو دنیا میں تمہارے لئے بڑی برائی ہوگی اور سخت سزا ہوگی اور آخرت میں عذاب عظیم۔قیامت کو خیر چھوڑ دیجئے ،دنیا میں کون بچار ہا ہے، جو عذاب آپ کو مل رہا ہے۔کون مولوی بچار ہا ہے،کون مسٹر بچار ہا ہے۔اب دیکھئے اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے صاف صاف بات کہہ دیا لیکن آپ کے علماء آپ کے پیر ،آپ کے لیڈر آپ کو الٹی سیدھی پڑھاتے ہیں۔کیا ہے بھائی، اتفاق نہیں ہے مسلمانوں میں۔اتفاق ہو جائیگا تو بس ہو گیا مسئلہ حل۔کیا ہے صاحب،غربت ہے۔دولت آجائے گی تو مسئلہ حل ہو جائیگا۔کیا ہے بھائی،تو مادّی طاقت نہیں ہے۔وہ آجائے گی تو مسئلہ حل ہو جائیگا۔کیا ہے،علم نہیں ہے۔علم ہو جائیگا تو مسئلہ حل ہو جائیگا۔ہر مسلمان کو پڑھاؤ،ایم۔اے،Ph.D کراؤ۔لیکن ان کو تو سوچنا ہی نہیں ہے۔کیونکہ وہ تو دنیا چاہتے ہیں اور آپ کو اس میں پھنسا کے رکھنا چاہتے ہیں۔آپ ہی کے بل بوتے پر دنیا کمانا چاہتے ہیں۔چاہے وہ مذہبی بھیس میں ہوں چاہے وہ سیاسی بھیس میں ہوں۔آپ کے پاس سب کچھ تھا۔مشرق سے مغرب تک حکومتیں آپ کو ملی ہوئی تھیں۔ حکومت تھی،فوج تھی، دولت تھی،علم تھا،ٹکنالوجی تھی، اتحاد سب تو تھا۔پھر کیوں چھن گیا؟ جبکہ صحابہؓ کے دور میں کچھ نہ تھا ان کے پاس۔ ان پڑھ، دولت نہیں، دن دن بھر فاقہ ہو جاتا تھا، بدن پر قاعدے کا لباس نہیں، دنیا کی کوئی وجاہت نہیں۔لیکن اللہ نے سب کچھ دے دیا ان کو۔اس طرف جانے کے لئے نہ آپکا لیڈر بتاتا ہے اور نہ آپ کا دشمن بتاتا ہے۔اللہ کہتا ہے راستہ ہے تو صرف یہی ہے۔اس سے تمہاری آخرت بنے گی اور اسی سے اللہ تعالیٰ اپنے چاہنے والوں کی دنیا بناتا ہے۔مگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجارت کرنا ہوگا اور تجارت میں جانتے ہیں دینا پڑتا ہے ایک تو سرمایہ دوسری محنت۔وہ کہتا ہے سرمایہ تمہارے پاس یہ دنیا ہے، یہ دے دو۔لیکن ہماری وعدہ خلافی اور دغابازی یہ ہے کہ اللہ میاں جان مانگیں گے تو ہم نہ دیں گے اللہ میاں مال مانگیں گے تو نہیں دیں گے۔یہ بال بچّوں کے لئے ہے۔ کیونکہ ہم مرجائیں گے تو بال بچوں کا کیا ہوگا؟ آج مرجاؤ گے تو کیا ہوگا؟ کہتے ہیں اللہ کی راہ میں مرجاؤ گے تو کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا۔جب کہ بال بچے آخرت میں کام نہیں آئیں گے۔مختصر یہ کہ اس فتنہ سے کامیابی سے گزرنا ہے۔جب کوئی شخص کہتا کہ آپ

سے ہم کو محبت ہے تو رسولؐ فرماتے کہ کیا بول رہے ہو، سوچ سمجھ لو۔ مجھ سے جو محبت کرتا ہے، آزمائش اور مصیبت اس پر اس طرح سے ٹوٹتی ہے جیسے ڈھلوان زمین پر سیلاب کا پانی آتا ہو۔ ہے ہمت تو کرو محبت، نہیں تو نہیں۔ آج آپ دیکھیں گے کہ جتنا دم بھر رہا ہے حضورؐ کی محبت کا اتنا ہی بدچلن اور کھوٹا ہے۔ کس کس قدم پر آپ کو دھوکا اور فریب دیا جا رہا ہے! میں نوجوانوں سے خاص طور پر کہتا ہوں اور اسلام کی خدمت ہمیشہ انہوں نے کی ہے۔ تم اس پھیرے میں نہ آؤ۔ تمہارے سامنے اللہ کی کتاب موجود ہے۔ تمہارے پاس اللہ کے نبیؐ کی سنت موجود ہے۔ اس میں کہیں پر کوئی گڑبڑی نہیں ہے۔ کہیں پر کوئی جھول نہیں ہے۔ بس اس کو پکڑو اور باقی چیزوں کے فریب سے نکل جاؤ۔ تم کو مولوی کہے گا کہ لاالہ کہہ دیا جنت تمہارے لئے ہوگئی۔ اور اللہ کا فرمان ہے کہ منافق کہتا ہے اشھدان لا الہ الا اللہ، مگر یہ جہنمی ہے۔

دیکھئے امام مہدی آئینگے۔ کب آجائیں گے؟ ہوسکتا ہے ایک سال بعد آئیں، ہوسکتا ہے چار سال بعد آئیں، لیکن وہ آئیں گے۔ اور حضرت عیسیٰؑ بھی آرہے ہیں۔ وہ دعوت دیں گے آپ کو کس چیز کی؟ Pure (خالص) اسلام کی۔ امام مہدی آئینگے تو کوئی کہے گا ارے وہ تو حنفی ہے، کہاں اس کی پھیرے میں پڑے ہوئے ہو۔ دیوبندی کہے گا ارے تم کس پھیرے میں پڑے ہوئے ہو، وہ تو بریلوی ہے۔ بریلوی کہے گا کہ کس پھیرے میں پڑے ہوئے ہو وہ تو دیوبندی ہے۔ سنی کہے گا ارے وہ تو شیعہ ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی ایک گھر میں پیدا ہونگے اور اس گھر کے جو لوگ ہوں گے وہ یا تو شیعہ ہونگے، سنی ہونگے، بریلوی ہونگے، اہل حدیث ہونگے۔ اس لئے اس چکر میں رہنے والے باقی لوگ تو کہیں گے کہ بھائی یہ تو ہمارا قائد نہیں ہے۔ اس چکر سے آپ نکلئے۔ اسلام شیعہ، سنی، اہل حدیث، بریلوی، دیوبندی کچھ بھی نہ جانتا۔

آپ سن لیجئے کہ جو لوگ انتظار میں رہتے ہیں وہ ساتھ نہیں دیتے ہیں۔ رسول اللہؐ کا جو لوگ انتظار کرتے تھے وہ لوگ تو انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ آپؐ آئے تو آپ کے منکر ہوگئے۔ ٹھیک اسی طرح کا معاملہ امام مہدی کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ انتظار میں رہے کہ آپ آئیں گے تو دیکھا جائے گا تو اللہ تعالیٰ توفیق نہیں دے گا ان کے کیمپ (Camp) میں جانے کی۔ اپنے تمام بھائیوں سے اور بالخصوص نوجوانوں سے یہ اپیل ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو اسلامی بنانے کی تحریک شروع کریں۔ جس کو دیکھ کر کے دنیا نے ہمیشہ اسلام قبول کیا ہے اور آج بھی وہ قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ اگر یہ کام آپ نے شروع کر دیا تو آپ حق بجانب ہونگے اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ ہے اپنے مومن بندوں سے وہ اس کو پورا کرے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ "جو میں وعدہ کرتا ہوں اس کو پوچھنے کا، سوال کرنے کا، اس کا مطالبہ کرنے کا میرے بندوں کو حق ہے"۔ اللہ کا یہ وعدہ ہے اپنے مومن بندوں سے کہ وہ مومنوں پر کافروں کو راہ نہیں دے گا۔ لیکن انہیں نئی دور کے صحابہؓ کے نمونہ کا سا بننا ہوگا۔

کیا آپ آخرت میں نیک نامی چاہتے ہیں اور اس کی خاطر دنیا میں بدنام ہونے کو تیار ہیں۔ کیا آپ آخرت میں اونچا سے اونچا مرتبہ چاہتے ہیں اور دنیا کے اونچے معیار زندگی (Standared of Living) کو ٹھوکر مارنے کو تیار ہیں۔ اگر نہیں، تو چند دن کے لئے اللہ جو چاہے گا دے دے گا اور پھر ہمیشہ کی رسوائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو اس بات کی توفیق دے کہ اس کے دین کے مخلص ماننے والے ہوں۔ آمین!

موجودہ حالات کا تقاضا اور فطرت کے اشارے

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

اس مضمون کو ڈاکٹر صاحبؒ نے فولڈر کی شکل میں شائع کروا کر انجمن اسلامیہ ہال میں غالباً ۱۹۹۳ء کے رمضان المبارک میں جمعہ کے اجتماع میں تقسیم کروایا۔

آج انسانوں کی خدا بے زاری اور بدعملی کی روش نے عقائد و اخلاق میں بگاڑ پیدا کر کے انسانی معاشرے کو تو ہلاکت کے دہانے پر کھڑا کر ہی دیا ہے، ساتھ ہی ساتھ طبعی ماحول میں فساد برپا کر کے دنیا کے طبعی وجود کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ کسی کو بھی اندازہ نہیں ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ اس صورت حال کے لئے جواب دہ اور اس کو بہتر بنانے کے ذمہ دار مسلمان ہی تھے اور ہیں، گرچہ ان کی اکثریت کے پاس دوسروں کا شکوہ کرنے کے لئے زبان تو ہے لیکن خود اپنے آپ کو بدلنے کا عزم نہیں! بہر حال جو بھی اپنی ذمہ داری ادا کرنا چاہتا ہو اسے آگے بڑھنے سے قبل یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟ کدھر جا رہا ہے؟ کدھر جانا ہے؟ اس سلسلے میں رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فطرت کے اشارات کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے تاکہ ہم اس پر غور کریں اور اپنے لئے لائحہ عمل متعین کریں۔

فطرت کے اشارے :

اپنی جدوجہد کے سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں؟ اس ضمن میں ہمیں فطرت کے اشاروں کو سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ''بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت میں اور رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں عقل و فہم والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔'' (آلِ عمران : ۱۹۰)

اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کو پیدا کیا۔ دن اور رات کا یہ چکر جس طرح طبعی دنیا میں چل رہا ہے اسی طرح انسان کی معاشرتی اور اخلاقی دنیا میں بھی چل رہا ہے۔ اور جو قانون طبعی دن اور رات کے سلسلے میں کارفرما ہے وہی قانون معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے بھی کام کر رہا ہے۔ اب ہم جس طرح طبعی دن اور رات کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی مشغولیات اور کام کا تعین کرتے ہیں اسی طرح انسانی معاشرت کے لحاظ سے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اس وقت رات ہے، دن ہے، صبح ہے، یا مغرب کا وقت ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے دن کا وقت وہ ہے جب حق یعنی اسلام غالب ہو، اور رات کا وقت وہ ہے جب باطل غالب ہو۔ رات اور دن کی طرح حق اور باطل کے غالب ہونے اور مغلوب ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ پھر کچھ اوقات ایسے بھی ہوتے ہیں جب نہ دن ہو اور نہ رات، یہ وقت ہے مغرب اور فجر کا۔ اب ہم رات اور دن کی خصوصیت پر غور کریں تو ان کی دو بنیادی خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ دن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روشنی ہوتی ہے، دوسری یہ کہ اس میں گرمی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس رات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریکی ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ اس میں خنکی اور ٹھنڈک ہوتی ہے۔ تو انسانی معاشرے میں جس وقت دن یعنی حق غالب ہوتا ہے اس وقت حقیقی علم کی روشنی میں انسانی زندگی کا ہر کام سلیقے سے چلتا ہے۔ اور اسی کے برعکس جب باطل غالب ہوتا ہے تو جہالت کی تاریکی (رات) ہوتی ہے اور اس وقت چور اور اچکوں، درندوں اور وحشی جانوروں کے کام کی طرح سے انسانی معاشرے کا کاروبار چلتا

ہے لیکن انسانوں جیسا کام اس وقت نہیں ہوتا۔

فطرت کے ان اشاروں کی مدد سے جب ہم ماضی قریب کی انسانی تاریخ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا زمانہ دراصل دن کا وقت تھا جب اسلام کی روشنی چھائی ہوئی تھی۔ پھر جب مسلمانوں پر بدنصیبی طاری ہوئی تو انہوں نے اسلام کا ساتھ چھوڑنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ باطل غالب آگیا۔ رات کی یہ تاریکی گہری سے گہری ہوتی گئی۔ پھر صبح کاذب کا وقت آیا جب بہت ہی مختصر وقت کے لئے آسمان میں ہلکی سی روشنی نظر آتی ہے لیکن جلد ہی پھر تاریکی چھا جاتی ہے، اور پھر کچھ دیر بعد صبح صادق کی روشنی نمودار ہوتی ہے جو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیان کا وقت سب سے گہری تاریکی کا وقت ہوتا ہے۔ (رات کے درمیانی حصہ کی تاریکی سے بھی زیادہ تاریک) چنانچہ صبح کاذب کا وقت تو وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں خلافت تحریک چل رہی تھی اور عالم اسلام میں دوسری جگہ بھی اسلام کے احیاء کی کچھ کوششیں ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے بعد گہری تاریکی چھا گئی (صبح کاذب اور صبح صادق کا درمیانی وقفہ) اس وقت مسلمانوں پر ایسی خبط الحواسی طاری ہوگئی کہ ان کے پلیٹ فارم سے اسلام کا نام لینا خود ان کے نزدیک جرم قرار پاتا تھا۔ اسلام کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا تو دور رہا خود وہ اس کے صحیح علم سے بے بہرہ ہو گئے۔ پھر ۱۹۴۰ء کے قریب کا زمانہ آیا جب اسلام کو علمی میدان میں پورے اعتماد کے ساتھ پیش کرنے کا آغاز ہوا۔ یہی دراصل صبح صادق کا آغاز تھا۔ حقیقی علم کی یہ روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ اسلام کی حقانیت آج علمی میدان میں واضح ہو چکی ہے۔ اس طرح اسلام کی علمی فتح تو حاصل ہوگئی ہے۔ اور اب عملی کشمکش کا مرحلہ ہے۔

یہاں ایک بات اور ملحوظ رکھئے کہ فجر کے وقت یعنی طلوع آفتاب کے وقت خنکی اور ٹھنڈک جو رات کی ایک خصوصیت ہے سب سے زیادہ ہوتی ہے اور نیند کا حملہ بھی شدید ہوتا ہے جو دراصل رخصت ہوتی ہوئی رات کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ اسی وقت آسمان میں سرخی بھی نمودار ہوتی ہے جسے قرآن نے شفق سے تعبیر کیا ہے۔ یہ علامت ہے خون کی سرخی کی۔ آج جب ہم انسانی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ باطل اور اس کی علمبردار اسلام دشمن طاقتوں کو جب یہ احساس ہونے لگا کہ حق یعنی اسلام علمی لحاظ سے استحکام کے بعد اب عملی کشمکش کے مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے تو اس نے رات کی طرح اپنا آخری حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس نے ایسے حالات پیدا کئے ہیں کہ لوگوں کے اعضاء مفلوج اور حواس شل ہو جائیں اور وہ آنکھ سے روشنی کو دیکھنے کے باوجود ہاتھ پاؤں نہ مار سکیں۔ ساتھ ہی آج جو ظلم و بربریت اور خون خرابہ کا بازار گرم ہے وہ شفق کی لالی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس طرح ہم اب چاہیں یا نہ چاہیں قدرت نے ہمیں اس دور میں داخل کر دیا ہے جب طلوع آفتاب یعنی غلبۂ اسلام کے آغاز کے وقت کا آخری معرکہ درپیش ہے۔

صبح یعنی غلبہ اسلام کے لئے تیاری کا ایک مرحلہ صبح صادق سے قبل سحر کے وقت ہوتا ہے جب تہجد کی نماز کا اہتمام کیا جاتا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ افراد کا گہرا تعلق پیدا ہو۔ یہ دراصل جہاد فی النفس اور انفرادی تزکیہ کے ذریعہ اسلامی تمدن کو چلانے والے افراد کی تیاری کا وقت ہے۔ صبح صادق کے آغاز کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اجتماعی تربیت اور تزکیہ کا وقت ہوتا ہے اور طلوع آفتاب کے بعد گزشتہ انفرادی و اجتماعی تربیت کو عملاً بہ روئے کار لانے کا وقت ہوتا ہے۔ اس لئے اب معلوم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے زمانے میں اسلامی انقلاب جس طرح اللہ تعالیٰ کی براہ راست نگرانی میں اس کی مشیت کے مطابق برپا ہوا اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مشیت آج پھر انقلاب کے حق میں ہے اور رسولؐ کے ہاتھوں اسلام کو جس طرح غلبہ حاصل ہوا تھا اسی طرح آج جب کہ اب کوئی نبی نہیں آنے والا ہے، یہ غلبہ امام مہدی کے ذریعہ حاصل ہو۔ امام مہدی سے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ''وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیگا جیسے وہ ظلم و جور سے بھر گئی تھی'' اور یہ کہ ''وہ لوگوں میں تمہارے نبیؐ کی سنت کے مطابق معاملہ کریگا۔'' (مشکوٰۃ ابوداؤد)

وقت کا تقاضہ:

یہ وقت جہاں اسلام کے لئے خوش آئند ہے مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائش کا ہے۔ یہ وقت نازک بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔ اسلام کے غلبے کے اس دور میں داخلہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان کے نام سے جانی جانے والی ساری آبادی بھی کامیاب ہو جائے گی بلکہ اس کا انحصار تو اس بات پر ہے کہ ہمارا رویہ کیا ہوتا ہے۔ ہم وقت کے مطالبے کو سمجھ کر اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہیں کہ نہیں۔ رسولؐ کی شخصیت جب دنیا میں آئی تو اس سے بڑھ کر تو خوش بختی کا کوئی دور نہیں ہو سکتا تھا لیکن کتنے بد بخت تھے جو اس وقت بھی دنیا سے نامراد گئے۔

اسلامی انقلاب کی تیاری کے اوپر بیان کردہ مرحلوں سے ہم مسلمانوں نے کتنا فائدہ اٹھایا اس کا علم تو مجھے نہیں ہے البتہ اس وقت ہمارے کرنے کا جو کام ہے وہ یہ ہے کہ ہم امام مہدی کے ذریعہ برپا ہونے والے انقلاب کے لئے زمین کی ہمواری کے کام میں لگ جائیں۔ اس غرض کے لئے مشیت نے بھی غلط عناصر کو چھانٹ کر الگ کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس موقع پر ہمیں اپنی امان میں رکھے۔ اس وقت آپ میں سے جو اسلام کی حقیقتاً خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے فرائض کی پابندی، کبائر سے اجتناب، معنی کے ساتھ قرآن، صحیح احادیث اور صحابہ میں سے 'السابقون' کی سیرت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اور آپ کے سمجھنے اور کرنے کا کام یہ ہے:

(۱) آپ فرداً فرداً اللہ تعالیٰ سے جڑ کر اور تمام ہنگاموں اور وقتی و ضمنی مسائل سے الگ ہو کر یکسوئی سے اپنی، اپنے گھر والوں اور اپنے معاشرے کی اصلاح کی کوشش انہی خطوط کار پر کریں جن پر رسولؐ نے اس امت کو حق کے ساتھ کھڑا کیا تھا۔ اسلام کے جس جس حکم پر عمل کرنے کے لئے جیسے جیسے اور جس حد تک حالات سازگار ہوتے جائیں اس پر عمل کرتے جائیں اور اپنے ساتھیوں سے عمل کرانے کی کوشش کریں۔ جو افراد بھی تیار ہوتے ہیں انہیں باہم مربوط رکھنے کی کوشش کریں۔

(۲) آپ کے ذہن کو پراگندہ کرنے کی جو کوشش مختلف تنظیموں، جماعتوں اور تحریکوں کی طرف سے ہو، آپ ان کے چکر میں نہ پڑیں۔ بعض صرف سیاسی غلبہ کی بات کریں گے تو بعض نمازی بنانے کی بات کریں گے۔ قرآن نے دو طرح کے نمازی کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک کے لئے ویل ہے اور دوسرے کے لئے جنت۔ اگر معاملہ ویل کا ہو تو دور رہیں۔ ہم ایسے لوگوں کے کردار پر نظر رکھیں کیونکہ بے نفس اور خدا ترس ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب علم افراد کم یاب ہیں۔

(۳) اسی طرح فکری یکسوئی میں خلل ڈالنے والے مغربی اور ملکی ذرائع ابلاغ (News Media) سے متاثر نہ ہوں۔ وہ جن چیزوں کو نمایاں کریں یا جن کی حمایت کریں آپ ان سے ہوشیار رہیں۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ وہ جن کے مخالف ہوں وہ سب ہمارے لئے مفید ہی ہوں۔

(۴) قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ (الممتحنہ:۸) اس لئے آپ ایسے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ ان سے قریبی تعلقات پیدا کیجئے۔ رہے وہ لوگ جو واقعی اسلام کی وجہ کر آپ سے دشمنی برتتے ہیں ان سے بھی اپنے دنیاوی مفاد کے لئے کش مکش سے بچتے ہوئے ان تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "برائی کو اچھائی سے دفع کرتے رہو۔ تم دیکھو گے کہ یکایک تمہارا بدترین دشمن جاں نثار دوست بن گیا (حم السجدہ:۳۴) آپ یقین مانئے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اللہ اور رسولؐ اور اس کے دین کے لئے وفادار ہونے کو اگر تیار نہ ہوئی تو غیر مسلموں کی شاید اس سے بڑی تعداد پورے خلوص سے اس دین میں داخل ہو کر اس کمی کو پورا کر دے گی۔

عذاب الٰھی

اور

دور حاضر

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۱ء اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں امین پبلیکیشنز، اکزیبیشن روڈ، پٹنہ، سے ڈاکٹر احسن احمد صاحب کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ کتاب کا مسودہ مصنف نے اقبال احمد صاحب سے املاء کرایا اور راشد نیر صاحب نے اسے ذیلی عنوانات کے ساتھ ترتیب دیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بچوں کو عقیدے کے لحاظ سے توحید پر اور عمل کے لحاظ سے اپنی شریعت پر چھوڑا۔ان کے بعض بچوں سے انفرادی طور پر نفس کے غلبہ سے متاثر ہوکر کچھ گناہ کے کام ہوئے مگر اس کی حیثیت بس گناہ کی تھی، جیسے آج کسی مسلمان سے گناہ ہو جایا کرتا ہے۔ بعد کی نسل آہستہ آہستہ اپنے بنیادی عقیدے سے اور اس کے نتیجے میں صحیح راہ سے دور ہوتی چلی گئی۔اس دوران ان میں انبیاء مبعوث ہوتے رہے جن میں سے صرف ایک کا نام ہمیں معلوم ہے اور وہ ہیں حضرت ادریسؑ۔ان انبیاء کی کوششوں سے کچھ لوگ جزوی طور پر سیدھے راستے کی طرف پلٹتے بھی رہے مگر مجموعی طور پر لوگ گمراہی میں آگے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ جب حضرت نوحؑ کا زمانہ آیا تو اس وقت حضرت نوحؑ کے سوا بقرینۂ غالب کوئی اسلام پر نہ تھا۔حضرت نوح علیہ السلام کی مسلسل ساڑھے نو سو برس تک انتھک تبلیغ اور کوششوں کے نتیجے میں بس چند ہی آدمی مومن ہو سکے۔ بالآخر ان کے علاوہ اس وقت کی پوری انسانی آبادی اللہ کے عذاب کے ذریعہ مٹادی گئی، اور اس کے بعد انسانی نسل کا جو سلسلہ آگے چلا اس میں قومیں بگڑتی اور بنتی رہیں، اور بگڑنے والی قومیں عذاب کے ذریعہ ہلاک کی جاتی رہیں۔ بننے اور بگڑنے کا یہ سلسلہ چلتا رہا ہے اور قیامت تک چلتا رہے گا۔

قیامت کبریٰ و قیامت صغریٰ

اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر انسانوں کو بسانے کے ساتھ ہی یہ بات طے کر دی کہ ایک دن سبھوں کو ختم ہونا ہے اور قیامت میں ان سارے اعمال کی، جو دنیا میں انہوں نے کئے ہوں گے، جزا یا سزا ملنی ہے۔یہی وہ قیامت کبریٰ ہے جس پر اس زمین اور پوری نوع انسانی کا خاتمہ ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی طے فرمادیا کہ قیامت کبریٰ سے پہلے بھی انسانی آبادیاں یا تو طبعی طور پر ہلاک کی جائیں گی یا سخت عذاب کے ذریعہ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں''۔(بنی اسرائیل:۵۸)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ بہت سے اعرابی آکر نبیؐ سے الساعۃ (قیامت) کے متعلق پوچھتے۔آپ ان میں سے کم عمر کی طرف دیکھتے اور فرماتے: یہ بوڑھا نہیں ہوگا کہ تمہاری الساعۃ (قیامت) قائم ہو چکی ہوگی۔(مشکوٰۃ: ۵۲۷۶: متفق علیہ)

اس حدیث میں پہلی بات یہ صاف واضح ہے کہ قیامت سے مراد یہاں قیامت کبریٰ نہیں ہے۔اس کا ایک مفہوم تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس قرن کے لوگ دنیا سے اٹھ جائیں گے اور نیا قرن آجائے گا۔دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہؓ کے بعد طرز زندگی بدل جائے گا۔جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ تابعین تبع تابعین سے کہتے تھے کہ تم اگر صحابہؓ کو دیکھتے تو پاگل کہتے اور صحابہؓ اگر تم کو دیکھتے تو کافر سمجھتے۔اس طرح قرآن و حدیث دونوں میں قیامت کبریٰ کے قبل بھی عذاب یا ہلاکت کا تذکرہ ملتا ہے، یہی قیامت صغریٰ ہے۔

اس طرح قیامتیں تین طرح کی ہیں۔ایک، فرد کی قیامت، جب اس کا انتقال ہو جائے۔دوسری، قوم یا کسی آبادی کی قیامت، جب وہ اجتماعی طور پر طبعی قوانین کے تحت یا عذاب کے ذریعہ ختم کر دی جائے یعنی قیامت صغریٰ۔تیسری، قیامت کبریٰ، جب ایک ایک متنفس ختم کر دیا جائے گا اور کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔

فرد کی قیامت

حدیث میں آتا ہے من مات فقد قامت قیامتہ ''جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہوگئی''۔اس کا شرعی مفہوم تو یہی ہے کہ اپنی زندگی بھر کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آنے لگتے ہیں اور دوسرا مفہوم تکوینی لحاظ سے یہ ہے کہ ایک فرد بے شمار خلیوں (

(Cells) سے بنا ہوتا ہے جن میں کوئی نہ کوئی خلیہ ہر آن مرتا رہتا ہے اور نیا خلیہ بنتا اور پیدا ہوتا رہتا ہے، لیکن جب وہ فرد مر جاتا ہے تو اس کے سارے کے سارے خلیے مر جاتے ہیں، یہی اس کی تکوینی قیامت ہے۔

قوم یا آبادی کی قیامت

قوم یا آبادی بے شمار افراد پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے کوئی نہ کوئی فرد ہر آن مرتا رہتا ہے اور نئے افراد پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن جب وہ سب کے سب ہلاک ہو جاتے ہیں تو وہ اس قوم یا آبادی کی قیامت ہوتی ہے۔

آسمان و زمین کی قیامت

اسی طرح آسمان وزمین کی قیامت کا حال ہے۔ ہماری کہکشاں (Galaxy) بے شمار ستاروں، سیاروں اور نظام ہائے شمسی کا مجموعہ ہے۔ ان کی مثال ویسی ہی ہے جیسے انسانی جسم کے خلیے۔ چنانچہ کوئی نہ کوئی نظام بنتا اور ٹوٹتا رہتا ہے، لیکن جب قیامت آئے گی تو یہ سب کے سب ایک ساتھ ختم کر دیئے جائیں گے۔

عذاب اور قیامت

یہ تینوں قسم کی قیامتیں تو بہر حال آتی ہی ہیں چاہے سارے کے سارے انسان اللہ کے فرماں بردار بن کر زندگی بسر کریں یا نافرمان بن کر۔ ایک فرد کو، اگر وہ زندگی بھر صالح رہے تو بھی اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر یا اس کے پہلے اپنی قیامت سے دوچار ہونا ہی ہے، البتہ اگر وہ مجرمانہ زندگی گزارے تو اس کی یہ قیامت اس کے لئے عذاب کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہی حال قوموں اور آبادیوں کا بھی ہے کہ اگر وہ خدا کی فرماں بردار ہوں تب بھی اپنی مہلت عمر پوری کرنے کے بعد ختم کر دی جاتی ہیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے لکل امۃ اجل ''ہر امت یا گروہ انسانی کے لئے زندگی کا ایک آخری وقت مقرر ہے''۔ ایسی قوموں کا خاتمہ طبعی طور پر ہوتا ہے۔ بخلاف ان کے مجرم قومیں اپنی مہلت پوری کر کے عذاب کے ذریعہ مٹادی جاتی ہیں۔ قیامت (قیامت کبریٰ) جس وقت آئے گی اس وقت زمین پر کوئی ایک انسان بھی اللہ کا وفادار نہیں ہوگا، اسی لئے وہ قیامت عذاب کی شکل میں آئے گی۔

مجرم قومیں اور عذاب الٰھی

وہ قومیں، امتیں اور آبادیاں جو عذاب کے ذریعہ مٹائی گئیں ان میں بعض کا حال قرآن میں بیان کیا گیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا حال بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الم یأ تکم نبؤ ا الذین من قبلکم قوم نوح وعاد و ثمود۔والذین من بعد ھم۔لا یعلمھم الا اللہ ''کیا تمہیں ان لوگوں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔ (ابراہیم:۹)

دوسری جگہ فرمایا: ولقد ارسلنا رسلا من قبلک منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک۔ ''اور یقیناً آپ سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے، ان میں سے وہ ہیں جن کا قصہ آپ کو سنایا اور وہ بھی ہیں جن کا قصہ آپ کو نہیں سنایا''۔ سورہ غافر، آیت ۷۸)

ظاہر ہے جن کا قصہ نہیں بیان کیا گیا ان کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس لئے ہم ان گزشتہ قوموں کا حال دیکھیں گے جن کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح اور کیوں ہلاک کی گئیں۔ ان میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی قوم ہے۔

قوم نوحؑ

نبی کی دعوت: ''اس نے کہا: میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا''۔(سورہ ہود:۲۶۔۲۵)

''کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں۔لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔پس تم اللہ سے ڈرو اور (بے کھٹکے) میری اطاعت کرو'' (سورہ الشعراء: ۱۱۰۔۱۰۵)۔

مزید مطالعہ کے لئے سورہ اعراف،سورہ یونس۔سورہ المومنون،سورہ نوح دیکھیں۔

قوم کا رد عمل: ''اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ: یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے،اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے) کچھ نہیں بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے کچھ مدت اور دیکھ لو۔(شاید افاقہ ہو جائے)''۔ سورہ المومنون:۲۵۔۲۳)

''آخرکار ان لوگوں نے کہا کہ: اے نوح! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کرلیا،اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر سچے ہو''۔(سورہ ہود: ۳۲)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ الشعراء،سورہ اعراف،سورہ ہود دیکھیں۔

نبی کا جواب: ''اس نے کہا: اے برادران قوم، ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا، مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر پر چپکا دیں؟ اور اے برادران قوم، میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں۔مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔اور اے قوم، اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچائے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات نہیں آتی؟ اور میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں، اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا''۔ (سورہ ہود: ۳۱۔۲۸)

''اور نوح نے کہا: میرے رب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا بدکار اور سخت کافر ہو گا''۔(سورہ نوح:۲۷۔۲۶)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ اعراف،سورہ یونس،سورہ المومنون۔سورہ الشعراء دیکھیں۔

عـــذاب: ''نوح پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے بس وہ لا چکے،اب کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ان کی کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کردو۔اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرو۔یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں''۔(سورہ ہود: ۳۷۔۳۶)

''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا: ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اپنے

گھر والوں کو بھی سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے اس میں سوار کر دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوحؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ کشتی ان لوگوں کو لئے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی''۔ (سورہ ہود: ۴۲۔۴۰)

''ہم کو (اس سے پہلے) نوح نے پکارا تھا تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے بچا لیا اور اسی کی نسل کو باقی رکھا، اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوحؑ پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا، پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا''۔ (سورہ الصفت: ۸۲۔۷۵)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ اعراف، سورہ یونس، سورہ المومنون، سورہ القمر دیکھیں۔

قوم عاد

نبی کی دعوت: ''اس نے کہا: اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادران قوم! اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو''۔ (سورہ ہود: ۵۲۔۵۰)

''یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لا حاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو، اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو، پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے، اولادیں دیں، باغ دیئے اور چشمے دیئے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے''۔ (سورہ الشعراء: ۱۲۵۔۱۲۸)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ المومنون، سورہ احقاف دیکھیں۔

قوم کا رد عمل: ''اس قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے، جواب میں کہا: ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو''۔ (سورہ اعراف: ٦٦)

''انہوں نے جواب دیا: کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے''۔ (سورہ اعراف: ۷۰)

''اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا جس کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا، وہ کہنے لگے: یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا، جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں رہے۔ یہ تمہیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے اس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ بعید بالکل بعید ہے یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے۔ زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس یہی دنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ شخص خدا کے نام پر محض جھوٹ گھڑ رہا ہے اور ہم کبھی اس کی ماننے والے نہیں ہیں''۔ (سورہ المومنون: ۳۸۔۳۳)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ ہود، سورہ الشعراء، سورہ احقاف دیکھیں۔

نبی کا جواب: ''اس نے کہا: تمہارے رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے

ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں''۔ (سورہ اعراف: ۷۱)

''ہود نے کہا: میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں، تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو، میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو۔ جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے''۔ (سورہ ہود: ۵۷۔۵۴)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ اعراف، سورہ المومنون، سورہ احقاف دیکھیں۔

عذاب: ''پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے نجات دے دی اور ایک سخت عذاب سے انہیں بچا لیا۔ یہ ہیں عاد! اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا۔ اس کے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی۔ سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا، سنو! دور پھینک دئے گئے عاد ہود کی قوم کے لوگ''۔ (سورہ ہود: ۶۰۔۵۸)

''عاد نے جھٹلایا، تو دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں، پس دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات''۔ (سورہ القمر: ۲۱۔۱۸)

مزید مطالعہ کے لئے دیکھیں سورہ الاعراف، سورہ المومنون، سورہ الشعرا، سورہ احقاف اور سورہ الحاقہ۔

قوم ثمود

نبی کی دعوت: ''اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا، اس نے کہا، ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے۔ لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے''۔ (سورہ ہود: ۶۱)

''یاد کرو جب ان کے بھائی صالحؑ نے ان سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دئے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخر یہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے''۔ (سورہ الشعرا: ۱۵۲۔۱۴۱)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ الاعراف اور سورہ النمل دیکھیں۔

قوم کا رد عمل: ''اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا: کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ انہوں نے جواب دیا: بیشک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔ ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا: جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں''۔ (سورہ الاعراف: ۷۶۔۷۵)

''انہوں نے کہا: اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس طریقہ کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے''۔ (سورہ ہود: ۶۲)

''انہوں نے جواب دیا: تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے، تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے؟ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے''۔ (سورہ الشعراء: ۱۵۴_۱۵۳)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ النمل اور سورہ القمر دیکھیں۔

نبی کا جواب: ''اور صالحؑ یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ: اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں''۔ (سورہ اعراف: ۷۹)

''صالحؑ نے کہا: اے برادران قوم! تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا، اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آسکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو۔ اور اے میری قوم کے لوگو! دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی ہے۔ اسے خدا کی زمین پر چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دو۔ اس سے ذرا تعرض نہ کرنا ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آ جائے گا''۔ (سورہ ہود: ۶۴_۶۳)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ الشعراء، سورہ النمل اور سورہ الشمس دیکھیں۔

عذاب: ''آخر کار ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالحؑ اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔ بیشک تیرا رب ہی دراصل طاقتور اور بالا دست ہے، رہے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے ان کو دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے کہ گویا وہ وہاں بسے ہی نہ تھے۔ سنو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیئے گئے ثمود''۔ (سورہ ہود: ۶۸_۶۶)

''مگر انہوں نے اس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔ آخر کار ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوند خاک کر دیا، اور اسے (اپنے اس فعل کے) کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں''۔ (سورہ الشمس: ۱۵_۱۴)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ الشعراء سورہ النمل اور سورہ القمر دیکھیں۔

قوم لوطؑ

نبی کی دعوت: ''لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لوطؑ نے ان سے کہا تھا کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لئے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو''۔ (سورہ الشعراء: ۱۶۶_۱۶۰)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ اعراف، سورہ ہود اور سورہ النمل دیکھیں۔

قوم کا رد عمل: ''مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ: نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے، بڑے پاک باز بنتے

ہیں''۔(سورہ اعراف:۸۲)

''کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انہوں نے کہا: لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے''۔(سورہ العنکبوت:۲۹۔۲۸)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ ہود، سورہ الشعراء اور سورہ النمل دیکھیں۔

نبی کا جواب: ''اس نے کہا: تمہارے کرتوتوں پر جو لوگ کڑھ رہے ہیں میں ان میں شامل ہوں۔اے پروردگار! مجھے اور میرے اہل وعیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے''۔(سورہ الشعراء: ۱۶۹۔۱۶۸)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ ہود اور سورہ العنکبوت دیکھیں۔

عذاب: ''تب فرشتوں نے کہا: اے لوطؑ ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، یہ لوگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔بس تو کچھ رات رہے اپنے اہل وعیال کو لے کر نکل جا اور دیکھو تم میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے مگر تیری بیوی (ساتھ نہیں جائے گی) کیوں کہ اس پر بھی وہی کچھ گزرنے والا ہے جو ان پر گزرنا ہے۔ان کی تباہی کے لئے صبح کا وقت مقرر ہے۔صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے۔پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر دیا اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں ہے''۔(سورہ ہود: ۸۳۔۸۰)

''لوطؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کو ہماری پکڑ سے خبردار کیا مگر وہ ساری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے۔پھر انہوں نے اسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔آخر کار ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں کہ چکھو اب میرا عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ۔صبح سویرے ہی ایک اٹل عذاب نے ان کو آ لیا۔چکھو مزہ میرے عذاب کا اور میری تنبیہات کا''۔(سورہ القمر:۳۶۔۳۹)

مزید مطالعہ کے لئے دیکھیں سورہ اعراف، سورہ الشعراء، سورہ نمل، سورہ عنکبوت اور سورہ الحجر۔

قوم شعیبؑ

نبی کی دعوت: ''اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا، اس نے کہا: اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آ گئی ہے۔لہذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو، جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔یاد کرو وہ زمانہ جب تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا، اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا، تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔ (سورہ اعراف:۸۷۔۸۵)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ ہود اور سورہ العنکبوت دیکھیں۔

''اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔یاد کرو جب کہ شعیبؑ نے ان سے کہا تھا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں، لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔میں اس کام پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے''۔ (سورہ الشعراء:۱۸۴۔۱۷۶)

قوم کا رد عمل: ''انہوں نے جواب دیا: اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں

جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشاء کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے''۔(سورہ ہود ۸۷)

''انہوں نے کہا: اے شعیب! تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے۔ تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگ سار کر چکے ہوتے، تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو''۔(سورہ ہود: ۹۱)

''انہوں نے کہا: تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے، اور تو کچھ نہیں مگر ایک انسان ہم ہی جیسا اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں، اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے''۔(سورہ الشعراء: ۱۸۷۔۱۸۵)

نبی کا جواب: '' شعیبؑ نے کہا: بھائیو! تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے مجھے اپنے یہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا (تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمہارا شریک حال کیسے ہوسکتا ہوں؟) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں، میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں، اور اے برادران قوم! میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخر کار تم پر بھی وہی عذاب آ کر رہے جو نوحؑ یا ہودؑ یا صالحؑ کی قوم پر آیا تھا، اور لوطؑ کی قوم تو تم سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ دیکھو، اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے''۔(سورہ ہود: ۹۰۔۸۸)

''شعیب نے کہا: کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے طریقے پر کام کئے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا، جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے، تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ چشم براہ ہوں''۔(سورہ ہود: ۹۳۔۹۲)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ اعراف دیکھیں۔

عذاب: ''آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیبؑ اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچا لیا، اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے''۔ (سورہ ہود: ۹۵۔۹۴)

مزید مطالعہ کے لئے سورہ اعراف اور سورہ الشعراء دیکھیں۔

یہ ساری قومیں وہ ہیں جو محدود خطوں میں آباد تھیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:'' یہ بستیاں تھیں، انہوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان میں سے ہر ایک کی ہلاکت کے لئے ہم نے وقت مقرر کر رکھا تھا'' (سورہ الکہف: ۵۹)

ان میں سے کوئی بھی قوم خدا کی منکر نہیں تھی۔ یہ سب کی سب وہ بستیاں تھیں جہاں کے لوگ موحد اور مومن لوگوں کی اولاد تھے مگر رفتہ رفتہ وہ شرک میں مبتلا ہو گئے اور اپنے نفس اور کمزور لوگوں پر ظلم کرنے لگے۔ جب کوئی آبادی بگاڑ کی انتہا کو پہنچ گئی تو ایک آخری رسول ان میں مبعوث کئے گئے ان کا بھی جب انہوں نے انکار کیا تو وہ ہلاک کر دئے گئے۔

بنی اسرائیل کی سرکشی اور وعدۂ الٰھی

ان قوموں کے بعد بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کا دور آیا۔ یہ محدود خطے میں آباد نہیں تھے بلکہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے

تھے۔ان پر ایک عذاب صورت کے مسخ کیے جانے کی شکل میں آیا، جس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے: ''اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت یعنی سنیچر کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے، اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھرا بھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے، اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لئے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔ آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو برائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا، پھر جب پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا کہ بندر ہو جاؤ ذلیل وخوار''۔ (سورہ الاعراف آیت ۱۶۳۔۱۶۶)

اور آئندہ کے لئے بنی اسرائیل کے لئے یہ فرمایا:

''اور یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگوں کو بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے''۔ (سورہ الاعراف آیت ۱۶۷ کا ایک حصہ) چنانچہ دو مواقع کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

''پھر ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا کہ دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ چنانچہ جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقعہ پیش آیا تو، اے بنی اسرائیل ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا'' (آیات ۴تا۵)

پھر آگے آیت ۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تا کہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑ جائے اسے تباہ کر کے رکھ دیں''۔

دوسرے وعدے کی تکمیل کے بعد اللہ کے آخری نبیؐ کا دور آ گیا۔ یہود کے لئے ایک تیسرا وعدہ بھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت

آپؐ کی امت کسی محدود علاقے یا مختلف علاقوں میں نہیں بلکہ پورے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے۔ پوری دنیا کی قوم اب ایک قوم ہے، اور اس کے اندر مختلف جغرافیائی وتہذیبی قومیں گویا اگلے زمانوں کی ایک قوم کے مختلف قبائل کی مانند ہیں۔ یہ آخری امت ہے جو قیامت تک موجود رہے گی۔ اس امت میں وہ بھی داخل ہیں جو آپؐ پر ایمان رکھتے یا ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ بھی داخل ہیں جو آپ کو نہیں مانتے ہیں۔ یعنی اس زمانے کی ساری انسانی آبادی رسولؐ کی امت ہے۔ اس عالمگیر امت کو ختم کر دینے کا مطلب انسانی آبادی کا مکمل خاتمہ ہوگا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس بین الاقوامی امت کو مٹا دینے کا فیصلہ ملتوی رکھا ہے قیامت کا صور

پھونکے جانے تک، البتہ قیامت سے قبل عذاب کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا جو قانون ہے اسے سمجھنا ہوگا۔

دور حاضر اور عذاب الٰھی

گزشتہ امتوں میں قوم کو متنبہ کرنے کے لئے نبی آیا کرتے تھے۔ اب کوئی نبی نہیں آئے گا بلکہ اب انسانوں کو متنبہ کرنے کا کام امت مسلمہ کے صالح افراد کے ذمہ ہے۔ پھر یہ کہ اللہ کی کتاب اپنی مکمل شکل میں موجود ہے جو اس بات کے لئے کافی ہے کہ لوگ یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہماری ہدایت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ قرآن دنیا کی مختلف بڑی زبانوں میں ترجمہ کے ساتھ ہر جگہ پہنچ چکا ہے (قوموں کے سربراہوں تک پہنچایا جا چکا ہے) اس لئے اللہ کا عذاب آنے کے لئے کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہاں عذاب کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے ارشادات پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

''جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرتے ہیں تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں'' (سورہ بنی اسرائیل:۱۶)

''پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی بلکہ ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی بھلا دیا، تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالی کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے ان کو پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ بالکل مایوس تھے'' (سورہ انعام:۴۳۔۴۴)

''ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ مکاریاں کر چکے ہیں تو دیکھ لو کہ اللہ نے ان کے مکری عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آ رہی اور ایسے رخ سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا''۔ (النحل:۲۶)

''کہو کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا اعلانیہ تم پر عذاب آ جائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟'' (سورہ انعام:۴۷)

''پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہے ہی ہیں۔ آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی'' (سورہ اعراف:۹۵)

''کہو وہ اس بات پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے نازل کر دے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے یا تمہیں گروہوں مین تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے۔ دیکھو، ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں، شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں'' (سورہ انعام:۶۵)

''کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا، ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا یا دن دھاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے اور جب ہمارا عذاب ان پر آ گیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے'' (سورہ الاعراف:۴۔۵)

''پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آئے گی جب کہ وہ سوتے پڑے ہوں یا انہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکا یک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالاں کہ اللہ کی چال سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہیں''۔ (سورہ الاعراف:۹۷ تا ۹۹)

''اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے، سو دیکھ لو وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے''۔ (سورہ القصص:۵۸)

یہ تو تھے عذاب اور وجہ عذاب کے متعلق ارشاد قرآنی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت صورت حال کیا ہے؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ ساری خرابیاں جو گزشتہ قوموں میں مشترکہ یا علیحدہ علیحدہ تھیں، وہ سب کی سب بیک وقت آج پائی جا رہی ہیں۔ ان کی مشترک خرابیاں تو یہ تھیں کہ وہ شرک کرتی تھیں۔ ان میں سے کوئی خدا کی منکر نہ تھیں۔ خدا، خلاق اور خود اپنے آپ پر ظلم کرتی تھیں۔ مذہب کے نام پر سادہ لوح عوام کی اکثریت کو دبا کر رکھتی تھیں اور اپنی بالادستی کیلئے فلسفے اور دلائل گڑھ لیتی تھیں۔ آج بھی کوئی قوم خدا کی منکر نہیں ہے، گنتی کے چند لوگ پہلے تھے اور اب بھی ہیں جو خدا کا انکار کرنے والے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پروپیگنڈہ کے زور پر دنیا کو یہ باور کرایا جا تا رہا ہے کہ ایک پوری سیاسی قوم خدا کی منکر ہوگئی ہے مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کا یہ پروپیگنڈہ جھوٹ اور فریب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سیاست کی گرفت جیسے ہی ڈھیلی ہوئی، دیکھتے دیکھتے مذہب نے اپنی گرفت کا لوہا منوالیا اور سچ تو یہ ہے کہ خدا کے انکار کا جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں ان کے دل چیر کر دیکھے جاسکیں تو وہاں خدا کا اقرار موجود ہوگا اور خدا کا انکار ایک ڈھونگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس طرح اگلی قومیں جس طرح شرک اور خدا کی نافرمانی کرتی تھیں آج بھی وہی حال ہے۔ دنیا کے جس گوشے میں چلے جائیے، خدا کا اقرار اور اسی کے ساتھ اس کی نافرمانی ہر جگہ موجود ہوگی، سادہ لوح عوام کی اکثریت کو مکر و فریب کے ذریعہ جس طرح پہلے دبا کر رکھا جاتا تھا، آج بھی وہی کیا جا رہا ہے۔ کمزور لوگوں پر کل جس طرح جبر اور ظلم کیا جاتا تھا آج بھی کیا جا رہا ہے۔ کل بھی بے ضرورت بلڈنگیں بنائی جاتی تھیں، آج بھی بنائی جا رہی ہیں۔ اللہ کے دین کا مذاق کل جس طرح اڑایا جاتا تھا آج بھی اڑایا جا رہا ہے۔ یہ مذاق دو طرح کا ہے، یا تو صاف صاف انکار کر کے اس کی تضحیک کے نئے نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، یا اس کو ماننے کا دعویٰ کر کے من مانے طور پر اس طرح عمل کیا جاتا ہے کہ مضحکہ خیز معلوم ہو۔

علیحدہ علیحدہ جو برائیاں ان قوموں میں پائی جاتی تھیں، وہ سب آج بھی موجود ہیں۔ کوئی قوم تھی جو لوگوں کو گھاٹا دینے کے لئے ناپ اور تول میں بے انصافی کرتی تھی، آج بھی ہمارے ملک میں یہ بیماری عام ہے۔ کوئی قوم تھی جس نے اللہ کے راستے سے روکنے کے لئے مختلف اڈے بنا رکھے تھے۔ آج بھی ایسے بہت سے ذرائع (Techniques) سے کام لیا جاتا ہے جو نام نہاد طور پر ترقی یافتہ مانے جاتے ہیں۔ کوئی قوم تھی جو ہم جنسی کے گندے عمل میں اعلانیہ مبتلا تھی۔ آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے بلکہ حد تو یہ ہے کہ بعض مذہبی مراکز تک نے اس کے جواز کا فتویٰ دے رکھا ہے۔ کوئی قوم تھی (قوم سبا) جس کی کثرت آبادی اس لئے اس کو کھلتی تھی کہ آبادی کے گھنے ہونے کے سبب طویل سفر کا لطف اس کو نہیں ملتا تھا اور طویل سفر کے لئے اس وقت تیز رفتار سواریاں میسر نہ تھیں۔ آج بھی آبادی کی کثرت لوگوں کو کھل رہی ہے، اس لئے نہیں کہ اس کے لئے خوراک کی واقعی کمی ہے، بلکہ اس لئے کہ پسماندہ قوموں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جائے تو سیاسی اجارہ داری ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے ورنہ خوراک تو کافی سے زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور مصنوعی طور سے بڑھائی گئی قیمت پر بیچنے کے لئے اسے سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ کوئی قوم تھی جو اللہ کی کتاب کی حامل تھی اور اس کی شریعت کو مانتی تھی مگر اللہ کے قانون کو اپنے عمل سے توڑتی تھی، آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ ہے وہ مماثلت جو گزشتہ ہلاک شدہ قوموں اور آج کی اقوام میں پائی جاتی ہے۔

پچھلی قوموں میں سے کسی قوم کے ساتھ ایسا نہیں ہوا کہ آج اس نے نافرمانی کا رویہ اختیار کیا اور کل اس پر عذاب ٹوٹ پڑا، بلکہ کئی کئی نسلوں تک اس کو سمجھانے اور ڈرانے والے آتے رہے یہاں تک کہ جب وہ سمجھنے کے بجائے نافرمانی میں بڑھتے بڑھتے انتہا

کو پہنچ گئی تو بالآخر اسے ہلاک کر دیا گیا۔ آج بھی صورتحال کچھ ایسی ہی ہے۔ آج کی خرابیاں نئی نہیں ہیں بلکہ نسلاً بعد نسلٍ بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچی ہیں۔ اس درمیان میں سمجھانے اور ڈرانے والوں کی کمی نہیں رہی ہے۔ آج ظلم، فساد، بربریت اور اخلاقی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ جس کا رونا مظلوم اور ظالم دونوں رو رہے ہیں مگر اللہ اور اس کے دین کی طرف لوٹنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔

یہاں اس امت کے اندر آنے والی قیامت صغریٰ اور عذاب کی علامات کے سلسلے کی احادیث بھی ہمارے سامنے رہنی چاہئیں:

''حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: انہوں نے کہا: ایک مرتبہ نبیؐ حدیث بیان فرما رہے تھے، ایک اعرابی آیا اس نے کہا الساعۃ (قیامت) کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کر۔ اس نے کہا، اس کا ضائع ہونا کیسا ہے؟ جب حکومت کا کام نااہلوں کے سپرد کیا جائے تو قیامت کا انتظار کر''۔ (بخاری، مشکوٰۃ: باب علامات قیامت)

ایک دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا ''جس وقت غنیمتوں کو ذاتی دولت ٹھہرایا جائے اور امانت کو غنیمت سمجھا جائے، غیر زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے، دین کا علم بڑھ جائے، آدمی اپنی بیوی کی اطاعت کرے اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے، اپنے دوست کو نزدیک کرے اور اپنے باپ کو دور رکھے، مساجد میں آوازیں بلند ہوں، فاسق اور فاجر شخص اپنے قبیلہ کا سردار بن جائے، قوم کا سردار ذلیل اور کمینہ شخص ہو، آدمی کے شر سے ڈرتے ہوئے اس کی عزت کی جائے، گانے بجانے والیاں اور باجے ظاہر ہوں، شراب پی جائے، اس امت کے پچھلے اگلوں کو لعنت کریں اس وقت سرخ ہوا کا، زلزلوں کا اور زمین میں دھنس جانے، صورتوں کے تبدیل ہو جانے کا، پتھروں کے برسنے اور پے در پے نشانیوں کے ظاہر ہونے کا انتظار کرو'' (ترمذی، مشکوٰۃ باب علامات قیامت)

اس آخری حدیث میں جو باتیں بتائی گئی ہیں، بدقسمتی سے وہ سب باتیں آج پائی جا رہی ہیں۔ جو لوگ اللہ سے غافل ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ ہر وقت جس قسم کا عذاب دینا چاہے، دینے پر قادر ہے۔ وہ کھلے آسمان سے جس پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہو، موسلا دھار بارش برسا سکتا ہے۔ وہ ٹھیک ایسے وقت میں جب سورج پوری طرح چمک رہا ہو، آسمان کا ٹکڑا زمین پر گرا دے سکتا ہے یعنی فضا کی حرارت اتنی کم کر دے کہ میلوں میل کے رقبے میں ہوا جو گیس کی شکل میں ہے برف کی طرح جم کر زمین پر گر پڑے اور پوری آبادی کو پیس کر نیست و نابود کر دے۔ دنیا کی قوموں نے دشمن کو ہلاک کرنے کے لئے جو خطرناک جوہری ہتھیار جمع کر رکھے ہیں ان کو وہ اگر باہمی مشورے سے نہیں بھی استعمال کریں تو بھی ان کے گناہوں کی پاداش میں اللہ جس وقت چاہے ایسی صورت پیدا کر سکتا ہے کہ ان میں (Auto explosion) ہو جائے اور 'پورس' کے ہاتھی کی طرح دشمن کے بجائے اپنی ہی آبادی کو نیست و نابود کر دے۔ یہ عذاب جس وقت بھی آ جائے، ظالموں کو تو ہلاک کرے ہی گا جو لوگ ظالم نہیں ہیں وہ بھی اس سے بچ نہ سکیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''بچو اس عذاب سے جو تم میں سے صرف ان ہی کو نہیں پہنچے گا جنہوں نے ظلم کا رویہ اختیار کر رکھا ہے'' (انفال:۲۵)

عذاب جو بظاہر ابھی نہیں آیا ہے اس کے کچھ اسباب ہو سکتے ہیں، جیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے کچھ بندے، جن کو خود اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے، ایسے ہوں جن کی وجہ سے عذاب رکا ہوا ہو تا کہ عذاب کے لپیٹ میں وہ نہ آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ:

''اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دے دے'' (سورہ انفال، آیت ۳۳)۔

لیکن جب پاپ کی ہانڈی ابل پڑتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بچا لینے کا انتظام کرتا ہے جن کو عذاب سے بچانا ہوا اور باقی لوگوں کو عذاب میں گرفتار کر لیتا ہے، جیسا کہ قوموں کی تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔

وہ قومیں اور تہذیبیں جن کا خاتمہ قریب ہے

موجودہ حالات اور قرآن و حدیث کی تصریحات کی روشنی میں یہ نظر آ رہا ہے کہ اب اس زمین پر دو طرح کی چھوٹی قیامتیں

بس آنے ہی والی ہیں۔ایک قیامت قومی، جس میں بعض قومیں تباہ کردی جائیں گی۔قومی قیامت ایک تو یہودیوں کی ہوگی، اوران کے ساتھ وہ بھی ہوں گے جوان کے ظلم میں ان کے ساتھی بنے ہوئے ہیں الا یہ کہ عذاب آنے سے پہلے پہلے یہ لوگ یہودیوں کی سرپرستی اوردوستی سے باز آجائیں، اسی کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ''جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا لے آئیں گے'' (بنی اسرائیل، آیت ۱۰۴)

یہی وہ تیسرا وعدہ ہے جس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب قیامت قائم ہوجائے گی تو سارے ہی انسان اکٹھا کئے جائیں گے اوران میں بنی اسرائیل بھی ہوں گے۔لیکن دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ قیامت کے قریب (جب ان کی ہلاکت کا وقت آئے گا) ان کو ساری دنیا سے سمیٹ کر ایک جگہ کردیا جائے گا جو کہ آج اسرائیل میں ہورہا ہے۔دوسری قوم جس کی قیامت آنے والی ہے وہ متعین طور پر تو ابھی معلوم نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں میں سے وہ کون سی قوم ہے۔البتہ قرآن وحدیث میں اس کو یاجوج ماجوج کہا گیا ہے۔تہذیب وثقافت کی قیامت جو عالمگیر ہوگی اس میں مقامی طور پر تو بھارتی سنسکرتی اور پورے کرۂ ارض پر مغربی تہذیب اور ثقافت کا خاتمہ ہوجائے گا کیوں کہ قرآن وحدیث میں مٹنے والی تہذیبوں کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں وہ ان میں پائی جارہی ہیں۔

عذاب الٰھی اور مومنین کا رویہ

قیامت خواہ وہ قیامت صغریٰ ہی کیوں نہ ہو، قیامت ہی ہے۔اس کے برپا ہونے سے پہلے بڑی اتھل پتھل مچے گی جس کا آغاز ہوچکا ہے۔تقطیب (Polarisation) کا عمل بھی شروع ہوگیا ہے جو بتدریج بڑھے گا۔اس میں ایمان والوں کے لئے سخت آزمائش ہوگی۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نئی تہذیب اور نیا تمدن برپا کرنے کیلئے مخلصین کو کھوٹے لوگوں سے علیحدہ کرکے رہے گا۔اس غرض کے لئے وہ ایسا انتظام کرے گا کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو دنیا پرست ہوں گے یا کم ازکم دنیا پرست نہیں بھی ہوں تو دنیا پسند ہوں گے، اپنا وزن باطل کے پلڑے میں ڈال دیں گے۔اس لئے کہ ظاہری اسباب کے لحاظ سے ان کو اسلام کا مستقبل بالکل تاریک نظر آئے گا بلکہ ان کو ایسا محسوس ہوگا کہ اسلام کا سرے سے کوئی مستقبل ہے ہی نہیں۔البتہ اربوں کی آبادی میں مٹھی بھر لوگ ہوں گے جن کو دنیا کے آرام سے کوئی مطلب نہیں ہوگا اور وہ صرف آخرت کے لئے جینے والے ہوں گے۔یہی وہ لوگ ہوں گے جنہیں اللہ آنے والی عالمگیر اکھیڑ پچھاڑ سے بچالے گا، لیکن اس پورے مرحلے سے سلامتی کے ساتھ گزرنے کے لئے ان مخلصین کو جو کام کرنا ہوگا وہ حسب ذیل ہے:

(۱) خود اپنے قول اور عمل سے اسلام کے سچے نمائندہ ہوں اور اس حماقت کا ارتکاب نہ کریں جو دنیا بھر میں مسلمان آج کررہے ہیں کہ نام اسلام کا لیتے ہیں اور کام اپنے دنیاوی مفاد کے مطابق کرتے ہیں۔

(۲) ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شدومد کے ساتھ کرتے رہنا ہوگا تاکہ اللہ کے دین کی تبلیغ میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔جو لوگ اللہ کی نافرمانی سے خود رکتے ہوئے دوسروں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں صرف ان ہی کو وہ بچاتا ہے جس کی ایک مثال سبت والوں کی ہلاکت کے سلسلہ میں گزر چکی ہے۔

(۳) مستقل طور پر اپنے گناہوں کی اللہ سے مغفرت چاہتے رہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جو لوگ توبہ کریں اور اپنے کاموں کی عملاً اصلاح کرلیں، توبہ دراصل انہی کی ہوتی ہے''۔(الفرقان، آیت ۷۱)۔

(۴) مستقل طور پر یہ دعا کرتے رہیں رب اما تریني مايو عدون. رب فلا تجعلني في القوم الظالمين (ترجمہ) ''پروردگار جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جارہی ہے وہ اگر میری موجودگی میں تو لائے تو اے میرے رب مجھے

ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کرنا"۔ (سورہ المومنون:۹۳۔۹۴)

(۵) وقتی طور پر اگر وہ مخالف طاقتوں کے نرغے میں گھر جائیں اور وہ کوئی تدبیر کرنے سے واقعی مجبور ہوں، تو یہ دو کلام ہیں، ان کو اجتماعی طور پر اس طرح پڑھیں:

(۱) تسبیح یونسؑ یعنی لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین (الانبیاء:۸۷) سوالاکھ بار

(۲) اس کو ختم کرنے کے بعد اجتماعی طور پر سوالاکھ بار یہ پڑھیں: وقدمنا الیٰ ما عملوا من عمل فجعلنه هباء منثورا (الفرقان:۲۳) اللہ تعالیٰ دشمن کی تدبیروں کو گرد وغبار کی طرح اڑا دے گا۔

آخری بات یہ کہ جب فیصلہ کن گھڑی آ جائے اس وقت تو ان کو حق پسندوں کا ساتھ دینا ہی ہے، اس سے پہلے اس کے لئے ذہنی و عملی تیاری کرتے رہیں۔ ذہنی تیاری تو یہ ہے کہ دنیا پرست اور دنیا پسند مسلمانوں کے پرفریب دلائل کو سمجھنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔ اس کے لئے خاص طور پر ان کو اپنا ذہن ایسا بنانا ہوگا کہ قرآن وسنت پر عمل کرنے میں کتنا ہی بڑا سے بڑا دنیاوی نقصان (ذاتی یا قومی) دکھایا جائے اس سے متاثر نہ ہوں اور پورے اطمینان قلب کے ساتھ قرآن وسنت کی باتوں پر ڈٹے رہیں۔ عملی تیاری کے لئے انہیں اپنی زندگی کو سادہ سے سادہ گزارنا ہے اور دنیاوی طور پر معیار زندگی کو بلند کرنے کے تصور کو اپنے دل ودماغ سے پوری طرح کھرچ کر نکال دینا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کبھی اور کسی مرحلے میں اپنے فضل کی بارش بھی کر دے تو اس سے ذاتی طور پر مستفید نہ ہو کر اسے اللہ کے دین اور اس کے بندوں پر خرچ کر دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہدایت سے نوازے اور غیر مسلموں میں بھی جو صالح روحیں ہیں، ان کو اس عذاب کے آنے سے پہلے پہلے اس راہ پر لگا دے جس پر چلنے والے عذاب سے بچا لئے جائیں گے۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

☆☆☆

تحریک و دعوت

تنظیم کے فطری اصول

سید ضیاء الہدیٰ

> یہ مقالہ جو جماعت اسلامی کے ایک صوبائی اجتماع میں پڑھا گیا، ماہنامہ 'زندگی' رام پور (مدیر: سید حامد علی) کے مارچ و اپریل ۱۹۵۷ء کے مشترکہ شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس سے قبل یہ مئی ۱۹۵۲ء کے شمارہ میں بھی شائع ہو چکا تھا

انسانی کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کے سامنے جب کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جو ان کے نزدیک نئی ہو یا انوکھی ہو، یا پرانی تو ہو مگر اس کا اس وقت رواج نہ ہو تو وہ سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے اس کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ بلکہ بہت سے حضرات تو اسے انہونی (Utopia) کہہ کے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور دوسرے بہت سے لوگ حیرانی اور اچنبھے میں پڑ جاتے ہیں۔ تھوڑے، بہت تھوڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں جو غور و فکر سے کام لے کر اس کو سمجھتے ہیں اور اپنا لیتے ہیں۔ پھر اگر وہ صبر و استقامت دکھاتے اور اس راہ میں پیش قدمی کرتے چلے جاتے ہیں تو پہلے ذہنی میدان میں ان کی برتری تسلیم کی جاتی ہے اور پھر درجہ بدرجہ عام لوگ ان کا ساتھ دے کر اس بات کو نظریہ کی حدود سے نکال کر عمل کی دنیا میں محسوس شکل میں پیش کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہی بات جس پر کبھی نری شاعری ہونے کی پھبتی کسی جاتی تھی اب ایک ناقابل انکار حقیقت تسلیم کی جانے لگتی ہے۔ یہی کچھ اس تحریک کو پیش آیا جو برطانوی سامراج سے ہندوستان کی خلاصی کے لئے اٹھائی گئی۔ یہی کچھ اس تحریک کو بھی پیش آیا جو مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کا احساس بیدار کرنے کے لئے اٹھی۔ یہی کچھ تھا جس سے اشتراکی تحریک کو بھی دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ سب ہی نظریے اپنے اپنے علم برداروں کی پیہم جدوجہد کی بدولت اس مادی دنیا میں آج ٹھوس سمجھے جانے لگے ہیں۔

اسی طرح کچھ باتیں ہیں جنہیں جماعت اسلامی دنیا والوں کے سامنے پیش کر رہی ہے اور انہیں ان کی طرف بلا رہی ہے۔ چنانچہ اس کے ساتھ بھی مختلف لوگوں کے رویئے مختلف رہے ہیں اور ہیں۔ کچھ اس کی دعوت کو وہی شاعرانہ تخیل سمجھتے رہے، کچھ لوگ حیرانی کا شکار ہوئے، کچھ لوگوں نے تنقید کا حق ادا کرنے کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ اس کی باتوں کو 'دقیانوسی' کہدیں اور کچھ لوگوں نے حق تو سمجھا مگر حق کو قبول کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ لیکن یہ دعوت اب پہلے مرحلے سے گزر چکی ہے۔ ذہنی طور پر اب اس کی برتری ہر کیمپ میں تسلیم کی جانے لگی ہے۔ اب یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ فقط ایک نظریہ نہیں بلکہ بہترین عملیہ ہے ایک ایسی صاحب کردار سوسائٹی کی ضرورت ہے جو اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھلی ہو۔ یہاں ہر کیمپ سے میری مراد صرف مسلمان قوم کے کیمپ سے ہے۔ ورنہ دنیا کی دوسری قوموں کا تو کیا ذکر ہم ابھی اپنے ہی ملک کی ہمسایہ قوموں تک اپنی دعوت نہیں پہنچا سکے ہیں۔ اور ہندوستان میں دراصل ہماری کامیابی کے امکانات کو سمجھنے میں جو دشواری ہوتی ہے وہ اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہماری دعوت جس چیز کی طرف ہے وہ کسی فرقہ یا کسی خاص قوم یا کسی خاص ملک یا کسی خاص زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی ضامن تو ہے نہیں، بلکہ یہ دعوت ان فطری اصولوں کی طرف ہے جنہیں قبول کئے بغیر کبھی کسی سوسائٹی کے بھی مسائل ٹھیک ٹھیک نہ حل ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جب تک اس ملک کی عام آبادی اس دعوت کو سمجھ نہ لے اور سمجھ کر اس سے مطمئن نہ ہو جائے نیز اس میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ کر اسے اپنا نہ لیں، نہ یہ دعوت پورے طور پر کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ یہاں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس نے اپنے اندر پیدا ہونے والی دونوں تحریکوں کو آزما کر دیکھا۔ آزادی بھی ملی اور متحدہ

قومیت کے علم برداروں نے بھارت میں اور جداگانہ قومیت کے علم برداروں نے پاکستان میں دادِ حکمرانی بھی دی۔مگر دونوں جگہ کے واقعی مسائل جس طرح حل ہو رہے ہیں اس کا مزہ عوام خوب چکھ رہے ہیں جس کے بیان کی حاجت نہیں۔بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ پاکستان کو حاصل کرنے والی مسلم لیگ ۸۔۹ ہی سال میں پاکستان کے اقتدار سے بے دخل کی جا چکی ہے، اور بھارت کو آزاد کرانے والی کانگریس کا صدر خود اعتراف کر رہا ہے کہ کانگریس اب بھارتی عوام میں مقبول نہیں رہی۔سرمایہ دارانہ نظام رسوائے زمانہ ہو ہی چکا ہے۔رہ گئی اشتراکیت تو خود اس کے سربراہ کار پکار پکار کر کہنے لگے ہیں کہ اس ٹٹی کی آڑ میں ''زاریت'' اور ''چنگیزیت'' کو بھی شرما دینے والے کیسے کیسے کھیل کھیلے جاتے رہے ہیں۔تمام ممکن تدبیروں کے باوجود چالیس سالہ اشتراکی اقتدار کے تحت بھی اشتراکیت ہنوز قائم نہ ہو سکی حالانکہ آہنی دیوار کے اندر بین الاقوامی دنیا کے مخالف اثرات بھی نہیں پہنچ پائے تھے۔کسی علاقے کا انتظام درست کرنا یا درست رکھنا ہو یا ساری دنیا کا (کسی نظام کو قبول کرنے کی غرض و غایت ہوا کرتی ہے) اس کے لئے چند چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں جن میں سب سے پہلی نظر آنے والی چیز تنظیم ہے۔کوئی تنظیم نہ ہو تو کسی آبادی کا ہر فرد خواہ کتنا ہی انتظام کی درستی کا خواہاں ہو انتظام کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔لیکن تنظیم قائم کرنے کے لئے صرف نقصانات کا احساس اور ان کو دور کرنے والے اصول کا علم کافی نہیں ہے۔بلکہ ضروری ہے کہ یہ احساس اتنا شدید اور یہ علم ایسا یقینی ہو کہ لوگوں کو جوڑنے میں مسالے کا کام دے سکے۔پھر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی آبادی میں اغراض پرست لوگ موجود نہ ہوں جن کے آلہ کار بہت سے سادہ لوح لوگ ہو جاتے ہیں۔ایسے لوگ تنظیم میں خلل پیدا کرنا چاہتے ہیں جن سے مزاحمت اور کشمکش وجود میں آتی ہے، اور یہ ایثار و قربانی کا مطالبہ سامنے لاتی ہے جس کے نتیجے میں کچھ لوگ پختہ ہوتے جاتے ہیں اور کچھ لوگ بدک بدک کر کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور کچھ لوگوں کا حوصلہ پست ہونے لگتا ہے۔یہی حالات ہیں جن کے پیش نظر مقصد کے تعین میں غلطی سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے، حالانکہ مقصد ہی تنظیم کے لئے سب سے اہم اور اس کا بنیادی پتھر ہوتا ہے۔مقصد کو متعین کرنے میں کسی تنظیم کی بنیاد ڈالنے والوں کو عام طور پر دو چیزیں متاثر کرتی ہیں۔ایک یہ خیال کہ مقصد ایسا دلفریب رکھا جائے جو پیش نظر لوگوں کو پہلی نگاہ میں اپیل کر سکے۔دوم یہ بات کہ مقصد بظاہر ایسا ہو کہ گویا وہ بڑی آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔اس کے لئے وہ عام آبادی کی دکھتی ہوئی رگ کو ٹٹولتے ہیں اور ایک خوشنما مقصد اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں، پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سطحی تدبیریں شروع کر دیتے ہیں۔جیسے کسی کے سر میں درد ہو اور اس سے کہا جائے کہ آؤ ہم تمہارے سر کا درد اچھا کر دیتے ہیں۔پھر اس کے سر کو رومال سے کس کر باندھ دیا جائے اور وہ فوری سکون محسوس کرنے لگے۔اسی طرح جب لوگ گرانی سے تنگ ہو رہے ہوں تو ان سے کہا جائے کہ ہمیں اپنا انتظام ملکی حوالے کر دو تو ہم ہر چیز کو کنٹرول میں کس دیں گے اور راشننگ کی گرہ لگا دیں گے۔

مقصد کا تعین صرف بنیادی ہی نہیں بلکہ فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔کیونکہ مقصد ہی منظم گروہ کے عمل کی نہج کو متعین کرتا ہے اور اس کی غایت اور انتہا کو بھی۔اسی لئے اگر کسی کا مقصد مادہ پرستی ہو تو وہ اخلاق کی راہ کسی طرح اختیار نہیں کر سکتا۔پھر مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہوتا بلکہ تنظیم کی روح بھی ہوتا ہے جس کے ساتھ اگر لوگوں کو عشق نہ ہو، اس سے بھی زیادہ جتنا اپنی مادی زندگی سے ہوتا ہے، تو وہ تنظیم کبھی برگ و بار نہیں لا سکتی۔اسی عشق کی بدولت وہ دوسروں کے مقابلے میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور اسی وقت دم لیتے ہیں جب اپنے محبوب مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں۔پھر اگر وہ مقصد اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ہر ہر متنفس اس سے آسودہ ہو سکے تو لوگ امن و سلامتی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں ورنہ وہی عشق زور لگاتا ہے اور اب یہ آپس میں سر پھٹول شروع کر دیتے ہیں۔لوٹ اور پھوٹ کا بازار ایسا گرم ہوتا ہے کہ کسی سامری کا جادو، کسی ڈکٹیٹر کی قاہری اور کسی مخلص کا اخلاص اسے کسی طرح سرد نہیں کر سکتا۔لوٹ تو کسی طرح

بند ہوتی ہی نہیں البتہ پھوٹ کو وقتی طور سے کوئی فرضی ہوا کھڑا کر کے دبایا جا سکتا ہے۔ اس طرح جب تک لوگ حالت جنگ میں یا واقعی جنگ میں پھنسے رہتے ہیں، آپس کا سر پھٹول روکے رہتے ہیں مگر اس طرح پریشانی کم ہونے کی بجائے اور بڑھتی جاتی ہے۔

ہندوستان کے لوگ اپنی تنظیموں میں ایسی ہی غلطی کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے مادہ پرستی کو اپنا مقصد بنایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چور بازاری، رشوت ستانی، چوری، ڈکیتی، ٹھگی، فرقہ وارانہ اور طبقہ وارانہ فساد، کلرکوں کی کام چوری، افسروں کی غفلت شعاری، لیڈروں کی بیان بازی اور عوام کی چیخ و پکار ان کے حصے میں آئی اور کیوں نہ آتی۔ آزادی کا اور اس کے حصول کے لئے قربانیوں کا مقصود اصلی یہی تو تھا کہ اس کے بعد ہندوستان کا روپیہ اور سونا باہر نہیں جائے گا تو ہم زیادہ خوش حال ہوں گے، بڑی بڑی نوکریاں انگریزوں کی بجائے ہمیں ملیں گی، بھر پیٹ کھائیں گے، اچھا پہنیں گے اور چین سے سوئیں گے۔ ان میں سے کون چیز ہے جو مادہ پرستی کے عنوان کے تحت نہ آتی ہو۔ پھر جب یہ دنیا اور اس کی ساری دولت جو محدود ہے اور اس کی محبت وطلب ہر دل میں پیدا کی گئی تو موقع پاتے ہی ہر شخص نے اپنی اپنی ہمت اور بساط بھر ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔ چیز تھوڑی تھی اس کے لئے سر پھٹول ہونا ضروری تھا اور ہو رہا ہے۔

مقصد کی اسی غلطی نے یہاں کی پوری قوم کی توجہ کو صرف اس مسئلے پر مرکوز رکھا کہ دوسروں کی غلامی سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ اس کام کے لئے صرف اتحاد کی ضرورت تھی۔ اپنی آزاد حکومت کے حصول کے لئے امنگ اور جذبے کی ضرورت تھی۔ اس جذبے کو بیدار کرنے کے لئے دنیوی لذتوں کی امید دلانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہی سب کچھ کیا بھی گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر خیال اور عقیدہ کے لوگ ہر پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور آج وہ کسی کام کو بھی یکدلی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتے، کیونکہ آزادی کے نعرے پر متحد ہونے والے افراد آزادی کے حصول کے بعد اپنے اپنے پوشیدہ میلانات وعزائم کی مختلف سمتوں میں قومی زندگی کو بڑھانا چاہتے ہیں۔

مقصد کی یہی غلطی ان کو اب قوموں میں، فرقوں میں، نسلوں اور طبقوں میں بانٹ رہی ہے اور علاقوں اور زبانوں کی بنیادوں پر ان کے ٹکڑے کر رہی ہے، اور مقصد کی یہی غلطی آگے چل کر ان کو دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ اسی طرح جنگ میں ڈھکیلے گی جس طرح گزشتہ دنوں انہیں فرقہ وارانہ فساد میں اور یورپ والوں کو بین الاقوامی جنگوں میں جھونک چکی ہے، اس لئے کہ یہ جہاں داخلی طور پر مفاد پرستی، نسل پرستی، طبقہ پرستی اور فرقہ پرستی کو جنم دیتی ہے، وہیں خارجی طور پر قوم پرستی کو ہوا دیتی ہے جس کے نتیجہ میں بین الاقوامی کشمکش اور جنگوں کا غیر مختتم دورہ پڑنے لگتا ہے۔

مقصد کی یہی غلطی ان کے اندر اقتدار کی جنگ کا باعث بنی ہوئی ہے اور بنی رہے گی، جس کی وجہ سے ان کی قومی زندگی گروہی سیاست بازی (Party politics) اور اس کے ناپاک نتائج کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے اور پھنسی رہے گی، اور ان کی زندگی کے حقیقی مسائل حل ہوئے بغیر یونہی دھرے رہیں گے، کیونکہ یہ وہ چکر ہے جس میں پھنس جانے کے بعد پھر نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

مقصد کی اسی غلطی کی وجہ سے بے حیائی اب تیزی سے بڑھ رہی ہے، خدا کا خوف دلوں سے اٹھتا جا رہا ہے، بے مروتی عام ہو رہی ہے، آپس کا اعتماد ختم ہو رہا ہے، مالدار غریبوں پر ترس نہیں کھاتے اور حسد اور بغض کی آگ میں جلنے والے غریبوں کو منظم کر رہے ہیں اور افراد ہیں کہ روز بروز اپنی جان، مال اور آبرو کی طرف سے غیر مطمئن ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر اب بھی حالات کو انتہائی حد تک بگڑنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی گئی تو پھر مکمل تباہی سے بچنا ناممکن ہو جائے گا، اور یہ اس وقت تک ناممکن ہی رہیگا جب تک لوگ اپنے مقصد کو بدل کر اس کے مطابق اپنی نئی تنظیم قائم کر کے جدو جہد شروع نہیں کرتے۔

دنیا پرستی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسان کھیتی کرنے کے زمانے میں اپنے ہل، بیل اور بیج سے جوتنے بونے کا مصرف لے کر مستقبل کی تیاری کرنے کی بجائے انہیں بیچ کھوچ کر کھا جائے۔ کیا ایسا کسان فصل کے وقت کھیت کاٹ سکے گا اور آئندہ فاقے

سے بچ سکے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ تو فصل کے وقت تک بھی شاید ان پر گزارا نہ کر سکے گا۔ کیوں کہ بیج، ہل اور بیل اس کی اور اس کے کنبے والوں کی بھوک کا، روز روز کی ضروریات کا اور بڑھتی ہوئی ہوس اور چٹورپن کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ بلکہ وہ تو اس لئے ہوتے ہیں کہ فطرت کے طبعی قانون کے مطابق صبر وایثار سے کام لیتے ہوئے وہ اپنی محنت اور بیج کو بظاہر ضائع کر دے تو ایک خاص وقت کے بعد وہی بیج جو چند دن کے لئے بھی ناکافی تھا طویل مدت کے لئے کافی بن کر برکتوں کے ساتھ دوبارہ اس کے پاس آ جائے۔ بس ایسا ہی حال انسان کو ملی ہوئی قوتوں اور دنیا کے اسباب ودسائل کا ہے کہ اگر انسان ہوس میں مبتلا ہو کر لذت پرستی پر اتر آئے تو پھر یہ خود اس دنیوی زندگی کے لئے بھی ناکافی ہو جاتے ہیں اور اگر وہ صبر وایثار سے کام لیتے ہوئے اپنی محنتوں کو اور ان اسباب کو مادی نقطۂ نظر سے بظاہر برباد کر دے تو فطرت کے اخلاقی قانون کے مطابق ایک خاص وقت کے بعد یہی محدود وسائل مقابلتاً لامحدود بن کر دوبارہ اسے مل جائیں گے۔

اسی لئے از روئے فطرت دنیا پرستی انسان کا مقصد نہیں بن سکتی بلکہ اس کا مقصد اپنے پیدا کرنے والے کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، جو اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے سے اور دنیا کا انتظام چلانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انسان کی ساخت یہ بتاتی ہے کہ یہ دیگر بے شعور حیوانات کی طرح محض چرنے، چگنے اور نسل کشی کرنے والا جانور نہیں ہے، کیونکہ یہ ذی شعور اور متمدن وجود ہے۔ اور انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ نہ تو انفرادی طور پر اور نہ ہی اجتماعی طور پر اس دنیا کا مالک ہے کیونکہ اسے ایسے اختیارات حاصل ہی نہیں ہیں، بلکہ دونوں انتہاؤں کے بین بین اس دنیا کے اصل مالک خدا کا خلیفہ ہے جس کے تفویض کردہ کچھ اختیارات سے کام لے کر اس دنیا پر اپنا اقتدار چلاتا ہوا نظر آتا ہے۔

مادہ پرستی کو چھوڑ کر خدا پرستی کو مقصد قرار دے لینے کے بعد لوگوں کی زندگی میں خود بخود جو کم سے کم تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں گی وہ یہ ہیں:

چونکہ خدا کا عقیدہ رکھنے والے ہر آدمی کو یقین ہوتا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر وناظر ہے اس لئے وہ کہیں بھی ہو، تنہائی میں ہو یا لوگوں کے درمیان، وہی کام کرے گا جس کے بارے میں وہ جانتا ہوگا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے اندر سے تضاد کی وہ بیماری دور ہو جائے گی جو آج عام ہو رہی ہے۔

چونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ خدا لوگوں کے دل کی حالت جانتا ہے اس لئے اس کے ظاہر وباطن میں فرق باقی نہ رہے گا۔ اس طرح نفاق کی بیماری دور ہو جائے گی جس کی وجہ سے آج معاشرے میں عام بے اعتمادی پیدا ہو رہی ہے، کیونکہ آج کا انسان جیسا ظاہر میں ہے ویسا ہی باطن میں نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مال کی محبت کو خدا ناپسند کرتا ہے اور غریبوں اور ناداروں کی مدد کرنے سے خوش ہوتا ہے، اس لئے وہ سرمایہ دارانہ ذہنیت سے پاک ہو جائے گا جسکی وجہ سے آج طرح طرح کے معاشی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

یہ تو وہ تبدیلیاں اور فائدے ہیں جو کسی ثبوت کے محتاج نہیں۔ اس لئے کہ آج بھی ساری دنیا میں خدا کے ماننے والوں کی یہ مشترک صفات ہیں جو اگر چہ دھندلی ہو چکی ہیں، کیونکہ ان کا خدا پر ایمان توہمات کی آلودگیوں سے گندلا اور دھندلا ہو چکا ہے اور مزید براں زندگی کی تقسیم نے ان کو عملاً سیاست کا شکار بنا کر مادہ پرستانہ ماحول میں جکڑ رکھا ہے جو خدا پر ایمان کے تقاضوں کو مٹاتا چلا جا رہا ہے۔ اب اگر توہمات کی آلائشوں سے پاک کر کے خدا کے عقیدے کو علمی بنیادوں پر اجاگر کر دیا جائے اور زندگی کی ناقابل تقسیم وحدت ہونے کا شعور ان کے اندر بیدار کر کے ان کے ماحول کو بھی خدا پر ایمان کے تقاضوں کے ہم آہنگ بنا دیا جائے تو ان کی زندگی

کیسی پاک، کیسی تابناک اور کیسی بابرکت ہو جائے گی۔

لیکن خدا پرستی کو مقصد قرار دینے کے بعد شدید کشمکش لازماً رونما ہو جایا کرتی ہے۔ اس لئے کہ انسان کا پرانا دشمن شیطان، جو قوم پرستی، مادہ پرستی اور اسی طرح کی دوسری باطل پرستیوں کی آڑ میں انسانوں کا شکار کر کے اپنے حلقہ اطاعت کو وسیع، اپنے اقتدار کو مستحکم اور اپنی تخریبی اسکیم کو پورا کرنے میں لگا ہوتا ہے، چونک پڑتا ہے اور اپنے اہلکاروں کے نام خفیہ فرمان جاری کر کے راہ روکنے پر مامور کر دیتا ہے۔ پھر تو ویسا ہی سماں پیدا ہو جاتا ہے جیسا آزادیٔ وطن کی تحریک پر پیدا ہو گیا تھا کہ انگریزی سامراج کے آلہ کار بن کر اپنی ہی قوم کے افراد اس تحریک کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے، حالانکہ حقیقت میں یہ تحریک ان کے لئے بھی ویسے ہی مفید تھی جیسی خود تحریک چلانے والوں کے لئے تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی سمجھ میں بھی یہ بات آتی گئی اور پھر وہ بھی اسی تحریک کے حامی بنتے گئے تا آنکہ انگریز کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا ہی پڑا۔ اسی طرح خدا پرستی کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک اگرچہ تمام افراد انسانی کے لئے یکساں مفید ہوتی ہے، پھر بھی وہ افراد جو شیطان کے فریب میں آ کر اس کے آلہ کار بنے ہوتے ہیں ابتداءً اس کی مخالفت کرتے ہیں، مگر علم برداران تحریک کی لگاتار جدوجہد اور ان کا حقیقی خلوص رفتہ رفتہ ان افراد کی خوابیدہ فطرت کو جگاتا ہے اور بالآخر انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ انسان کی اجتماعی زندگی بھی اس کے ازلی دشمن کے اقتدار سے خلاصی پا جاتی ہے۔

خدا چونکہ تمام انسانوں کا یکساں خدا ہے اس لئے خدا پرستی کی بنیاد پر اٹھنے والی تنظیم شخصی، نسلی، گروہی اور قومی عصبیتوں سے پاک ہوتی ہے اور تمام انسانوں کی فلاح اس کے نزدیک مساوی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ تنظیم کسی شخص، کسی گروہ یا کسی قوم کے خلاف نہیں ہوتی اس لئے دنیا میں کوئی بھی اس کا حقیقتاً دشمن نہیں ہوتا، یہ اور بات ہے کہ لوگ غلط فہمی کی وجہ سے اس سے دشمنی کریں یا شیطان کا آلہ کار ہونے کی وجہ سے اس کی راہ روکیں۔ یہ تنظیم کسی خاص شخص یا نسل یا گروہ یا قوم کی ترقی، فلاح و بہبود اور فائدے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ تمام انسانوں کیلئے ہوتی ہے، اس لئے ہر ملک، ہر نسل اور ہر قوم کے لوگ اس کی دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ اس کی راہ روکنے والے انسانی ادارے اس کے خلاف ٹھوس چٹان نہیں بن سکتے اور جیسے جیسے اس کی دعوت لوگوں کی سمجھ میں آتی جاتی ہے ویسے ویسے ان کے بل بوتے پر چلنے والی شیطانی حکومت پھسپھسی ہوتی جاتی ہے۔ خدا چونکہ خدا ہے ہی اس لئے کہ وہی سب سے بالاتر ہے، اس لئے خدا پرستی کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم ہوس اقتدار کی کشمکش سے پاک ہوتی ہے۔ اس میں جو آتا ہے اسے اقتدار کی آرزو سے توبہ کر کے آنا پڑتا ہے اور ایک مقتدر اعلیٰ کی فرمانبرداری کے لئے آنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اس تنظیم میں داخلے کی شرط قومیت، ممبری فیس اور ایسی ہی دوسری چیزیں نہیں ہوتی ہیں بلکہ صرف خدا پرستی کا جذبہ اور اس کا عملی ثبوت ہوتا ہے۔ خدا نے چونکہ انسان کے اندر اخلاقی حس پیدا کر کے اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کیا ہے اور اسی کی بناء پر اس کے اندر شخصی و اجتماعی، روحانی و تمدنی ارتقاء کا مادہ رکھا ہے، اس لئے خدا پرستانہ انسانی تنظیم کے لئے یہ اخلاقی حس نادر الوجود اور بے بہا سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس حس کو نشو و نما دینا ہی دراصل اس کا جوہری امتیاز ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کے اندر عزت کا معیار خدا ترسی ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ تنظیم بالکل متجانس افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔

ایسے افراد کی تنظیم سے وجود میں آنے والی جماعت کا مقصد دولت و اقتدار کا حصول نہیں ہوتا۔ اس کی جدوجہد کے نتیجے میں یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ آتی ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں انسان کے لئے طبعاً بہت زیادہ پرکشش واقع ہوئی ہیں، اس لئے ان کے حصول کے بعد ان کے دام میں پھنس جانے کے امکان کا سدباب ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے باوجودیکہ اسلام (خدا پرستی کے مکمل ترین نظام کا بہترین ایڈیشن) ایوان اقتدار کے مسائل کے بہترین اور واحد حل کا ضامن ہے، وہ اپنی تنظیم کے ابتدائی مراحل میں ان

سے کبھی اپنے پروگرام کا ذکر نہیں کرتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ہوسکتا ہے کہ یہی دولت واقتدار اپنی طبعی کشش کی بناء پر ان کی توجہ کا مرکز بن جائیں اور ان کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر لے نیز ان کے اندر پروپیگنڈا بازی کی بیماری پیدا ہو جائے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ دولت واقتدار سے بے رغبتی پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ دراصل ایسا کرنا اس حل کے لئے ناگزیر تیاری ہے۔ یہی تدبیر ہے جس سے اندرون تنظیم کے افراد بھی بے لوث جدوجہد کے عادی ہو جاتے ہیں اور باہر سے آنے والے بھی دنیاوی غرض کے تحت اس میں داخل نہیں ہوتے۔

چونکہ اس جماعت کا مقصد صرف انقلاب برپا کردینا یا صرف تبدیلی اقتدار نہیں ہوتا بلکہ خدا کی رضا کا حصول اس کا مقصد ہوتا ہے، اس لئے انقلاب کے بعد اس جماعت کے افراد کی کوششیں نہ تو سرد پڑتی ہیں اور نہ صحیح راہ سے منحرف ہوتی ہیں بلکہ ان کی جدوجہد اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ اسی سمت میں جاری رہتی ہیں، تا آنکہ حاصل شدہ انتظام کو خدا کے مقرر کردہ خطوط پر عملاً چلاتے ہوئے یکے بعد دیگرے اس کے پاس پہنچ جائیں۔

اس طرح وجود میں آنے والی ریاست اور اس کی انتظامی مشینری کی امتیازی خصوصیات یہ ہوتی ہیں:

۱) اس کے کارکن اور عوام دونوں براہ راست خدا کی رعایا ہوتے ہیں اور ان کے آپس کے تعلقات خدا کے واسطے ہوتے ہیں۔ یہ پوری آبادی یکسوئی کے ساتھ خدا کی بندگی کرنے والی ہوتی ہے، جو نظم مملکت اور استقلال ریاست سے انفرادی پرستش تک زندگی کی ساری مصروفیتوں پر یکساں مشتمل ہے۔ اس لئے اس میں انتشار، افراتفری اور تضاد کی کارفرمائی نہیں ہوتی بلکہ کامل ہم آہنگی اور پوری یکسوئی ہوتی ہے۔ پرامن انقلاب پرامن زندگی کا پیش خیمہ بنتا ہے اور پرامن اور یکسو زندگی پرامن تمدنی ترقی کو تیز کردیتی ہے۔ اس کے کارندے اپنے جیسے انسانوں کے یا اپنی نمائندہ پارلیمنٹ کے یا حکومت کے نوکر نہیں ہوتے بلکہ خدا کے نوکر ہوتے ہیں اور جو کام ان کے ذمہ ہوتا ہے وہ پیٹ کے لئے حکومت کی مجبورانہ ڈیوٹی نہیں بنتا بلکہ صرف خدا کی خوشنودی کے لئے اس کی عبادت وبندگی ہوتا ہے۔ اس لئے انسان بادل ناخواستہ اسے انجام نہیں دیتا بلکہ اسی طرح حوصلے اور دلی وروحانی جذبے سے انجام دیتا ہے جس طرح خدا کی خوشنودی کا کام سمجھ کر آج لوگ کڑکڑاتے جاڑے میں آدھی رات کے بعد اپنی میٹھی نیند کو قربان کر کے بغیر کسی ظاہری اور مادی دباؤ کے باسی پانی سے وضو کرتے اور نماز ادا کرتے ہیں یا اسی وقت کچھ دوسرے لوگ میلوں کے فاصلے سے چل کر دریا میں اشنان کو آتے ہیں اور ریاضتیں کرتے ہیں۔

۲) اس کے باشندے رشوت سے ناآشنا ہوتے ہیں جیسا کہ آج بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ بے رحم ماحول اور نامنصفانہ نظام مسلط ہے، خدا پرست لوگ تکلیفیں اٹھاتے ہیں، پھٹا پرانا پہنتے ہیں، آدھا پیٹ کھاتے ہیں مگر جائز آمدنی سے زیادہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، اور دوسرے جو لوگ لیتے دیتے ہیں، وہ بھی ان کی موجودگی میں اپنے دل میں بہر حال اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ پھر وہ حکومت چونکہ خدمت خلق کے لئے اور اخلاق کو پروان چڑھانے کے لئے قائم ہوتی ہے اس لئے وہ آج کی مادہ پرست اور استحصال کرنے والی حکومتوں کے برخلاف اپنے کارکنوں کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ وہ ایسا نہیں کرسکتی کہ ایک کنبہ کا خرچ تو ہو سو روپے مگر اس کے سرپرست کی محنتوں کا معاوضہ ساٹھ روپے دے۔ کیونکہ ایسا کرنے کے معنی یہی ہیں کہ اس بیچارے کو ناجائز طریقے سے باقی روپے فراہم کرنا پڑیں جس کے لئے وہ رشوت لے یا کام چوری کرے۔

۳) اس کے کارندے صرف انسانوں کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے کہ دکھاوے کا کام کریں اور صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ کی حد تک اچھے ملازم بنے رہیں، بلکہ اصلاً خدا کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں جو دلوں کے حال تک سے واقف ہے، اس لئے کام

کے ظاہر کو بھی درست رکھتے ہیں اور باطن کو بھی، اور کام بھی دلی جذبے سے کرتے ہیں۔ اس دوطرفہ ذمہ داری کی وجہ سے سہولت پسندی اور آرام طلبی کا رجحان پرورش نہیں پاتا اور آج کی جیسی لاپروائی اور بدانتظامی سر نہیں اٹھاتی۔ دوسری طرف پبلک بھی اس ریاست کو اپنے خدا کی امانت اور اس کی وفاداری کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا ناگزیر ذریعہ سمجھتی ہے، اس لئے اس کے قانون کا کھلے اور چھپے احترام کرتی ہے، اور جب وہ ریاست واقعی اس کی زندگی کو امن وسکون سے بھر دیتی ہے اور اس کی ضروریات پوری کرتی ہے تو اس کے جذبہ خدا پرستی کو زیادہ سے زیادہ بالیدگی حاصل ہوتی جاتی ہے۔ پھر چور بازاری کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ گھر کا ملازم سودے کی خریداری میں اپنا حصہ نہیں بناتا اور اس طرح ایک پیسے کی چیز پر آج جو خواہ مخواہ چار پیسے جیب سے نکل جاتے ہیں وہ ایک ہی پیسے میں مل جاتی ہے۔ اور آج جو چیزیں اتنی گراں خرید کر لائی جاتی ہیں اور پھر گھر پہنچ کر ملازموں کے دست برد سے ایک سیر کی بجائے سوا سیر اور ڈیڑھ سیر پکوانی اور خرچ کرنی پڑتی ہیں وہ بھی اس دست برد سے محفوظ رہتی ہیں۔ کیوں کہ ان ملازموں کو چوری کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور خدا کا زندہ تصور ان کے اندر اور ان کے باہر چاروں طرف کارفرما ہوتا ہے۔ ان وجوہ کی بناء پر آج کے مقابلے میں اس ریاست میں بڑی برکت نظر آتی ہے۔ پھر آج کوئی چیز اصلی اور خالص نہیں ملتی جس سے صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے، جسم میں طاقت پیدا نہیں ہوتی۔ اس ریاست میں یہ سب بھی نہیں ہوسکتا اور اس پہلو سے بھی اس میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ نیز آج کاروباری دنیا میں کسی واقعی تبادلۂ اجناس وزر ومحنت کے بغیر محض کھاتوں میں اندراجات کے ذریعہ سرمایہ دار یا درمیانی لوگ چیزوں کا احتکار کرکے یا احتکار کیے بغیر ہی مصنوعی گرانی پیدا کرتے یا خواہ مخواہ گرانی کا سبب بن جاتے ہیں، یہ بھی اس ریاست میں حرام ہوتا ہے۔ اس طرح کسی واقعی تمدنی خدمت کے بغیر نفع اندوزی کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے بلاوجہ گرانی سے پبلک مامون رہتی ہے۔

خدائے واحد کے اقتدار کے تحت وجود پذیر ہونے والی ریاست تاریخ انسانی میں اگرچہ بار بار برپا ہوچکی ہے اور اس کی ان برکتوں کا ہر بار تجربہ بھی ہو چکا ہے، لیکن میرا موضوع ماضی کی داستان دہرانا نہیں ہے بلکہ تضاد وتغیر سے پاک، ہمہ گیر نظام فطرت کے ایک شعبے کے نظام کارکردگی سے دوسرے شعبے کے نظام کارکردگی کو معلوم کرنا ہے، تاکہ تاریخ کی شہادت سے قطع نظر کرکے بھی محض عقل سلیم کی رہنمائی انسانیت کے کسی بہی خواہ کے لئے اپنی فطری منزل مقصود کا اور اس تک پہنچانے والی فطری راہ کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ وہ انحرافات کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے سے بچ سکے۔ اس غرض کے لئے خدا کی وحدانی حکومت کے طبعی شعبے کے نظام عمل پر روشنی ڈالوں گا جس کا لوہا چاروناچار وہ بھی مانتے ہیں جو پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس کے ناظم اعلیٰ یعنی خدا ہونے کا انکار کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی اس زمین پر مومن بھی بستے ہیں اور کافر بھی، منافق بھی رہتے ہیں اور دہریئے بھی اور ان میں سے ہر ایک کو زندگی کا یکساں حق حاصل ہے۔ ہر ایک کو پیٹ بھرنے کو غذا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا اور دیگر ضروریات زندگی پورا کرنے کو سامان حاصل کرنے کا یکساں انتظام ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ایک ضابطہ ہے جس کے مطابق ہی لوگ اپنے حقوق سے متمتع ہوتے ہیں۔ وہ یہ کہ خدا نے جس کو جتنی طاقت دی ہے اس کے بقدر اس کو اپنی ضروریات خود فراہم کرنے کا مکلف ٹھہرایا ہے اور جس حد تک طاقت نہیں دی ہے اس حد تک انتظام اپنی طرف سے کر دیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نومولود بچہ کسب معاش کی طاقت نہیں رکھتا تو ماں کی چھاتی میں دودھ اور دل میں مامتا اور باپ کے سینے میں شفقت بھر دی ہے۔ بچہ صرف چوسنے کی طاقت اپنے ساتھ لاتا ہے اس لئے یہ کام اسے خود کرنا پڑتا ہے۔ مگر وہی بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اور یہ طاقت بھی نہیں رکھتا تو اس کی تکلیف بھی اس پر نہیں ڈالی جاتی۔ لیکن وہی بچہ جیسے جیسے قوت اور عقل حاصل کرتا جاتا ہے اپنی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری قدرت اس پر ڈالتی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد اگر وہ اپنی طاقت سے کام نہ لے اور کسب معاش نہ کرے تو پھر حسب جرم، اذیت فاقہ سے مصیبت موت تک کی سزا

قدرت اسے دیتی ہے۔

یہاں طبعی قوانین کا پابند رہتے ہوئے اپنے حالات ونظریات کی اشاعت کا اور اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہے، لیکن ان قوانین کی خلاف ورزی پر سزا فوراً مل جاتی ہے جو غلطی کے متناسب ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ہی نہیں متضاد نظری اور عملی سائنس دنیا میں ساتھ ساتھ پائی جاتی رہی ہیں۔ ان کی اشاعت ہوتی رہی ہے اور ان کے مطابق عمل بھی ہوتا رہا ہے مگر صرف اس گنجائش کی حد تک جو حقیقی قوانین طبعی میں رکھی گئی ہے، اور جہاں اس کی گنجائش سے تجاوز کیا گیا وہیں قوانین حرکت میں آ گئے ہیں۔

یہاں ہر شخص برابر صلاحیت کا مالک نہیں ہوتا۔ اور جو جتنی صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے اتنا وہ دوسروں کے مقابلے میں فضیلت یافتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی نابرابری کی وجہ سے انسانی تمدن وجود میں آیا اور مسلسل ترقی کر رہا ہے، ورنہ یہ انسانی آبادی بھی حیوانی آبادی کی طرح از آدم تا ایں دم ایک ہی سطح زندگی پر رہتی۔

یہاں برتری کا دارومدار طبعی قوانین کی پابندی پر ہے۔ لیکن کوئی شخص اس طرح خواہ کتنی ہی زیادہ برتری کا استحقاق پیدا کر لے ضروری نہیں کہ اخلاقی اعتبار سے بھی وہ ایسا ہی مستحق فضیلت ہو، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس اعتبار سے وہ کسی درجہ میں بھی فضیلت کا مستحق نہ ہو۔ اسی طرح اس کے برعکس جو گروہ طبعی قوانین کی پابندی نہ کرے تو وہ یہاں برتری حاصل نہیں کر سکتا خواہ وہ اخلاقی لحاظ سے کتنا ہی اونچا ہو۔

یہاں کے طبعی قوانین اپنی نوعیتوں کے لحاظ سے بہت متضاد ہیں۔ کچھ اساسی اہمیت کے حامل ہیں تو کچھ فروعی اہمیت کے۔ اسی لئے جہاں ان کی پابندی کے نتیجے میں انسان یا تو ترقیاں کرتا ہے یا زندگی کی ناؤ کو کم از کم کھیتا ہی چلا جاتا ہے وہیں ان کی خلاف ورزی کی نوعیت یا تو معمولی جرم کی ہوتی ہے یا سنگین بغاوت کی، جس کی سزا یا تو تکلیف واذیت کی شکل میں ملتی ہے یا موت و ہلاکت کی صورت میں۔

یہاں طبعی قوانین میں کوئی خلاء، کوئی کمی، کوئی بے ربطی، کوئی رعایت یا جانب داری نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر غلطی کرنے والا اپنی جگہ خود نادم ہوتا ہے اور طبعی حکومت کے خلاف اس کے اندر شکایت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ طبعی حکومت اپنے مقتدر اعلیٰ یعنی خدا کی کسی ذاتی غرض و مفاد کے لئے قائم نہیں ہے بلکہ اس حکومت کا پورا نظام انسانوں کے اپنے بھلے کے لئے ہے۔ انسان کی اندرونی فطرت کے ٹھیک مطابق وموافق ہے، اور اس لئے ہے کہ انسان کو بتدریج کمال کے اس مقام تک پہنچا دے کہ وہ اس طبعی دنیا پر حکمرانی کے لائق ہو جائے۔

یہ طبعی مملکت اپنے اندرونی نظام کے لحاظ سے ایسی ہے کہ یہاں کی آبادی اسے اپنے اوپر خواہ مخواہ مسلط نہیں محسوس کرتی بلکہ اسے اپنی اندرونی آواز اور تقاضوں کا ٹھیک ٹھیک جواب پاتی ہے اور اپنے اندر سے اسے زور لگاتی اور کام کرتی ہوئی محسوس کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اس میں داخل ہو جاتا ہے اس کا فریفتہ ہو جاتا ہے۔ پھر اگر چہ بشریت کی بناء پر بھول چوک اور کوتاہ بینی کی وجہ سے غلطیاں بھی کرتا ہے اور نتیجے میں قانون کی گرفت میں بھی آتا ہے اور بدتر سے بدتر حالت میں مبتلا ہو کر تکلیفوں پر تکلیفیں بھی جھیلتا ہے پھر بھی اس مملکت کی تباہی یا اس سے فرار کی خواہش یا ان قوانین فطرت کے خلاف شکایت تک اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔

اب اگر پوری کائنات پر حاوی نظام فطرت کے اندر کوئی تضاد نہیں، بلکہ یہ ایک سازگار اکائی یعنی Harmonious whole ہے، اور اگر طبعی نظام حکومت ہی کی طرح اسی نظام فطرت کا ایک شعبہ انسان کا سیاسی نظام بھی ہے جو انسان کی مدنیت سے

ابھرتا ہے، اور یہ مدنیت اس کے اندر پائی جانے والی انفرادی واجتماعی ارتقاء کی استعداد سے وجود پذیر ہوتی ہے، اور یہ استعداد ارتقاء فطرت کی ودیعت کردہ اخلاقی حس کی رہین منت ہے تو پھر لازماً اس سیاسی نظام کو فطرت کے مماثل اور اس سے ہم آہنگ و ہمساز ہونا چاہئے ۔اسی لئے جو سیاسی اور اجتماعی نظام انسانی ارادہ واختیار کی مداخلت کی وجہ سے ایسا نہ رہے وہ جس حد تک ان خصوصیات سے عاری ہو اسی حد تک وہ فطری راہ سے منحرف ہونے کی وجہ سے فطرت سے متصادم ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں انتشار، فساد اور بگاڑ رونما ہونے لگتا ہے۔لہذا فطری نظام سیاست کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے:

اولاً جس نے پوری کائنات کی فطرت متعین کی ہے اور جو طبعی سطح پر پوری کائنات کا مقتدر اعلیٰ ہے سیاسی اقتدار اعلیٰ بھی اسی کا ہوتا ہے۔ثانیاً، بنیادی قوانین یا حدود اسی اقتدار اعلیٰ کے وضع کردہ ہوتے ہیں جن کے تحت یا جن کے اندر ذیلی یا ثانوی ضوابط بنانے کا حق خود انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔طبعی نظام سے مختلف سیاسی نظام میں ضوابط سازی کا یہ جزوی حق انسانوں کو اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ طبعی ریاست کلیتہً بے ارادہ و بے شعور مخلوق پر مشتمل ہے اور تمدنی ریاست جزوی اختیار کی حامل مخلوق (انسان) پر قائم ہوتی ہے۔ اگر انسان ارادہ واختیار مطلق کا حامل ہوتا تو جملہ قانون سازی کا کلی اختیار اسے تفویض کر دیا جاتا، مگر چونکہ یہ ارادۂ مطلقہ اور مجبوری محض کے بین بین حیثیت کا حامل ہے اسی لئے اسے ذیلی ضوابط کا جزوی حق دیا گیا ہے۔

اب ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی ریاست کا نظام عمل کیسا اور کیوں ہوتا ہے۔ چنانچہ طبعی حکومت جسے اصطلاح میں تکوینی حکومت کہتے ہیں کے مقابلے میں سیاسی یعنی تشریعی حکومت کا نظام حسب ذیل ہوتا ہے:

اللہ کے تمام بندے مومن ہوں یا کافر، منافق ہوں یا دہرئے سبھوں کو یکساں شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے پیٹ بھرنے کو غذا، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور دیگر ضروریات زندگی پورا کرنے کو سامان حاصل کرنے کی یکساں سہولت بہم پہنچائی ہوتی ہے۔جو لوگ معذور ہوں ان کا انتظام حکومت کو کرنا پڑتا ہے۔جو لوگ حوادث روزگار کا شکار ہو جائیں ان کو سہارا دینا حکومت کے ذمے ہوتا ہے۔البتہ ہر ایک کو بقدر اپنی طاقت کے کوشش خود کرنی پڑتی ہے، اور کوئی ہٹا کٹا آدمی تن آسانی کو راہ دینا چاہے تو اس کا ذمہ دار وہ شخص خود ہوتا ہے، حکومت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ ضرورت ہو تو اس کو سزا بھی دی جاتی ہے۔

انسان کے اندر اخلاقی حس پر مبنی تمدنی ارتقاء کی استعداد رکھنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ ترقی کائنات کے آئندہ ترقی یافتہ مراحل کے لئے جسے آخرت کہتے ہیں انسان اپنے آپ کو سازگار بنانے کے لائق ہو سکے، اور فطری ریاست (نظام سیاست) کا مقصد وجود بھی یہی ہوتا ہے۔اس لئے اس ریاست کے قوانین انسان کو اصلاً تہذیب نفس سکھانے کے لئے ہوتے ہیں تاکہ اسے تربیت دے کر آخرت کے ترقی یافتہ ماحول کے لئے سازگار (Fit) بنایا جاسکے۔اور یہی ان قوانین کی پابندی کی حقیقی جزا ہے، لیکن جو کوئی ان کی پابندی نہ کرے ظاہر ہے کہ وہ اس ماحول میں پہنچنے کے بعد خود کو ناسازگار (Unfit) پائے گا۔اور اس طرح کرب واذیت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگا اور یہی ان قوانین کی خلاف ورزی کی حقیقی سزا ہے۔مگر صرف اس حقیقی جزا وسزا پر اکتفا کی جاتی تو پھر انسان اپنی کوتاہ اندیشی کے سبب کبھی آخرت کی تیاری نہ کرتا، اور ایسا نظام سیاسی وتربیتی ہونے کی بجائے عملاً محض ایک مجموعۂ مقالات سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔اس لئے انسان کی بھلائی ہی کے لئے جہاں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جب اس فطری نظام کو بحیثیت مجموعی قبول نہ کرے تو اس کی زندگی کی کل کسی طرح ٹھیک بیٹھنے نہ پائے اور اس کے مسائل زندگی حقیقی طور پر کسی طرح حل ہی نہ ہوں تاکہ شاید وہ متنبہ ہو کر اس فطری نظام کی طرف پلٹ آئے، وہیں سیاسی نظام کی حیثیت میں عملاً برپا کرنے اور برپا ہونے کی صورت میں اس کے قوانین کی پابندی کرانے کا اہتمام بھی کرایا جاتا ہے چنانچہ اس تشریعی حکومت کے اندر قانونی حدود میں رہتے ہوئے اپنے اپنے خیالات وعقائد کی

اشاعت کا اور اپنے اپنے مسلک پر زندگی گزارنے کا حق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تہذیبی خود اختیاری (Cultural autonomy) ہر معاشرے کو حاصل ہوتی ہے، لیکن قوانین ملکی کی خلاف ورزی کی سزا فوراً دی جاتی ہے جو جرم کی نوعیت کے ٹھیک ٹھیک مناسب ہوتی ہے۔

اس کے اندر بھی ہر شخص برابر نہیں ہوتا بلکہ اخلاق عامہ اور قوانین خداوندی کی پابندی میں جو جتنا زیادہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ مکرم ہوتا ہے۔ اور یہی تفاوت اور یہی تکریم ہے جو اخلاقی مسابقت کے جذبہ کو ابھارتی اور اخلاقی ماحول پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے انسان اخلاقی میدان میں ترقی کے بلند ترین منازل طے کرنے لگتا ہے۔ یہاں اخلاقی قوانین کی پابندی کرنے سے فضیلت کا جو مقام بھی انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ اخلاقی مقام ہوتا ہے نہ کہ طبعی، اس لئے کچھ ضروری نہیں کہ مادی اعتبار سے بھی اسے کوئی اونچا مقام حاصل ہو اور سامان دنیا میں سے اسے زیادہ حصہ ملے۔ مگر اس اخلاقی حکومت میں مقام فضیلت بہر حال اسی کے لئے مخصوص ہوتا ہے جو اخلاقی کمال حاصل کرے، اور جو اخلاقی کمال حاصل نہ کرے اس کے لئے یہاں فضیلت کا کوئی مقام نہیں ہے خواہ وہ مادی اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔

یہ اخلاقی قوانین کچھ اساسی ہوتے ہیں اور کچھ غیر اساسی، اس لئے ان کی پابندی کی بدولت انسان یا تو ترقی کرتا ہے یا پر امن زندگی سے متمتع ہوتا رہتا ہے۔ اور اسی لئے ان کی خلاف ورزی یا تو جرم کی فہرست میں آتی ہے یا بغاوت کے شمار میں، جس کی سزا بھی یا تو تکلیف و رسوائی کی شکل میں دی جاتی ہے یا موت اور جلاوطنی کی صورت میں۔ یہ قوانین علیم وحکیم اور بے نیاز خدا کے وضع کردہ ہوتے ہیں اس لئے مکمل، اتم، مربوط اور بے لاگ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والے خود ہی ندامت محسوس کرتے ہیں اور حکومت کے ڈھانچے کے کمزور ہو جانے پر بھی خوشی خوشی ان قوانین کی پابندی کرتے رہتے ہیں۔

یہ حکومت اپنے مقتدر اعلیٰ، خدا کی کسی ذاتی غرض اور مفاد کے لئے قائم نہیں ہوتی بلکہ انسانوں کی بھلائی کے لئے قائم ہوتی ہے۔ ان سے وصول کئے جانے والے ٹیکس کا ایک ذرہ اور ان کی محنتوں کا ایک شمہ بھی خدا اپنی آسائش، اپنی خدمت یا اپنا ٹھاٹھ جمانے کے لئے نہیں لیتا بلکہ کل کا کل انہی پر صرف ہوتا اور انہی کے فائدے کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ جو انسان اس کی حکومت کے سربراہ کار ہوں وہ بھی کچھ لیں، الا یہ کہ وہ خود کفیل نہ ہوں تو صرف ناگزیر ضروریات کی حد تک لے سکتے ہیں اور بس۔ اس حکومت کا مقتدر اعلیٰ بھی وہی خدا ہوتا ہے جو طبعی حکومت کا مقتدر اعلیٰ ہے۔ اس طرح یہ دونوں الگ الگ بیگانہ حکومتیں یا ادارے نہیں رہتے بلکہ عملاً ایک ہی نظام حکومت کے دو شعبے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ سازگاری کرنے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔ اور ہم بطور تمثیل یہ کہہ سکتے ہیں کہ طبعی شعبہ گویا فوجی شعبہ (Military) ہے اور تشریعی شعبہ انتظامی (Civil)۔ اور اس پورے نظام کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ انسان کو بتدریج کمال کے اس مقام تک پہنچا دے کہ وہ ملکوتی دنیا میں بھی عزت کا مقام حاصل کر لے۔

یہ حکومت دراصل انسان کی اپنی فطری امنگوں اور اندرونی تقاضوں کا مظہر، محافظ اور مربی ہوتی ہے، اس لئے وہ اسے اپنے اوپر ناپسندیدہ تسلط نہیں محسوس کرتا بلکہ اس کی روح اور اس کا دل اسے امرت سمجھتا ہے۔ اس لئے جو اس میں داخل ہو کر اس کی فیض رسانی سے آشنا ہو جاتا ہے وہ اس پر فریفتہ ہو کر اسی کا ہو رہتا ہے، پھر تو اس کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ وہی انسان جو کسی لادینی نظام حکومت کا علم بردار ہو کر سزا سے بچنے کی سو تدبیریں کرتا ہے اس حکومت میں بشریت کی بنا پر غلطی کر جائے تو خدا پرستانہ نظام کا علم بردار ہونے کی وجہ سے اس حکومت میں سزا سے بچنے کی نت نئی تدبیریں اختیار نہیں کرتا ہے۔ وہی انسان جو دنیا پرستی کی وجہ سے لادینی حکومت میں جابر حکمرانوں کے خلاف اپنا مستقبل خراب کرنا پسند نہ کرتا تھا اب خدا پرست ہو کر بڑے سے بڑے سربراہ کار پر بے دریغ

تنقید کرنے لگتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ایک طرف وہ اپنی آخرت سنوارنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اپنے محسن نظام حکومت میں بگاڑ کو برداشت نہیں کرسکتا۔

یہ ہیں اس فطری اور معیاری ریاست کے خدوخال جس کا جلوہ کئی بار یہ دنیا دیکھ چکی ہے اور پھر دیکھنے کے لئے بے چین ہے۔ لیکن فطری اور معیاری ریاست کسی معیاری تنظیم ہی کے ذریعہ قائم ہوسکتی ہے، ایسی تنظیم جو فطری اصولوں پر قائم کی گئی ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایسی ریاست جس کا سب سے بڑا عہدے دار ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ رات کی نیند، دولت کی محبت اور اولاد کی آسائش کے خیال سے دست بردار ہوجایا جائے اور اس کے معاوضے میں اوسط شہری کی زندگی گزارنے بھر وظیفہ پر قناعت کیا جائے، اور اگر اپنی معاشی حالت خود ہی اچھی ہوتو پھر کچھ بھی نہ لیا جائے۔ جس کے دفاتر کے کلرک ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ دفتر کا کام خدا کی عبادت سمجھ کر کیا جائے یعنی اس میں دنیا کے لالچ کا سوال پیدا نہ ہو۔ اور دفتر سے باہر آکر بھی خدا کی عبادت ہی میں لگا رہا جائے۔ جس کی پولس میں بھرتی ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنی ڈیوٹی کا صرف کاغذ کے ریکارڈ میں صحیح اندراج ہی نہیں ہو بلکہ خدا کی نگاہ میں اپنے واقعی انتظام کو حسین بنا کر پیش کرنا ہو۔ جس کی فوج میں بھرتی ہونے کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اپنی دہشت پسندی اور بربریت سے آبادی کو سہائے رکھیں اور اپنے وجود کو لوگوں کی جان اور مال کے لئے مستقل خطرہ محسوس کرایا جائے بلکہ اس کے معنیٰ ہیں خداترسی اور پاکبازی کا زندہ نمونہ بنے رہنا، اور اس فوج کا وجود، لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کی طرف سے ان کے مطمئن اور بے فکر ہوجانے کے لئے کافی سمجھا جانا۔ کیا ایسی ریاست دنیا پرستوں اور جان و مال کے طالبوں کے ہاتھوں کبھی وجود میں آسکتی ہے؟ ایسی ریاست تو صرف ان افراد یا اس سوسائٹی ہی کے ذریعہ قائم ہوسکتی ہے جو خاص طور پر اسی کے لئے ابتدا سے تیار کئے گئے ہوں۔ ذہنی تیاری وہ اصل مسئلہ ہے جس کی طرف اول تو توجہ نہیں دی جاتی ہے، اور اگر کسی نظام کے علم بردار توجہ دیتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ ان کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ ایسا متوازن پروگرام بنا سکیں جو انسانوں کو اس کے لئے تیار کرسکے۔ اس لئے کہ اگر شروع ہی سے ان کے اندر یہ شعور پیدا کیا جائے کہ دنیا کا کاروبار چلانا ہے اور امامت میں تبدیلی لانی ہے تو دنیادارانہ اور مفاد پرستانہ ذہنیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر ابتداء ہی سے شعوری طور پر انہیں اس کے لئے تیار نہ کیا جائے تو بعد میں یا تو ان کے اندر اس کی صلاحیت ہی نہ ابھرے یا پھر ان کے درمیان شدید اختلاف رونما ہوجائے۔ مزید براں انسان ایک ایسی پیچیدہ مشینری ہے جس کے اندرونی گوشے ہی بہت سے ایسے ہیں جو بہر حال اوجھل رہ جاتے ہیں، اور بیرونی طور پر اس لامحدود کائنات کے اندر اس مشینری پر اثر انداز ہونے والے بے شمار عوامل کا احاطہ ان کے بس میں نہیں ہے جو وہ کوئی جامع و مانع پروگرام وضع کرسکیں۔ یہ کام تو وہی کرسکتا ہے جو انسانوں کا بھی اور پوری کائنات کا بھی پورا پورا علم رکھتا ہو اور بہ یک وقت اپنے تمام علم کو پیش نظر بھی رکھ سکتا ہو۔ ظاہر ہے ایسی ہستی وہی ہے جو فاطر کائنات ہے، چنانچہ اسی لئے یہ کام اس نے اپنے ذمہ رکھا ہے اور یہ پروگرام وہ خود انسانوں کو دیتا رہا ہے۔ جماعت اسلامی وہی پروگرام اپنے سامنے رکھتی ہے، جس پر روشنی انشاء اللہ آئندہ ''اسلام کا تنظیمی معجزہ'' میں ڈالی جائے گی۔

⊕⊕⊕

متحدہ سیرت کمیٹی پٹنہ کی دعوت کیاھے ؟

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

متحدہ سیرت کمیٹی کے کل پٹنہ اجلاس منعقدہ ۱۸؍اکتوبر ۱۹۶۴ء بمقام انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ کی تقریر۔ اس وقت ضیاء الہدیٰ مرحوم جماعت اسلامی ہند، پٹنہ کے مقامی امیر تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اما بعد! الحمد للہ الذی ھدانا لھذا و ما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانااللہ.

جناب صدر! حاضرین کرام اور محترم خواتین! سب سے پہلے ہم اللہ بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ہم اپنی گروہ بندیوں کے خول سے اور فرقہ پرستیوں کے اندھیرے کھڈ سے نکل کر ملی وحدت کی دینی اہمیت اور اس کے لئے تقاضائے وقت سے نہ صرف آگاہ ہوئے بلکہ اس رخ پر عملاً ایک بنیادی قدم اٹھانے کی اس نے ہمیں کامیاب توفیق بھی بخشی۔ جیسا کہ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اس سے پہلے تحریک خلافت کے وقت دین کی ایک شاخ کے لئے ایسا ہی ملی اتحاد ہم میں پیدا ہوا تھا مگر وہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا جس کی وجہ میرے نزدیک یہ تھی کہ وہ اتحاد ایک ایسے مسئلہ کے لئے تھا جس پر ''مدعی سست اور گواہ چست'' والی مثل صادق آتی ہے۔ اس کے بعد ایک بار پھر پوری ملت نے نہ سہی، ملت کے اچھے خاصے بڑے حصے نے فرقہ پرستانہ تنگ نظری کو ترک کرکے ملی اتحاد کا منظر پیش کیا۔ مگر وہ ملی اتحاد دینی شعور کی بنیاد پر نہیں، بلکہ دین کے صرف نعروں کے بل پر وجود میں آیا تھا جس کے نتیجہ میں دینی قدروں کی مٹی جس طرح پلید کی جارہی ہے اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ پھر آج سے ایک سال قبل ہم نے ملی ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا جس کے اثر سے ہمارے پرسنل لاء کو ختم کرنے کی سازش وقتی طور پر ناکام ہوگئی۔ مگر وہ ملی ہم آہنگی ایک مخصوص مسئلہ کے لئے اور محض وقتی طور پر ظاہر ہوئی تھی۔

اب موجودہ ملی اتحاد کو ہمیں مستحکم اور پائدار بنانا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم اپنے دین وملت کی نہ تو حفاظت کرسکتے ہیں اور نہ اسے قائم کرسکتے ہیں۔ اس غرض کے لئے ہمیں پچھلی کوتاہیوں سے بچنا ہوگا اور پائدار ملی وحدت کیلئے محکم اور ٹھوس مشترک بنیاد کو اختیار کرنا ہوگا۔

ہماری متفقہ بنیادیں:

شکر کا مقام ہے کہ دنیا کی قوموں اور ملتوں میں ہم وہ واحد ملت ہیں جس کے مختلف مکاتب فکر اور مسلکوں کے ماننے والوں کے درمیان سب سے زیادہ مشترک اور محکم بنیادیں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ ہمارے دین کے سارے ہی اصول ہمارے درمیان متفق علیہ ہیں اور اختلافات جو کچھ ہیں محض فروع میں ہیں۔ ہمیں ان اصول کو متفقہ طاقت سے شعوری طور پر پکڑ لینا ہے اور فروعی اختلافات کے لئے خود اپنے دین ہی کی بخشی ہوئی گنجائش کی حد تک ہر گروہ کو آزادی دینا ہے۔ نہ صرف آزادی دینا ہے بلکہ اس آزادی سے کام لینے کی ذہنی اور عملی تربیت بھی کرنا ہے۔ اس آزادی کے استعمال میں ایسے مراحل اور مواقع بھی آسکتے ہیں جہاں اختلافات کی سرحدیں ملتی ہیں اور آزادی کے استعمال میں آویزش کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ہمارے دین مبین نے ہمیں جو تہذیب نفس، شرافت طبع اور فراست ایمانی عطا کی ہے اس سے کام لے کر مہذب، شریف اور سمجھدار انسانوں کی طرح ہمیں اپنے لئے حدود طے کرلینے ہیں اور پھر پوری مومنانہ دیانت داری کے ساتھ اپنی عائد کردہ حدود کی اپنے افراد سے کامل پابندی کرانی ہے۔ اگر ہم نے یہ کچھ کرلیا تو پھر شیاطین جن وانس ہمارے درمیان فرقہ وارانہ منافرت اور جھگڑے پیدا کرنے سے عاجز ہوجائیں گے اور لامذہب اور بدمذہب لوگ آئندہ ہمارے پاک دین پر کیچڑ اچھال نہ سکیں گے۔

ٹھوس عمل کا مظاہرہ :

ہم یہ دعوے سے کہتے ہیں اور بلاخوف تردید کہتے ہیں کہ ہمارا اسلام وہ واحد دین ہے، جس نے تاریخ انسانی میں پہلی بار

آزادیٔ مذہب، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ فکر و عمل کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اپنے مقدس نظام میں اس کو بنیادی اور دستوری حیثیت دی اور میں تو آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے تاریخ عالم میں آخری بار اپنی بخشی ہوئی اس آزادی کا نہ صرف پورا پورا احترام کیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس آزادی کے استعمال کے لئے دنیا کی قوموں اور ملتوں کی مشفقانہ حوصلہ افزائی کی۔ کیا یہ حیرت اور انتہائی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انسانوں کے تخیل اور نگاہ پر جادو کرنے والے بے دین اور بد دین سیاسی ساحرین اپنی منافقانہ کاغذی دستوری دفعات کو پیش کر کے ناکردہ سعادت کا Credit لیتے ہیں؟ اور اس سے بھی زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ اپنے دین اور اپنی تاریخ سے ناواقف مسلمان بھی ان کے پرفریب پروپگنڈے کا شکار ہو کر اسلام کو تنگ نظر، اور ان منافقوں کو وسیع النظر اور عالی ظرف سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ صورت حال ہمیں بدلنی ہے۔ باطل کا یہ طلسم توڑنا ہے۔ اس کا ڈھونگ خود ہی آشکارا ہو چکا ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ علمی اور کتابی دنیا سے زیادہ عملی میدان میں اسلام کے اس اصول کا مظاہرہ کریں تاکہ ہمارا یہ عصائے موسیٰ میدان میں آنے کے بعد سیاسی جادوگروں کی نظر بندیوں کا پول کھول کر رکھ دے۔ کیونکہ جب حق عملاً آجاتا ہے تب ہی باطل مٹتا ہے۔

تلخ تجربہ:

حضرات! یہ تو تھا عقائد اور عبادات کے پہلو سے اپنا جائزہ۔ اب آیئے معاملات کے پہلو سے تاریخ کے آئینے میں ہم اپنی تصویر دیکھیں۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے اصل اسباب کیا تھے؟ عربوں نے فراست کے میدان میں انگریزوں سے مات کھائی۔ اور علیم و حکیم اور قوانین فطرت کے بنانے والے خدا کی واضح تنبیہوں کے علی الرغم اپنے دینی بھائی یعنی ترکوں کے ساتھ بے وفائی کی۔ اس کا نتیجہ صرف اتنا ہی نہیں نکلا کہ عالم اسلام سیاسی غلامی میں مبتلا ہو گیا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عظیم سانحہ یہ رونما ہو گیا کہ دین حق لادینیت، دہریت اور صیہونیت سے مغلوب ہو کر رہ گیا۔ عربوں کی اس قومی خود غرضی کے جواب میں ترکوں میں دہریت مآب نوجوانوں کو اس کا موقعہ ہاتھ آ گیا کہ قیادت کی باگ ہاتھ میں لے لیں اور پھر قانون کے ڈنڈے سے مار مار کر ترکوں کو اپنے دین سے پھیریں اور بین الاقوامی امت وسط میں رخنہ پیدا کر کے ترکوں کو ایک وطنی قومیت میں تبدیل کر دیں۔ چنانچہ آج یہ زہر عالم اسلام میں سب سے زیادہ ان ہی دونوں یعنی ترکی اور عربی قوموں میں سرایت کر کے ان کو تباہی کی طرف کشاں کشاں لئے چلا جا رہا ہے۔

یہ خود غرضی کا مرض رفتہ رفتہ پوری دنیا کی ملت اسلامیہ کو لگ گیا اور قومی خود غرضیوں سے آگے بڑھ کر اس آخری انتہا کو پہنچا کہ ہر شخص اپنی شخصی خود غرضی کے نشہ میں پوری طرح بدمست، ہو کر رہ گیا۔ اس خود غرضی نے ایک ایک فرد کو لذت نفس کا، مال اور جاہ کا پجاری بنا کر چھوڑا۔ اور یہی وہ روگ ہے جو ہر اس اتحاد کو فوراً ہی گھن کی طرح کھانے لگ جاتا ہے جو وقت کے تقاضے اور حالات کے دباؤ کے تحت زبردستی رونما ہو جاتا ہے۔ جہاں اس اتحاد نے مسلم ملت کو کسی فائدے سے ہم کنار کیا خود غرض افراد نے عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا۔ آپ ان ہی تلخ تجربوں کے پیش نظر ہر نئی تحریک کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس میں آپ حق بجانب بھی ہیں کہ کہیں یہ نئی تحریک بھی آپ کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے اور آپ کو سیڑھی بنا کر وزارت کی کرسی پر چڑھنے کے لئے ایک پوشیدہ چال تو نہیں ہے۔

ملت فروشی کی کاٹ:

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ کا حال سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کے جیسا ہے۔ جب انہوں نے اپنے بچپن کے بھولے پن میں اپنے نبی باپ کی ہدایت کی خلاف ورزی کی تو وہ اپنے بھائیوں کے لئے ایک بکاؤ مال ہو کر رہ گئے۔ لیکن جب اپنے شعور کو پہنچ گئے اور انہیں رشد حاصل ہو گیا اور انہوں نے اپنے اصول دین سے چمٹ کر اعلیٰ

اخلاق اور حسین کردار کا عملی نمونہ پیش کیا تو ان کے بیچنے والے ان کے قدموں میں آ گئے۔ٹھیک یہی صورت حال آپ کے ساتھ بھی پیش آتی رہی ہے کہ آپ نے اپنے رؤف ورحیم نبیؐ کی ہدایت کی بھرپور خلاف ورزیاں کیں۔۔۔ہاں ہاں، بھولے پن اور سادگی ہی میں سہی۔۔۔اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے اپنے ملی بھائی آپ کو بیچنے میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔اب آپ اگر شعور سے کام لیں اور رشد وہدایت کی راہ پر چلیں، اصول دین کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور خلق عظیم اور کریمانہ کردار کے ذریعے اپنے آپ کو دنیا میں روشناس کرائیں تو پھر چھا گلاؤں، طارقوں اور ہمدانیوں وغیرہ قسم کے ملت فروشوں کی پوری ٹیم آپ کے بھی قدموں میں آکر ناک رگڑتی نظر آئے گی۔

متحدہ کمیٹی کے ارکان:

حضرات! جہاں تک اس متحدہ سیرت کمیٹی کا تعلق ہے اس کے سارے ہی مرکزی ذمہ دار وہ حضرات ہیں جن کے بارے میں آپ کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ یہ کبھی اس متعفن سیاست کی خدانا آشنا کرسیٔ وزارت پر پہنچنے کی خواہش کریں گے۔رہا دوسرے سیاسی کھلاڑیوں کے جوڑتوڑ سے اس ادارہ کو محفوظ رکھنے کا مسئلہ، تو یہ جتنا ان حضرات کے خلوص ودیانت اور بیداری وفراست پر موقوف ہے، اس سے زیادہ اگر نہیں تو کم بھی نہیں، خود آپ پر موقوف ہے۔اگر یہ حضرات آپ کی صحیح دینی رہنمائی اور ذہنی تربیت کرتے رہے اور آپ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورا عملی تعاون پیش کرتے رہے تو پھر کوئی مائی کا لال ایسا پیدا نہیں ہوسکتا جو آپ کو بے وقوف بنا سکے یا مال تجارت سمجھنے کی جرأت بھی کر سکے۔

بازاری سیاست:

حاشا۔سیاست اسلام سے علیحدہ نہیں ہے۔لیکن اس سیاست اور موجودہ دنیا کی رائج الوقت سیاست میں دن اور رات کا روشنی اور اندھیرے کا فرق ہے۔آج جس چیز کا نام سیاست ہے وہ ذاتی اغراض، گروہی مفاد اور قومی خودغرضیوں کے لئے جوڑتوڑ کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا یا قابض رہنا ہے۔اور بطور اصول موضوعہ لوگوں کے دماغ میں یہ بات اتاری گئی ہے کہ سیاست اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے، جس میں اخلاق نام کی کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے۔اور اگر ہے تو فقط یہ کہ جو کچھ اس سیاسی نقطۂ نظر سے مفید مطلب ہو وہی عین اخلاق ہے۔جہاں مشترک مفاد رکھنے والے افراد کے گٹھ جوڑ کا نام پارٹی ہے، جہاں لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے سنہرے نظر فریب الفاظ میں عہد اور معاہدے کرنا اور موقعہ آنے پر عہد سے پھر جانے اور معاہدے کی خلاف ورزی کر جانے اور اپنی کہی ہوئی بات کا مفہوم بدل دینے کا نام ڈپلومیسی ہے۔جہاں غیروں میں بدنامی سے بچنے کی آڑ میں اپنوں کی دھاندلیوں پر پردہ ڈالنے کا نام نظم ونسق ہے۔جہاں ملک کی دولت ملک کے اندر ہی رہنے کی دلیل کے ذریعہ رشوت اور غبن جیسے جرائم سے چشم پوشی برتنا ماہر اقتصادیات اور کامیاب سربراہ ہونے کی ضمانت ہے اور جہاں اقلیت کے افراد کے لئے اپنی قوم اور اپنی ملت سے غداری کرنا حب الوطنی ہے۔

اس سیاست میں وہی افراد قوم کے لیڈر اور وہی قوم دوسری قوموں کی امام ہوسکتی ہے جو مذکورہ اخلاق فاسدہ میں سبھوں سے بازی لے جائے۔اس لئے یہاں رذائل اخلاق میں مسابقت ہوتی ہے۔ہر آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ ڈپلومیسی یعنی فریب دینے کے فن میں اسے سب سے زیادہ نمبر ملے۔جوڑتوڑ میں کوئی اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکے۔سستی سے سستی ناموری کے طریقے ایجاد کرے۔کیونکہ اس کی پارٹی دوسری پارٹیوں کے مقابلہ میں، اس کا گروہ دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں اور اس کی قوم دوسری قوموں کے مقابلہ میں یہ اطمینان کر لینا چاہتی ہے کہ اس کا نمائندہ اس انسانیت کش دنگل میں چت نہ ہو جائے گا۔اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ چار دانگ

عالم میں شیطان ننگا ناچ رہا ہے۔اور اقوام عالم کی محفلوں کا صدر بن کر آدم وحوا کے بیٹوں اور بیٹیوں کو تہذیب وثقافت کے نام پر ننگا ناچ نچا رہا ہے اور قہقہے لگا کر کہہ رہا ہے کہ لباس حیا اتروا کر انسانیت کے آگے ناک رگڑنے کی بجائے انسانیت سے اپنے آگے ناک رگڑوا کر کیا بھرپور انتقام لیا۔اسی کا نتیجہ ہے کہ بڑوں میں شفقت باقی نہیں رہی اور نہ چھوٹوں میں احترام۔استاد خلوص اور وقار سے عاری ہو گئے اور طلبہ نے اطاعت اور ڈسپلن کا جامہ اتار پھینکا۔زبردست اپنی گرفت روز بروز ہمہ گیر اور سخت کرتا جاتا ہے اور زیردست چیخ رہا ہے۔سرمایہ دار پہلے جونک تھا، پھر جونک سے ترقی کر کے سیرنج بنا اور اب موٹر پمپ بن کر غریبوں کا خون کھینچ رہا ہے اور نادار طبقہ انتقام اور حسد کی آگ میں جل رہا ہے۔الغرض ہر گوشے میں فساد مچا ہوا ہے اور دنیا کے لال بجھکڑوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے۔۔۔؟

انبیائی سیاست:

بھلا اس گھناؤنے کاروبار اور ایسے فساد انگیز طریقۂ کار سے سیرت طیبہ کو نمونہ عمل بنانے والی ملت بیضا کو کیا سروکار ہو سکتا ہے۔اس کی سیاست تو وہ سیاست ہے جو سیدنا حضرت یوسفؑ کی سیاست تھی کہ باوجود یکہ مصر کی آبادی نے ان کے دین کو نہیں اپنایا پھر بھی ان کے اخلاق کا لوہا مان کر اس نے انہیں اپنا سربراہ بنالیا۔ہماری ملت کی سیاست تو سیدنا حضرت موسیٰؑ کی سیاست ہے کہ اسی مصر کی اکثریت کے اندر ان سے صرف ہمدردی کرنے والے نہیں بلکہ ان پر ایمان لانے والے افراد پیدا ہوئے۔اور خود فرعون کی بیوی نے اذیت کے ذریعہ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دینا ہنسی خوشی گوارہ کر لیا مگر اقلیت کے ایک فرد کے دین کے مقابلہ میں اپنے جاہ وجلال کو ترجیح نہیں دی۔ہماری ملی سیاست سیدنا حضرت عیسیٰؑ کی سیاست ہے جس نے رومیوں کی حاکم قوم کو اپنے ایک محکوم اور مظلوم شخص کا دین قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ہاں! ہماری سیاست تو خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست ہے جس نے اس وقت کی ایسی ہی اندھیر نگری میں جہاں ظلم وعدوان کا راج تھا اور جہاں اخلاق اور انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی، مثالی کردار کی علم بردار ایک پارٹی بنائی، پھر زندگی کے ہر گوشے کو ایسے حسین نقشے پر تعمیر کیا کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے بھی اسے دیکھ لیا تو جن کی جان کے وہ دشمن تھے ان ہی پر اب اپنی جان چھڑکنے لگے۔ہم اسی سیاست کے مکلّف ہیں اور اسی میں ہماری نجات ہے۔

شہادت للہ، نہ کہ گروہ بندی:

ملت اسلامیہ دنیا کی گروہ بندیوں میں ایک مزید گروہ کا اور اغراض ومفاد کے ٹکراؤ میں ایک نئے ٹکراؤ کا اضافہ کرنے کے لئے وجود میں نہیں لائی گئی ہے بلکہ مختلف گروہوں میں مفاہمت، ائتلاف ویگانگت اور اغراض ومقاصد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہے، اسی لئے یہ زمین پر شہداء اللہ اور امن وامان کی ذمہ دار قرار دی گئی ہے۔بھلا ایسی ذمہ دار امت ہی اپنے فرض سے غافل ہو کر فسادی عناصر کے جیسا رول ادا کرنے لگے تو پھر دنیا میں امن وعدل کیسے پایا جائے۔

طاقت کی جنگ؟

یہ ملت اس لئے تو نہیں بنائی گئی تھی کہ مادی طاقت پر بھروسہ کرے اور اس کے بل بوتے پر دنیا والوں سے کشمکش کرے اگرچہ اس کو اس کا مکلّف بھی ٹھہرایا گیا تھا کہ وہ حسب استطاعت قوت ضرور فراہم کرے۔لیکن قوت کی یہ فراہمی اس لئے نہ ہو کہ اس کا استعمال دنیا پرستوں کی طرح اسے بھی کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کو کمزور سمجھ کر بندگان خدا کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے اس پر دست درازی کی جرأت نہ کر سکیں۔چنانچہ اس کا مشن ایک طرف اگر انسانیت عامہ کے لئے فلاح وکامرانی کا ضامن ہونے کے سبب مقناطیسی کشش رکھتا تھا تو دوسری طرف انسانی حقوق کو غصب کرنے والوں کے نزدیک، انتہائی مبغوض بھی تھا اور انہوں نے اس کو کشمکش میں مبتلا

ہونے کے لئے مجبور کر دیا۔ اس کشمکش میں جب بھی اس نے مادی طاقت پر بھروسہ کیا ہزیمت اٹھائی۔ اور جب اس نے فلاح انسانیت کے ضامن اخلاق و کردار کی طاقت سے کام لیکر اپنے خدا پر بھروسہ کیا، کامیاب اور بامراد ہوئی۔

ہمارا مضبوط محاذ:

ہر گروہ کیلئے کشمکش کے بہت سے محاذ ہوتے ہیں، جن میں سے کوئی کمزور ہوتا ہے، کوئی مستحکم۔ اور ہر گروہ اپنے کمزور محاذ پر وار کو خالی دیکر اپنے اس محاذ پر مقابلہ کرنا چاہتا ہے جو مستحکم ہو۔ چنانچہ عددی طاقت، مادی طاقت اور مالی قوت کے محاذ ملت اسلامیہ کے ہمیشہ ہی کمزور محاذ رہے ہیں۔ اور حکمت الٰہی نے قصداً اسکے یہ مورچے کمزور بنائے ہیں تا کہ ملت اسلامیہ ان محاذوں پر لڑنے کی حماقت نہ کر سکے۔ کیونکہ اس صورت میں رب العالمین کی بنائی ہوئی یہ ملت اور رحمۃ للعالمین کی یہ امت فلاح عالم کی ذمہ داری ادا کرنے کی اہلیت کھو بیٹھے گی۔ لہذا اسکو ایسا مضبوط مورچہ عطا کیا ہے جس پر کشمکش کرنے کی مہارت میں یہ منفرد ہے اور جس پر کشمکش کے نتیجہ میں خواہ مخواہ اقوام عالم کے درمیان گندی اور تخریبی مسابقت کی بجائے پاکیزہ، صحت منداور تعمیری مسابقت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا زمانہ گذر جانے کے بعد بھی یہ امت محمدیہ تاتاریوں سے سیاسی شکست کھا جانے کے باوجود ان پر روحانی فتح پا گئی۔

پچھلی بیوقوفی کا نتیجہ:

پچھلے دنوں ہم اتنے بے وقوف ہوگئے تھے کہ ہم نے اپنے کمزور ہی محاذ پر کشمکش قبول کرلی۔ اور اس وار کو خالی دیکر اپنے مضبوط مورچہ یعنی اخلاق و کردار کے محاذ پر مقابلہ کے لئے دوسروں کو مجبور نہ کیا، جس کا نتیجہ جو کچھ نکلا نہ صرف نگاہوں کے سامنے ہے بلکہ اسلامی قدروں کی پامالی اور اپنی رسوائیوں کی شکل میں بھگتنا بھی پڑ رہا ہے۔ فراست ایمانی کا اس وقت بھی تقاضہ یہی تھا کہ اقتدار وقت اور ہمسایہ قوم کے ساتھ سیاسی برتری اور مادی پستی، اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر معاملہ اور مقابلہ کرنے کی بجائے دونوں کو ہم اخلاقی محاذ پر لاکھڑا کرتے۔ اور آج بھی ہمارے شایان شان یہی کام ہے اور اسی پر ہم اللہ تعالیٰ کی تائید کے مستحق ہو سکتے ہیں اور اس طرح ہمیں دنیا اور آخرت میں عزت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

ہم کیوں متحد کرنا چاہتے ہیں:

چنانچہ متحدہ سیرت کمیٹی آپ کو متحد کرنا اور متحد رکھنا اصلاً اسلئے چاہتی ہے کہ یہ آپ کے دین کا عین تقاضہ ہے اور خود آپ کا دین اتحاد و تنظیم کے بغیر آپ کو کسی شمار میں گننے کیلئے تیار نہیں ہے۔ اور ضمناً اس لئے کہ آپ کیلئے جو پروگرام یہ کمیٹی رکھتی ہے وہ اتحاد اور تنظیم کے بغیر بروئے کار آ ہی نہیں سکتا۔

بزدلی کی ایک وجہ:

آج آپ متفرق ہیں تو آپ میں کا ہر شخص اپنے کو اکیلا سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ حوادث کا مقابلہ مجھے اکیلے کرنا ہے، زندگی کی گاڑی کو مجھے تنہا اکیلی طاقت سے آگے بڑھانا ہے اور اپنے سارے مسائل سے اکیلے اپنے وسائل کے ذریعہ نمٹنا ہے۔ یہ احساس بزدلی کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب ہے۔ آپ منظم ہو جائیں تو جتنی بڑی آپ کی تنظیم ہوگی ہر فرد خود کو اتنا بڑا محسوس کرے گا۔ وہ سمجھے گا کہ میں ایک نہیں بلکہ چھ کروڑ ہوں۔ یہ اسکے اندر خود اعتمادی پیدا کریگا۔ اور اس طرح وہ بوداپن دور ہو سکے گا جس کا مظاہرہ برابر ہوتا رہتا ہے۔

افتراق کی وجہ سے :

آپ کے افتراق کی وجہ سے دنیا والے آپ کو نرم چارہ سمجھ کر نگل جانے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ آپ متحد ہو کر اپنی ملت کے اجزائے ترکیبی میں شدید گٹھاؤ پیدا کر کے لوہے کا چنا بن جایئے۔ آپ کے انتشار اور انفرادیت پسندی کے سبب آپ کے افراد اور آپ کے گروہوں کو ایک دوسرے سے آسانی کے ساتھ پھاڑ لیا جاتا ہے۔ آپ اسلامی اخوت واتحاد کے ذریعہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جایئے جس میں شگاف ڈالنا ممکن نہ رہے۔ آپ ایک دل اور چھ کروڑ جسم بن جایئے، ایک جان اور چھ کروڑ قالب بن جایئے، ایک آواز اور چھ کروڑ زبان بن جایئے، ایک خزانہ اور اس کو سیراب کرنے والی چھ کروڑ شاخیں بن جایئے اور ہاں! ایک مسئلہ اور اسکو حل کرنیوالے بارہ کروڑ ہاتھ بن جایئے۔ پھر دیکھیے گا کہ آپکی مرضی اور آپ کے ملی مفاد کے خلاف کسی شاہی مسجد کا امام آپ کا نمائندہ بن کر ساری دنیا میں جھوٹ بول کر نہ آسکے گا۔ پھر نومنیشن (Nomination) کے ذریعہ اوپر ہی اوپر لے لیا جانیوالا کوئی نام نہاد مسلمان دنیا کی بھری محفلوں میں آپکا خود ساختہ نمائندہ بنکر اقوام عالم کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکے گا اور پھر آپکے دین میں چند ٹوڈیوں کی تائید کے بل پر مداخلت نہیں کیجا سکے گی۔

تحفظ کیلئے :

آپ کا اس وقت کا بہت بڑا مسئلہ جان مال اور آبرو کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ مگر آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اسلامی عقیدے کے مطابق یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے جس کا کوئی راجہ ہی نہ ہو یا ہو تو چوپٹ راجہ ہو بلکہ ایک علیم وخبیر خدا کی یہاں کارفرمائی ہے جسکے اذن کے بغیر دنیا بھر کے فرقہ پرست اور تنگ نظر بھی گٹھ جوڑ کرلیں تو آپ کا ایک بال بیکا نہیں کر سکتے اس لئے آپکے قتل کا بازار جو آئے دن گرم ہوتا رہتا ہے یقیناً اس کے اذن ہی سے ہوتا ہے اور اللہ اپنے حبیبؐ کی امت کیلئے قہار نہیں ہے اسلئے یقینی بات ہے کہ اس قتل میں اس کی عظیم حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس سے، اسکے رسولؐ سے اور اس کے دین سے کامل وابستگی اختیار کرلیں تو پھر آپ بہت جلد دیکھ سکتے ہیں کہ فسادات کی یہ آتش نمرود کس طرح آپ کیلئے گلزار خلیل بن جاتی ہے۔ بے صبری کو راہ نہ دیجئے۔ اس شر میں عظیم خیر چھپا ہوا ہے۔

فسادات کا دوسرا رخ :

فسادات کے ذریعے ایک طرف اللہ تعالیٰ کتنوں کو شہادت کا مقام نصیب کرانا چاہتا ہے اور دوسری طرف جو مہیب تباہیاں ان فسادات کے پیچھے آنے والی ہیں ان سے ملک اور اکثریت کے دور اندیش افراد کو ہوشیار ہوجانے کا موقع دے رہا ہے۔ ایک نتیجہ کو تو وہ کسی نہ کسی حد تک سمجھنے بھی لگے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آج کی دنیا ماقبل تاریخ کی دنیا نہیں ہے جس میں قومیں پہاڑوں، دریاؤں اور انتظامی حد بندیوں کے اندر مگن رہا کرتی تھیں۔ جب فرعون اپنی اقلیت کے بچوں کا قتل عام کرتا تھا اور دنیا کو معلوم تک نہ ہوتا تھا، جب جینوں کا صفایا کیا جاتا تھا اور دنیا کو اس سے کوئی مطلب نہ ہوتا تھا اور جب بودھوں کا نام ونشان مٹایا جاتا تھا اور دنیا والے خاموش تماشائی بنے رہتے تھے۔ آج کسی بھی ملک میں اقلیت پر تباہی ڈھائی جائے تو بین الاقوامی سیاست میں خطرناک ہلچل مچ جاتی ہے اور ساری دنیا چاہے یا نہ چاہے، بہر حال مجبور ہوجاتی ہے کہ اس کا سخت نوٹس لے۔ اس لئے اقلیت کشی کے ذریعہ خون ریزی اور لاقانونیت کا جو چسکا لگ رہا ہے اقلیت کا صفایا تو کر نہیں سکتا آگے چل کر یہ رنگ لائے گا اور اکثریت کا یہ بھرم جو سیاسی جادوگری کے ذریعہ قائم ہے کھل کر رہے گا اور ایسی تباہی مچائے گا جس پر بین الاقوامی برادری کسی ضابطے کے تحت بھی کوئی مداخلت نہ کر سکے گی۔ یہ تو وہ پہلو ہے جو تھوڑا تھوڑا اکثریت کے دور اندیش لوگوں کو پریشان کرنے لگا ہے۔ دوسرا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس طرح فرقہ پرست

آہستہ آہستہ برہنہ ہوتے جارہے ہیں اور قدرت ملک والوں کو موقعہ دے رہی ہے کہ وہ ہوشیار ہوجائیں۔ ورنہ وقت بتادے گا کہ فرقہ پرستی کے جذبات کو بھڑکا کر سوچنے سمجھنے والوں کے ذہن و دماغ کو ماؤف کر کے انکو ننگ نظری کے مرض میں مبتلا کر کے انکی آنکھ میں خاک جھونک کر موقعہ پاتے ہی اپنا کھیل کھیل جانے کا کونسا بیرونی منصوبہ کام کر رہا تھا۔ یہ آپ کی خوش نصیبی اور آپ کیلئے باعث فخر بات ہے کہ آپ کے شہیدوں کے خون کے چھینٹے اس چھپے ہوئے دشمن کا سراغ دینے والے ہیں جس نے مسلم دشمنی کا بورڈ لگا کر ایسی کمین گاہ بنا رکھی ہے جس پر ملک دشمنی کا شبہہ کرنے کی بھی کوئی جرأت نہ کرسکے۔ آپکو منظم ہوکر نہ صرف اپنا دفاع کرنا ہے بلکہ ملک کو بھی اس شب خوں حملے سے بچانا ہے اور یہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ فرقہ پرست کیمپ میں جو لوگ اپنے بھولے پن کی وجہ سے موجود ہیں انکو دشمن کی یہ جنگی چال سمجھانے کی آپ بھرپور کوشش کریں۔

نئے مبارک دور کا آغاز کیجئے:

اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ آپکو اپنی ہمہ جہتی تعمیر بھی کرنی ہے اور دراصل آپ کا یہ مثبت کام ہی حقیقی کام ہے جس پر آپکو زیادہ سے زیادہ توجہ، محنت اور وسائل لگانے ہیں۔ یہ سیرت کمیٹی اسلام کی اوپر بتائی ہوئی حکمت عملی کے مطابق یہ چاہتی ہے کہ جہاں ملک کے اندر تخریب میں مسابقت کی گرم بازاری ہے وہاں اب ایک نئے مبارک باب کا آغاز کیا جائے یعنی آپ ایک ایسا منظم گروہ بنکر اٹھیں جو زندگی میں ہمہ گیر تعمیر کا علم بردار ہو اور اپنی عملی کارگزاریوں سے ایک نیا دور پیدا کردے، جہاں گندی مسابقت (Filthy Competition) کی جگہ صحت مند مسابقت (Healthy Competition) کا بازار گرم ہو اور تخریب پسندی اپنی موت آپ مرجائے۔ وہ دن ملک وملت کیلئے بڑا مبارک اور تاریخی دن ہوگا جس دن مزاحمتوں کے علی الرغم آپ اپنے تعمیری منصوبے کے مطابق ملک والوں کے سامنے ایک نمونۂ عمل پیش کردیں گے۔ اسی دن عملاً ہمارے ملک کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑیگی اور ہر گروہ کیلئے ناگزیر ہوجائیگا کہ آئندہ وہ دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں عملاً زیادہ سے زیادہ پاکیزہ اخلاق اور بہتر سے بہتر تعمیری صلاحیت کا ثبوت پیش کرے ورنہ میدان سے ہٹ جائے۔

سیاسی اخلاق نہیں، اخلاقی سیاست!

حضرات! اتنا کچھ سننے کے بعد یہ بات آپکی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ ہماری ملت اسلامیہ جس چیز کی علم بردار بنائی گئی ہے وہ کیا ہے۔ وہ اخلاق ہے مگر سیاسی اخلاق نہیں۔ وہ سیاست بھی ہے مگر استحصالی سیاست نہیں۔ بلکہ وہ اخلاقی سیاست اور ربانی سیاست ہے۔ اخلاقی سیاست وہ ہوتی ہے جس پر مصلحت (Expediency) کا غلبہ نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ عالمگیر اصول اخلاق (Universal Code of Morality) کی پابند ہوتی ہے۔ اور ربانی سیاست کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی شخص، کسی قوم یا کسی گروہ کے اقتدار کو قائم کرنے یا قائم رکھنے کیلئے اور دوسروں کے استحصال (Exploitation) کیلئے نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ کائنات کے خدا کی طرف سے اسکی ساری مخلوق کو بلا امتیاز رنگ ونسل، مذہب وملت اور طبقہ وقومیت فائدہ پہنچانے اور ان کے حقوق کی نگرانی کرنے کیلئے ایک غیر جانبدار رفاہی ادارہ کو وجود میں لانے کیلئے ہوتی ہے۔ اور اس کا بروئے کار آنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک باشندگان ملک کی اس ڈھب پر تربیت نہ کردی جائے کہ وہ تخریب سے نفرت اور تعمیر کو عملاً پسند کرنے لگیں، فرض سے جی چرانے کی بجائے فرض کو ادا کرنے میں خوشی محسوس کرنے لگیں اور خود غرضی، خود فریبی اور خود نمائی کی بجائے مسائل کو انسانیت عامہ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور دولت واقتدار کی بجائے خدمت خلق اور خدا ترسی کو معیار عزت سمجھنے لگیں۔

اندرونی استحکام :

اس مبارک مسابقت کی ابتدا ہمیں کرنی ہے اور ہم ہی کر بھی سکتے ہیں۔ اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہم اجتماعی طور پر اخلاقی تعمیر کا عملی نمونہ پیش کریں۔ محض فرداً فرداً ہمارا ہر آدمی اگر اخلاق کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر بھی فائز ہو تو وہ صالح تبدیلی لانے کے لئے اتنا مؤثر نہیں ہوسکتا جتنا اجتماعی طور پر اخلاق کا اوسط ہی معیار ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ایک اخلاقی فضا پیدا کرنے، ایک اخلاقی ماحول ہویدا کرنے اور ایک اخلاقی ہماہمی برپا کرنے کے لئے ہمیں اجتماعی زندگی میں اب داخل ہونا ہے۔ اور اپنی اس اجتماعیت کو حاسدوں، شرپسندوں اور وسوسہ اندازوں سے محفوظ بھی رکھنا ہے۔ آپ اجتماعی زندگی گذارنے کا پختہ عزم کرلیں تو پھر ایسے لوگ آپ کا کچھ نقصان نہیں کرسکتے۔ خوب یاد رکھئے، کسی بھی اجتماعی نظم کو باہر کی طاقت مٹا نہیں سکتی بلکہ وہ خود اسکے اندر کا فساد ہوتا ہے جو اسکی خودکشی کا باعث بن جاتا ہے۔ لہٰذا آپکو دراصل اپنے اندرونی استحکام پر اصلی توجہ صرف کرنی ہوگی۔

ملت ابراہیمی ہونے کا شعور:

یہ بھی اچھی طرح اپنے شعور میں اجاگر رکھیں کہ آپ کوئی وطنی قوم، کوئی لسانی گروہ، کوئی طبقاتی جتھا یا کوئی مفاد پرست گٹھ جوڑ کرنے والی ٹولی نہیں ہیں کہ آپ اس قسم کی قوموں، گروہوں، جتھوں اور ٹولیوں کے طرز پر اپنی اجتماعیت قائم کریں اور چلائیں، بلکہ آپ ملت ابراہیمی ہیں۔ ملت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک خاص طریقۂ زندگی اپنانے کی وجہ سے ایک اجتماعی وحدت بنے ہیں۔ اس لئے آپ کی یہ اجتماعی وحدت اسی طرح قائم ہوسکتی اور قائم رہ سکتی ہے جس طرح سیدنا حضرت ابراہیمؑ نے اسے قائم کیا اور جس طرح اس کو قائم رکھنے کا طریقہ خود اللہ تعالیٰ نے تجویز کردیا ہے۔

پہلی بنیاد نماز:

سنئے! قرآن حکیم کیا فرماتا ہے۔ فرماتا ہے **واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا** ۔ یعنی اللہ کی رسی کو جماعتی طور پر مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور پھوٹ کا شکار نہ بنو۔ آخر اللہ کی رسی ہے کیا؟ قرآن آگے فرماتا ہے **اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه** ۔ یعنی دین قائم کرو، اس معاملہ میں فرقہ بندیوں کا شکار مت بنو۔ معلوم ہوا کہ دین کو قائم کرنا ہی اللہ کی رسی ہے جس کو اکٹھا ہوکر مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دین قائم کرنے کا طریقہ (Process) کیا ہے؟ قرآن میں فرمایا گیا ہے **اقيموا الصلوٰة ولا تكونوا من المشركين، من الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعا، كل حزب بما لديهم فرحون** ۔ یعنی نماز قائم کرو مشرکوں میں سے نہ ہوجاؤ ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو پھاڑ ڈالا اس طرح کہ ہر ٹولی اس میں مگن ہے جو اسکے پاس ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق نماز کی اقامت سے توحید اور وحدت ملت کا اثبات ہوتا ہے۔ اور اقامت نماز سے غفلت کی وجہ سے مسلم ملت اور مشرک ملت میں امتیاز باقی نہیں رہ جاتا اور اسکی وحدت فرقہ بندیوں کی لعنت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

ملت ابراہیمی کی زندگی اور موت سے متعلق قانون فطرت جب یہ ہے تو پھر دوسری تدبیروں سے اسکی شیرازہ بندی کس طرح ممکن ہے؟ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق نماز میں جن لوگوں کی صفیں سیدھی نہیں ہوتیں انکے دل آپس میں نہیں ملتے۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کی سیدھی صفیں بھی نہ ہوں بلکہ سرے سے صفیں ہی نہ ہوں اور آپ کے دلوں کو جوڑ دیا جائے۔ لہٰذا اگر آپ کو اپنا وجود عزیز ہے، آپکو آبرومندانہ زندگی بسر کرنا ہے اور آپکو ملت ابراہیمی پر جینا اور مرنا ہے اور اسکے لئے آپ کا متحد ہونا ناگزیر ہے تو اپنے پروگرام کا پہلا جزو اسی اقامت صلوٰۃ کو بنانا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ دنیا بھر کی دولت بھی خرچ کرڈالتے تو انکے دلوں میں الفت

پیدا نہ کر سکتے، لیکن یہ اللہ ہے جس نے ان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ اس کے ایک معنی تو وہ ہیں جو آپ سرسری طور پر سمجھ جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص قدرت سے مومنوں کے دلوں کو جوڑ دیا تھا۔ مگر اس کا دوسرا معنی آپکے لئے زیادہ قابل توجہ ہے اور اسی میں آپکے لئے شفاء کا نسخہ ہے۔ وہ معنی یہ ہے کہ دنیاوی اغراض و مفاد سے دل نہیں جڑا کرتے بلکہ للّٰہیت سے وہ الفت پیدا ہوتی ہے جو کسی مجموعۂ افراد کو بنیان مرصوص یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیتی ہے اور آپکو یہی بننا ہے۔ کیونکہ اس سے کم کے ذریعہ سے آپ کا مسئلہ حل ہونیکا نہیں ہے۔ اس لئے اقامت نماز کو اپنائے بغیر کوئی معجزہ نہیں دکھایا جاسکتا۔ کیونکہ نماز ہی وہ کیمیا اثر نسخہ ہے جو انسان کے اندر للّٰہیت پیدا کر سکتا ہے۔

یہ نماز آپکے اندر جماعتی شعور پیدا کرے گی۔ یہ نماز آپکو اجتماعی اخلاق سکھائیگی۔ یہ نماز آپکو پابند اوقات بنائے گی۔ یہ نماز آپ کو فرض شناس اور مستعد بنائے گی۔ یہ نماز آپ میں ڈسپلن پیدا کریگی اور آپکو جماعتی زندگی کے اصول وضوابط دے گی۔ نہ صرف دیگی بلکہ ان کی آپ سے عملی مشق کرائے گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ نماز آپکو زندگی، طاقت اور عزت کے منبع یعنی خدا، سے ذہنی اور شعوری طور پر نزدیک اور نزدیک تر کرتی چلی جائیگی اور آپکو دنیا میں سب سے برتر گروہ بنا دے گی۔

نماز ہی کے سبب اللہ تعالیٰ اپنا وہ وعدہ پورا کرتا ہے کہ تم ہی سب سے برتر رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔ گویا نماز ہی مومن بنانے والی ہے جس کو سبھوں پر برتری حاصل ہونا ہے۔ اس برتری کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ دنیا کے گروہوں میں کوئی نہ کوئی گروہ بہر حال سب سے برتر ہوتا ہے، مگر وہ برتری محض مادی برتری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس برتری کا وعدہ فرمایا ہے وہ اللہ کے پسندیدہ انداز میں دنیا کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنانے والے نظام کی علم بردار تنظیم کی حیثیت سے غلبہ و برتری ہے۔ خود اللہ تعالیٰ جس ڈھنگ پر اپنی بنائی ہوئی دنیا کے نظم و نسق کو دیکھنا پسند کرتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ اس نظم و نسق کا ذمہ دار گروہ زیادہ سے زیادہ ان صفات کا حامل ہو جو ایسے نظم و نسق کیلئے ضروری صفات ہیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ لوگ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے اور اسکے اخلاق کو اپنائے ہوئے ہوں۔ کسی کے رنگ میں رنگ جانے اور کسی کے اخلاق کو اپنانے کیلئے ضروری ہے کہ انسان اسکی رفاقت کو اختیار کرے اور زیادہ سے زیادہ اس کے نزدیک رہے۔ چنانچہ یہ نماز ہی وہ نادر چیز ہے جسکے ذریعہ انسان ذہنی اور شعوری طور پر اپنے خدا سے قریب ہوتا ہے ورنہ ویسے تو خدا خود ہر ایک سے اسکی شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ دراصل ذہن و شعور کی بیداری کے ساتھ ادا کی جانے والی نماز انسان کو اللہ سے قریب کرتی ہے۔ اور پوری نماز کے اندر سجدہ وہ پسندیدہ ادا ہے جو انسان کو اللہ سے انتہائی قریب کر دیتی ہے۔ چنانچہ شعوری سجدہ کی کثرت اور اسکی طوالت بندہ کیلئے اللہ سے قریب ہونے اور قریب رہنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اور اس طرح اللہ سے قریب ہونے، بار بار قریب ہونے اور طویل لمحات میں قریب رہنے کے سبب انسان رب العالمین کے صفات اپناتا چلا جاتا ہے۔

جمال ہم نشیں در من اثر کرد　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اسی لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سجدہ کے لئے جو تسبیح سکھائی وہ سبحان ربی الاعلیٰ ہے۔ یعنی پاک ہے میرا رب اعلیٰ۔ اور جب آپ کی امت کے مخلصین نے سجدوں میں اپنے رب کی صفت 'الاعلیٰ' کو ذہن میں اجاگر کیا تو رفتہ رفتہ ان میں خود یہ صفت پیدا ہوگئی اور وہ 'الاعلون' ہو گئے۔ یہ ہے اللہ کا وعدہ انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ اس طرح نماز ہی وہ چیز ہے جو آپ کو ابدی زندگی، ناقابل تسخیر طاقت اور لازوال عزت سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ چنانچہ اس نماز ہی میں مومنوں کی وہ معراج ہے جسکے حصول کیلئے وہ اپنا سب کچھ بھی قربان کر دیں تو یہ سودا مہنگا نہیں سستا ہی ہے۔

دوسری بنیاد زکوٰۃ:

آپ کے پروگرام کا دوسرا جز ونظام زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ ایک مقررہ شرح سے مال نکال دینے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دراصل نظام سودخواری کے مقابلہ میں ایک پورا اقتصادی نظام ہے۔ سود بھی اپنی ابتدائی اور سادہ سی شکل میں ایک مقررہ شرح کے مطابق اپنے دیئے ہوئے مال سے زیادہ وصول کرنے کا نام ہے۔ لیکن معاملات کی دنیا میں پیچیدہ ہوتے ہوتے ایک ہمہ گیر اقتصادی نظام بن جاتا ہے اور بن گیا ہے۔ اسی طرح ابتاءً زکوٰۃ اپنی سادہ شکل سے تمدن کے ساتھ ارتقا کرتے ہوئے ایک ہمہ گیر معاشرتی معاشی نظام (Comprehensive Socio-economic Order) بننے والا ہے، بن چکا ہے اور بنے گا۔ نظام سودخواری کسی حاجت مند کی مجبوری سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے والی ذہنیت کو جنم دیتا ہے، جس سے سخت دلی، خود غرضی، مادہ پرستی، تنگ نظری اور لوٹ کھسوٹ پیدا ہو کر جنگ تک نوبت پہنچتی ہے۔ اس طرح حاجت مندوں کے جسموں سے کھینچ کھینچ کر جمع کیا ہوا خون عالمگیر جنگ کی بھٹی میں جل کر سخت بساندھ پیدا کر کے آنے والی نسلوں میں طرح طرح کے جسمانی اور روحانی امراض پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور فصلیں اور نسلیں خراب ہونے لگتی ہیں۔ اس نظام کی لعنتوں میں سے ایک یہ ہے کہ عوام کی قوت خرید جواب دیدیتی ہے۔ اس پر مصنوعی طور پر قابو پانے کی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں جس سے افراط زر کی مصیبت آدبوچتی ہے۔ افراط زر کے نتیجہ میں چیزوں کی قیمتیں چڑھنے لگتی ہیں تو اجرتوں میں اضافہ کا مطالبہ زور پکڑتا ہے۔ اجرت میں اضافہ کیا جاتا ہے تو اس اضافہ کو پورا کرنے کیلئے ٹیکس بڑھانا پڑتا ہے۔ بڑھے ہوئے ٹیکس کو ادا کرنے کے لئے اشیائے صرف کی قیمتیں بڑھائی جاتی ہیں اور پھر اجرت میں اضافہ کا مطالبہ شروع ہوتا ہے۔ اس طرح قیمتوں میں زیادتی، اجرتوں میں اضافہ اور ٹیکس میں اضافہ کا ایک ناپاک چکر (Vicious Circle) چلتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں مسئلہ حل ہونے کی بجائے سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ لعنت پھر ایک عظیم تصادم، ایک بھیانک فساد (Disorder) اور ایک خون آشام قیامت لے آتی ہے۔ یہ ایک ایسا شیطانی جال ہے جس میں پھنس جانے کے بعد انسانیت کسی طرح ان مصیبتوں سے نجات پا ہی نہیں سکتی الا یہ کہ وہ اس نظام ہی کو دفن کر کے ایک صالح نظام کو بروئے کار لے آئے۔ وہ صالح نظام یہی نظام زکوٰۃ ہے۔ یہ مالدار کے ذہن کی بالکل برعکس تربیت کرتا ہے، یہ حاجت مند سے لینے کی بجائے اس کو دینے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس سے قلب میں نرمی اور گداز، نفس میں جذبۂ ایثار، نظر میں وسعت اور لوٹ کھسوٹ کی بجائے خدمت خلق کا داعیہ ابھرتا ہے جسکے نتیجہ میں رافت ورحمت، مودت ومحبت اور تعاون واعتماد کا ماحول پیدا ہو کر پوری زندگی امن وامان کے ساتھ ایک خوشگوار تعمیری ارتقا کی طرف گامزن ہوتی ہے، فصلیں خوب تر اور نسلیں بہتر پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس نظام میں قومی دولت کا ارتکاز نہیں ہونے پاتا جس سے عوام کی قوت خرید کبھی جواب نہیں دیتی اس لئے وہ ساری خرابیاں اس میں رونما نہیں ہو پاتیں جو نظام سودخواری میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ یہ نظام زکوٰۃ صرف مقررہ مقدار میں اپنے مال کا ایک حصہ نکال دینے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ نظام ہر مسلمان کو فرداً فرداً اور پوری مسلم سوسائٹی کو بحیثیت مجموعی اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ اس کے علم کے دائرے میں کوئی بھی انسان خواہ وہ کسی قومیت اور کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو ناداری کی وجہ سے اپنی زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم نہ رہے۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ اگر کوئی ایک آدمی ناداری کے سبب بھوکا سو رہتا ہے تو اس محلے کے سارے مسلمانوں کا کھانا حرام ہو جاتا ہے۔

اس طرح یہ نظام زکوٰۃ مسلم سوسائٹی کو ایک عام رفاہی ادارہ بنا دیتا ہے اور آپ کے پروگرام کا دوسرا بنیادی جز ونظام زکوٰۃ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اسلام نے آپ کو ایک رفاہی امت بنایا ہے جو دوسری پارٹیوں اور گروہوں کے برعکس اپنے فائدے کیلئے نہیں بلکہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اخرجت للناس.

یادرکھئے:

اگر شعور کے ساتھ نماز اور خلوص کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کے ان دونوں پروگراموں کو حسن وخوبی اور ڈھنگ اور سلیقہ سے آپ نے انجام دیا تو اسلام اور خود آپ سے متعلق جو غلط فہمیاں اپنے دین سے ناواقف مسلمانوں اور دوسرے عام انسانوں میں پائی جاتی ہیں خود بخود دور ہوتی چلی جائیں گی اور ان غلط فہمیوں کی وجہ سے خود آپ کے اندر جو اضمحلال اور آپ کے لئے مصائب ومشکلات کے جو خارزار پیدا ہوگئے ہیں رفتہ رفتہ خود بخود ختم ہوجائینگے۔ لیکن یاد رکھئے! یہ خیر وبرکت انفرادی زندگی بسر کرتے ہوئے حاصل نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے حصول کی شرط یہ ہے کہ منظم طور پر ان دونوں پروگراموں کو لے کر چلا جائے۔ اگر آپ کے سربراہ دل سوزی کے ساتھ آپ کی رہبری کرتے رہے اور آپ تندہی کے ساتھ کام کرتے رہے تو پھر کوئی مشکل نہیں جو آسان نہ ہوجائے۔

قیادت کا مسئلہ:

اجتماعی زندگی کے تصور کے ساتھ قیادت کا سوال فطری طور پر ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور پھر آپ مایوسی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بھی آپ کا ذہن بالکل صاف اور یکسو ہوجائے۔ قیادت کی کئی قسمیں ہیں۔ اسکی بنیادی قسمیں دو ہیں۔ ایک صالح دوسری غیر صالح۔ صالح قیادت وہ ہے جو صالح اور مفید انسانیت انقلاب برپا کرسکے یا برپا شدہ صالح انقلاب کو صحیح خطوط پر چلا سکے اور برقرار رکھ سکے۔ غیر صالح قیادت وہ ہے جو غیر صالح اور مضر انسانیت انقلاب برپا کرسکے یا اسکو چلا سکے اگرچہ اسکی اپنی دلی خواہش اور تمنا صالح انقلاب ہی کی ہو۔ پھر یہ ہردو قیادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہی جو نئے انقلاب کو برپا کرکے نئے دور کو جنم دیتی ہے اور اسطرح وہ ایک تاریخ ساز قیادت ہوتی ہے۔ دوسری وہ جو تاریخ ساز قیادت کے کھینچے ہوئے خطوط پر اسکے نقطہ نظر سے کامیاب طور پر اسکو چلاتی رہتی ہے۔ پہلی قسم کی قیادت روز روز پیدا نہیں ہوتی بلکہ لمبے وقفہ پر وجود میں لائی جاتی ہے۔ اور دوسری قسم کی قیادت ضرورت کے مطابق ہمیشہ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پہلی قسم کی صالح قیادت اول نمبر پر انبیاء علیہم السلام کی قیادت ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ اندر سے ابھر کر نہیں آتی بلکہ اوپر ہی اوپر اللہ کی طرف سے بھیجی ہوتی ہے۔ اسے وہبی قیادت کہتے ہیں۔ اسکا سلسلہ سرکار رسالت مآب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوچکا۔ حضورؐ کے بعد دوسرے نمبر کی صالح قیادت مجددین امت کی قیادت ہے جسکا سلسلہ چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ مگر اس قیادت کو بھی امت اپنے اندر سے نہیں ابھارتی ہے بلکہ یہ قیادت اپنے زور سے امت کو ابھارتی ہے اور اسطرح یہ بھی وہبی ہی قیادت ہوتی ہے۔ دوسری قسم کی صالح قیادت جس کے ذمہ امت کی گاڑی کو چلاتے رہنا ہے۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہوتا کہ وہ دبی ہوئی امت کو ابھار سکے، بلکہ خود ملت اپنے اندر سے اس قیادت کو ابھارتی ہے۔ جہاں تک ایسی قائدانہ صلاحیت کا تعلق ہے ضروری صلاحیتیں دیکر ایسے افراد پیدا کرنے کے معاملے میں قدرت کبھی بخیل واقع نہیں ہوئی ہے۔ مگر یہ امت کی اپنی کوتاہی ہوتی ہے کہ وہ اس قیادت کو ابھارے ہی نہیں، یا غلط کار قیادت کو ابھار ڈالے۔ پھر یہ قیادت بھی دو قسم کی ہوتی ہے ایک سستی اور اتھلی قیادت جو جذبات کو ابھار کر سطحی پروگراموں میں امت کو لگادیتی ہے۔ اور دوسری تعمیری اور سنجیدہ قیادت جو ملت کو سنجیدہ اور فرض شناس بناتی، اسکے اخلاق کو سنوارتی، اسکے کردار میں نکھار، اسکی معاشرت میں استواری اور اسکی معیشت میں استحکام پیدا کرتی اور بحیثیت مجموعی اسکو ایک ایسا حسین گروہ بنادیتی ہے کہ جو اس کو دیکھے وہ اسی کا ہوجانے کی تمنا کرنے لگے۔

یہ سنجیدہ تعمیری قیادت ہے:

آپکی یہ متحدہ سیرت کمیٹی اسی آخری قسم کی قیادت ہوسکتی ہے۔ اس سے آپ اس قسم کی توقع نہ رکھیں کہ وہ نعرہ بازی اور ہیجان انگیزی کے پروگرام آپکو دے سکے گی۔ وہ احتجاج کرنے والی، قراردادیں پاس کرنے والی اور میمورنڈم پیش کرنیوالی قیادت بننا نہیں

چاہتی۔ اسکو آپکی ملی فضا میں محض دل خوش کن ہلچل مچانا نہیں ہے اور نہ قائدانہ بازی گری کے اکھاڑے میں اتر کے چھوٹے بڑے قائدوں سے دنگل لڑنا ہے۔ وہ آپکو اولاً متحد اور اسلام کی بنیاد پر متحد دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ آپکو فضول اور نقصان رساں مشغلوں سے بچا کر اچھے اور مفید کاموں میں لگانا چاہتی ہے۔ وہ آپ کو سنجیدہ، فرض شناس، بااخلاق اور صاحب کردار بنانا چاہتی ہے۔ وہ آپکی معاشرت میں اسلامی سادگی اور آپکی معیشت میں حقیقی استواری پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ آپکے بچوں کیلئے صحیح تعلیم وتربیت کا بندوبست کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے وہ آپ سے ایسے افراد مانگتی ہے جو قوال نہ ہوں فعال ہوں، جو باتونی نہ ہوں کارگذار ہوں اور جو کج رو اور کھاؤ پکاؤ نہ ہوں بلکہ راست باز اور دیانت دار ہوں۔

آپ کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟

آپ خود سوچئے اگر وہ آپ کے معاشی استحکام ہی کی خاطر اس نتیجہ پر پہنچے کہ پہلے قدم پر آپکی معاشرت اور روزمرہ کی زندگی کو سادہ بنانا ناگزیر ہے اور وہ آپ سے اس کیلئے اپیل کرے اور اسلامی سادگی سے اپنے کاموں کو انجام دینے کیلئے ہدایتیں دے مگر آپ وہی کرتے رہیں جو پہلے سے کرتے رہے ہیں تو بیچاری کمیٹی کیا کر کے دکھا سکے گی؟ اگر وہ آپ کے معاشی استحکام کیلئے کوئی چھوٹا یا بڑا منصوبہ بنائے، اس کیلئے سرمایہ جمع کرے مگر آپ ہی کے فراہم کئے ہوئے کارکن غیر ذمہ دار ثابت ہوں تو وہ کیا کر سکے گی؟ اگر آپ خود غرضانہ ذہنیت سے بالاتر نہ ہو سکے اور آپ نے اپنے اندر سے ایسے افراد کو اوپر بھیجا جو جوڑ توڑ کرنے والی ذہنیت رکھتے ہیں تو اس سیرت کمیٹی کے پاس ایسی کون سی طاقت ہے کہ بیچاری اپنے کو خود زندہ رکھ سکے۔ چہ جائیکہ وہ آپ کی کوئی خدمت کر سکے؟ اس لئے اب یہ آپکی ذمہ داری ہے کہ ہر قسم کی تنگ نظری اور اغراض پرستی سے سچی اور پکی توبہ کر کے اپنے اندر سے بےنفس اور باصلاحیت کارکن پیش کیجئے۔ سیرت کمیٹی آپ کے پیش کئے ہوئے کارکنوں اور آپ کے فراہم کئے ہوئے وسائل کو سامنے رکھ کر آپکی فلاح و بہبود کے نقشے بنائے گی۔ اس کیلئے ضروری ہدایتیں دینا اس کا کام ہوگا اور ان ہدایتوں کو وفاداری کے ساتھ عملی جامہ پہنانا آپ کا کام۔ اس طرح انشاء اللہ وہ حسین انجام سامنے آسکے گا جس کے بغیر آج انسانیت گھناؤنی اور زندگی ڈراؤنی ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو اسلام کا سچا خادم بنادے اور ہم کو اسلام کی تمکین کا ذریعہ بنادے (آمین)

کتاب پر ایک تبصرہ

۱۸/ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو متحدہ سیرت کمیٹی پٹنہ کا اجلاس بمقام انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب نے اس اجلاس میں ایک مقالہ پڑھا تھا۔ یہ پمفلٹ، موصوف کا وہی مقالہ ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے جو باتیں لکھی ہیں وہ ۶۸ء میں بھی اتنی ہی مفید ہیں جتنی ۶۴ء میں تھیں۔ موصوف کو اللہ نے بڑی صلاحیتیں عطا کی ہیں اور وہ انہیں بڑے ایثار کے ساتھ دین حق کی سربلندی کی جدوجہد میں استعمال کر رہے ہیں۔ یہ پمفلٹ ان کی علمی صلاحیت کی ایک دلیل ہے۔ اس میں انہوں نے دینی سیاست اور موجودہ دور کی ڈپلومیسی کا فرق واضح کیا ہے اور ماضی قریب میں مسلمانوں کے وقتی اتحاد پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے پائدار اسلامی اتحاد کی بنیاد، اس کی ضرورت اور اہمیت ثابت کی ہے۔ پورا مقالہ پڑھنے کے لائق ہے اور اس کے متعدد پیراگراف بہت مدلل، موثر اور ادیبانہ ہیں۔ متحدہ سیرت کمیٹی پٹنہ باقی رہی ہو یا نہ رہی ہو اس کی وہ دعوت آج بھی باقی ہے جو اس مقالے میں دی گئی تھی۔

(تبصرہ ماہنامہ 'زندگی'، رام پور اپریل ۱۹۶۸۔ ع ق)

افتتاحی تقریر

اجتماع حلقہ طلبہ

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

(یہ تقریر حلقہ طلبہ اسلامی، بہار کے ارکان کے اجتماع میں دسمبر ۱۹۷۸ء میں کی گئی)

بعد حمد وصلوٰۃ!

محترم عزیزو! آج کئی سال کے بعد میں اس لائق ہوسکا ہوں کہ آپ کے اس تربیتی اجتماع میں شریک ہوسکوں۔ اس دوران آپ اپنے تربیتی اجتماعات کرتے رہے اور میں اپنی خواہش کے باوجود اس میں شریک نہیں ہوسکا اور شاید پٹنہ میں یہ اجتماع نہ ہوتا تو آج بھی میں شریک نہ ہوسکتا۔

آپ طلباء ہیں اور آپ کے اندر قدرت نے جو Potentiality رکھی ہے اس کا اندازہ اب آپ کو بھی شاید ہوگیا ہوگا۔ پہلے لوگوں کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ ملیشیا میں جو انقلاب آیا اس سے متاثر ہوکر پہلی بار ہندوستان میں جے پرکاش نرائن نے طلباء کی طاقت کا اندازہ لگایا۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ملیشیا میں مسلم طلبہ نے اپنی طاقت کا لوہا منوایا اور جتنی بھر بھی ان کے اندر Awakening (بیداری) تھی اتنا بھر وہ انقلاب لے آئے۔ اس کے بعد یہاں جئے پرکاش نرائن نے ہندوستان کے طلبا کو للکارا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ جانتے ہیں۔ ہم اس طاقت کا اندازہ پہلے سے رکھتے تھے۔ اسی لئے تحریک اسلامی نے شروع ہی سے جبکہ حلقہ طلبہ نام کا کوئی حلقہ باضابطہ قائم نہیں تھا، طلبہ پر خاص توجہ رکھی اور ان میں کام کو بنیادی اہمیت دی۔ پھر میں نے یہ خیال قائم کیا کہ پٹنہ میں چونکہ پچھلا تجربہ یہ رہا کیا ہے کہ طلباء میں کام کیا گیا، اچھی خاصی طاقت فراہم ہوئی مگر پھر وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے منتشر ہو گئے اور اپنے جانشیں نہیں چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بار بار نئے سرے سے یونیورسیٹی اور کالجز میں کام کرنا پڑتا تھا، تو ان تجربوں نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ میں باضابطہ ایک حلقہ قائم کروں تاکہ یہ بیچ میں جو Gap ہو جاتا ہے اس پر قابو پایا جاسکے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس لحاظ سے میرا یہ تجربہ ناکام نہیں بلکہ کامیاب ثابت ہوا اور اس بیچ میں، حالانکہ کئی سال ہو گئے، کوئی Gap (خلاء) پیدا ہونے نہیں پایا۔ البتہ دور سے جو مجھے اندازہ ملتا رہا کیونکہ اس عرصہ میں میں قریب سے آپ کو نہیں دیکھ سکا، وہ یہ تھا کہ تربیتی نقطۂ نظر سے اب پہلے والی بات نہیں رہی ہے اور یہ شکائتیں خود آپ کے رفقاء کی طرف سے بھی مجھ تک پہونچتی رہیں کہ کچھ انحطاط کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ تحریک اسلامی کی اولین دنوں سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس کی طرف غبی طلبا نہیں آتے، بلکہ ذہین طلبا آتے ہیں، عموماً Toppers آتے ہیں اور یہ خصوصیت اس کی اب بھی باقی ہے۔ اس کے باوجود یہ انحطاط کیوں ہوا، اس کے بارے میں میں اب تک کوئی صحیح فیصلہ نہیں کرسکا ہوں۔ میں عنقریب انشاءاللہ آپ کے ذمہ داروں کو بٹھاؤں گا۔ ان سے تبادلۂ خیال کے بعد ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ کھول دے اور اس انحطاط پر قابو پایا جاسکے۔

آپ طلباء ہیں اور بڑی حد تک تحریک اسلامی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے طلباء کی دوسری تحریکوں سے آپ متاثر نہیں ہوئے، ان کا غلط اثر نہیں لیا اور اسلامی خصوصیت کو برقرار رکھا، لیکن اسلامی خصوصیت میں آپ کو جتنا آگے بڑھنا چاہئے تھا اس سلسلے میں یا تو آپ کے جذبے میں کمی آگئی ہے یا تربیتی نظام میں کوئی نقص رہ گیا ہے کہ اب پہلے جیسی بات نہیں پیدا ہو رہی ہے، بہر حال

انشاءاللہ تعالیٰ اس پر قابو پالیا جائے گا۔

عزیزو! آپ کی تربیت ایک تو علمی پہلو سے ہونی چاہئے، یعنی کہ یہ آپ کی صلاحتیں ٹھوس ہوں۔صرف دکھانے کی مصنوعی (Superficial) قسم کی صلاحیتیں اگر آپ کے اندر ابھریں تو آپ تحریک کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہونگے۔آپ کی تحریک عالم گیر پیمانے پر جس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اس مرحلے میں جس Talent کی ضرورت ہوگی وہ آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی تو جس تحریک کو آپ اس منزل میں پہونچانے والے ہیں، اس منزل میں پہونچانے کے بعد ایسا نہ ہو کہ آپ اپنی صلاحیتوں کی کمی کی وجہ سے پیچھے رہ جائیں۔اس لئے آپ کو بالخصوص اپنی علمی استعداد بڑھانے کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔اور علمی استعداد سے میری مراد صرف مذہبی قسم کا علم نہیں ہے، کیونکہ اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور دین اپنے وسیع معنوں میں جو وسیع مفہوم رکھتا ہے وہ بھی آپ جانتے ہیں تو دینی علوم کے لحاظ سے آپ کو اپنے زمانے میں ممتاز ترین لوگ بننا ہے۔آپ کی تربیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ کو اپنا اخلاق و کردار اتنا اعلیٰ وارفع بنانا ہے کہ آپ دوسروں کے لئے رہنما اور شمع ہدایت بن سکیں دراصل یہ توقعات ہیں جن کی خاطر حلقہ طلبہ اسلامی بہار کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی یا آئندہ ہوگی یہ سب محض اللہ تعالیٰ کی توفیق پر موقوف ہے۔ اور اگر ہم خلوص کے ساتھ اس بات کی کوشش میں لگے رہیں تو اللہ تعالیٰ بخیل نہیں ہے کہ وہ توفیق عنایت کرنے میں کوئی کمی کرے گا۔ دراصل جو کوتاہی ہوتی ہے وہ ہماری طرف سے ہوتی ہے، اور جب کوتاہی ہوتی ہے تو توفیق میں کمی ہو جاتی ہے۔ہم جتنا زیادہ توفیق کے طلب گار رہوں اتنا ہی زیادہ ہمیں اپنی کوتاہیوں پر قابو پانا پڑے گا۔

میرے عزیز دوستو! آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا ہمارے طلبا کو ان کے Guardians (سرپرست) یہ کہہ کر Discourage کیا کرتے تھے کہ تم جدھر جا رہے ہو اس کے نتیجے میں تمہارا کیریر خراب ہو جائے گا، تمہارا مستقبل تاریک ہو جائے گا اور تمہاری دنیا برباد ہو جائے گی۔آخرت سے تو انہیں کوئی دل چسپی تھی ہی نہیں کہ وہ اس کے بارے میں کچھ بولتے۔لیکن جن چیزوں کے بارے میں وہ اندیشے ظاہر کرتے تھے، وقت نے اور اللہ تعالیٰ کی اعانت نے ان کے تمام اندیشوں کو غلط ثابت کر دیا۔ہم تو ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم جدھر بلا رہے ہیں یہ کیریر کو بگاڑنے والا راستہ نہیں بلکہ بنانے والا راستہ ہے اور جن راستوں کو وہ کیریر کا بنانے والا سمجھ رہے ہیں وہی دراصل کیریر کو بگاڑنے والا راستہ ہے۔محدود مذہبی معنوں میں اور صرف آخرت کو پیش نظر رکھ کر نہیں بلکہ اس دنیا کو سامنے رکھ کر میں پوری بصیرت سے یہ بات کہتا تھا۔کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ ہمارے لڑکے صلاحیت کے لحاظ سے اپنے ساتھیوں میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔تحریک اسلامی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اگر ایک طرف وہ دین کا شعور پیدا کرتی تھی تو دوسری طرف وہ ان کی علمی استعداد اتنا بلند کر دیتی تھی کہ وہ اپنے معاصر لڑکوں کے مقابلے میں سیکولر تعلیم کے معاملہ میں بھی، جہاں تک اس کو Digest کرنے کا تعلق تھا دوسروں سے زیادہ ڈائجسٹ کرتے تھے اور دوسروں سے زیادہ بہتر طریقے سے Reproduce کر سکتے تھے۔چنانچہ ہمارے لڑکے جس شعبے میں بھی تعلیم کے لئے گئے وہاں انہوں نے اپنی نمایاں حیثیت منوائی، اپنے ساتھیوں میں بھی، اپنے اساتذہ سے بھی اور یونیورسیٹیز کے رزلٹ کے معاملے میں بھی۔یہاں ایک لڑکا ہے جو پوری یونیورسٹی میں میٹریکولیشن میں فرسٹ آیا جبکہ اسی ہزار لڑکے اس سال بیٹھے تھے۔اس طرح میں دیکھ رہا تھا کہ ان کا مستقبل یقیناً تابناک ہے۔پھر میں پوری بصیرت سے یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ مستقبل اب کفر کا نہیں، اسلام کا ہے، اور یہ لڑکے جب اپنی زندگی میں داخل ہونگے تو یقیناً اس وقت انشاءاللہ تعالیٰ یا تو اسلامی انقلاب برپا ہو چکے گا یا ہونے کے قریب ہوگا۔اس لئے خالص دینوی نقطۂ نظر سے بھی ان کا مستقبل تاریک نہیں تابناک ہے۔
آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہماری تحریک کا کوئی لڑکا دوسرے لڑکوں کی طرح پریشان حال نہیں رہا، دربدر کی ٹھوکریں نہیں کھاتا رہا، ملازمت

کے چکر میں پڑ کر وہ بے سہارا بنا نہیں رہا، بلکہ اب تک جتنے بھی لڑکے ہم سے وابستہ رہے ہیں بحمد اللہ وہ اپنی زندگی میں Fit-In ہو گئے ہیں۔ اور اب تو اللہ کے فضل و کرم سے آپ کی تحریک ایسے دور میں داخل ہو گئی ہے کہ وہی شخص جو آنکھ کا بالکل کورا ہو اور مسلمان ہونے کے باوجود نا مسلمان ہو، وہی تحریک اسلامی کے مستقبل سے مایوس ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اب تو کافر طاقتیں بھی اسلام کا لوہا ماننے پر مجبور ہو رہی ہیں اور یہ سمجھ رہی ہیں کہ انہیں اس سے اب Compromise کرنا ہی پڑے گا۔ مجھے یاد ہے، غالباً یہ Twenties کی بات ہے کہ ایک انگریز اور ایک مسلمان ریل میں سفر کر رہے تھے تو انگریز نے کہا کہ "Our Future war is with Islam" یعنی ہماری مستقبل کی جنگ اسلام سے ہے اور پچاس سال کے اندر یہ جنگ چھڑ جائے گی۔ ہم پورا Precaution لے رہے ہیں اور ہم نے یہ طئے کر لیا ہے کہ مسلمانوں کو دنیا کے کسی خطہ میں بھی بالخصوص اسلام کے نام پر منظم ہونے نہیں دیں گے۔ اس وقت جبکہ انگریز کا ستارہ پورے عروج پر تھا، اس کی حکومت میں سورج نہیں ڈوبتا تھا، زمین کے چپہ چپہ پر اور اسکے ہر کلیدی موڑ پر اس کی چوکی قائم تھی، اس نے بھرپور کوشش کی لیکن ٹھیک اس کی ناک کے نیچے اور ناک کے سامنے اسلامی تنظیمیں قائم ہوئیں اور پروان چڑھتی چلی گئیں۔ جس طرح فرعون نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ حضرت موسیٰ کا وجود نہ ہو اور اس کے تخت و تاج کو کوئی خطرہ پیش نہ آئے۔ لیکن اس کی گود میں حضرت موسیٰ پرورش پائے۔ ٹھیک اسی طرح انگریز نے بھی پوری کوشش کی لیکن اس کی ناک کے سامنے اسلامی تحریکیں وجود میں آئیں اور پروان چڑھتی چلی گئیں۔ اس لئے ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ اس کی مشیت اب یہ ہو چکی ہے کہ اسلام کو غالب ہونا ہے۔ اب وہ دور نہیں ہے کہ اسلامی تحریکیں مقامی طور پر اٹھتی تھیں، کچھ طاقت دکھاتی تھیں اور مٹ جاتی تھیں۔ اب تو یہ دور ہے کہ اسلام کو ساری دنیا پر غالب ہونا ہے اور غالب ہونا ہی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب اسے روک نہیں سکتی۔ یہ اللہ کا فیصلہ معلوم ہوتا ہے۔ تو اس وجہ سے آپ خوش نصیب لوگ ہیں کہ ایسے دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس خوش نصیبی کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس لئے آپ پوری یکسوئی اور پورے اعتماد کے ساتھ اسلام کی پوری پوری حمایت کرنے کے لائق اپنے آپ کو بنانے کے لئے تن، من، دھن جو کچھ آپ کے پاس ہے اس سے لگ جائیے، آپ کا مستقبل اسی میں تابناک ہوگا۔ اپنے مستقبل کو بنانا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے یہی راہ باقی رہ گئی ہے۔ اب کفر و نفاق اور تذبذب کی راہ میں نہ تو کوئی Charm باقی رہا ہے اور نہ کوئی امید اس سے وابستہ کی جا سکتی ہے۔ یہ راہیں اب Out Dated ہو چکی ہیں۔ جو کچھ کوتاہی ہوتی ہے وہ دراصل اسی نقطہ نظر سے ہوتی ہے کہ آدمی دور تک نہیں دیکھتا ہے اور اپنے Immediate Future میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا ہوگا؟ ہمارا کیریر خراب ہو جائے گا، ہمارا مستقبل بگڑ جائے گا۔ میرے دوستو! تمہارا کیریر نہ پہلے خراب ہوا اور نہ بگڑا ہے اور نہ اب اس کا امکان ہے۔ البتہ جس چیز کی ضرورت ہے، اور خصوصاً اس تاریکی کے ماحول میں جو بہت مشکل ہے، وہ ہے اپنے اخلاق کو اسلامی اخلاق بنانا۔ لیکن آپ جانتے ہیں تاریک ترین ماحول میں اسلام کا چراغ روشن کیا گیا ہے اور اس میں روشن ترین لوگ ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہی وقت تو ہوتا ہے اپنا کردار اور اخلاق بنانے کا۔ اگر ماحول روشن ہو تو اس میں آپ اپنی روشنی کیا دکھائیں گے۔ تاریک ماحول ہی میں تو روشنی دکھائی جا سکتی ہے۔ اس تاریک ماحول میں اگر آپ اپنے اندر اسلام کی روشنی پیدا کریں اور اسلامی اخلاق کو اجاگر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے اثرات کتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ اب یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے کہ جو محض وعظ کے طور پر کہی جائے، آپ کے تجربے اور مشاہدے کی چیزیں ہیں۔ وقت نہیں ہے ورنہ میں کچھ واقعات بھی آپ کے سامنے رکھ دیتا کہ اسلامی اخلاق کو اپنانے سے آخرت سے پہلے دنیا میں کیا فائدہ ہوتا ہے۔

اس وقت خاص طور پر مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ کی تحریک میں بحمد اللہ اب طالبات بھی آنے لگی ہیں۔ اس لئے اس محاذ

پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ تو ویسے بھی فطری طور پر صنف نازک سمجھی جاتی ہیں اور انہیں سہارا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالخصوص جبکہ نئی نئی وہ ادھر آرہی ہیں وہ آپ کی طرف سے رہنمائی اور تعاون کی زیادہ ضرورت مند ہیں۔ اس محاذ پر کام کو آگے بڑھانے کے لئے آپ اپنی ان رشتہ دار لڑکیوں کی طرف خصوصی توجہ دیجئے جن سے شرعاً آپ سامنے ہوتے ہیں اور وہ آپ کے سامنے ہوتی ہیں۔ اور ان کی طاقت وتوانائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجئے قبل اس کے کہ یہ مرحلہ گذر جائے۔ اپنی ان عزیز طالبات سے بھی میں یہ کہوں گا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا اندازہ لگائیں۔ عموماً وہ اپنے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا رہتی ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر بڑی طاقت رکھی ہے۔ اور وہ جب غلط بات کے لئے اپنی بات اپنے گارجین، اپنے ماں باپ سے منوا سکتی ہیں تو پھر صحیح بات کے لئے وہ اپنی بات کیوں نہیں منوا سکتی ہیں؟ یہاں پر آکر نہ معلوم کیوں وہ کمزور پڑ جاتی ہیں۔ حالانکہ اس موقعہ پر تو انہیں اور جرأت سے کام لینا چاہئے، کیونکہ ان کے پیچھے خدا کا Sanction ہوتا ہے۔ اس واسطے میں ان سے بالخصوص یہ کہوں گا کہ جب اسلام کی طرف وہ آگے بڑھنا چاہتی ہیں اور وہ یہ محسوس کریں کہ چاروں طرف سے ان کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہیں تو ان کو جرأت سے کام لینا چاہئے اور ہمت نہیں ہارنا چاہئے اور اپنے غلط قسم کے مطالبات کو جس طرح وہ منواتی تھیں، صحیح قسم کے مطالبات کو اس سے زیادہ زور کے ساتھ وہ منوائیں۔ آخر کیوں نہیں مانیں گے ان کے گارجین، ان کے والدین، ان کو ماننا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے اور امید ہے کہ وہ آپ کی صلاحیتوں کو اسلام کی راہ میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا اور آپ کو، جیسا کہ وہ خود پسند کرتا ہے، اور ہماری بھی خواہش ہے ویسا، نمونے کا باکردار اسلامی سپاہی بنائے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

☆☆☆☆

افتتاحی تقریر

آل بہار اجتماع جماعت اسلامی

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ

یہ تقریر جماعت اسلامی ہند کے آل بہار اجتماع میں کی گئی تھی۔ جو ۱۱ر تا ۱۳ر اپریل ۱۹۷۹ء کو رام موہن رائے سمنری پٹنہ میں منعقد ہوا تھا۔

اللہ کا بے حد وحساب شکر ہے جس نے ہم کو بغیر کسی استحقاق کے اور بغیر کسی سوال کے وجود بخشا اور وجود کے ساتھ سارے لوازمات بخشے۔ اللہ غفور وشکور ہے اس نے اپنے طور پر جو کچھ بخشا، بخشا اس کے بعد ہم نے جو کچھ سوال کیا اس نے سب کچھ دیا۔ چنانچہ ان سوالوں میں سے ہمارا ایک سوال یہ تھا کہ اس کا پسندیدہ دین یعنی اسلام ہمارے ہاتھوں دنیا میں قائم ہو تو اس نے ہماری اس دعاء کے جواب میں ہمیں توفیق بخشی کہ ہم اقامت دین کی جدوجہد میں حصہ لیں۔ اس کی شان غفوری کا یہ حال ہے کہ ہم گناہ گار بندے گناہ پر گناہ کئے چلے جارہے ہیں اور وہ ہے کہ پیہم بخشے چلا جاتا ہے، اس کی قدر افزائی کا یہ حال ہے کہ ہم اس کی راہ میں کوششوں کا حق تو کیا ادا کریں گے سراپا کوتاہی بنے ہوئے ہیں، پھر بھی اس نے ہماری تمام کوتاہیوں کے باوجود ہماری تحریک کو اسی مرحلے میں پہونچا دیا، جس میں ہم آج ہیں۔

بھائیو اور بہنو! جس دور سے ہم گذر رہے ہیں، اور جس دور میں ہماری تحریک داخل ہو چکی ہے اس دور کو تفصیل سے بیان کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ ہم اور آپ اسی ماحول اور انہیں حالات میں جی رہے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اب سے تقریباً ۴۰ سال پہلے اجتماعی زندگی کے کسی شعبہ میں اسلام کا نام لینا جہاں جرم تھا، وہاں اب اسلام کا نام لئے بغیر ہمارے مخالفوں کو بھی کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ چیز ان حقیر کوششوں کے نتیجے ہی میں سامنے آئی ہے جو ہم سے اللہ تعالیٰ نے کرائی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں یا تو اسلامی نظام کو برپا کرنے کی طلب اور کوشش جاری ہے یا پھر اس کو سمجھنے کی طرف ہمارے مخالفین بھی اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے سنا ہوگا کہ امریکہ کے صدر جمی کارٹر روزانہ کچھ نہ کچھ وقت اسلامی لٹریچر پڑھنے، سمجھنے اور اس کو ہضم کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ اس غرض کے لئے ایک مستقل آدمی اسلامی لٹریچر کا ترجمہ کرنے کے لئے مقرر ہے۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ امریکہ، افریقہ اور یورپ میں اسلام کو سمجھنے کی طرف خاصا رجحان پیدا ہو گیا ہے اور لوگ آہستہ آہستہ اسلام قبول بھی کرتے جارہے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ جہاں کمیونسٹ ڈکٹیٹرشپ ہے وہاں کے آہنی پردے کے پیچھے صورت حال کیا ہے۔ لیکن اتنی بات چھن چھنا کر بہر حال سامنے آہی جاتی ہے کہ وہاں جو مسلمان بستے ہیں ان کے اندر بھی دینی احساس ہے اور اسلامی زندگی کی طرف بڑھنے کا جذبہ ابھرنے لگا ہے۔ چنانچہ یہی بات تھی جس کے سبب روس بوکھلا اٹھا اور اس نے سب سے کمزور، سب سے پسماندہ اور انتہائی نرم چارہ سمجھ کر ایک غیر جانبدار ملک یعنی افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اور اس کی کوشش یہی ہے کہ وہاں بھی اسلام کو مٹا کر کمیونزم کو قائم کر دے مگر اس کے سارے منصوبے غلط ثابت ہوئے اور اس نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ افغانستان کو ہضم کرنا آسان نہیں بلکہ اس کو فرو کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ وہ لوہے کا چنا ثابت ہو رہا ہے۔

آخر مسلمانوں کے اندر دین کے لیے یہ جذبہ اور ان کا دین سے منحرف کیا جانا تقریباً ناممکن کیسے ہوگیا؟ یہ دونوں باتیں تحریک ہی کے نتیجہ میں سامنے آئی ہیں جو اقامت دین کے نام سے تقریباً ۴۰ سال سے چل رہی ہے بلکہ اور زیادہ مدت سے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ہم کو ایسے دور میں پیدا کیا جب کہ اسلام پسپائی کے بعد پھر پیش قدمی کر رہا ہے، اور یہ اللہ کا محض فضل اور احسان ہی ہے کہ اس نے ہم کو اس بات کی توفیق عطا فرمائی کہ اس جدوجہد میں حصہ لیں ورنہ ہمارے ہی زمانہ میں کہیں زیادہ کثیر تعداد میں خاندانی مسلمان ایسے بھی ہیں جو یا تو اقامت دین کی تحریک کے مخالف ہیں یا اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔

محترم ساتھیو! اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا بدلہ اس کے سوا اور کیا ہونا چاہئے کہ ہم بھی احسان کا رویہ اختیار کریں جیسا کہ اللہ نے خود فرمایا۔ ھل جزاء الاحسان الاالاحسان ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ احسان ہماری طرف سے ہوتا اور اس کا بدلہ اللہ کی طرف سے احسان کی شکل میں ملتا۔ لیکن ہو یہی رہا ہے کہ عملاً احسان اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اب ہم سے اس احسان کا تقاضہ اور مطالبہ یہ ہے کہ ہم احسان کا رویہ ادا کریں۔ آپ یقیناً احسان کا وہ مفہوم نہیں لے رہے ہوں گے، جو مفہوم اردو زبان میں لیا جاتا ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہماری حقیر کوششوں کو نوازا اور ان کے اندر ایسی جاذبیت، ایسی کشش، اور ایسا حسن پیدا کیا کہ دنیا کے لوگ اقامت دین کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے دھیرے دھیرے قبول کرتے جارہے ہیں، وہیں ہمیں یہ چاہئے کہ اپنے رویہ اور اپنی پوری زندگی میں ایسا حسن، ایسا جمال اور ایسی کشش پیدا کریں جو اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا مناسب جواب ہو۔ انشاء اللہ بہت جلد ہماری تحریک دعوت کے مرحلے سے گذر کر اب اس دور میں داخل ہو جائے گی جبکہ اس کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ دور اندیشی اور مومنانہ حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس دور کے لئے ہم اپنے آپ کو ابھی سے تیار کرلیں۔ کیونکہ وہ دور اپنے تقاضوں کے ساتھ یکا یک آجائے گا اور اس وقت تیاری کا وقت نہیں رہے گا۔ بلکہ پہلے سے کی ہوئی تیاری کو عملاً بروئے کار لانے کا وقت ہوگا۔ اگر ہم نے اس وقت سے پہلے پہلے تیاری نہیں کی تو ہمارا یہ رویہ تحریک اسلامی کے لئے خدانخواستہ ناکامی کا موجب ہوگا۔ کسی اصولی تحریک کی کامیابی یہی ہے کہ جب اسے نفاذ کا موقع ملے تو وہ اپنی صحیح شکل میں نافذ ہو سکے اور اس کی حقیقی ناکامی یہی ہوتی ہے کہ اسے نفاذ کا موقع ملے تو وہ نافذ نہ ہو سکے اور مسائل حل نہ کر سکے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام دنیا کے مسائل کو حل کرنے کا بڑا دعویٰ لے کر اٹھا، لیکن اس کی ناکامی آج ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اس کی بجائے بلکہ اس کے نتیجہ کے طور پر اشتراکیت نے سر اٹھایا اور اس نے بھی بڑے زور سے دعویٰ کیا، دنیا کے مسائل کا حل ہمارے پاس ہے اور ہمیں اس کا موقع ملنا چاہئے کہ ہم مسائل کو حل کر کے دکھائیں۔ مگر صورت واقعہ یہ ہے کہ کمیونزم عملی میدان میں سرمایہ دارانہ نظام سے بھی زیادہ بودا ثابت ہوا۔ وہ نافذ ہونے سے پہلے ہی ناکام ہوگیا۔ جیسا کہ کسی سرمایہ دار ملک کے نمائندہ نے نہیں بلکہ خود روس کے نمائندہ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ روس میں کمیونزم اب تک قائم نہیں ہو سکا ہے، چنانچہ نافذ ہونے سے پہلے ہی کمیونزم Fail ہوگیا اور اس میں پیوند کاری شروع ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اصول دھیرے دھیرے اس میں قبول کئے جانے لگے ہیں بلکہ یہ کہئے کہ کمیونزم بحیثیت ایک Ideology اور ایک نظریہ کے اب عملاً ختم ہو چکا ہے اور صرف اس کا نام رہ گیا ہے۔ وہ بھی دنیا والوں کو بے وقوف بنانے کے لئے جیسا کہ افغانستان پر روس کی چڑھائی سے ثابت ہوگیا ہے کہ روس اب کسی نظریہ کا علمبردار نہیں رہا بلکہ قومی ریاست (Nation State) ہوگیا ہے جو اسی طرح اپنی توسیع چاہتا ہے جیسے سرمایہ دارانہ نظام کی حامل ریاستیں کرتی رہتی ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب امتحان کے اسی میدان میں ہم کو اتارنے والا ہے۔ ہم اگر اسلام کو اس طرح نافذ کر سکے جس طرح قرون اولیٰ کے مسلمانون نے نافذ کر دیا تھا تو یہ ہماری تحریک کی صحیح معنوں میں کامیابی ہوگی۔ لیکن ہم اگر صرف زبانی

جمع خرچ کرتے رہ گئے اور عملاً اسے نافذ نہ کر سکے جس طرح ہمارے ان اسلاف نے کیا جو بعد میں آئے تو پھر یہ تحریک کی ناکامی ہی نہیں ہوگی بلکہ اسلام کی بدنامی بھی ہوگی۔ اس لئے ہم کو اس وقت خوب اچھی طرح سمجھ لینا ہے کہ ہم تاریخ کے کس مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں، اور تحریک کے کس مقام پر کھڑے ہیں۔ اس وقت ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں، آئندہ کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں اور ان کے لئے ابھی سے ہمیں کیا تیاریاں کرنی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے یا یوں کہئے کہ انسانوں کی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ جس راستہ پر پہلے سے چلتے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ بھی اسی راہ پر چلتے رہیں۔ حالانکہ زندگی کی گاڑی مختلف مرحلوں میں مختلف راہوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ ہر نیا مرحلہ ایک نئی راہ لاتا ہے، جو لوگ اپنے مقصد کے ساتھ شعوری عشق رکھتے ہیں ہر نئی راہ پر اسی ولولے کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ لیکن جن کو اپنے مقصد سے عشق نہیں ہوتا، جن کو اپنے مقصد تک پہونچنے کی راہوں کا علم اور شعور نہیں ہوتا وہ نئی راہ کو اور نئے مرحلے کو دیکھ کر گھبرا اٹھتے ہیں اور اپنی پرانی راہ سے چمٹے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک پیچھے چلی جاتی ہے۔ انسانوں کی یہی کمزوری ہے جس کی بدولت امت مسلمہ پچھلی صدیوں میں Out Dated ہوگئی اور زندگی کی کش مکش گاہ میں وہ دوسری قوموں کی امامت کے لائق نہیں رہی، کیونکہ نئے دور نئے حالات اور نئے تقاضے لے کر آئے اور ہماری امت اپنی پچھلی ڈگر پر چلتی رہی۔

میرے محترم ساتھیو! مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میں یہ بتادوں کہ دنیا کی اس کش مکش گاہ میں جہاں حق اور باطل کی کش مکش ہر آن برپا ہے، برپا رہتی ہے، برپا رہے گی، ذراسی چوک تحریک کو کہاں سے کہاں پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ اور صحیح اقدام اس کو کہاں سے کہاں آگے پہنچا تا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے اندر اسلام کا اور اسلام میں ترجیحات (Priorities) کا جو تناسب اللہ اور اس کے رسول نے طے کر دیا ہے اس کا پورا شعور ہونا چاہئے اور اس معاملے میں ہم کو اپنے آپ پر پورا قابو ہونا چاہئے۔ میں مثال کے لئے صرف ایک بات کہوں گا تاکہ اس کی روشنی میں پوری بات خود بخود آپ کی سمجھ میں آسکے۔ اسلام میں کچھ چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں اور کچھ چیزیں فروعی ہیں۔ بنیادی اہمیت جن چیزوں کو حاصل ہے ان کے معاملے میں اسلام کا واضح حکم یہ ہے کہ کوئی مداہنت برداشت نہ کی جائے اور کسی حال میں ان کے اندر کوئی تبدیلی روا نہ رکھی جائے۔ بخلاف اس کے جو چیزیں فروعی اہمیت رکھتی ہیں ان کے سلسلے میں اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر لچک دیکھنا چاہتا ہے، کیونکہ دراصل وہ فروعی چیزیں ایسی ہیں جو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر دانستہ طور پر لچک دار رکھی گئی ہیں تاکہ جیسے بھی حالات دنیا میں پیدا ہوں ان کے مطابق اسلام کو نافذ (Apply) کیا جا سکے۔ ہوتا یہ ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ایک خاص ڈگر پر چلتے رہنے کی وجہ سے طبیعتیں اس ڈگر پر چلنے کی عادی ہو جاتی ہیں اور جو لچک دار چیزیں ہیں ان کو لوگ اپنے لئے بے لچک بنا لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو چیزیں بنیادی ہیں اور جن کے اندر اللہ نے لچک نہیں رکھی لوگ ان میں لچک پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ الٹی ترتیب دراصل تحریک کے ماننے والوں کو پسماندہ بنا دیتی ہے اور بالآخر انہیں اغیار کا غلام بنا دیتی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ اسلام میں ایک طرف تو عقیدہ کو بنیادی حیثیت دی گئی جن میں کوئی مداہنت برداشت نہیں کی جانی چاہئے اور اللہ اور رسول نے جو واضح عقیدہ دے دیا ہے اسکے اندر کوئی ترمیم گوارہ نہیں کی جانی چاہئے۔ برخلاف اسکے تمدن سے متعلق جو اعمال بتائے گئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے اندر بڑا تنوع اور بڑی لچک ہے۔ مگر جہاں صحابہؓ کرام کا یہ حال تھا کہ وہ بنیاد پر پہاڑ کی طرح جمے رہا کرتے تھے اور فروعات میں بے حد رواداری برتتے تھے اور بہت سارے اختلافات ان کے درمیان ہونے کے باوجود ایک ٹیم کی طرح اسلام کو قائم رکھنے میں ایک دوسرے کے مددگار بنے ہوئے تھے وہاں بعد میں ایسا ہوا کہ بنیادی چیزوں کی اہمیت ختم ہوگئی اور فروعی چیزوں کی اہمیت اتنی زیادہ ہوگئی کہ انہیں کو اصل اسلام سمجھا جانے لگا۔ مزید وضاحت کیلئے یوں سمجھئے کہ اسی ہندوستان میں مختلف فقہی مسلک کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔ انکے فقہی مسلک کو اب یہ اہمیت دے دی گئی ہے

کہ ایک مسلک والے دوسرے مسلک والے کو گویا مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔ آج آپ یہ تصور نہیں کر سکتے کہ ایک مسلک والے دوسرے مسلک کو اپنا امیر، اپنا امام اور اپنا قائد بنالیں گے۔ آپ اپنی تحریک کو نہ سوچئے، اپنی تحریک سے باہر دیکھیے کوئی حنفی کسی اہل حدیث کو اپنا لیڈر نہیں مانے گا اور کوئی اہل حدیث کسی حنفی کو اپنی اجتماعی زندگی کی قیادت نہیں سونپے گا۔ برخلاف اس کے ایک ایسا شخص جو سرے سے اسلام ہی کو نہ مانتا ہو، جو دہریہ ہو اور جو آج کی اصطلاح میں Secular ہو اس کو وہ اپنی زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے اطمینان سے دیدیں گے۔ جن باتوں سے آدمی کافر ہو جاتا ہے ان باتوں پر جمنے والوں کو بلکہ ان باتوں کی تبلیغ کرنے والوں کو، یہاں تک کہ اسلام کو مٹاڈالنے کی کوشش کرنے والوں کو آج ہمارے درمیان مسلمان سمجھا جاتا ہے اور لوگ بے تکلف انہیں اپنا لیڈر اور پیشوا بھی بنالیتے ہیں۔ ایک کمیونسٹ یا سیکولرسٹ (Secularist) کو حنفی بھی اپنا رہنما مان لیتے ہیں اور اہل حدیث بھی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے ہے کہ اللہ اور رسولؐ نے جن چیزوں کو بنیادی اہمت دی تھی ان کو ہم کچھ بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہیں، اور جن چیزوں کو بنیادی اہمیت نہیں دی تھی انہیں پر ہم اسلام کا دارومدار رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی کا خمیازہ ہے جو دنیا کے ہر خطہ میں مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے کہ وہ مشرق سے مغرب تک یورپ یا کمیونسٹوں کے غلام بنادیئے گئے ہیں۔ آج جبکہ تحریک اقامت دین نے ہمارے اندر یہ شعور پیدا کیا ہے کہ ہم اہمیت کے معاملے میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی واضح تعلیمات کو سرمایۂ ہدایت سمجھتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اس شعور پر قائم رہیں، اس شعور کو عام کریں، اس شعور کو باقی رکھیں اور اس شعور کو اپنی بعد کی نسلوں میں منتقل کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری تحریک سے باہر اس ضمن میں جو افراط اور تفریط پائی جاتی ہے اس کے ہم بھی شکار ہو جائیں اور یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے۔ کیونکہ آدمی جب اقامت دین کی جدوجہد میں سست پڑ جاتا ہے تو لازمی طور پر یہی چھوٹی چھوٹی چیزیں اہمیت اختیار کر کے اس پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ دراصل ہمارے جن اسلاف نے اسلام کی کشتی کو ڈبویا وہ اسی کمزوری کا شکار ہو گئے تھے یعنی یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد ان کے دل ودماغ سے محو ہو چکی تھی۔ اور اسی لئے فروعی چیزوں کی اہمیت ان کے اندر اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انہیں میں انہماک کو وہ اصلی اسلام سمجھنے لگے تھے۔ خدانخواستہ ہم بھی اگر اقامت دین کی جدوجہد اور اس کو قائم اور نافذ کرنے کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں کبھی جی چرانے لگے تو یہ بیماری ہمارے اندر بھی لوٹ آسکتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان معاملات میں چوکنا اور ہوشیار رہیں۔ آدمی خالی الذہن نہیں رہ سکتا۔ اہم چیز اگر اس کے ذہن سے نکل جائے تو غیر اہم چیز اس میں لازماً داخل ہو جاتی ہے۔ آدمی بیکار بھی نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ اہم کام میں مشغول رہے گا تو غیر اہم کام کی طرف توجہ کا اس کو موقع نہیں رہے گا۔ لیکن اگر وہ اہم کام سے غفلت برتے گا تو لازمی ہے کہ غیر اہم کام اس کو ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جب ایسا ہوتا ہے تو فرد اور ایسے افراد سے بنی ہوئی قوم پیچھے کی طرف چل پڑتی ہے اور بالآخر ذلت کے گڈھے میں جا گرتی ہے۔

محترم ساتھیو! اس برے انجام سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نسخہ دیا ہے وہ سورہ آل عمران کی اس آیت میں ہے، واعتصموا بحبل الله جميعا و لا تفرقوا ! (اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور الگ الگ فرقے نہ بن جانا) دراصل اسی آیت کو ماقبل کی آیت سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کا تقویٰ ویسا کرو جیسا کہ حق ہے اور ہرگز تمہاری موت نہ آئے مگر صرف اسی حال میں کہ تم مسلم یعنی فرماں بردار ہو۔ اس بات کی ضمانت کیلئے کہ موت جو بغیر کسی وارننگ (پیشگی انتباہ) کے آتی ہے وہ لازماً اللہ کی فرمانبرداری کی حالت میں آئے ان اعمال کا اہتمام انفرادی طور پر تو کیا جاسکتا ہے جن کا تعلق محض فرد کی ذات سے ہے، لیکن جن اعمال میں فرد کو دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنا ناگزیر ہے، ان میں دوسروں کے تعاون کے بغیر وہ اس کا اہتمام اور اس کی طرف سے اطمینان کیسے کر سکتا ہے۔ اس کی تو ایک ہی صورت ہوسکتی ہے کہ اللہ کی

فرماں برداری کے نظام پر ایمان رکھنے والے افراد ایک دوسرے کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے کے لئے باہم مربوط ہوں، تا کہ اگر عام معاشرہ اس معاملہ میں ساتھ دینے کو نہ بھی تیار ہو تو یہ آپس میں مل کر اس اجتماعی یا معاشرتی کام کو اللہ کی ہدایت کے مطابق انجام دے سکیں۔ مثلاً شادی بیاہ کو لے لیجئے، اس معاملے میں ہمارے سماج میں جاہلیت جس طرح گہری جڑوں کے ساتھ پیوست ہوگئی ہے ہم اگر اپنی اولاد کی شادی خالص اللہ اور رسول کی منشاء کے مطابق کرنا چاہیں تو سماج ساتھ نہیں دے گا۔ ایسی صورت میں یا تو ہم اپنی اولاد کو غیر شادی شدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کریں جو نہ صحیح ہے اور نہ ممکن، یا پھر ہم جاہلیت کے آگے سپر ڈال کر اسلامی اصولوں کو خود ہی روندڈالیں۔ اس کے برخلاف اگر ہم خیال لوگوں کی ایک مربوط جماعت موجود ہو تو ہم آپس ہی میں رشتے طے کر کے نہ صرف اسلام کے اصولوں کی پابندی کر سکتے ہیں بلکہ سماج کے لئے عملی نمونہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اسی مثال پر بہت سارے کاموں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ہم عملاً اجتماعیت کے اس شعور کو اپناتے رہیں تو پھر اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خواہ وہ ہماری انفرادی ذات سے متعلق ہو خواہ دوسرے بہت سارے افراد سے متعلق ہو ہم اس بات کا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں کہ موت جس وقت بھی آئے انشاء اللہ اپنے انفرادی اعمال کے لحاظ سے بھی اور دوسرے تمام سماجی اجتماعی معاملات کے لحاظ سے بھی اللہ کے اصول کی پابندی کرتے ہوئے ہم دنیا سے رخصت اور اپنے اللہ کے حضور حاضر ہوں گے۔

یہی انفرادی اور اجتماعی اعمال ہیں جن کو اللہ کے دین کا پابند بنانا ہے۔ یہ پابندی نہ تو آن واحد میں ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی مختصر مدت میں، بلکہ فطرت کے اصول کے مطابق یہ کام لمبا وقت اور تدریج چاہتا ہے۔ یہ تدریج الل ٹپ بھی ہو سکتی ہے مگر کوئی کام جو الل ٹپ کیا جائے وہ بڑے اثرات کا حامل نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کی ہمہ گیری اور تمدن کا مسلسل ارتقاء اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ جو انقلاب بھی مطلوب ہو اس کے لئے کوششیں منصوبہ بند اور مسلسل کی جائیں۔ منصوبہ نہ ہونے سے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اپنی کوششیں آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے کو بے اثر کر دیتی ہیں، اور تسلسل نہ ہونے سے ایک کئے ہوئے کام کے اثرات ماند پڑ جاتے ہیں اور دوبارہ آگے کا سلسلہ شروع کرنے کے لئے پچھلے ہی کام کو نئے سرے سے شروع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یقیناً کوئی پیش رفت نہیں ہو پاتی ہے۔

زندگی میں جو انقلاب یا جو تبدیلی بھی لانے کی کوشش کی جائے ظاہر ہے دنیا میں بے شمار عوامل اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ خود اپنا نفس اور باہر کا ماحول سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ ایسے موقعہ پر اگر آدمی کے اندر اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کا اور ماحول کی ناسازگاری اور مخالفوں کی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں پر صبر کا مادہ نہ ہو تو آدمی پھسل جاتا ہے اور حالات کے آگے سپر ڈال دیتا ہے۔ اس لئے زندگی میں تبدیلی اور انقلاب لانے والی جماعت کے ہر ہر فرد کو صبر و ثبات، پامردی اور استقامت کا پہاڑ ہونا پڑتا ہے۔ تب ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشنودی کا یہ پیغام پہونچتا ہے۔ ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملئكة ان لا تخافوا ولا تحزنوا... الخ (بیشک جو لوگ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے، پھر استقامت دکھاتے ہیں ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ خوف کرو اور نہ غمزدہ ہو۔ اخیر تک) دراصل صبر اور استقامت کا دامن آدمی کے ہاتھ سے اس لئے چھوٹتا ہے کہ وہ ایثار اور قربانی سے شعوری یا غیر شعوری طور پر جی چراتا ہے۔ وہ نہ تو اس بات کے لئے تیار ہوتا ہے کہ اس کو مالی نقصان یا جسمانی اذیت پہنچے اور نہ ہی اس بات کی ہمت کرتا ہے کہ لوگ اپنی تنقیدوں سے اس کا دل چھلنی کریں اور نہ اس بات کے لئے تیار ہوتا ہے کہ سماج کے لوگ اس کو برا بھلا کہیں۔ حالانکہ یہ ساری چیزیں انقلابیوں کے لئے لازمی اور ناگزیر ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ فسوف یات الله بقوم يحبهم ويحبونه..... ولا يخافون لومة لائم. ''اگر تم اس راہ پر نہ ڈٹو

گے اور پھر جاؤ گے تو اللہ کا کام رکا نہیں رہے گا، وہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ بھی اس سے محبت کریں گے۔ اللہ پر سچا ایمان رکھنے والوں کے مقابلے میں نرم اور اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کے مقابلے میں سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں مخالفوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور ملامت کرنے والوں کی ملامت کو خاطر میں لانے والے نہیں ہوں گے۔" یہ وہ اوصاف ہیں جو اقامت دین کی داعی جماعت کے ہر فرد میں رچے بسے ہونے چاہئیں ورنہ اقامت دین کا دعویٰ طفل تسلی اور زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور ناگزیر چیز یہ ہے کہ ہر شخص Self Critic یعنی اپنی ذات پر خود تنقید کرنے والا ہو۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ سے خواہ مخواہ خوش گمان نہ بھی ہو تو غافل ضرور رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا عیب کم ہونے کی بجائے مزید پرورش پاتا اور جڑیں مضبوط کرتا رہتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ بعض لوگوں کا گفتگو کے دوران کچھ سخن تکیہ ہوتا ہے۔ اگر آدمی گفتگو یا تقریر کرتے وقت اپنے الفاظ اور اپنے جملوں پر کڑی نگاہ رکھے تو کوئی سخن تکیہ اس کے اندر جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ یہی حال ہر کام اور ہر معاملہ میں ہوتا ہے۔ اگر آدمی اپنے خیال، اپنی گفتگو اور اپنے کاموں پر اپنی نگاہ کڑی رکھے تو انسانی کمزوریوں کی وجہ سے جو خرابی نمودار ہونے لگتی ہے وہ بڑھنے سے پہلے ہی مٹ جاتی ہے۔ اسی کا نام خود احتسابی (Self Criticism) ہے اور یہ بہترین ذریعۂ تزکیہ ہے۔ پھر اس احتساب کو خود احتسابی سے آگے بڑھ کر احتساب باہمی (Mutual Criticism) بننا چاہئے۔ یعنی ہم ایک دوسرے کا احتساب کرتے رہیں۔ ایک آدمی جو اپنا احتساب نہیں کرتا ہے وہ دوسروں کے احتساب میں اعتدال سے آگے بڑھ جایا کرتا ہے جس کا نتیجہ حسب خواہ نہیں نکلتا۔ وہ خود کو غلطی سے بالاتر سمجھتا ہے، اور دوسروں کا احتساب کسی قدر جذبۂ تحقیر و تذلیل کے ساتھ اور کسی حد تک سخت گیری سے کرتا ہے جس کے نتیجے میں دوسرے کی طرف سے قبولیت کی بجائے نامناسب ردعمل ظاہر ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو آدمی اپنا احتساب کرتا رہتا ہے وہ اپنی بشری کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے، اسلئے اسکے احتساب میں نرمی اور دلسوزی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ خوش آئند ہوتا ہے۔

میرے محترم ساتھیو! یہ وہ باتیں ہیں جن پر اقامت دین کے ہر داعی اور ہر جماعت کی نظر ہر وقت رہنی چاہئے۔ ان کے بغیر نہ فرد کی تعمیر ممکن ہے اور نہ جماعت کا نشو و نما۔ جہاں ان امور کی جانب ہماری خصوصی توجہ رہنی چاہئے اور کسی درجہ میں غفلت و سستی کو راہ نہیں دینا چاہئے وہیں ہماری ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم ان حالات اور مسائل پر نگاہ رکھیں جو ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں اور جن سے ہمارا سماج اور ملک دوچار ہے۔ مسائل سے کنارہ کشی اختیار کر کے نہ تو تحریک اپنی راہ ہموار کر سکتی ہے اور نہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے سکتی ہے۔ ہم کو یہ دیکھتے رہنا چاہئے کہ ہم کو کن مسائل میں فکری رہنمائی کا فریضہ ادا کرنا ہے اور کن مسائل میں عملی رہنمائی کی ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں۔ بطور مثال وقت کے چند ایسے مسائل کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہوں گا جو ہمارے ملک اور سماج کے لئے دردسر بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک لا اینڈ آرڈر کا سنگین مسئلہ ہے۔ کسی بھی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بہت سے زاویے ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنے زاویۂ نظر کے مطابق ہی غور کرتا اور رائے دیتا ہے۔ ہمارا بھی اپنا ایک زاویۂ نظر ہے۔ اور ہمارا زاویۂ نظر یہ ہے کہ ہم کسی مسئلہ کی شاخوں میں نہیں الجھتے بلکہ اس کی جڑ اور بنیاد کی طرف طرف توجہ کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ کی جڑ قانون کا عدم احترام ہے۔ قانون پر عمل ڈنڈے کے زور سے نہیں کرایا جا سکتا۔ کیونکہ ڈنڈے کا زور کچھ دنوں اپنا اثر دکھا بھی دے تو بہت جلد لوگ اس کے خوگر ہو کر نڈر ہو جاتے ہیں۔ پھر ڈنڈے کے وار سے بچنے کی بے شمار راہیں ہوتی ہیں، اس لئے قانون پر عمل ہونے کے لئے یہ بات لازمی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام پایا جائے۔ قانون کی بے احترامی بنیادی طور پر تو اسلئے

ہوتی ہے کہ قانون بنانے والے اور اس کی پابندی کرنے والے دونوں انسان ہی ہوتے ہیں اور قانون بنانے والے کسی لحاظ سے انسانی سطح سے بلند نہیں ہوتے۔ دوسرے بشری کمزوریوں کی وجہ سے وہ اعتدال پر مبنی اور متوازن (Well Balanced) قانون نہیں بناسکتے۔ یہ تو وہ بنیادی سبب ہے جو ہر وضعی قانون (Man Made Law) میں لازماً ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ایک سبب اور ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آزادی کی جنگ کے زمانہ میں ہم نے وقت کے قانون کے احترام کو بری طرح مجروح کیا اور یہ نہیں سوچا کہ کل اگر ہم کو آزادی مل گئی تو قانون شکنی کی یہ عادت ہمارے لئے بھی ویسی ہی مصیبت بن جائے گی جیسی وہ آج بیرونی اقتدار کے لئے ہے۔ نتیجہ یہی نکلا کہ آزادی کے بعد لا اینڈ آرڈر (Law & Order) کا مسئلہ دردسر بن گیا اور اب اسکے حل کی کوئی امید دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ہماری اسلامی تحریک اگر کامیاب ہوجائے تو فطری طور پر یہ مسئلہ خود بخود حل ہوجائے گا اس لئے کہ اسلام کے قوانین انسان کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ خدا کے نازل کردہ ہیں۔ اس لئے ان کو تقدس (Divine Sanctity) بھی حاصل ہے اور وہ مکمل اعتدال کے بھی حامل ہیں۔

دوسرا نمایاں مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات کا ہے۔ اس سلسلے میں بھی سوچنے کے بہت ڈھنگ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ آزادی سے پہلے انگریز اپنی حکومت چلانے کے لئے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے اصول پر کام کرتے تھے اس لئے فسادت ہوتے تھے یا یوں کہئے کہ حکومت فساد کراتی تھی، آزادی کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ یہ تصور محض سادہ لوحی پر مبنی تھا۔ سوال یہ ہے کہ انگریز ایسا کیوں کرتے تھے۔ ایسا کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ملک والوں کو اپنے اعتماد میں نہیں لے سکے کہ وہ اپنے اندر کی آمادگی سے اس کے ساتھ تعاون کرتے اس لئے وہ پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کو ہی آسان نسخہ سمجھتے تھے۔ جب بات یہ ہے تو لازمی ہے کہ جو بھی حکومت ہو اگر وہ عوام کو اپنے اعتماد میں نہ لے سکے تو اس کے لئے یہی آسان راہ کھلی ہوتی ہے کہ وہ فسادات کے مواقع کو ختم کرنے کے بجائے باقی رکھے اور موقع بہ موقع ہوا دیتی رہے۔ اگر ہمارے عوام غور سے اپنی آزادی کے بعد کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ان کو میری اس بات کی صداقت کا یقین ہوجائے گا۔ اس لئے اس مصیبت سے نجات کی ایک ہی راہ ہے کہ ایسے لوگوں کو عوام اپنا سربراہ بنائیں جو ان کو اعتماد میں لے کر حکومت کرنے کے اہل ہوں تاکہ پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی ان کو ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔

تیسرا مسئلہ اونچ نیچ، چھوت چھات اور ذات پات کا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی سوچنے کا عام ڈھنگ سطحی، محض سطحی بلکہ آپ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ بچکانہ ہے۔ اس پر قابو پانے کے لئے ایک انحصار تو قانون سازی پر کیا گیا اور قانون کے احترام کا حال اوپر گذر چکا۔ ظاہر ہے اس کو بے اثر ہونا ہی چاہئے۔ دوسرا انحصار کچھ اصطلاحوں پر کیا گیا، جیسے ڈوم کو مہتر کہا گیا جس کے معنی سردار کے ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ بیچارے ڈوم لوگ سردار ہوتے مہتر کا لفظ ہی ڈوم ہوکر رہ گیا۔ اسی طرح انحصار کے لئے تیسری چیز پروپگنڈہ اور پبلسٹی کو اختیار کیا گیا لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ یہ سب لال بجھکڑوں کا نہیں تو کم از کم طفل تسلی دینے والوں کا طریقہ ہی ہوسکتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس ہندوستان میں ہزار ہزار سال سے مذہب کی بنیاد انہیں اصولوں پر چلی آرہی ہے۔ اور مذہب کی گرفت انسان کے ظاہر پر نہیں بلکہ اس کے دل، دماغ اور اس کی روح پر ہوتی ہے۔ کیا انسانی وجود کے اندر اس حد تک پیوست اور جمی جمائی چیز کو ان اوچھے ہتھیاروں سے کھرچ کر نکالا جاسکتا ہے جو یہاں اختیار کئے جاتے رہے ہیں۔ اس کو تو ایک ایسا مذہب ہی ختم کرسکتا ہے جو سماجی مساوات کا علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ تقدس کے معاملہ میں بھی بلند و برتر ہو اور لوگ اسے شعوری طور پر قبول کرلیں۔ ہمارا دعویٰ بھی یہی ہے اور پچھلی اسلامی تاریخ بھی اس پر گواہ ہے کہ سماجی عدل کے معاملہ میں دنیا کا کوئی بھی مذہب اسلام کا ہم پلہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس لئے ان لعنتوں سے اگر ملک کو چھٹکارا پانا ہے تو اسے چاروناچار اسلام کو اپنانا ہوگا۔ لیکن یہاں بدنصیبی یہ ہے کہ خود

مسلمان جو اسلام کا نام لیتے ہیں وہ ہمسایہ قوم پر اثر انداز ہونے کی بجائے اس سے متاثر ہو گئے اور ان لعنتوں سے ملک کو چھٹکارا دلانے کی بجائے خود ان میں مبتلا ہو گئے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے بہت سارے شعبوں کی طرح سماجی شعبہ کو بھی اسلام سے آزاد سمجھ لیا یا عملاً آزاد کر لیا اور اسلام کو دنیا کے دوسرے مذہبوں کی طرح پوجا پاٹ اور کچھ رسم و رواج کا مذہب سمجھ لیا۔ اس لئے ان لعنتوں سے ملک اور ملکی سماج کو نجات دلانے کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو کتاب و سنت کی روشنی میں مکمل دین کی حیثیت سے بیدار کیا جائے تا کہ وہ جس طرح نماز اور روزہ کے معاملہ میں اسلام سے ادنیٰ انحراف کو برداشت نہیں کرتے بالکل اسی طرح زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کی مکمل پابندی کو اپنے لئے لازمی سمجھیں۔ چھوت چھات کی لعنت تو بحمد اللہ مسلم سماج میں نہیں پیدا ہوئی مگر اونچ نیچ اور ذات پات کی خود ساختہ شریعت ضرور چل پڑی ہے۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہم جماعت اسلامی کے لوگ جن کا شعور اس پہلو سے بیدار ہے وہ عملاً اس راہ میں آگے بڑھ کر کوئی عملی نمونہ پیش نہیں کر سکے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس طرح دینی شعور کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے افراد سوسائٹی کے اندر متعارف اور ممتاز ہیں۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی وہ سوسائٹی میں معروف ہوتے۔ اس سمت میں کچھ کوششیں کی بھی گئیں ہیں تو وہ کوئی خاص قابل ذکر نہیں ہیں۔

ہم نے جب سے اقامت دین کے فریضے کو اپنایا ہے تو ہماری یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ جس حد تک بھی ہمارے لئے ممکن ہو تا جائے ہم خود آگے بڑھ کر اس کے اصولوں کو عملی جامہ پہناتے جائیں، نہ یہ کہ جس روگ میں مسلم سماج مبتلا ہے ہم بھی اس روگ کی پرورش کرتے رہیں۔ آیئے ہم اللہ تعالیٰ سے تازہ عہد کریں کہ ہم اپنے اندر سے تمام جاہلی عصبیتوں کو نکال پھینکیں گے، اور اس سلسلے میں دنیاوی نقصان اور لوگوں کی لعن طعن اور ان کی ملامتوں کی پرواہ کئے بغیر ہم آپس میں مسلمان اور صرف مسلمان کی حیثیت میں تعلقات اور رشتہ داریاں قائم کریں گے تا کہ دنیا کو یہ معلوم ہو سکے، اسلام محض فلسفہ نہیں ہے بلکہ عملی دین ہے، نیز وہ اس پر عمل کرنے کے فوائد کا بھی مشاہدہ کر سکے۔

بہنو اور بھائیو! جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے اسلامی انقلاب اب برپا ہونے لگا ہے، مہلت کم ہے اور کام بہت زیادہ۔ اللہ نے اپنے پسندیدہ انقلاب کے لئے اپنے کروڑوں بندوں اور اور بندیوں میں سے ہمیں منتخب کر کے بڑی سعادت سے نوازا ہے۔ اس سعادت کی قدر کیجئے اور سہولت پسندی ترک کیجئے۔ انقلابیوں کے لئے انقلاب کے سوا کوئی دوسرا ہدف نہیں ہوتا۔ وہ مستقبل سے بے فکر، کیریر (Career) بنانے کے تصور سے بے نیاز، دنیاوی نفع اور نقصان سے بے پرواہ، اپنے دھن کے دھنی، اپنے عزم کے پختہ، سوسائٹی کی کلائی مروڑ ڈالنے کا جذبہ اور حالات کا رخ پھیر دینے کا حوصلہ رکھنے والے، دنیا کا چیلنج قبول کرنے والے باطل کا سرنگوں کرنے کے لئے مرد اور عورت سب کے سب یکساں ولولے سے سرشار، شانہ بشانہ انتھک جدوجہد کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی رگوں میں گرم لہو بہتا ہے۔ عورتیں تو عورتیں انکے بچے تک کی رگ رگ میں انقلاب سرائت کئے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ سرد خون، یہ مصلحت کوشی، یہ سست گامی، یہ دبو پن آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ طوفان کی طرح اٹھئے، سیلاب کی طرح رواں دواں ہونا سیکھئے۔ خدیجہؓ کا ایثار و رفاقت، عائشہؓ کا تبحر علمی اور خطابت، زینبؓ کی خود سپردگی اور ساتھ ہی اپنے حق پر استقامت، ام عمارہؓ کی جاں نثاری، ابوبکر کا صدق، عمر کی صلابت، عثمان کی سخاوت اور علی رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شجاعت کا پرتو اپنے اندر پیدا کیجئے اور تحریک اقامت دین میں اپنا اپنا حصہ ادا کر کے آنے والی نسلوں کے لئے مثال قائم کر جایئے، اللہ ہمارا مددگار ہوگا۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

☆☆☆

سوال نامہ اور اس کا جواب

(جماعت اسلامی ہند کے آل انڈیا اجتماع بمقام حیدرآباد بتاریخ ۲رفروری ۱۹۸۱ء کے موقع پر ایک سوال نامہ اکابرین جماعت کو بھیجا گیا تھا۔ ذیل میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ" امیر جماعت اسلامی حلقہ بہار و رکن مرکزی مجلس شوریٰ کا جواب جو اجتماع کے مجلّہ میں شائع ہوا تھا دیا جا رہا ہے)

(۱) سوال: اسلام کو ایک تحریک کن معنی میں کہا جاتا ہے؟ اسلام کے تاریخی عمل اور اسکی تحریکیت میں کس نوعیت کا ربط ہے؟

جواب: انسانی زندگی میں اسلام اس وقت سے کارفرما ہے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی اور ان کی خلافت کے اعلان کے ساتھ ابلیس اپنا چیلنج لئے مخالفت کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اس زمین پر انسانیت بحیثیت ایک مجموعہ یا کل کے اسی طرح تدریجی ارتقاء سے گزرتی ہوئی آج اس مرحلہ میں ہے جس میں کہ وہ ہے۔ جس طرح ایک فرد بتدریج شیر خوارگی کی عمر سے ترقی کرتا ہوا جوان اور پھر بوڑھا اور بالآخر پیر فرتوت ہو جاتا ہے۔ انسانیت کو ارتقاء کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں بتدریج انبیاء علیہم السلام ہی لاتے رہے ہیں۔ یعنی اسلام ایک عامل کی حیثیت سے انسانیت کو مرحلہ بہ مرحلہ مسلسل مہمیز لگاتا چلا آیا ہے۔ انسانی تاریخ کے اس تسلسل میں صاف نظر آتا ہے کہ ابلیس یعنی باطل طاقت نے ہر مرحلے میں رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ اور انسانیت کے ارتقاء کو اسی طرح پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کی ہے جس طرح ایک فرد کے Smooth نشو و نما میں بیماریاں حارج ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن بیماریوں کی ان رکاوٹوں کے باوجود قدرت کی اس اسکیم کے تحت زندگی کی طاقت اسے بہر حال آگے بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح باطل کی منفی اور محرک کوششوں کے باوجود جب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس زمین پر انسانیت اور انسانی تمدن کا خاتمہ ہو جائے گا، اسلام نے اسے سہارا دیا۔ اور موت وحیات کی کشمکش سے نکال کر صحت اور ترقی کی راہ پر اسے دوبارہ لگا دیا۔

(۲) سوال: تحریک اسلامی میں عملیت (Pragmatism) کا کیا مقام ہے؟

جواب: اسلام کے لفظ ہی میں عمل کا مفہوم چھپا ہوا نہیں بلکہ صاف صاف کھلا ہوا ہے۔ اسلام کوئی فلسفہ، کوئی شاعرانہ تخیل، کوئی سائنسی یا حسابی مفروضہ، توہمات کا کوئی گورکھ دھندہ یا من گھڑت تمناؤں کے سہارے جینے کے لئے کوئی Utopia نہیں ہے۔ اسلام تو ان فطری قوانین کا نام ہے جن کے مطابق یہ کائنات اور کائنات کے اندر انسانی زندگی اپنی کلی حیثیت میں چل سکتی ہے اور چاروناچار چل رہی ہے۔ کائنات سے حرکت وعمل سلب کر لیجئے تو کائنات معدوم ہو جائے۔ اسی طرح انسانی زندگی سے حرکت وعمل کو سلب کر لیا جائے تو اس کا خاتمہ ہو جائے۔ انسانی زندگی میں یہ حرکت وعمل تین قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تقاضائے فطرت کے عین مطابق، دوسرا تقاضائے فطرت کے بالکل خلاف اور تیسرا جزوی طور پر مطابق اور جزوی طور پر خلاف۔ یہ تیسری قسم اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے شمار ہے۔ پہلی قسم ہی مکمل انسانی ارتقاء کی ضامن ہے۔ اور انسانیت کی بقاء کا انحصار بھی اسی پر ہے۔ یہی اسلامی تحریک ہے۔ دوسری قسم اصلاً ایک منفی عمل ہے، اسی لئے اسے جینے کا فطرت کی طرف سے کوئی حق نہیں ہے۔ مگر وہ فطری حقائق میں سے کچھ حقیقتوں کا اور اسلام سے کشمکش کا سہارا لے کر جینے کا حق حاصل کرتا ہے۔ یہی کشمکش ہے جو دونوں کو تحریک میں تبدیل کرنے کا ذمہ دار ہے۔ کشمکش نہ ہو تو نہ اسلام ایک تحریک رہے اور نہ باطل۔ تیسری قسم تو اپنی فطرت میں طفیلی واقع ہوئی ہے اور وہ دراصل کشمکش سے فرار ہی کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ اس لئے اس میں تحریکیت پائے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) سوال: یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ ماضی قریب وبعید میں اکثر اسلامی تحریکات محض مناسب ومبسوط حکمت عملی (Strategy) کے اختیار نہ کرنے کی وجہ کر بارآور نہ ہوسکیں؟

جواب: میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسلامی تحریک حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ہی چل رہی ہے۔ اور مرحلہ بہ مرحلہ اس کی قیادت معمولی انسان نہیں بلکہ انبیاء، علیہم السلام کرتے رہے ہیں جو براہ راست اللہ کی نگرانی میں تحریک کو چلاتے رہے ہیں۔ اس لئے ان کی حکمت عملی (Strategy) میں کسی خامی یا کسی نقص کا شائبہ بھی نہیں پایا جاسکتا۔ اس کے باوجود ظاہری لحاظ سے وہ بہت موقعوں پر ناکام ہوتی رہی۔ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ایک مشیت (Scheme) کے تحت اس دنیا کو چلارہا ہے جس کے تقاضوں کے مطابق کبھی تحریک اسلامی غالب ہوتی رہی اور کبھی باطل تحریکیں غالب ہوتی رہیں۔ اسی طرح امت محمدؐیہ کے اندر ماضی قریب اور ماضی بعید میں اکثر اسلامی تحریکیں اگر بارآور نہ ہوسکیں تو اس کی وجہ میرے نزدیک حکمت عملی کا قصور نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی کلی مشیت کا تقاضا تھا جس کے تحت یا تو ان تحریکوں کو صحیح قسم کے مردان کار میسر نہ ہوسکے یا سازگار حالات تحریک کے لئے قدرت کی طرف سے فراہم نہ کئے گئے۔

(۴) سوال: کیا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ "مظلوم ومحکوم قوتوں کی نشاندہی وتحریک" اسلامی حکمت عملی کا ایک اہم جزرہی ہے اور آج کے دور میں اس جز کو نظر انداز کیا گیا ہے؟

جواب: یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ مظلوم اور محکوم کی حمایت اسلام میں ایک اہم مقام رکھتی ہے لیکن اس مسئلہ کو Issue بناکر تحریک چلانا اسلام کے اپنے فطری (Inherent) اعتدال کو مجروح کرنے والا ہے۔ اس لئے تحریک اسلامی کی حکمت عملی کا اہم جز اسے نہیں ہونا چاہئے۔ ماضی میں اسلام کے علمبرداروں نے اگر کوئی تحریک اس حکمت عملی کے تحت چلائی ہو جس کا مجھے علم نہیں ہے تو اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ اسلام میں جو بگاڑ بھی پیدا ہوتا رہا وہ جزدی نوعیت کا ہی رہا کیا ہے۔ اس لئے اس بگاڑ کو دفع کرنے کے لئے ایک یا چند مسائل کی بنیاد پر تحریکیں چلتی ہوں گی۔ آج جبکہ زندگی میں کلی بگاڑ پیدا ہو چکا ہے اور اسلام ایک کل کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے نہیں ہے بلکہ اسلام کے جن اجزاء پر عمل ہو بھی رہا ہے ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ اس لئے اس دور میں ایک یا چند مسائل کو لے کر تحریک چلانا بالکلیہ غلط ہوگا۔ ایسی حکمت عملی تو ان تحریکوں کے پیش نظر ہوتی ہے جو حقیقی تبدیلی اور اصلاح کی بجائے استحصال (Exploitation) کے لئے چلائی جاتی ہیں۔

(۵) سوال: ہندوستان میں اسلام کو پیش آنے والے حالات ومسائل ملکی سطح پر عموماً اور آپ کی ریاست اور علاقے کے باشندوں کے مخصوص عقاید، احوال ورجحانات کی روشنی میں خصوصاً کیا ہیں؟

جواب: میرے خیال میں ہندوستان میں ملکی سطح پر اسلام کو پیش آنے والے مسائل اور حالات میں بنیادی اہمیت کی حامل: (۱) اسلام سے خود مسلمانوں کی اور اسی لئے غیر مسلموں کی بھی ناواقفیت (۲) مسلمانوں کی طرف سے اسلام کا غلط تعارف (۳) اسلام کی مسلمانوں کے ملی مذہب ہونے کی حیثیت سے نمائندگی (۴) اور حقیقی اسلام کے خلاف حکومت کی منافقت پر مبنی معاندانہ پالیسی، ہیں۔

بہار میں ریاستی سطح پر اسلام کو پیش آنے والے مسائل میں ایک تو مسلمانوں کے اندر ذات اور برادری کا امتیاز، دوسرے غیر مسلموں سے روابط میں فقدان کی حد تک کمی اور اسی لئے ان کی زبان اور ان کی میتھولوجی سے ناواقفیت اور ان کے عملی مسائل سے بے تعلقی ہیں۔

(۶) سوال: کیا یہ خیال درست ہے کہ اسلام کی تاریخ میں ہندوستان کا وجود وحال (Situation) اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد

(Unique) ہے؟اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں؟

جواب: شروع میں جب مسلمان ہندوستان میں آئے اس وقت یہاں کی آبادی میں انتشار تو تھا مگر اپنے مذہب کے ساتھ ان کی وابستگی میں نفاق نہیں تھا۔اس اعتبار سے اس وقت کی صورت حال منفرد کہی جاسکتی ہے کہ یہاں کے سماج میں شدید انتشار کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے ساتھ وابستگی میں نفاق بھی پایا جاتا ہے۔یعنی اسلام کی راہ میں مذہبی عصبیت اپنے حقیقی معنی میں حائل نہیں ہونے والی ہے۔یہاں کا سماج مذہب کے نام پر استحصال کرنے والوں اور استحصال کئے جانے والوں میں بٹ گیا ہے۔اور جن کا استحصال کیا جارہا ہے ان کو اب اس کا شعور بھی ہوگیا ہے۔ماضی قریب میں مسلمانوں کی طرف سے مسلم قوم پرستانہ سیاست کا کھیل اگر نہ کھیلا گیا ہوتا تو آج اسلام کے لئے فضا بڑی سازگار ہوتی۔ضرورت اس کی ہے کہ اسلام کو بہ حیثیت ایک مکمل نظام عدل کے پوری آبادی میں متعارف کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کی غیر مسلم آبادی کو اس پہلو سے مطمئن کیا جائے کہ اسلام کے نام پر مسلمان نام کی جو قوم پائی جاتی ہے اس کی سیاسی بالادستی ہرگز مطلوب نہیں ہے۔

(۷)سوال: آئندہ برصغیر میں اسلام کے بحیثیت ایک اجتماعی نظریہ و نظام غالب آنے کے کیا امکانات ہیں؟

جواب: جواب(۶) میں واضح ہے۔

(۸)سوال: تحریک اسلامی کے ہندوستانی عوام میں نفوذ کی راہیں کیا ہیں؟

جواب: عوام میں تحریک اسلامی کے نفوذ کی راہیں نہیں ہوتیں بلکہ ایک اور صرف ایک راہ ہوتی ہے،وہ ہے تحریک کے علمبرداروں کا اپنے نصب العین کے ساتھ والہانہ تعلق اور اس کے عملی نمونہ بن کر عوام کے ساتھ مخلصانہ ربط رکھنا۔

(۹)سوال: برصغیر و عالم اسلام میں تحریک اسلامی کے ارتقاء میں جماعت اسلامی کا کیا رول ہے؟

جواب: ان کا آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے مسلمان نام کے لوگ اسلام کے نمائندے سمجھے جاتے تھے اور ساتھ ہی اسلام سے ان کی عمومی ناواقفیت کا حال یہ تھا کہ وہ اسلام کو ایک دین کی بجائے ایک مذہب سمجھنے لگے تھے۔ایسی صورت میں ان کے ذہین لوگ اسلام بحیثیت ایک مذہب کو فرسودہ اور out of date سمجھنے لگے تھے اور جو لوگ اسے اپنا آبائی مذہب سمجھ کر محض جذبۂ عقیدت سے اس کے ساتھ وابستہ رہنا چاہتے تھے،وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ہندوستان کی تحریک اسلامی نے ایک طرف اسلام کو ایک کامل اور مکمل دین کی حیثیت سے (جو وہ حقیقت میں ہے) دوبارہ متعارف کرایا اور دلائل کی بنیاد پر ذہنوں کو مطمئن کیا کہ اسلام ایک ازکاررفتہ مذہب نہیں ہے بلکہ رائج الوقت نظاموں کے مقابلہ میں یہ واحد نظام ہے جو دنیا کے سارے مسائل کو فطرت کے عین تقاضے کے مطابق حل کرسکتا ہے،دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ جو افراد اسلام کی اس حیثیت پر ایمان لاتے گئے ان کو اس نے منظم بھی کیا اور تنظیم کی اس طاقت سے اس نے احیائے اسلام کا صور اتنے زور سے پھونکا کہ باطل اپنی سیاسی، مادی اور سائنسی برتری کے باوجود مدافعانہ پوزیشن میں آگیا۔

(۱۰)سوال: کل ہند اجتماعات کا نظریاتی و تحریکی پس منظر،مرکزی خیال(Central theme)اور ان کے مطلوبہ اغراض و مقاصد کیا رہے ہیں اور آئندہ کیا ہونے چاہئیں؟

جواب: ہماری تحریک چونکہ کل ہند پیمانے کی ہے اس لئے اپنے اپنے مقام پر رہتے ہوئے نہ تو اس کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ تحریک اپنے ہمہ جہتی پہلوؤں کے اعتبار سے کس مرحلہ میں ہے اور نہ معروضی مشاہدہ کے بغیر کارکنوں کے اندر کام کی وہ امنگ پیدا ہوسکتی ہے جو اس وقت کے مرحلہ میں پیدا ہونی چاہئے،نہ ہی تحریک کے باہر جو لوگ ہوتے ہیں ان کو اس کا صحیح اندازہ ہو پاتا ہے۔کل ہند پیمانے کے

اجتماعات سے ایک تو عام کارکنوں کو ایک دوسرے کا بالمشافہ تعارف حاصل ہوتا ہے اور تحریک کے اندر پائی جانے والی صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے جس سے آئندہ فائدہ اٹھانے کی تدبیر سوچی جاسکتی ہے۔ کارکنوں کی خامیاں سامنے آتی ہیں جن کو دور کرنے کی تدبیریں سوچنے کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ بڑے اجتماعات میں اچھے خاصے لوگ نظم وضبط کے معاملے میں ڈھیلے پڑ جایا کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی کے کارکنوں کی اس پہلو سے تربیت کا بہترین موقعہ فراہم ہوتا ہے۔ اب چونکہ تحریک اسلامی صرف برصغیر کے اندر محدود نہیں ہے (اگرچہ جماعت اسلامی ہند اس دائرہ میں محدود ہے) اس لئے کل ہند اجتماع کی ایک بڑی غرض یہ بھی ہونی چاہئے کہ عالمگیر تحریک اسلامی کو اس اجتماع سے تقویت حاصل ہو اور وہ اپنی ضرورت کے مطابق برصغیر کی تحریک اسلامی سے استفادہ کرسکیں۔

(۱۱) سوال: حیدرآباد میں جماعت اسلامی ہند کے چھٹے اجتماع سے جماعتی وتحریکی استحکام وتوسیع دعوت کے امکانات کے سلسلے میں آپ کی توقعات کیا ہیں؟

جواب: مسلم قوم پرستانہ سیاست کے نتیجہ میں شمالی ہند میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جو بدگمانیاں بلکہ تلخیاں پیدا ہوگئی ہیں بفضلہٖ تعالیٰ جنوبی ہند میں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ اس لئے کل ہند اجتماع کے ذریعہ جو کچھ بھی پسندیدہ اثر غیر مسلموں پر ڈالا جاسکتا ہے وہ شمالی کی بجائے جنوبی ہند میں زیادہ متوقع ہے۔ اس لئے جنوبی ہند کا ایک عظیم مرکزی شہر ہونے کی حیثیت سے حیدرآباد میں کل ہند اجتماع رکھنا قرین مصلحت ہے۔ تحریک کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ ملک کی غیر مسلم آبادی جو بہت بڑی اکثریت میں بھی ہے اس تحریک کے بارے میں اچھی رائے رکھے۔ لہٰذا اگر جنوبی ہند میں غیر مسلموں کا ذہن تحریک کی طرف سے صاف ہوجائے تو اس کے فوائد اتنے واضح ہیں کہ ان کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۱۲) سوال: کارکنان جماعت اسلامی پر تحریک فکر وعمل کے لئے مجوزہ کل ہند اجتماع کا ممکنہ اور متوقع اثر کیا ہوسکتا ہے؟

جواب: جماعت اسلامی کے کارکن ارکان بھی ہیں اور غیر ارکان بھی، پختہ بھی ہیں اور خام بھی۔ بڑے اجتماعات کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ اس میں شریک ہونے والے افراد روزمرہ کی زندگی میں اگر پابند نظم وضبط زندگی بسر کرنے کے خوگر نہ ہوں تو ان کی طرف سے بڑا بھونڈا مظاہرہ ہوتا ہے جیسے پنج وقتہ نماز کے جو لوگ عادی نہ ہوں، عادتاً نماز تو پڑھتے ہوں مگر وہ بندگی کے خوگر نہ ہوں تو بڑی جماعتوں مین ان کی صفیں مضحکہ خیز حد تک ٹیڑھی ہوجاتی ہیں۔ اب ذہنی، فکری یا عملی لحاظ سے کل ہند اجتماع کے موقعہ پر اگر ہم نے اچھا مظاہرہ کیا تو کارکن نیا جذبۂ عمل لے کر لوٹیں گے۔ اور خدانہ خواستہ مختلف مقامات پر ہماری تربیت خام رہی ہو اور اس کے نتیجہ میں وہاں نامطلوب مظاہرہ ہو تو اجتماع کی تمام ظاہری خوبیوں کے باوجود اس کا حاصل کچھ نہ ہوگا۔

☆☆☆

کو اپنا عمل مرکوز کرنا چاہئے۔

حق کوئی آمیزش قبول نہیں کرتا

ضیاء الہدیٰ

(اگست ۸۱ء کے ماہنامہ "رفیق" میں شائع شدہ تحریکات اسلامی سے متعلق ایک سوال پر ڈاکٹر صاحب کا جواب)

تحریک پر اثر انداز ہونے والے عوامل مثبت ہوں یا منفی دو طرح کے ہوتے ہیں، ظاہری اور پوشیدہ سورۂ روم میں اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے یعلمون ظاهراً من الحيوة الدنيا وهم عن الاخرة هم غفلون (پہلا رکوع) اس میں ایک تو وہ عوامل ہیں جو ظاہر ہیں اور وہ دنیوی زندگی سے متعلق ہیں ان کے مقابلے میں وہ عوامل ہیں جو پوشیدہ ہیں اور اخروی زندگی سے متلق ہیں۔ ظاہر بیں نگاہ ظاہری اور مادی عوامل ہی کو سب کچھ سمجھتی ہے اور اسی میں الجھ کر رہ جاتی ہے مگر فیصلہ کن عوامل یہ نہیں بلکہ دوسرے ہیں اس کی موٹی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ انسانی جسم کتنا ہی طاقتور اور پھرتیلا ہو جس کو دیکھ کر دوسرا آدمی مرعوب ہو جاتا ہے کہ اس کی زد سے بچنا ممکن نہیں ہے مگر وہ جسم ایک مخفی طاقت دماغ سے کنٹرول ہوتا ہے اور ایک کمزور آدمی بھی اگر اس شہ زور آدمی کے دماغ کو اپنے جی میں کر لے تو وہ قوی ہیکل جسم اس کے تابع ہو جائے گا۔ اسی طرح تحریکیں کامیاب اس وقت ہوتی ہیں جب عوام اس کے تابع ہو جائیں مگر عوام اسی وقت تابع ہوتے ہیں جب ان کے ذہنوں کو کوئی تحریک اپنا ہمنوا بنا لیتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اسلام اور باطل کے فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلام کھانٹی اور خالص چیز ہے اس میں ذرا بھی کسی چیز کی آمیزش ہو جائے تو اگر چہ غالب حصہ اسلام کا ہی رہے گا مگر وہ خالص نہیں رہے گا بلکہ غیر خالص ہو جائے گا۔ جو اللہ کو پسند نہیں ہے اور اس لئے وہ باطل نہ بھی ہو تو وہ باطل کے مشابہ ہو جاتا ہے اسی لئے شیطان اس پر راضی ہو جاتا ہے کہ ایک انسان سولہ آنا اسلام کا باغی نہ بھی ہو تو کسی قسم کی آمیزش ہی پر راضی ہو جائے۔ اس بات کو اگر سامنے رکھا جائے تو اسلام بحیثیت تحریک کے عروج و زوال کے حقیقی اسباب آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے کچھ یا بہت سارے اجزاء کو قائم کرنے کی تحریک نہیں چلائی بلکہ آپ کی تحریک کل کے کل اسلام کو قائم کرنے کی تھی چنانچہ وہ قائم ہو گیا۔ باطل نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کشمکش جاری رکھی چنانچہ کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے اس خالص اسلام میں ایک ملاوٹ پیدا کر دی یعنی اس کی سیاست میں بادشاہت کو داخل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بجا طور پر اتنی سی تبدیلی سے خوش ہوا کیونکہ اگر چہ سیاست کے سوا زندگی کے سارے شعبے اسلام کے تابع تھے مگر مسلمانوں پر خالص اسلام کا غلبہ ختم ہو گیا جو در اصل اپنی روح کے اعتبار سے باطل ہی کا غلبہ شمار ہوگا اس کے مقابلے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے جو دفاعی تحریک چلی میرے ناقص خیال میں یہاں بھی بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ غیر شعوری طور پر مسلمانوں کا ذہن یہ سوچنے لگا کہ زندگی کے سارے شعبوں پر تو اسلام کا غلبہ ہے ہی صرف سیاسی شعبہ پر غالب کرنے کے لئے تحریک چلانا کافی ہے۔ اس طرح جزوی تحریک چلانے کی داغ بیل پڑ گئی، جزوی تحریک چاہے وہ چند اجزاء یا بہت سے اجزاء کو قائم کرنے کے لئے ہو وہ اپنی فطرت میں اسلامی نہیں ہوتی بلکہ اسلام کے لئے مفید ہونے کے بجائے مضر ہوتی ہے اسی لئے وقتی طور پر خواہ ایک یا چند جز پر باطل کے حملے کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوتی رہی ہو بحیثیت مجموعی اسلام مسلسل پسپا ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ زندگی کے ایک ایک کر کے ہر شعبے سے باطل نے اسے بے دخل کر دیا۔ ہونا یہ

چاہئے تھا کہ چاہے جتنے اجزا پر بھی باطل نے غلبہ حاصل کرلیا ہو مقابلے میں اٹھائی جانے والی تحریک جزوی نہیں بلکہ کلی ہوتی جیسا کہ انبیاء کرامؑ کا قاعدہ رہا ہے جنہوں نے ہر حال میں اپنی تحریک کی بنیاد یہی رکھی کہ اللہ کی کامل عبادت اور میری بھرپور اطاعت کرو۔

سب سے آخری تحریک جو سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہما نے چلائی اس میں بھی صورت یہی تھی کہ باطل زندگی کا ہمہ گیر تصور لے کر ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے میں لگا ہوا تھا اور ذہنوں کی راہ سے جسموں پر قبضہ حاصل کرنے کی حکمت عملی اپنائے ہوا تھا اس کے مقابلے میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ اسلامی تحریک کی اس طرف توجہ نہیں تھی۔

اس دور میں جب کہ باطل نے پوری زندگی سے اسلام کو بے دخل کر دیا تو شعوری ہو یا غیر شعوری اس سے بحث نہیں بہر حال مسلمانوں کی طرف سے جزوی نہیں بلکہ کل کے کل اسلام کے احیاء اور غلبہ کی تحریکیں مختلف مما لک میں اٹھ کھڑی ہوئیں یہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کی پہلی شرط ہے جو بہر حال پوری ہوتی ہے۔ اب تحریک یا تحریک سے متاثر ہونے والوں کی نگاہ اسلام کے کسی جز یا اجزاء پر مرتکز ہو کر نہیں رہ گئی ہے جو اسلام کی پسپائی کا سبب بنتا رہا ہے بلکہ اب توجہ اور کوشش مکمل اسلام کے لئے ہے۔ یہ تحریکیں ذہنوں کو جیتتی جا رہی ہیں اور یہ ذہن اندھی عقیدت نہیں بلکہ بصیرت کی بنیاد پر اسلام کو قبول کر رہے ہیں اور اس پہلو سے یہ تحریکیں عالمی پیمانے پر مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں۔ علم اور عمل کے پہلو سے زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تحریک اپنی برتری ثابت کرتی جا رہی ہے اور باطل پرستوں سے منواتی چلی جا رہی ہے اس لئے اگر چہ فوری طور پر ہر طرف باطل اور باطل پرستوں کا بالفعل قبضہ ہونے کی وجہ سے تحریک کی راہ میں بے شمار دشواریاں اور رکاوٹیں حائل ہیں مگر حالات کا رجحان صاف صاف بتا رہا ہے کہ مسقبل بعید نہیں بلکہ مستقبل قریب میں حالات غلبہ اسلام کے لئے سازگار ہونے جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ۔

☆☆☆

انقلابی تحریک

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں محمود عالم صاحب، سابق ایڈیٹر ماہنامہ رفیق، پٹنہ نے دین ودانش پبلکیشنز، پٹنہ سے شائع کیا۔
دوسرا ایڈیشن جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اسے ضیاء الہدیٰ صاحب کی نظر ثانی کے بعد راشد نیر صاحب نے ذیلی عنوانات
کے ساتھ از سر نو مرتب کیا اور شمیم احمد اور سعید الحق صاحبان کی معاونت سے امین پبلکیشنز پٹنہ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

الحمدلله الذی هدانا لهذاوما کنا لنهتدی لولا ان هدانالله.

دین قائم ہو جائے اس کی خواہش تو مجھے زمانہ شباب ہی سے رہی مگر اس کا نہج کیا ہو یہ سامنے نہیں تھا۔ چالیس سال سے زیادہ گزرنے کے بعد کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی مگر بحیثیت مجموعی نہج (Process) پھر بھی واضح نہیں تھا۔ کچھ نوجوان اور کچھ سن رسیدہ حضرات اس سلسلہ میں مجھ سے سوال کرتے رہے مگر میں کوئی واضح جواب نہیں دے سکتا تھا، ان کے تقاضوں سے میری پریشانی بڑھتی گئی۔ میں نے سوچا کہ قرآن اپنے مقصد اور مدعا کے معاملہ میں خاموش تو نہیں رہ سکتا اس لئے میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ سورہ والضحیٰ کی آیت ووجدك ضالا فهدیٰ جب خود پڑھتا یا سنتا تو میں اپنے آپ کو اس کا مخاطب تصور کر کے اللہ سے امید باندھتا کہ وہ ضرور یہ گرہ کھول دے گا۔ رفتہ رفتہ بات واضح ہونے لگی جس کو میں تحریری شکل میں اس لئے نہیں لا رہا ہوں کہ جو اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں ان پر کوئی نقد یا تبصرہ پیش نظر ہے (ہر ایک کو اس کے خلوص کے مطابق آخرت میں اجر بہر حال ملے گا) بلکہ اس کا محرک یہ اندیشہ ہے کہ اپنے مقصد یعنی دین کو عملاً قائم کرنے کے حصول میں موجودہ تحریکوں کی شان وشوکت کے باوجود ان کی ناکامی آئندہ نسلوں کو پست ہمت نہ کر دے۔ اس تحریر میں بنیادی نکات اور ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ تفصیلات کا رنگ تو تحریک کے چلنے کے دوران بھرا جاتا ہے۔

یہاں میں ایک بنیادی بات کی نشاندہی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ زمانہ کا چلن اور لوگوں کے رجحانات کو نظر انداز کر کے قرآن کی آیتوں پر معروضی (Objective) انداز میں تدبر کرنا ضروری شرط ہے۔ یہ تدبر جدھر بھی لے جائے اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔ مطالعۂ کائنات کے لئے بھی صحیح نتیجہ پر پہونچنے کے لئے یہ شرط لازم ہے اور اسی کا نام علمی منہاج (Scientific Approach) ہے۔ میں نے یہی انداز اختیار کیا ہے اور جو لوگ بھی اس معاملہ میں بلکہ کسی بھی معاملہ میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیں ان کو یہی کرنا ہو گا۔ اللہ ان کا مددگار ہو گا بشرطیکہ وہ اللہ کے مددگار بن کر اٹھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حق کو غالب کرنے کے لئے جو تحریک اٹھتی ہے اس کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ایک مرحلہ ہوتا ہے جب اس کی ابتداء کی جاتی ہے اور داغ بیل ڈالی جاتی ہے اور دوسرا مرحلہ ہوتا ہے جب وہ تحریک مکمل ہو جاتی ہے۔اس سلسلے میں انبیاء علیہم السلام جو تحریکیں چلاتے رہے ان کی تفصیلات نہ تو تاریخ میں ہیں اور نہ قرآن سے پہلے کے پچھلے الہامی ریکارڈ مستند انداز میں محفوظ ہیں۔ بین الاقوامی دور میں چلائی جانے والی تحریک کی ابتداء حضرت ابراہیمؑ نے کی اور اس کی تکمیل پیغمبر آخرالزماںؐ کے ذریعہ ہوئی۔ یہ تحریک جزوی اصلاح کی نہیں بلکہ کلی انقلاب کی تھی۔چنانچہ حضرات ابراہیمؑ کے بارے میں اللہ نے بتایا:

وجعلھا کلمۃ باقیۃ فی عقبہ ''اور ابراہیمؑ یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا۔'' (الزخرف:۲۸)

یعنی اس سلسلہ کو انہوں نے اپنے بعد آنے والوں کے لئے باقی رکھنے کا انتظام کیا اور پھر انہوں نے مزید یہ دعاء کی:

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم ''اور اے رب، ان لوگوں میں خود انہیں کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو۔'' (البقرہ:۱۲۹)

جس کا مفہوم یہی ہے کہ اس تحریک کو تکمیل تک پہنچانے والا ایک نبی مبعوث کر۔اور ان کی اس کوشش اور اس دعاء کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے خاتم النبیینؐ کو مبعوث کیا۔ان پر دین کو مکمل کیا اور ان کے ذریعہ مکمل انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ کیا جس کے سلسلے میں اللہ نے فرمایا:

ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ''وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کردے۔'' (الصف: ۹)

یہی ''تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کردے'' کا جملہ انقلابی تحریک کی وضاحت کرتا ہے۔

غلبہ حق کی جدوجھد کیوں؟

یہ دنیا اپنے محدود وسائل کے ساتھ ہم انسانوں کے لئے ایک امتحان گاہ، ایک لیبوریٹری (Laboratory) اور ایک تربیت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے تاکہ یہاں سے کامیاب ہو کر آخرت میں اللہ کی طرف سے خودمختار حکومت کے مستحق بن سکیں۔وہ آخرت جس میں کامیاب لوگ جن نعمتوں سے نوازے جائیں گے ان کا صرف دو پہلو جان لینا کافی ہے۔پہلا یہ کہ اللہ تعالےٰ قرآن میں فرماتا ہے:

واذارایت ثم رایت نعیما وملکا کبیرا۔ ''وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سروسامان تمہیں نظر آئے گا۔'' (الدھر :۲۰)

ولکم فیھا ماتشتھی انفسکم ولکم فیھا ماتدعون۔ ''وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی۔'' (حم السجدۃ :۳۱)

اتنے عظیم وسائل اور اتنی عظیم طاقت ملنے کے بعد آدمی پر نشہ نہ چڑھے اور وہ ان کا غلط استعمال نہ کرے اس کی گارنٹی فراہم کئے بغیر وہ مقام انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیسے دیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے تربیت، امتحان اور زبردست چھان بین (Scrutiny) ضروری ہے۔دنیا کی یہ امتحان گاہ اتنی وسعت نہیں رکھتی کہ جتنے انسان پیدا ہو چکے اور آئندہ ہونے والے ہیں سب کے سب ایک ہی وقت میں یہاں داخل کئے جاسکیں اس لئے انسانوں کو قسطوں میں یہاں سے داخل کر کے نکالا جاتا ہے۔چنانچہ اسی لئے

ہر نسل کے لئے ایسے حالات لازماً پیدا کر دئے جاتے ہیں کہ وہ فتنوں، آزمائشوں اور سختیوں سے گذرے تا کہ اپنے اندر کی کمزوریوں پر مرنے سے پہلے قابو پالے، اور اسی لئے حق برپا ہو جانے کے بعد پھر باطل کو موقع دے دیا جاتا ہے کہ وہ اس کی جگہہ لے لے تا کہ ہر نسل تربیت کے کورس سے گذر سکے یعنی باطل سے کش مکش کر کے حق کو دوبارہ برپا کرنے کی کوشش کرے خواہ وہ باطل بہت ہی محدود ہو یا بہت پھیلا ہوا ہو۔

نبی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی تھی کہ اس کا مشن اس کے بعد والے بھی پورا کرتے رہیں۔ چنانچہ نبی آخرؐ کے زمانے میں دین حق سرزمین عرب میں سارے دینوں پر غالب ہو گیا اور اس کے لیے آپؐ اپنا نمونہ چھوڑ گئے۔ اب اس کام کو آگے بڑھا کر ہدایت اور دین حق کو سارے کرہ ارض پر تمام دینوں کے مقابلہ میں غالب کرنے کی کوشش کی ذمہ داری آپؐ کی امت کی ہے۔ یعنی اس امت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کو غالب کرنے کے لئے انقلابی تحریک چلائے اور چلاتی رہے۔ یعنی پورے کرۂ ارض پر حق کے غلبہ کے لئے منصوبہ بند طریقہ پر وہ تحریک چلائے تا کہ ایک نسل میں ہدف حاصل نہ ہو تو اس کا تسلسل ختم نہ ہو بلکہ وہ مسلسل جاری رہے یہاں تک کہ وہ ہدف حاصل ہو جائے۔

تحریکیں اصلاً دو ہی ہوتی ہیں، انقلابی اور اصلاحی۔ ویسے ہمارے ملک میں بلکہ تیسری دنیا میں طرح طرح کی تحریکیں پائی جاتی ہیں مثلاً شخصیتوں کے لئے، بے تکے مقاصد کے لئے یا پیوند کاری (Patchwork) کے لئے چلائی جانے والی تحریکیں۔ اس طرح کی تحریکوں پر گفتگو کرنا اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔

اصلاحی تحریک :

اصلاحی تحریک دراصل بر وقت موجود نظام میں کچھ خلل یا کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہو تو اس کی اصلاح کر کے اس کی زندگی بڑھانے کے لئے چلائی جاتی ہے۔ اگر خرابی معمولی قسم کی ہو تو اس کے لئے تحریک ہلکی پھلکی ہوتی ہے اور اگر بڑی اور پیچیدہ خرابی ہو تو تحریک اسی مناسبت سے بھاری بھرکم ہوتی ہے اور کوششیں سخت کرنی پڑتی ہیں۔ عام طور پر ہمارے زمانے میں اصلاحی تحریکوں کو ہی انقلابی تحریک کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک ہی نظام کو چلانے ک لئے جو تحریکیں شخصیت کے گرد چلتی ہیں ان کو بھی انقلابی کہہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بے تکی پیوند کاری کے کام کو بھی انقلابی تصور کر لیتے ہیں۔

ہمارے دور میں ایک زبردست تحریک اٹھی جس کا نام ہے کمیونسٹ تحریک، اس کو تو باضابطہ اچھے خاصے لوگ انقلاب اور انقلابی تحریک سمجھتے رہے اور اب بھی سمجھتے ہیں، اور اسی طرح یورپ میں جمہوری کوششوں کو جمہوری انقلاب اور انقلابی تحریک کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ کسی حد تک بنیادی اصلاح کی تحریکیں تھیں یعنی مادہ پرستی کا جو نظام رائج تھا چاہے اس کو چرچ چلا رہا ہو (مذہب کا لبادہ اوڑھ کر) یا سرمایہ دارانہ نظام ہو (سیکولرزم کے نام پر)، یہ دونوں اصلاً ایک ہی چیز تھیں یعنی مادہ اور دنیا پرستی۔ جب ان کی خرابی بہت زیادہ بڑھ گئی اور استحصال (Eploitation) حد سے زیادہ ہو گیا تو اسی کی اصلاح کے لئے یہ دونوں تحریکیں اٹھیں تا کہ عوام کو کچھ راحت نصیب ہو اور مادہ پرستی مٹنے نہ پائے. ہم اسے Pseudo-Revolution (شبہہ انقلاب) کہیں گے۔

باطل کے علم برداروں ہی کی طرح حق کے علم بردار بھی یہ غلطی کرتے رہتے ہیں کہ وہ انقلاب اور اصلاح کے فرق کو نہیں سمجھتے جس کی وجہ سے وہ اپنی اصلاحی تحریکوں کو بھی انقلابی تحریک کہہ دیتے ہیں، اور اس طرح معاملہ سلجھنے کے بجائے الجھتا چلا جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی نظام حق میں جب باطل کے لوگ اپنے مقاصد کے تحت گھس آتے ہیں تو وہ اندر سے خرابیاں پیدا کرنے لگتے ہیں۔ نظام تو موجود رہتا ہے مگر اس میں جزوی خرابیاں پیدا کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان جزوی خرابیوں کو دور کرنا تا کہ حق کا نظام

اپنی اصلی شکل میں چلتا رہے دراصل اصلاح کا کام ہے انقلاب کا نہیں۔

انقلابی تحریک :

انقلاب دنیا میں صرف ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے حق کی جگہ باطل کا آجانا یا باطل کی جگہ حق کا آجانا۔ یہ انقلاب دراصل بیخ و بن سمیت ایک نظام کی جگہ دوسرے نظام کو لانا ہوتا ہے اور جو تحریک اس غرض کے لئے چلائی جاتی ہے وہی انقلابی تحریک کہلاتی ہے۔ جب عمومی بگاڑ بڑھتے بڑھتے کسی حق کے نظام کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے تو اس وقت اصلاح کی کوشش بے سود ہوتی ہے، اس وقت انقلاب کی کوشش ناگزیر ہو جاتی ہے، مگر عملاً دشواری یہ پیش آتی کہ لوگ اصلاحی کوششوں ہی کو انقلابی کوشش سمجھنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے انقلابی کوشش ان کی سمجھ میں نہیں آتی اور خاص کر ایسے دور میں جب باطل پوری طرح مسلط ہو چکا ہو انقلاب کے نام کو پوری طرح بدنام کر دیا گیا ہوتا ہے، اس لئے صحیح انقلاب کا نام لینے کی بھی وہ جرأت نہیں کرتے یا اگر جرأت کرتے بھی ہیں تو ان پر شاید یہ بات واضح نہیں ہوتی ہے کہ حق کا انقلاب برپا کرنے کا واقعی Process کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی کوششیں بارآور نہیں ہو پاتیں۔ حق جس کے برپا کرنے کی کوشش کو ہم حقیقی انقلاب کہہ رہے ہیں اس کا نام اسلام ہے۔

حق اور باطل کے طرز عمل کا فرق :

باطل انسانی فطرت اور کائنات کی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اس لئے ایک طرف اس کی تحریک چلانے والوں کو صرف اپنی محدود عقل اور ناقص تجربے پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف اسے مسلط کرنے کے لئے مار دھاڑ، کشت و خون، قرقی ضبطی اور بے شمار قسم کی دھاندلیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ کچھ تو نظام حق کی جگہ پر باطل نظام کو لانے کے لئے واقعی انقلابی کوششوں اور کچھ شبہ انقلاب (Pseudo Revolution) برپا کرنے کے لئے جدوجہد کرنے میں جو زبردست خون خرابہ کرنا پڑا اس کے نتیجہ میں عام ذہن یہ بن گیا کہ انقلاب لازماً خون خرابہ اور بدامنی کی کوششیں چاہتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ نہیں ہے کیوں کہ انقلاب واقعتاً اس وقت تک برپا نہیں ہوسکتا جب تک لوگوں کا دل اس انقلاب کے لئے مسخر نہ ہو جائے، اور دل دھاندلی، دھونس، کشت و خون، طاقت کے استعمال سے مسخر نہیں ہوا کرتا۔ دل تو لازماً اخلاق اور ہمدردی ہی سے مسخر ہوتا ہے جس میں دھونس یا طاقت کا استعمال نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں ہے بلکہ الٹا اثر کرنے والا ہوتا ہے۔ مگر باطل کی مجبوری یہ ہے کہ فطرت سے متصادم ہونے کی وجہ سے دلوں کو اپیل کر نہیں سکتا، زیادہ سے زیادہ دماغ کو متاثر کر سکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ جبر و ظلم کے سہارے لوگوں کے جسم پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ باطل جب ایک نام سے روشناس ہو کر بدنام ہو جاتا ہے تو چولا بدل کر دوسرے نام سے آجاتا ہے، اور اس طرح اپنی زندگی کی مہلت بڑھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور یہ مہلت اس کو اس وقت تک ملتی رہتی ہے جب تک حق میدان میں نہیں آجاتا۔

باطل کے مقابلے میں جب حق میدان میں آجاتا ہے تو باطل اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا اور وہ وسائل اور عوام کے استحصال سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوسکتا۔ اس لئے حق کے علم برداروں کو سخت کش مکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالاں کہ حق انسانی فطرت اور کائنات کی فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے براہ راست لوگوں کے دل سے اپیل کرتا ہے اور لوگ اسے راضی خوشی قبول کرتے ہیں۔ اس لئے خود ان کی طرف سے طاقت کے استعمال کا سوال تو اس لئے پیدا ہی نہیں ہوسکتا کہ طاقت ان کے پاس سرے سے ہوتی ہی نہیں ہے اور دوسرے ہتھکنڈوں کو ان کی ضرورت نہیں ہے مثلاً پروپگنڈا اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں۔ ان کا سارا زور اپنی دعوت لوگوں کے دل میں اتار دینے کی کوشش پر صرف ہوتا ہے۔ اور اسی کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے باطل بے شمار ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، اور اس طرح حق اور باطل کے درمیان کش مکش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اسلام نے کبھی نہ تو چولا بدلا اور نہ اپنا نام بدلا، اگر چہ جب سے دنیا میں انسان ہے تب سے بار بار باطل اور حق کے بیچ کا چکر چل رہا ہے اور اسلام کے علمبردار مختلف زمانوں مختلف قوموں اور مختلف زبانوں میں اس کو برپا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مگر انہوں نے ہمیشہ اس کو اسلام ہی کا نام دیا ہے چاہے ان کی زبان میں اسلام کا لفظ نہ ہو مگر جو لفظ بھی اسلام کے مفہوم کا حامل رہا اسی لفظ کو اپنی انقلابی تحریک کا عنوان بنایا۔

اسلام کائنات کے خالق اور مالک خدا کے حکموں پر اس کے پیغمبروں کے نمونے کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے نتیجے میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے اور آخرت میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ اسلام کے مطابق اس دنیا میں انسانوں کو خدا کی نیابت (Vicegerency) کے اختیارات دے کر بھیجا گیا تا کہ اپنے ان اختیارات کو خدا کے نائب (Viceroy) کی حیثیت سے چند دنوں اپنی زندگی کی مہلت میں صحیح طور پر استعمال کر کے اپنا استحقاق ثابت کر دے تو آخرت میں اس کو اس سے زیادہ طاقت (Power) یعنی (Autonomy) دے کر نوازا جائے، یا وہ اگر نمک حرامی کا راستہ اختیار کرے تو اپنی مدت پوری کرنے کے بعد جو اختیارات ملے ہوئے ہیں وہ اس سے چھین لئے جائیں اور اپنی غداری کا آیندہ وہ مزہ چکھتا رہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر انسان کے لئے عام ہے چاہے وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، کسی قوم یا نسل میں پیدا ہوا ہو، کسی ملک یا کسی زمانے میں اس نے آنکھ کھولی ہو، وہ ایک عامی انسان ہو یا دولت اور اقتدار کا مالک ہو۔ ہر ایک سے اس کی یہی اپیل ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر کے اپنے زندگی کو اس کے مطابق گزار کر دنیا سے جائے۔ اس میں کسی بھی کش مکش کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، مگر برا ہو انسان کی کم نگاہی کا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ ان حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے اس کو گھاٹا ہوگا اور اس لئے وہ مزاحمت شروع کر دیتا ہے۔

باطل کے علم برداروں کے برعکس جن کے پاس کوئی حقیقی رہنمائی نہیں ہے اور جنہیں اپنی خواہشوں سے مغلوب ناقص عقل اور سطحی تجربوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے، ہمارے پاس الہامی رہنمائی موجود ہے۔ ہم بے لنگر کے جہاز پر سوار نہیں ہیں کہ حالات کا تھپیڑا جدھر چاہے ہم کو لے جائے۔ ہم کو ہر مرحلے اور ہر موڑ پر صحیح رہنمائی فراہم کرتے رہنے کے لئے عالم الغیب خدا نے ایک مجموعہ ہدایت یعنی قرآن اور اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہ صرف یہ کہ عطا کر دی ہے بلکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لی ہے۔ اس لئے ہم دیکھیں کہ اسلامی انقلاب کیسے برپا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے اور اس میں رخنے کیسے پیدا کئے جاتے ہیں اور برپا ہو چکنے کے بعد اس کی حفاظت کس طرح اور کس حد تک کی جا سکتی ہے۔

حق یعنی اسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین خالص ہے جو اپنے اندر معمولی آمیزش بھی گوارہ نہیں کرتا۔ جیسے خالص دودھ ہو۔ اس میں ایک قطرہ بھی دوسری چیز ملا دی جائے تو اگر چہ بظاہر کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا مگر بہر حال وہ خالص نہیں رہے گا۔ اس لئے حق اپنے آپ قائم رہتا ہے اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اس کے مقابلے میں باطل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خالص ہوتا ہی نہیں ہے یعنی حق کا کچھ نہ کچھ سہارا اس کو لینا ہی پڑتا ہے، اسی لئے وہ اس پر بھی راضی ہو جاتا ہے کہ ننانوے فی صد حق سہی ایک فی صد یا اس سے بھی کم باطل اس میں آمیز کر دیا جائے تو وہ باطل ہو جائے گا۔

اور اسی لئے باطل کی کوئی ایک متعین صورت نہیں ہے بلکہ اس کی بے شمار قسمیں ہیں اور اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا :''الکفر ملۃ واحدہ'' جس کا مفہوم یہ ہے کہ کفر چاہے کتنی ہی قسموں کا ہو سب کا فرانہ طریقہ ہی ہے اور اس کے ماننے والے حق کے مقابلے میں سب ایک ہیں۔ چنانچہ باطل نظام کو چلانے والے ایک طرف تو مجبور ہوتے ہیں کہ توحید خالص اور آخرت پسندی کو کسی قیمت پر گوارا نہ کریں اور دنیا ہی ان کی سارے کوششوں کا ہدف ہو دوسری طرف وہ اس بات کے لئے بھی مجبور ہوتے ہیں کہ حق کا کچھ

حصہ اپنے باطل میں ملائیں تاکہ اس کے سہارے ان کا باطل نظام چلتا رہے اور دنیا والوں کو اسی کا حوالہ دے کر باطل کے ساتھ جوڑے رکھا جائے۔

اسلام اور دیگر اجتماعی نظام:

انسان کی اجتماعیت کی پہلی اینٹ (اکائی) ماں باپ اور ان کی اولاد ہوتے ہیں۔ اجتماعیت کے لئے ایک سربراہ ہونا لازمی ہے، چنانچہ اس پہلی اینٹ کے لئے باپ کو سربراہ قرار دیا گیا۔ باپ اور ماں دونوں مل کر نہ صرف یہ کہ بچوں کی شیرازہ بندی کئے رہتے ہیں بلکہ ان سے محبت بھی کرتے ہیں۔ ماں باپ کا یہ مقام اور اپنی اولاد کے لئے ماَمتا اور شفقت بھری نگہداشت ان کے خالق مجازی ہونے کی بنا پر ایک فطری امر ہے جو اللہ نے خود خلاق حقیقی اور احسن الخالقین ہونے اور اپنے بندوں کے لئے بے انتہا الرحم الراحمین ہونے کی وجہ سے بطور پرتو کے ان کے اندر رکھا ہے۔ ماں باپ اور اولاد سے بنی یہ اجتماعی اکائیاں جب جمع ہوگئیں تو انسانیت قبائلی دور میں داخل ہوگئی اور ہر قبیلہ کے نظم ونسق کو چلانے اور اس کے افراد کو شیرازہ بندی کے لئے ایک سربراہ کی ضرورت ہوئی جو قبیلہ کا سردار کہلایا۔ پھر تیسرا دور آیا جب بہت سے قبائل کی آپسی رضامندی سے مل جانے یا ایک قبیلے کے ذریعہ دوسرے کو دبا دینے کی وجہ کر ایک مرکزیت وجود میں آجاتی تھی۔ یہ مرکزیت جس شخص کے اندر ہوتی تھی اس کو بادشاہ کہا جاتا تھا۔ اور اس کی بادشاہت کے اندر رہنے والے سارے قبائل مل کر ایک قوم کہلاتے تھے۔ ابتدائی زمانوں میں یہ قومیں ایک دوسرے سے فاصلوں پر ہونے اور رسل ورسائل کی کمی کی وجہ سے اپنے اپنے علاقہ میں محدود تھیں مگر جیسے جیسے وسائل بڑھتے گئے اور تمدن ترقی کرتا گیا ویسے ویسے ان قوموں کے باہمی تعلقات بڑھنے لگے اور بین الاقوامیت کا دور آ گیا۔ ابھی ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں اس سے آگے مثلاً بین السیارگانی (Interplanetary) دور میں انسانی تمدن داخل ہوجائے۔ بہر حال اب تک انسانی تہذیب اور تمدن کو چلانے کے لئے انسانوں نے بطور خود زندگی کے جو نظام تجویز کئے ہیں وہ مختصراً قبائلی سرداری، بادشاہت (Monarchy) آمریت (Dictatorship) اور جمہوریت (Democracy) ہے مگر انسانی عقل اور تجربہ کی بنیاد پر تجویز کئے ہوئے یہ سارے نظام کبھی بھی ان کے دکھ کا مداوا نہ ہوسکے۔ ان کے برعکس اسلام جو خالق کائنات کا بنایا ہوا طریقۂ زندگی ہے ہر دور میں وہی اور صرف وہی اپنے زیر اثر لوگوں کو فوز وفلاح سے ہمکنار کرتا رہا ہے۔

جس دور میں جو نظام غالب ہوجاتا ہے دنیا والے اس سے مرعوب ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ جس زمانہ میں بادشاہت کا زور تھا اس زمانے میں مسلمانوں کے بھی عوام وخواص اسی سے مرعوب تھے اور ''السلطان ظل اللہ'' کہا کرتے تھے۔ اور سلطان سے ان کی مراد بادشاہ ہوتا تھا یعنی بادشاہ کو اللہ کا سایہ سمجھتے تھے۔ پھر جب ڈکٹیٹری کامیاب ہونے لگی تو اس سے مرعوب ہوکر کہنے لگے کہ ڈکٹیٹرشپ ہی اسلام میں ہے۔ جب ڈکٹیٹرشپ کو دنیا والوں نے رد کردیا اور جمہوریت کا چرچا ہونے لگا تو جہاں آمرانہ نظام بھی تھا جیسے روس اور چین اس کو بھی جمہوریت ہی کہتے رہے۔ اور مسلمان تو اسی کو عین اسلامی نظام سمجھنے لگے۔ اگر کچھ فرق کیا تو ''اسلامی جمہوریت'' کی بات کرنے لگے، حالاں کہ یہ ویسی ہی مہمل اصطلاح ہے جیسے کہا جائے ''اسلامی شرک''، ''اسلامی کفر''، ''اسلامی شہنشاہیت'' اور ''اسلامی ڈکٹیٹرشپ''۔ بات یہ ہے کہ بادشاہت ہو یا آمریت، اشتراکیت ہو یا سرمایہ داری ہر ایک، ایک مستقل نظام ہے۔ اسی طرح جمہوریت بھی ایک مستقل نظام ہے اور ان سب کی بنیاد خدا سے بے نیازی یا اس کے انکار پر ہے۔ اور یہ سب اور ان کے علاوہ جتنے بھی نظام ہوسکتے ہیں سب کے سب ''ملت واحدہ'' ہیں۔ ان کے مقابلے میں اسلام ایک مستقل نظام ہے جس میں نہ بادشاہت کی، نہ آمریت کی، نہ اشتراکیت اور نہ سرمایہ داری کی اور نہ ہی جمہوریت کی گنجائش ہے۔

طریقۂ جمہوری اور نظریۂ جمہوری کی پوشیدہ حقیقت:

یہ بات کسی حد تک صحیح ہوسکتی ہے کہ باطل نظاموں میں جمہوریت سبھوں سے کم ظالم ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ نظام حق ہوجائے یا نظام حق کا بدل بن جائے اور مسلمان اس کی توصیف کے گن گانے لگیں۔ مغربی نظام زندگی میں گہری بصیرت رکھنے والے شاعر مشرق نے جمہوریت جو کا نقشہ کھینچا ہے وہ یہ ہے:

''دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب''

غیر مسلموں کے لئے تو واقعی مجبوری ہے کہ وہ خدا کے اقتدار اعلیٰ کو قبول نہیں کرسکتے اور اقتدار وقت کے ظلم اور قہر سے بچنے کی خواہش ان کا فطری تقاضا ہے۔ اس صورت میں جب ان کے سوچنے سمجھنے والوں نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے نظام زندگی پر غور کیا تو وہ اسلام کی بنیاد کو رد کرتے ہوئے جہاں تک پہنچ سکتے تھے وہ وہی مقام ہے جس کو جمہوریت کہتے ہیں۔ ان کی عقل اس سے بہتر نظام تجویز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ لیکن کہاں اسلام اور کہاں جمہوریت، دونوں کا کوئی موازنہ ہی نہیں ہوسکتا، چہ جائیکہ دونوں میں پیوند کاری کی کوشش کی جائے۔ جمہوریت کی بنیاد جمہور کے اقتدار اعلیٰ پر ہے۔ اسلام کی بنیاد اللہ اور صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ پر ہے۔ یعنی جہاں بادشاہی نظام میں بادشاہ خدا کا مدمقابل ہوتا ہے اور آمرانہ نظام میں ڈکٹیٹر اللہ کا مدمقابل ہوتا ہے وہاں جمہوریت میں جمہور (People) خدا کے مدمقابل ہوتے ہیں۔ اسلام میں خدا فی الواقع وحدہ لاشریک اور اس کی حکومت غیر محدود ہے۔ جمہوریت میں جمہور اور ان کی ریاست غیر محدود فرض کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر بات نہیں بنتی ہے۔ گویا ریاست (State) اسی طرح ایک بت ہے جس طرح بت پرستوں کے مٹی یا دھات کے بت ہوتے ہیں جن کے اندر خدائی ہوتی تو نہیں مگر فرض کرلی جاتی ہے۔

انسانوں کو ان کی عقل نے جمہوریت کی راہ دکھائی مگر جمہور تو انتظام ملکی چلا نہیں سکتے، اس کے لئے تو اختیارات کا ارتکاز ضروری ہے۔ اس لئے طاقت کو ایک جگہ مرکوز کرنے کے واسطے Adult Franchise (بالغ رائے دہندگی) کا طریقہ انہیں اختیار کرنا پڑا۔ ہر قوم میں سادہ لوح عوام کی اکثریت ہوتی ہے اور کچھ لوگ چالاک ہوتے ہیں۔ چنانچہ طاقت کے اس مرکز پر قبضہ کرنے کے لئے ہمیشہ یہی چالاک لوگ سادہ لوح عوام کو بیوقوف بناتے رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں جتنی خرابیاں جمہوریت کے تحت زندگی گذارنے والوں کے اندر پیدا ہوچکی ہیں اور آئندہ ہونے والی ہیں اس کو بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں بالغ رائے دہندگی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس لئے جہاں دوسرے سارے نظاموں سے لوگ گھبرا اٹھے وہیں اب جمہوریت سے بھی لوگ گھبرانے لگے ہیں۔ چنانچہ بقول چرچل ''دنیا کا بدترین نظام جمہوریت ہے''۔ لیکن مغرب کے ذہنی غلام مسلمان لوگ جس طرح ہر چیز دیر کے بعد وہاں سے درآمد کرتے ہیں اسی طرح ابھی وہ جمہوریت کے گن گانے ہی کے دور میں ہیں اور اس کی بدتری شائد اسی وقت ان کی سمجھ میں آئے گی جب مغرب والے اس کو مکمل طلاق دیدیں گے، کیونکہ بین الاقوامی معاملات میں تو مغرب اب جمہوریت کو واضح طور سے رد کرچکا ہے۔ مسلمانوں کو جمہوریت کی یہ اصل حقیقت شائد اس وقت سمجھ میں آئے گی جب اس کا سمجھ میں آنا زیادہ مفید نہ ہوگا۔

اسلامی اجتماعیت اور اسکی قیادت:

اسلام میں بادشاہت اللہ کی ہے اور قانون بنانے کا حق اسی کو ہے۔ انسان بندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا صرف خلیفہ ہے۔ اس لئے اللہ کی بادشاہت اور اسی کے قانون کو نافذ کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ البتہ جتنا بھر ضمنی قوانین (By Laws) بنانے کا اختیار خود اللہ نے اسے دے رکھا ہے اس حد کے اندر یہ ضمنی قانون بنا سکتا ہے۔ چنانچہ اس دوغرض (یعنی اس کی بادشاہت کا نفاذ اور ضمنی قوانین بنانا) کے لئے جو System ہونا چاہئے وہ بھی اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کردیا ہے۔

اسلامی انقلاب کا پہلا دور:

جب انقلاب کو برپا کرنا ہوتا ہے اس کے لئے قیادت یعنی Leadership مصنوعی طور پر نہیں ابھاری جاسکتی بلکہ وہ فطری ہوتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو انقلابی بصیرت رکھتا ہے وہ اس تحریک کی ابتداء کرتا ہے اور جو صالح لوگ اس کی شخصیت، اس کی بصیرت اور اس کے کردار پر اعتماد کرتے ہیں وہ لبیک کہتے ہوئے اس کے گرد جمع ہوتے جاتے ہیں اور وہ فطری طور پر ان کا قائد ہو جاتا ہے، نہ یہ کہ وہ کچھ ہم خیالوں کو جمع کرے اور ان کو یہ قانونی حق دے کہ وہ اپنے ووٹ کے ذریعہ جس کو چاہیں اپنا لیڈر (قائد) بنالیں۔ باطل کی انقلابی تحریک ہو یا حق کی، یہی ہوتا ہے اور فطری طور پر یہی ہوسکتا ہے۔ اس دوران وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ تو کرتا ہے اور اسے کرنا بھی چاہیئے مگر ان مشوروں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی ہے کہ اس طرح مسائل کے مختلف پہلو سامنے آجائیں جو صرف ایک دماغ کے لئے عام طور پر ممکن نہیں ہے، پھر ان کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا حق قائد ہی کو ہوتا ہے۔ ساتھیوں کا مشورہ، مشورہ ہی ہوتا ہے حکم نہیں۔ قائد کے ان فیصلوں سے جو مطمئن ہوں وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور انقلابی جدوجہد میں اس کے ہر حکم پر لبیک کہتے ہیں اور اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ جن کو اس پر اعتماد نہ رہے یا اس کے طریقہ کار سے اختلاف ہو وہ اگر دیانت دار ہوتے ہیں تو خود سے الگ ہو جاتے ہیں ورنہ قائد کو ان کا اخراج (Purging) کر دینا چاہیئے۔ ورنہ تحریک کی منزل کھوٹی ہو کر رہے گی۔

اسلامی انقلاب کا دوسرا دور:

جب انقلاب برپا ہوچکے اور اب اس کو مستحکم اور قائم (Establish) کرنے کا مرحلہ ہو اس وقت بھی قیادت (Leadership) مصنوعی طور پر اوپر نہیں آتی اور نہ ایسا ہونا چاہیئے، ورنہ اس کا زیادہ امکان ہے کہ پچھلے مرحلہ کی کوشش برباد ہو جائے اور جس چیز کے لئے وہ کوشش کی گئی تھی وہ تو قائم نہ ہو، اس نام پر کوئی دوسری چیز قائم ہو جائے۔ اس مرحلہ میں بھی قائد کو پہلے سے زیادہ مشوروں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اب بھی وہ مشورے بس مشورے ہوتے ہیں، حکم نہیں۔ قائد مشورہ لینے کا تو پابند ہے لیکن قبول کرنے کا پابند نہیں ہے، بلکہ ان مشوروں کی روشنی میں معاملہ کا فیصلہ اسے ہی کرنا ہوتا ہے اور تمام لوگوں کو (بشمول مشیر) اس کی اطاعت کرنی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جس طرح قائد کا چناؤ نہیں ہوتا اسی طرح مشورہ دینے والوں کا بھی چناؤ نہیں ہوتا ہے۔ البتہ اسلام نے قائد کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ نہ تو کفار اور منافقین کو اعتماد (Confidence) میں لے اور نہ ہی مومنین میں سے بے سمجھ لوگوں کو۔ مومنین کے اندر جو سوجھ بوجھ والے لوگ ہیں ان میں سے حسب ضرورت جن کو وہ چاہے مشورہ لینے کے لئے طلب کرلے۔ چنانچہ اسلام میں بالغ رائے دہندگی (Adult Franchise) کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے جس میں اکثریت کی رائے فیصلہ کن مانی جاتی ہے۔ زمین پر آباد اکثریت ہر زمانہ میں سادہ لوحوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کو عام طور سے مفاد پرست اور چالاک لوگ بیوقوف بناتے اور ان کو شعوری یا بے شعوری طور پر اپنا آلۂ کار بنالیتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے کہا:

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل الله "اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔" (الانعام: ۱۱۶)

قائد اول تو فطری قائد ہوتا ہی ہے، اس کے بعد اس کے جانشین کی حیثیت اس جیسی تو نہیں ہوتی مگر وہ بھی اس طرح سے قائد نہیں بنتا کہ عوام نے (Election) کے ذریعہ اسے اپنا قائد (Leader) مانا ہو بلکہ اس کا انتخاب السابقون الاولون اور ان کے نقش قدم پر حسین طریقہ سے چلنے والے بعد میں آنے والے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ صرف انہی کے اندر کے منتخب لوگ (جو اپنے

کارناموں کی وجہ سے نمایاں ہوجاتے ہیں نہ کہ عوام یا خواص کے ووٹوں سے) قائد کا انتخاب کرتے ہیں۔ پھر جس قائد کا اس طرح انتخاب ہوجاتا ہے اس کی اطاعت تمام مسلمانوں پر فرض ہوجاتی ہے، چنانچہ حدیث میں اس طرح نہیں کہا گیا ہے کہ تم جس کو اپنا امیر منتخب کرو اس کی فرمانبرداری کرو بلکہ یہ کہا گیا کہ جس کو تم پر امیر بنایا جائے اس کی اطاعت کرو، اس بات میں بھی جو تم کو پسند ہو اور اس بات میں بھی جو تمہیں پسند نہ آئے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان امر عليكم عبد مجدع يقودكم بكتاب الله فاسمعوا له واطيعوا "رسولؐ نے فرمایا اگر سیاہ، نکٹا غلام تم پر مقرر کیا جائے تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو بشرطیکہ وہ اللہ کی کتاب کے مطابق تم پر حکومت کررہا ہو"۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

اللہ نے فرمایا: والذين استجابوا لربهم واقاموا الصلوٰة. وامرهم شورىٰ بينهم. ومما رزقنهم ينفقون "جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" (الشوریٰ:۳۸)

واضح رہے کہ مشاورت کی جو بات کہی گئی اس میں شوریٰ، امیر اور شوریٰ بنانے والے لوگ کوئی بھی عام لوگوں کے منتخب کیے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ وہ اللہ، رسولؐ اور اسلام کے لئے اپنے مخلصانہ کارناموں کی وجہ سے خود بخود ممتاز ہوجاتے ہیں۔ اور قیادت Leadership کا یہ کام ہے کہ عامة المومنين (عامة المسلمين نہیں) میں سے ایسے افراد کو ہمیشہ Induct (شامل) کرتی رہے تاکہ جن کو ارباب حل وعقد کہا جاتا ہے وہ ہمیشہ موجود رہیں اور اس تسلسل میں کوئی خلا نہ پیدا ہو۔ ارباب حل وعقد کے تعین میں یہ آیتیں رہنمائی کرتی ہیں:

والذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا في سبيل الله والذين آووا ونصروا اولئك هم المومنون حقا. لهم مغفرة ورزق كريم. والذين آمنوا من بعد وهاجروا وجاهدوا معكم فاولئك منكم. "جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کرکے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم میں شامل ہیں۔" (الانفال:۷۴،۷۵)

ارباب حل وعقد میں سے مشورہ کے لئے افراد کا انتخاب امیر کا کام ہوگا نہ کہ حل وعقد کا کہ وہ اپنے ووٹ سے کچھ لوگوں کو منتخب کرکے امیر کو ان کا پابند بنائیں، یعنی ان کا یہ قانونی حق ہو کہ امیر ان کے دئے ہوئے مشورہ کا پابند ہو۔ البتہ امیر کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ ارباب حل وعقد کے باہر سے کسی آدمی کو اعتماد میں نہ لے، کیوں کہ ایسا کرنے کا انجام حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں سامنے آچکا ہے جب انہوں نے مروان کو اپنے اعتماد میں لیا۔

انقلاب اسلامی کی راہ:

اسلام کی یہ انقلابی تحریک اصلاً انسانی افراد کے خلاف نہیں ہوتی ہے بلکہ انہی کے لئے ہوتی ہے، لیکن چونکہ رائج نظام کو چلانے والوں کا دنیاوی مفاد اس نظام سے وابستہ ہوتا ہے اور عام لوگ کسی نئی تبدیلی سے گھبراتے ہیں، کیوں کہ وہ غلط ہی نظام سہی اس کے کسی نہ کسی حد تک خوگر ہوچکے ہوتے ہیں، اس لئے وہ اس تحریک کی مخالفت اور مزاحمت شروع کردیتے ہیں اور یہیں سے حق اور باطل کی کشمکش انسانوں کی کش مکش میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اسی کش مکش کا نام جہاد ہے۔ (جہاد کے معنی قتال کے نہیں ہیں) اگر خارج

میں یہ مزاحمتی کش مکش نہ ہو بلکہ ہر فرد بجائے خود اپنی اُخروی نجات کے لئے انتھک کوشش کرے تو جہاد نہیں جہد ہے۔

اس سلسلے میں اللہ اور رسول کی جو اسکیم تھی وہ اسکیم مختصر طور پر یہ ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی کا مقصد جان کر اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی کے لئے ہر طرح کی مشقتوں، امتحانوں اور نقصانات کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں وہ ایسی زندگی گزاریں جو جنتی زندگی کی تہذیب اور تمدن کا نمونہ ہو، تاکہ وہ جنت کے ماحول میں فٹ ہوسکیں۔ ایسی زندگی بجائے خود اتنی پرکشش ہے کہ عام انسان اس کو دیکھیں تو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اگر عوام کا استحصال کرنے والے چند لوگ ان کو غلط فہمی میں ڈالے نہ رکھیں تو یہ انقلاب بغیر جہاد کے محض جہد کے بل بوتے پر برپا ہو جائے بشرطیکہ ویسی زندگی گزارنے والے کچھ پختہ کار لوگ اس کا عملی نمونہ پیش کریں۔ جیسا کہ مدینہ منورہ میں ہوا جب پختہ کار مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چھ سال کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں ایک اسلامی معاشرہ تشکیل پا گیا تو پہلے مرحلے میں اللہ کے حکم سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل باطل سے صلح کی جس کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ اس کے پیچھے جو عظیم مصلحت تھی اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جیسا زیرک اور دور اندیش آدمی بھی بروقت نہیں سمجھ سکا جب تک اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ فرمان نازل نہیں فرمایا:

انا فتحنا لک فتحامبینا ''اے نبی ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کردی۔'' (الفتح:۱)

چنانچہ اس صلح کے بعد جب چہار طرف سے کفار اور مشرکین مدینہ آنے لگے کیوں کہ اب ان کو مخالف پروپگنڈے سے پیدا ہونے والا جان، مال اور آبرو کا خوف باقی نہیں رہا تھا تو اسلامی زندگی کے نمونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا ان کو موقع ملا، اور پھر ایک سال کے اندر اندر تقریباً پورا عرب مسلمان ہو گیا، اور پھر اس معاشرے کے نمونے کو لے کر صحابہ کرامؓ عرب سے باہر جہاں جہاں بھی گئے وہاں وہاں تقریباً کل آبادی اسلام قبول کرتی چلی گئی۔

اسلامی انقلاب کی اصل غایت جنتی زندگی کے نمونے پر دنیوی تہذیب وتمدن کو ڈھالنا ہے، اور اگر یہ چیز اوجھل ہو جائے تو اسلامی انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔ اور اس کے لئے جن ایثار پیشہ اور پختہ کار لوگوں کی ضرورت ہے ان کو عام آبادی میں سے چھانٹ کر اور تعلیم تربیت اور تزکیہ کے ذریعہ قابل اعتماد بنانا ہوگا۔

چھانٹنے کا یہ عمل (Process) ابتداء ہی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس طرح چلا کہ جب انہوں نے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو قبول کرنے کی دعوت دی تو جو بہت ہی ذہین لوگ تھے وہ تو سمجھ گئے کہ اس کلمہ کے اثرات پوری زندگی پر کیا پڑیں گے۔ ان میں سے جو لوگ اپنے مفاد کے پجاری تھے انہوں نے اس دعوت کو رد کر دیا اور جو لوگ مخلصانہ مزاج رکھتے تھے انہوں نے اسے قبول کیا۔ مگر اسلام قبول کرنے کی جو سب سے اہم وجہ تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اب تک کی شخصی زندگی تھی جس کو دیکھ کر انہوں نے اس دعوت کو قبول کیا، رہے ان سے نیچی سطح کے لوگ تو ان کی سمجھ میں اس مرحلہ میں ساری باتیں نہ آسکیں، بعد میں درجہ بدرجہ رسولؐ کے ساتھ آپ پر ایمان لانے والوں کی زندگی میں بتدریج تبدیلیوں کو دیکھ کر متاثر ہوتے اور ایمان لاتے گئے۔ اسی طرح مسلمانوں کی عملی زندگی کو دیکھ دیکھ کر لوگ ایمان لاتے چلے گئے یہاں تک کہ انقلاب برپا ہو گیا۔ انقلاب برپا کرنے کے لئے عام آبادی سے منتخب افراد کو چھانٹنے اور تعلیم وتربیت اور تزکیہ کے ذریعہ قابل اعتماد بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ مستقل سنت ہے کہ باہر سے مزاحمت اور کش مکش ہو جیسا کہ اللہ نے خود فرمایا:

وکذلک جعلنا فی کل قریۃ اکبر مجرمیھا لیمکروافیھا ''اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر وفریب کا جال پھیلائیں۔'' (الانعام:۱۲۳)

دوسری جگہ فرمایا:

ایطمع کل امریٔ منھم ان یدخل جنة نعیم. کلا. انا خلقنھم مما یعلمون " کیاان میں سے ہرایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کردیا جائے؟ ہرگزنہیں ہم نے جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے کہ اسے یہ خود جانتے ہیں۔'' (المعارج:۳۸-۳۹)

دوسری جگہ فرمایا:

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم. مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین امنو معه متی نصر الله. " پھرکیاتم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالاں کہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جوتم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اوراس کے ساتھ اہل ایمان پکاراٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔'' (البقرہ:۲۱۴)

ایک جگہ اور فرمایا:

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لایفتنون. ولقدفتنا الذین من قبلھم " کیالوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے، اوران کوآزمایا نہ جائے گا۔ حالاں کہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جوان سے پہلے گزر چکے ہیں۔'' (العنکبوت : ۲-۳)

اس طرح کی اور بھی آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ دین کو غالب کرنے کے لئے تحریک چلانے والوں کوآزمائش کی بھٹی سے چاروناچار گزرنا ہی پڑے گا تا کہ جن کو اپنی جان، اپنا مال اوراپنے دنیاوی مفاد پیارے ہوں وہ اس کوچے میں قدم رکھنے کی ہمت نہ کریں۔اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی گنجائش رکھی ہی نہیں ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے اسلامی انقلاب برپا ہوجائے۔اس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے فتنے کے دودروازے رکھے ہیں ایک باہر کا اور ایک اندر کا۔ باہر کے دروازے سے فتنہ ان لوگوں کی طرف سے آتا ہے جو اسلامی نظام کے کھلے مخالف ہوتے ہیں، اوراندر کے دروازے سے فتنہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو مسلمانوں میں گھس کراندر سے کام کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی کو لے کر چلنے والوں کے لئے اتنی بصیرت ناگزیر ہے کہ وہ ان دونوں دروازوں سے واقف ہوں اوران کے فتنوں کی کاٹ بھی جانتے ہوں۔ اللہ کا یہ بڑا کرم ہے کہ اس نے اس معاملے میں اپنے سچے ماننے والوں کوان کی اپنی عقل اورصوابدید کے حوالے نہیں کیا ہے بلکہ بہت تفصیل سے فتنہ پردروں اوران کے فتنوں کی نشاندہی کردی ہے۔

مؤثر جدوجھد کی شرائط

مکمل یکسوئی : ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس انقلاب کی داغ بیل حضرات ابراہیمؑ نے ڈالی اوراس کی تکمیل نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ چنانچہ قرآن نے ہم سے یہی کہا کہ:

قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابراھیم والذین معه. " تم لوگوں کے لئے ابراہیمؑ اوراسکے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے۔'' (الممتحنہ:۴)

اوردوسری جگہ فرمایا: لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة " درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔'' (الاحزاب: ۲۱)

چنانچہ جہاں اللہ نے یہ فرمایا کہ ابراہیم مسلم حنیف تھے وہیں یہ فرمایا:

فاتبعوا ملة ابراهیم حنیفا ''تم کو یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہئے۔'' (آل عمران: ۹۵)
یعنی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی حنیف یعنی یکسو ہو، اور دنیا میں جو طریقے رائج ہوں ان کی طرف اس کا ادنی رجحان بھی نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا:

ولا ترکنو آالی الذین ظلمو (ھود:۱۱۳) ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا۔

اسی سے متعلق وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''حضرت عمرؓ کو توریت کے کچھ اقتباسات مل گئے اور وہ ان کو بہت پسند آئے اور وہ خوش خوش رسولؐ کے پاس آئے اور آپ کو سنانے لگے۔ وہ سنانے میں محو تھے اور رسولؐ کا چہرۂ مبارک غصہ سے تمتمار ہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً حضرت عمرؓ کو متنبہ کیا اور کہا کہ تم دیکھتے نہیں کہ حضورؐ پر ناگواری کے آثار طاری ہیں۔ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا تو وہ کانپ اٹھے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ اس وقت موسیٰ بھی ہوتے تو ان کو میری پیروی کرنی ہوتی۔'' یہ ہے حقیقت۔

ان کی کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ مسائل کھڑے کردیں جن میں تحریک والے الجھ جائیں اور ان کی یکسوئی متاثر ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسولؐ نے کسی بھی مسئلہ کو Issue نہیں بنایا، حد تو یہ ہے کہ خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے لیکن آپؐ نے اس چیز کو سرے سے Issue بنایا ہی نہیں،۔ حالاں کہ اگر آپ نعوذ باللہ سستی قیادت اور قوم کے اندر ہل چل پیدا کرنے کی خواہش رکھتے تو اس Issue پر بڑی خاصی تعداد آپؐ کے گرد جمع ہو جاتی، کیوں کہ قریش سب کے سب یہ بات جانتے اور مانتے تھے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے کی ہے اور وہ بت پرست نہیں بلکہ بت شکن تھے۔ اس لئے بہت سے لوگ اس سلسلے میں آپؐ کے ساتھ ہو جاتے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خانہ کعبہ سے بت ہٹا دئے جاتے لیکن بت پرستی ختم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف آپ نے ساری طاقت نفس شرک کے خلاف لگادی جس کے نتیجہ میں بت پرستی کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ خود بخود بتوں سے پاک وصاف ہو گیا۔ ایسا ہی کچھ حال دوسرے قومی اور ملکی مسائل کا تھا جن کو آپ ذیلی ہدف بناتے تو آپ کی پذیرائی اچھی خاصی ہوتی اور لوگوں کی مادہ پرستانہ نگاہ میں آپ کا Issue اچھا بنتا لیکن اسلامی انقلاب کا کیا ہوتا؟ تحریک کے مفاد میں آپ نے ایک موقع پر یہ سوچا کہ قوم کے بڑے لوگ اگر اسلام قبول کرلیں تو انقلاب کی راہ بڑی حد تک ہموار ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک موقع پر سرداران قریش سے آپ اسلامی موضوع پر بات فرمارہے تھے کہ اس درمیان میں حضرت ابن ام مکتومؓ جو نابینا تھے آ گئے اور حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر آپ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ کو آپؐ کی یہ ادا پسند نہیں آئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عبس وتولیٰ. ان جاء ہ الاعمیٰ. ومایدریک لعله یزکی اویذکر فتنفعه الذکری. اما من استغنی. فانت له تصدی. وما علیک الایزکی. واما من جائک یسعی. وهو یخشی. فانت عنه تلهی. کلا انها تذکرہ. فمن شاء ذکرہ. ''ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا۔ تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لئے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالاں کہ وہ اگر نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے اس سے تم بے رخی برتتے ہو، ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔'' (عبس: ۱۔۱۲)

اسی طرح حضورؐ کے خلاف، مسلمانوں کے اور اسلام کے خلاف بدترین پروپگنڈہ کا زور پورے عرب میں تھا جس کی وجہ سے آپ کو بڑی پریشانی تھی کہ تبلیغ کا حق کیسے ادا کریں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت عملی آپؐ کو سمجھادی اور آپ کو شرح صدر ہو گیا جس کا ذکر سورہ 'الم نشرح' میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الم نشرح لک صدرک . ووضعنا عنک وزرک. الذی انقض ظھرک. ورفعنالک ذکرک۔
''اے نبی کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آواز بلند کردیا۔'' (الم نشرح:۱-۴)

یہ حکمت عملی نہ تو باطل نظام کے بس میں ہے اور نہ وہ اس کی کاٹ کر سکتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے سارے پروپگنڈہ کو نظرانداز کردیا اور پوری یکسوئی کے ساتھ طے شدہ منصوبے کے مطابق کھرے افراد کو چھانٹنے اور ان پر مشتمل ایک اسلامی معاشرہ، جو اسلامی نظام کا چلتا پھرتا آنکھوں سے دیکھا جانے والا نمونہ ہو، بنانے میں لگے رہے۔ چنانچہ جب وہ نمونہ بن کر تیار ہوگیا تو وہی مخالف پروپگنڈہ اسلام کی قبولیت کی راہ کھولنے کا ذریعہ بن گیا، یعنی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے جب دیکھ لیا کہ ان کے اکابر نے اسلام کے خلاف جھوٹا پروپگنڈہ کرکے ہم کو اتنے دنوں بیوقوف بنائے رکھا تو وہ اپنے اکابر سے بھی اور اپنے غلط دین سے بھی بیزار ہوگئے اور پہلی فرصت میں اسلام قبول کرنے لگے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان مع العسر یسرا. ''بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔'' (الم نشرح: ۶)

یعنی جو دشواریاں آپؐ کی راہ میں حائل تھیں انہی دشواریوں نے آپؐ کا مسئلہ آسان کردیا، کیوں کہ آپؐ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ عرب کے گوشہ گوشہ میں اور ہر ہر فرد تک اپنی بات پہنچا سکیں، یہ کام آپؐ کے دشمنوں نے کردیا جس کے نتیجے میں ہر شخص تحریک اسلامی سے واقف بھی ہوگیا اور اس کی طرف متوجہ بھی، اس طرح مخالف پروپگنڈہ نے اسلامی تبلیغ کی راہ آسان کردی۔ یہ صالح معاشرہ عملاً پس منظر میں نہ ہوتا (جو مدینہ میں بنا) تو اسلام کے لئے جتنی تشہیر (Publicity) کی جاتی اور اسلام اور رسولؐ کے خلاف جتنی گندگی بھی اچھالی جاتی اس پر احتجاج اور دلائل کا انبار کچھ مفید نہ ہوتا۔

مفاد پرستانہ ذھنیت سے اجتناب :

دوسری شرط یہ ہے کہ انقلاب کے داعیوں میں آخرت کے لئے پوری یکسوئی ہو اور دنیا کی طرف رغبت کے بجائے دنیا پر آخرت کو وہ ترجیح دینے والے ہوں۔ چنانچہ جب رسولؐ کے سامنے دنیا کی نعمتیں پیش کی گئیں یہاں تک کہ عرب کی بادشاہت بھی پیش کی گئی تو آپؐ نے بجائے اس کے کہ اس کی طرف ادنیٰ التفات کرتے اور سوچتے کہ شاہی طاقت اور رعب کے ذریعہ ہم لوگوں پر اثر ڈال سکتے ہیں ____ اور ان کے اندر 'الناس علی دین ملوکھم' کی جو کمزوری پائی جاتی ہے اس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، گویا کہ یہ ایک حیثیت سے نعمت غیر مترقبہ ہے اور اس سے فائدہ نہیں اٹھانا کفران نعمت ہوگا، شاہی دربار میں ایک سوئی بھی گرتی ہے تو اس کی آواز پورے ملک میں سنائی دیتی ہے، اپنے مشن کی تبلیغ کے لئے یہ ایک بہترین ذریعہ ہوگا ____ آپؐ نے بلا پس وپیش پوری قوت سے ٹھکرا دیا اور فرمایا:

''خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دیدیں تب بھی میں اپنے فرض سے بعض نہ آؤں گا، خدا یا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہوجاؤں گا۔'' (ابن ہشام صفحہ ۸۹۔ امام بخاری نے بھی تاریخ میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے)۔

بات یہ ہے کہ اقتدار کا رعب اور دنیا کی لالچ لوگوں کو مائل تو ضرور کرتی ہے لیکن یہ لوگ کردار کے کچے، چمچہ گیری کرنے والے، دنیا پرست اور مفاد پرست ہوتے ہیں جو اسلامی تحریک کے لئے زہر ہلاہل ہوتے ہیں۔ اس طرح مدینہ سے پہلے مکہ ہی میں مخلصوں سے زیادہ منافقین کا ایک جھرمٹ تیار ہوجاتا۔ کھرے لوگ تو آزمائشوں کے ذریعہ دنیوی مفادات کو حقیر سمجھ کر ٹھکرانے

سے ہی بنتے ہیں۔ چنانچہ آزمائشوں سے جب صحابہؓ گھبرا اٹھے تو ایک مرتبہ حضرت خبابؓ نے حضورؐ سے دعا کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے فرمایا:

عن خباب بن الارت قال شكونا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو متوسد بردة له فى ظل الكعبة فقلنا الاتستصر لنا الاتدعولنا فقال قد كان من قبلكم يوخد الرجل فيحفر له فى الارض فيجعل فيها فيجاء بالمنشار فيوضع على راسه فيجعل نصفين ويمشط بامشاط الحديد مادون لحمه وعظمه فما يصده ذلك عن دينه والله ليتمن هذاالامر حتى يسير الراكب من صنعاء الى حضرموت لايخاف الاالله والذئب على غنمه ولكنكم تستعجلون۔ ''حضرت خباب بن ارتؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سایہ میں اپنی دھاری دار چادر سر کے نیچے رکھ کر لیٹے ہوئے تھے، ہم نے آپؐ کی خدمت میں (حاضر ہو کر مشرکین مکہ کی سختیوں کی) شکایت کی اور عرض کیا حضور! کیا (اب بھی) آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے مدد نہیں مانگتے؟ آپ ہمارے لئے اللہ سے دعا نہیں کرتے؟ (کہ وہ ہمیں غلبہ عطا فرمائے)۔ آپ نے فرمایا، تم سے پہلے داعیان حق کا یہ حال تھا کہ (دعوت الی اللہ کے جرم میں) ایک آدمی کو پکڑ لیا جاتا، زمین میں اس کے لئے گڑھا کھود کر اس کو اس گڑھے میں کھڑا کیا جاتا، پھر اس کے سر پر آرا رکھ کر چیرا جاتا، اور وہ دو ٹکڑے ہو جاتا اور کسی کے جسم پر لوہے کی کنگھیاں چلا کر گوشت ہڈی سے الگ کر لیا جاتا، یہ سزا اسے اس کے دین سے نہ روک سکی۔ اللہ کی قسم! یہ کام پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضرت موت تک چلا جائے گا وہ نہ ڈرے گا مگر اللہ سے، اور نہ ڈرے گا بھیڑیے سے تاکہ وہ اس کی بکری کو اٹھا کر نہ لے جائے لیکن تم عجلت چاہتے ہو۔'' (بخاری، کتاب الاکراہ)

اسلامی انقلاب بھاڑے کے لوگوں اور بامعاوضہ (خواہ اسے مشاہرہ کہا جائے یا کفاف) کام کرنے والوں کے ذریعہ برپا ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکی دور میں ایسا کوئی ایک کارکن بھی بھرتی نہیں کیا گیا، اور مدنی دور میں بھی جب تحریک انقلاب برپا کر کے اس کو چلانے کے مرحلہ میں پہنچ گئی تھی ایک شخص بھی ہمہ وقتی یا جز وقتی بامعاوضہ کارکن (Paid Worker) نہیں تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اصحاب صفہ، جو صحیح معنوں میں ہمہ وقتی کارکن (Whole Timer) تھے ان کا بھی کوئی کفاف یا معاوضہ نہیں طے کیا گیا۔ حالاں کہ رسولؐ کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ آپؐ مسلمانوں سے کہتے کہ تم لوگ ان کے گزر بسر کے لئے چندہ میرے پاس جمع کرو اور میں ان میں تقسیم کروں گا، بلکہ آپ نے اس معاملے کو جذبۂ انفاق اور انفرادی روابط کے حوالہ کر دیا اور تحفہ و تحائف کی شکل میں ان کی اعانت پر زور دیا۔ مصلحت واضح ہے کہ پہلی شکل میں ان کے اندر دنیاوی میلان کی کمزوری پیدا ہو سکتی تھی اور ملازمانہ ذہنیت ابھر سکتی تھی، بخلاف اس کے دوسری شکل میں آپس کی محبت (تهادوا تحابوا) پیدا ہوئی اور تحریکی کام کے ذریعہ اپنی دنیاوی ضرورت پورا کرنے کا رجحان پیدا نہیں ہوا۔ حد تو یہ ہے کہ آنحضورؐ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ کو بحیثیت خلیفہ کفاف لینے پر لوگوں نے مجبور کر دیا تو انہوں نے لے تو لیا لیکن اپنی وفات کے بعد ساری رقم بیت المال میں جمع کر دینے کے لئے اپنے ورثاء کو تاکید کر گئے، اور یہی کام حضرت عمرؓ نے بھی کیا۔ نیز تحریک کے یہ قائدین تنگی اور فراخی دونوں ہی حالت میں انتہائی سادہ زندگی بسر کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔

مفاد پرستانہ ذہنیت کی جڑ کاٹنے کے لئے پورے مکی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ انذار کا پہلو غالب رہا اور بشارت ضمنی ہی حیثیت سے دی جاتی رہی، مدنی دور میں تھوڑی سی تبدیلی اس میں آئی مگر توازن پیدا کرنے سے زیادہ نہیں، یعنی بشارت کا پہلو ابھارا تو گیا مگر ایسا نہیں کہ خوف کا پہلو دب جائے۔ اس لئے اسلامی تحریک چلانے والوں کو اس پہلو سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے۔

مداھنت سے احتراز :

اسلامی تحریک کے کھلے مخالفوں کی طرف سے مار دھاڑ، قتل وخون ریزی، جیل اور پھانسی وغیرہ کے علاوہ جو دوسرے داؤ پیچ چلائے جاتے ہیں ان سے بھی کامیابی سے نمٹنا اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ قائدین انقلاب کے مفہوم اور اس کے تقاضوں کا پورا پورا شعور رکھتے ہوں۔ ان کا ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر آپس میں مفاہمت کی کوشش کریں کہ اس میں ان کا گھاٹا نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ باطل، باطل ہی رہتا ہے، گھاٹا تو حق والوں کا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا:

ودو الو تدھن فیدھنون ''یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔'' (القلم: ۹)

دوسری جگہ فرمایا:

ولولاان ثبتنک لقد کدت ترکن الیھم شیا قلیلا. اذ الاذقنک ضعف الحیوۃ وضعف الممات ثم لاتجدلک علینا نصیرا ۔ ''اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔'' (بنی اسرائیل: ۷۴۔۷۵)

اخلاق حسنہ کی آبیاری :

ایک حکمت عملی یہ سامنے آئی ہے کہ مذکورہ معاشرہ کے عملاً بن جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو چند چیزوں کا پابند کیا مثلاً ظاہری اور باطنی پاکیزگی، طہارت، نماز کی پابندی، اور یہ کہ خلق خدا کو ان کی ذات سے کوئی تکلیف اور نقصان نہ پہنچے بلکہ یہ اپنی جان اور مال سے ان کی خدمت صرف اللہ کی رضا کے لئے کریں (نہ کہ Publicity اور تحریک کا Image بنانے کے لئے کہ لوگ ان کو اپنا غمگسار محسوس کریں)، اور یہ کہ رذائل اخلاق سے پوری طرح بچیں جس میں جھوٹ، غیبت، چغلی، فریب، جنسی بے راہ روی، چوری، ڈکیتی جیسی چیزیں داخل ہیں۔ جہاں تک ان کی معاش کا تعلق تھا اس سے متعلق جوا، شراب اور اس قسم کی چیزوں کو اللہ نے نظر انداز کر دیا البتہ جو لوگ اپنی ذکاوت حس سے از خود رضا کارانہ (Voluntarily) چھوڑ دیں ان کا اللہ کی نگاہ میں ایک مقام تھا۔

خدائی تائید پر بھروسہ :

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے ایک اور حقیقت کا انکشاف فرمادیا، وہ یہ کہ حق کی راہ میں جدوجہد کے سلسلے میں وہ صرف ظاہری فطری عوامل کو سب کچھ نہ سمجھ لیں بلکہ کچھ ایسے عوامل بھی کام کر رہے ہیں جہاں انسانوں کی نگاہ نہیں پہنچ پاتی اور باطل کے علمبرداروں کے تو بس میں بھی نہیں ہے کہ وہ ان عوامل سے اپنے حق میں کام لے سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یعلمون ظاھرامن الحیوۃ الدنیا . وھم عن الاخرۃ ھم غفلون ''وہ صرف ظاہری عوامل کو جانتے ہیں ان کے علاوہ دوسرے عوامل (جن کا منبع آخرت اور عقیدہ آخرت ہے) سے غافل ہیں۔'' (الروم: ۷)

دوسری جگہ فرمایا: ذلک مبلغھم من العلم۔ ''ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔'' (النجم: ۳۰)

ظاہر ہے کہ آخرت کی حقیقت یا اس کے عقیدہ کو وہ جان اور مان لیں تو پھر اسلامی نظام کے سوا کسی دوسرے نظام کو وہ لے کر چل نہیں سکتے اس لئے وہ دوسرے عوامل ان کے حق میں ہو نہیں سکتے۔ وہ عوامل تو لازماً مومنین ہی کے حق میں کام آئیں گے خواہ وہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ۔ یہی باطنی اور ظاہری صلاحتیں اور عوامل تھے جن سے مسلح کر کے اللہ نے ان مومنین سابقین کو مدینہ میں اکٹھا ہونے کا حکم دے دیا۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مدینہ میں منتقل ہونے کے بعد حالات نے کچھ دوسرا رخ اختیار کیا۔ پہلا تو یہ کہ مسلمانوں میں کچے پکے اور منافق کافی گھس آئے جن سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے۔ دوسرا یہ کہ کفار کی طرف سے اسلام کی مخالفت اور مزاحمت انفرادی اذیت رسانی کے بجائے اب اجتماعی حملوں اور جنگ کی صورتوں میں ہونے لگی۔ چنانچہ اب اسلامی تحریک کو خود اندر سے بھی خطرہ پیدا ہوگیا جس کی طرف سے ذرا سا غافل ہونا تحریک کو ملیامیٹ کردینے کے لئے کافی ہوتا۔ اس کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔ دوسری طرف باہر سے دشمنوں کے حملے کی کاٹ کے لئے داخلی تیاری کے ساتھ ساتھ خارجی تدبیروں کے طور پر آس پاس کی آبادیوں سے معاہدے کئے گئے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رسولؐ نے نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی دوسروں سے جتنے معاہداتی معاملات کئے ہر ایک میں آپؐ کو بالادستی حاصل رہی۔ یہ بالادستی بالکل نمایاں بھی تھی اور کہیں پر چھپی ہوئی، جیسے صلح حدیبیہ۔ باہر کے ان متوقع حملوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ اشارہ میں مسلمانوں کو یہ بتا دیا کہ مادی لحاظ سے وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اپنے کو فروتر دیکھ کر ہمت نہ ہاریں، بلکہ وہ عوامل جن تک اہل باطل کی رسائی نہیں ہے مسلمانوں کے مادی پہلو سے وسائل کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ ان ظاہری وسائل کے سلسلے میں استطاعت بھر تیاری میں وہ کوتاہی نہ برتیں۔ اللہ نے فرمایا:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل.. " اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو۔" (الانفال: ۶۰)

اللہ تعالیٰ نے ما استطعتم کہہ کر مسلمانوں کی مجبوری کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اس دور کی تو بڑی بات ہے، ہمارے اس گئے گزرے دور میں تازہ ترین مثال افغانیوں اور روسیوں کے مقابلہ کی ہے جس میں نہتے افغانیوں نے محض ایمان کے زور پر بظاہر بچکانہ انداز میں (لوہے کی نلکی میں بارود بھر کر بندوق کا کام لینا اور یہی اس وقت انکے بس میں تھا) وقت کے ظالم اور جابر ترین سوپر پاور کے (جو ایٹمی ہتھیار بین الاقوامی مجبوریوں سے استعمال نہیں کرسکا، باقی جتنے Sophisticated ہتھیار تھے سب کو استعمال میں لایا) مقابلہ کی ابتدا کردی، یعنی وہ اللہ کے حکم "ما استطعتم" کو بجالائے تو اللہ نے اپنے انہی پوشیدہ عوامل کے ذریعہ ان کی تائید کی جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ روس کو بھاگنا پڑا بلکہ اس کا نظریہ (Ideology) بھی چکنا چور ہوگیا۔ انہی پوشیدہ عوامل میں ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

ان یکن منکم عشرون صٰبرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفا من الذین کفروا " اگر تم میں بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے....." (الانفال: ۶۵)

گویا ایک اور دس کا تناسب ہوگا۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں میں کمزوری پیدا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الئن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفا. فان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین. وان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن اللہ. "اچھا، اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دوسو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے۔" (الانفال: ۶۶)

یعنی دس گنا کے بجائے صرف دوگنا پر غالب ہوں گے۔ یہاں جس کمزوری کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ تعداد کی کمی یا مادی

وسائل کی پہلے کی بہ نسبت کمی نہیں ہے کیوں کہ ان کی افرادی طاقت بھی بڑھ چکی تھی اور اسی لحاظ سے وسائل بھی پہلے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ مگر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے مقدار (Quantity) بڑھنے کے بعد صفات (Quality) میں کمی آ جاتی ہے، یہی کچھ وہاں بھی ہوا چنانچہ جن صفات کی وجہ سے تعداد میں کم ہونے کے باوجود ۲۰ ہوں تو ۲۰۰ پر اور ۱۰۰ ہوں تو ۱۰۰۰ پر غالب ہوتے اب تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے میدان میں ۲۰ کے بجائے ۱۰۰ اور ۱۰۰ کے بجائے ہزار افراد کو اتارنے کے باوجود صفات میں کمزور ہو جانے کی وجہ سے صرف دو گنا دشمن پر غالب ہوں گے۔ یہ تو دراصل اللہ کی طرف سے سرکاری یقین دہانی (Commitment) تھا مگر عملاً اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے زیادہ تناسب میں دشمنوں کی کثرت پر غلبہ عطا کیا ہے۔

منافقوں پر کڑی نگاہ :

اب ہم اندرونی فتنہ کی طرف متوجہ ہوں گے جیسا کہ معلوم ہو چکا مدینہ میں منافقین اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ان منافقین کی بہت سی قسمیں تھیں اور یہ قسمیں ہر زمانہ میں اسلام کی انقلابی تحریک کو نقصان پہنچانے والی رہیں گی، ان میں سے چند کا ذکر کافی ہوگا۔ چنانچہ ان کی اس خطرناکی کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے مشرکین اور مشرکات سے پہلے منافقین اور منافقات کا ذکر کیا ہے، مثلاً سورہ الاحزاب کی آخری آیات:

لیعذب الله المنفقين والمنفقت والمشركين والمشركت ويتوب الله على المؤمنين والمؤمنت.

"... کہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے۔" (الاحزاب، ۷۳)

سورہ فتح کی آیات:

ويعذب المنفقين والمنفقت والمشركين والمشركت الظانين بالله ظن السوء. "اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں۔" (الفتح: ۶)

ایک تو وہ تھے جو اپنا دنیاوی مفاد خطرہ میں محسوس کر کے اس تحریک میں گھسے تا کہ اگر یہ کامیاب ہو جائے تو ان کے مفادات محفوظ رہیں۔ دوسرے وہ تھے جن کو منصوبہ بند طریقہ پر تحریک میں داخل کیا گیا تا کہ وہ اندر کی باتیں باہر والوں کو بتا سکیں اور اندر رہ کر جس جس تدبیر سے بھی تحریک کو کمزور کر سکتے ہوں کریں۔ کسی تحریک میں اس طرح نفوذ کرنا باطل کا ایک خاص ہتھکنڈہ رہا ہے، لیکن اسلامی تحریک اس ہتھکنڈے کو نہ تو اپناتی ہے اور نہ اس کے لئے یہ مفید ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اس کو بے کردار اور بدکردار افراد چاہئے ہی نہیں۔ اور کسی تحریک میں اس طرح نفوذ کرنا لازمی طور پر بے کردار اور بدکردار افراد ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ منافقانہ رویہ پر عمل کرنے کے نتیجے میں بھی ان کے اندر یہ برائی پیدا ہو سکتی ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس کا پابند کرتا ہے کہ وہ صاف ستھرے طریقہ پر اپنے قول اور اسکے مطابق صالح عمل کے ساتھ عوام میں نفوذ کریں نہ کہ ان کے اداروں، تنظیموں، اور نظام میں۔ اسی کے نتیجے میں ان کے صالح عناصر ہر طبقہ اور ہر مقام سے پختہ کردار کے ساتھ اسلام کے کیمپ میں آئیں گے اور عملاً آتے رہے۔ تیسرے وہ تھے جو کسی منصوبہ کے تحت نہیں آئے تھے بلکہ مطلوبہ اخلاص کی کمی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی کمزوری کے ساتھ آئے تھے۔ اس لئے اسلام کے ان احکام پر تو عمل کرتے تھے جن میں کوئی دنیاوی خطرہ یا نقصان نظر نہیں آتا تھا اور یہ عمل کچھ مخلصانہ انداز کا بھی ہوتا تھا مگر جن احکام پر عمل کرنے سے ان کو دور یا نزدیک کا خطرہ یا دنیاوی نقصان نظر آتا تھا ان پر عمل کرنے سے کتراتے تھے۔ یہ تو تھیں موٹی تقسیمیں، لیکن قسمیں ان کی بے شمار تھیں۔ یہ سب کے سب اللہ کی نگاہ میں کفار اور مشرکین سے بھی اسلام کے لئے زیادہ خطرناک تھے اور خطرناک

رہیں گے، اسی لئے ان کی سزا بھی کفار اور مشرکین سے زیادہ سخت اور رسوا کن رکھی گئی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اگر اسی حال پر مر جائیں تو ان کے لئے بخشائش ہے ہی نہیں۔ دوسری یہ کہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رکھے جائیں گے جہاں کفار، مشرکین اور دہریے بھی نہیں ڈالے جائیں گے۔ ان کی خطرناکی کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ان کے کردار، ان کے اعمال اور ان کی حرکتوں اور طور طریقوں کی پوری تصویر کشی کر دی ہے تاکہ اسلامی تحریک کے ذمہ دار جن کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ مومنین کا گروہ ہے وہ پوری طرح ہوشیار رہیں۔ یہ اس لئے بھی کہ مومنین کے اندر اچھی خاصی تعداد ان مخلصین کی تھی اور رہے گی جو سیدھے سادے، کم عقل اور بھولے بھالے ہوتے ہیں، جو ان منافقین کی چالبازیوں کو تو کہاں سے سمجھیں سرے سے ان کو پہچانتے بھی نہیں اور اس لئے ان پر اعتماد کرنے کی وجہ سے ان کے بھرے میں آ جاتے اور ان کا آلہ کار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لا تعلمهم . نحن نعلمهم. ”تم انہیں نہیں جانتے ہو ہم ان کو جانتے ہیں۔“ (التوبہ: ۱۰۱)

دوسری جگہ فرمایا:

وفیکم سمعون لهم. ”تمہارے اندر ایسے لوگ ہیں جو ان کی باتوں کو بہت توجہ سے سنتے اور قبول کرتے ہیں۔“ (التوبہ: ۴۷)

اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے لئے تمہارے اندر کی بات وہ سنتے ہیں اور ان تک اس کو پہنچاتے ہیں۔ منافقین کی اس خطرناکی کی وجہ سے اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا کہ ایک طرف تو علی الاعلان ان کو منافق نہ کہا جائے لیکن ساتھ ہی ان کو تحریک کے دروبست پر قبضہ کرنے بھی نہ دیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چھپے ہوئے منافقین کسی طرح انتظامی معاملات میں گھس گئے تو حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد ایک ایک منافق کو جو عمال وغیرہ کی حیثیت میں پہنچ گیا تھا ملازمت سے خارج (Purge) کر دیا۔ جہاں منافقین پر کڑی نگاہ رکھنی تھی وہیں سادہ لوح مومنوں کو بھی نگاہ میں رکھنا تھا۔ چنانچہ انہی لوگوں کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

وقل اعملوا فسیری الله عملکم رسوله والمومنون. ”اور اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کے رسول اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل کیا رہتا ہے۔“ (التوبہ: ۱۰۵)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن پر کڑی نگاہ رکھنی ہے ان کو کوئی ذمہ داری سونپی نہیں جا سکتی چہ جائے کہ ان کو اسلامی انقلاب اور اسلامی نظام کو چلانے کے سلسلے کے اختیارات دیے جائیں۔

منافقوں سے ہشیار رہنے کے لئے ان کی تفصیلی حالتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں، ان کو سامنے رکھنا ان تمام لوگوں کے لئے لازمی ہے جو مخلصانہ طور پر چاہتے ہوں کہ اسلامی انقلاب برپا ہو۔ ان میں سے چند کا ذکر یہاں پر کیا جاتا ہے:

(۱) یامرون بالمنکر وینهون عن المعروف.. ”برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔“ (التوبہ: ۶۷)

(۲) والذین اتخذو مسجدا ضرارا و کفرا وتفریقا بین المؤمنین. ”کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لئے کہ (دعوت حق) کو نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں۔“ (التوبہ: ۱۰۷)

(۳) واذا قیل لهم لاتفسدو افی الارض قالوا انما نحن مصلحون. ”جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔“ (البقرہ: ۱۱)

یہاں فساد اور مفسد کے صحیح مفہوم کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم لوگ عام طور پر فساد اس کو سمجھتے ہیں جب عملاً بدامنی پائی جائے، لیکن یہ تو دراصل فساد کے درخت کا پھل ہے اور قرآن اس کی جڑ پر انگلی رکھتا ہے۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی ملک میں دنیا والوں کے نقطہ نظر سے کوئی جائز حکومت قائم ہو۔ اس کے اندر ایک محدود پیمانہ پر مثلاً ایک شہر میں لوگ اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہ کر کے اپنی ایک حکومت قائم کر لیں اور اپنی عدالت، اپنا قانون، اپنی پولس، اور اپنی فوج تیار کر لیں اور وہاں کے لوگ ظاہری طور پر واقعی پر امن زندگی بسر کر رہے ہوں تو بھی وہ ملکی حکومت اس کو امن قرار دے گی یا فساد۔ ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں کو فسادی قرار دے گی اور وہاں کی بظاہر پرامن زندگی کو فساد قرار دے گی۔ اس مثال کو سامنے رکھا جائے تو اسلام کی یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اس بظاہر لامحدود کائنات میں تو درحقیقت اللہ کی حکومت ہے اور اسی کا قانون نافذ ہے، اس میں ایک بہت ہی چھوٹا سا جزیرہ جس کو زمین کہتے ہیں اس پر آباد لوگ اللہ کے اس لامحدود اقتدار کو محدود کر کے، اس کا انکار کر کے اپنا نظم حکومت قائم کر لیتے ہیں اگرچہ بظاہر وہاں لوٹ مار، کشت وخون اور عام لوگوں کے نزدیک جو چیز فساد کہلاتی ہے وہ نہ بھی ہو تو بھی اسلام کی نگاہ میں وہ حالت فساد ہی ہے۔ لیکن جیسا کہ قرآن کہتا ہے وہ اس کا شعور نہیں رکھتے ہیں۔ دراصل فساد کی جڑ یہی ہے کہ حکومت وقت کا وقار اور اس کے قانون کا احترام ختم ہو جائے۔ اسی طرح منافقین کا یہ رویہ دراصل اللہ کے وقار اور اس کے قانون کے احترام کو مجروح کرنے والا تھا، اسی لئے قرآن نے ان کے رویہ کو فساد اور ان کو مفسد قرار دیا۔

(۴) وہ اللہ اور رسول پر مخلصانہ ایمان لانے والوں کو 'سفیہ' سمجھتے تھے۔ اللہ نے کہا کہ 'سفیہ' وہی ہیں لیکن وہ جانتے نہیں ہیں:

واذاقیل لھم امنوا کما امن الناس قالوا انومن کما امن السفھاء. الا انھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون. ''اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟ خبردار حقیقت میں تو یہ خود بیوقوف ہیں، مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔'' (البقرہ: ۱۳)

جب پتہ درخت سے ٹوٹ جاتا ہے تو پھر وہ ہوا کے ہر جھونکے پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر زمین پر مارا پھرتا ہے۔ اسی کیفیت کا نام 'سفاہت' ہے، چنانچہ مومن تو اپنے درخت سے ٹوٹا ہوا نہیں بلکہ جڑا ہوا پتہ ہوتا ہے۔ اس لئے نفس کی خواہشوں، مفادات کے تقاضوں، اور ماحول کے دباؤ، اقتدار وقت کا چیلنج، ان سبھوں کے کتنے ہی طوفانی تھپیڑے چلیں وہ پتہ ہل تو جائے گا لیکن اپنی جگہ سے ڈگمگائے گا نہیں۔ بخلاف اس کے منافق جو اللہ اور رسول سے جڑا ہوا نہیں ہے اور اپنی عقل اور اپنی حکمت کو خدا اور رسول کی حکمت پر ترجیح دیتا ہے وہ ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح ہے۔ نفس کی خواہش، مفادات کے تقاضے، ماحول کا دباؤ، اقتدار وقت کا چیلنج، اس کو جدھر جدھر بھی لے جانا چاہتا ہے وہ ادھر ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔

(۵) **اذا جاءک المنفقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک لرسولہ واللہ یشھد ان المنفقین لکذبون.** '' اے نبی جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں 'ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں'۔ ہاں اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔'' (المنافقون: ۱۰)

اس حقیقت کو سمجھے بغیر منافقین کے دھوکے میں نہ آنا ممکن نہیں ہے۔ منافقین کے دعوے کے دو جز ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، یہ جز بجائے خود صحیح ہے، اس کی اللہ نے تصدیق کی کہ اللہ جانتا ہے کہ بیشک آپؐ اللہ کے رسول ہیں، لیکن ان کے دعوے کا دوسرا جزیہ کہ ''وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں'' جھوٹ دراصل یہی ہے لیکن اس کا جھوٹ ہونا عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ اسی لئے کلمہ شہادت زبان سے ادا کر دینے کو وہ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی کافی سمجھتے ہیں۔ اگر وہ شہادت کے مفہوم کو جانتے

ہوتے تو نہ دھوکے میں رہتے اور نہ دھوکہ کھاتے۔ گواہی کے لئے قرآن نے لفظ 'شہادت' استعمال کیا ہے اور اسی سے شہید بنا ہے۔ گواہی کو سمجھنے کے لئے کسی عدالت میں مقدمہ کھلا ہوا ہو اور وہاں مدعی اور مدعا علیہ کی طرف سے گواہ پیش کئے جارہے ہوں تو اس کارروائی کو دیکھنے سے بات سمجھ میں آجائے گی۔ جب کوئی گواہ گواہی کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے تو مخالف وکیل اس پر جرح کرتا ہے۔ اس پے در پے جرح میں وہ اگر ثابت قدم رہتا ہے تو اس کو سچا اور پکا گواہ تسلیم کیا جاتا ہے ورنہ کہیں پر وہ ٹوٹ جائے تو وہ جھوٹا قرار پاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ' الہ واحد' ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں تو اسلام کی مخالف طاقتیں خواہ وہ اس کے نفس کی خواہشیں ہوں یا مفادات کے تقاضے یا اہل وعیال کی محبت یا ماحول کا دباؤ یا اقتدار وقت کا چیلنج، یہ سب کے سب اس کے خلاف زبان قال کے بجائے زبان حال سے جرح شروع کر دیتے ہیں، پھر کوئی پہلی دوسری ہی جرح میں ٹوٹ جاتا ہے اور کوئی اخیر اخیر تک پہنچتے ہوئے ٹوٹ جاتا ہے، یہ سب جھوٹے ہیں۔ اور یہی اللہ کے نزدیک منافق ہیں۔ البتہ جو شخص ہر گواہی کے معاملے میں اپنے قول اور عمل سے اپنی بات پر ثابت قدم رہے تو وہ اللہ کے نزدیک مومن، سچا گواہ اور شہید ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

والذین امنوا باالله ورسله اولئک هم الصدیقون. والشهداء عند ربهم. ''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔'' (الحدید: ۱۹)

(۶) واذا رایتهم تعجبک اجسامهم. وان یقولوا تسمع لقولهم. '' انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں، بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ۔'' (المنفقون: ۴)

وہ ظاہری ٹیپ ٹاپ، ملمع کاری، چرب زبانی، لچھے دار تقریر کے ذریعہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔

ومن الناس من یعجبک قوله فی الحیوة الدنیا ویشهد الله علی مافی قلبه وهو الدالخصام. واذا تولیٰ سعی فی الارض لیفسد فیها ویهلک الحرث والنسل. والله لایحب الفساد. ''انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے حالاں کہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔'' (البقرہ: ۲۰۴، ۲۰۵)۔

یہاں تین باتیں خاص طور پر سمجھ لینے کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بڑا 'لسان' ہوتا ہے۔ اور اسی زبان کے زور کی وجہ سے لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ باطل کے پاس اس ایک طاقت کے سوا اور کچھ ہے بھی نہیں کہ الفاظ کے جادو سے لوگوں کو مسحور کرے اور اپنا الو سیدھا کرے۔ چنانچہ زور خطابت سے زیادہ تر مفاد پرست ہی لوگ کام لیتے رہے ہیں جس کی ایک مثال حضرت داؤدؑ کے قصے میں بیان کی گئی ہے، جب کہ مظلوم نے کہا کہ میرا مخالف خطابت کے زور سے مجھ پر غالب ہو گیا:

ان هذا اخی له تسع وتسعون نعجه، ولی نعجة واحدة. فقال اکفلنیها وعزنی فی الخطاب. ''یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دنبی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دنبی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا۔'' (ص: ۲۳)

دوسری بات یہ کہ وہ اپنی ملمع سازی کو موکد کرنے کے لئے اپنی نیت پر اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ عموماً یہی کہہ کر زبان بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ میری نیت پر حملہ کیا جارہا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اللہ نے فرمایا 'لیفسد فیها ویهلک الحرث النسل' یعنی وہ کوشش کرتا ہے اس بات کی کہ زمین

میں فساد پھیلے اور کھیتی اور نسل تباہ ہو۔ یہاں جو بات خاص طور پر سمجھ لینے کی ہے کہ لفظ 'لیفسد' جو استعمال ہوا ہے اس کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ اس کی نیت اور اس کا ارادہ بھی کھیتی اور نسل کو برباد کرنے اور فساد مچانے کا ہو بلکہ اس نیت کے بغیر بھی اگر ایسی کوشش کی جائے جس کا انجام فساد فی الارض اور کھیتی اور نسل کی تباہی ہو اس کے لئے بھی قرآن نے 'ل' کا حرف استعمال کیا ہے اس مثال کے لئے سورہ انعام کی ایک اور آیت پیش نظر رکھی جائے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وکذلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم. ''اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنادیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہہ بنادیں۔'' (انعام: ۱۳۷)

یہاں اللہ تعالیٰ نے 'لیردوھم' (تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں) کا جو لفظ استعمال فرمایا اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے شرکاء کی نیت اور مقصد اپنے ماننے والوں کی تباہی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چاہے کتنی ہی اچھی نیت سے اس کام کو کیا جائے قتل اولاد بجائے خود تباہی کا ذریعہ ہے۔ البتہ آگے کا ٹکڑا 'ولیلبسوا علیھم دینھم' اس میں پھر دوبارہ 'ل' کا حرف اس لئے لایا گیا کہ دین کو گڈ مڈ کر دینا ان کی نیت اور ارادہ میں داخل تھا۔

(۷) منافق، لوگوں کی نگاہ میں اپنی اہمیت بڑھانے، اپنے کو نمایاں (Project) کرنے اور اپنا Image بنانے اور اس طرح تحریک میں دخیل ہونے کے لئے مختلف تدبیریں کرتے ہیں۔ مثلاً یہ دکھانے کے لئے کہ انکو قائد تحریک کا تقرب حاصل ہے یا تحریک میں ان کا بھی ایک مقام ہے یا یہ کہ وہ دشمنوں کے شر سے بچنا اور بچانا جانتے ہیں وہ بے ضرورت بھی رسولؐ سے سرگوشی کرتے تھے تاکہ لوگ ان کو رسولؐ کا معتمد علیہ سمجھیں اور باطل کے کیمپ سے ساز باز رکھ کر عام مسلمانوں کو یہ جتلاتے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کو اس طرح ہم دور کرنے اور مسلمانوں کی اچھی تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنا مال 'ریا' یعنی دکھاوے کے لئے خرچ کرتے تھے تاکہ لوگ ان کے زیراثر آجائیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ جیسے کہ ان کا ایمان اللہ کے بجائے لوگوں پر ہو جن سے وہ اجر چاہتے ہوں، اور آخرت کے بجائے دنیا پر ہو جوان کو مطلوب ہے۔ مال کے سلسلے میں انسانوں کی کمزوری گرچہ ہمیشہ ہی رہی ہے لیکن اس دور میں بہت شدید ہوگئی ہے۔ اس مال کے ذریعہ لوگوں کا دین، ایمان اور ضمیر خریدنے کی کوشش بھی آج بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔ اس دور میں تحریک اسلامی کو سبوتاژ کرنے والی طاقتیں باہر سے بڑی بڑی رقمیں دے کر، تحریک میں گھسے ہوئے لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنا کر یا بڑی تنخواہوں کے ساتھ ملازمت دے کر اپنے لئے فضا کو سازگار بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔

(۸) وہ مومنوں کے بارے میں کہتے تھے:

....غرھؤلاء دینھم. ''ان لوگوں کو تو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر رکھا ہے۔'' (الانفال: ۴۹)

یہ جامع جملہ ہے، آج کے دور میں اس کے مفہوم کو کچھ اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بنیاد پرست یعنی Fundamentalist ہیں اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور حالات کو تحریک کے لئے سازگار بنانا نہیں جانتے۔ اس سے پہلے ان کو کٹر پنتھی Orthodox کہا جاتا تھا۔ معلوم نہیں آئندہ اس غرض کے لئے کیا کیا الفاظ گڑھے جائیں گے، ایسے مومنوں کے لئے یہ جملہ بھی سننے میں آتا ہے کہ یہ اندھے متقی لوگ ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خود بینا فاسق ہیں۔ یہ مسلمانوں کے اندر رہ کر کافروں اور مشرکوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے مسلمانوں کو دین سے منحرف کرنے کی تدبیروں میں لگے رہتے ہیں اور

استدلال کے زور پر ان کے اندر شکوک وشبہات پیدا کر کے انکے دین کی بنیاد ہی کو کمزور کر دینا چاہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ 'بیع' یعنی تجارت 'ربوا' یعنی سود ہی کے مثل ہے اور جوا اور شراب میں یہ اور یہ فائدے ہیں یا جیسے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کفار کی کج بحثی جس کی طرف قرآن پاک میں اشارہ کیا گیا ہے:

وقالوا ء الھتنا خیرام ھو. ماضربوہ لک الاجدلا. بل ھم قوم خصمون. "اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لئے لائے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔" (الزخرف:۵۸)

یا جیسے مردار کے حرام اور ذبیحہ کے حلال ہونے کو اپنی عقل کی کسوٹی پر کس کر بڑا پروپگنڈہ کیا کہ یہ لوگ اللہ کے مارے ہوئے کو حرام اور اپنے مارے ہوئے کو حلال کہتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کہا کہ اگر تم ان کے کہنے میں آجاؤ گے تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔

وان اطعتمو ھم انکم لمشرکون اگر تم ان کے کہنے میں آجاؤ گے تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔ (الانعام:۱۲۱)

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مشرک کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ یہ تو ایک فعل تھا اس کے لئے 'تشرکون' کہا جا سکتا تھا اور اس کا مطلب ہوتا کہ ایسی صورت میں تم ایک شرک کرو گے یا یہ شرک کا کام ہوگا۔ شرک کا کوئی کام کرنا ایک چیز ہے اور مشرک ہو جانا دوسری چیز ہے۔ پھر سوال یہ بھی ہے کہ اس میں شرک کیسے ہو گیا جب کہ ان کو خدا نہیں بنایا، صرف ان کی بات مان لی۔ اور اصل شرک کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی عام ہے کہ جب تک اللہ کے سوا کسی اور کو عقیدۃً 'الہٰ' نہ سمجھا جائے اس وقت تک شرک نہیں ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ 'ایمان' اور شرک اکٹھا نہیں ہوتا ہے، لیکن قرآن اس کے خلاف بات بتاتا ہے، مثلاً سورہ کہف میں باغ والے اور اس کے ساتھی کا جہاں ذکر ہے وہاں باغ والے نے نہ تو اللہ کے سوا کسی کو خدائی میں شریک ٹھہرایا اور نہ خدا کا انکار کیا بلکہ شروع سے اخیر تک خدا کی ربوبیت کا اقرار کرتا رہا، البتہ آخرت کے معاملے میں اس کی گفتگو میں شک کا اظہار ہوتا ہے، چنانچہ جب اس کا باغ تباہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے الفاظ یوں بیان کئے ہیں:

یلیتنی لم اشرک بربی احدا "کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔" (الکھف: ۴۲)

اسی طرح سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وما یومن اکثر ھم باللہ الا وھم مشرکون. "ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔" (یوسف:۱۰۶)

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ 'ایمان' کے ساتھ بھی شرک ہوتا ہے اور عقیدۃً اللہ کا کسی کو شریک ماننے بغیر بھی شرک ہوتا ہے۔ اس لئے اس معاملے میں مومن کو کتنا محتاط ہونا چاہئے اس کا اندازہ صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جس کو اپنی عاقبت عزیز ہو۔

اسلامی تحریک کے لئے ناپسندیدہ اور خطرناک لوگوں کی تصویر کے یہ محض چند رخ ہیں جو قرآن نے اس لئے بیان کئے ہیں کہ تحریک کے مخلص قائدین ان سے ہشیار رہیں اور جو سادہ لوح مخلصین ہیں وہ بھی ان پر کڑی نگاہ رکھیں تا کہ وہ ان کے دام فریب میں نہ آئیں۔ چنانچہ مدینہ میں ان کے سلسلے میں جو حکمت عملی اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ ان کو منافق اور ناپسندیدہ اعلانیہ قرار نہیں دیا گیا، لیکن ان کے کردار کو بیان کر کے عام مخلصین کو متنبہ کر دیا گیا کہ وہ ان کردار کے حاملین سے چوکنا رہیں۔ اس طرح ایسے لوگوں کو معاملات میں دخیل ہونے نہیں دیا گیا جس کا شکوہ انہی کی زبان سے بیان کیا گیا ہے:

....ھل لنا من الامر من شئی. "اس کام کو چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔" (آل عمران: ۱۵۴)

... لو کان لنا من الامر شئی ماقتلنا ھھنا. "اگر اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو ہم نہ مارے جاتے۔" (آل عمران،۱۵۴)

اوران کے جواب میں کہا گیا:

.... قل ان الامر کله لله۔ ’’ان سے کہواس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔‘‘ (آل عمران: ۱۵۴)

اگر ایسے لوگوں کو معاملات میں دخیل کر دیا جائے تو وہ سرے سے معاملہ ہی کو الٹ دیں جیسا کہ قرآن نے بتایا:

لقد ابتغوا الفتنة من قبل وقلبوا لک الامور حتی جاء الحق وظھر امر الله وھم کرھون. ’’اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لئے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔‘‘ (التوبہ: ۴۸)

ولا تطع الکفرین والمنفقین ’’اور ہرگز بات نہ مانو کفار و منافقین کی۔‘‘ (الاحزاب: ۴۸)

عقلی دلیل کے بجائے برھان کو فیصلہ کن ماننا :

جہاں تک عقلی دلائل کا تعلق ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی ہے اور باطل کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا حربہ نہیں ہے۔ باطل کے اس حربہ کے مقابلے کے لئے اللہ نے اپنے مخلص بندوں کو دلیل کے بجائے برھان سے نوازا ہے۔ دلیل کا جہاں تک تعلق ہے اس کا سب سے پہلا استعمال ابلیس نے کیا جب اس سے اللہ نے پوچھا کہ تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔ اس نے جواب دیا، میں اس سے بہتر ہوں، تو نے اس کو مٹی سے اور مجھے آگ سے پیدا کیا ہے۔

قال انا خیر منه . خلقتنی من نار وخلقته من طین. ’’ میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔‘‘ (ص: ۷۶)

یہ عقلی لحاظ سے اتنی وزنی دلیل تھی کہ آج تک عام انسان آگ کو مٹی سے فضیلت یافتہ سمجھتے ہیں۔ اور دلیل اس نے اس صریح حکم کے خلاف دی جس میں اللہ نے فرمایا:

امرتک ’’میں نے تجھے حکم دیا تھا۔‘‘ (الاعراف: ۱۲)

یہ ہے برھان اور برھان کو چھوڑ کر عقلی دلیل کو فیصلہ کن قرار دینے کے نتیجے میں اللہ نے ابلیس کو ملعون قرار دے دیا۔ اسی طرح کفار کا یہ اعتراض کرنا کہ یہ اللہ کے مارے ہوئے کو حرام اور اپنے مارے ہوئے کو حلال کہتے ہیں، عقلی دلیل کے لحاظ سے بے انتہا وزنی ہے لیکن برھان یہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے:

.. ومـا لـکـم الا تـا کـلـوا مـمـا ذکر اسم اللـه علیـه ’’ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔‘‘ (الانعام: ۱۱۹)

یا جیسے ان کا کہنا کہ ’بیع‘ (تجارت) اور ’ربوا‘ (سود) ایک ہی طرح کی چیز ہے عقلی دلیل ہوئی اس کے جواب میں یہ کہا گیا:

.... واحل الله البیع وحرم الربوا.. ’’حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔‘‘ (البقرہ: ۲۷۵)

یا شراب اور جوے کے فوائد بیان کرنا عقلی دلیل ہوئی، اس کے جواب میں اللہ کا فرمان آیا کہ:

قل فیھما اثم کبیر ومنا فع للناس واثمھما اکبر من نفعھما. ’’ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔‘‘ (البقرہ: ۲۱۹)

یہ برھان ہوا۔ عقلی دلیل ذہن اور الفاظ کی منطقی بنیاد پر ہوتی ہے لیکن واقعات کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے جس کے مطابق وہ وقوع پذیر ہوتے ہیں، جیسے مالتھس کا نظریہ جس کو واقعات نے رد کر دیا لیکن عقل کے پجاری اب بھی اس کو تسلیم کئے جا رہے ہیں۔ یا

جیسے کوئی کہے کہ میں جس طرح ایک بات سے متاثر ہو گیا ہوں اسی طرح دنیا کا ہر آدمی متاثر ہو جائے گا۔ بس ہر آدمی ایک آدمی کو متاثر کرنے کی کوشش کرے تو ایک سے دو ہوں گے، دو مزید دو کو متاثر کر کے چار ہو جائیں گے اور چار، چار کو متاثر کر کے آٹھ ہو جائیں گے، اسی طرح بالآخر سب کے سب انسان اسی خیال کے ہو جائیں گے لیکن واقعات کی دنیا میں آج تک کسی بھی دور میں ایسا نہیں ہوا۔ اسی طرح عقلی دلیل مشاہدہ کی ناقص بنیاد پر قائم ہوتی ہے، مگر مشاہدہ اکثر کسی چیز کی اصلی حقیقت کے مطابق نہیں ہوتا۔ جیسے ہم کسی چکنی چیز کو دیکھ کر اور چھو کر یہ سمجھتے ہیں کہ واقعی وہ ویسی ہی چکنی ہے یعنی کھردری نہیں ہے، مگر حقیقت میں کوئی چیز بھی یہاں اس معنی میں چکنی نہیں ہے بلکہ چکنی سے چکنی چیز اپنی حقیقت میں کھردری ہی ہوتی ہے اور یہ بات بھی خوردبینی مشاہدہ ہی کی بنیاد پر کہی جارہی ہے یا پھر عقل کے زور سے سمجھی جارہی ہے جو ہوسکتا ہے کل غلط ہو جائے لیکن میں مشاہدہ کو حقیقت سمجھنے کی تردید برھان کی بنیاد پر پیش کر رہا ہوں۔ مثلاً ایک مثال جو عالم واقعہ میں پیش آچکا ہے یعنی غزوہ بدر کے موقع جب مسلمان اور ان کے دشمن آمنے سامنے تھے تو دونوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کی تعداد کو غلط دیکھا:

..یرونھم مثلیھم رای العین. ''دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دو چند ہے۔''
(آل عمران: ۱۳)

چنانچہ انسانی عقل، مشاہدات اور تجربات سب ناقص اور سطحی ہوتے ہیں اور ان کی رسائی اشیاء اور واقعات کی حقیقت تک نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جو کائنات کی ہر چیز کا خالق اور اس کی حقیقت کا عالم ہے اپنے خاص بندوں کو جن کے ذمہ اسلامی انقلاب کی کوشش ہے ان کی ناقص دلیلوں کے حوالے نہیں کیا ہے بلکہ اپنی طرف سے انکو برھان عطا کیا ہے جو سارے ہی امور پر حاوی ہے اور اسی لئے فرمادیا:

...ا ن الامر کله لله. ''سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔''

یہ ایک واضح برھان ہے جس سے صرف نظر کر کے محض عقلی دلائل کی بنیاد پر جو فیصلہ کیا جائے گا اس میں تقریباً سوفی صد دھوکہ ہوگا۔

ذلک ھدی اللہ یھدیه من یشاء ''یہ ہے اللہ کی ہدایت اس کے ذریعہ جس کے لئے اس کی مشیت ہوتی ہے اس کو ہدایت دیتا ہے یا جس کے لئے اس کی مشیت ہوگی اس کو ہدایت دے گا۔''

واخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین.

☆☆☆

اسلامی معاشرہ

کس طرح بنا اور آئندہ کس طرح بن سکتا ہے؟

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ

اس کتاب کا مسودہ ڈاکٹر صاحبؒ نے اقبال احمد پٹنہ سے املاء کرا کر مولانا صدرالدینؒ کے پاس بغرض نظرثانی بھیجا۔ مولانا کی نظرثانی کے بعد راشد نیر صاحب نے چند ذیلی عنوانات کے اضافہ کے ساتھ آخری ترتیب دی۔ اسکے پہلے ایڈیشن کی اشاعت ۱۹۹۰ء مولانا حامد علی صاحب، سابق سکریٹری جماعت اسلامی ہند، کے زیر اہتمام 'ادارہ شہادت حق' نے محبوب عالم صاحب، پٹنہ کی معاونت سے کی اور دوسری طباعت محبوب عالم کے ذریعہ 'اقراء اکیڈمی فور دعوہ' پٹنہ سے ہوئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اول

معاشرہ سے مراد زندگی کا کوئی محدود دائرہ نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں زندگی بحیثیت مجموعی جس طرح گزاری جاتی ہے، وہ پورا طرز عمل مراد ہے۔ اسلامی معاشرہ سے مراد وہ معاشرہ ہے جس میں زندگی کا ہر چھوٹا بڑا کام اسلام کے مطابق اللہ کی رضا کے لئے انجام دیا جاتا ہو۔ بعثت محمدیؐ کے وقت اس معاشرے کا زمین پر کہیں وجود نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعہ اس کو وجود بخشا۔ اسلامی معاشرہ کو عدم سے وجود میں لانے کا کام نبی ہی کے کرنے کا ہوتا ہے، غیر نبی یہ نہیں کرسکتا۔ اب جبکہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے اور حضورؐ کا بنایا ہوا معاشرہ بہت بڑی حد تک درہم برہم ہوگیا ہے، اس کو عدم سے وجود میں لانا نہیں بلکہ اس کو نئے سرے سے مرتب یعنی سٹ (set) کرنا ہے۔

معاشرے کی فطری بنیاد

معاشرہ کی پہلی اینٹ کنبہ ہوتا ہے جو ماں باپ اور ان کی اولاد پر مشتمل ہوتا ہے۔ بچہ سب لوگوں سے زیادہ محبت اپنے ماں باپ سے کرتا ہے اور اس کے بعد جس جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے علیٰ قدر مراتب ان سے بھی محبت کرتا ہے۔ والدین سے بچے کی محبت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہی اس کو پیدا کرتے اور اس کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں، ساتھ ہی اس سے غیر معمولی محبت اور شفقت بھی رکھتے ہیں۔ ماں کی مامتا دراصل اللہ کی شان رحمانی کا اور باپ کی شفقت اللہ کی شان رحیمی کا ایک ہلکا سا پرتو ہے، اس لئے اللہ کا مومن بندہ سب سے زیادہ محبت اسی سے کرتا ہے اور یہ محبت حقیقی ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو واقعی معنوں میں اپنی بے پناہ رحمت (رحمانی ورحیمی) کے تحت اس کی پرورش و پرداخت بھی کرتا ہے۔ ماں باپ کی پرورش و پرداخت تو اس کی پرورش کا مظہر یا ظاہری پردہ ہوتی ہے۔ اللہ رب العالمین سے سچی محبت رکھنے والا مومن فطری طور پر اپنے ہی جیسے مومنوں سے دلی تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح مومنوں کی یہ جماعت اللہ کی جماعت (حزب اللہ) ہوتی ہے اور سارے مومنین انس و جن ایک دوسرے کے ولی اور بھائی ہوتے ہیں۔ یہی جماعت ہے جس پر اسلامی معاشرے کا اطلاق ہوتا ہے۔

مثالی اسلامی معاشرہ کس طرح بنا تھا

مثالی اسلامی معاشرہ اللہ کے رسول ﷺ کے ذریعہ تین مرحلوں میں مکمل ہوا تھا۔ پہلے مرحلہ میں وہ ٹیم تیار ہوئی تھی جو ایسے بے نفس لوگوں پر مشتمل تھی جو بغیر کسی خارجی دباؤ اور بغیر کسی دنیاوی غرض (Icentive) کے صرف اللہ کی رضا و محبت اور آخرت کی کامیابی کی خاطر اللہ کی مرضیات پر چلنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد جو لوگ ان کے ساتھ ہو کر اس معاشرے کا حصہ بنے وہ بالعموم اس درجہ بے نفس نہیں تھے اور اللہ کی مرضیات پر چلنے کے لئے انہیں خارجی دباؤ اور طاقت کی تو نہیں مگر سہارے کی بہر حال ضرورت تھی۔ آخر میں ایسے لوگوں کی آمد ہوئی جن کی تعداد تو بہت زیادہ تھی مگر ان پر نفس امارہ کا غلبہ تھا اور ان کو اللہ کی رضا کی راہ پر قائم رکھنے کے لئے خارجی دباؤ بلکہ طاقت کے استعمال کی بھی ضرورت تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ثم اورثنا الکتب الذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرٰت باذن اللہ ذلک ھو الفضل الکبیر "پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنادیا ان

لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لئے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی میانہ رو ہے اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔ (سورہ فاطر:۳۲)

اس آیت میں تین گروہوں کا یکجا ذکر ہوا ہے۔ البتہ اس تذکرے میں ترتیب نزولی کے بجائے صعودی اختیار فرمائی گئی ہے، جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تیسرے گروہ یعنی اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کی تعداد چونکہ زیادہ تھی، اس لئے ان کا ذکر پہلے آیا ہے اور اس سے کم تعداد درمیانی لوگوں کی تھی اور اس سے بھی کم پہلی قسم کے لوگوں کی تھی، اس لئے ان کا ذکر درمیان میں اور آخر میں آیا ہے (لیکن ایک وجہ اور بھی ہے جس کا ذکر آئندہ آئے گا)۔

سابقین

پہلا گروہ جو پہلے وجود میں آیا تھا اس کے افراد کی مختلف صفات حسنہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر مختلف مقامات پر مواقع کی مناسبت سے الگ الگ صفتوں سے کیا ہے۔ کہیں ان کو صالحین کہا ہے، تو کہیں سابقین، کہیں مقربین فرمایا گیا ہے اور پھر ان کی مجموعی صفات کے لحاظ سے انہیں کہیں حزب اللہ اور کہیں خیر امت کہا۔ جس طرح بالعموم ہر شخص اپنی بعض انفرادی خصوصیات رکھتا ہے، اور ان میں وہ ایک طرح کا امتیاز رکھتا ہے، اسی طرح ہر شخص کا درجہ بھی اللہ کے یہاں مختلف ہے جس کا شمار نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ اس مثالی گروہ مومنین کا بھی یہی حال تھا کہ ان میں کے ہر شخص کا اللہ کے نزدیک ان کی ایمانی خصوصیات کی بنا پر ایک خاص درجہ اور ایک خاص مقام ہے۔ یہ ایسے اہل ایمان ہیں جو حضورﷺ کے زمانے سے لے کر جب تک یہ امت دنیا میں رہے گی پیدا ہوتے رہے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ البتہ ابتدائی دور یعنی قرون اولیٰ میں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور بعد کے زمانوں میں ان کی تعداد کم رہی اور کم رہے گی۔ ان اہل ایمان کی صفات مذکورہ بالا کی مختصر تشریح درج ذیل ہے:

ان کو سابقین کہنے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ خیر کے کاموں میں عام مسلمانوں سے یہ سبقت لے جانے والے ہوتے ہیں اور دوسری یہ کہ خود ان کے مابین بھی خیر کے کاموں میں مسابقت اور مقابلہ (Competition) ہوتا رہتا ہے۔

صالحین سے مراد یہ ہے کہ وہ سراپا خیر اور صلاح ہوتے ہیں۔ وہ ایسے لوگ نہیں، جن کے عمل صالح بھی ہوں اور برے بھی، اور یہ صفت خاص انہی سابقون کو حاصل ہوتی ہے۔

صادقین اس لئے کہا گیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے طاعت و بندگی کا جو عہد کیا اس پر وہ پورے اترے اور اس عہد میں سچے ثابت ہوئے۔ انہوں نے جنت کے عوض اپنے جس مال اور جان کی تجارت اللہ سے کی تھی اور جنہیں اللہ نے خرید لینے کے بعد بطور امانت ان کے پاس چھوڑ رکھا تھا، انہیں انہوں نے اللہ کی امانت ہی سمجھا اور اس امانت میں ادنیٰ درجے کی بھی کبھی خیانت نہیں کی، اور جب اللہ نے جو کچھ اور جتنا کچھ ان سے طلب کیا اس امانت میں سے انہوں نے بلا تامل حاضر کر دیا۔

یایھا الذین آمنوا اتقو اللہ و کونوا مع الصدقین "اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو"۔ (التوبہ:۱۱۹)

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدو االلہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ و منھم من ینتظر و ما بدلوا تبدیلا "ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا، ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔ (الاحزاب:۲۳)

ان کو متقین اس لئے کہا گیا کہ ان کے اندر تقویٰ عام لوگوں کی طرح تھوڑا بہت نہیں تھا بلکہ وہ سراپا ایمان اور تقویٰ تھے۔

مقربین ان کو اس لئے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف واخلاق سے اپنے کو انہوں نے زیادہ سے زیادہ آراستہ کیا اور اس کی بندگی اور محبت میں یہ دوسرے مسلمانوں سے بہت آگے تھے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے تقرب خاص سے نوازا جیسا کہ اس نے ایک جگہ فرمایا ہے:

واسجد و اقترب ''سجدہ کر اور قریب ہوجا''۔(علق:۱۹)

آخرت میں اللہ سے ان کے قریب ہونے کا اظہار اس طرح ہوگا کہ حشر کے میدان میں یہ عرش کے سائے میں رہیں گے اور انہیں جنت الفردوس ملے گی، جو سب سے اعلیٰ درجے کی جنت ہے اور عرش الٰہی کے براہ راست نیچے ہے۔

انہیں حزب اللہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ اور رسولؐ سے ان کا قلبی تعلق بالکل خالص اور حنیف تھا۔ وہ ان کی نافرمانی کرنے والوں سے ذرا بھی لگاؤ نہیں رکھتے تھے، چاہے وہ ان کے اپنے ماں باپ یا بھائی بہن یا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوتے۔

لاتجد قوما یومنون باللہ و الیوم الا خر یوآدون من حآد اللہ و رسولہ ولو کانوا ابآء ھم او ابنآء ھم او اخوانھم۔ او عشیرتھم اولٓئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ۔ وید خلھم جنت تجری من تحتھا الانھر خلدین فیھا۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ اولٓئک حزب اللہ۔ الآان حزب اللہ ھم المفلحون۔ ''تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کردیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں''۔

(المجادلہ:۲۲)

خیر امت یوں تو پوری امت مسلمہ کو کہا جاتا ہے، مگر دراصل مسلمانوں کے اندر کا یہی برگزیدہ طبقہ تھا (اور ہے) جس کو خیر امت قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تاریخ انسانی میں خدا پرستوں کا کوئی دوسرا گروہ وجود میں نہیں آیا جیسا کہ یہ گروہ تھا۔

اس مثالی گروہ مومنین کو یہ مرتبہ بلند اس لئے ملا اور ملتا ہے کہ ان کا نفس نفس مطمئنہ تھا (اور ہوتا ہے) جب کہ دوسرے اور تیسرے درجے کے مسلمانوں کا حال یہ نہیں ہوتا۔ نفس تین طرح کا ہوتا ہے: نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ۔ نفس امارہ وہ نفس ہوتا ہے جو انسان کو اللہ کی مرضی کے خلاف کام پر اکساتا رہتا ہے۔ تیسرے درجے کے مسلمان اسی سے مغلوب ہوا کرتے ہیں۔ نفس لوامہ اس نفس کو کہتے ہیں جو برا کام کرنے پر انسان کو ملامت کرتا ہے۔ دوسرے درجے والے مسلمانوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان پر یہ دونوں طرح کے نفس اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اعمال صالح اور غیر صالح دونوں طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ پہلے درجے کے مسلمان یعنی سابقون وہ ہوتے ہیں جن کا نفس امارہ مردہ نہیں تو اتنا مضمحل ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ ان سے دانستہ برا کام کرا ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر و الفسوق

والعصیان۔ اولئک ھم الرشدون ”لیکن اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمھارے لئے دل پسند بنا دیا۔ اور کفرو فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ راست رو ہیں“۔ (الحجرات: ۷)

پھر ان سابقون کی بھی تین قسمیں ہیں، ایک تو وہ لوگ ہیں جنہیں السابقون الاولون فرمایا گیا ہے۔

والسابقون الاولون من المھجرین و الانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ و اعد لھم جنت تجری تحتھا الانھر خلدین فیھا ابدا۔ ذلک الفوز العظیم۔ ”وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جنکے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے“۔ (التوبہ: ۱۰۰)

یہ سب سے اونچے درجے کے لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دعوت قرآنی کے ابتدائی دور یعنی مکی دور سے لے کر غزوہ بدر تک کے زمانے میں ایمان لائے تھے۔ انہیں الاولون اسی لئے کہا گیا ہے۔ دوسری قسم کے السابقون وہ ہیں جو غزوہ بدر کے کچھ بعد کے زمانے میں ایمان لائے، پھر ہجرت بھی کی اور السابقون الاولون کے ساتھ ہو کر اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا۔ ان کا شمار بھی فی الجملہ السابقون الاولون ہی میں ہوگا۔ تیسری قسم کے السابقون وہ ہیں جو ان کے بعد امت میں پیدا یا داخل ہوئے اور ان السابقون الاولون کے نقش قدم پر چلے۔ ان تینوں ہی قسم کے سابقین کی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے یہ لوگ نگراں اور ذمہ دار (custodian) تھے جیسا کہ کچھ نام نہاد مسلمانوں کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ و المومنون ”اے نبیؐ ان سے کہہ دیجئے کہ تم عمل کرو تمہارے عمل کو اللہ دیکھے گا، اس کا رسول دیکھے گا اور مومنین دیکھیں گے“۔ (التوبہ: ۱۰۵)

یہاں پر مومنین سے مراد وہی السابقون ہیں۔

مقتصدین

دوسرا گروہ جو بعد میں وجود میں آیا تھا اسلام پر عمل کرنے کے لئے کسی خارجی دباؤ اور نگرانی کا محتاج تو نہیں تھا، لیکن اسے سہارے کی ضرورت بہر حال تھی، اس لئے کہ نفس امارہ اور نفس لوامہ دونوں کی کشمکش ان کے اندر رہتی تھی۔ ایسی صورت میں باہر سے تذکیر یا نصیحت کے ذریعہ نفسیاتی سہارا مل جانے سے ان کے نفس لوامہ کو تقویت حاصل ہوتی رہتی تھی اور وہ اس قابل رہا کرتا تھا کہ نفس امارہ کے زور کرنے سے اگر کبھی ان سے گناہ سرزد ہو جاتا تو وہ ان کو بے چین کر کے رکھ دیتا تھا اور وہ اللہ کی بارگاہ میں اپنی مغفرت کے فوراً خواستگار ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

واخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملا صالحا و اخر سیئا۔ عسی اللہ ان یتوب علیھم۔ ان اللہ غفور رحیم۔ خذ من اموالھم صدقة تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیھم۔ ان صلوتک سکن لھم۔ واللہ سمیع علیم۔ الم یعلموا ان اللہ ھو یقبل التوبة عن عبادہ ویا خذ الصدقت و ان اللہ ھو التواب الرحیم۔ وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمومنون۔ وستردون الی علم الغیب و الشھادة فینبئکم بما کنتم تعملون۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے، ان کے عمل مخلوط قسم کے یعنی صالح اور غیر صالح دونوں طرح کے ہیں۔ توقع ہے کہ اللہ ان پر توجہ فرمائے

گا۔ بلاشبہ اللہ بڑا غفور اور رحیم ہے۔ اے نبیؐ (اگر یہ لوگ اپنے مالوں میں سے صدقہ نکالیں تو) ان کے صدقے کو قبول کرو، اس کے ذریعہ تم ان کو پاک کرو گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔ اور ان کے لئے دعائے رحمت کرو، یقیناً تمہاری دعا ان کے لئے سکون کا موجب ہوگی، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے صدقوں کو بھی منظور کرتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ تم عمل کرو، تمہارے عمل کو اللہ دیکھے گا اس کا رسول دیکھے گا اور مومنین بھی دیکھیں گے۔ پھر تم ظاہر و باطن کے جاننے والے خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اس وقت وہ تمہیں بتا دے گا جو تم کرتے رہے ہو"۔ (التوبہ: ۱۰۳ تا ۱۰۵)

انہیں لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مقتصدین یعنی درمیانی قسم کے لوگ کہا ہے، کیوں کہ تعداد کے لحاظ سے بھی اور عمل کے لحاظ سے بھی یہ درمیانی درجے کے لوگ تھے۔ مطلب یہ کہ جہاں پہلے گروہ السابقون الاولون سے تعداد میں زیادہ اور تیسرے گروہ سے کم تھے، وہیں ایمان اور عمل صالح کے معاملے میں پہلے گروہ سے فروتر اور تیسرے گروہ کے لوگوں سے بلند تر تھے۔

اسلام کے تفصیلی احکام بالعموم اسی گروہ کے وجود میں آنے کے دوران نازل اور نافذ ہوئے اور اس میں بر بنائے حکمت و مصلحت تدریج کو ملحوظ رکھا گیا۔ یعنی احکام دھیرے دھیرے دئے گئے۔ تربیت کے ذریعہ جیسے جیسے ان کے اندر پختگی آتی گئی اور اسلامی شعور بڑھتا گیا ویسے ویسے زندگی کے مختلف دائروں کے احکام دئے گئے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود ان کی طرف سے احکام کے مطالبے ہوتے تھے مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاموشی اختیار فرمائی جاتی تھی، کیونکہ مطلوبہ احکام کے نازل کئے جانے کا اس وقت مناسب موقع نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس مسئلے میں اگر حکم دیا جائے گا تو واقعتاً پوری تندہی سے اس پر عمل ہوگا تب حکم نازل فرمایا جاتا۔ مثال کے طور پر شراب کی حرمت کا حکم اس وقت آیا جب اہل ایمان اس کی تعمیل کے لئے دل سے آمادہ سمجھے گئے۔ چنانچہ حکم آیا تو جس نے سنا اس کا ہاتھ جہاں پر تھا وہیں کا وہیں رکا رہ گیا۔ شراب اگر منہ میں جا چکی تھی تو حلق تک نہیں پہنچ سکی۔

رسول اللہ ﷺ کے زیر نگرانی یہ معاشرہ اسلامی رنگ میں اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ اس کی مثال کان نمک جیسی ہو گئی تھی۔ جو اس میں شامل ہوتا آپ سے آپ اس کے رنگ میں رنگ جاتا۔ ایک دن طائف سے ایک وفد اسلام قبول کرنے کیلئے آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے سامنے چار باتیں رکھیں۔ ایک یہ کہ نماز کی پابندی کرنی ہوگی۔ دوسری یہ کہ شراب چھوڑنی ہوگی۔ تیسری یہ کہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور چوتھی یہ کہ رمضان کا روزہ رکھنا ہوگا۔ ان لوگوں نے کہا کہ جب کوئی معاملہ ہوتا ہے تو ساری شرطیں یک طرفہ نہیں ہوتیں۔ اس لئے نصف نصف پر بات طے کر لیجئے۔ آپؐ راضی ہو گئے اور فرمایا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد پہلی دو شرطیں تمہیں پوری کرنی ہوں گی۔ ان لوگوں نے ان شرطوں کو مان لیا اور اسلام کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال کر واپس چلے گئے۔ بعد میں صحابہ کرامؓ نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں (نماز اور ترک شراب) تو ان پر ان کے اسلام قبول کرتے ہی واجب التعمیل ہو جائیں گی۔ رہی زکوٰۃ تو وہ ایک سال کے بعد ان کو دینی ہوگی اور روزہ جب رمضان آئے گا تب رکھنا ہوگا۔ اس وقت تک مسلمانوں کے معاشرے میں رہ کر وہ ایسے ہو جائیں گے کہ ان باقی دونوں چیزوں کی بھی از خود پابندی کرنے لگ جائیں گے۔

تیسرا طبقہ

تیسرا گروہ جن لوگوں پر مشتمل تھا ان پر ان کا نفس امارہ بری طرح غالب تھا اور نفس لوامہ اگر بالکل مردہ نہیں تو بے اثر ہو گیا تھا، ایسے لوگوں کی تعداد ہر دور میں سب سے زیادہ رہی ہے اور رہے گی۔ ایمانی اور عملی کیفیات کے لحاظ سے یہ لوگ بھی مختلف درجات

کے ہوتے ہیں۔کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو نفس امارہ کے کہنے پر چلتے تو ہیں مگر نفس کو اپنا خدا نہیں بنائے ہوتے ہیں بلکہ ان کو یہ احساس رہتا ہے کہ ہم گنہگارانہ زندگی بسر کررہے ہیں۔یہ دوسرے گروہ کے لوگوں سے نسبتاً قریب ہوتے ہیں۔کچھ دوسرے ایسے ہوتے ہیں جو نفس امارہ سے اور زیادہ مغلوب ہوتے ہیں حتیٰ کہ گناہ وثواب کا خیال بھی انہیں بہت کم آتا ہے۔اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نفس سے آخری حد تک مغلوب ہوتے ہیں اور اسے گویا خدا بنا چکے ہوتے ہیں۔اسی کے کہنے پر چلتے رہتے ہیں اور بالعموم اپنے گناہ پر نادم ہونے کے بجائے مصر رہتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا بتایا ہے:

ثم اورثنا الکتب الذین اصطفینا من عبادنا ۔ فمنھم ظالم لنفسه ''پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنادیا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لئے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے''۔ (فاطر:۳۲)

یہ وہ لوگ ہیں جن کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔دنیا میں ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ ایمان کی سرحد کے اندر ہیں یا اس کی سرحد پار کر کے نفاق کے دائرے میں چلے گئے ہیں۔آخرت میں بھی ان کا معاملہ اس وقت تک معلق رکھا جائے گا جب تک اللہ تعالیٰ کی عدالت برخواست ہونے کو ہوگی۔اس وقت تک یہ اللہ کے فیصلے کے انتظار میں رہیں گے کہ دیکھیں اللہ تعالیٰ عذاب کا فیصلہ سناتا ہے یا گناہوں کی معافی کا،اور حشر کے میدان کی ساری تکلیفیں اس لمبے عرصے تک جھیلتے رہیں گے،جو معلوم نہیں کتنے ہزار سال کے برابر ہوگا اور بالکل اخیر میں فیصلہ اس طرح سنایا جائے گا کہ جن کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا ان کی بخشائش ہوگی اور بقیہ لوگوں کے لئے جہنم کا عذاب ہوگا۔یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں،یہاں تک کہ جو اعمال صالحہ بظاہر آخرت کے لئے کرتے ہیں ان کے پیچھے بھی ان کی غرض کوئی نہ کوئی دنیاوی ہی ہوتی ہے۔مثلاً نماز پڑھتے ہیں تو اس لئے کہ اس سے کسی نہ کسی طرح کا دنیوی مفاد حاصل ہوگا۔لوگ انہیں نمازی سمجھیں گے،ان کی قدر کریں گے،یا لوگ انہیں دیندار سمجھیں گے،یا اس سے آمدنی کی سبیل پیدا ہوگی۔قرآن ایسے ہی لوگوں کا حال بتاتا ہے جب کہتا ہے کہ کچھ لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت کنارے پر رہ کر کرتے ہیں،اگر ان کو دنیاوی فائدہ ہوا تو اطمینان محسوس کرتے ہیں اور اگر کوئی نقصان یا تکلیف پہنچے تو پیٹھ پیچھے پھر جاتے ہیں۔یہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ گھاٹے میں ہیں۔

ومن الناس من یعبد الله علی حرف فان اصابه خیر اطمان به ۔وان اصابته فتنة انقلب علی وجھه خسر الدنیا و الاخرة۔ذلک ھو الخسران المبین ''اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے،اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہوگیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو الٹا پھر گیا۔اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی،یہ ہے صریح خسارہ''۔(الحج:۱۱)

ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو اس دین سے کچھ خاص مطلب نہیں ہوتا جو اللہ اور رسول نے دیا ہے۔بلکہ جو کچھ ان کے باپ دادا سے ان کو ملا ہوتا ہے یا جن چیزوں کا ان کے سماج میں چلن ہوتا ہے انہی کو وہ دانتوں سے پکڑے رہتے ہیں اور اسی کو وہ اسلام کا نام دیتے ہیں۔ان سے اگر کہا جائے کہ اللہ کی کتاب میں اس کے خلاف لکھا ہوا ہے جو تم کرتے ہو یا جس کا تمہارے یہاں رواج ہے تب بھی وہ انہی چیزوں پر جمے رہتے ہیں۔ان پیشہ ور مذہبی لوگوں کی بات کو وہ دل سے قبول کیا کرتے ہیں جو اسلام کو ان کی خواہش کے مطابق بنا کر پیش کرتے ہیں۔حدیث میں آیا ہے ''میری امت کا ہر شخص جنت میں جائے گا سوائے اس کے جو میرا انکار کرے۔صحابہؓ نے پوچھا کہ آپؐ کا انکار کرنے والا آپؐ کا امتی کون ہوگا؟ تو آپؐ نے فرمایا: جو میری اطاعت کرے وہ جنت میں

جائے گا اور جو میری اطاعت نہ کرے وہ میرا انکار کرنے والا ہے"

ان جیسے لوگوں کی وجہ سے اسلامی معاشرے کو بہت نقصان پہنچتا رہا ہے اور اب وہ بالکل نیم جان ہو کر رہ گیا ہے۔ واضح رہے کہ اس گروہ کے لوگ جاہل اور ان پڑھ عوام یا معاشی طور پر پسماندہ لوگ ہی نہیں ہوتے بلکہ پڑھے لکھے خوش حال لوگ بھی ہوتے ہیں۔

اس صورت حال کے پیدا ہونے کی ابتدأ وجہ یہ ہوئی کہ صلح حدیبیہ کے بعد لوگ اسلام میں تیزی سے داخل ہونے لگے تھے۔ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جب اسلامی فتوحات کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ ان نو واردوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی چلی گئی کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول نظم دشوار ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے تو ایک بار یہاں تک تمنا کی کہ کاش ہمارے اور کافر ملکوں کے درمیان آگ کی دیوار حائل ہوتی تا کہ یہ سلسلہ رک جاتا، اور ان نو واردوں کی تعلیم و تربیت کا پوری توجہ سے بندوبست کیا جا سکتا۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو بعد کی اسلامی تاریخ کا رنگ کچھ دوسرا ہی ہوتا۔ لیکن اللہ کی مشیت یہی تھی کہ آئندہ آنے والی پودیں (generations) ہر زمانے میں فتنوں اور آزمائشوں کے ماحول سے گزریں تا کہ ان میں جو سعید روحیں ہوں وہ ان فتنوں کا مقابلہ کر کے اپنے ایمان کو جلا دے سکیں۔

"السابقون" سابقون کیسے بنے؟

یہ بات تو آپ کو اوپر معلوم ہو چکی کہ سب سے پہلے السابقون الاولون تیار ہوئے۔ اب یہ بھی جان لینا چاہئے کہ یہ کس طرح تیار ہوئے اور تیار ہو کر کیسے بن گئے تھے؟ یہ جاننے کے لئے ذرا اوپر سے چلنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی لامحدود صفاتِ حسنہ میں سے کچھ تو وہ ہیں جو صرف اسی کے لئے مخصوص ہیں، بندے ان سے اپنے کو متصف کر ہی نہیں سکتے، اور اگر ان میں سے کسی صفت کا وہ ادعا کریں گے تو سرتا سر جھوٹ ہو گا اور شرعی طور پر حرام۔ جیسے الوہیت، حاکمیت، کبریائی، عظمت وغیرہ۔ باقی صفتیں ایسی ہیں جن کو بندے کے لئے اپنانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہی مطلب ہے حضورؐ کے اس ارشاد کا تخلقوا باخلاق اللہ " یعنی اپنے اندر اخلاقِ الٰہی پیدا کرو"۔ جو بندہ ان صفات سے جس حد تک اپنے کو آراستہ کرے گا اس کا درجہ اتنا ہی بلند ہو گا۔ حضور اکرم ﷺ ان صفات سے بدرجہ اتم متصف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے بارے میں فرمایا کہ آپؐ بلند ترین اخلاق کے حامل ہیں (انک لعلیٰ خلق عظیم) اور اس طرح آپؐ کی ذات خیر و صلاح اور حق کا نمونۂ کامل (symbol) قرار پائی۔ لیکن یاد رہے کہ آپ کی حیثیت دوگونہ تھی۔ ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے بندے تھے دوسرے یہ کہ آپؐ اس کے رسول بھی تھے۔ اس طرح آپؐ کی ذات میں دو طرح کی صفات کمال جمع تھیں۔ ایک اللہ کے بندہ کامل ہونے کی صفات۔ دوسرے اس کے رسول برحق ہونے کی صفات اور دونوں ہی طرح کی صفات کے لحاظ سے آپؐ کامل ترین تھے۔ ان میں سے دوسری حیثیت سے تعلق رکھنے والی صفات، یعنی صفات نبوت و رسالت اور ان کے تقاضے تو آپؐ کے لئے مخصوص تھے۔ ان صفات میں کوئی بھی امتی آپؐ کا ذرہ برابر بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ جبکہ پہلی حیثیت سے تعلق رکھنے والی صفات یعنی صفات بندگی سے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ آراستہ کرتے رہنا امت کے سبھی افراد پر فرض ہے، ان سے جس قدر بھی کوئی شخص اپنے کو آراستہ کرے گا اسی قدر اللہ کے یہاں اس کا درجہ بلند ہو گا۔ اس معاملے میں سب سے اونچا مقام رکھنے والوں ہی کو السابقون فرمایا گیا ہے۔ یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کے لحاظ سے اتنے پختہ تھے، اور ہوتے ہیں کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے سوا ان کو کسی چیز سے مطلب نہیں ہوتا۔ ان کے لئے کسی کام کے کرنے یا کسی کام سے رکنے کے لئے اتنا جان لینا کافی ہوتا ہے کہ اس کام کے عوض خدا کی خوشنودی حاصل ہو گی یا ناراضی؟ اور آخرت میں اس کا اچھا نتیجہ نکلے گا یا برا؟ دنیا ان کی نگاہ میں ہیچ ہو گئی تھی۔ اللہ کی محبت کے سلسلے میں جب ان کو بتایا گیا کہ اس کے رسول کے اتباع کرنے سے ہی اللہ ان سے محبت کرے گا تو وہ

لوگ آپؐ کی پیروی کے انتہائی حریص ہوگئے اور اس معاملے میں ایک دوسرے سے مسابقت (competition) کرنے لگے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم۔ ’’ اے نبی، لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا ہے‘‘۔ (آل عمران:۳۱)

جس طرح یہ لوگ اللہ کی رضا طلبی میں سرگرم تھے اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی ان کی دلجوئی برابر پیش نظر رہی۔ چنانچہ دنیا والوں کو جو مال و متاع میسر تھا ان میں سے نمایاں چیزوں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے انہیں سمجھایا کہ یہ سب دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم نے تمہارے لئے آخرت میں جن غیر معمولی نعمتوں کا اہتمام کر رکھا ہے ان کے مقابلے میں ان دنیوی چیزوں کی شمہ برابر بھی اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ ان نعمتوں کا آغاز آخرت میں اس طرح ہوگا کہ پل صراط پار ہوتے ہی انہیں اللہ تعالیٰ دنیا جہان کی ساری لذتیں روٹی کی شکل میں چکھادے گا تاکہ کبھی بھی ان کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ نہ معلوم دنیا کی کون کون سی لذتیں تھیں جن سے ہم لطف نہیں اٹھا سکے۔ اس کے بعد جب وہ جنت میں داخل ہوچکیں گے تو ان کی سب سے پہلی تواضع ایک گلاس جنت کے پانی سے کی جائے گی، جس کی لذت کا یہ حال ہوگا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل انہوں نے دنیا کی ساری لذتوں کا جو مزہ روٹی کی شکل میں چکھا تھا وہ سب ان کو ہیچ معلوم ہوگا۔ دوسری طرف جنت کی دیگر اعلیٰ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی اس پانی کے پینے سے ان کے اندر پیدا ہو جائے گی، جیسا کہ بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو اسے پہلے سیال چیز ہی دی جاتی ہے۔

دنیا میں بڑے لوگوں اور لیڈروں کی تعظیم و تکریم کا ایک بظاہر شاندار مگر فی الواقع ابلہ فریب طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ بڑے بڑے جلوس کے ساتھ نکلتے ہیں۔ ان کے لئے دروازے (gate) بنائے جاتے ہیں۔ ان کا نعروں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مقرب و محبوب بندوں کا بھی آخرت میں استقبال ہوگا، جو دنیا کے استقبالوں کی طرح نمائشی اور کھوکھلا نہ ہوگا، بلکہ واقعی معنوں میں تعظیمی اور تکریمی استقبال ہوگا۔ اللہ کے یہ محبوب بندے جلوس کی شکل میں جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ جنت کے دروازے ان کے لئے سجائے جائیں گے اور پہلے ہی سے کھلے رکھے جائیں گے۔ ان کا استقبال جنت کے فرشتے سلامتی کی دعا اور بشارت کے ساتھ کریں گے۔ نیز دنیا والوں کی عارضی اور وقتی آؤ بھگت کے برخلاف انہیں اس جنت میں ہمیشہ رہنے کی خوشخبری اور مبارکباد دیں گے۔

وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا۔ حتی اذا جاء وھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلٰم علیکم طبتم فاد خلوھا خٰلدین۔ ’’اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جاچکے ہوں گے تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ ’’سلام ہو تم پر، بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لئے‘‘۔ (الزمر:۷۳)

واقعی تعظیم و تکریم کی اس سچی بشارت نے ان کی نگاہ کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ دنیا میں لیڈری کی خواہش ان کے لئے بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی تھی، اور اگر اللہ کی مشیت کے تحت انہیں کبھی جلوس اور استقبال سے سابقہ پڑا، یا کسی ملک میں فاتحانہ داخل ہونے کا موقع ملا تو ان کے نفس نے اس سے کوئی لذت نہیں لی اور وہ پوری فقیرانہ بے نیازی کے ساتھ ان مرحلوں سے گزر گئے۔

دنیا والے اپنی دنیوی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان محبوب بندوں کے سامنے جنتی زندگی کا ایک سے ایک بلند معیار کا نقشہ کھینچ کر انہیں اس کا ایسا طالب اور حریص بنا دیا کہ دنیوی زندگی کے معیار کی بلندی ان کے

لئے کوئی مطلوب شے رہ ہی نہیں گئی، اور اگر اللہ کی مشیت کے تحت دنیا میں ان کو دولت ملی بھی تو اس کو اپنے دنیوی معیار کو بڑھانے کے بجائے آخرت کا معیار بڑھانے کے لئے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ دنیا میں عیش و آرام حاصل کرنے کی خواہش سے انہیں یکسر بے نیاز بنا دیا گیا تھا۔

حضرت عمرؓ ایک بار حضورؐ کے پاس آئے، گرمی کا موسم تھا۔ حضورؐ کرتا اتار کر کھجور کی چٹائی پر لیٹے تھے جس کی وجہ سے جسم مبارک پر چٹائی کے پتوں کے گہرے نشانات پڑ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ آبدیدہ ہو گئے، اور کہا کہ یا رسول اللہ قیصر و کسریٰ جیسے دشمنان خدا تو طرح طرح کے آرام سے رہتے ہیں اور آپؐ اس حال میں ہیں۔ آپؐ اجازت دیں تو ہم آپؐ کے لیٹنے کے لئے کوئی گدا بنا دیں۔ آپؐ نے فرمایا، اے عمرؓ! کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ لوگ دنیا لیں اور ہم آخرت۔ اس ارشاد نبویؐ نے حضرت عمرؓ پر ایسا اثر کیا کہ جب آپ خلیفۃ المسلمین اور اپنے وقت کے دنیا کے سب سے بڑے حکمراں ہوئے تو حکمرانی کی شان و شوکت سے کوسوں دور رہے۔ ایک بار کسی ملک کا سفیر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے دیکھا کہ آپ ایک درخت کے نیچے زمین پر اینٹ کا تکیہ لگا کر لیٹے ہیں۔ اس منظر نے آپ کو یا اسلام کو اس کی نگاہ میں کچھ بے وقعت نہیں بنایا، بلکہ حد درجہ اونچا اٹھا دیا اس کا خود اقرار تھا کہ ''میں نے بہت سے بادشاہوں کی شان و شوکت اور ان کا دبدبہ و جلال دیکھا ہے مگر اس سے کبھی مرعوب نہیں ہوا، لیکن یہاں تو میرا حال ہی دگر گوں ہو گیا ہے۔''

مال و دولت کے بارے میں ابتدا ہی سے ان کی تربیت اس طرح کی گئی کہ اپنے کو اپنے مال کا مختار مطلق نہ سمجھیں، بلکہ امین سمجھیں، اور اس میں سے اپنی ذات پر صرف ناگزیر ضرورت کی حد تک ہی خرچ کریں۔ بقیہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے دین کی اشاعت، حفاظت اور ترقی کی جدوجہد میں نیز محتاجوں پر خرچ کرتے رہیں۔ چنانچہ خود آں حضورؐ کی دولت جو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے کاروبار سے حاصل ہوئی تھی، سب کی سب دین پر خرچ ہو گئی اور آپؐ کے ان صحابہؓ نے بھی، جن کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا تھا، ایسا ہی کیا۔ ان کو اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ اگر ہم نے اللہ کے دیے ہوئے مال کو صرف اپنی ذات پر خرچ کر ڈالا تو کہیں قیامت میں اللہ تعالیٰ یہ نہ فرمادے کہ تم نے اپنا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں ہی لے لیا اور اپنی دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیا، اب یہاں تمہارا کیا استحقاق باقی رہ گیا ہے؟ اس طرح کا احساس رکھنا دراصل ان کے کمال خشیت کا نتیجہ تھا ورنہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ بات جہنم میں کفار سے کہی جائے گی نہ کہ اہل ایمان سے۔

ویوم یعرض الذین کفروا علیٰ النار، اذھبتم طیبٰتکم فی حیاتکم الدنیا و استمتعتم بھا، فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق وبما کنتم تفسقون۔ ''پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لاکھڑے کئے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا ''تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا، اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا''۔ (الاحقاف:۲۰)

ان کا یہ احساس آگے چل کر اس وقت تو پریشانی کی حد تک بڑھ گیا تھا، جب دولت کی ریل پیل کی وجہ سے امداد یا خیرات لینے والا کوئی فرد ملتا ہی نہ تھا۔

اللہ سے تعلق دین کی روح ہے اور اس تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی سب سے موثر اور کارگر تدبیر نماز ہے، بالخصوص رات کی طویل نماز۔ آپؐ کے ساتھ آپؐ کے اکثر صحابہ بھی اس نماز (تہجد) کا اہتمام کرتے تھے۔ اگرچہ پانچ وقت کی نمازیں فرض

ہو جانے کے بعد تہجد کی نماز صرف آپؐ کے لئے فرض رہی اور امت کے لئے نفل ہو گئی تھی، اس کے باوجود آپؐ اپنے مخصوص صحابہؓ کو اس کی تاکید کیا کرتے تھے بلکہ نگرانی بھی فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپؐ اسی غرض سے گشت پر نکلے تو حضرت عمرؓ کو تہجد کی نماز میں قرآن زور زور سے اور حضرت ابوبکرؓ کو بہت مدھم آواز میں پڑھتے سنا۔ دن میں آپؐ نے دونوں حضرات سے اس کی وجہ دریافت فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں زور زور سے اس لئے پڑھ رہا تھا کہ اور لوگ بھی اٹھ جائیں۔ آپؐ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ کچھ پست آواز سے قرأت کیا کریں اور حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ وہ اپنی آواز کچھ بلند کریں۔ نماز کے اندر کی قرأت قرآن میں یا عام تلاوت میں جہاں پر ڈراوے کی آیتیں آتی تھیں وہاں آپؐ پر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ ایسا ہی کچھ حال آپ کے اصحابؓ کرام کا بھی تھا، اور جن آیتوں میں بشارت ہوتی تھی ان کو پڑھ کر آپؐ پر خوشی وانبساط طاری ہو جاتا تھا۔ میں نے سیرت کی کتابوں میں جب یہ بات دیکھی تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کس طرح ہوتا تھا؟ کیوں کہ قرآنی آیات کا حال یہ ہے کہ ڈراوے اور خوش خبری کی، دونوں طرح کی آیتیں یکے بعد دیگرے آتی چلی جاتی ہیں۔ اس قدر جلد جلد انسان کے مزاج میں ایسی تبدیلیاں کیسے رونما ہو سکتی ہیں؟ مگر جب میں نے چھوٹے بچوں کو دیکھا کہ آنسوؤں سے رو رہے ہوتے ہیں، لیکن اگر اسی درمیان انہیں کوئی خوش کر دینے والی چیز سامنے آجاتی ہے تو یکا یک خوش ہو کر مسکرا اٹھتے ہیں، اور پھر چند لمحوں بعد ہی اگر بات ان کی خاطر کے خلاف واقع ہو جاتی ہے تو پھر رونے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بات میری سمجھ میں آگئی کہ جس طرح بچہ اپنی کسی طلب کی تکمیل سے خود کو مجبور اور بے بس پا کر اور اپنے بڑوں کو اس پر قادر سمجھ کر رو اٹھتا ہے، تاکہ ان کی شفقت اور توجہ کو اپنی طرف مبذول کرالے، اور جب ان کی اس شفقت اور توجہ کا اظہار ہو جاتا ہے تو فوراً خوش ہو جاتا ہے، کچھ ایسا ہی معاملہ آں حضورؐ اور آپؐ کے زیر تربیت صحابہؓ کا بھی تھا (اور سبھی سچے اہل ایمان کا ہوا کرتا ہے) وہ اپنے کو بچے سے بھی زیادہ مجبور محض باور کرتے اور اللہ جل شانہ کو قادر مطلق یقین کرتے تھے۔ اس لئے ابھی خوف کی اور ابھی مسرت کی کیفیتوں کا ان پر طاری ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ علم اور طاقت کے معاملے میں بچہ تو اپنے ماں باپ کے مقابلے میں بہر حال کچھ نام کی حیثیت رکھتا بھی ہے، لیکن آدمی اللہ کے مقابلے میں یہ نام کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا نبیؐ اور اصحابؓ نبیؐ کو پورا شعور تھا۔ اس شعور نے ان کو بندگی کے اس مقام تک پہنچا دیا تھا جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور پھر اسی چیز نے اللہ کو ان سے اتنا راضی کر دیا کہ جب کبھی اس نے ان کی اخروی کامیابی کا تذکرہ کیا تو ان سے اپنے راضی ہونے کا ذکر پہلے کیا، اور یہ بات بعد میں فرمائی کہ وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ رضی اللہ عنھم پہلے فرمایا اور رضوا عنہ بعد میں۔ اسی طرح ان بندگان خاص کے مقام محبت کا جہاں تذکرہ کیا ہے وہاں پہلے ان سے اپنی محبت کا ذکر کیا ہے اور اپنے سے ان کی محبت کا ذکر بعد میں کیا ہے یحبھم (وہ ان سے محبت کرتا ہے) پہلے فرمایا اور یحبونہ (وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں) بعد میں فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی صفات حسنہ کو اپنایا تو اس نے آپؐ کا مقام عالی یہ قرار دیا کہ "اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں" اسی طرح جب آپؐ پر ایمان لانے والوں نے آپؐ کی صفات میں ممکن حد تک اپنے کو رنگا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بھی فرمایا "اللہ وہ ہے جو تم لوگوں پر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور وہ مومنوں پر بڑا مہربان ہے"

بحث کا خلاصہ

اوپر کی پوری گفتگو سے جو باتیں واضح ہوئیں وہ یہ ہیں:

(۱) نبیؐ کی دعوتی جدوجہد کے نتیجے میں سب سے پہلے ایک ایسی ٹیم تیار ہوئی جس کا ہر فرد اللہ کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخرت

کی کامیابی کے حصول پر جس کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ دنیا کا فائدہ اور نقصان جس کی نظر میں ہیچ تھا۔ یہ لوگ محض اپنے اندرونی تقاضے سے اسلام کے ایک ایک حکم پر عمل کرنے والے تھے۔ کسی خارجی دباؤ کے محتاج بالکل نہ تھے بلکہ خود اس حیثیت میں تھے کہ دوسروں کے نگراں بنیں، چنانچہ وہ ایسے بنے بھی، اور پورے معاشرے پر اسلامی احکام کا نفاذ بنیادی طور پر انہی کے ذریعے ہوا۔

(۲) اس کے بعد ایک دوسرا گروہ وجود میں آیا جو تعداد میں پہلے گروہ سے تو بڑا تھا مگر ایمان وعمل کے لحاظ سے اس سے کم تر تھا، اس لیے خارجی نگرانی اور تعلیم وتربیت کا محتاج تھا۔ ان کی اس ضرورت کو پہلے گروہ نے پورا کیا جس کے نتیجے میں اس کے اندر بھی اتنی پختگی آتی گئی کہ وہ پہلے گروہ کا گویا دایاں بازو بن گیا، اور اس طرح دونوں گروہ مل کر بڑی طاقتور ٹیم بن گئے جو پورے معاشرے میں اسلامی احکام کو جاری وساری کئے ہوئے تھی۔

(۳) آخر میں ایک ایسا تیسرا گروہ معاشرے کا حصہ بنا جو کثیر تعداد پر مشتمل تھا اور جس کے افراد ایمان وعمل میں بہت پیچھے اور نفس امارہ سے بری طرح مغلوب تھے۔ اس لئے ان سے اسلامی احکام کی از خود پابندی کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور اس کے لئے ضروری تھا کہ طاقت اور قانون کے دباؤ میں انہیں رکھا جائے۔

یہ تیسرا طبقہ ایک طرف تو بڑی تیزی کے ساتھ تعداد میں بڑھتا گیا دوسری طرف مختلف وجوہ سے اس کی مناسب تعلیم وتزکیہ کا نظم نہ رکھا جا سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ آگے چل کر اس کا حال ابتر سے ابتر ہوتا چلا گیا، اور اسلام کے دشمنوں کے لئے ایک بڑی عمدہ کمین گاہ بن گیا۔ ہوتے ہوتے پہلا گروہ، جو دراصل معاشرے کی جان تھا، تعداد میں کم سے کم اور غیر موثر ہو گیا اور کچھ ایسا ہی حال دوسرے گروہ کا بھی ہوتا چلا گیا۔ بالآخر اسلامی معاشرہ درہم برہم ہو کر عملاً بہت بڑی حد تک غیر اسلامی ہو کر رہ گیا۔

باب دوئم

اسلامی معاشرے کی تعمیر نو

اب ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ اس بکھرے اور بگڑے ہوئے معاشرے کو دوبارہ اسلامی معاشرہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کی بنیادی باتیں، جن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، درج ذیل ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ کی بنائی ہوئی امت موجود ہے۔ اس لئے مسئلہ کسی نئی امت کے بنانے کا نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود امت کی اصلاح کا ہے۔

(۲) اس امت میں جس طرح ہر زمانے میں تینوں طرح کے لوگ موجود رہے ہیں اسی طرح آج بھی ہیں۔ اگرچہ تناسب میں بہت فرق آ گیا ہے۔ بہت بڑی اکثریت تیسرے درجے کے مسلمانوں پر مشتمل ہے، جب کہ دوسرے درجہ کے بہت کم اور پہلے درجے کے مسلمان بہت ہی کم تعداد میں ہیں۔

(۳) رسول اللہ ﷺ نے فرما رکھا ہے کہ اس امت کا معاملہ جس طرح پہلی بار درست ہوا ہے اسی انداز پر آئندہ بھی درست ہوگا۔ یہ ایک ہدایت بھی ہے اور ایک آگاہی بھی ہے۔ ہمیں معاشرے کی تعمیر نو کے سلسلے میں اس ہدایت نبوی کو دانتوں سے پکڑے رہنا ہوگا، ورنہ دوسرا کوئی طریقہ ہرگز کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچا سکے گا۔

(۴) غیر مسلموں کو تو ایمان لانے کی دعوت دی ہی جاتی ہے، لیکن نسلی مسلمان بھی اس ضرورت سے بلند نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں یہ مغالطہ عام ہے کہ وہ تو خود ہی صاحب ایمان ہیں، ان کو دعوت دینے کا کیا سوال؟ اس مغالطہ کو دور ہو جانا چاہئے اور اسے وقت کی اولین ضرورت سمجھنا چاہئے کہ جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہیں ان کو بھی بظاہر تو نہیں مگر فی الواقع ایسی ہی دعوت دی جائے گی

جیسی کہ اوروں کو دیتی ہے۔ البتہ ان سے گفتگو کا انداز اور افہام وتفہیم کی نوعیت کچھ بدلی ہوئی ہوگی۔ اس دعوت کو اصطلاح میں ''تجدید ایمان'' کی دعوت کہتے ہیں۔

(۵) عمارت کی ایک بنیاد ہوتی ہے جس پر اس کا پورا ڈھانچہ ٹھہرا ہوا ہوتا ہے۔ اگر یہ بنیاد کمزور ہوتی ہے تو ڈھانچہ بھی کمزور رہتا ہے اور اگر بنیاد سرے سے موجود ہی نہ ہو تو کوئی کمزور ڈھانچہ بھی وجود میں نہ آسکے گا۔ اسی طرح اسلامی معاشرے کی تعمیر کے لئے بالکل ناگزیر ہے کہ سب سے پہلے اس کی مضبوط اور ٹھوس بنیاد بنائی جائے، پھر ڈھانچے کی تعمیر کی جائے۔ اسلامی معاشرے کی یہ بنیاد السابقون کی ٹیم کی شکل میں ظہور میں آیا کرتی ہے۔ اس لئے اگر یہ ٹیم تیار نہ کی جاسکی تو آگے کی کوششیں لاحاصل ہو کر رہ جائیں گی۔

(۶) مسلمانوں کے اس بگڑے ہوئے معاشرے کو اسلامی معاشرے میں تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد اسی طرح کرنی ہوگی جس طرح رسول اللہ ﷺ نے کی تھی۔ یعنی اپنی سکت کی حد تک ایک ایک بندہ خدا کو سچے ایمان اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کی تلقین کرتے رہنا ہوگا۔ اس کوشش کے نتیجے میں جہاں پہلے گروہ یا پہلی قسم کی ٹیم کی صف میں جگہ پانے والے افراد ابھر کر سامنے آتے جائیں گے وہاں دوسرے گروہ یا دوسری قسم کی ٹیم کے درجے کے لوگ بھی نسبتاً زیادہ تعداد میں ملتے جائیں گے۔ اور پھر ان دونوں طرح کے لوگ مل کر وہ کارواں بنتے جائیں گے جس کی منزل مقصود صحیح اسلامی معاشرے کا قیام ہوگی۔ مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ دعوت صرف خاندانی مسلمانوں ہی کو دینا ہے، نہیں، تمام ہی انسانوں کو دینا ہے۔ اور پھر جو لوگ بھی اس آواز پر لبیک کہتے جائیں خواہ وہ پہلے کے مسلمان ہوں یا غیر مسلم ان سب کو اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی مہم (Process) میں لگاتے چلے جانا ہے۔

(۷) تیسرے درجے کے لوگ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اپنے نفس سے اس درجہ مغلوب ہوتے ہیں کہ محض سمجھانے بجھانے سے وہ احکام دین کے پابند نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ان کو اسلامی معاشرے میں رہنے سہنے کے باوجود اسلامی احکام کی خلاف ورزی سے باز رکھنے کے لئے قانون اور طاقت کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے۔ اور صاف بات یہ ہے کہ معاشرے میں طاقت کے استعمال کی ضرورت اصلاً انہیں لوگوں کے لئے ہوا کرتی ہے جس کے نتیجے میں وہ برائیوں اور نافرمانیوں کے ارتکاب سے خواہی نہ خواہی رکے رہ جاتے ہیں۔ اس امر کی حال کی شہادت سنئے۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں دستور بننے کا مسئلہ کھڑا ہوا اور ہر طرف سے اسلامی دستور کا مطالبہ ہونے لگا۔ اس وقت عام گفتگو کا موضوع یہی تھا کہ پاکستان کا دستور اسلامی ہو یا سیکولر؟ اسی زمانے میں ایک صاحب جو کمیونسٹ تھے اور یہاں آئے ہوئے تھے، ایک گفتگو کے دوران انہوں نے از خود بتایا کہ کراچی کی ایک سڑک پر وہ گزر رہے تھے اور مخالف سمت سے ایک مزدور قسم کا آدمی آرہا تھا جس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ انہوں نے اس کو روکا اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کا خیال کیا ہے، اس سے پوچھا کہ پاکستان کا دستور کیسا ہونا چاہئے، اسلامی یا غیر اسلامی؟ اس سوال کا سننا تھا کہ وہ شخص، جو معمول کے مطابق سیدھا کھڑا تھا، تن گیا اور سر اوپر کر کے بولا ''اسلامی'' انہوں نے اس کی بوتل کی طرف اشارہ کیا تو اس نے اسی طرح تنتے ہوئے انداز میں جواباً کہا کہ اس سے کیا ہوتا ہے؟ مجھے اس گناہ کی عادت لگ گئی ہے جو چھوٹتی نہیں، اسلامی حکومت ہو جائے گی تو وہ مجھ سے زبردستی چھڑا دے گی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے بعد وہ خاموشی سے وہاں سے چل دئے۔

تحریک اور دعوت

اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے اس کام کو تحریک کی شکل میں چلانا ہوگا، اس سلسلے میں کچھ بنیادی نکات سمجھ لینا ضروری ہیں:

(۱) تحریک کا لفظ جب سامنے آتا ہے تو ذہن فوراً قواعد وضوابط، عہدوں اور مناصب اور ان کے لوازم کی طرف چل پڑتا ہے۔

حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی ضرورت اگر ہوسکتی ہے تو تحریک کے اپنی منزل مقصود تک پہنچ جانے کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔اس سے پہلے بالخصوص ابتدائی دعوتی دور میں انہیں کام کے عملی پروگراموں میں کوئی خاص اہمیت دے دینا فائدے سے زیادہ نقصان کا موجب ہوگا۔ اس لئے اس قسم کی ذہنیت سے اپنے کو بچائے رکھنا ضروری ہے۔

(۲) ایمان خالص اور عمل صالح کی یہ دعوت ہر شخص کو دی جانی چاہئے۔ چاہے وہ جاہل ہو یا پڑھا لکھا، مفلس ہو یا مالدار، عوام میں سے ہو یا خواص میں سے، حکمراں ہو یا محکوم۔ یہ ساری تفریقات ہمارے لئے ہیں اور بالکل ظاہری اور سطحی نوعیت کی ہیں۔ اللہ اور اس کے دین کی نگاہ میں سارے انسان یکساں ہیں اور سبھی اس بات کے یکساں حقدار ہیں کہ انہیں سچائی اور نجات کی راہ راست دکھائی اور بتائی جائے۔

(۳) دعوت صرف ان بنیادی حقائق کی تلقین پر مبنی ہونی چاہئے کہ تم اللہ کے پیدائشی بندے ہو اور اس کے بنائے ہوئے قوانین میں جکڑے ہوئے ہو۔ لہذا اپنی زندگی کا ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہی انجام دو۔ اسی میں تمہاری دنیا اور آخرت دونوں جگہ کا بھلا ہے۔ ویسے یہ تمام تر تمہاری اپنی ذات کا معاملہ ہے۔ اس دعوت کو مانو یا نہ مانو، تم پر نہ خدا کی طرف سے کوئی جبر ہے اور نہ ہماری طرف سے، لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے)۔

(۴) اس دعوت کے سلسلے میں یہ بات بھی دوٹوک انداز میں بتادی جانی چاہئے کہ ہم تم سے اس دعوت کے بدلے میں کسی قسم کا کوئی دنیاوی معاوضہ نہیں چاہتے:

قل ما اسئلکم علیه من اجر الا من شاء ان یتخذ الیٰ ربه سبیلا ''ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے'' (الفرقان: ۵۷)۔

(۵) سماجی، اقتصادی یا سیاسی حیثیت سے جو لوگ سربرآوردہ ہوتے ہیں وہ اس طرح کی دعوت پر فوراً اپنے کان کھڑے کرلیتے ہیں۔ ان کو اندیشہ ہوجاتا ہے کہ اگر عوام نے اس دعوت کو قبول کرلیا تو ان کا جو استحصال وہ کررہے ہیں نہ کرسکیں گے۔ اس لئے وہ فوراً چالیں چلنا شروع کردیتے ہیں۔ اور سادہ مزاج عوام کو یہ کہہ کر بھڑکانا اور ڈرانا شروع کردیتے ہیں کہ اس دعوت کو قبول کرلینے کے نتیجے میں تمہارے سارے مفادات تباہ ہوکر رہ جائیں گے۔ اس لئے دعوت پیش کرنے کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح واضح کردینی چاہئے کہ جس طرح ہم تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتے اسی طرح نہ تو تمہارے اسباب و وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، نہ تم پر اپنی برتری اور سیادت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کی کوئی غرض نہ تو ہمارے پیش نظر ہے اور نہ ہمارے لئے جائز ہی ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے رب کی سچی بندگی اختیار کرلو۔ حضرت ابراہیمؑ سے نمرود نے جو جھگڑا کیا تھا وہ اسی بات پر تھا کہ وہ اسے خدا کی بندگی اور فرماں برداری کرنے کے لئے کیوں کہتے ہیں؟ جب کہ میں خود خدا ہوں۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ نے جب فرعون کو بندگی کی دعوت دی تو اس نے بھی آپؑ پر یہی الزام لگایا کہ تم یہاں اپنی بڑائی قائم کرنا چاہتے ہو، مگر آپؑ نے اس کے سامنے شروع ہی میں یہ مطالبہ رکھ کر کہ ''بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے'' اس کی اس چال کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی جو اس نے عوام کو بہکانے کے لئے یہ کہہ کر چلی تھی کہ ''یہ دونوں بھائی (موسیٰ و ہارونؑ) اس ملک میں اپنی کبریائی اور بڑائی چاہتے ہیں''۔ ظاہر ہے کہ آپ کے اس مطالبے کے بعد کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے اس بات کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ اس کی قوم کو وہاں سے نکال کر خود اپنی کبریائی قائم کریں گے۔ نبی ﷺ کو تو مخالفین کی طرف سے خود ہی دولت اور سیاسی اقتدار کی پیش کش کی گئی (چاہے یہ پیش کش کرنے والوں کے ذہن میں کوئی چال ہی کیوں نہ رہی ہو) لیکن حضورؐ نے بلا تامل اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر رہا ہوں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اسلامی سیاست ایک مستقل موضوع ہے جس کو یہاں وضاحت سے پیش کرنے کا موقع نہیں، مجمل طور پر بس اتنا سمجھ لیا جائے کہ اسلام کی سیاست کفر کی سیاست سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ اسلام میں تو سیاست کے بغیر دین کا صحیح تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔

(۶) دعوت عام مقرروں اور واعظوں کی طرح محض تقریر، تحریر اور زبان سے نہیں دی جا سکتی۔ اس کے برخلاف بالکل ضروری ہے کہ اپنی زندگی کو اسلام میں رنگ کر عملی نمونے کے ساتھ دی جائے۔

(۷) دعوت کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک منفی دوسرا اثباتی۔ یعنی ایک ردشرک دوسرا اثبات توحید۔ ردشرک میں تو صرف ایسے موثر عقلی استدلال سے کام لیا جائے جس سے انسان کے ذہن و دماغ پر شرک کی نامعقولیت واضح ہو جائے لیکن توحید کے اثبات کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کے فطری جذبات اور حسیات کو بھی متحرک کر دینا ضروری ہے۔ یہ اس لئے کہ ایمان کا واقعی معنوں میں قبول کر لینا دماغ کا نہیں، بلکہ فی الواقع دل کا کام ہے، اس لئے توحید کی طرف دعوت اس انداز سے دی جائے جس سے لوگوں کے دماغ کے ساتھ ساتھ ان کے دل بھی متاثر ہوں اور اللہ کی عبادت کے لئے وہ کشش محسوس کرنے لگیں۔ خالص فلسفیانہ اور منطقی انداز میں جو بات کہی جاتی ہے وہ انسان کے قلب و دماغ پر وہ اثر نہیں ڈال سکتی جو وہ بات ڈالتی ہے جو یقین محکم کی زبان سے اور محبت اور دلسوزی کے جذبے سے کہی جاتی ہے۔ جن لوگوں کے اندر خود یقین محکم اور محبت و دلسوزی کا جذبہ نہ ہو وہ دوسروں میں کیسے اور کہاں سے منتقل کر سکتے ہیں۔

(۸) یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئے کہ دین حق کی دعوت کا راستہ آزمائشوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ دعوت چاہے کتنے ہی خلوص، کتنی ہی محبت، کتنی ہی دلسوزی اور دنیاوی مفاد سے کتنی ہی بے نیازی کے ساتھ دی جائے اہل کفر کی طرف سے نہایت سخت ردعمل کا ہونا ضروری ہے۔ مخالفت، عناد اور ایذا رسانی کی کوئی ممکن کوشش وہ اٹھا نہ رکھیں گے اس دعوت کے دینے والے پر بھی اور اس دعوت پر لبیک کہنے والے پر بھی۔ یہ حقیقت پہلے دن سے واضح رہنی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب ایک صاحب نے کہا کہ مجھ کو آپ سے محبت ہے تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ سوچ لو کیا کہہ رہے ہو؟ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص مجھ سے واقعی محبت کرتا ہے، فقر و فاقہ اس پر اس طرح تیزی سے آتا ہے جس طرح کسی ڈھلوان زمین پر سیلاب کا پانی۔

دعوت کے لوازم

ضروری ہے کہ سورہ مدثر کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو جو ہدایتیں دی ہیں ان کو خوب غور سے سمجھ لیا جائے اور ان پر اچھی طرح عمل کیا جائے۔

(۱) پہلی ہدایت ہے "قم" (کھڑے ہو جاؤ) مطلب یہ ہے کہ اب تمہارے لئے معمول کی زندگی گزارنے کا وقت نہیں رہ گیا ہے، تم پر ایک بھاری ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے، اسے انجام دینے کے لئے کمر کس لو۔

(۲) دوسری ہدایت ہے "انـــذر" (لوگوں کو ڈراؤ) یعنی وہ بھاری ذمہ داری جس کے لئے کمر کس لینے کی ہدایت دی جا رہی ہے، یہ اور صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اس گمراہی اور کفر و شرک اور جاہلیت کے انجام بد سے اچھی طرح خبردار کر دو جس میں وہ مبتلا ہیں۔

(۳) تیسری ہدایت ہے "ربک فـــکبر" (اپنے رب کی بڑائی بیان کرو) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور وحدانیت کا اعلان کرو۔ لوگوں کو بتاؤ، کبریائی اور معبودیت اسی کے لئے مخصوص ہے۔ وہ یکتا اور بے مثل ہے۔ سب چھوٹے ہیں اور صرف وہی ایک بڑا ہے۔ سب بندے ہیں، وہی ایک تنہا معبود ہے۔ اس لئے اس کی عبادت اور اطاعت ہی تمہیں آخرت میں کامیاب بنا سکتی ہے۔

(۴) چوتھی ہدایت ہے "ثیابک فطھر" (اپنا کپڑا پاک صاف رکھو) پاک وصاف رکھنے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ اس پر میل کچیل، داغ دھبہ یا اس میں بدبو نہ ہو بلکہ اس میں یہ باتیں بھی داخل ہیں کہ وہ پاکیزہ ذرائع سے حاصل کیا اور بنایا گیا ہو اور اس کی تراش خراش بھی ایسی ہو جو پاکباز لوگوں کو زیب دیتی ہے۔لفنگوں، دنیا پرستوں، متکبروں اور پیشہ ور مذہبی لوگوں جیسا نمائشی نہ ہو۔

(۵) پانچویں ہدایت ہے "الرجز فاھجر" (گندگی سے دور ہو) یعنی ظاہری، مادی، اخلاقی، اعتقادی، روحانی غرض ہر طرح کی گندگی سے اپنے کو دور رکھو۔

(۶) چھٹی ہدایت یہ ہے "لاتمنن تستکثر" (احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لئے) یعنی لوگوں پر جو احسان بھی تم کرو، خواہ وہ کوئی مادی یا دنیوی قسم کا احسان ہو خواہ لوگوں کو حق سے روشناس کرانے کا اور ان کی تعلیم وتزکیہ ہی کا احسان کیوں نہ ہو ،اسے بالکل بے غرض اور للہ وفی اللہ ہونا چاہئے۔اس طرح کوئی وسوسہ بھی تمہارے قریب نہ پھٹکنے پائے کہ اپنے اس احسان کے نتیجے میں ان سے کچھ حاصل کرلو اور ان کا استحصال (Exploitation) کرو۔یہ استحصال مادی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مادی بھی۔غیر مادی استحصال یہ ہے کہ ہدایت اور رہنمائی کا کام کرنے کے بعد تمہیں توقع رہے کہ لوگ عزت وتوقیر سے پیش آئیں گے، ہاتھ چومیں گے، نعرے بلند کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

(۷) ساتویں ہدایت یہ ہے کہ "لربک فاصبر" (اپنے رب کے لئے صبر کرو) اسلام میں صبر کا مفہوم بہت وسیع ہے۔صبر صرف یہی نہیں ہے کہ تکلیفوں اور مصیبتوں پر یا غم اور مفلسی پر صبر کیا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ آرام وآسائش، خوشی اور تونگری پر بھی صبر کیا جائے، یعنی ان اچھے حالات میں بھی بندگی کی شان پر حرف نہ آنے دیا جائے، نہ خدا کو بھولنے پائے نہ آخرت سے غفلت ہونے پائے۔اور یہ محض اللہ کی رضا کے لئے کیا جائے، ورنہ صبر تو وہ کفار ومشرکین اور دہریئے بھی کرتے ہیں جن کے سامنے اپنا دنیوی مستقبل سنوارنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔سیاسی برتری، دولت مندی، معیار زندگی کی بلندی اور نام ونمود کے لئے وہ کیا کچھ نہیں کرتے مگر یہ سب کچھ دنیا ہی کے لئے ہوتا ہے، رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کے جیسا اعلیٰ مقصد بالکل نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ جب ایک غزوہ کے موقع پر مسلمان سخت حالات سے دوچار ہو کر کچھ بددل سے ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں گویا ایک طرح سے عار دلاتے ہوئے فرمایا:

ان تکونوا تالمون فانھم یالمون کما تالمون۔ وترجون من اللہ مالا یرجون۔ و کان اللہ علیما حکیما " اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امید وار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں۔اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم ودانا ہے۔(النساء:۱۰۴)

ان تمام ہدایتوں پر رسول اللہ ﷺ نے بدرجہ اتم عمل کیا اور پھر آپؐ کے زیر تربیت اصحاب بھی جن کو "السابقون الاولون" ہونے کا شرف عطا ہوا، اسی رنگ میں رنگ گئے۔اس سلسلے میں احساس ذمہ داری کی شدت کا عالم یہ تھا کہ اس نے آپ کی پیٹھ توڑ رکھی تھی، چنانچہ اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے لئے آپؐ نے اپنی تمام صلاحیتیں، توتیں، آرام وسکون اور مال ومتاع غرض سب کچھ اس راہ میں جھونک دیا تھا۔آپؐ کی دعوتی تگ ودو کا حال بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان لک فی النھار سبحا طویلا (المزمل:۷) (یعنی دن میں آپ کو بہت زیادہ تگ ودو کرنا پڑ رہی ہے) چوں کہ اس غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے آپ کو دن میں اللہ سے لو لگانے کا وقت کم ملتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی کہ اس غرض کے لئے رات کی طویل گھڑیوں سے کام لو۔(قم الیل الا قلیلا) (المزمل:۲) اس ہدایت الٰہی پر آپؐ برابر عامل رہے اور صف اول کے صحابہؓ بھی آپ کی اتباع میں ایسا ہی کرتے رہے۔

دعوت اور آزمائش

اسلام کے دشمنوں نے اگر چہ اہل ایمان کی انفرادی اور اجتماعی تعذیب (Torture) میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن یہ مخالفتیں اور ایذا رسانیاں ان کی ایمانی عزیمت کو ذرا بھی نہ ہلا سکیں۔ مصیبتوں اور فتنوں کے اس ریلے کے مقابلے میں وہ ایمان اور صبر کی کوئی معمولی چٹان نہیں، جو کبھی نہ کبھی بہہ بھی جاتی ہے اور ٹوٹ بھی جاتی ہے، بلکہ بھاری پہاڑ بنے رہے۔

دعوت حق کے مقابلے میں آزمائشوں کا امنڈ آنا اور آتے رہنا کسی خاص دور کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک مستقل اور دائمی سنت ہے۔ اس لئے آج بھی جو لوگ اس کام کے لئے اٹھیں گے ان کو بھی لازماً ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دوست احباب کی طرف سے ان پر طعن و تشنیع بھی ہوگی، ہر طرف سے لعنت ملامت کی بوچھار بھی ہوگی، پھبتیاں بھی کسی جائیں گی، شوہر یا بیوی بچوں سے کشمکش بھی کرنی پڑے گی، والدین ڈانٹ پھٹکار کر اپنے گھر سے نکال بھی دے سکتے ہیں، دین کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹاتے دیکھ کر اہل و عیال مخالفت پر بھی اتر آئیں گے، غنڈے پیچھے لگا دیئے جائیں گے، خوف و ہراس کا ماحول بھی طاری کر دیا جائے گا تاکہ اعصاب جواب دے جائیں، جیل اور پھانسی تک کی بھی نوبت آ سکتی ہے۔ غرض وہ سب کچھ سامنے آ سکتا ہے جس کا سامنا ان اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کرنا پڑا تھا۔ اس لئے یہ کام فی الواقع انہی خوش بختوں کے کرنے کا ہے جو ان خطرات سے پنجہ آزما ہونے کی جرأت رکھتے ہوں۔ محض اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی کے لئے کوشاں رہنا اور دوسرے بندگان خدا کو بھی مقصود کی طرف بلانا ابلیس کو سخت ناپسند ہے، اس لئے وہ اپنے کارندوں کو اس دعوت کو مٹا دینے یا بے اثر کر دینے کی بری سے بری تدبیروں پر اکساتا رہتا ہے، ایسی صورت میں دعوت حق کی راہ کانٹوں بھری راہ ہی ہو سکتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بڑا دنیوی مقصد بھی قربانیوں، تکلیفوں اور صعوبتوں کے بغیر حاصل نہیں ہوا کرتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اپنے سامنے صرف دنیا کے مفادات رکھتے ہیں وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے طرح طرح کی صعوبتوں اور تکلیفوں کو صبر کے ساتھ جھیل جاتے ہیں۔ حالانکہ بڑا فرق ہے طالب آخرت کے صبر میں اور طالب دنیا کے صبر میں۔ ایک آدمی اگر برسرعام اس لئے پیٹا جائے اور اسے اس لئے جان لیوا اذیتیں پہنچائی جائیں کہ وہ دولت کا یا حکومت کا طالب ہے، اور ایک دوسرا شخص ہو جسے دولت یا اقتدار حکومت یا اسی طرح کے کسی بھی دنیوی مطلوب سے کوئی واسطہ نہ ہو مگر اسے ایسی اذیتیں صرف اس لئے پہنچائی جائیں کہ وہ کیوں پوری بے نفسی کے ساتھ خدا کو راضی کرنے اور اپنی آخرت سنوارنے کی کوشش میں خود لگا ہوا ہے اور دوسروں کو بھی اسی بات کی دعوت دیے جا رہا ہے۔ پہلے شخص کی حالت دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں کسی صالح جذبے کے پیدا ہونے کا کوئی سوال نہ ہوگا، لیکن دوسرے شخص کا حال دیکھ کر کتنے ہی دلوں کی دنیا بدل جائے گی۔

اب جب کہ اسلامی معاشرے کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور اس پر عام طور سے نفس پرستی اور دنیا طلبی کا غلبہ ہے، اسے جو لوگ پھر سے قائم کرنے کے لئے دل کی سچی تڑپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے ان کے لئے ''السابقون کے زمرے میں شامل ہونے کی خوش خبری ہے۔ بلکہ انہیں السابقون الاولون کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ میری امت میں وہ لوگ پیدا ہوں گے جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ تم سے بہتر ہوں گے یا تم ان سے بہتر ہو۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ ہم سے بہتر کیسے ہو سکتے ہیں؟ جب کہ ہم نے آپؐ کو دیکھا، آپؐ کی صحبت کا فیض اٹھایا اور براہ راست آپؐ کی تربیت میں رہے۔'' آپؐ نے جواب دیا ''تم نے مجھے دیکھا اور دیکھ کر ایمان لائے۔ پھر تم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے پہلے میری مزاحمت کی تھی اور اس کے بعد ہماری صفوں میں داخل ہوئے ہیں، جب کہ وہ لوگ مجھ کو دیکھے بغیر اور کسی تامل کے بغیر مجھ پر ایمان لانے

والے ہوں گے اور میری اطاعت کریں گے" (اس مفہوم کی احادیث کئی جگہ آئی ہیں، مسند احمد، الجزء الرابع، ص ۱۰۶۔ جامع الترمذی، ابواب الامثال عن رسول اللہ ﷺ)

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ بعد کے ان مومنین، صادقین اور مصلحین ملت کو السابقون الاولون کا درجہ آخرت میں ملے گا۔ دنیا میں ان کے بارے میں صرف حسن ظن رکھا جاسکتا ہے، قطعیت سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ جب کہ حضور ﷺ کے ان اصحابؓ کا معاملہ، جن کو قرآن کریم نے صراحت سے السابقون الاولون کہا ہے، بالکل مختلف تھا، وہ تو وحی الٰہی کی روشنی میں نام بہ نام معلوم ہیں۔ جب کہ بعد کے زمانوں میں اسلامی معاشرہ کے نئے سرے سے قیام کی کوشش کے دوران السابقون الاولون کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آنے والوں کے بارے میں متعین طور پر بتا دینے کے لئے وحی کا ذریعہ موجود نہیں رہ گیا ہے، اس لئے کسی کو بھی وثوق سے معلوم نہیں ہوسکتا کہ وہ واقعی اللہ کے نزدیک بھی السابقون الاولون ہیں یا نہیں؟

انداز دعوت

(۱) دعوت اس انداز سے دیں کہ صاف محسوس ہوتا رہے کہ آپ خود کو بھی امت مسلمہ ہی کا حصہ سمجھ رہے ہیں دوسرے مسلمانوں کے اندر جو گمراہیاں اور برائیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سے نہ صرف یہ کو پوری طرح دور ہیں بلکہ ان سے نفرت بھی کریں مگر خود ان لوگوں سے ہرگز نہ کٹیں، نہ انہیں حقیر سمجھیں۔

(۲) فقہی یا مسلکی اختلاف کی وجہ سے بھی کسی کو گمراہ یا فاسق نہ ٹھہرائیں۔ ان سے تبادلۂ خیال میں اپنے اندر جذباتیت اور گرمی نہ پیدا ہونے دیں۔

(۳) اپنی دعوت کو صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ غیر مسلموں کو بھی اپنا مخاطب بنائیں، ان سے گفتگو کرتے وقت حکمت سے کام لیں اور ان کی نفسیات کو اچھی طرح ملحوظ رکھیں۔ اپنے دین اور ان کے دین میں جو مشترک باتیں پائیں انہی کو گفتگو اور تبادلۂ خیال کی بنیاد بنائیں، پھر ان باتوں کے صحیح منطقی تقاضوں کی طرف ان کے ذہن کو موڑنے کی کوشش کریں، اور اس طرح انہیں دین حق کی حقانیت کا معترف بناتے جائیں۔ بات چیت کا انداز ایسا دلنشیں ہو کہ وہ ایسا تاثر نہ لینے پائیں کہ آپ ان پر کوئی چیز تھوپ رہے ہیں۔ ذہن و دماغ سے زیادہ ان کے دل سے اپیل کرنے کی کوشش کریں یہاں تک کہ وہ ایسا محسوس کریں کہ جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہ ان کے اپنے دل کی آواز ہے ۔

دیکھنا واعظ کی یہ خوبی کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

دعوت زبان سے زیادہ عملی نمونہ اور مخلصانہ تعلقات ہی کے ذریعہ موثر ہوتی ہے۔

داعی اور ربط باہمی

(۱) اپنی ذاتی کوششوں کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ دوسرے بندگان خدا کو بھی اس کام کی طرف متوجہ کریں اور انہیں دعوت دیں کہ وہ بھی اس مہم کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس کوشش کے نتیجے میں جتنے لوگ آتے جائیں وہ سب آپس میں مربوط ہوتے جائیں اور باہم مل کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ اس سلسلے میں نماز کے اصول پر ایک شخص کو اپنا امام یا امیر بنالیں۔ اس امیر کی اطاعت کیسے کی جائے؟ یہ بھی نماز ہی بتاتی ہے۔

اپنے مقام سے باہر السابقون کی صفات رکھنے والے جو لوگ ہوں ان کو تلاش کیا جائے۔ ان سے رابطے کی راہیں نکالی

جائیں اور کوشش کر کے سب کو ایک لڑی میں پرو لیا جائے اور پھر ایک بڑے دائرے کا ایک قائد اور امیر بنا لیا جائے تا کہ دعوت حق کا کام زیادہ مؤثر طور پر آگے بڑھ سکے اور بڑھتا جائے۔ ''ایک لڑی میں پرونے'' کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہئے کہ موجودہ زمانے میں انجمن سازی کے لئے یا تنظیمیں قائم کرنے کے لئے عام طور پر جو طریقے رائج ہیں ویسے ہی طریقے یہاں بھی اختیار کئے جائیں گے۔ نہیں! اسلامی معاشرہ ان طریقوں سے نہیں بنا کرتا، نہ اس کا مزاج ہی انہیں گوارا کر سکتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کی تعمیر اور تنظیم اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوسری تمام تعمیروں اور تنظیموں سے بالکل مختلف چیز ہے۔ چنانچہ اس کے لئے نہ تو رواجی انداز کی ممبر سازی کرنی ہے، نہ صدر اور سکریٹری چننا ہے اور نہ کوئی ٹھیٹھ دفتری نظام قائم کرنا ہے۔ کم از کم ابتدا میں تو کافی دنوں تک اس طرح کی باتوں سے بالکل دور رہنا ہوگا۔

(۲) امیر کی اطاعت کے سلسلے میں افراط و تفریط سے بچنا ضروری ہے۔ افراط یہ ہے کہ اس کو عقیدتاً نہ سہی عملاً نبی جیسا واجب الاطاعت اور محترم سمجھ لیا جائے، اس کے سامنے بلند آواز سے بولنے کو بھی ایمان کے لئے خطرہ سمجھا جائے، اس کے کسی حکم سے اختلاف کا اظہار نہ کیا جائے، اس کی کسی غلطی پر ٹوکا نہ جائے۔ افراط کی یہ ساری شکلیں اسلامی تنظیم اور معاشرے کے لئے بہت مہلک ثابت ہوں گی۔ یہ دراصل وہ خرابیاں ہیں جو ملوکیت اور آمریت کی پیداوار ہیں۔ ڈکٹیٹروں اور بادشاہوں کو من مانی کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں کی زبان بند کر دی جائے، تا کہ وہ بلا روک ٹوک اپنی کبریائی کا سکہ چلا سکیں اور کھل کر داد عیش دے سکیں اور کسی طرف سے اختلاف کی کوئی ہلکی سی آواز بھی نہ اٹھے۔ اگر اس طرح کی ذہنیت اسلامی معاشرے میں پروان چڑھ جائے تو اس کی نتیجے میں مذہبی اور سیاسی پیشوا آگے چل کر اربابا من دون اللہ بنے بغیر نہ رہیں گے۔ اسی طرح تفریط یہ ہے کہ امیر کو آج کل کے کسی باتنخواہ امام مسجد کی حیثیت دے دی جائے کہ وہ بے چارہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی حق بات تک نہ کہہ سکے۔

(۳) امارت ہو یا کوئی اور منصب اس کو کبھی مزیدار نہ ہونے دیا جائے۔ اسلامی معاشرہ کے قیام کی جدوجہد ایک بے مزہ اور کڑوی کسیلی چیز ہے اور اس کی قیادت تو راتوں کی نیند حرام کر دینے والی ذمہ داری ہے، ضروری ہے کہ اسے ایسا ہی رہنے دیا جائے، تا کہ کوئی طالع آزما اس منصب کو اپنے کسی دنیاوی مفاد کے لئے استعمال کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

ذاتی تربیت

ابتدائی دور میں اپنی پوری توجہ اپنی تیاری اور تربیت کے اسی عملی پروگرام پر مرکوز رکھنی ہوگی جو قرآن نے اپنے مکی دور میں اہل ایمان کے سامنے رکھا تھا۔ یہ پروگرام بنیادی طور پر دو باتوں یا حکموں پر مشتمل تھا۔ ایک تو اقامت صلوٰۃ دوسرے ایتائے زکوٰۃ (اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ) ان دونوں چیزوں کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صلوٰۃ یعنی نماز کی حقیقت اور اقامت کے مفہوم، اور اسی طرح زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کی ادائیگی کے مفہوم کو ٹھیک طور سے معلوم کر لیا جائے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔

(الف) نماز

مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیا جائے کہ نماز، فرد کا تعلق اللہ سے جوڑنے والی اور اجتماعیت کے لئے رہنما اصول دینے والی چیز ہے، جب کہ زکوٰۃ نفس کو مادی حرص سے پاک بنانے والی اور معاشرے کی معیشت (Economy) کو مستحکم کرنے والی چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سب لوگ جو اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لئے پہل کریں انہیں اس بھاری مہم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے درج ذیل باتوں کا اہتمام کرنا اور رکھنا چاہیے:

(۱) نماز اس شعور کے ساتھ ادا کی جائے کہ اس وقت اللہ کے دربار میں اس کے سامنے حاضر ہوں۔ قیامت کے دن مجھے پلٹ

کر اسی دربار میں: سمانی طور پر پیش ہونا اور اپنے کیے کی جزا پانا ہے۔

(۲) پھر نماز میں یہ شعور بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ یہی نماز دنیا میں میری سب سے بڑی جائے پناہ ہے۔ایک بچہ جب کسی پریشانی سے دوچار ہوتا ہے، چاہے وہ کسی طرح کا خوف ہو یا کوئی مشکل ہو تو وہ دوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس جاتا ہے جہاں سے اس کو طاقت اور خود اعتمادی حاصل ہو جایا کرتی ہے۔اسی طرح مومن دنیا کے جھمیلوں میں طرح طرح کے اچھے اور برے حالات اور مسائل سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔کہیں اپنے کو کمزور پاتا ہے، کہیں کوئی گتھی سلجھتی نظر نہیں آتی ہے تو وہ نماز میں خدا کے حضور جا کھڑا ہوتا ہے جہاں سے اس کو توانائی بھی حاصل ہوتی ہے اور رہنمائی بھی۔

(۳) اگر چہ تہجد کی نماز پنجگانہ نمازوں کی طرح فرض نہیں ہے، مگر جہاں تک ہو سکے اس کی پابندی کا بھی اہتمام رکھنا چاہئے۔دن کے جھمیلوں اور مشغولیتوں سے فراغت کے بعد رات کے پرسکون ماحول میں ذہنی اور جذباتی یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کرنا تہجد کی روح ہے، اس لئے اس سے وہ روحانی ارتقاء نصیب ہوتا ہے جو کسی اور طرح ممکن نہیں۔

(ب) زکوٰۃ

(۱) زکوٰۃ سے مراد صرف وہ قانونی زکوٰۃ نہیں ہے جو سال میں ایک بار نکالی جاتی ہے بلکہ اس کا پورا مفہوم و مدعا یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اس کے دیے ہوئے مال کو زیادہ سے زیادہ خرچ کیا جائے اور برابر خرچ کیا جاتا رہے۔

(۲) اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہئے کہ قانوناً فرض زکوٰۃ حتی الوسع اجتماعی نظم کے ساتھ خرچ کی جائے لیکن دوسرے صدقات عام حالات میں انفرادی طور پر دیے اور خرچ کیے جانے چاہئیں، جب کہ خاص حالات میں ضرورت اور مصلحت کا تقاضہ دیکھ کر اجتماعی نظم کا طریقہ ہی اختیار کیا جانا چاہئے۔

(۳) زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی کن جذبات خیر کے ساتھ ہونی چاہئے، اس بات کا اندازہ لگانے کیلئے قرآن مجید کی ان آیتوں پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا جن میں اللہ تعالیٰ نے سچے اہل ایمان کا حال بیان کیا ہے۔مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ''اگر چہ یہ لوگ خود تنگ حالی میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کے باوجود اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں (الحشر:۹)۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا کہ ''اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اس کے باوجود کہ یہ کھانا انہیں خود مطلوب ہوتا ہے۔اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے ہیں) ہم تمہیں یہ کھانا صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کھلا رہے ہیں۔ ہم نہ تو اس کا تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ کوئی شکریہ'' (الدہر ۷۶:۸۔۹)

بڑا فرق ہے اس کھلانے میں اور اس کھلانے میں کہ کوئی ملاقاتی یا کوئی مسافر یا کوئی محتاج آئے اور اس کو اجتماعی فنڈ سے کھلا دیا جائے، اللہ تعالیٰ افراد کے درمیان اخوت اور محبت کا رشتہ دیکھنا چاہتا ہے، صرف قانون اور ضابطے کی خانہ پری نہیں۔

(ج) دیگر معمولات

ان کے علاوہ روزانہ کے معمول کے طور پر مزید کچھ باتوں کا لازماً اہتمام کیا جائے:

(۱) قرآن سے کچھ نہ کچھ پڑھنا مفہوم کو سمجھتے ہوئے۔ جو خود نہ پڑھ سکتے ہوں وہ دوسروں سے سنیں۔

(۲) سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہؓ و صحابیاتؓ کا مطالعہ، جو خود نہ پڑھ سکتے ہوں وہ دوسروں سے سنیں۔

(۴) بچوں کو قرآن اور صحیح احادیث میں بیان کئے گئے قصوں کو کہانی کے طور پر سنانا۔

اللھم ات محمد ن الوسیلۃ و الفضیلۃ والدرجۃ الرفیعۃ و البعثہ مقاما محمودا۔
واحشرنا فی زمرتہ وتحت لوائہ
واجعلنا من رفقائہ
واوردنا حوضہ
واسقنا بکأسہ وانفعنا بمحبتہ
برحمتک یا ارحم الراحمین

اے اللہ محمدؐ کو دے وسیلہ، فضیلت، بلند درجہ اور ان کو مقام محمود پر فائز کر۔
اور اٹھا ہمیں قیامت کے دن ان کے گروہ میں اور ان کے جھنڈے کے نیچے اور
اور ان کے رفقاء میں ہمیں شامل کر
اور ان کے حوض (کوثر) پر ہمیں پہنچا
اور ان کے جام سے ہمیں پلا اور ان کی محبت سے ہمیں نفع پہنچا،
اپنی خاص رحمت سے اے ارحم الرحمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

☒ ☒ ☒

اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے ایک تحریک

جس کا کوئی نام نہیں

(ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ سے لیا گیا ایک انٹرویو جو ماہنامہ افکار ملی، دہلی کے ستمبر ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

ریحان غنی: آپ کی تحریک کا نام کیا ہے؟

ضیاء الھدیٰ: تحریک کا لفظ جب سامنے آتا ہے تو ذہن فوراً اس کے نام، اس کے قواعد وضوابط، عہدوں اور مناصب اور ان کے لوازم کی طرف چل پڑتا ہے حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی ضرورت اگر ہو سکتی ہے تو تحریک کے اپنی منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد۔ اس سے پہلے ان چیزوں کو اہمیت دینا فائدے سے زیادہ نقصان کا موجب ہوگا، اس لئے اس قسم کی ذہنیت سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا ضروری ہے۔ تحریک اس انداز سے چلائی جائے کہ صاف محسوس ہوتا رہے کہ آپ خود کو بھی امت مسلمہ کا ہی حصہ سمجھ رہے ہیں اور یہ کہ دوسرے مسلمانوں کے اندر جو گمراہیاں اور برائیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ پوری طرح دور رہیں بلکہ ان سے نفرت بھی کریں، مگر خود ان لوگوں سے ہرگز نہ کٹیں اور نہ انہیں حقیر سمجھیں۔ فقہی یا مسلکی اختلاف کی وجہ سے بھی کسی کو گمراہ یا فاسق نہ ٹھہرائیں۔ ان سے تبادلۂ خیال میں اپنے اندر جذباتیت یا گرمی نہ پیدا نہ ہونے دیں۔ یہ کام تحریک چلانے والوں کی کوئی ٹھیکہ داری کا کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ساری امت کا ایسا کام ہے جس سے کسی کو اختلاف بھی نہیں ہے۔ اس لئے تحریک کا نام رکھ کر اور اپنی انفرادیت کے کسی طرح کے اظہار سے مسلمانوں کے کسی طبقے یا گروہ میں یہ تاثر پیدا ہونے دیا جائے کہ تحریک والے کچھ مخصوص لوگ ہیں یا کسی خاص تنظیم یا کسی جماعت یا کسی مسلک کی طرف اس راہ سے بلانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کے اندر یہی احساس اجاگر ہونا چاہئے کہ یہ کام ان تحریکی لوگوں کی طرح خود ان کے بھی کرنے کا ہے اور ہم اور وہ دو نہیں ہیں۔

ریحان غنی: تحریک کی غرض وغایت کیا ہے؟

ضیاء الھدیٰ: اسلام انسانی زندگی کو کچھ اصولوں کا پابند بنانے کے لیے آیا۔ اس معاملے میں جب امت میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو ایسی صورت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرما رکھا ہے کہ اس امت کا معاملہ جس طرح پہلی بار درست ہوا ہے اسی انداز پر آئندہ بھی درست ہوگا۔ یہ ایک ہدایت بھی ہے اور ایک آگاہی بھی۔ کسی عمارت کی ایک بنیاد ہوتی ہے جس پر اس کا پورا ڈھانچہ ٹھہرا ہوا ہوتا ہے۔ اگر یہ بنیاد کمزور ہوتی ہے تو ڈھانچہ بھی کمزور رہتا ہے اور اگر بنیاد سرے سے موجود ہی نہ ہو تو کوئی کمزور ڈھانچہ بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ اسی طرح ایک ایسی اجتماعیت کی تعمیر کے لیے جو اسلامی اصولوں کی پابند ہو بالکل ناگزیر ہے کہ سب سے پہلے اس کی مضبوط اور ٹھوس بنیاد بنائی جائے۔ پھر ڈھانچے کی تعمیر کی جائے۔ اسلامی اجتماعیت کی تعمیر کی اس بنیاد کو اللہ تعالیٰ نے السابقون کا نام دیا ہے یعنی ابتداءً ایسی ٹیم کا ہونا جس کے افراد میں السابقون کی صفات پیوست ہو چکی ہوں۔ اس لئے ایسی ٹیم تیار کئے بغیر آگے کی جو کوششیں بھی کی جائیں گی وہ لاحاصل ہو کر رہ جائیں گی۔ میں نے یہ تحریک اسی غرض کے لیے چلائی ہے۔

ریحان غنی: تحریک میں شمولیت کے لیے کیا شرط ہے؟

ضیاء الھدیٰ: یہ تحریک دراصل اپنے آپ کو اور دوسرے بندگان خدا کو اللہ تعالیٰ سے براہ راست جوڑنے کی کوشش ہے تاکہ ہمارا

تعلق اپنے رب سے رسمی ہونے کے بجائے قلبی اور شعوری ہو جائے۔ اور آخرت میں ہم اس کی ناراضگی اور عذاب کے بجائے اس کی رضا اور انعام کے مستحق ٹھہریں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا اس تحریک کا کوئی مخصوص نام یا تنظیمی شکل نہیں ہوگی تا کہ افراد تحریک امت مسلمہ کے جز ہونے کے علاوہ کوئی مخصوص گروہ یا جماعت نہ بننے پائیں۔ عمل کے معاملے میں ہر فرد اپنے ضمیر کا پابند اور اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ البتہ اپنی تربیت اور اپنے کام سے متعلق ضروری رہنمائی کے لیے افراد تحریک مرکزی محرک یا اس کے نمائندوں کی طرف رجوع کریں گے۔ عام افراد تحریک کو یہ آزادی ہوگی کہ وہ چاہیں تو کسی جماعت یا تنظیم یا پارٹی سے منسلک رہتے ہوئے بھی جس حد تک ممکن ہو اس کام کو کریں اور اپنی زندگی میں تبدریج صالح تبدیلی لانے کی کوشش کریں۔ ان سے صرف اس بات کا تقاضا ہوگا کہ فرائض کی پابندی اور کبائر سے اجتناب کریں اور روزانہ کم سے کم تین آیات قرآنی کا اور ہفتہ میں کم سے کم ایک صحیح حدیث اور سیرت رسولؐ یا سیرت صحابہ یا صحابیات کا مطالعہ کریں۔ مگر تحریک سے وابستہ خاص افراد جو محرک تحریک ہوں گے انہیں اپنے طرز رہائش میں رسول اللہؐ اور صحابہؓ کی طرح سادگی اختیار کرنے، اپنے علم میں اضافہ کرنے، دینی تقاضوں کو پورا کرنے اور مرکز تحریک کی ہدایتوں پر عمل کرنے کا خاص اہتمام کرنا ہوگا اور وہ کسی جماعت یا تنظیم یا پارٹی سے منسلک نہیں ہوں گے۔

ریحان غنی: تحریک کی رکنیت کے قواعد وضوابط کیا ہیں؟

ضیاء الھدیٰ: اس کام کو باضابطہ شروع کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ تازہ غسل اور اس نیت کے ساتھ تازہ وضو کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری دینے جا رہے ہیں، دو رکعت نماز اس تصور کے ساتھ ادا کریں کہ ایک دن حشر کے میدان میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس کے بعد قرآن پاک کو ہاتھ میں لے کر اپنے رفقاء کار کے سامنے اللہ تعالیٰ سے اس طرح پیمان باندھیں ''میں عہد کرتا / کرتی ہوں کہ آئندہ تیری اس کتاب کے حکم اور تیرے رسول پاکؐ کے طریقے کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی اپنی صلاحیت بھر کوشش کروں گا / کرونگی''۔ رہے عام افراد تو وہ چاہیں تو اللہ تعالیٰ سے یہ پیمان اسی طریقے پر تنہائی میں بھی باندھ سکتے ہیں۔

ریحان غنی: تحریک کے نتائج سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ضیاء الھدیٰ: تحریک کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور ماشاء اللہ لوگوں کے طرز زندگی میں عملاً تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

☆☆☆

تربیت واصلاح

نماز ایک معجزہ

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ
کی تقریروں سے ترتیب شدہ

مرتبہ
امینہ خاتون

''نماز ایک معجزہ'' پہلی بار شعبہ مطبوعات حلقہ طلبہ اسلامی بہار، سلطان گنج، پٹنہ۔۶ سے مارچ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسری بار اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا کے شعبۂ مطبوعات، ایس آئی پی، دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اور تیسری بار مکتبہ دین ودانش، رمنہ روڈ، پٹنہ سے ۱۴۱۷ھ میں شائع کیا گیا۔ یہی تیسرا ایڈیشن اس مجلّہ میں شامل ہے۔

پہلے ایڈیشن میں احمد علی اختر صاحب کی بحیثیت ناشر ایک تحریر بھی تھی اور امینہ خاتون کا پیش لفظ بھی جو تیسرے ایڈیشن میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے یہاں ہم ان دونوں تحریروں سے چند اقتباسات دے رہے ہیں۔

عرض ناشر

اردو زبان میں نماز پر مضامین اور کتابوں کی کمی نہیں، تاہم یہ کتابچہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں قارئین کیلئے ایک نئے انداز سے غور وفکر کا سامان ہے۔ نماز وہ بنیادی عبادت ہے جو دعویٰ ایمان کے فوراً بعد انسان پر لازم ہو جاتی ہے، مگر کم لوگ ہیں جو نماز کے وسیع مفہوم ومعنی، اس کی حکمتوں اور تقاضوں، اس کے فوائد اور منافع سے واقف ہوں۔۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک انسان نماز کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہ ہو، اس کے فوائد وبرکات سے متمتع نہیں ہو سکتا۔

''نماز ایک معجزہ'' نماز کا ایک سائنٹفک اور علمی مطالعہ ہے۔ یہ مطالعہ ان گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے جو نماز کی عظمت کا راز آشکارہ کرتے اور اس کی اعجازی خصوصیات کو سامنے لاتے ہیں.......

.......ان مباحث میں صاحب تقریر کی ذہانت اور فکری صلاحیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہاں ہمیں وہی ندرت وتازگی اور فکری توانائی ملتی ہے جو محترم ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کی اکثر تقریروں کی خصوصیات ہیں۔

یہ کتابچہ طالب علموں کیلئے خاص طور سے مفید ہے۔ اسی وجہ سے شعبۂ مطبوعات حلقہ طلبہ اسلامی بہار نے اسے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس کی مقبولیت خود اس کی افادیت کی دلیل بن جائے گی۔

احمد علی اختر

انچارج شعبہ مطبوعات حلقہ طلبہ اسلامی بہار

(مارچ ۱۹۷۹ء)

عرض مرتب

''اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ہی ساری حمد ہے جس کی توفیق سے میں یہ کتابچہ ہدیہ ناظرین کرنے کے لائق ہو سکی، اور اس کے بے پایاں کرم سے میں امید رکھتی ہوں کہ آئندہ بھی بیش از بیش توفیق نصیب فرمائے گا کہ اس کے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکوں۔ یہ کتابچہ دراصل محترم ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب امیر حلقہ جماعت اسلامی بہار کی تقریروں کے اقتباسات پر مشتمل ہے اور میں صرف ان کو یکجا کر کے تحریر میں لانے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔ میری زندگی کی یہ پہلی کوشش ہے، اور یہ انہیں کی حوصلہ افزائی کی مرہون منت ہے۔ جا بجا انہوں نے اصلاح بھی کی اور ترتیب دینے میں میری مدد بھی کی ورنہ یہ مضمون غیر مربوط ہونے کے سبب شائع کئے جانے کے لائق نہ ہوتا۔

امینہ خاتون

پیش لفظ

نماز کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیری کو سمجھنے کے لئے ایک واقعہ نے میرے ذہن کو ادھر متوجہ کیا۔ میری کمسنی کے زمانہ میں مناظرہ کا بڑا زور تھا۔ حالانکہ اسلام میں مناظرہ پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ اس سے مخالف فریق کا ذہن چاہے لاجواب ہو جائے یا وہ استدلال کی زبان میں لاجواب ہو جائے مگر اس کے دل میں ایک قسم کا تعصب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بات پر اڑ جاتا ہے۔ یہ بات اسلام کے لئے بہت مضر ہے، کیونکہ اسلام تو چاہتا ہے کہ گفتگو کا جو بھی انداز ہو ایسا ہو کہ سننے والے کا دل مطمئن ہو جائے نہ کہ ذہن۔ اور اس طرح اس کا امکان ہوتا ہے کہ وہ حق کو قبول کرلے گا۔ اس نفسیات کو مناظرہ چکنا چور کر دیتا ہے۔

چنانچہ جس زمانہ کی بات میں کہہ رہا ہوں اس وقت ایک مولوی صاحب تھے اور ایک پنڈت جی جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ پنڈت جی نے مولوی صاحب کو کہلوایا کہ ایک مناظرے کی محفل بلائی جائے۔ مولوی صاحب نے جواب میں کہلوا دیا کہ میں تیار ہوں مگر پنڈت جی کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میں نماز کے مسائل پر پوری طرح حاوی ہوں۔ یہ جواب سن کر پنڈت جی نے مناظرے کا خیال ترک کر دیا۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا، اور جس نے بعد میں چل کر میرے ذہن کو ادھر متوجہ کیا کہ نماز کا انتہائی غائر مطالعہ کیا جائے۔ یہ تو بچپن کی بات تھی۔ جب شعور ہو گیا تو میں نے یہ کام شروع کیا جس کے نتیجہ میں پیش نظر مضمون مرتب ہوا۔

اللہ سے دعا ہے کہ میرے اس مضمون کو شرف قبولیت بخشے اور اپنے بندوں کو حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وما توفیقنا الا باللہ۔

ضیاء الہدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز صلوٰۃ کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس لفظ کو اس لئے اپنالیا گیا کہ فارس کی پوری قوم مسلمان ہوگئی اور اپنے آبائی طریقۂ عبادت کو بھول گئی، اس لئے اس لفظ میں مشرکانہ عنصر باقی نہ رہا جس سے صلوٰۃ کے مفہوم میں گڑبڑی پیدا ہوسکتی تھی۔ بخلاف اس کے صلوٰۃ کا ترجمہ پوجا یا Prayer کیا جائے تو صلوٰۃ کا مفہوم تو اس میں آئے گا نہیں البتہ مشرکانہ طریقۂ عبادت یا عیسائیوں کا محدود مفہوم عبادت اس پر غالب رہے گا۔ ہم ہندوستانیوں کے یہاں اسلام چونکہ ایران سے ہوتا ہوا آیا اس لئے ہم صلوٰۃ سے زیادہ لفظ نماز سے مانوس ہیں اور اسی لئے اس کتاب کا نام بھی نماز رکھا جارہا ہے۔

نماز ایسی جامع اور معتدل عبادت ہے کہ اگر آدمی اس پر غور کرے تو اس کا دل پکار اُٹھے گا کہ انسان اور کائنات کے خالق کے سوا ایسی عبادت کوئی تجویز کر ہی نہیں سکتا۔ گویا نماز ایک معجزہ ہے۔ اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت یعنی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو صاف صاف پکار کر کہتی ہے کہ خدا ہے اور میں اسی کی طرف سے ہوں۔ نماز انسان کی مکمل شخصیت کے ارتقاء (Development of total personality) کی ضامن ہے۔ یہ اس کی انفرادیت کو پختہ اور اجتماعیت کو مضبوط بناتی ہے، اس کے جسم، نفس اور روح کا تزکیہ کرتی ہے، اس کے اخلاق کو سنوارنے، اس کے تمدن کو بنانے، اس کی تہذیب کو آراستہ کرنے، اس کی تنظیم میں استحکام پیدا کرنے، اس کے سماج کو ترقی دینے، اس کی سیاست کو معتدل کرنے اور اس کی معیشت کو استوار کرنے کے گر سکھاتی ہے۔ اتنا کچھ کے باوجود وہ بالکل سادہ اور سہل ہے۔

نماز کیا ھے: حدیث شریف میں ہے الصلوٰۃ عماد الدین من اقامھا فقد اقام الدین و من ترکھا فقد ھدم الدین۔ (نماز دین کا ستون ہے، جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا، جس نے اس کو چھوڑ دیا اس نے دین کو ڈھا دیا) اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نماز دین کا ستون ہے یعنی Support جس کے سہارے یا جسکے اوپر دین کی پوری عمارت قائم رہتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کے دین کیا ہے؟ قرآن شریف میں سورہ یوسف میں کہا گیا ہے ان الحکم الا للہ۔ امر الا تعبدوا الآ ایاہ۔ ذلک الدین القیم (سورہ یوسف:۴۰) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاکم مطلق نہ ماننا اور عملاً اس کے سوا کسی کے حکم کے مطابق زندگی نہ گزارنا، یہی 'الدین' ہے۔ یعنی اللہ کی مطلق حاکمیت اور اس کی بے چوں چرا فرمانبرداری کا نظام زندگی نماز کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا، اسی لئے دین کو قائم کرنا اور نماز کو قائم کرنا دونوں لازم وملزوم ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفآء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ و ذلک دین القیمۃ۔ (البینۃ:۵) . ترجمہ: ''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے بالکل یکسو ہوکر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح دین ہے۔'' اسی طرح ہر ایک نبی اور اس کی معرفت ان کی امت کو اس کا پابند کیا گیا کہ دین کو قائم کریں اور اس معاملے میں آپس میں پھوٹ نہ پڑنے دیں۔ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ۔ اس سے یہ معلوم ہوا کے دین کو قائم کرنا نہ صرف یہ کہ فرض عین ہے بلکہ نماز کو قائم کرنے کی جو بات حدیث اور قرآن کی مذکورہ آیتوں میں کہی گئی ہے وہ اسی شعور پر موقوف ہے کہ آدمی دین کو قائم کرنا چاہتا ہو۔

گزشتہ حدیث میں دو طرح کے آدمیوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو نماز قائم کریں، دوسرے وہ جو نماز چھوڑ دیں۔ نماز قائم

کرنے والے کو مقیم الصلوٰۃ کہتے ہیں اور چھوڑ دینے والے کو تارک الصلوٰۃ۔ ایک قسم اور ہے جس کو فقط نمازی کہتے ہیں۔ قرآن میں ان کو مصلّی کہا گیا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ لازماً اچھے ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ لازماً برے ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اسی لئے تیسری قسم کے لوگوں کا ذکر اس حدیث میں نہیں کیا گیا۔ گویا کہ دین کو قائم کرنے کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس کا بوجھ نہیں سہار سکتے، چاہے وہ عملاً دین کو منہدم نہ کریں مگر قائم بھی نہیں کر سکتے۔

نماز چھوڑ دینے والے کو اس حدیث میں دین کو ڈھا دینے والا بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ کام کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ دوسری حدیث میں صاف صاف کہہ دیا گیا کہ من ترك الصلوٰة متعمداً فقد كفر۔ ''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی بے شک اس نے کفر کیا''۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ کفر اور اسلام میں فرق کرنے والی چیز نماز ہے۔ اس طرح بے نمازیوں کا معاملہ صاف کر دیا گیا کہ ان کا سارا وزن عملاً کفر ہی کے پلّے میں رہتا ہے۔ اب رہے نمازی تو وہ اپنی عملی زندگی میں اچھے ہوں یا برے ہوں اگر نماز قائم نہیں کرتے مگر پابندی سے پڑھتے ہیں تو ان کو قرآن نے نمازی تسلیم کیا، بالفاظ دیگر ان کو نمازی ہونے کا سرٹیفکٹ دیا ہے۔ گویا کہ ان کا فقط نمازی یعنی پابند نماز ہونا بجائے خود کوئی مثبت قیمت نہیں رکھتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اگر ان کے اندر خوبیاں ہیں تو وہ اچھے ہوتے ہیں اور اگر ان کے اندر برائیاں ہوں تو وہ برے ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا انّ الانسان خلق هلوعاً ۰ اذا مسه الشر جزوعاً ۰ واذا مسه الخير منوعاً ۰ الا المصلين ۰ الذين هم علىٰ صلاتهم دائمون ۰ .... والذين هم علىٰ صلاتهم يحافظون ۰ (المعارج: ۱۹ تا ۳۴) ترجمہ: ''انسان تھڑ دلا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں........ اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔''

ان میں ان کے پابند نماز ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ اچھی صفات کے حامل ہونے کا بھی ذکر ہے اور اس بنیاد پر اللہ نے ان کی تعریف کی، اور جن انسانوں کی مذمت کی گئی ہے ان سے ان کو مستثنیٰ قرار دیا اور ان کو جنت کی خوشخبری دی۔ بخلاف ان کے جن لوگوں میں نماز کی پابندی کے باوجود برائیاں ہوتی ہیں ان کی مذمت کی گئی۔ جیسے فويل للمصلين الذين هم عن صلاتهم ساهون۔ اس میں نمازی ہونے کے باوجود برائیوں کی وجہ سے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

نماز کے ضمنی فوائد: انسان جسم، نفس، اور روح کا مرکب ہے۔ سب سے پہلے جسم کو لے لیا جائے۔ جسم کی صحت اور نشو و نما کے لئے مناسب غذا اور مشروب، مناسب ورزش، مناسب لباس و طہارت اور نیند ضروری ہے۔ غذا اور مشروب میں سے کچھ چیزیں حرام قرار دیدی گئی ہیں۔ ان کی حرمت کی جہاں بنیادی وجہ اخلاق پر ان کے خراب اثرات ہیں وہیں ان چیزوں میں جسم کے لئے بھی شدید نقصان چھپا ہوا ہے۔ ان سے پلا ہوا جسم اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ اور اس جسم کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔ اس طرح نماز مناسب غذا اور مشروب کا پابند بناتی ہے۔ صحت کے لئے غسل ضروری ہے۔ مخصوص حالات میں غسل فرض ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ جمعہ کے دن غسل واجب ہے اور اس کے علاوہ مسنون۔ بقیہ ہر روز پانچ وقت نصف غسل یعنی وضو فرض ہے جو جسم کے ہر اس حصے کو صاف کر دیتا ہے جس پر گرد و غبار پڑا کرتا ہے۔ اس غرض کے لئے جو پانی استعمال کیا جاتا ہے پہلے اسے ہاتھ میں لے کر آنکھ سے دیکھنا ہوتا ہے کہ کیسا ہے؟ پھر منہ سے چکھنا ہوتا ہے اور پھر ناک سے سونگھنا ہوتا ہے۔ جب ہر طرح سے اطمینان ہو جاتا ہے کہ پانی اچھا ہے تو اس سے اصل وضو شروع اور مکمل کیا جاتا ہے۔ وضو جہاں گرم مزاج والوں کے لئے فرحت بخش ہے وہیں ایسے سرد مزاج والوں

کے لئے بھی مفید ہے جن کو ٹھنڈک سے تنفس کی شکایت ہو جاتی ہے۔ پانچوں وقت ناک کو صاف کرنے کے بعد ایک بار پانی کو اتنا سُڑک لیا کریں کہ حلق تک پہنچ جایا کرے تو ان کی تنفس کی شکایت ٹھیک ہو جائے گی۔ صحت کی طرح نماز کے لئے بھی لباس کی پاکی ضروری ہے۔ حکم ہوا: وثیابک فطھر ''اپنے کپڑے پاک رکھ''۔ تندرستی کے لئے ورزش بھی ضروری ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو نماز جیسی کوئی ورزش دنیا میں نہیں ہے۔ سر سے پاؤں تک جسم کا کوئی جوڑ ایسا نہیں جس کی ورزش نماز میں نہ ہو جاتی ہو۔ رکوع اور سجدے کے ذریعے شکم اور اندرون شکم کی ورزش ہو جاتی ہے۔ سجدے اور خصوصاً رات کے طویل سجدے کے ذریعے سر کی طرف دیر تک دورانِ خون ہونے کے سبب دماغ کی ورزش ہو جاتی ہے، اور قیام اور رات کے طویل قیام کے ذریعے دورانِ خون میں اعتدال بھی پیدا کرایا جاتا ہے جبکہ دورانِ خون پاؤں کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ سجدے میں جاتے ہوئے اور پھر سجدے سے یا قعدہ سے اٹھتے ہوئے گھٹنوں کو پکڑ کر اٹھنے سے پاؤں کے پٹھوں پر خاصا زور پڑتا ہے جس سے ان میں طاقت آتی ہے۔ رکوع میں ہاتھ پر زور پڑنے سے ہاتھ کے پٹھے توانا ہوتے ہیں۔ یہ ساری ورزشیں ایسی ہیں جو عمر کے ہر حصے میں کی جاسکتی ہیں۔ صحت کی خاطر ورزش کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔

صحت کے لئے رات کو سویرے سو جانا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خلا سے Cosmic Rays نصف شب تک وافر مقدار میں آتی ہیں اور طحال ان کو قبول (Receive) کرکے اعصاب کے ذریعے سارے جسم میں پہنچا دیتا ہے اور زائدہ (Appendix) Earth کا کام کرکے ان Rays کو جسم سے باہر کر دیتا ہے۔ اس طرح جسم کو وہ زبردست توانائی حاصل ہوتی ہے جو غذا اور کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لئے سویرے رات کو نہیں سونے کے وجہ سے خاص قسم کا ضعف پیدا ہوتا ہے جس سے قوت حیات کمزور ہوتی ہے۔ نصف شب کے بعد Cosmic Rays کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سویرے سونے اور نصف شب کے بعد جاگ اُٹھنے کے لئے واضح ہدایت دی گئی ہے۔

رات کو تہجد پڑھو۔ تہجد کہتے ہیں اخیر شب کی اس نماز کو جو سونے کے بعد اُٹھ کر پڑھی جائے۔ سونے کا طریقہ یہ سکھایا گیا ہے کہ داہنے پہلو پر سونا چاہئے۔ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ اس طرح تلّی اوپر کی طرف ہو کر Aerial کا کام کرتی ہے اور Appendix نیچے کی طرف ہو کر Earth کا۔ انسانی نفس عجیب چیز ہے۔ نفس سے مراد وہ شئے ہے جسے اسلام کے سوا باقی سارے نظریات روح کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی رسائی حقیقی روح تک ہو ہی نہیں سکتی۔ نفس وہ شے ہے جس کی وجہ سے حیوانات زندہ ہیں۔ یہ نفس کسی نوع کے حیوان میں بہت ہی کمزور ہے اور کسی میں طاقتور۔ انسان میں یہ قوی ترین ہے۔ اگر صرف یہی نفس انسان کے اندر ہوتا اور روح نہ ہوتی تو وہ پیچیدہ ترین سہی ایک نرا Biological یعنی حیاتیاتی حیوان ہوتا جس میں انسانی تصرفات کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ جسم کی طرح نفس کی بھی ورزش ہوتی ہے۔ ایک ورزش تو جسمانی صحت اور صحیح نشو ونما کے لئے ہوتی ہے، جس کا ذکر کیا گیا۔ مگر ایک قسم کی ورزش اور ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں آدمی حیرتناک کام کر سکتا ہے۔ جیسے دوسری قسم کی مختلف جسمانی ورزش کے نتیجے میں نٹ اور سرکس دکھانے والے ایسے ایسے کام کرتے ہیں جو عام تندرست سے تندرست آدمی نہیں کر سکتا۔ ویسے ہی نفس کی دوسری قسم کی مختلف ورزشوں سے آدمی کے اندر کچھ خوابیدہ Inert قوتیں، صلاحتیں ابھر آتی ہیں جس سے بظاہر فوق الفطری (Supernatural) کام وہ انجام دیتا ہے جو عام آدمی کے بس کا نہیں ہوتا اگر چہ اس کا نفس کتنا ہی ترقی یافتہ ہو۔ ہم نے ابھی دیکھا ہے کہ نماز اعلیٰ ترین جسمانی ورزش ہونے کے باوجود انسان کو نٹ اور بازیگر نہیں بناتی، اسی طرح نفس کی لاثانی ورزش ہونے کے باوجود نماز انسان کو عوام کے تصور کے مطابق روحانی کرشمہ گر نہیں بناتی۔ بلکہ جس طرح جسمانی طور پر اس کی متوازن صحت کی ضامن ہے جس کا کوئی دوسرا ردعمل (Side Effect) یا اثر

مابعد (After Effect) نہیں ہوتا اسی طرح اس کے نفس کے اندر متوازن ارتقا پیدا کرتی ہے اور کوئی بُرا اثر پیدا نہیں ہونے دیتی۔

عام اصطلاح کے مطابق روحانیت جس چیز کا نام ہے اس کے حصول کے ذرائع خواہ کتنے ہی مختلف ہوں ان کا حل الاصول ارتکاز خیال (Concentration of thought) ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح جسم کا کام مادّی حرکتیں کرنا ہے اسی طرح نفس کی مابہ الامتیاز خصوصیت سوچنا اور خیال کرنا ہے۔ خیال کو مرتکز کرنے کے لئے بہت سارے طریقے ہیں اور ہر فرد کی خصوصیات کے پیش نظر ماہر روحانیات اس کو کوئی خاص طریقہ سکھاتا ہے۔ مثلاً کسی روشن نقطے پر یا سیاہ نقطے پر نظر جمانا' خاص طرح کی نشست اختیار کرنا یا خاص قسم کی حرکتیں کرنا یا خاص قسم کے بول جپنا یا خاص قسم کے تصور پر خیال کو جمانا اور جو غذا یا جو عادتیں خیال کو منتشر کرنے کی خاصیتیں رکھتی ہیں ان سے پرہیز کرنا وغیرہ۔ ان مشقوں کے ذریعے خاص خاص قسم کی صلاحیتیں اُبھر آتی ہیں، جس طرح کہ جسمانی مشقوں کے ذریعے پہلوانی یا مکا بازی یا نٹ بازی وغیرہ کی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

نماز سب مشقوں کی جامع ہے۔ وہ حرکت بھی کراتی ہے اور سکون بھی۔ وہ قیام بھی کراتی ہے اور نشست بھی۔ وہ بول جپواتی ہے اور خیال جمانے کے لئے مختلف نقطے بھی فراہم کراتی ہے۔ مثلاً اللہ کی ذات، اس کی صفات' اس کا رحم اور اس کا عتاب' آخرت میں پیش آنے والے حالات' میدان حشر میں اپنے رب کے سامنے پیشی' نامۂ اعمال' میزان' پل صراط' جہنم اور جنت وغیرہ۔ جس آدمی کا خیال جس تصور پر جم سکے اس پر اس کو جمانا چاہئے۔ اسی کی مداومت سے اس کے اندر اسی کے مناسب کوئی صلاحیت ضرور ابھر آئے گی۔ لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ روحانی بازیگری کی استعداد پیدا نہیں ہوگی۔ اس غرض کے لئے تو اسے نماز کے باہر کوئی ادنیٰ اور غیر معتدل ورزش اختیار کرنا ہوگی۔

خیال اور توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نظر کو سجدہ گاہ پر جمائے رکھنا چاہئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں نگاہ کو ناک کی نوک پر مرکوز رکھنے سے نماز کی ہر حالت میں وہیں پر مرکوز رہ سکتی ہے۔ صوفیاء کے نزدیک سینے میں کئی مقامات ہیں جن پر خیال کو جمانا مفید ہے۔ ان میں سے ایک مقام کا نام اخفی ہے۔ یہ دل کی دائیں جانب اوپر کی طرف ہے۔ قرآن شریف کی دو آیتوں کو ملانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص تجلّی کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان اللہ یحول بین المرا وقلبہ یعنی ''اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہوتا ہے'' دوسری جگہ فرمایا ہے ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (ق:۱۶) ''ہم اس کی شہ رگ (ورید) سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔'' ورید قلب کی دائیں جانب اوپر کے خانے میں خون کو گراتی ہے۔ ظاہر ہے یہ رگ بالکل قلب سے جڑی ہوئی ہے مگر اس خورد بینی دور میں اس بات کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں کہ بادی النظر میں جو چیزیں متصل دکھائی دیتی ہیں ان کے درمیان خورد بینی خلا اور عظیم خلا ہوتا ہے۔ یہاں قریب اور دور ہونے کا مفہوم اسی خلا کو پیش نظر رکھ کر سمجھنا ہوگا۔ ان دو آیتوں کو ملانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی کی ذات کا مقام اسی خلا میں حبل الورید اور قلب کے درمیان ہے اور یہ مقام ورید سے دور اور قلب سے نسبتاً نزدیک ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نقطہ آدمی کی ذات کے مقام اور قلب کے درمیان ہے اور وہ نقطہ آدمی کی ذات کے مقام سے قریب تر ہے بہ نسبت حبل الورید کے' جو اس مقام سے زیادہ دور ہے بہ نسبت نقطہ تجلّی کے۔ میرے خیال میں اس مقام پر توجہ کو مرکوز کرنا سب سے بہتر ہے، کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ کی تجلّی خاص رہتی ہے جس طرح عرش پر اور خانہ کعبہ پر اس کی تجلّی خاص رہتی ہے۔ اگر اس توجہ پر مداومت کی جائے تو بدرجہ اولیٰ نفس کی وہ خوابیدہ طاقتیں بیدار ہو سکتی ہیں جن کو دوسرے ذرائع سے لوگ پیدا کرتے ہیں، مگر سب سے ارفع اور اعلیٰ توجہ کا مرکز اللہ کی لطیف ذات ہے۔ اگر اس پر آدمی اپنی توجہ کو جما سکے جیسا کہ حدیث شریف میں بتایا گیا ہے اعبد ربک کانک تراہ فان لّم تکن تراہ فانّہ یراک یعنی ''اپنے رب

کی عبادت اس طرح کر جیسے کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے لیکن تو اسے دیکھنے کی طرح عبادت نہیں کر سکتا تو اس تصور کے ساتھ کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔'' ایک لطیف ترین اور غیر مجسم وجود پر توجہ اگر مرکوز کرنے کی مہارت ہو جائے تو اس سے جو قوتیں آدمی کے اندر پیدا ہوں گی ان کے مقابلے میں وہ ساری قوتیں ہیچ ہیں جو دوسری اشیاء پر توجہ جمانے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان ساری خوبیوں کے باوجود اسلام ان چیزوں کو مقصود قرار نہیں دیتا۔

نماز اور ذہانت: نفس ہی کی طاقت ذہانت ہے۔ نماز انسان کو ذہین بھی بناتی ہے۔ جب آدمی نماز میں قرآن پڑھتا ہے تو اسے اس کے مفہوم پر دھیان رکھنا چاہئے۔ اسی لئے قرآن میں حکم دیا گیا ہے: رتل القرآن ترتیلاً (المزمل:۴) یعنی ''قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ''۔ نیز افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالها (محمد:۴۲) ''کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں۔'' قرآن میں مضامین کا تنوع اور تکلم و تخاطب اس قدر جلد جلد اور کثرت سے بدلتا ہے کہ اگر آدمی توجہ کے ساتھ پڑھے تو لازماً اس کی ذہنی صلاحیت بے حد بڑھتی چلی جائے گی' کیونکہ ذہن کو بڑھانے کی جو ورزش تجرباتاً انسان کو معلوم ہو سکی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اور متنوع چیزیں اس کی نگاہوں کے سامنے سے تیزی کے ساتھ گزار دی جائیں اور پھر یہ اندازہ لگایا جائے کہ اس نے ان میں سے کتنی چیزوں کو پہچانا اور یاد رکھا۔

سب سے اونچا مقام روح کا ہے، لیکن جب تک روح کی حقیقت معلوم نہ ہو اس کی غذا اور اس کی مشق کس طرح معلوم ہو سکتی ہے۔ مادہ پرست تو اس کو سرے سے مانتے ہی نہیں۔ مگر جو لوگ اس کے وجود کے قائل ہیں وہ بھی اندھیرے میں سرگرداں ہیں۔ اسلام ہی ہے جس نے اس کی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام خالق کائنات کا نازل کیا ہوا دین ہے۔ پوچھا گیا روح کیا ہے؟ یسئلونک عن الروح (بنی اسرائیل:۸۵) ''وہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں''۔ جواب دیا گیا قل الروح من امر ربی (بنی اسرائیل:۸۵) ''کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔'' اس میں روح سے متعلق سارے جواب دے دیئے گئے ہیں۔ روح کا رب کے حکم سے ہونا ویسا ہی مفہوم رکھتا ہے جیسا مفہوم اس کا ہے آدم من تراب '' آدمی مٹی سے ہے'' یعنی آدم کا جسم مٹی سے بنا ہوا ہے۔ اسی لئے جسم کو نشوونما دینے والی ساری غذا اور دوائیں مٹی سے بنی ہوئی ہے۔ اگر چہ ہر ایک کی صورت، مزہ، خاصیت اور بظاہر ماہیت علیحدہ علیحدہ دکھائی دیتی ہے مگر حقیقتاً سب مٹی ہی مٹی ہے۔ اسی طرح روح کا رب کے حکم سے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل ماہیت امر رب ہے، اس لئے اس کو نشوونما دینے والی ساری چیزیں بھی امر رب ہی ہو سکتی ہیں، مگر یہاں صرف امر رب نہیں کہا گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم فرماتا ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ اس رب کے حکم سے ہے جس کا میں نمائندہ ہوں، اس لئے وہی احکام روح کی غذا اور دوا ہیں جو میری معرفت دنیا والوں کو دئے گئے ہیں۔ یہ احکام بھی مادی غذا کی طرح صورت، لذت، خاصیت اور بظاہر ماہیت میں مختلف ہیں مگر ان سب کی حقیقت رب محمدؐ کے عمل اور حکم ہی کی ہے۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح جسم کے نشوونما کے لئے دن میں تین چار بار مادی غذا کی ضرورت ہے خواہ وہ ہلکی پھلکی ہو یا بھر پیٹ، اسی طرح روح کے نشوونما کے لئے دن میں پانچ بار نماز ضروری ہے۔ اسی تمثیل پر دوسرے احکام الٰہی کو قیاس کیا جا سکتا ہے جو روزانہ کے بجائے خاص خاص موقعوں میں ادا کئے جاتے ہیں یا جسم کے لئے مادی دوا کے بالمقابل روح کے لئے غیر مادی دوا وہ احکام ہیں جنہیں توبہ، انابت اور کفارہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

چونکہ دنیا والے اس روح سے تقریباً ناواقف ہیں اس لئے اس کی ورزش اور مشق کی طرف انھوں نے توجہ نہیں دی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ موجودہ کائنات پر جس حد تک بھی انسان تصرف کر رہا ہے یا کرے گا وہ اسی روح کا ادنیٰ سا کام ہے۔ یہ تصرفات اس کا

کل سرمایہ نہیں ہے بلکہ یہ دراصل فطرت کے اشارے ہیں جن کے ذریعے وہ انسان کواس طرف متوجہ کرنا چاہتی ہے کہ وہ اپنی قدر پہچانے اوراپنی روح کوصحیح رُخ پرنشونمادے۔نفس کی طاقت سے انسان خواہ کتنا ہی بڑااورمحیر العقول کام کرلے وہ بہرحال پابند حدود (Limitations) ہوتا ہے۔مگر روح کی طاقت جب قوت سے فعل میں آجائے گی تو انسان پابند خلافت نہیں رہے گا' بلکہ اسے خود اختیاری (Autonomy) دیدی جائے گی۔ جہاں وہ جو چاہے گا وہی ہوگا اوراس کی جو خواہش ہوگی چشم زدن میں پوری ہوجائے گی۔

نماز اور اخلاق: انسان کے اخلاق اگر اچھے ہوں تو وہ دوسروں کے لئے رحمت ہوتا ہے لیکن بداخلاق آدمی زحمت اور مصیبت بن جاتا ہے۔ پھر جتنے زیادہ لوگ بداخلاق ہوتے جاتے ہیں دنیا کی مصیبت اتنا ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آجاتا ہے جب زمین کی پیٹھ سے اس کا پیٹ بہتر ہوجاتا ہے۔انسان میں بداخلاقی کی جڑ اس کی خودفریبی اور خودغرضی ہے۔نماز اسی جڑ پر کلہاڑا چلاتی ہے اور خودفریبی کی جگہ خوداحتسابی اور خودغرضی کی جگہ ایثار پیدا کرکے اسے صحیح معنی میں دنیا والوں کے لئے سراپا رحمت بنادیتی ہے۔ ان الصلوۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر ۔(العنکبوت: ۴۵) (یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے)۔

نماز اور تہذیب: تہذیب کا براہ راست تعلق انسان کے اندر سنجیدگی (Seriousness) اور احساس ذمہ داری (Sense of Responsibility) سے ہے۔احساس ذمہ داری کے بغیر سنجیدگی افیون کی چٹکی ہے اور سنجیدگی کے بغیر صرف احساس ذمہ داری وحشی جانور کے لئے فقط لگام ہے۔لیکن یہ دونوں چیزیں اکٹھا ہوجائیں تو حیاتیاتی جانور کوانسان مہذب انسان بناتی ہیں۔ با مقصد زندگی انسان میں سنجیدگی پیدا کرتی ہے اور بالاتر اقتدار کا شعور اس کوایک ذمہ دار وجود بناتا ہے۔زندگی کا مقصد جتنا عظیم ہوگا سنجیدگی اتنی ہی مستحکم ہوگی۔اور اقتدار جس قدر اعلیٰ اور ارفع ہوگا ذمہ داری کا احساس اسی قدر زوردار ہوگا،اس لئے تہذیب بھی اتنی ہی زیادہ جاندار (Dynamic) ہوگی۔اور سنجیدگی اور احساس ذمہ داری میں جتنا کامل اعتدال وتوازن ہوگا تہذیب اتنی ہی حسین اور آراستہ ہوگی۔ چنانچہ نماز انسان کو بحیثیت فرد اور بحیثیت اجتماعی وجود کے ایسا عظیم مقصد زندگی عطا کرتی ہے اور اتنے عالی شان اقتدار کا شعور بخشتی ہے اوران دونوں میں ایسا حسین امتزاج پیدا کرتی ہے جس کا تصور بھی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے: وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (الزاریات:۵۶) یعنی ''میں نے جن اورانسان کوصرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا: سبح اسم ربک الاعلیٰ (الاعلیٰ:۱) ''اپنے بلندترین رب کی تسبیح بیان کر''

نماز اور تمدن: تہذیب ہی انسانی تمدن کو جنم دیتی ہے اوراس کی صورت گری کرتی ہے۔زندگی کا سب سے گھٹیا مقصد عیش کوشی ہے اور سب سے ادنیٰ منتہا مرکرمٹی ہوجانا ہے۔اس تصور کا حامل انسان نرا حیوان ہوتا ہے۔ انسان نما حیوان۔ ایسے افراد سے بننے والے معاشرے کوکسی ارفع واعلیٰ اقتدار کا شعور چھو بھی نہیں سکتا۔اقتدار لازماً اسی کے اندر سے ابھرے گا اوراس لئے ہر آن بدلتی رہنے والی خواہش' خودغرضی اور گھٹیا مصلحت پرستی کا تابع ہوگا۔ایسی تہذیب سے جو تمدن برآمد ہوتا ہے وہ جوانی کی موت مرتا ہے۔ٹھیک جس وقت وہ اپنے شباب (Climax) پر ہوتا ہے۔اس کے افراد کی رذیل خصلتیں بھی اپنے انتہائی عروج پر ہوتی ہیں اور تمدنی وسائل بھی اپنی ترقی کی انتہا پر ہوتے ہیں مگر ہوتے ہیں محدود۔ایسے میں جب مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو زندگی میں فساد (Disorder) رونما ہوجاتا ہے اور قوم کی زندگی کا چراغ گُل ہوجاتا ہے۔ فلما نسوا ما ذکروا بہ .... اخذنھم بغتۃ (الانعام:۴۴)

اس کے برخلاف زندگی کا عظیم مقصد اور عالی شان اقتدار اعلیٰ کا شعور انسان کے حرص وآز کو،اس کے ہوس اقتدار کو اور مصلحت کوشی کی بنا پر اپنے لئے سہولتیں فراہم کرنے اور چھوٹ (Allowance) حاصل کرنے کے جذبے کو زور پکڑنے نہیں دیتا۔یہ تہذیب ایسے تمدن کو جنم دیتی ہے جو قوم کواس کی طبعی عمر تک پہنچاتا ہے' زندگی کے وسائل سے بھرپور استفادہ کرنا سکھاتا ہے۔کیونکہ اس

کے حامل افراد میں تعاون کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور ان کے درمیان کامل ہم آہنگی (Harmony) ہوتی ہے۔

قال یقوم انی لکم نذیر مبین۔ ان اعبدو الله واتقوه واطیعون۔ یغفر لکم من ذنوبکم ویؤخرکم الیٰ اجل مسمیً۔ (نوح:۲ تا۴) ''اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لئے ایک صاف صاف خبردار کردینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ) اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں اجل مسمّیٰ تک باقی رکھے گا۔''

سماج افراد سے بنتا ہے۔ افراد اگر سہل انگار اور عافیت کوش ہوں، دولت، وقت، علم اور زندگی کی قدر نہ پہچانتے ہوں اور انہیں یونہی برباد اور ضائع کرتے رہتے ہوں تو وہ نرے بے شعور ہوں گے اور ان کا سماج انتہائی پسماندہ ہوگا۔ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اٰذان لا یسمعون بھا۔ اُولٰئک کا الانعام بل ھم اضلّ۔ (الاعراف:۷۹) ''ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔'' لیکن افراد اگر جفاکش ہوں، زندگی اور وسائل زندگی کی قدر و قیمت پہچانتے ہوں، علم دوست اور مہم جو ہوں تو ایسے افراد اپنے مسائل کا شعور رکھنے اور ان کو حل کرنے کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا سماج ترقی کرتا ہے۔ لئن شکرتم لا زیدنکم (ابراہیم:۷) ''اگر شکرگزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔''

نماز اور تنظیم: تنظیم اور بھیڑ کا فرق بہت سے لوگ نہیں جانتے بلکہ کم عقل لوگ تو بھیڑ ہی کا نام تنظیم رکھتے ہیں اور اپنے اس فریب کا بری طرح شکار ہوتے ہیں۔ حالانکہ تنظیم حیرتناک قسم کے کام کر ڈالتی ہے جو بھیڑ کے بس کا نہیں ہوتا۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے ایک مثال کافی ہوگی۔ ایک سائیکل، ایک موٹر یا کسی مشین کے سارے پرزے ایک جگہ ڈھیر کی شکل میں جمع ہوں تو وہ کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتے اس لئے کہ وہ محض بھیڑ ہیں۔ لیکن انہیں پرزوں کو ان کے مخصوص نظم میں کس دیجئے، پھر وہ آپ کے لئے جتنے مفید ہوں گے اور جیسے جیسے حیرت انگیز کام کرنے لگیں گے اس کی وضاحت کی حاجت نہیں ہے۔ اسی طرح انسانوں کا محض اکٹھا ہو جانا اور کسی نعرے یا کسی مقصد پر محض جمع ہو جانا ہی تنظیم نہیں ہے، اور نہ ہی ان کے درمیان تقسیم کار کے اصول پر مختلف عہدوں وغیرہ کا تعین انہیں تنظیم بنا دیتا ہے بلکہ ان کی تنظیم اس وقت وجود میں آتی ہے جب وہ نظم وضبط (Discipline) میں پوری طرح کس دیئے جائیں۔

لیکن یہاں پر آ کر تنظیم کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ انسان انسان ہے مشین کے بے جان پرزوں جیسا نہیں ہے اس لئے اس کا کسا جانا آسان نہیں ہے۔ انسان کو جو چیز انسان بناتی ہے اور دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا دماغ ہے۔ دماغ ہی میں خواہشیں اُبھرتی ہیں، جذبات امنڈتے ہیں، منصوبے بنتے ہیں اور ارادہ جنم لیتا ہے جن کی بنا پر اس کو قابو میں رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اسی لئے زیادہ مضبوط تنظیم بنانے کے لئے اس کے دماغ کو قابو میں کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس غرض کے لئے اس کے شعور کو دبایا بلکہ مٹایا جاتا ہے، اس کی ذہنیت کو جانوروں کی سطح پر لے جایا جاتا ہے، اس کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ انسان نما حیوان بن کر رہے اور پھر جانوروں کے ریوڑ کی طرح اسے اپنے حسب منشا ہکایا جا سکے۔ مگر حقیقتاً یہ انسانوں کی تنظیم نہیں ہوئی۔ انسانوں کی تنظیم تو وہی ہوگی جس کا ہر فرد انسانی خصوصیات کا عملاً حامل ہو، وہ سوچتا ہو اور ارادہ رکھتا ہو، خوددار اور بے غرض ہو اور زندگی کا بلند تر تصور بھی رکھتا ہو، پھر بھی وہ اپنے آپ کو نظم وضبط کا پابند بنائے، اور اتنا پابند بنائے کہ پہلی قسم کی تنظیم اور اس سے وابستہ افراد اس کا اور اس کی تنظیم کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوں۔ اس کا رشتہ اپنی تنظیم سے کہیں زیادہ مستحکم، پائدار اور اٹوٹ ہو۔ نماز اپنے ہر چاہنے والے (Admirer)

کو ایسا ہی بنا دیتی ہے۔

نماز اور سیاست: سیاست کے اندر عجیب نشہ ہوتا ہے، اور جب اقتدار ہاتھ میں آجائے تو فرد اور جماعت دونوں ہی توازن کھو بیٹھتے ہیں جس کے نتیجے میں کمزور طبقے ان کی بے اعتدالیوں کا بُری طرح شکار ہوتے ہیں۔ عدل وانصاف کا خون ہونے لگتا ہے، بے چینی اندر ہی اندر کروٹیں بدلنے لگتی ہے اور بالآخر فطرت کا ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور ٹھیک جس وقت سیاسی بالادستی رکھنے والے طاقت کے نشہ میں بدمست ہوتے ہیں اور سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ان کا اقتدار لازوال ہو چکا ہے یکا یک وہ بساط سیاست سے ہٹا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن نماز نہ تو ان میں نشہ پیدا ہونے دیتی ہے اور نہ ہی انہیں بے اعتدالی کی راہ پر بڑھنے دیتی ہے۔ وہ ایسے متوازن اصول لے کر ان کی پابندی کراتی ہے کہ وہ مثالی کردار ادا کر کے دنیا سے اس طرح رخصت ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں پر ان کی حکمرانی جاری رہتی ہے۔ الّذین ان مکنّھم فی الارض اقاموا الصّلوۃ واتوا الزکوۃ وامرُو ابالمعروف ونھوعن المنکر۔ (الحج: ۴۱) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔''

نماز اور معیشت: دنیا، دنیاوی وجاہت اور اس کی سطحی لذتیں اور آسائشیں عموماً انسان کو لبھا لیتی ہیں اور وہ ان کے حصول کے لئے بے تحاشہ دولت بٹورنے اور خرچ کرنے میں لگا رہتا ہے مگر ان کے پیچھے تلخیوں، ناکامیوں اور مصیبتوں کا دیو چھپا رہتا ہے جو بالآخر اسے دبوچ لیتا ہے۔ فرد کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی دیکھنے میں آتا ہے اور قوم کو ذلت وغلامی کا طوق پہننا پڑ جاتا ہے۔ مگر نماز انسان کو فرداً فرداً اور جماعت کو بحیثیت جماعت معیشت کے ایسے گُر عطا کرتی ہے جس سے دنیا کی دولت ان کے قدموں میں چلی آتی ہے اور سوسائیٹی کا کوئی فرد بھی اپنے حصّے سے محروم نہیں رہتا۔ ایک پائیدار معاشی استحکام اور عمومی خوش حالی کا سنہری دور دنیا پر سایہ فگن ہوتا ہے۔ قوم شعیب نے اپنے رسول سے کہا: اصلٰوتک تامرُك ان نّترك مایعبد اباءُ نا اوان نّفعل فی اموالنا مانشاءُ (ہود: ۸۷) ''کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو۔'' معلوم ہوا کہ نماز مال اور معیشت میں بے لگام ہونے نہیں دیتی بلکہ کتاب الٰہی کا پابند بناتی ہے جس کے نتیجے میں مذکورہ فوائد سب کے سب حاصل ہوتے ہیں۔ ولو انّھم اقاموا التّورۃ والانجیل وما اُنزل الیھم من رّبھم لا کلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم (المائدہ: ۶۶) ''کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے اُبلتا۔'' ہے نا یہ سب حیرت انگیز چیز! اگر واقعی یہ ساری چیزیں اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم علیحدہ علیحدہ ہر ایک عنوان کی تفصیل بیان کریں گے تاکہ آپ کو بھی یقین ہو جائے کہ ہم نے کسی مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ نماز سے مراد آج کل کے مسلمانوں کی نماز نہیں بلکہ اسلامی نماز ہے۔

اقامت صلوٰۃ: یہ بات واضح کی جا چکی کہ دین کو قائم کرنے کے لئے نماز کو قائم کرنا بنیادی شرط ہے۔ اس لئے نماز کو قائم کرنے کے سلسلے میں جو باتیں کہی جائیں گی ان سے خود بخود یہ نتیجہ نکلے گا کہ دین کو قائم کرنے کے لئے بھی وہ چیزیں لازمی اور ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اقم الصّلٰوت لذکری (طٰہٰ: ۱۴) اس کے دو معنیٰ ہیں ایک یہ کہ نماز قائم کر اس لئے کہ تو مجھے یاد رکھے اور دوسرے یہ کہ میں تجھے یاد رکھوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: فاذکرونی اذکرکم ''تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔'' یہاں پر جو گفتگو ہوگی وہ پہلے مفہوم کے لحاظ سے ہوگی یعنی یہ کہ ہم نماز اس لئے قائم کریں کہ اللہ کو یاد کریں، اور یاد رکھیں جیسا

کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وذکر اسم ربّہ فصلّیٰ. جہاں تک اللہ کو یاد کرنے کا تعلق ہے ہمیں آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: واذکروہ کما ھداکُم (البقرہ:۱۹۸) یعنی ''اور تم اس کو اس طرح یاد کرو جیسے اس نے تم کو ہدایت دی۔'' دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الّذین یذکرون اللہ قیاماً وّقعودا وّعلیٰ جنوبھم و یتفکّرُون فی خلق السّمٰوت والارض الخ (آل عمران:۱۹۱) ''جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔'' اس میں اللہ کو یاد کرنے کے ایک خاص پہلو کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔ یاد کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی کی یاد میں ایسا کھو جائے کہ اس کو کسی دوسری چیز کا ہوش اور احساس نہ رہے، اور دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی یاد کے ساتھ ساتھ دوسرے مقاصد اور ذمہ داریوں کا بھی شعور رہے، اور تیسری طرح کا ذکر محض زبانی ذکر ہوتا ہے جس میں آدمی نہ تو یاد میں کھو جاتا ہے اور نہ مقاصد اور ذمہ داری کا شعور رکھتا ہے بلکہ اس کا دل یکسر غافل ہوتا ہے یا دوسرے تصورات میں کھویا رہتا ہے۔ یہ تیسری قسم کا قطعاً ذکر نہیں ہے، پہلی دو قسموں میں سے کون مطلوب ہے اس میں امت کے اندر دو رائیں ہیں۔ پہلی رائے گروہ صوفیاء کی ہے اور ان میں کچھ لوگ تو اس رائے میں غلو کی حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ کچھ واقعات بھی بیان کرتے ہیں جن کی حیثیت میرے نزدیک مستثنیات کی ہے۔ جہاں تک نماز کی حالت میں اللہ کو یاد کرنے کا تعلق ہے قرآنی آیات اور احادیث میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس سے صوفیا کے خیال کی توثیق نہیں ہوتی جیسا کہ اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کو یاد کرتے ہوئے آسمان اور زمین کی بناوٹ میں بھی غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوۃ فلتقم طائفۃ منھم معک ولیاخذ وا اسلحتھم .... ولیاخذوا حذرھم و اسلحتھم۔ ود الذین کفروا لو تغفلون عن اسلحتکم وامتعتکم .... وخذ وا حذرکم۔ (النساء:۱۰۲) ''اور اے نبیؐ جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے اسلحہ لئے رہے.....اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامانوں کی طرف سے غافل ہو.......... مگر پھر بھی چوکنّے رہو.....'' اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز کی حالت میں تم دشمنوں سے اپنے بچاؤ کی طرف سے غافل نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ دشمن یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے اسلحے اور اپنے سامان سے غافل ہو جاؤ تو تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑیں۔ اسی طرح آنحضورؐ فرماتے ہیں: کبھی میں نماز پڑھاتا رہتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ لمبی قراءت کروں مگر یکایک کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو اس خیال سے کہ میرے پیچھے اس کی ماں بھی نماز پڑھ رہی ہے جس کا دل بچّے میں اٹکا ہوا ہوگا' میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نماز پڑھاتا رہتا ہوں اور جنگ کی صفیں درست کرتا رہتا ہوں۔ ظاہر ہے یہ سب وہ کیفیتیں ہیں جن میں انسان اللہ کی یاد میں کھو نہیں جاتا۔ میری سمجھ کے مطابق نماز میں اللہ کی یاد جس قسم کی مطلوب ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کسی بہت ہی باجبروت فرماں روا کے سامنے حاضر ہوا اور اپنا مدعا پیش کر رہا ہو۔ ایسی صورت میں اس کے ذہن پر اس حاکم کا رعب اور جلال بھی مسلسل طاری رہے گا اور اپنے مدعا سے بھی اس کا دماغ غافل نہیں ہوگا یعنی دونوں چیزیں بیک وقت پائی جائیں گی، البتہ یہ ضرور ہے کہ کوئی غیر متعلق بات اس کے دماغ میں بار نہیں پا سکے گی۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: واستعینُوا بالصّبر والصّلوٰۃ وانّھا لکبیرۃ الاّ علی الخاشعین الّذین یظنّون انّھم ملاقوا ربّھم وانّھم الیہ راجعُون (البقرہ:۴۵) ''اور صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔ بے شک نماز گراں ہے' مگر ان لوگوں پر گراں نہیں ہے جو عجز کرنے والے ہیں۔ جو یقین کرتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں اور اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔''

اس میں جہاں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ نماز ان لوگوں پر کٹھن نہیں ہے جو قیامت میں خدا سے ملاقات اور اس کے سامنے حاضر ہونے کا گمان رکھتے ہیں۔ وہیں دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ نماز اس طرح پڑھتے ہیں جیسے وہ خدا سے ملاقات کر رہے ہوں اور جہاد زندگانی میں پیش آنے والی دشواریوں اور مسائل کے سلسلے میں اس کی طرف رجوع کر رہے ہوں۔

البتہ رات کی نماز بالفاظ دیگر تہجد کے لئے یہ بات اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے: انّ ناشئة الليل هى اشدُّ وطأ وّ اقومُ قيلا۔ انّ لک فى النّهار سبحاً طويلاً۔ واذكر اسم ربّک وتبتّل اليه تبتيلاً۔(المزمل:۶تا۸) ''کچھ شک نہیں کہ رات کا اُٹھنا (نفس بہیمی کو) سخت پامال کرتا ہے اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔'' نماز میں آہ وزاری اور خوف کی حالت طاری ہونی چاہئے: تتجافى جنوبهم عن المضاجع يدعون ربّهم خوفا وّ طمعا (السجدہ:۱۶) ''ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔'' نماز کے لئے دل، خیال اور نیت کی پاکی شرط ہے جس کے لئے حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ نماز سے پہلے جس نے انّى وجّهت وجهى للّذى فطر السّمٰوات والارض حنيفًا وّما انا من المشركين (الانعام:۷۹) ''میں نے یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' نہیں پڑھا' اس کی نماز نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جسم کی پاکی شرط ہے۔ جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے: ان كنتم جنبًا فاطّهّروا (المائدہ:۶) ''اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔'' پھر وضو بھی شرط ہے جیسا کہ حکم ہے: اذا قمتم الى الصّلوٰة فاغسلُوا وُجُوهكُم.... (المائدہ:۶) ''جب تم نماز کے لئے اُٹھو تو چاہئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو' سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔'' یہ تو ظاہری وضو ہوا، مگر جیسا کہ حدیث میں کہا گیا ہے وضو سے پہلے یہ پڑھ لینا ضروری ہے بسم اللّٰه العلىّ العظيم والحمدُلله علىٰ دين الاسلام۔ ''اللہ بزرگ و برتر کے نام سے' اور اللہ کا شکر ہے دین اسلام (دینے پر)۔'' تا کہ جسم کی طہارت کے ساتھ ساتھ توجہ میں بھی پاکیزگی آ جائے۔ کپڑے کی پاکیزگی ضروری ہے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا لمسجد اسّس على التقوىٰ من اول يوم احق ان تقوم فيه (التوبہ : ۱۰۸) ''جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لئے) کھڑے ہو۔'' آخر میں نماز کے مقاصد کا پاک ہونا بھی شرط ہے یعنی یہ کہ وہ خالصاً لوجہ اللہ (اللہ کے لئے) ہونی چاہئے۔

نماز اور اسلامی نظام زندگی کی نوعیت : ہر وقت فرض اور سنت دونوں طرح کی نمازیں مقرر کی گئی ہیں۔ فرض لازماً جماعت سے اور سنتیں لازماً انفرادی طور پر ادا کرنے کا حکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز پانچ وقت اس بات کی یاد دہانی کرتی ہے کہ اسلامی نظام نہ تو سراسر اجتماعی ہے جس میں افراد کی انفرادیت کو ختم کر دیا گیا، اور نہ سراسر انفرادی ہے جس میں اجتماعی مصلحتوں کو فرد پر بھینٹ چڑھا دیا گیا ہو۔ بلکہ اجتماعیت اور انفرادیت کے واضح حدود طے کر دیئے گئے ہیں جن کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔

نماز اور فرد: قدرت کی بنائی ہوئی کوئی دو چیز یکساں نہیں ہوتی۔ ایک ہی درخت کی دو پتیاں تک یکساں نہیں ہوتیں۔ اسی طرح کوئی دو انسان یکساں نہیں ہوتے۔ نہ صورتیں یکساں ہوتی ہیں' نہ آواز اور نہ چال۔ بلکہ اگر حساس نگاہ ہو تو ظاہری جسم کا کوئی بھی حصہ دو آدمیوں کا یکساں نہیں ہوگا۔ اسی طرح کسی دو آدمی کی اندرونی خصوصیات بھی یکساں نہیں ہوتیں۔ یہی ظاہری اور باطنی عدم یکسانیت انسان کی انفرادیت کی علامتیں ہیں۔ یعنی ہر انسان کا اپنا ایک مستقل وجود ہے جس کی حفاظت' جس کے نشو ونما اور جس کے ارتقا کا داعیہ اور ضروری استعداد' وسائل اور ہدایتیں سب فراہم کر دی گئی ہیں۔ داعیہ اور استعداد جو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں ان کا

ایک حصہ جبلّی ہے جو اسکے شعور اور ارادے کے بغیر خود بخود کام کرتا رہتا ہے۔ اور دوسرے حصہ کا تعلق اس کے شعور اور ارادے سے ہے۔ وسائل اور ہدایتیں خارج سے فراہم کی جاتی ہیں جن کا بھی ایک حصہ اسے بغیر کوشش کے خود بخود ملتا رہتا ہے۔ مگر دوسرے حصہ کے لئے شعور اور ارادے سے کام لینا پڑتا ہے۔

اپنے ارتقا کے لئے شعور اور ارادے سے کام لینا انسان کے اندر اس کی انفرادیت کے احساس اور شعور کو اجاگر کرتا ہے۔ یہی شعور جتنا زیادہ ابھرتا ہے انسان اتنا ہی زیادہ اس دنیا میں اپنا رول ادا کرتا ہے۔ لیکن اس کے بڑھنے کی ایک آخری حد ہے جس کے بعد وہ دوسرے افراد کی انفرادیتوں کو مجروح کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس حد کے اندر رہتے ہوئے ہر فرد کی انفرادی شخصیت کا ہمہ جہتی ارتقا اس کے خالق کا عین مطلوب ہے اور اس کی اسی اندرونی فطرت کا تقاضہ بھی ہے۔ جب کہ اس کے باہر ساری کائنات کی فطرت اس کی سازگاری کے لئے موجود ہے۔ چنانچہ زندگی کا جو نظام فطرت سے جتنا زیادہ قریب ہے اتنا ہی وہ انسان کی اس مہذب اور پابند انفرادی شخصیت کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ اسلام انسان کا فطری دین ہے، اس لئے وہ اس کی انفرادیت کے مکمل ارتقا کے لئے جامع پروگرام دیتا ہے جس کا جزو اعظم نماز ہے۔

نماز ایک عبادت ہے۔ عبادت کچھ لایعنی حرکتوں، کچھ بے مقصد رسموں اور ان کی غیر شعوری پابندیوں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ انسانی عبادت اصلاً شعوری عبادت ہے۔ جسم کچھ حرکتیں کرتا رہے، روٹین کے مطابق متعین وقت پر متعین پروگرام خود کار مشین کی طرح چلتا رہے مگر دل و دماغ اس سے غافل ہوں تو اسے عادت تو کہہ سکتے ہیں مگر عبادت ہرگز نہیں۔ عبادت تو جب ہوگی کہ اس عمل کے وقت دل اور دماغ دونوں حاضر ہوں اور ان حرکات و سکنات کی طرف، ان کے مقاصد کی طرف، اپنے خدا کی طرف اور اپنی ذات، کائنات اور خدا کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس شعور اور توجہ کے ساتھ جو شخص عبادت کی پابندی کرے گا اس کو کائنات میں اپنا ٹھیک ٹھیک اضافی مقام معلوم ہو جائے گا۔ اور یہ اس کی اپنی انفرادیت کے شعور کا انتہائی کمال ہے۔

نماز ہمیں بتاتی ہے کہ بہ حیثیت ایک ملّت کے اللہ کی طرف سے قانونی طور پر امامت کا مقام ہمیں عطا کیا ہوا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں ہم اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے عملاً اس پر فائز نہ رہے ہوں۔ پھر خود اپنی ملّت کے اندر بہ حیثیت ایک فرد کے اپنا کیا مقام ہے، نماز اس کی بھی وضاحت کے ساتھ نشان دہی کرتی ہے۔

نماز فرد کے مقام کا تعین اس طرح انگلی رکھ کر بلا وجہ نہیں کرتی بلکہ اس لئے کرتی ہے کہ اس کے خالق کے نزدیک فرد ہی اصل ہے۔ اسی کا ارتقا مطلوب ہے۔ اسی کو اپنا رول ادا کرنا اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں، اور اپنے کارناموں کے انجام سے اسے ہی دوچار ہونا ہے۔ اسی لئے نماز صرف اتنا ہی نہیں کرتی ہے کہ فرد کے مقام کا واضح تعین کر دیتی ہے بلکہ اس کے اندر اس کی انفرادیت کے احساس کو زندہ اور مستحکم بھی کرتی ہے، اس کی ذمہ داریوں کو بتاتی بھی ہے اور اس کے نتائج و انجام سے آگاہ بھی کرتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ اس سے کہلواتی ہے "میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے" اسی احساس خودی کو مزید طاقتور بنانے کے لئے اس سے کہلواتی ہے "میں نے اپنی ذات کو یکسوئی کے ساتھ اسکی طرف متوجہ کر لیا جس نے ساری کائنات کو اپنے مقرر کئے ہوئے فطری قوانین کا پابند پیدا کیا ہے۔" اسی انفرادی حیثیت سے توجہ کی بنا پر انتہائی قرب الٰہی عطا کرنے والے دو ارکان نماز یعنی رکوع اور سجدے میں اللہ نے یہ انفرادی تسبیح پڑھوائی ہے "پاک ہے میرا عظیم رب" اور "پاک ہے میرا برتر رب" اس سے دراصل یہ اقرار کروانا مقصود ہے کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔"

یہ گواہی صرف زبان ہلا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ شہادت ادا کرنے کا نام ہے۔ شہادت دل سے، زبان سے اور ظاہری اعمال کے ذریعہ ادا کی جاتی ہے، جیسا کہ منافقوں کے سلسلے میں صراحت سے بتایا گیا ہے کہ ''جب منافق آپؐ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور ساتھ ہی اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ بلا شبہ منافق جھوٹے ہیں۔'' یعنی یہ کہ منافقوں کے قول کے دو جز تھے۔ ایک یہ کہ وہ گواہی دینے کا دعویٰ کرتے تھے اور دوسرے، یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ دوسرا جز تو اپنی جگہ پر ایک واقعہ اور ایک حقیقت تھا جس کی تصدیق اللہ نے کر دی مگر ان کے دعوے کا پہلا جز و صحیح نہ تھا۔ زبانی اقرار تو تھا مگر دل اور عمل اس کے خلاف تھے۔ اس لئے ان کی گواہی معتبر نہیں ٹھہری اور وہ جھوٹے قرار پائے۔

گواہی دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہاں اس دعوے کو چیلنج کرنے والا بھی کوئی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جب ایک شخص دعویٰ کرتا ہے تو دنیا اس کو گواہی کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہے۔ پھر اس پر دنیا کی طرف سے جرح کی بوچھار شروع ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے اس کا اپنا نفس اپنے شدید اندرونی تقاضوں کے ذریعہ اس پر پیہم جرح و تنقید شروع کر دیتا ہے اور اپنی خواہشوں کا بندہ بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس نے اپنی نکیل اس کے حوالہ نہ کی بلکہ اس کی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھی تو اس جرح میں وہ نہ ٹوٹا اور نہ اس پہلی ہی جرح میں جھوٹا ثابت ہو گیا، اور جو اس جرح کی تاب نہ لا سکا وہ پھر کسی جرح کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ پہلی اور حقیقی آزمائش درحقیقت نفس کا مقابلہ ہی ہے۔ بقیہ جن بتوں کی پوجا بھی انسان کرتا ہے دراصل وہ اس کے اپنے نفس ہی کی پرستش کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

نفس کی جرح سے کامیاب گزر جانے کے بعد ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے اور کنبہ کے لوگ سامنے آجاتے ہیں اور خدا کے مقابلے میں اپنے مطالبے منوانا چاہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ثابت قدم رہ جانے پر خاندان، قبیلہ، قوم اور دوسرے لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بحث و مباحثہ، لعنت ملامت، سوشل بائیکاٹ، مار پیٹ اور بے شمار قسم کی ایذا رسانیوں کے ذریعے اسے اپنے موقف سے ہٹا ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان سب کے مقابلے میں وہ ثابت قدم رہ گیا تو بالآخر اقتدار وقت اپنے تمام ہتھکنڈوں کے ساتھ آدھمکتا ہے۔ عہدوں کا لالچ دے کر، مراعات اور عیش کی پیش کش کر کے اسے پھسلانا چاہتا ہے۔ حقوق سے محروم کر کے، جائداد ضبط کر کے، فقر و فاقہ کا خوف دلا کر، جیل کی کوٹھری میں ڈال کر، تاریک دور جیسے وحشیانہ مظالم ڈھا کر اور بالآخر قتل اور پھانسی کی سزا دے کر اسے توڑنا چاہتا ہے۔ اگر وہ ان تمام مرحلوں سے بخیر و خوبی گزر جاتا ہے اور قول و عمل دونوں سے یہی اعلان کرتا رہتا ہے کہ زندگی کے سارے گوشوں سے متعلق تمام معاملات خدا ہی کی ہدایت کے مطابق انجام پانے چاہئیں اور ان کو انجام دینے کا عملی طریقہ صرف وہی ہونا چاہیئے جو رسول اللہؐ نے سکھایا۔ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری رہنمائی اور کوئی دوسرا نمونہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ تب کہیں جا کر اس کی گواہی معتبر قرار پاتی ہے۔ دنیا بھی اسے اپنے اصول کا گواہ مان لیتی ہے اور خدا بھی اسے اپنا شہید قرار دے دیتا ہے۔

نماز اور اجتماعیت: نماز قائم کرنے کے لئے مسجد کی آبادکاری ضروری ہے، یعنی نماز باجماعت ادا کی جائے الّا یہ کہ کوئی شرعی عذر مانع ہو، جیسا کہ اللہ نے فرمایا انّما یعمُرُ مسجد الله من اٰمن بالله والیوم الأخر واقام الصّلوٰة واٰتی الزکوٰة ولم یخش الّا الله (التوبہ:۱۸) ''خدا کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔'' اسی طرح حدیث میں آیا ہے۔ مَن لّا یجب داعی الله فلا صلوٰة له الّا من عذر '' جو اللہ کے داعی (مؤذن) کی پکار پر لبیک نہ کہے تو اس کی نماز بغیر عذر کے نہیں

ہوتی ۔"یعنی جو اللہ کے پکارنے والے (موذن) کا جواب نہ دے یعنی مسجد کی طرف نماز کے لئے نہ جائے اس کی نماز نہیں ہوتی اِلّا یہ کہ کوئی عذر ہو نیز اللہ نے فرمایا: وارکعُوا مع الرّاکعین (البقرہ: ۴۳) "رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔"

اس اجتماعیت کے شعور کو کارفرما بنانے کے لئے سب سے پہلے تو اس نے ہر فرد پر خواہ وہ جس جگہ بھی ہو لازمی قرار دیا کہ وہ اپنی ہر نماز ایک مرکز (قبلہ) کی طرف رخ کر کے ادا کرے۔ وہ نماز خواہ تنہا پڑھی جاتی ہو یا جماعت کے ساتھ۔ اسی طرح ہر نماز میں بلکہ اس کی ہر رکعت میں اس کے لئے لازمی قرار دیا کہ وہ یہ نہ کہے کہ میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں بلکہ یہ کہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، ہم کو سیدھا راستہ بتا وغیرہ۔ اس طرح وہ کوئی بھی نماز پڑھ رہا ہو رکوع کے بعد اسے یہی کہنا ہوتا ہے کہ "اے ہمارے رب حمد تیرے ہی لئے ہے۔" جب وہ بیٹھتا ہے اور التحیات پڑھتا ہے تو ہر صورت میں یہی کہتا ہے "سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر۔"

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں ہی حمد (جو سورہ فاتحہ میں پڑھی جاتی ہے اور رکوع کے بعد قومہ میں) دراصل اللہ کا شکر ہیں، بالخصوص ان نعمتوں پر جن کا تعلق ہماری اجتماعی زندگی سے ہے۔ اللہ کا شکر کوئی رسمی چیز نہیں ہے اور نہ ہی وہ کچھ منتر کے بول ہیں جنہیں بس زبان سے ادا کر دینا کافی ہے بلکہ شکر لازماً تین اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ اوّل نعمت کا دل سے اعتراف، دوم اس کو بے مصرف نہ رکھ چھوڑنا بلکہ اس سے مصرف لینا۔ سوم ایسا مصرف نہ لینا جو دینے والے کو ناپسند ہو بلکہ وہ مصرف لینا جو اس کو پسند ہو۔ ان میں سے کسی ایک چیز کے بغیر شکر ادا نہیں ہو سکتا۔

اس طرح کا شکر انسان کو لازماً فعال بنانے والا ہے نہ کہ بے عمل۔ اور چونکہ اس کی ساری سرگرمیاں نعمتوں کے صحیح استعمال کے لئے ہوتی ہیں، اس لئے لامحالہ اس سے فائدے ہی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ اللہ سے ہدایت کا طالب ہوتے ہوئے کہتا ہے "ہدایت دے ہم کو سیدھے راستے کی، جس پر انعام یافتہ لوگ چلا کئے ہیں، جن پر نہ تو کبھی غضب ناک ہوا اور جو نہ کبھی بے راہ ہوئے۔" اس ہدایت کے مطابق جب اجتماعی عمل ہوتا ہے تو لازماً سلامتی نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہہ اُٹھتا ہے "سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر" صالح بندے شکرگزار بندے ہی ہوتے ہیں یعنی وہ بندے جو صالح عمل کرنے والے ہیں۔ کوئی عمل صالح جب ہوتا ہے کہ اس کو اچھی نیت سے اور سلیقے کے ساتھ کیا جائے اور صالح بندے وہ ہوتے ہیں جو اپنے ذمہ کے کام اچھی نیت، ڈھنگ اور سلیقے سے انجام دیتے ہوں۔ ظاہر ہے ایسے بندوں پر سلامتی نہ ہوگی تو کیسے بندوں پر ہوگی۔

اجتماعیت کے شعور کو خوب مستحکم کرنے کے لئے نیز مشق کے ذریعہ اس کو مزاج کا جزو بنا دینے کے لئے دن میں پانچ وقت نماز فرض کر دی گئی ہے جنہیں اسے لازمی طور پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا ہے اِلّا یہ کہ جماعت میسّر ہی نہ ہو۔ ایسا اس لئے ہے کہ فرد تو اپنا مستقل بالذات تشخص رکھتا ہے مگر اجتماعیت کے ساتھ یہ صورت نہیں ہے۔ اس لئے شعور سے اس کے اوجھل ہو جانے اور اس کے تقاضوں کے نظرانداز ہو جانے کا ہر وقت امکان رہتا ہے جس کے نتیجے میں گھاٹا بالآخر فرد ہی کا ہوتا ہے۔ مگر یہ گھاٹا اگرچہ عظیم اور ہولناک ہوتا ہے پھر بھی چونکہ رونما بہت دیر میں ہوتا ہے اس لئے فرد اطمینان کے ساتھ اس سے غفلت برتتا رہتا ہے۔

نماز اور ذوق جمال: حدیث شریف میں ہے "اللہ جمیل ویُحبُّ الجمال۔ یعنی "اللہ خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔" قرآن پاک میں ہے: "ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کر لیا کرو"۔ اسی غرض کے لئے جمعہ کا غسل ضرورت نہ ہونے پر بھی واجب کیا گیا۔ عطر اور سرمہ کا استعمال مسنون قرار دیا گیا۔ اچھا سے اچھا لباس جو میسّر ہو اس کو پہننے کے لئے کہا گیا۔ اسی لئے نماز کے اوقات میں تسویہ (Symmetry) پیدا کیا گیا۔ وہ اس طرح کہ نماز عظیم مصلحتوں کی وجہ سے (جن کا ذکر انشاء اللہ آگے آئے گا)

صرف پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ طلوع آفتاب سے قبل یعنی فجر کی نماز کے مقابلے میں غروب آفتاب کے بعد مغرب کی نماز۔ غروب آفتاب سے پہلے ادا کی جانے والی عصر کی نماز کے مقابلے میں کوئی نماز فرض نہیں ہے تو اس کی کو اشراق کی سنت کے ذریعہ پورا کیا گیا۔ اسی طرح زوال آفتاب کے بعد ظہر کی نماز کے مقابلے میں چاشت کو مسنون کر کے کمی پوری کی گئی۔ اور رات کے وقت مغرب کے بعد عشاء کی نماز کے مقابلے میں فجر کی نماز سے پہلے تہجد کے ذریعہ Symmetry پیدا کی گئی۔

یہ تو تھا نماز کو مزین کرنے کا معاملہ۔ زینت ایک خارجی چیز ہوتی ہے جس کے ذریعہ کسی چیز کے حسن کو دو بالا کیا جاتا ہے۔ جیسے ایک آدمی اچھا سا کپڑا پہن کر، زیور سے آراستہ ہو کر' غازہ اور روغن' کاجل اور ٹیکہ وغیرہ سے اپنے اندر زیادہ جاذبیت پیدا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب خارجی اور عارضی چیزیں ہوتی ہیں۔ بخلاف ان کے حسن کسی چیز کی ذات میں ہوتا ہے جو زینت کی طرح کبھی وابستہ اور کبھی علیحدہ نہیں ہوتا۔ جیسے انسان کی اپنی صورت اور اس کے جسم کی بناوٹ.... اسی طرح نماز کا بھی معاملہ ہے۔ اوپر نماز کی زینتوں کا ذکر تھا، اب نماز کے حُسن پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال لیجیے۔ نماز میں اعتدال' قرأت میں ترتیل' ارکان کی ادائیگی میں سکون و وقار' بہترین وقت پر ادائیگی' جماعت کی پابندی وغیرہ اس کے اجزائے حسن ہیں۔ حدیث میں یہ کیفیتیں پیدا کرنے کو احسان کہا گیا ہے اور اس کی تدبیر یہ بتائی گئی ہے کہ أعبُد ربّک کانّک تراہ فان لّم تراہُ فانّہ یراك (عبادت کر اپنے رب کی جیسے کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے' لیکن اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تو دیکھ ہی رہا ہے)

ظاہر ہے کہ جب آدمی کو نماز پڑھنے کی حالت میں یہ احساس ہو کہ کوئی اس کو دیکھ رہا ہے تو وہ یہ کرے گا کہ ایسی نمایاں غلطی نہ کرے جو دیکھنے والے کو نظر آ جائے، اور اگر دیکھنے والا کوئی عالم اور محترم شخصیت ہو تو وہ اور زیادہ احتیاط سے کام لے گا۔ پھر جب دیکھنے والا خود خدا ہو جو عالم الغیب بھی ہے تو یہ نمازی اپنی نماز کے ظاہر و باطن دونوں کو ٹھیک ٹھیک بجالانے کی کوشش کرے گا، اور اس طرح اس کی نماز حسین ہو جائے گی۔

نماز اور پابندئ وقت: نماز وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے۔ انّ الصّلوٰۃ کانت علی المُومنین کتابًا مّوقُوتًا۔ (النساء:۱۰۳) ''بلاشبہ مومنوں پر وقت کی پابندی سے نماز فرض کی گئی ہے''۔ نماز نے مسلمانوں کو وقت کی قدر و قیمت بتایا اور وقت کا پابند بنایا۔ فرض اوقات میں جن مصلحتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہ مثال کے طور پر یہ ہیں۔ دعوت و تبلیغ کی مصروفیت' تحریک حق کی ہماہمی' تمدنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی مہلت وغیرہ۔ فجر سے ظہر تک انسان تازہ دم ہوتا ہے جو مذکورہ بالا مصالح کے لئے فارغ رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد زوال اور انقلاب کے مراحل کی علامتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ یعنی آفتاب کے ڈھلنے' آفتاب کے ماند پڑنے' آفتاب کے غروب ہو جانے' رات کی تاریکی کے چھا جانے اور پھر فجر کی شکل میں حق کے دوبارہ آ جانے کی علامتوں سے حق و باطل کی کشمکش کے ضمن میں انقلابات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ حق کے غالب ہو جانے کے بعد اس کی خدمت میں دوسروں سے سبقت لے جانے کے لئے رات رہتے ہی اپنی پیاری نیند چھوڑ کر تیاری کرنے کے لئے تہجد کا علامتی وقت مقرر کیا گیا ہے۔

For they while their companions slept

Were toiling up-ward in the night

نماز اور خلافت ارضی: نماز صرف انسان ہی کی نہیں ہے بلکہ ہر مخلوق کی اپنی اپنی نماز ہے۔ جس طرح ہمارے اردگرد کی دوسری مخلوقات کی سمجھ میں ہماری نماز نہیں آتی اسی طرح ہم بھی نہیں سمجھتے کہ ان کی نماز کیسی ہے' کیا ہوتی ہے اور کس طرح ادا کی جاتی ہے؟ ہر مخلوق کی نماز اس کی نوعی ضرورت کے مطابق ہے۔ ہماری نماز بھی ہماری، یعنی نوع بشری کی، ضرورت کے مطابق ہے۔ یعنی یہ

کہ ہماری نماز ہمیں اس عبادت کے لائق بناتی ہے جس کے لئے ہم کو انسانی جامہ پہنایا گیا ہے۔ نماز کے ذریعہ ہمیں انکشاف ہوتا ہے کہ عبادت کی موٹی موٹی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو فرشتوں کی عبادت ہے جو تسبیح، تکبیر اور تہلیل ہے۔ وہ نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ شادی بیاہ کرتے ہیں اور نہ اولاد پیدا کرتے ہیں اور نہ کسب معاش کرتے ہیں۔ دوسری عبادت نظر آنے والی مخلوقات (حیوانوں) کی عبادت ہے جو کھاتے پیتے ہیں، ازدواجی تعلقات قائم کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ایک عبادت جنوں کی بھی ہے جو مستقل نوعیت کی نہیں ہے بلکہ انہی دونوں عبادتوں کا مرکب ہے۔ یعنی یہ کہ وہ تسبیح و تہلیل بھی کرتے ہیں جو فرشتوں کی عبادت ہے اور ساتھ ہی کھاتے پیتے اور بچے بھی پیدا کرتے ہیں جو حیوانوں کی عبادت ہے۔ ہم انسانوں کی عبادت اگر فقط اتنی ہی ہوتی تو جنوں سے ہم برتر مخلوق نہ ہوتے مگر نہیں! ہماری عبادت اس مرکب عبادت کے ساتھ ساتھ مزید ایک اور ہے جس کو خلافت الٰہی کہتے ہیں۔ یہ ہماری مستقل نوعی عبادت ہے جو ہمیں اس کائنات میں ممتاز بناتی ہے، جس کی بدولت ہم اشرف المخلوقات قرار پاتے ہیں اور جس کے فطری تقاضوں ہی کا کرشمہ ہے کہ ہم کائنات کو بتدریج مسخر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

نماز اور باھمی محبت: اسلام مسلمانوں کو باہمی الفت اور محبت کے لحاظ سے بنیان مرصوص یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے جیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ بات مخلصانہ محبت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور کوئی دنیاوی غرض خلوص پیدا ہونے نہیں دیتی۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا کہ اگر آپؐ دنیا بھر کی دولت خرچ کر دیتے تو ان کے دلوں کے درمیان الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ محبت تو اللہ کے واسطے ہوتی ہے جو سب سے زیادہ شدید اور پائیدار ہوتی ہے۔ چنانچہ نماز ایک ہی صف میں شاہ و گدا، محتاج و غنی سب کو شانہ بہ شانہ کھڑا کر دیتی ہے۔ جب مسلمان بازو سے بازو ملا کر کھڑے ہوتے ہیں تو انسانی بجلی (Human Electricity) اور حیوانی مقناطیسیت (Bio-magnetism) دونوں اپنا اپنا کام شروع کر دیتی ہیں۔ انسان کے بائیں پہلو میں مثبت بجلی (Positive Electricity) اور دائیں میں منفی بجلی (Negative Electricity) ہوتی ہے۔ اس طرح مثبت منفی، مثبت منفی مسلسل Series میں ملتے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں جتنی بڑی صف ہوتی ہے اتنا ہی Voltage زیادہ ہوتا ہے اور اس طرح باہمی محبت شدید سے شدید تر ہوتی ہے۔ پھر اگر کئی صفیں ہوتی ہیں تو یہ بجلی مثبت مثبت سے، اور منفی منفی سے Parallel میں ملتی جاتی ہے جس سے پیدا ہونے والی بجلی کا Ampere بہت بڑھ جاتا ہے۔ اور اس طرح ان کی باہمی محبت میں اتنا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کا اثر خارج میں ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نماز اور روزمرّہ کے مسائل: نماز محلّے بھر کے مسلمانوں کو پانچ وقت مسجد میں جمع کرتی ہے جن میں غریب اور امیر، ضعیف اور توانا، جاہل اور عالم، حاجت روائی کی صلاحیت رکھنے والے اور محتاج سبھی ہوتے ہیں۔ چونکہ نماز ان کو ایک منظم گروہ دیکھنا چاہتی ہے، اس لئے یہ سارے نمازی ایک دوسرے کی ضرورت اور حیثیت سے خود بخود واقف ہوتے رہتے ہیں اور ان کے بہت سے باہمی مسائل حل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کئی وقت مسلسل غیر حاضر رہتا ہے تو قدرتی طور پر سبھوں کے ذہن میں تشویش پیدا ہوتی ہے۔ وہ بیمار ہوتا ہے تو لوگ فطری رفاقت و محبت کے جذبے سے مجبور ہو کر اس کی عیادت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی عذر ہوتا ہے تو سب مل کر اسے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نماز اور ڈسپلن: نماز جماعت اور جماعتی زندگی سے متعلق تفصیلی رہنمائی دیتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ جماعت ایک امام کے ماتحت ہونی چاہئے۔ امام کے انتخاب کے لئے وہ بتاتی ہے کہ تمام نمازیوں میں سے جو سب سے زیادہ قرآن کا علم رکھنے والا، صاحب تقویٰ اور با اثر ہو اس کو امام بنانا چاہئے۔ چنانچہ نماز کا امام صرف مسجد کا امام نہیں ہوتا بلکہ پوری زندگی کا امام ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت علی

کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ جب رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں آپ کو نماز میں ہمارا امام بنا دیا تو سیاست میں آپ کے سوا دوسرا کوئی ہمارا امام کیسے ہوسکتا ہے۔

نماز سکھاتی ہے کہ اپنے سربراہ یا امام کی اطاعت کس طرح کرنی چاہئے۔ امام کے حکم پر سبھوں کو صف بند ہونا' اٹھنا' بیٹھنا اور پھر منتشر ہونا پڑتا ہے۔ وہ غلطی کرے تو بھی اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ اس کو لقمہ دینے یعنی غلطی پر ٹوکنے کی تربیت دی جاتی ہے کہ کب اور کس طرح ٹوکنا چاہئے۔ اور اگر اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرے تو بھی اس کی اطاعت کئے جانا چاہئے الا یہ کہ وہ اللہ و رسول کے بنائے ہوئے حدود کو توڑ دے، جیسے نماز کی ہیئت بدل دے یا کوئی دوسری من مانی کرنے لگے تو پھر اللہ کی صریح نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

نماز امام کی صرف اطاعت یعنی حکم پر عمل کرنا نہیں سکھاتی ہے بلکہ امام کے اتباع کا حکم دیتی ہے۔ یعنی امام جو کرے اور کہے مقتدی اس کی پوری پوری پیروی کرے۔ چنانچہ آں حضورؐ کے پیچھے جو صحابہؓ نماز پڑھتے تھے وہ پہلے دیکھ لیتے تھے کہ حضورؐ نے کون سا عمل کیا اور اس کے بعد اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ یعنی جب حضورؐ رکوع میں جا چکتے تب صحابہؓ رکوع کرتے' جب آپؐ سجدے میں جا چکے ہوتے تب صحابہؓ سجدے کرتے وغیرہ وغیرہ۔ ایسا اس لئے بھی کرتے تھے کہ اس بات کا امکان ہر وقت رہتا تھا کہ نماز کی ہیئت میں کوئی تبدیلی ہو جائے۔ لیکن حضورؐ کی وفات کے بعد یہ امکان ختم ہو گیا اور نماز کے اجزائے ترکیبی ہمیشہ کیلئے متعین ہو گئے۔ اور ہمارے زمانے کی نمازیں خودکار مشین کی طرح ادا کی جانے لگیں۔ شریعت نے امام کو لقمہ دینے اور اس کی غلطی کا بھی اتباع کرنے کا حکم دے کر نماز کی اس اسپرٹ کو قائم رکھا ہے۔ اسی لئے امام سے پہلے کوئی حرکت ادا کرنا بہت ہی مذموم قرار دیا گیا ہے اور حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ایسا کرتا ہے قیامت کے دن جب وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو اس کا سر گدھے کے سر جیسا ہوگا۔

نماز اور بین الاقوامیت: نماز خانہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے پڑھنا لازمی ہے۔ چاہے آدمی اکیلا نماز پڑھے یا جماعت کے ساتھ اور چاہے زمین کے کسی بھی حصے میں پڑھے۔ یہ اس بات کی یاددہانی کیلئے ہے کہ اسلام کوئی مقامی اور ہنگامی نظام زندگی نہیں بلکہ بین الاقوامی اور آفاقی دین ہے۔ اسی غرض کے لئے پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ جمعہ کی نماز فرض کی گئی ہے۔ جمعہ میں محلّوں کی علیحدہ علیحدہ نماز کی بجائے پورے شہر کی یکجائی نماز ہوتی ہے۔ اور عیدین کی نماز واجب کی گئی ہے جس میں شہر اور مضافات شہر کے سارے مسلمان یکجا کئے جاتے ہیں۔ اور سال میں ایک بار دنیا جہان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ مرکزی مقام یعنی خانہ کعبہ کے پاس جمع کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی عالمگیر اجتماعیت اور اس کے فوائد کا مشاہدہ کریں۔ پھر اس بات کے پیش نظر کہ مسلمانوں میں سے کم فہم لوگ یا اگلی اُمتوں کی طرح انحطاط کا شکار ہو جانے والے مسلمان کہیں خانہ کعبہ میں خدا کو محصور نہ سمجھنے لگیں یا خانہ کعبہ یا اس کے سمت کو اپنا مسجود نہ سمجھ لیں تحرّی کا حکم دیا گیا۔ یعنی اگر ایسی جگہ پر نماز کا وقت ہو جائے جہاں کوئی ذریعہ خانہ کعبہ کا سمت معلوم ہونے کا میسر نہ ہو تو ذہن پر زور دینا چاہئے، جس طرف گمان غالب ہو اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لینی چاہئے۔ اگرچہ ہوسکتا ہے کہ واقعتہً خانہ کعبہ کی طرف پشت ہو جائے مگر نمازی کی نماز ہو جائے گی۔

قبلہ دراصل امامت اقوام کی علامت (Symbol) ہے۔ خانۂ کعبہ کی طرف توجہ اور خانہ کعبہ کی زیارت کی اصل غرض اُمت مسلمہ کو ہر وقت یہ یاد دلاتے رہنا ہے کہ وہ دنیا کی اُمتوں میں محض ایک اُمت نہیں ہے بلکہ دنیا کی قوموں کا اسے امام بنایا گیا ہے۔ جس طرح نماز باجماعت میں افراد کا ایک امام ہوتا ہے جس کے حکم پر سارے مقتدی حرکت و عمل کرتے ہیں اور جس کی تقلید انہیں کرنا پڑتی ہے، اسی طرح ایک اُمت یا ایک قوم و گروہ دنیا کی قوموں' اُمتوں اور گروہوں کا امام ہوتی ہے جس کی ہر بات پر دنیا والے آمنّا و صدّقنا

کہتے ہیں اور جس کی ہرادا کی نقل اتارنا اپنے لئے باعث عزت وفخر سمجھتے ہیں۔ نماز اُمت مسلمہ کو، جو اللہ کی طرف سے قانونی (Dejure) طور پر صالح امامت کے منصب پر فائز کی گئی ہے، عملاً (Defacto) اس پر فائز کئے جانے کے لائق بناتی ہے۔

پھر حق کی یہ گواہی اسے محض انفرادی اعمال ہی کی حد تک نہیں دینی ہے۔ صرف ملیّ، قومی اور ملکی سطح ہی پر نہیں دینی ہے بلکہ بین الاقوامی پیمانے پر صالح امامت قائم کرنے کی جدوجہد کے ذریعہ، اور قائم ہو جائے تو اس کو حسن وخوبی سے چلا کر بھی ادا کرنی ہے۔ اس غرض کے لئے کہ اس کے دل میں اس گواہی کے جذبات انگڑائی لینے لگیں۔ کلمہ شہادت کے فوراً بعد نماز اس سے درود پڑھواتی ہے جس میں رسول اللہؐ اور آپؐ کے آل پر ویسی ہی نوازشیں اور برکتیں نازل کرنے کی دعاء کی جاتی ہے جیسی نوازشیں اور برکتیں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل پر نازل کی گئی تھیں۔ انبیاء اور رسولوں کی عظیم فہرست میں سے صرف حضرت ابراہیمؑ پر کی جانے والی نوازشوں اور برکتوں کا ذکر یہی مفہوم رکھتا ہے کہ ان کو جس چیز نے سبھوں سے ممتاز بنایا ہے وہ قوموں کی امامت کا منصب ہے۔ لہٰذا جس طرح ان کو قوموں کی امامت سے نوازا گیا اسی طرح ہمارے رسولؐ کو بھی امامت کے منصب سے نوازا جائے۔

نیز یہ منصب حضرت ابراہیمؑ کی ذات تک محدود اور ان کے لئے مخصوص نہیں تھا بلکہ ان کی آل کو بھی اس میں شریک کیا گیا تھا یعنی ان کی آل بھی امامت سے سرفراز کی گئی تھی۔ نماز اس سے یہ دعا کراتی ہے کہ اس طرح ہمارے رسولؐ کو بھی امامت سے نوازا جائے اور ان کی آل کو بھی اس سے سرفراز کیا جائے۔ واضح رہے کہ قرآن اور حدیث میں آل کا لفظ اولاد کے لئے نہیں بلکہ طریقے پر چلنے والے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس طرح درود کا مطلب یہ ہوا کہ آں حضورؐ کو دنیا کی قوموں کی امامت عطا کی جائے، اور آپؐ کے طریقے پر چلنے والوں کو بھی۔ جن میں ایک وہ شخص خود بھی ہے جو درود پڑھ رہا ہے۔ اس لئے صالح امامت برپا کرنے کی جدوجہد میں، یا بالفعل برپا ہو تو اس کو بہترین طور پر چلانے میں جس نوعیت کی شہادت درکار ہے وہ شہادت اسے دینی ہے۔

واٰخر دعوانا ان الحمدُ للہ ربّ العٰلمین

☆☆☆

طلبہ کی اصلاح وتربیت کے لئے خطوط کار

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ

(یہ مضمون ماہنامہ ’رفیق‘ کے فروری، مارچ ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

اللہ کے لئے جذبۂ شکر سے میں اپنے دل کو لبریز پا رہا ہوں اس لئے کہ اب وہ اپنے مقدس دین کو ساری دنیا پر غالب کرنے کی طرف متوجہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے طلباء جو اب سے پہلے تک الحاد، تشکیک اور دوسرے گمراہ کن فلسفوں اور نظاموں کے شکار ہو رہے تھے اب بحمداللہ وہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے اسلام کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ مستقبل کے معمار یہی ہوتے ہیں، اس لئے بجا طور پر یہ توقع ہوتی ہے کہ انشاءاللہ بہت جلد دنیا کا غالب نظام اسلام ہوگا۔ یہ بات میں بتاتا بھی رہا ہوں اور یہ بات خود ہی اتنی واضح ہے کہ بتائے بغیر سمجھ میں آجائے کہ ایک عملی نظام غالب ہونے کے بعد نافذ بھی ہونا چاہتا ہے اور اس کو نافذ کرنے والے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہوں نے اس کے غلبے کے لئے جدوجہد کی ہو۔ چنانچہ اس پہلو سے تحریک کے دو مرحلے ہوتے ہیں ایک اس کو غالب کرنے کے لئے جدوجہد اور قربانیوں کا مرحلہ اور دوسرا غالب ہوجانے کے بعد اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا مرحلہ تاکہ دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ تحریک نے جو دعوے کئے تھے وہ محض الفاظ کے گورکھ دھندہ نہیں تھے۔ اس پہلو سے جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی بھی نظام اپنے دعوے میں کھرا اور سچا نہیں ثابت ہوا۔ اس کو غالب کرنے کے لئے قربانیاں بہت زیادہ دینی پڑیں، مگر کسی نے بھی اپنے دعوؤں اور وعدوں کے مطابق نہ تو مسائل کو حل کیا اور نہ ہی وہ اپنی اصلی شکل میں قائم ہو سکا۔ اس کی تازہ ترین مثال جمہوریت اور کمیونزم کی ہے۔ جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ Government of the people, for the people, by the people ہے لیکن ہر شخص اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے خطۂ زمین پر ایک دن کے لئے بھی قائم نہیں ہو سکی، وہ محض ایک utopia ثابت ہوئی۔ اسی طرح کمیونزم کا حال ہے کہ سرمایہ داروں کے پروپگنڈے کے مطابق نہیں بلکہ خود روس کے سربراہوں کے اعتراف کے مطابق (لاکھوں لاکھ انسانوں کے بے دردانہ قتل اور بے حساب املاک کی جبری ضبطی کے باوجود) کمیونزم ابھی نہیں آیا۔ اسلام وہ واحد دین اور نظام ہے جو تاریخ میں بار بار اپنی اصلی شکل میں قائم ہوتا رہا اور ہر دور میں اس وقت کے مسائل کو تسلی بخش طریقے پر حل کرتا رہا ہے۔ واضح رہے کہ اسلام صرف وہ نہیں ہے جو آج سے چودہ سو سال پیشتر عرب میں برپا ہوا۔ بلکہ حضرت آدمؑ کے وقت سے اسلام چلا آرہا ہے اور عرب کے مذکورہ انقلاب سے پہلے بہت سی جگہوں پر اور بہت سے زمانوں میں یہ برپا ہوتا رہا ہے۔ کچھ تو تاریخ کے دور سے پہلے اور کچھ بعد زمانہ تاریخ میں۔ مثال کے طور پر داؤدؑ اور سلیمانؑ کے عہد کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ شخصتیں ہیں جن کے بارے میں ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ یہ دونوں اللہ کے پیغمبر تھے۔ اسی ہندوستان میں گوتم بدھ کی تحریک کے نتیجے میں جو نظام امن قائم ہوا ظاہر ہے وہ دہریت یا سیکولرزم کا علمبردار نہیں تھا۔ یہ بہر حال اس دور میں ہوا ہے جب پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ جاری تھا گرچہ ہم قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ گوتم بدھ پیغمبر تھے ہی۔ جہاں تک ان کی تعلیم کا تعلق ہے یہ گمان کرنے کے لئے بنیادیں موجود ہیں کہ جس طرح ان پیغمبروں کی تعلیمات مسخ کردی گئیں جن کو ہم یقین کے ساتھ اللہ کے پیغمبر مانتے ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی ممکن ہے کہ گوتم بدھ بھی پیغمبر ہی ہوں۔ مگر ان کی تعلیمات کو بعد والوں نے مسخ کردیا۔ کم از کم اتنی بات تو آج بھی معلوم ہے کہ گوتم بدھ بت پرستی کے سخت ترین مخالف تھے مگر بعد والوں کی ستم ظریفی دیکھئے کہ دنیا میں سب سے زیادہ

انہی کے بت کی پرستش ہوتی ہے۔ اسی سے غالب گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے لئے الہامی ضابطے دیئے ہوں گے اور انہی کے نتیجے میں ایک نظام امن قائم ہوسکا مگر بعد والوں نے ان کو فراموش کر دیا۔

اب اللہ کا جہاں فضل یہ ہے کہ اس نے اسلامی نظام کو مکمل کر دیا ہے وہیں اس کا فضل یہ بھی ہے کہ اس نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لے لی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال میں اسلام اگر چہ دنیا کے ہر خطے اور ہر قوم میں پھیلتا رہا پھر بھی یہودی سازش اور امت مسلمہ کے اندر کے منافقین کی انتہائی کوششوں کے باوجود اپنی خالص شکل (Pristine purity) میں آج بھی موجود ہے اور اب جبکہ کوئی نیا پیغمبر آنے والا نہیں ہے اسلام سے دور ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد اسلام کو دوبارہ قائم اور نافذ کرنے کی ذمہ داری ان تمام مسلمانوں کی ہے جو اس خالص دین کا علم اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی ذمہ داری کا احساس ہے جس نے تحریک اقامت دین کی شکل مختلف ملکوں میں اختیار کر لی ہے اور عمر رسیدہ اور نو جوان سبھی لوگ اس قافلے میں شریک ہوتے جا رہے ہیں۔

ابھی یہ تحریک اپنے پہلے مرحلے میں ہے جب کہ اس کا تعارف کرایا جا رہا ہے اور ایک ایک دو دو کر کے افراد اس کا ساتھ دیتے جا رہے ہیں۔ میں اس موقع پر اپنے نو جوان ساتھیوں کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان پر دونوں مرحلوں کی ذمہ داری ہے۔ بوڑھی نسل کے لوگ ہوسکتا ہے کہ دوسرا مرحلہ نہ دیکھ سکیں اور دیکھیں بھی تو ان کی قوت کارکردگی اتنی باقی نہ رہ گئی ہو کہ اسلامی نظام عملاً چلا سکیں۔ لیکن مجھے بہر حال اس بات کا تقریباً کامل یقین ہے کہ ہماری نو جوان نسل کو دونوں مرحلہ دیکھنا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے نو جوانوں کو دونوں ہی مرحلوں سے متعلق باتیں بتاؤں۔

سب سے پہلی بات جو سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام ایک جامد مذہب اور کچھ رسم ورواج کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک انقلابی دین اور Dynamic force ہے۔ اس کا اعتراف خواہ مذہبی طبقے والوں کو نہ ہو لیکن قرآن کا مطالعہ کرنے والے اسلام کے مخالفین اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ قرآن ایک انقلابی کتاب ہے اور اس کی عامل امت غلام بنا کر نہیں رکھی جاسکتی ہے۔ اور اسی لئے سیاسی طور پر غالب اقوام نے بہت سی جہتوں سے اس بات کی منظم مہم چلائی کہ کسی طرح مسلم عوام کا قرآن کے ساتھ شعوری تعلق ختم کر دیا جائے۔ جذباتی تعلق رہے تو رہے۔ چونکہ اسلام ایک Dynamic force ہے وہ اپنے ماننے والوں کو اپنے مخصوص سمت میں کھینچ کر آگے بڑھانا چاہتا ہے لیکن ایسے لوگ جو کل کے کل اسلام کو اپنی زندگی میں نہیں سموتے ہیں وہ غیر شعوری طور پر اپنے کو دو مخالف سمتوں میں کھینچنے والی طاقتوں کے حوالے کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں فعال بن کر نہیں رہ سکتے ان کے لئے انفعال مقدر ہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کے بعض حصے پر عمل کرتے ہیں اور بعض حصے پر عمل نہیں کرتے ہیں ان کا بدلہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا میں وہ رسوائی کی زندگی بسر کریں اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہو۔ اس لئے میں اپنے نو جوان ساتھیوں سے یہ کہوں گا کہ وہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بننا قبول نہ کریں بلکہ قرآن کے مطالعہ کے مطابق اپنے پورے وجود کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں سمیت مکمل اسلام میں داخل ہو جائیں تا کہ اسلام انہیں اسی طرح ایک سمت میں آگے بڑھاتا ہوا دنیا اور آخرت میں اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا دے جس طرح اس نے خیر القرون کے لوگوں کو پہنچا دیا۔

اس غرض کے لئے ان کو اسلام کا گہرا اور ہمہ جہتی مطالعہ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں میرے خیال میں کوئی چیز اور کوئی مصلحت حائل نہیں ہونی چاہئے۔ ایک انقلابی دین اپنے ماننے والوں کے اندر انقلابی روح پھونکتا ہے اور انقلابی روح کسی رکاوٹ اور کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ کوئی تحریک جس کے کارکن ٹھنڈے ٹھنڈے زندگی کی راہ گذارنا چاہتے ہوں انقلابی نہیں ہوسکتی۔ انقلابی تحریک کے کارکن تو گویا جنونی ہوتے ہیں انکے سونے اور جاگنے ہر حال میں صرف اپنا نصب العین ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ذات

تحریک میں گم اور انکے اپنے مسائل گویا معدوم ہوتے ہیں۔ ان کا حال تحریک کا حال ہے۔ اور تحریک کا مستقبل ان کا مستقبل ہوتا ہے۔ جب ایسے کارکن کسی تحریک کو مل جاتے ہیں تو مشیت اس تحریک کے حق میں فیصلہ کر دیتی ہے۔ افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ باطل تحریکوں کو ایسے کارکن خاصی تعداد میں ہوتے ہیں حالانکہ ان کے سامنے آخرت تو سرے سے ہے ہی نہیں لے دے کر بس دنیا کی یہ چند روزہ زندگی ہے لیکن اس میں بھی وہ آئے دن مشاہدہ کرر ہے ہیں کہ جب ان کی تحریک کامیاب ہوتی ہے تو اس کے مخلص کارکنوں کو اسی طرح موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے جس طرح درندے اپنی جنس کے ساتھ کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اسلامی تحریک وہ واحد تحریک ہے۔ جس کا مستقبل لازماً کامیاب اور تابناک ہے۔ اس لئے کہ اگر دنیا میں حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے تحریک مادی لحاظ سے کامیاب نہ بھی ہو تو ہماری مسلسل زندگی کا آخری حصہ بہرحال اسلامی نظام ہی میں بسر ہوگا کیونکہ مرنے کے بعد ہم اپنی زندگی کے ابدی حصے میں جہاں جاتے ہیں وہاں کسی باطل نظام کا گذر نہیں ہے۔ وہاں تو اسلام اور صرف اسلام ہی کا غلبہ ہے، وہاں تو اسی خدا کی حکومت ہے جس کی حکومت کو شرعی طور پر قائم کرنے کے لئے ہم تحریک چلا رہے ہیں۔ اس لئے ہمارا اور ہماری تحریک کا مستقبل تو Guaranteed ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے نوجوانوں سے یہ مطالبہ کرر ہا ہوں کہ وہ پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ اسلام کا مطلوبہ مطالعہ کریں۔

جب میں اسلام کا مطالعہ کرنے کی بات کہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ میں وہ بات کہہ رہا ہوں جو مذہبی لوگ کہتے ہیں۔ اسلام بحیثیت دین کا مطالعہ خود اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ علوم جن کو اصطلاح میں سیکولر کہا جاتا ہے ان کا بھی مطالعہ ساتھ ساتھ ہو اور باطل تحریکوں اور فاسد نظاموں کا بھی مطالعہ ہونا چاہئے کیونکہ اسلام کو سمجھنے کے لئے سبیل المجرمین یعنی جرم شعار لوگوں کے طور طریقے بھی اہل اسلام پر واضح ہونے چاہئیں۔ بقول صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اسلام کو کما حقہ ہم ہی سمجھ سکتے ہیں کیوں کہ ہم نے کفر کو بھی دیکھا، برخلاف تابعین کے جنہوں نے اپنی آنکھیں اسلام میں کھولیں اور انہوں نے کفر کو دیکھا ہی نہیں۔ میں جس طرح کے مطالعہ کا مطالبہ کرر ہا ہوں اس کی دو خصوصیت واضح رہنی چاہئے۔ پہلی یہ کہ آپ کے مطالعہ کی غرض وغایت اپنی تحریک کو فائدہ پہنچانا اور اپنے دین کی خدمت ہونی چاہئے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپکا سارا مطالعہ اسلام ہی کی جدوجہد کے لئے ہونے کی وجہ سے عبادت قرار پائے گا اور اس پر آپ بڑے اجر کے مستحق ہوں گے، اسی بنا پر دوسری بات یہ ہے کہ یہ مطالعہ Sincere ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں مطالعہ کا حق ادا ہونا چاہئے نہ کہ ویسا مطالعہ جیسا کہ محض Diploma حاصل کرنے اور ملازمت کے لئے ہوتا ہے۔ اس مطالعہ کے اسلام کے لئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے پہلے مرحلے میں آپ ایک کامیاب اور خود اعتمادی سے بھرپور داعی بن کر اٹھیں۔ اور دوسرے مرحلے میں جو مسائل Challenge بن کر سامنے آئیں ان کو آپ ٹھیک ٹھیک اسلام کی روح اور حکمت کے مطابق حل کرسکیں۔

جہاں تک خود اعتمادی کا تعلق ہے اس کے لئے وقت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب آپ اپنی تعلیم میں مہارت حاصل کرلیں۔ آپ نے اگر اپنے تحریکی لٹریچر کا مطالعہ اچھی طرح سے کرلیا ہے تو آپ کے لئے اپنے مخاطب سے مرعوب ہونے یا اس کے مقابلے میں کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربات اور اپنے زیر تربیت کارکنوں کے تجربات کی بنیاد پر پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ آپ قابل سے قابل اور اونچی سے اونچی ڈگری رکھنے والے کے پاس اپنی دعوت دینے کے لئے پوری خود اعتمادی کے ساتھ جایئے، البتہ اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھئے کہ گفتگو صرف اصول کی حد تک ہو فروعات Offshoots اور غیر متعلق Irrelevant باتوں میں ہرگز نہ الجھئے اور اگر آپ کا مخاطب قصداً یا عادتاً اس طرح کی باتوں میں آپ کو الجھانا چاہے تو پوری حکمت کے ساتھ اپنے آپ کو الجھنے سے بچالیجئے۔ کسی کے دل میں بات کو اتار دینا تو یہ صرف اللہ کا کام

ہے لیکن جہاں تک دعوت پہنچانے کا تعلق ہے انشاء اللہ آپ کامیاب رہیں گے۔ کسی تحریک خصوصاً انقلابی تحریک اور اس کے کارکنوں کے لئے معیار زندگی اور دوسروں کی ریس زہر ہلاہل ہے جو شخص دوسروں کی دیکھا دیکھی ان کے جیسا بننے کا اور معیار زندگی میں دوسروں کے مقابلے کار جحان رکھتا ہو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ کسی بھی تحریک کا کارکن نہ بنے۔ انقلابی تحریک جو محض دنیا کے لئے برپا ہو اس کے کارکنوں کے سامنے بھی مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے ان کو توقع ہوتی ہے کہ ان کی تحریک کامیاب ہو جائے گی تو مادی لحاظ سے ان کا معیار زندگی بلند ہو جائے گا۔ اسی مستقبل کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے حال کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اور اس کے لئے وہ اپنے ماحول کی طرف سے طعن و تشنیع کا شکار بھی ہوتے ہیں مگر نہ تو ان کو اس کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ اپنی آسائش کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ تن آسانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ اس کے باوجود ہوتا ہے کہ مستقبل کے لئے وہ کوشاں ہوتے ہیں جو یقینی نہیں ہوتا بس ان کو ایک امید اور ایک توقع ہوتی ہے کہ وہ جس مستقبل کا خواب دیکھ رہے ہیں اور جس انقلاب کی وہ امید رکھتے ہیں وہ شاید انہیں حاصل ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے اسلامی انقلاب اور اسلامی تحریک کا مستقبل جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے یقینی اور قطعاً یقینی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریک کے کارکن دوسروں کو مادی لحاظ سے خوشحال دیکھ کر لالچ میں مبتلا ہوں یا تحریکی دور میں معیار زندگی کے پھیرے میں پڑیں یا تن آسانی کا شکار ہوں۔ ان کے لئے تو بلند ترین معیار زندگی اور انسانی تصور کے حدود سے بھی کہیں وسیع تر نعمتوں کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔ اس کے لئے آپ قرآن کا مطالعہ کریں گے تو اس میں آرام و آسائش، نعمتوں اور لذتوں اور بلندیٔ درجات کا جو اہتمام اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے واضح ہو کر سامنے آئے گا اور اگر وہ اس دور میں معیار زندگی کے پھیرے میں پڑے تو انہیں شاندار مستقبل سے بہر حال انہیں ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تحریک اسلامی کے کارکنوں کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں مثلاً یہ کہ مصیبت پر وہ بلبلا نہیں اٹھتے ہیں بلکہ وہ اپنے شعور میں اس بات کو تازہ کر لیتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹنے والے بھی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم مصیبت پر گھبرا اٹھیں۔ یا مثلاً یہ کہ اگر مادی خوش حالی میسر نہ ہو تو تھڑ دلا پن نہیں دکھاتے ہیں اور اس سلسلے میں ماحول اور لوگوں کی ملامتوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی نگاہ اپنے نصب العین پر جمائے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مبارک ہیں اللہ کے وہ بندے جن کی اللہ نے دست گیری کی اور اسلامی انقلاب کی راہ ان پر واضح کی اور اقامت دین کی تحریک کا کارکن بننے کی توفیق عنایت فرمائی۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمہ داری تحریک کو لے کر چلنے والوں کی ہوتی ہے، ان کے لئے معیار زندگی کے معاملے میں اور مادی فوائد کے تعلق سے واحد نمونہ اولاً تو رسولؐ کی زندگی میں ہے، جن کو چٹائی پر لیٹنے کی وجہ سے جسم پر داغ دیکھ کر حضرت عمرؓ رو پڑے اور کہنے لگے کہ قیصر و کسریٰ تو شاندار زندگی بسر کریں اور آپ اس حال میں رہیں، تو آپ نے فرمایا ''اے عمرؓ! کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ قیصر و کسریٰ دنیا کی چند روزہ زندگی کا محدود لطف اٹھالیں اور مجھے اللہ تعالیٰ ابدی زندگی میں لامحدود نعمتوں سے نوازے۔'' دوسرے حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں جو سید التجار تھے، جن کی ساری دولت تحریک اسلامی کے لئے وقف تھی اور خلیفہ بنائے جانے کے بعد انہوں نے سارے کاروبار کو تج دیا اور کفاف پر گذر اوقات کرنے لگے، اس میں سے بھی ایک موقع پر کچھ بچا کر ان کی اہلیہ نے کچھ لذیذ کھانا بنایا تو آئندہ انہوں نے اپنے کفاف سے اتنا کم لینا شروع کر دیا۔ تیسری حضرت عمرؓ فاتح قیصر و کسریٰ کی سادہ زندگی ہے جو ہر شخص کو معلوم ہے جس کی ایک مثال کافی ہوگی کہ باہر سے کوئی قاصد آیا اور اس نے خلیفۃ المسلمین کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے پوری شان بے نیازی سے اشارہ کر دیا، جب وہ ان کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ اینٹ کا تکیہ لگائے سوئے ہوئے ہیں جب ان کی آنکھ کھلی تو وہ شخص رعب اور ہیبت سے کانپنے لگا، معلوم ہوا کہ دنیا میں بھی عزت اور وقار ظاہری ٹیپ ٹاپ میں نہیں ہے بلکہ سادگی میں ہی ہے اور زندگی کی یہی سادگی مادی لحاظ سے اونچے معیار زندگی کی نفی کر دیتی ہے۔ اس لئے میں خصوصی طور پر تحریک

کے ذمہ داروں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی ذاتوں سے ایسا نمونہ پیش کریں جس کے نتیجے میں ان کے پیچھے چلنے والے معیار زندگی کو بے وقعت سمجھنے لگیں۔

ایک بات کی طرف مزید متوجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہ وقت گذرنے کے ساتھ تحریک کو لے کر چلنے والوں کے اندر سستی اور ماندگی اور ایک گونہ ان کے دلوں میں زنگ آلودگی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے، اس کے لئے میں اس وقت صرف اتنا کہوں گا کہ آپ حضرات سورہ الحدید کی اس آیت کو سامنے رکھیں لللذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر الله ومانزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتب من قبل فطال علیھم الا مدفقست قلوبھم. وکثیر منھم فسقون (الحدید:۱۶)

ترجمہ: کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت ان پہ گذر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں؟

ماند پڑنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، آخرت کے وہ مرحلے جن کا ذکر اس آیت سے پہلے اور بعد میں کیا گیا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے ابھی دنیا ہی میں آپ کی تحریک کو انشاء اللہ لازماً کامیاب ہونا ہے اور اس کے بعد اس کو کامیابی کے ساتھ اور شاندار طریقے پر آپ کو چلانا ہے جس کے لئے آپ کو ابھی سے تیاری کرنی ہے۔ جو لوگ مستقبل کے لئے پہلے سے تیاری نہیں کرتے ہیں ان کے لئے وقت پر ناکام ہو جانا مقدر ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں ہمہ جہتی تیاری کرنی ہے مگر ہمہ جہتی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر ایک شخص کو ہر پہلو سے تیاری کرنی ہے بلکہ قیادت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ساتھ چلنے والوں میں سے ہر ایک صلاحیت اور رجحان کا فرداً فرداً جائزہ لے اور اس کے مطابق ہر شخص کو اپنی تیاری کرنے میں لگائے۔ اس سلسلے میں سب سے بنیادی چیز مستقبل میں تعلیم کا مسئلہ ہے۔ آپ نے اگر ابھی سے اس کے لئے غور وفکر کا حق ادا نہ کیا تو آپ وقت آنے پر اس مسئلہ کا حق ادا نہیں کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں تفصیل میں جائے بغیر جو لوگ اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے ہوں ان کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ وہ میرا مضمون ''نظام تعلیم کا ایک خاکہ'' کا مطالعہ کریں۔ اس سے ان کو خاکہ اور ضروری رہنمائی مل جائیگی۔

اپنے مستقبل کی نسلوں کی ایسی تعلیم کا اہتمام کرنا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ کسی طرح اسلامی نظام چلانے کے لائق ہو جائیں بلکہ انہیں ایسا بنانا ہے کہ وہ علمی اور عملی دونوں حیثیت سے دنیا کی امامت کے اہل بن جائیں۔ وہ پامال اور پٹی پٹائی راہ پر چلنے والے نہیں بلکہ ہر آن ترقی پذیر زندگی اور تمدن کے لئے نئی راہیں کھولنے والے ہوں اور مستقبل کے لئے رہنمائی دینے والے ہوں۔ اسی طرح اکتشافات اور اختراعات کے سلسلے میں مومن کی شایان شان یہ نہیں ہے کہ وہ اس پر اکتفا کرے کہ الل ٹپ At random جو چیزیں مستقبل کے پردہ غیب سے سامنے آجائیں اس پر وہ اکتفا کرنے کے خوگر ہوں بلکہ ان کے شایان شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس فطری اسکیم کو سمجھیں جس کے مطابق وہ انسانی زندگی کو ڈھکیل ڈھکیل کر آگے بڑھا رہا ہے۔ اگر وہ قرآن اور اس کی روشنی میں کائنات کا مطالعہ کریں گے تو وہ اسکیم ان کے سامنے بالکل صاف صاف آجائیگی اور اس کے نتیجے میں وہ اس لائق ہوں گے کہ منصوبہ بند طریقے پر وہ نئے انکشافات اور نئی اختراعات کو عمل میں لائیں اور ان کو سابق کی طرح ڈھکیلنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس کے نتیجے میں تمدن کی ترقی بغیر دھچکے کے ہوگی اور اخلاقی، سیاسی، معاشی وغیرہ کسی قسم کے بحران (Crisis) سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا۔ ان اشارات سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کو کتنا عظیم کام انجام دینا ہے اور اس کے لئے کیسی یکسوئی اور کیسے لگن کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب ساتھیوں کو اس عظیم خدمت کے لائق بنائے اور اپنے تقرب خاص سے نوازے (آمین)

نماز
قرب الٰھی کا ذریعه

ضیاءالہدیٰ

اس کتابچہ کو ۱۹۹۶ء میں سعید الحق صاحب نے مکتبہ دین ودانش، رمنہ روڈ، پٹنہ سے شائع کیا

پیش لفظ

الحمدلله الذی هدانا لهذا وما کنا لنهتدی لولا هدانا الله

اللہ کا تقرب دراصل اللہ کی صفات کو اپنے اندر اختیار کرنا ہے۔تقرب الٰہی انسان کی فطرت میں ودیعت ہے جس کی شعوری طلب اللہ کے مومن بندوں کے اندر ہوتی ہے مگر زیادہ تر انسان اس سے غافل ہوتے ہیں۔اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درجہ کمال پر فائز تھے۔یعنی انسان ہوتے ہوئے اللہ کی جو صفات اخذ کی جانی چاہئیں وہ آپؐ کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں۔اپنی ان صفات ہی کو اللہ نے کلام پاک میں اپنا رنگ کہا ہے: صبغة الله ومن احسن من الله صبغة ونحن له عبدون۔اللہ کا رنگ یعنی اس کی صفات اختیار کرو اور اللہ کے رنگ یعنی صفات سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اس کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی بندگی میں زندگی گذاری جائے، نیز یہی بات ہے جو رسول ﷺ نے فرمائی تخلقوا باخلاق الله اللہ کے اخلاق سے اپنے کو آراستہ کرو۔اس کتابچے میں یہی بات وضاحت سے بتائی گئی ہے۔

اس لیے تمام مسلمانوں کو خواہش اور کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ یہ خوبی ان کے اندر پیدا ہو جائے۔ویسے بھی اللہ تعالیٰ کا تقرب نصیب ہونے کی لالچ اور تمنا تو ہر مومن کے اندر ہونی چاہیے۔گرچہ میں خود اس معیار پر پورا نہیں اترتا ہوں، البتہ کوشش اور پیہم کوشش اس کی کرتا ہوں۔اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کی نیک کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔اس امید پر دن رات میں اس کی نظر کرم پر آس لگائے ہوئے ہوں، اور اس کتابچے کو بطور وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں۔شاید کہ اس کے بندوں میں اس کتابچے سے اس کا تقرب ڈھونڈھنے کا جذبہ پیدا ہو، اور اس میں ایسے افراد پیدا ہوں جو اعلیٰ مقام تک پہنچ جائیں اور یہ میرے لیے اللہ تعالیٰ کے راضی ہو جانے کا بہانہ بن جائے۔

ضیاء الہدیٰ
ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیرِ نظر مضمون ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کے ان خطبات جمعہ کا مجموعہ ہے جو انہوں نے نماز کے موضوع پر رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ (۱۹۹۵ء) میں انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ میں دیے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ذمہ جو کام لگایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں اور حکمتیں اس طرح استعمال کریں کہ غیر اسلامی معاشرہ، اسلامی معاشرہ بن جائے۔ وہ نہایت حکیمانہ انداز سے اپنے اس غیر اسلامی معاشرہ میں اس کے دین کی تبلیغ کریں۔ تبلیغ دین کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنی ہی ذات پر اللہ کے دین کو نافذ کریں، پھر اپنے گھر کے لوگوں پر، پھر پاس پڑوس والوں پر، پھر محلّے والوں پر۔ کوشش تو یہ ہو کہ ہمارے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر لوگ خود ہی اسلام کی حقیقت دریافت کرنے کیلئے ہماری طرف بڑھیں، لیکن ہم ان کے آنے کا انتظار نہ کریں بلکہ نام نہاد مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے پاس بلا امتیاز حقیقی اسلام پیش کرتے رہیں۔ انہیں بتائیں کہ اسلام کیا ہے؟ اور ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بھی بتائیں کہ اسلام کیا نہیں ہے؟ تا کہ یہ از خود فیصلہ کر سکیں کہ اس معاشرے میں جو جو چیزیں اسلام کے نام پر پھیلی ہوئی ہیں ان کا اسلام سے واقعی کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ ہماری زبان سے چند الفاظ نکلتے ہی لوگ دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنا شروع کر دیں گے۔ کام اگر اتنا آسان ہوتا تو پھر باطل جھوٹے پروپگنڈے، جنگ اور قتال کے ذریعے اسے روکنے کی کوشش کیوں کرتا۔ اور چوں کہ اللہ نے ہمیں تبلیغ دین کے کام کو کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا اب ہم اس فرض سے ہاتھ بھی نہیں کھینچ سکتے، کیوں کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو اس کوتاہی کی جو سزا بھگتنی پڑے گی وہ اس تکلیف سے بدرجہا زیادہ ہوگی جو اس فرض کی انجام دہی میں پیش آتی ہے۔ لہٰذا اب ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم خاموشی سے یہ کام بالکل اس طرح کرتے چلے جائیں جس طرح کرنے کے لئے اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

اس ذمّہ داری کو ادا کرنے کے لئے بنیادی چیز اللہ کے ساتھ بندے کا براہ راست تعلق اور لگاؤ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کی سیرت اور اس کے کردار کو وہ مضبوطی اور قوّت عطا کرتی ہے جو اس کام کے لئے درکار ہے۔ اور اللہ سے قربت پیدا کرنے کیلئے جو بہترین عمل ہے وہ نماز ہے۔ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ اقم الصّلوٰۃ لذکری یعنی میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ پھر فوراً ہی فرماتا ہے کہ دیکھو قیامت آرہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے یعنی تم اس خواب وخیال میں نہ رہنا کہ جو کام تمہارے سپرد کیا گیا اس کی باز پرس تم سے کبھی نہ ہوگی بلکہ وہ دن اب بالکل قریب آ گیا ہے جس میں، میں تم سب لوگوں کے پل پل کی خبر لوں گا اور تمہارے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دوں گا۔ یہ بات بھی تم اپنے ذہن میں اچھی طرح جما لو کہ قبر میں اور حشر کے دن جو سب سے پہلا سوال تم سے میرے کارندے کریں گے وہ تمہاری نماز ہی کے متعلق ہوگا۔ یہاں جس چیز کے کرنے پر اللہ نے اپنی مدد کا یقین دلایا ہے وہ ہے نماز کا قائم کرنا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے لیے دو الفاظ استعمال کیے ہیں ایک مصلّی یعنی نماز پڑھنے والے، دوسرے مقیم الصّلوٰۃ یعنی نماز قائم کرنے والے۔ اب ظاہر ہے ان دو مختلف الفاظ کے استعمال میں کچھ نہ کچھ حکمت تو ہوگی ورنہ اگر ان کا مفہوم بھی ایک ہی ہوتا تو

خواہ مخواہ لفظ کو بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیں اللہ نے مقیم الصّلوٰۃ بننے کو کہا ہے۔ جو شخص پانچ وقتوں کی نماز پوری شرائط، لوازمات اور کامل یکسوئی کے ساتھ تاحیات ادا کرتا رہے وہ مقیم الصّلوٰۃ ہے، اور جو اپنی نمازوں کو اس کی کامل شرائط اور پابندیوں کے ساتھ ادا نہیں کرتا وہ کہلاتا ہے مصلّی۔ جو مصلّی ہیں وہ اچھے بھی ہو سکتے ہیں بُرے بھی ہو سکتے ہیں۔ جنّتی بھی ہو سکتے ہیں جہنّمی بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن مقیم الصّلوٰۃ بُرے ہوتے ہی نہیں، وہ لازماً اچھے ہوتے ہیں اور ان کیلئے جنّت یقینی ہے۔ مقیم الصّلوٰۃ کے متعلق یہ خوش خبری یونہی نہیں گڑھ لی گئی ہے بلکہ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ نماز کو قائم کرو، بے شک نماز انسانوں کو تمام بُرائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اپنے اندر سے برائیوں کو دُور کرنے کے لئے نماز کا قائم کرنا ضروری ہے نہ کہ صرف اس کا پڑھ لینا۔ یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیئے کہ اقامت صلوٰۃ کا حکم صرف فرض نمازوں کے متعلق ہے، بقیہ نمازیں یعنی سُنّتیں، نوافل وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی کم از کم فرض نمازوں کے دوران تو اقامت صلوٰۃ کی تمام شرائط لازماً ملحوظ رہنی چاہییں۔ ورنہ ہم مقیم الصلوٰۃ کی فہرست سے نکال دیئے جائیں گے۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ فرض کے علاوہ جو نمازیں ہیں ان کی کوئی وقعت اور حیثیت اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ ایسا سوچنا بہت بڑی نادانی ہوگی، کیوں کہ ایک حدیث قدسی میں رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے فرائض ادا کر کے مجھ سے قریب ہوتے رہتے ہیں اور فرائض کے ساتھ نوافل وغیرہ ادا کر کے مجھ سے بہت زیادہ قریب ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ میں ان کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتے ہیں' میں اُن کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتے ہیں، میں اُن کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتے ہیں۔ میں اُن کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتے ہیں، (یہاں تک کہ) میں اُن کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتے ہیں، اس حدیث سے یہ بات آسانی سے اخذ کی جاسکتی ہے کہ جو لوگ نماز ادا کرنے کے باوجود اپنے ان اعضاء کا غلط استعمال کرتے ہیں یعنی اپنے ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ کا استعمال اللہ کی مرضی کے خلاف کرتے ہیں اُن کو یقیناً اللہ کی وہ قربت نصیب نہیں جس کا ذکر اس حدیث میں ہوا ہے، چاہے وہ دنیا کی نگاہ میں پکّے نمازی ہی کیوں نہ ہوں۔ اُن کی نماز میں ضرور کوئی نہ کوئی کھوٹ ہے اور انہیں اپنی نماز کی فوراً فکر کرنی چاہیئے۔

نماز تو دین کا ستون ہے اور اسلام و کفر میں فرق کرنے والی چیز ہے۔ نماز کی حیثیت اسلام میں کیا ہے وہ اس مثال سے آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ جس طرح ایک بڑی عمارت اپنے آپ میں بڑی اور مکمل ہوتی ہے لیکن ایک نقشہ پر نہایت چھوٹی نظر آتی ہے' لیکن جب ہم اُسے Microscope سے بڑا کر کے دیکھتے ہیں تو پوری عمارت نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ ٹھیک اُسی طرح نماز بظاہر تو محض چند ارکان کی ادائیگی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس کے اندر پورا اسلام پوشیدہ ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر رسول ﷺ تک تمام انبیاء اور ان کی اُمتوں پر اللہ نے اس فرض کو نازل کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے اوقات' رکعت کی تعداد اور ارکان مختلف رہے۔ انبیاء کے ذریعہ اس فرض کی اہمیت واضح ہو جانے کے باوجود اُن کی اُمتوں نے نماز جیسی عظیم ترین چیز کو مختلف طریقے سے ضائع کر دیا۔ کسی نے اس کی ظاہری شکل بگاڑ دی' کسی نے وقت کی پابندی ترک کر دی، کسی نے اللہ کی رضا کے بہانے دنیوی فوائد حاصل کرنے کے لئے اس کو پڑھا یعنی جب انہیں لگتا کہ اس سے ہماری دنیا بنے گی، یا ہمارے کاروبار میں فائدہ ہوگا، یا عوام میں ہمارا رتبہ بلند ہوگا تو اسے ادا کرتے اور جب دیکھتے کہ اس کی ادائیگی سے ہمارے کاروبار میں گھاٹا ہوگا' ہماری دنیا برباد ہو جائے گی تو اسے ترک کر دیتے، اور اسی طرح دھیرے دھیرے وہ لوگ بے راہ روی کے شکار ہو کر اور نماز سے بالکل غافل ہو کر مشرکانہ عمل میں ملوّث ہوتے گئے۔

ظاہر ہے کی ان مقاصد کیلئے اگر نماز ادا کی جائے گی تو اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں ہوگی۔ جب تک نماز کو ان شرائط کے ساتھ جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے اُس کی قبولیت کے لئے بتائے ہیں' ادا نہ کیا جائے تب تک نماز سے وہ حقیقی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا

جس کے لئے اللہ نے اسے نازل کیا ہے۔ نماز کو اس کی کامل شرائط کے ساتھ ادا کرنے پر ہی وہ قبول ہوتی ہے۔ درحقیقت نماز ایک تھرما میٹر کی مانند ہے۔ جس طرح تھرمامیٹر سے جسم کی حرارت کا پتہ چلتا ہے ٹھیک اسی طرح نماز سے ایمان کی حرارت معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر نماز پڑھنے سے ہماری اخلاقی اور روحانی بیماریاں دور ہورہی ہیں تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ اللہ کے فضل وکرم سے ہماری نماز اللہ تعالےٰ کے یہاں مقبول ہورہی ہے۔ لیکن اگر نماز لگاتار اور مستقل ادا کرتے رہنے کے باوجود ہماری برائیاں ہم سے چپکی ہوئی ہیں اور ہم گناہوں میں بدستور ملوث ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ ہماری نمازوں کو قبول ہی نہیں فرمارہا ہے، اور ہماری نماز میں ضرور کوئی نہ کوئی نقص ہے جسے فوراً دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اس سلسلے میں ایک بات ذہن نشیں رہے کہ اگر کوئی یہ چاہے کہ نماز شروع کرتے ہی اس کے اندر سے تمام برائیاں دفع ہو جائیں اور وہ پوری طرح نیک بن جائے تو یہ ممکن نہیں۔ ہاں انسان کو اپنی صلاحیت بھر کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ اگر ہم کوشش میں مخلص ہوں گے تو انشاء اللہ ہماری نماز ہم سے ہماری برائیاں ضرور دور کردے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کے بارے میں لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ فلاں شخص نماز بھی پڑھتا ہے اور مختلف گناہوں میں بھی ملوث رہتا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ عنقریب اس کی نماز اس سے اس کی برائیاں دور کردے گی۔

نماز کی قبولیت کے لئے جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی شرط نیت کی پاکیزگی ہے۔ نیت کی پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ نماز خالصتاً اللہ کے لئے پڑھی جائے اور مقصود صرف اللہ کی رضا وخوشنودی اور آخرت میں فلاح وجنت کی چاہت ہو۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے ان دونوں چیزوں کا تذکرہ بھی قرآن پاک میں ایک ساتھ کردیا ہے۔ وہ فرماتا ہے "اقم الصّلوٰۃ لذکری انّ السّاعۃ اٰتیۃ"۔ "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے اور بیشک قیامت آنی ہے" (طٰہٰ)۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز کے دوران ہمارے دل ودماغ میں کسی اور کی نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کی یاد باقی رہنی چاہیئے اور ذہن پر قیامت وآخرت کا خوف طاری ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کسی کی نیت یہ ہے کہ نماز سے اس کے کاروبار میں ترقی ہوگی، یا اس کی دنیا سنورنے لگے گی، لوگوں میں اس کی بڑی عزّت ہوگی یا اسی طرح اگر کوئی عادتاً نماز پڑھتا ہے یا کوئی اپنے گھر والوں کی ٹوک ٹاک اور طعن وتشنیع کے ڈر سے پڑھتا ہے یا کوئی اپنے آفیسر یا حاکم کو خوش کرنے کے لئے پڑھتا ہے تو اللہ کے نزدیک اُس نے نماز ادا نہیں کی بلکہ اُسے ضائع کردیا۔ نمازیں تو منافقین بھی ادا کرتے ہیں لیکن یہ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کی نمازیں آخرت میں انہیں کچھ بھی نفع نہ دیں گی۔ ہاں فقہی قوانین کے مطابق وہ بھی نمازی ہی کہلائیں گے، کیوں کہ یہ قوانین صرف ظاہر سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن اللہ جو کہ ظاہر وباطن دونوں کو یکساں طور پر دیکھتا ہے اس کے نزدیک ایسی نمازوں کی کوئی قدر وقیمت نہیں، کیوں کہ مندرجہ بالا آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوچکی ہے کہ صرف وہی نماز آخرت میں مقبول ومفید ثابت ہوگی جو صرف اللہ کی رضا اور اس کی یاد کے لئے پڑھی گئی ہو----- یہ بات واضح ہے کہ نماز کے دوران صرف دو چیزوں کا خیال دل ودماغ پر پوری طرح حاوی رہنا چاہیئے۔ ایک تو ہے اللہ کا خیال اور دوسرا آخرت کا تصور۔ اب اگر کوئی شخص نماز کے علاوہ تمام اوقات میں تو دنیا کے رنگین خیالات میں گم رہے، اللہ اور آخرت کی یاد سے پوری طرح غافل رہے اور اچانک نماز میں آتے ہی یہ چاہے کہ اُس کے ذہن سے اللہ اور آخرت کی یاد کے سوا ساری یادیں غائب ہوجائیں تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ انسان کے بیشتر اوقات جن خیالات کے ساتھ گزریں گے ویسے ہی خیالات نماز کے دوران بھی آئیں گے۔ اب چوں کہ اللہ نے فرمادیا ہے کہ اقم الصّلوٰۃ لذکری۔ لہٰذا اس حکم کی تعمیل کا بہترین طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے ذہن کو نماز کے علاوہ کے اوقات میں بھی ان خیالات سے پاک رکھیں جو نماز میں ہمیں اللہ اور آخرت

کی یاد سے غافل کرنے والے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم سارے کام چھوڑ کر تسبیح لے کر اللہ اللہ کرنے بیٹھ جائیں بلکہ یہ تو اللہ کو ناراض کرنے والا عمل ہوگا، کیوں کہ یہ انسان کے مقصدِ تخلیق کے خلاف ہے۔ اللہ نے انسان کو کسی بھی ایسے کام سے نہیں روکا ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے کرنا، ناگزیر ہے۔ اس لیے ہم وہ سب کام کریں گے جو انسان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے کرنا ضروری ہے لیکن اللہ کی یاد سے غافل ہو کر نہیں، بلکہ ہمارے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ ایسا کرنے کے لئے بھی اللہ ہی نے ہم سے کہا ہے، لہٰذا ہم جو کریں گے اُسی کی رضا جوئی کے لئے کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دن رات کے جتنے بھی کام ہمارے لئے بہ حیثیت انسان کرنا ناگزیر ہیں ان سب کے لئے حدیثوں میں دعائیں بتائی گئی ہیں تا کہ بندۂ مومن کا تعلق ہر وقت اللہ تعالیٰ سے قائم رہے۔ کھانے، پینے، وضو کرنے، غسل کرنے، سونے، جاگنے الغرض ہر کام اور ہر موقع کی دُعائیں بتائی گئی ہیں۔ ایک مومن کی دلی تمنا تو یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے معبود کو پوری طرح خوش کر دے اور اس کی کامل رضا اُسے حاصل ہو جائے۔ لہٰذا وہ جہاں سارے احکام کی بجا آوری کرتا ہے وہیں ان دعاؤں کو یاد کر کے حسبِ موقع انہیں استعمال کر کے اپنے پروردگار کو راضی کرتا رہتا ہے، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ بھی اُسے اپنے قریب کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ہونا تو یہی چاہیئے کہ ہم بھی ان دعاؤں کو یاد کر لیں۔ لیکن جب تک یاد نہیں ہوئی ہیں تب تک تو کم از کم اللہ کا صرف نام ہی لے کر اُسے یاد کریں۔ لہٰذا ہم اگر چاہتے ہیں کہ نماز کے دوران ہمارا ذہن ادھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے اللہ کی یاد اور آخرت پر مرکوز رہے تو ہمیں بقیہ اوقات میں بھی اپنے اللہ سے اپنا تعلق بنائے رکھنا ہوگا اور آخرت کی باز پرس کو اپنے ذہن میں تازہ کرتے رہنا ہوگا۔

نماز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: انّ الصّلوٰة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً (بیشک نماز تمام مسلمانوں پر پابندیٔ وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔) ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ایک ایسا فرض ہے جو کسی بھی حالت میں معاف نہیں کیا گیا۔ ہم گھر پر ہوں یا سفر پر ہوں، بیمار ہوں یا تندرست ہوں، میدانِ جنگ میں ہوں یا حالتِ امن میں ہر حال میں ہم پر وقت کی پابندی کے ساتھ نماز فرض ہے۔ اب دیکھئے کہ جنگ کی حالت میں اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کو اور اپنے پیارے بندوں کو کس طرح نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ ”اے نبیؐ جب آپؐ اُن کے لئے نماز قائم کریں تو چاہیئے کہ اُن میں سے ایک گروہ آپؐ کے پیچھے ایک رکعت نماز پڑھے اور سجدے کے بعد وہ ہٹ جائے، پھر جنہوں نے نماز نہیں پڑھی ہو وہ آ کر آپ کے ساتھ دوسری رکعت میں مل جائیں“ ____ یہاں پر چند باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے یہاں پر اپنے حبیب ﷺ کو مقیم الصّلوٰۃ کہا ہے اور آپکے مقتدیوں کو مصلّی کہا ہے۔ پھر آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: ”جب تم مطمئن ہو جاؤ یعنی جنگ کے خطرات ٹل جائیں تو نماز قائم کرو“ اُوپر جن کو اللہ نے نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا انہی سے اب کہہ رہا ہے کہ نماز قائم کرو۔ یہاں نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے کا فرق جس کا تذکرہ قبل آ چکا ہے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ نماز تمام شرائط، کامل یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا ”اقامتِ صلوٰۃ“ ہے۔ اور اس کے برعکس اگر نماز کی ادائیگی کے وقت دل پر جان جانے کا خوف طاری ہو۔ افراتفری کا عالم ہو، اور حالت ایسی ہو کہ پوری نماز بھی ادا کرنا مشکل ہو رہا ہو۔ تو اسے نماز پڑھنا کہتے ہیں۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایسے موقع پر بھی اللہ نے نماز معاف نہیں کی ہے۔ یعنی حالتِ جنگ میں بھی ہمیں اللہ کی یاد اور نماز سے غافل نہیں ہونا ہے۔ ہمیں جب اطمینان نصیب ہو جائے تو ہمیں نماز قائم کرنے کا حکم ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کم از کم فرض نمازوں کی حد تک تو ہمارے سامنے اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی کے علاوہ کوئی اور غرض ہونی ہی نہیں چاہئے۔ ہاں نفل میں ہمیں اختیار ہے، ہم اللہ سے دنیا بھی مانگ سکتے ہیں لیکن صرف اتنا ہی جتنا یہاں زندہ رہنے کے لئے ناگزیر ہے۔ ہمیں اللہ سے ایسی دعائیں نہیں مانگنی چاہیئے جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ہم دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے

ہیں اور ہم سارا انعام، عیش و آرام یہیں چاہتے ہیں بلکہ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے جتنا ہمارے لئے ضروری ہے بس وہ ہمیں مل جائے۔ اب اگر اللہ تعالےٰ ہمیں ہماری بنیادی ضرورتوں سے زیادہ عطا کرتا ہے تو ایک مومن کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو آخرت کے لئے اللہ تعالےٰ کے پاس جمع کر دیتا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے، یہ نہیں کہ زیادہ پاتے ہی تمام چیزوں کو بھلا کر اسبابِ عیش جمع کرنا شروع کر دیں۔ تو اس طرح ہمیں معلوم ہوگیا کہ اقامت صلوٰۃ کا جو حکم ہے وہ فرض نماز کے لئے ہے، بقیہ سنتیں اور نوافل وغیرہ بھی ہم پوری شرائط کے ساتھ ادا کریں تو وہ بھی نماز قائم کرنے میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ تھیں نیت کی پاکی کے متعلق چند ضروری ہدایات۔ اب دیکھئے کہ اس کے بعد دوسری کون سی شرط ہے۔

نیّت کی پاکیزگی کے بعد نماز کی قبولیت کی جو دوسری شرط ہے وہ ہے طہارت۔ طہارت سے مراد صرف ظاہری پاکی ہی نہیں کہ غسل کر لیا، اچھا کپڑا پہن لیا بس پاک ہو گئے، بلکہ طہارت کا مطلب ہے ہر جہت سے پاکیزگی اختیار کرنا۔ اس کے اندر سب سے پہلی چیز ہے جسم کی طہارت، یعنی جسم پر اگر کوئی ناپاکی جیسے پاخانہ پیشاب لگا ہوا ہو تو اسے دور کر لیجئے یا غسل کی حاجت ہو تو غسل کر لیجئے۔ یہ تو ہے جسم کی ظاہری طہارت۔ اس کی باطنی صفائی یہ ہے کہ اپنے پیٹ کو حرام دانے سے بچائیں۔ حرام دانے سے پلا ہوا جسم اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اُس کی عبادت قبول کی جائے اور حرام کمائی سے پلے ہوئے جسم کے لئے جنت حرام ہے۔ یعنی سب سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو اس بات پر راضی کرنا ہوگا کہ سوکھی روٹی ہی سہی لیکن آج سے ہمارے پیٹ کے اندر جو چیز بھی جائے گی وہ حلال ہوگی، حرام کا ایک دانہ بھی اب ہم اپنے حلق سے نیچے نہیں اُتاریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنے کے نتیجے میں ہمیں وہ ٹھاٹھ باٹھ اور عیش کی زندگی نصیب نہیں ہوگی جو حرام کی کمائی سے نصیب ہوتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ناجائز طریقہ ہی اختیار کر کے ہم اتنا پیسہ حاصل کر سکتے ہیں جو عزّت کی زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے۔ حالاں کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی کو اُس کے مقدّر سے زیادہ یا کم نہیں دیا جاتا۔ یعنی ہم جو پیسہ حرام ذرائع اختیار کر کے کماتے ہیں اور اللہ کے غصّہ کو بھڑکا کر کماتے ہیں وہی پیسہ ہم تھوڑی محنت کر کے اور صبر کر کے حلال طریقہ سے اور اللہ کو خوش کر کے بھی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن یہ ہماری بدبختی اور کم ظرفی ہے کہ اللہ کی رضا کے بجائے اس کی ناراضگی کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ہم شاید یہ سمجھتے ہیں کہ حرام کی کمائی میں بڑی برکت ہوتی ہے جب کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کہتے ہیں "جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کا پیسہ ناجائز کام میں خرچ ہو رہا ہے تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا پیسہ حرام اور ناجائز ہے۔"

یہ تھی جسم کی طہارت۔ اس کے بعد کپڑے کی طہارت کا نمبر آتا ہے، یعنی آپ کے جسم پر جو کپڑا ہے اُسے دیکھ لیجئے کہ وہ ہر حیثیت سے پاک ہے یا نہیں۔ کپڑے کی پاکی کا مطلب بھی صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ظاہری گندگی سے پاک ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کپڑا آپ نے جس پیسہ سے خریدا وہ پیسہ جس طریقہ سے حاصل کیا ہے وہ طریقہ ناجائز ہے یا جائز۔ جیسے درزیوں کی عام طور پر یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ گاہک کے کپڑے میں سے کچھ کپڑا بچا کر رکھ لیتے ہیں اور پھر اُسے اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ اس طرح تیار کیا ہوا لباس بظاہر تو بالکل پاک صاف ہوتا ہے لیکن اللہ کے نزدیک وہ لباس نجس ہے۔ یعنی اس میں ملبوس ہو کر کوئی نماز پڑھے گا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ ہاں اگر آپ گاہک کو بتا کر اس کی اجازت سے وہ کپڑا اپنے استعمال میں لاتے ہیں تو یہ جائز ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال تھی۔ لیکن یہاں تو کپڑا بیچنے والے ہوں یا کپڑا خریدنے والے، کپڑا سینے والے ہوں یا کپڑا پہننے والے، وہ چاہے بہت بڑے رئیس ہوں یا کوئی محدود کمائی والا ہر ایک اپنے اپنے طریقہ سے اللہ کو دھوکا دینے کی لاحاصل کوشش میں مگن ہے اور اسے یہ احساس تک نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ایک ایسے گڑھے کے قریب جا رہا ہے جس میں گرنے کے بعد کبھی نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہر ایک اپنی حرام کمائی پر مست ہے اور اس کا مظاہرہ اپنے لباس سے وہ خوشی خوشی کرتا ہے۔ بہرکیف کپڑے کی پاکیزگی میں مزید جو چیزیں شامل

ہیں وہ یہ ہے کہ مرد کا لباس ریشم کا نہ ہو، اور عورتوں اور مردوں دونوں کا لباس غیر ساتر نہ ہو ساتھ ہی لباس اس ڈھنگ کا نہ ہو جن میں گندے، لوفر، چور، بدمعاش، عیش پرست وغیرہ ملبوس رہتے ہیں۔ اس طرح وہ لباس بھی پہن کر نماز پڑھنا ممنوع ہے جس سے کسی قوم کی نقالی ظاہر ہوتی ہو، یہ اس وجہ سے کہ عام طور پر لوگ حاکم قوم کے لباس کو اختیار کر کے فخر محسوس کرتے ہیں، اور یہ اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک اور بات جس کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اسراف نہ ہو، یعنی اپنی حیثیت سے بڑھ کر مہنگا کپڑا پہن کر نماز نہیں پڑھنا چاہیئے۔ منجملہ یہ کہ نماز کے لئے جو لباس اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ حلال ہو، اس میں سادگی ہو اور وہ ساتر ہو۔ یعنی اتنا باریک یا چست نہ ہو جس سے جسم نظر آئے یا اس کا نشیب و فراز ظاہر ہو۔

ان چیزوں کے بعد اب یہ دیکھیئے کہ وہ جگہ جہاں آپ نماز ادا کرنے جا رہے ہیں وہ پاک ہے یا نہیں، یعنی وہ جگہ پاخانہ پیشاب اور دوسری تمام ظاہری نجاستوں سے پاک ہے یا نہیں۔ پھر جس مکان یا جس مسجد میں آپ نماز ادا کرتے ہیں اُس کے بارے میں معلوم کر لیجئے کہ آیا وہ مکان یا مسجد جائز طریقہ سے وجود میں آئی ہے یا ناجائز طریقہ سے۔ یعنی زمین کا وہ حصّہ جہاں آپ نماز ادا کرتے ہیں اگر کسی سے چھین کر یا زبردستی قبضہ کر کے حاصل کیا گیا ہے تو یہ ناجائز قبضہ ہے، وہ جگہ نماز کے لئے پاک قرار نہیں پائے گی۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آتا ہے جس کا تذکرہ یہاں کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ پٹنہ سیٹی میں بہت پہلے ایک طوائف رہا کرتی تھی۔ اُس نے وہیں ایک مسجد بنوائی تھی جس کا نام محمدی جان کی مسجد ہے۔ ایک زمانہ میں ہنگامہ ہوا کہ اس مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ جب لوگوں نے معاملہ کی حقیقت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ تائب ہوگئی تھی اور شادی میں اُس کو جو مہر کی رقم ملی تھی اُس نے اس مسجد کی تعمیر میں وہی رقم استعمال کی تھی۔ تب یہ فتویٰ ہوا کہ وہاں نماز پڑھنا جائز ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ آجکل جو مسجدیں بنوائی جا رہی ہیں اس میں کیسی رقم استعمال کی جا رہی ہے۔ بینک سے سُود پر قرض لے کر مسجدیں بنوائی جا رہی ہیں۔ کیا ایسی مسجدوں میں نماز پڑھنے سے ہماری نمازیں قبول ہوں گی؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اسی طرح آپ جس جائے نماز پر نماز ادا کرتے ہیں تو اس کے متعلق بھی پوری واقفیت حاصل کر لیجئے کہ یہ کہیں حرام پیسہ سے تو خریدی ہوئی نہیں ہے یا کہیں یہ ریشم کی تو نہیں ہے۔ اگر یہ جائے نماز حلال رزق سے خریدی گئی ہو، اس میں سادگی ہو اور ریشم کی نہ ہو تو اس پر نماز ادا کی جا سکتی ہے۔

یہاں تک اگر آپ کا معاملہ درست ہے تو اب آگے بڑھیئے۔ نماز کے لئے جو تیسری شرط ہے وہ ہے وضو۔ ایک وضو تو یہ ہے کہ آدمی ہاتھ دھوئے، کلّی کرے۔ ناک میں پانی ڈالے منھ وغیرہ دھولے۔ یہ ہے قانونی وضو۔ قانونی وضو کر لینے سے آپ کا وضو تو ہو جائے گا، کوئی یہ نہیں کہے گا کہ آپ نے وضو نہیں کیا، لیکن وضو کی جو روح ہے وہ وضو اُس سے خالی ہوگا، صرف وضو کا ڈھانچہ ہوگا۔ حقیقی وضو کیا ہے؟ حقیقی وضو یہ ہے کہ جب آپ وضو کرنے کے لئے بیٹھیں تو وضو سے پہلے یہ دعاء ضرور پڑھیں بسم اللہ العلیّ العظیم والحمدُ للہ علیٰ دین الاسلام۔ یعنی ''میں وضو کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت بزرگ اور عظمت والا ہے اور اس کا بے حد شکر ہے کہ اُس نے مجھے اسلام جیسا سچا دین عطا کیا''۔ (اگر وہ ہمیں یہ دین نہ دیتا تو ہم کہاں سے پاتے)۔

حدیث میں تکمیل وضو کے لئے وضو سے پہلے اس دعاء کو پڑھنے کی تاکید آئی ہے۔ یہ کوئی منتر تو ہے نہیں کہ صرف زبان سے پڑھ دیا اور کام ہوگیا۔ بلکہ آپ کو اس کے مفہوم کو اپنے دل میں اتارنا ہوگا۔ یعنی اللہ جو رب العٰلمین ہے جو سب سے بلند ہے، بڑا ہے اُس کے نام سے ہم وضو کر رہے ہیں یہ وضو ہم اُس مالک الملک کو خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ اس نے اپنے دربار میں حاضر ہونے کے لئے خود ہی یہ شرط رکھی ہے کہ تم جب مسجد میں آیا کرو تو پاک صاف ہو کر آیا کرو۔ لہٰذا وضو کے ذریعہ ہم جو طہارت حاصل کرتے ہیں وہ کسی اور کو دکھانے کے لئے نہیں بلکہ صرف اس لئے ہے کہ اپنے رب کے دربار میں حاضری

دینے کے قابل ہو جائیں۔

پھر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ: خُذُو ازینتکم عند کُلّ مسجد۔ ’’ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرلیا کرو‘‘۔ اس زینت سے مراد دنیاوی زینت نہیں بلکہ ویسی زینت جو اللہ پسند کرتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جب ہم میں سے کوئی کسی بڑی شخصیت کے پاس جاتا ہے تو ہر اُس چیز کا خیال رکھتا ہے جس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن جب اللہ کے دربار میں حاضر ہونے کیلیے ہم جاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ گویا ہم اس پر احسان کرنے جارہے ہیں کہ چلیں اس کے دربار میں حاضری دے کر اس کا دل بھی رکھ لیں، ویسے وہاں جانے سے کوئی فائدہ وغیرہ تو ہے نہیں، خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے، ہاں وزیر اعلیٰ یا گورنر صاحب کے یہاں جانا ہو تو ایک بات ہو۔ ہم بھلے ان الفاظ کو اپنی زبان سے نہ نکالتے ہوں لیکن ہماری حرکتیں ہو بہو انہی چیزوں کا ثبوت دیتی ہیں کہ اللہ کی حیثیت تو ان نام نہاد بڑے لوگوں سے بھی کم ہے نعوذ باللہ۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں جس طرح ہم اللہ کو نظر انداز کرتے ہیں اور خیال تک میں اسے لانا ہم پسند نہیں کرتے اسی طرح آخرت میں وہ بھی ہمیں نظر انداز کردے گا اور ہمارا نام لینا تک پسند نہیں کرے گا' کیڑے مکوڑوں کی طرح ذلیل کرکے ہمیں وہیں ڈال دے گا جہاں پہلے سے ہمارے وزیر اعظم اور گورنر صاحبان تشریف فرما ہوں گے۔ اور جس طرح یہاں ہم ان کی رفاقت پسند کرتے ہیں اللہ تعالےٰ آخرت میں بھی ہماری اس پسند کا پورا پورا خیال رکھے گا۔

بہر کیف اب ہم نے زینت اختیار کرلی' وضو بھی کرلیا اور اس قابل ہو گئے کہ اللہ رب العٰلمین کے دربار میں حاضری دے سکیں تو اب ان اصول وضوابط اور آداب کا ہمیں پورا خیال رکھنا ہوگا جو اس کے رُوبرُو ہونے کے لئے ضروری ہے۔ یعنی وضو کے مقام سے اُٹھنے کے بعد نہایت لرزتے اور کانپتے ہوئے اُس مقام کی طرف بڑھئے جہاں آپ کو نماز ادا کرنی ہے۔ وہاں پہنچ کر تکبیر کہنے سے پہلے یہ دعاء ضرور پڑھیں: انّی وجّھتُ وجھی للّذی فطر السّمٰوٰت والارض حنیفاً وّما انا من المُشرکین (میں نے یکسو ہو کر اپنے آپ کو اس ذات کی طرف متوجہ کر دیا جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔)

اب یہ بھی کوئی منتر تو ہے نہیں کہ پڑھ لیا اور ہمارا کام پورا ہو گیا بلکہ اس کے مفہوم کو بھی ہمیں اپنے دل میں اُتارنا ہوگا۔ یعنی اس وقت ہم کو اپنے اندر یہ کیفیت پیدا کرنی ہوگی کہ اب ہم ساری دنیا سے کٹ کر صرف ایک اللہ کے ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں کسی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہم نماز کے اندر ہوں یا نماز سے باہر، جب بھی ہمارے سامنے اللہ کی محبت کا سوال پیدا ہو تو ہم کو ایک حقیقی مومن کی طرح یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ اے اللہ تجھ سے زیادہ کسی چیز سے محبت کا سوال پیدا ہوگا تو تیرے مقابلہ میں کسی کی محبت نہیں ہوگی۔ نہ ماں کی، نہ باپ کی، نہ بھائی کی، نہ بہن کی' نہ بیوی کی' نہ پیر صاحب کی' نہ مرید کی' نہ کسی دوست کی۔ وہاں صرف اور صرف اللہ کی محبت ہوگی اور اسی پر توجہ ہوگی۔ وما انا من المشرکین کے الفاظ ادا کرتے وقت یہ بات اچھی طرح آپ کے ذہن نشیں رہنا چاہیئے کہ میری ان باتوں کو اللہ بھی سن رہا ہے اور میرے دل کی حالت سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہے۔ وہ خوب جان رہا ہے کہ آپ اللہ کی طرف متوجہ ہیں یا کسی مارکیٹ کی رونق میں گم ہیں، آپ کا دل اللہ سے جڑا ہوا ہے یا اپنے کاروبار سے۔ اب اگر آپ کی پوری نماز اپنے کاروبار کے بارے میں سوچتے سوچتے یا کسی مارکیٹ ہی میں گھومتے گھومتے پوری ہوگئی تو ظاہر میں وہ نماز تو ہو جائے گی، لیکن اللہ کے یہاں ایسی نماز کی کوئی قدر نہیں۔ اپنی نماز کو درست کرنے اور ان وسوسوں سے بچا کر رکھنے کیلئے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک ترکیب بتائی ہے۔ آپؐ نے کہا ہے کہ جب تم نماز ادا کرو تو اس طرح ادا کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تو ضرور سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ فرض کر لیجئے کہ جہاں آپ نماز پڑھ رہے ہیں وہیں ایک مفتی یا عالم دین بیٹھا ہے۔ اس کو اپنے قریب دیکھ کر آپ اپنی نماز کو اپنی حد تک سنوار کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ کہیں یہ شخص آپ کو کسی غلطی پر ٹوک نہ دے۔ حالاں کہ وہ بیچارہ تو صرف آپ کے ظاہر ہی کو دیکھ رہا ہے۔ دل میں آپ بازاروں کے چکر کاٹ رہے ہیں کہ اپنے کاروبار میں مشغول ہیں اس بیچارے کو اس کی کیا خبر؟ وہ تو آپ کے صرف ظاہر کو دیکھ کر کہہ دے گا کہ آپ نے نماز ادا کر دی۔ اب کسی طرح اگر یہ یقین آپ کے دل میں اُتر جائے کہ ایک ظاہر بین کے بجائے آپ کو ایک ایسی ہستی دیکھ رہی ہے جو آپ کے ظاہر و باطن حتیٰ کہ دل و دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی پوری طرح باخبر ہے تو یقیناً آپ اپنے ظاہر و باطن دونوں کو اس ہستی کے خوف سے دُرست کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس یقین کا پیدا ہو جانا کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے، اور نماز میں اپنے دل و دماغ کو ہر وقت اس یقین پر جمائے رکھنا کوئی ایک دن یا ایک مہینہ یا ایک سال میں نہیں ہو جائے گا، بلکہ اس کی مشق تو زندگی بھر آپ کو کرتے رہنی ہوگی۔ اور ثواب کا دارومدار بھی اس جدوجہد کی بنیاد پر ہے جو جتنا زیادہ جدوجہد کرے گا، جو جتنی مشق کرے گا اس کو اللہ کی اتنی ہی قربت نصیب ہوگی۔

اور اگر آپ دل کو اس بات پر جمانے میں کامیاب ہوگئے کہ آپ اللہ کو دیکھ رہے ہیں تو یہ تو بہت ہی بہتر ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا احساس کیسے پیدا ہوگا؟ آپ مجھے پہلے یہ بتائیں کہ ہم میں سے ہر ایک کے کاندھوں پر دو دو فرشتے موجود ہیں یا نہیں؟ آپ کہیں گے کہ ہاں ہیں۔ لیکن یہ یقین آپ کو کیسے حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ ہم میں سے کسی نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن ہمارا یقین ہے کہ وہ ہمارے کاندھوں پر موجود ہیں۔ اسی طرح ہمارے درمیان اللہ کے بندے ''جن'' بھی موجود رہتے ہیں۔ ویسے ہم ان میں سے کسی کو بھی اپنے سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے لیکن ہمارا یقین اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اگر کوئی آ کر ہم سے کہے کہ جن یا فرشتے کوئی چیز نہیں تو ہمارا ذہن اس کے بارے میں فوراً یہی رائے قائم کرے گا کہ یہ کوئی دہریہ ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح جب نماز میں آپ کھڑے ہوں تو آپ کو اس بات کا کامل یقین ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے سامنے ہے اور آپ اُسے دیکھ رہے ہیں تب پھر آپ کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے جس سے وہ ناراض ہوتا ہے۔

نماز میں پڑھے جانے والے اذکار کی معنویت اور اس کے اثرات کو ہم چند مثالوں سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کر لیجئے کوئی شخص ہم سے ایک ایسا کام کرانا چاہتا ہے جسے ہم اپنے کسی نقصان کی وجہ کر کرنا نہ چاہتے ہوں اور وہ ہم پر اُسے زبردستی لادنے کی کوشش کرے تو ایسی حالت میں ہم عادتاً اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے یعنی اپنے کانوں کو پکڑتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ بھئی ہمیں معاف کرو، ہم سے یہ کام نہیں ہوگا۔ اسی طرح نماز میں داخل ہوتے وقت شیطان ہمیں دنیا کا لالچ اور اُس کے نقصان کا خوف دلا کر ہمیں نماز سے روکنا چاہتا ہے تو اللہ کی طرف متوجہ ہو کر ہم یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اوپر اُٹھاتے ہیں کہ اے اللہ تو ان سب سے بڑا ہے (اللہ اکبر) جو مجھے تیری یاد سے غافل کرنا چاہتے ہیں۔ میں اُدھر جانا نہیں چاہتا اور اُس مردود کی خواہش پوری کرنے سے اپنا ہاتھ کھینچتا ہوں' لٰہذا تو مجھے بچالے اور میری نماز میں یکسوئی عطا فرما۔

اسی طرح ایک دوسری مثال سے بھی اس کے مطلب کو سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جب کوئی فوج مخالف فوج کے افسر کے سامنے ہتھیار ڈالتی ہے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر اُٹھا کر اس کا اظہار کرتی ہے کہ اب میرا معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کا جو دل چاہے کریں۔ ٹھیک اسی طرح جب ایک شخص اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر نماز میں داخل ہوتا ہے تو وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اے اللہ اب میں تیرے آگے ہتھیار ڈالتا ہوں۔ اب مجھ پر صرف تیرا حکم چلے گا۔ جس بات کا تو حکم کرے گا اسے میں کروں گا، جس سے تو روک دے گا اس سے میں رک جاؤں گا۔ کیونکہ اس کائنات میں تو ہی سب سے بڑا ہے اور بقیہ سب چھوٹے ہیں۔

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ ہم سے بڑے تو ہمارے ماں باپ بھی ہیں، ہمارے اُستاد بھی ہیں، ہمارے بڑے بھائی بہن بھی ہیں لیکن ان کی بڑائی ہم وہیں تک مانیں گے جہاں تک ماننے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے کہا ہے، اس سے آگے نہیں۔ کیونکہ اللہ کی بات کو ٹھکرا کر کسی دوسرے کی بات ماننا دراصل اس شخص کو اللہ کے مدمقابل ماننا ہے اور یہ سراسر شرک ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ بات پیوست ہو جانی چاہیے کہ اللہ ان سب سے بڑا ہے۔ اس سے بڑا تو کیا اس کے برابر بھی کوئی نہیں۔ اس لیے نماز میں یہ تکبیر بار بار ہم سے کہلوائی جاتی ہے تا کہ اس کا مفہوم پوری طرح ہمارے ذہن میں رچ بس جائے، اور جب بھی ہمارے سامنے کوئی ایسا معاملہ آئے جس کے متعلق اللہ کا حکم کچھ ہو اور غیر اللہ کا حکم کچھ اور ہو تو فوراً ہم سب کی باتوں کو ٹھکرا کر اللہ کے حکم کو سینے سے لگالیں اور اپنے قول ''اللہ اکبر'' کو عملاً ثابت کر دیں۔ یہ اسی وقت ہو گا جب ہم اسے شعوری طور پر زبان سے ادا کریں گے۔ لیکن اگر کوئی اسے غیر شعوری طور پر ایک لاکھ بار بھی اپنی زبان سے ادا کر دے تو بھی اس کی نگاہ میں اللہ چھوٹا ہی رہے گا۔ اور باقی سب بڑے رہیں گے۔ بہرکیف اس کے بعد یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے حدود کے اندر اپنے بڑوں کی بڑائی کو تسلیم کرنا اور ان کے حکم کو بجالانا بھی دراصل اللہ ہی کی بڑائی بیان کرنا ہے، اس لیے کہ اسی نے ہمیں ایسا کرنے کو کہا ہے۔

اس طرح آپ نماز میں داخل ہوتے ہیں۔ اب چونکہ آپ نے اللہ اکبر کہہ کر زبان سے اللہ کی بڑائی بیان کی ہے اور اس کے مفہوم کو بھی آپ سمجھ چکے ہیں تو اب اس کے رعب، اس کے جلال، اس کے غصّہ، اس کے عذاب یا اس کی محبت اور اس کے انعام سے اپنے دل کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کیجیے۔ دل پر یہ اثر جلدی نہیں پیدا ہو گا۔ اللہ نے ہر بندہ کو مختلف مزاج کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کسی کو سخت دل بنایا ہے تو کسی کو نرم دل۔ ظاہر ہے کہ سخت دل والے کو اللہ کی ان صفات سے اپنے دل کو متاثر کرنے میں کافی محنت کرنی پڑے گی اور اس کے برعکس نرم دل والے اپنے دل کو ان صفات الٰہی سے بآسانی متاثر کر سکتے ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ کوشش اور زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے سخت دل والے کو زیادہ اجر ملے۔ اس لیے اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس نے کس بندے کو کس مزاج کا بنایا ہے اور اس لیے وہ ان کے ساتھ معاملہ بھی اسی حساب سے کرے گا تا کہ کسی پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہ ہو۔ ہاں ہمیں خلوص کے ساتھ کوشش ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے نتیجہ میں ہم وہ اثر اپنے دل میں پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں، یہ اللہ پر چھوڑ دیجیئے۔ نماز میں یکسوئی پیدا کرنے کا ایک بہترین طریقہ یہ بھی ہے کہ جو کچھ ہم نماز میں پڑھتے ہیں اس کے مفہوم کو بھی جان لیں اور نماز کے دوران ہم اپنے دل و دماغ کو اس کے مفہوم ہی پر جمائے رکھیں۔ یہ کبھی ممکن ہی نہیں ہے کہ ہمارا ذہن بالکل خالی رہے اور کسی طرح کے خیالات بھی اس میں نہ آئیں۔ جس طرح دل کی دھڑکن پر ہمارا کوئی زور نہیں ہے، ہم چاہیں یا نہ چاہیں دل دھڑکتا ہی رہتا ہے، اسی طرح ذہن کو اچھے اور برے خیالات سے خالی رکھنا بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔ لیکن جتنا ہمارے اختیار میں ہے اتنا تو ہمیں کرنا ہی ہو گا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں لغو، دُنیوی اور برے خیالات نہ آئیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جگہ پر کوئی دوسرا خیال آئے۔ اور چونکہ ایک ذہن میں ایک ہی وقت میں دو مختلف خیال جمع نہیں ہو سکتے، تو برے خیالات سے اپنے ذہن کو بچانے کے لیے یہ لازم ہے کہ اچھے خیالات کو ہم اپنے ذہن میں جگہ دیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہمارے بیشتر اوقات جن خیالات میں گذریں گے وہی نماز کے دوران بھی آنے کی کوشش کریں گے، کیونکہ ذہن جن خیالات کا عادی ہوتا ہے اسے بڑی آسانی سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس لیے ہمیں بالآخر وہی کرنا ہو گا جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں، یعنی نماز کے علاوہ اوقات میں بھی ہمیں اپنے ذہن کو برے خیالات سے پاک رکھنا ہو گا۔

اب ہم اللہ اکبر کہتے ہوئے نماز میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد ہم ثنا یا کوئی ایک دعاء پڑھتے ہیں۔ ہم ثنا کے علاوہ مختلف

دعاؤں میں سے ایک کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ دعا یہ ہے: ”اللھمّ باعد بینی وبین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب واغسل قلبی بماء الثّلج والبرد ونقّ قلبی من الخطایا کما نُقیّت الثّوبُ الابیضُ من الدّنس“ یعنی اے اللہ تو میرے اور میرے گناہوں کے درمیان ایسی دوری پیدا کر دے جیسی تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان رکھی ہے (تا کہ میں اور گناہ کبھی بھی ایک ساتھ جمع نہ ہو سکیں) اور میرے قلب کو برف کے پانی اور اولے سے دھو دے، اور پاک کر دے میرے قلب کو گناہوں سے، جس طرح پاک کیا جاتا ہے سفید کپڑا گندگی سے۔

اس کے بعد ہم سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ دیکھیے کہ اسی سورہ کو اللہ نے نماز کی ہر رکعت میں فرض کیوں کیا ہے اور اس کے ذریعہ وہ ہمیں کون سی تعلیم دینا چاہتا ہے۔ وہ ہم سے کہلواتا ہے: الحمدُ للہ ربّ العلمین یعنی ”سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں“۔ یہاں اللہ ہماری زبان سے اپنا تعارف کروا رہا ہے۔ اسے یوں سمجھیے دنیا میں جب ہم آتے ہیں تو کچھ نہیں جانتے، نہ ہم اپنے باپ کو پہچانتے ہیں نہ ماں کو، نہ بھائی کو، نہ بہن کو، نہ کسی اور کو۔ لیکن جب ذرا ہمیں شعور ہوتا ہے تو ہمارے والدین خود ہی ہم سے اپنا تعارف کرواتے ہیں۔ وہ بھی ٹھیک اسی طرح کہ دیکھو بیٹا: ہم تمھارے ابا ہیں ہم تمھاری اماں ہیں، یہ تمھارے بڑے بھیا ہیں وغیرہ، تب جا کر ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ اب اللہ کو ہم کیسے جانیں گے۔ اسے تو ہم دیکھ بھی نہیں سکتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو یہ بتایا کہ دیکھو ہم اللہ ہیں، ہم تمھیں دکھائی نہیں دیتے مگر ہم موجود ہیں۔ اگر وہ صرف یہ بتا کر چھوڑ دیتا کہ ہم اللہ ہیں تو بھی ہم اسے ٹھیک طرح سے پہچاننے سے قاصر ہی رہتے۔ اسی لیے وہ خود ہی اپنی خصوصیات ہم سے بیان کرتا ہے کہ دیکھو میری یہ اور یہ صفات ہیں۔ چنانچہ اللہ خود فرماتا ہے کہ میں ربّ العالمین ہوں۔ یعنی ساری کائنات کا رب اور مالک اور آقا ہوں۔ باقی سب میرے غلام اور بندے ہیں چاہے وہ رسول اور انبیاء ہی کیوں نہ ہوں۔ میں نے انھیں پیدا کیا، ان کی دیکھ بھال کر رہا ہوں، ان کی ضروریات کو پورا کر رہا ہوں۔ اس کے بعد کہلواتا ہے: الرّحمٰن الرّحیم ان دونوں کے معنیٰ ہیں بہت زیادہ رحم کرنے والا۔ آپ شاید یہ جانتے ہوں گے اللہ نے اپنی بے پایاں رحمتوں میں سے بہت تھوڑا سا اس کائنات کی مخلوقات کے درمیان بانٹ دیا ہے۔ اس نے سو میں سے اپنی رحمت کا صرف ایک حصہ تقسیم کیا ہے، باقی ننانوے (۹۹) حصہ اس نے اپنے پاس رکھا ہے۔ اب اس دنیا میں جہاں بھی رحم نظر آتا ہے چاہے وہ انسان کے درمیان ہو یا حیوان اور کیڑے مکوڑوں کے اندر وہ سب کا سب اسی ایک حصہ کی وجہ سے ہے۔ اس ایک حصہ میں سب سے زیادہ رحم جس سے ہمیں نصیب ہوتا ہے وہ ہماری ماں ہے جسے ہم مامتا کہتے ہیں۔ ماں اور باپ کی محبت میں جو فرق ہے وہ یہ کہ ماں کی محبت اندھی ہوتی ہے، حتیٰ کہ آپ دیکھیں گے کہ عموماً جو بچہ نافرمان ہوتا ہے اسی سے وہ زیادہ محبت کرتی ہے اور اسی لیے بچہ شوخ ہو جاتا ہے۔ لیکن وہی ماں جب طیش میں آتی ہے تو اپنے اس بچہ کو بیخ سے جلا بھی دیتی ہے، یہ اور بات ہے کہ جلانے کے بعد پھر وہ اس کی مرہم پٹی کرے۔ ٹھیک یہی حال اس دنیا میں اللہ کے نافرمان بندوں کا ہے۔ یہاں جو اس کے نافرمان بندے کھاتے پیتے، عیش کرتے نظر آتے ہیں وہ صرف اللہ کی صفت رحمانی کی وجہ سے، ورنہ وہ ایک قطرہ پانی کے لیے بھی ترس جائیں۔ لیکن باپ کی محبت اور رحمت اندھی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے بچوں میں امتیاز کرتا ہے۔ نیک بچوں سے زیادہ محبت کرتا ہے، بدمعاش بچوں سے کم۔ اور اسے سزا بھی دیتا ہے۔ تو یہ اللہ کی شان رحیمی کا ایک بہت ہی حقیر سا حصہ ہے۔ اب جب آپ سورۂ فاتحہ پڑھیں اور الرّحمٰن الرّحیم کی آیت پر آئیں تو سوچیے کہ دیکھو ہماری ماں ہم سے کتنا پیار کرتی ہے (یا اگر کسی کی ماں نہیں ہے تو یہ سوچے کہ اگر وہ ہوتی تو ہم سے کتنا پیار کرتی) کیسے دل و جان سے وہ ہم پر نچھاور ہوتی رہتی ہے۔ صفت رحمانی کا جو حصہ ماں کو ملا ہے وہ اتنا کم ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، تو جس نے ۹۹ حصہ اپنے پاس چھپا رکھا ہے وہ کتنی محبت کرتا ہوگا ہم سے؟ کتنا پیار کرتا ہوگا؟ کتنا ہم کو چاہتا ہوگا؟

اب اس جذبہ کو خوب اُبھاریئے اور نماز میں ہی اس سے لطف اٹھائیے۔ جب اس طرح آپ سوچیں گے تو بہت ممکن ہے کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو آجائے اور آپ کے دل سے یہ آواز آنے لگے کہ بتاؤ اللہ ہم سے کتنا پیار کرتا ہے حالانکہ ہم اس لائق نہیں ہیں۔ ہم سے اس کی کتنی نافرمانی ہوتی رہتی ہے، لیکن وہ پھر بھی ہمیں صحیح سلامت رکھے ہوئے ہے حالانکہ وہ اگر چاہے تو فوراً ہمیں لنگڑا، لُولھا بنادے لیکن ہمیں ہر آفت سے بچائے رکھتا ہے، کیا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ کوئی ہم پر اتنا احسان کرے اور پھر بھی اس کے ساتھ ہم نمک حرامی کریں اور احسان فراموش بن کر رہیں؟ نہیں، ہم اتنے ذلیل نہیں ہوسکتے کہ ہمیں کھانا کھلائے اللہ، کپڑا پہنائے اللہ، چلنے پھرنے کی طاقت دے اللہ، اور ہم شکر ادا کریں کسی انسان کا؟ فرمانبرداری کریں شیطان کی؟ اور اپنے حقیقی محسن کے ساتھ نمک حرامی اور احسان فراموشی کا رویہ اختیار کریں؟۔ اسی طرح باپ کی رحمت اور محبت کو یاد کرکے اپنے دل کو متاثر کرنے کی کوشش کیجیے کہ ہمارے ابّا ہم سے کتنا پیار کرتے ہیں، ذرا سا اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں تو کتنا پریشان ہوجاتے ہیں، تو اللہ جو اصل رحیم ہے وہ کتنا خیال رکھتا ہوگا ہمارا۔

اس طرح اگر آپ ہر آیت کے مفہوم سے اپنے دل کو متاثر کرتے رہیں گے تو اتنی فرصت کہاں ملے گی کہ آپ کا ذہن اِدھر اُدھر کے لغو خیالات یا شیطانی وسوسے سے پریشان ہو۔ جو ذرا نرم دل ہوتے ہیں وہ تو اس آیت سے پوری طرح اپنے دل کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے، لیکن جو سخت دل ہوتے ہیں اور اللہ کا احسان ماننے کے لیے جلدی تیار ہی نہیں ہوتے ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ آگے فرماتا ہے: ملک یوم الدین یعنی ہم سے کہلواتا ہے کہ ہم صرف الرحمٰن الرحیم ہی نہیں ہیں بلکہ اس دن کے مالک بھی ہیں جس دن سب کو اپنے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس دنیا میں احسان فراموشی اور نمک حرامی کا جتنا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ہوسکتا ہے اختیار کرلو گردن میں جتنی اکڑ چاہو پیدا کرلو، جتنی نافرمانی کرنا ہے کرلو میرے نیک بندوں کو جتنا ستانا ہو ستالو ابھی چھوٹ ہے۔ ابھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں بھی کوئی چیز ہوں، بس ذرا اپنی موت کا وقت قریب آنے دو۔ روح نکالتے وقت اتنی تکلیف دینگے، اتنی ضرب لگائیں گے کہ تمہاری گردن کی ساری اکڑ نکل جائے گی۔ اس کے بعد پھر تم سے ہم قبر میں نمٹیں گے، اور سب سے زیادہ تمہیں بدحالی کا جو سامنا ہوگا وہ اس میدان میں جہاں سب لوگ جمع ہوں گے، جس کا نام حشر ہے۔ وہاں تمھیں ہماری قدرت واختیار کا پورا اندازہ ہو جائے گا۔ یہ کہ ہم صرف رحمٰن اور رحیم ہی نہیں ہیں قہار اور جبار بھی ہیں۔ یہ اس دن اچھی طرح سمجھا دیں گے۔ اب چاہے کوئی کتنا ہی سخت دل ہو، ابلیس تو ہے نہیں کہ ان باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر اس کے دل پر نہ ہو الا یہ کہ سب باتیں اس کے سامنے آئیں ہی نہیں جو اس آیت کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اب آپ سوچیے کہ جو شخص مسلسل اس کی مشق کرے گا اس کے اندر اللہ کی نافرمانی کا جذبہ باقی رہے گا؟

ہاں انسان ہے غلطی کر جائے گا۔ لیکن یہ گناہ وہ اس لیے نہیں کرے گا کہ وہ ڈھیٹ ہے، گناہ کے بعد وہ اکڑے گا نہیں کہ ہم نے جو کیا صحیح کیا، بلکہ فوراً نادم ہوکر رو رو کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے گا۔ وہ کہے گا کہ ایاك نعبد وایاك نستعین کہ اے اللہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم سے بھول سے ایک گناہ سرزد ہوگیا۔ اے اللہ مجھے معاف کر دے، میری مدد فرما ورنہ ہم تباہ ہوجائیں گے۔ پھر کہے گا: اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم. غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین یعنی ”اے اللہ ہمیں سیدھے راستہ پر لگا دے، ان کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے اور ان لوگوں کی راہ اختیار کرنے سے مجھے بچالے جو تیرے غضب میں پڑے اور جو تیری راہ سے گم ہوگئے“۔ اس طرح وہ اللہ کے آگے خوب روئے گا، گڑگڑائیگا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فرمادے گا کہ جا میں نے تجھے معاف کردیا۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ جب کوئی بچہ شرارت کرتا ہے اور اس کے ماں باپ اس سے روٹھ جاتے ہیں تو شریف بچہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر رو رو کر جب معافی مانگنے لگتا ہے تو کس طرح ماں اسے اپنے سینے سے لگالیتی ہے اور بچہ کی اس حرکت سے اس کی ماں کو کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح جب ایک

انسان اپنے گناہوں پر نادم ہوکر سجدے میں سر رکھ کر اللہ سے معافی مانگتا ہے تو اللہ بیحد خوش ہوتا ہے اور اگر دل سے معافی مانگ رہا ہوتا ہے اور سچی توبہ کر رہا ہو تو وہ اسے ضرور معاف کر دیتا ہے۔

جب ہم سیدھے راستے کے لیے دعا کرتے ہیں تو ہمیں جاننا چاہیے کہ وہ راستہ کیسا ہے جس کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثال اس طرح دی ہے کہ ایک بہت ہی لمبا چوڑا راستہ ہے اور بالکل ہموار ہے کہیں ذرا سا بھی اونچ نیچ نہیں ہے۔ اسی پر سب چل رہے ہیں اور اس کے دونوں طرف یعنی دائیں اور بائیں طرف بہت بڑی تعداد میں شیاطین کھڑے ہیں اور وہ ہر ایک کو آواز دے کر بلاتے رہتے ہیں کہ ادھر آؤ ادھر آؤ (یہاں تمھاری مرضی کے مطابق ساری چیزیں موجود ہیں) تو اللہ کا جو مومن بندہ ہوتا ہے وہ ادھر اُدھر دیکھتا بھی نہیں، وہ پوری یکسوئی کے ساتھ سیدھا چلتا جاتا ہے، (یہاں تک کہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے)۔ اس مثال کو ہم آپ اس طرح سوچ سکتے ہیں کہ ایک سڑک ہے بالکل سیدھی اور اس کے بالکل آخری کنارے پر اللہ عرش پر ہے۔ اسی طرف انسان کا ایک گروہ چلا جا رہا ہے، ہم بھی جا رہے ہیں۔ سب سے آگے رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کے پیچھے صحابہ کرامؓ ہیں، ان کے پیچھے اولیاء اللہ ہیں، پھر ہم لوگ ہیں۔ تو اس تصوّر کے ساتھ آپ نماز پڑھیے کہ ادھر اُدھر جو شیاطین ہمیں بلاتے ہیں ادھر نگاہ کیے بغیر بالکل سامنے نیچی نگاہ کیے ہمیں نماز پڑھتے رہنا ہے۔

جب نماز میں آپ کھڑے ہوں تو تصوّر یہ ہونا چاہیے کہ سامنے اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی لیے نمازی کے سامنے سے گزرنے کے لیے منع کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے سامنے تھوکنے کے لیے بھی منع کیا گیا ہے۔ ہاں نمازی اور اس کے آگے سے جانے والے کے بیچ میں کوئی آڑ ہو تو یہ جائز ہے، اسے دوسری طرح سے بھی سمجھیے کہ دنیا میں جب ہم اپنے سے کسی بہت بڑے مرتبہ والے آدمی کے پاس جاتے ہیں تو اپنی نگاہیں نیچی رکھتے ہیں، تو کیا یہ درست ہوگا کہ نماز کے دوران ہم اپنی نگاہیں آسمان پر یا مسجد کی چھت پر رکھیں؟ کوئی اگر اپنی نگاہ نیچی کیے ہوئے ہے تو یہ عام طور پر دو وجوہ سے ممکن ہے۔ یا تو اپنے محسن کے احسان و محبت کی وجہ سے اپنی نگاہیں نیچی کیے ہوئے ہوگا یا اس کے سامنے کوئی ایسی ہستی ہوگی جس سے وہ بہت خوف کھاتا ہوگا تو بہر حال یہ دونوں کیفیت ایک بندے پر طاری ہونی چاہیے۔

اب سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورہ یا کم از کم تین آیتیں پڑھ کر ہم رکوع میں جاتے ہیں۔ رکوع کا مطلب ہے کہ ہم نے اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیا جو میرے سامنے ہے پھر اٹھ کر کے سجدے میں جاتے ہیں۔ اس وقت یہ تصور کیجیے کہ ہم نے اپنا سر زمین پر نہیں بلکہ اللہ کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ اب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسی سجدے کی حالت میں ایک مومن اپنے معبود سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ سجدے میں جو تسبیح ہم کو سکھائی گئی ہے وہ ہے: سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلیٰ یعنی پاک ہے میرا رب سب سے بلند۔ ایک مومن جب سجدے میں جا کر "سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلیٰ" کہتا ہے تو جانتے ہیں اللہ تعالیٰ کیا جواب دیتا ہے؟ کہتا ہے: "انتم الاعلون" تم ہو سب سے بلند۔ یعنی اللہ اس مومن کو اس بات کی سند دیتا ہے کہ تمھارا مرتبہ میری نگاہ میں بہت بلند ہے اور اب تمھارے اندر میری صفت پیدا ہو گئی۔ لیکن ایک شخص جو لاشعوری طور پر نماز ادا کرتا ہے تو وہ سجدے میں جا کر بھی دُکانداری ہی میں کھویا رہتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو جس کام میں دن بھر مشغول رہتا ہے وہ سجدے کی حالت میں اسی طرح کے خیالوں میں گم رہتا ہے۔

اس حقیقت سے تو ہم سب واقف ہی ہیں کہ جس انسان کی جیسی صحبت ہوتی ہے یعنی جن لوگوں کے ساتھ اس کے زیادہ تر اوقات گذرتے ہیں انہی لوگوں کے رنگ ڈھنگ اور خوبیاں اسکے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں ایک جگہ کچھ مٹی تھی خوشبودار، تو میں نے پوچھا کہ تو کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ بھئی میں تو مٹی ہوں، حقیر مٹی، مگر کافی دنوں تک پھولوں کے ساتھ رہی تو پھول کی خوشبو میرے اندر پیدا ہو گئی، ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں۔ اسی طرح اللہ کا مومن بندہ وہ ہے جو اللہ کے قریب رہتا ہے، ہر وقت اس کی

فرمانبرداری کرتا رہتا ہے۔ جہاں بھی رہتا ہے اسے اپنے اعمال سے راضی کرتا رہتا ہے۔ اس لیے اللہ بھی اسے اپنے قریب تر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کا ہاتھ، پاؤں، کان اور زبان بن جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے، چلتا ہے، سنتا ہے اور بولتا ہے۔ تو یہ ہے وہ کھلا ہوا نسخہ جس کے ذریعہ انسان اللہ سے قریب ہوتا ہے۔ تو جو اپنا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جتنا بلند کرنا چاہتا ہے وہ اسی حساب سے اس پر عمل کرے۔

آپ خود غور کیجیے کہ کوئی شخص اگر ان تصورات کے ساتھ نماز ادا کرے تو وسوسہ کس قدر کم ہو جائے گا۔ بہرکیف جب آپ نے نماز ادا کر دی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جب نماز ادا کر چکو تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا رزق تلاش کرو'' تو اب ہم چلے اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہونے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ نماز سے فارغ ہوتے ہی انسان وہ ساری باتیں بھول جاتا ہے جو نماز میں اپنے معبود سے کرکے آتا ہے۔ اپنے گناہوں کی معافی، آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم، اللہ کا فرماں بردار بن کر رہنے کا پختہ ارادہ، وہ یہ ساری باتیں بھول کر پھر سے وہی ساری حرکتیں شروع کر دیتا ہے، جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور شیطان خوش۔ کپڑا بیچنے والا ہے تو کپڑا ناپنے میں کمی، بنیا ہے تو تولنے میں کمی، سروس کرنے والا ہے تو فرض کی ادائیگی میں کوتاہی۔ غرض ہر شخص اپنے اپنے دھندے میں بے ایمانی شروع کر دیتا ہے، لیکن اب آپ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ اب آپ نے نماز کی حقیقت کو جان لیا ہے۔

پھر بھی اگر آپ ایک طرف تو اللہ کے پاس اپنی نمازیں بھیج رہے ہیں اور دوسری طرف جھوٹ، بے ایمانی، رشوت، چوری وغیرہ بھی تو کیا ہمارے یہ گناہ اللہ کے پاس جا کر ہماری اس نماز کی بیخ کنی نہ کر دیں گے یا ہماری نماز ضائع نہ ہو جائے گی؟ اس لیے اب ہم اتنی بڑی حماقت نہیں کریں گے، بلکہ نماز کو اللہ کی رضا کے لیے ادا کرنے کے بعد اس کی حفاظت بھی کریں گے اور اپنی زندگی کے تمام کاموں میں اس بات کا خیال رکھیں گے کہ ہم سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو کہ اتنی محنت سے کی ہوئی نیکیاں برباد ہو جائیں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ یہی نماز جو اس وقت آپ کو اتنی کٹھن معلوم ہوتی ہے، کس طرح آپ کو عزیز اور پیاری ہو جائے گی اور پھر آپ دیکھیں گے نماز میں شروع شروع میں جو وسوسے آتے تھے وہ کتنے کم ہو گئے ہیں۔ یہ یاد رکھیے گا کہ وسوسہ بالکل ختم نہیں ہوگا لیکن بے حد کم ہو جائے گا۔ چنانچہ ایک واقعہ ہے جس کا تذکرہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کی نماز بے وسوسہ کی ہوتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کی بھی نماز بے وسوسہ کی نہیں ہوتی۔ حضرت علیؓ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں پڑھ سکتا ہوں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ ٹھیک ہے دو رکعت پڑھو، اگر تم نے بے وسوسے کے نماز پڑھ لی تو میں ان اونٹوں میں سے ایک تمھیں انعام میں دونگا۔ حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور دو رکعت نماز ادا کر دی۔ سلام پھیر کر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے نماز پڑھ لی اور وسوسہ نہیں آیا۔ حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ فلاں موقع پر تمھارے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ نہیں کہ دیکھیں کون سا اونٹ ہمیں انعام میں ملتا ہے، تو انھوں نے کہا کہ ہاں یا رسول ﷺ۔ اس لئے یہ ثابت ہو گیا کہ بے وسوسہ کی نماز نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وسوسہ تو آئے گا لیکن اس سے گھبرانا نہیں ہے، ہم نے کہہ ہی دیا کہ ثواب کا دارومدار اسی جدوجہد پر ہے جو آپ اپنے ذہن کو شیاطین کے حملوں سے بچانے کے لیے کرتے ہیں۔ ہمارے ذہن کی مثال تو ایک سڑک کی طرح ہے کہ جس طرح اس پر بے شمار چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں اسی طرح ہمارا ذہن بھی ہے۔ اس میں اچھے خیالات بھی آتے ہیں برے خیالات بھی آتے ہیں۔ ہم نہ ان خیالوں کو روکیں اور نہ ان سے لطف اندوز ہوں جو اللہ کو ناراض کرنے والے ہیں۔ ہاں جو نیک خیالات آتے ہیں ان سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کی مشق وہ کام ہے جو ہمیں تا زندگی کرتے رہنا ہے۔ جو شخص جس وقت اپنی اس جدوجہد میں ڈھیلا پڑتا ہے اسی وقت شیطان دھاوا بول دیتا ہے۔ شیطان ہمیشہ اسی کوشش میں رہتا ہے کہ کسی طرح ہمارے دھیان کو اللہ اور آخرت کی طرف سے ہٹا دے۔ اس لیے اپنے ذہن کو قابو میں

رکھنے کے لیے شیاطین اور اپنے نفس سے بڑی کش مکش کرنی پڑتی ہے۔ اسی کش مکش کے نتیجے میں جب نفس کمزور ہو جاتا ہے تو شیطان کی حملہ آوری بھی کم ہو جاتی ہے۔

اس جدوجہد کی ایک مثال یہ ہے کہ کچھ بزرگوں نے نماز اس طرح پڑھی گویا وہ دیکھ رہے ہوں کہ ہم پُل صراط پر ہیں ہمارے دائیں بھی جہنم ہے اور بائیں بھی، اور اسی خوف کے عالم میں کہ کہیں گر نہ جائیں اپنی پوری نماز ادا کر دیتے تھے۔ اس طرح کے احوال کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔

اسی طرح آخرت کے متعلق قرآن میں جو نقشے کھینچے گئے ہیں ان میں سے چند یا کسی ایک نقشہ پر اپنے ذہن کو ہم اگر منتقل کر دیں تو بہت حد تک وسوسہ کم ہو جائے گا۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی خیال لائیں اور ویسے بھی انسانی ذہن ایک ہی چیز سے مسلسل اور ہمیشہ یکساں اثر نہیں لیتا بلکہ کیفیت بدلتی رہتی ہے، اس لیے مختلف وقت میں مختلف کیفیتوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اسی لیے قرآن وحدیث میں مختلف احوال بیان کیے گئے ہیں تا کہ نفس ایک چیز کا عادی نہ ہو جائے اور وہ اس واقعہ سے اثر لینا ہی ترک کر دے۔ اس کے لیے لازماً ہمیں اپنا تعلق قرآن سے قائم کرنا ہوگا تا کہ وہاں سے ہمیں وقتاً فوقتاً قوت اور سہارا ملتا رہے، جو نماز کا معیار بلند کرنے کے لیے اور اپنے آپ کو دین پر قائم رکھنے کے لیے درکار ہے۔ ایک وقت کی نماز ادا کر لینے کے بعد دوسرے وقت کی نماز ادا کرنے تک جو وقت ہم گذارتے ہیں درحقیقت ہماری آزمائش اور امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقفہ میں مختلف خواہشات، مختلف جذبات ہمارے اندر سر اٹھاتے ہیں، اور ہمارا نفس اپنی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے ہمیں مجبور کرتا ہے۔ اس وقت ہمیں اپنے نفس سے اور شیاطین سے بڑی کش مکش کرنا ہے۔ ہم اگر یہ نہ جانیں کہ اپنے نفس کو کس طرح قابو میں کیا جاتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ اس وقفہ میں ہم کوئی ایسا کام کر گزریں جو اللہ کو ناراض کر دینے والا ہو اور نتیجتاً ہماری نماز غارت ہو جائے۔

اب ہم نفس کی چند خواہشات اور مطالبے اور اس کے ان حملوں سے بچنے کی ترکیب قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کریں گے۔ اور اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیاطین اور نفس کے حملہ سے بچنے کے لیے قرآن سے تعلق جوڑنا کتنا ناگزیر ہے۔

(۱) اس دنیا میں ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہم اس دنیا کے سب سے شہرت یافتہ انسان ہوتے، کاش ہم لیڈر ہوتے، آگے پیچھے لوگوں کا ایک پورا مجمع ہوتا۔ لوگ ہماری تعریف میں ایک سے ایک بات کہتے۔ ہمارے لیے جلوس نکلتا، ہمارے حق میں نعرہ لگتا، ہم جہاں جاتے سب کے سب جھک کر ہمارا استقبال کرتے، ہماری خوب خاطر تواضع ہوتی، ہمارے پاس عیش کے سارے سامان موجود ہوتے، دنیا کی جتنی لذتیں ہیں وہ سب ہم کو حاصل ہوتیں۔ یہ خواہشیں خوب زور کرتی ہیں، اور ہم سے ایسا کام کرانا چاہتی ہیں جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ اور اگر ہم ان کو دباتے ہیں تو نفس کہتا ہے کہ رہو بھکاری بن کر، ہمیشہ پیسہ کے لیے پریشان رہو گے۔ عزت کی زندگی نہیں نصیب ہوگی۔ کوئی تمھیں جانے گا بھی نہیں۔ اور سارے لطف سے محروم ہو کر رہو گے۔ میں تو تمھارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اب دیکھیے کہ اس سلسلہ میں جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کو اگر ہم تازہ کر لیں تو ہم ان خواہشوں پر بہت آسانی سے قابو پا سکتے ہیں۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ جس وقت مومن پل صراط سے گذر رہے ہوں گے اس وقت اللہ تعالیٰ اس زمین کو روٹی کی شکل میں تبدیل کر کے اُلٹ پلٹ کر رہا ہوگا جس طرح روٹی پکاتے ہیں۔ اور جب اس کے مومن بندے پل صراط کے اس پار اُتر جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے اس روٹی سے ان کی مہمان نوازی کرے گا۔ اس دنیا میں جتنی لذتیں اللہ پاک نے رکھی ہیں وہ ساری کی ساری تو آج تک نہ کسی انسان کو میسّر ہوئیں اور نہ آئندہ کبھی ہوں گی، اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ مومن بندے کے دل میں یہ ارمان رہ جائے کہ خدا جانے کون کون سی نعمتیں اور لذتیں دنیا میں اللہ تعالیٰ نے رکھی تھیں اور ہم نے چکھا بھی نہیں۔ اللہ کو یہ بھی پسند نہیں

ہے کہ اس کے مومن بندے کے دل میں ایک کسک بھی باقی رہ جائے۔ چنانچہ وہ اس روٹی کے ذریعہ ان ساری لذتوں کا مزہ اپنے مومن بندے کو چکھادے گا جو اس نے دنیا میں رکھی تھیں۔ اس مہمان نوازی کے بعد انھیں جنت کی طرف لے جایا جائیگا۔ دیکھیے کہ اس وقت کیا منظر ہوگا۔ ایک بہت ہی عظیم الشان جلوس ہوگا اور فرشتے اس کی رہبری کر رہے ہوں گے اور اس کی شان وشوکت بڑھا رہے ہوں گے۔ مومنوں کی عزت افزائی کر رہے ہوں گے۔ یہ جلوس پہنچتا ہے جنت کے قریب۔ مومن بندے کے لیے جنت کو اتنے حسین طریقہ سے سجایا گیا ہے کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت مومن بندے کی خوشی کا کیا ٹھکانہ، وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہے ہوں گے۔ وہ جب جنت کے گیٹ کی سجاوٹ کو دیکھیں گے تو اور بھی خوش ہوں گے۔ پھر جیسے ہی وہ گیٹ کے قریب پہنچتے ہیں جنت کے جو ذمہ دار فرشتے ہیں وہ ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں السلام علیکم۔

آپ غور کیجیے کہ کہاں یہ استقبال جس میں کوئی غرض، کوئی مقصد نہیں، جس میں صرف خلوص ہی خلوص اور پیار ہی پیار ہے، اور کہاں وہ استقبال کہ ہاتھ میں پھول کی مالا ہے لیکن دل میں نفرت، جہاں صرف وہی لوگ آپ کا استقبال کرتے ہیں جن کو آپ سے کچھ غرض ہوتی ہے، اور آپ کے سامنے بھلے ہی کچھ زبان سے نہ نکالیں لیکن آپ کے پیٹھ پیچھے تو سوائے گالی کے اور کچھ نہیں ملتی۔ اب کیا یہ باتیں جان جانے کے بعد بھی کوئی ہوش مند یہاں کی شہرت کی تمنا کرے گا؟ اب آگے دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے۔ جب مومن بندے جنت کے دروازے پر پہنچیں گے تو دیکھیں گے کہ رسول اللہ ﷺ پہلے ہی سے وہاں اپنی امت کے استقبال کے لیے موجود ہیں۔ وہ اپنے معاونوں کے ساتھ مومنوں کو لے کر جنت کے اندر داخل ہوجائیں گے۔ آخرت میں رسول اللہ ﷺ کا جو مقام ہوگا وہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سب سے اونچا مقام ہوگا، لہذا ہماری بھی دلی تمنا یہ ہونی چاہیے کہ استقبال کرنے والوں میں ہم بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوں۔ اب اس مقام کے لیے اللہ سے تڑپ تڑپ کر رو رو کر دعائیں مانگیے۔ اللہ ہم لوگوں کو آخرت میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت نصیب کرے۔ ان باتوں کو ذہن میں لانے کے بعد یہ دنیا کی شہرت اور استقبال کے لیے گھٹیا قسم کی سجاوٹ، یہ پنڈال وغیرہ اس کی کوئی حقیقت رہ جائے گی آپ کی نگاہ میں؟ یہ تو نہایت حقیر اور گھٹیا چیز ہے جس کے پیچھے لوگ جان دیتے ہیں۔

(۲) ہمارا دل چاہتا ہے ہماری بڑی بڑی کوٹھی ہو، اس میں موزیک وغیرہ ہو اور ہمارے گھر میں ہر وہ چیز موجود ہو جس کی خواہش ایک آدمی کو ہوتی ہے۔ لوگ ہماری تعریفیں کریں۔ ہمارے پاس بے حساب پیسہ ہو، تاکہ ہم جو چاہیں خرید لیں۔ سوچیے کہ اول تو یہ چیزیں دنیا ہی میں آپ کا جینا دوبھر کردیں گی۔ دن رات آپ خطرے میں گھرے رہیں گے۔ لوگ آپ کے مال پر قابض ہونے کی کوشش کریں گے۔ اور کچھ ہو چاہے نہ ہو موت کا کیا ٹھکانا، کسی وقت بھی آکر آپ کو ان نعمتوں سے دور کردے گی۔ لہذا سوچنا یہ چاہیے کہ ہم ان چیزوں کے پیچھے کیوں مریں۔ بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنے کے بعد ملتی بھی ہیں تو ہمیشہ چھین جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ اور ایک دن ایسا آنا ہی ہے کہ وہ ساری نعمتیں ہم سے چھین لی جائیں گی۔ ہمیں تو کوشش ان نعمتوں کے حصول کی کرنی چاہیے جو ایک دفعہ مل جائے تو نہ وہ ہم سے چھینی جائے اور نہ ہم سے الگ کی جائے۔ ہم یہاں معمولی موزیک وغیرہ کے پیچھے مرتے ہیں جب کہ وہاں حال یہ ہوگا کہ جو سب سے نیچے درجہ کی جنت ہے جنت الماویٰ، اس کی جو چہار دیواری ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کی ایک اینٹ سونے کی ہے تو ایک چاندی کی۔ ہماری یہاں خواہش ہوتی ہے کہ جب سیر وتفریح کے لیے نکلیں تو خوب بڑے بڑے ہوٹل میں ٹھہریں۔ وہاں جب لوگ سیر وتفریح کے لیے نکلیں گے اور کہیں کیمپ کریں گے تو وہ پورا کیمپ ایک عدد موتی سے بنا ہوا ہوگا وہ موتی کا خیمہ اتنا بڑا ہوگا کہ اس کے اندر وہ ساری چیزیں موجود ہوں گی جن کی خواہش انسان کو ہوتی ہے۔ وہاں چاندی سے بنے شیشے کے گلاس میں آپ کو شربت یا شراب پلائی جائے گی۔ یہاں کے سونے یا چاندی کے گلاس اور سڑی ہوئی شراب کا اس سے کیا مقابلہ؟

ہم اپنی تعریف دنیا والوں سے کرانے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ جب مجھ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں۔ جب وہ مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اس کا ذکر ان سے بہتر لوگوں یعنی فرشتوں کے درمیان کرتا ہوں۔ آپ غور کیجیے وہ شخص کتنے بلند مرتبہ پر فائز ہوگا جس کا ذکر اللہ اپنے فرشتوں کے درمیان کرتا ہے۔ تو کیا ہمارے اندر اب بھی یہ خواہش باقی رہے گی کہ ان دو ٹکوں میں بکنے والے لوگوں کے منہ سے اپنی تعریف سنیں؟

اللہ پاک فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے اور اس طرح یاد کرتا ہے کہ میں اس سے خوش ہو جاتا ہوں تب میں اپنے مقرب فرشتوں سے کہتا ہوں کہ فرشتو! دیکھو میں فلاں شخص سے خوش ہوں، اور اس سے محبت کرتا ہوں، لہٰذا تم بھی اس سے خوش ہو جاؤ اور اس سے محبت کرو۔ اور پھر یہ فرشتے اپنے ماتحتوں سے کہتے ہیں، اور اس طرح اللہ کا یہ حکم زمین کے فرشتوں تک پہنچ جاتا ہے اور یہ سب اس مومن بندے سے خوش ہو جاتے ہیں اور اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے کہ یہ محبت اچھی ہے یا وہ، جس کی عمر کچھ گھنٹوں یا چند دنوں سے زیادہ نہیں ہوتی اور وہ بھی حقیقی محبت نہیں ہوتی۔ جب کہ اللہ کی محبت تو بالکل حقیقی ہے۔

یہ تو چند باتیں تھیں، آگے جب آپ قرآن کا خود مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ دنیا کی کوئی بھی شئے ایسی نہیں ہے جس سے یہاں دل لگایا جائے بلکہ ہر نعمت فانی ہے اور ہر چیز جو ہمارے پاس آتی ہے وہ فانی ہے لیکن اللہ کے پاس جو کچھ ہے ان میں سے ایک بھی فانی نہیں۔ ایک دفعہ اگر کوئی جنت میں پہنچ گیا تو نہ اس کی نعمت میں کمی کی جائے گی نہ یہ ان نعمتوں سے الگ کیا جائے گا۔ وہاں ہر چیز حسین ہوگی، وہ چاہے خود اہل جنت ہوں یا انکی ازواج مطہرات یا دوسری نعمتیں، ہر ایک چیز کے حسن میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا کمی ہرگز نہیں ہوگی۔

اگر ہم نماز سے باہر کی زندگی میں اپنا رویہ ایسا ہی اختیار کریں تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کا معاشرہ کیسا بن جائیگا۔ کیا کوئی کسی کا استحصال کرے گا؟ کوئی کسی کو دھوکا دے گا؟ کوئی کسی کی حق تلفی کرے گا؟ کیا کوئی کسی کی برائی بیان کرے گا؟ ظاہر ہے کہ سب یہ سوچ کر رک جائیں گے کہ ہم ان بُرائیوں کے ذریعہ اتنی محنت سے حاصل کی گئی نیکیوں کو برباد کیوں کریں؟ یہی معاشرہ رسول اللہ ﷺ نے بنایا تھا۔ اور اسی معاشرہ کا یہ کرشمہ تھا کہ اسلام دیکھتے دیکھتے دنیا میں پھیل گیا۔ آج بھی اسی معاشرہ کو وجود میں اگر لانا ہے تو یہ اسی وقت وجود میں آئے گا جب حقیقی نمازیوں کی تعداد اچھی خاصی ہو جائے گی۔ ویسے نماز پڑھنے والوں یعنی مصلّیوں کی تعداد تو اس وقت اتنی ہے کہ اتنی پہلے کبھی نہیں تھی، لیکن نماز قائم کرنے والوں کی تعداد اور ویسے نمازیوں کی تعداد جن کا ذکر اس کتابچہ میں ہوا ہے، بہت کم ہے، اور جو ہیں وہ بھی منتشر ہیں۔ لہٰذا ہمارا کام یہی ہے کہ ہم ایسے افراد تیار کریں۔ ایسے افراد آئیں گے کہاں سے؟ یہی نماز وہ شئے ہے جو ہمیں اور آپ کو ایسے افراد فراہم کرے گی۔ جب ایسے افراد کی اچھی خاصی تعداد ہو جائے گی تب جا کر دنیا میں اسلامی انقلاب برپا ہوگا۔ تو ہمیں کوشش کرنی ہے کہ ہم نماز سے وہ فائدہ حاصل کریں جس کے لیے یہ ہم پر فرض کی گئی ہے، اور اس فائدہ کے نتیجہ میں ہم کو اللہ تعالیٰ کے یہاں کامیابی و کامرانی نصیب ہو اور دنیا میں ہمارے ذریعہ سے اسلام برسر اقتدار آ جائے۔ آمین

☆☆☆

نظام التعليم

اسلامی نظام تعلیم

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ

یہ مضمون جو پہلے ماہنامہ 'زندگی' میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ کی نظر ثانی کے بعد نئی ترتیب سے اس مجلّہ میں شائع کیا جارہا ہے

اپنی آئندہ نسلوں کو تعلیم دینے کا سلسلہ تو ہر زمانہ میں جاری رہا ہے مگر حقیقی اور موثر تعلیم کا اہتمام بہت کم کیا گیا ہے۔ ہر زمانہ کا رائج الوقت نظام تعلیم عموماً ان کو جو علم فراہم کرتا رہا ہے وہ ان کے حق میں زیور کی طرح وجہ آرائش وزیبائش تو ہوتا ہے مگر ان کے لئے ذریعۂ قوت ثابت نہیں ہوتا ہے۔ وہ ان کے اندر اقدامی صلاحیت کے بجائے پسپائی کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ نت نئے مسائل کا سامنا کرنے کے بجائے ان سے گریز اور کنارہ کشی کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ زمانہ کو اپنے رخ پر بہانے کے بجائے زمانہ کے رخ پر بہہ جانا سکھاتا ہے۔ کشمکش حیات میں ابھرنے والی متحرک قوت بننے کے بجائے پسماندگی اور پامالی میں مگن رہنا سکھاتا ہے۔ دوسروں کی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے بجائے دوسروں کے ہاتھوں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا جانا سکھاتا ہے۔ وہ انھیں ماضی کا انسان تو بناتا ہے لیکن مستقبل کا انسان نہیں بناتا۔

اگر دنیا میں ہمیشہ صرف یہی نظام تعلیم ہوتا تو زمانہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہی کھسکتا یا زیادہ سے زیادہ ایک ہی حال اور ڈگر پر قائم و دائم رہتا۔ انسانی نسل بھی جانوروں کی طرح علم اور تجربات اور ان کے ثمرات کے سلسلے میں کوئی ارتقاء نہیں کرتی مگر خدا کی مشیت سے ہوتا یہ رہا ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے اونچے انسان پیدا ہوتے رہے جنھوں نے یا تو تعلیم کے بغیر ہی یا اس کے ساتھ فطرت کا آزادانہ مطالعہ کیا اور اپنے زمانے سے آگے نکل گئے اور پچھلے نظام تعلیم سے چمٹے رہنے والے پسماندہ رہ گئے۔ انہوں نے جو تعلیم دی اس نے کچھ دنوں علمی میدان میں انسانی نسلوں کو آگے بڑھانے کا کام کیا، اس طرح جب زمانہ آگے بڑھتا ہے اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں تو ہر پرانی تعلیم کچھ دنوں کے بعد تشنہ اور بالآخر فرسودہ (out dated) ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف عوام الناس کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ ہر معاملہ کی طرح تعلیم کے سلسلہ میں بھی پرانی ڈگر، پٹی پٹائی راہ پر ہی چلنا چاہتی ہے اور ان کے خودغرض اور مفاد پرست قائدین بھی ان کا استحصال کرتے رہنے کے لئے ان کو پسماندہ بنائے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا پورا زور اس پر رہتا ہے کہ لوگ فرسودہ نظام تعلیم ہی سے چمٹے رہیں تا کہ نئے مسائل کا شعور اور خود شناسی ان کے اندر پیدا نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ ہر رائج الوقت نظام تعلیم میں یہ خرابی، یہ نقص اور یہ کوتاہی کیوں ہوتی ہے؟ جو بھی نظام تعلیم وضع کیا جاتا ہے اور جو نصاب تعلیم بھی مدون ہوتا ہے اس کی اساس ماضی کے تجربوں اور حال کے مشاہدوں پر ہی ہوتی ہے۔ جب اس سے استفادہ کرنے والی نسل زندگی کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی عمر کو پہنچتی ہے تو اس وقت تک زمانہ کئی قدم آگے بڑھ چکا ہوتا ہے اور نئے مسائل، نئی پیچیدگیوں کے ساتھ اپنے حل کا مطالبہ لے کر سامنے آجاتے ہیں جن سے ان کے اسلاف کو سابقہ نہیں پڑا تھا اور جس کا اسے بھی نہ تو کچھ اندازہ تھا اور نہ علم۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نسل وقت کے چیلنج کا جواب نہیں دے پاتی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اسی پرانے نظام کو مقدس بھی سمجھتی ہے اور خواہ مخواہ کے تقدس کی وجہ سے وہ اس سے چمٹی رہنا چاہتی ہے، یہاں تک کہ کئی نسلوں کے بعد جب انتہائی پس ماندہ ہو جاتی ہے اور دھیرے دھیرے اس نظام کا تقدس ختم یا کم ہو جاتا ہے اور نئے حالات اسے مغلوب کر لیتے ہیں تب کہیں جا کر وہ

مرعوبیت میں اپنے وقت کے نظام کو قبول اس وقت کرتی ہے جب خود وہ بھی فرسودہ ہونے لگتا ہے۔

گزرتے ہوئے دنوں میں تمدن بہت ہی آہستہ خرام تھا۔ حالات طویل مدت تک تقریباً یکساں رہتے تھے۔ احوال و ظروف میں تبدیلی اور کوائف و مسائل میں پیچیدگی چھلانگیں لگاتی ہوئی نہیں آتی تھی، لیکن مستقبل میں صورت حال ایسی ہرگز نہیں رہے گی۔ تمدن سینکڑوں سال کی مسافت دنوں میں طے کرتا جائے گا۔ ہر آنے والا دن ناخن گرہ کشا کے لئے نئی گتھیاں اپنے ساتھ لایا کرے گا۔ ایسے برق رفتار اور فوق البرق رفتار زمانوں میں پرانے طرز پر ماضی کے انسان تیار کرنے والی تعلیم ہماری نسلوں کو اپنی سابق نسل کی جانشینی کا اہل نہ بنا سکے گی۔ اس کے لئے تو اب ناگزیر ہو جائے گا کہ ان کو ایسی تعلیم دی جائے جو انہیں حال کا نہیں مستقبل کا انسان بنائے۔ لیکن مستقبل کا انسان بنانے کے لئے مستقبل کا علم ہونا لازمی شرط ہے، اور مستقبل غیب کے پردے میں چھپا ہوا ہے جس میں دور تک تو کیا نزدیک بھی یقین کی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایسی صورت میں محض قیاس اور گمان ہی سے کام لیا جا سکتا ہے جو یا تو سراسر غلط ہو سکتا ہے یا کچھ صحیح اور کچھ غلط کا مجموعہ۔

عام انسانوں کے بارے میں تو گرچہ یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن ہم مسلمانوں کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے۔ ہم کو عالم الغیب خالق کائنات کی طرف سے مکمل دین اور دائم و قائم شریعت ملی ہوئی ہے۔ تمدن کتنا ہی ترقی کر جائے، زندگی کتنی ہی وسیع و عریض ہو جائے، مسائل کتنے ہی محیر العقول سامنے آئیں، سب کے لئے اس میں دائمی و کافی ہدایت موجود ہے۔ کسی بھی دور میں مومنین صالحین ہدایت و رہنمائی کے لئے اسلام کے سوا کسی دوسرے سرچشمہ کے نہ صرف یہ کہ محتاج نہیں ہوں گے بلکہ پوری نسل انسانی کو اسلام کے سوا کہیں اور سے صحیح رہنمائی نہ مل سکے گی۔ لیکن آج مسلمانوں نے زندگی کے دیگر امور کی طرح تعلیم کے امور میں بھی قرآن اور اللہ کے رسول ﷺ سے رہنمائی حاصل کرنا چھوڑ دیا جب کہ یہ ہر نسل کو اتنا پیش بین یقیناً بنا سکتا ہے کہ وہ اپنے بعد کی نسل کے لئے بالکل مناسب نظام تعلیم وضع کر سکے۔ یہاں میری کوشش ہوگی کہ اس پہلو پر ابتدائی روشنی ڈالوں، بنیادی خاکہ پیش کر دوں تا کہ اصحاب علم و تجربہ اس کو مکمل شکل دے سکیں۔

سب سے پہلے یہ بات طے کر لینے کی ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں تعلیم کا سب سے گھٹیا مقصد حصول ملازمت ہے اور سب سے اعلیٰ مقصد خلافت ارضی اور امامت اقوام کی اہلیت پیدا کرنا ہے۔ ان دونوں کے درمیان بہت سارے مقاصد ہو سکتے ہیں جنہیں دنیا کی مختلف قومیں اور ملتیں اپنے اپنے نظریئے اور حوصلے کے مطابق اپناتی ہیں۔ چونکہ خلافت ارضی انسان کی خمیر میں ہے اور امامت اقوام اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی ہے، اس لئے حوصلہ مند لوگ اپنی نسلوں کی تعلیم میں اس کا لحاظ ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن ہدایت الٰہی کی اساس کے بغیر تعلیم انھیں جیسا انسان بناتی ہے وہ دنیا کو جنت ارضی تو بنا نہیں سکتے البتہ جہنم زار بنا دیتے ہیں۔ بہر حال امامت کے لئے قوموں کے درمیان مسابقت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور امامت صالحہ جن کو حاصل ہوتی ہے اگر وہ فرسودہ (out dated) تعلیم کی وجہ سے زمانے کے چیلنج کا جواب دینے کے اہل نہیں رہتے تو جو لوگ جواب دینے کے لئے خواہ ان کا جواب غلط ہی ہو میدان میں اتر جاتے ہیں، وہ تاریخ کی سطح پر ابھر آتے ہیں اور ائمہ ضلال بن کر دنیا پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ کے پاس جوابدہی سے بچنے اور نسلاً بعد نسلٍ امت مسلمہ کو صالح امامت کے منصب پر برقرار رکھنے کے لئے اس کو ایسی تعلیم دینا ضروری ہے جو انتہائی تیزی سے بدلتی چلی جانے والی دنیا کے ہر نئے چیلنج کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہنے کے لئے تیار کرے۔ اگر علمی برتری حاصل نہ ہونے کے سبب مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ ہو تو سیاسی طور پر غالب قوم کو اپنی مغلوب کردہ قوم سے اصول زندگی اپنانا پڑتا ہے، اور فاتح قوم کو مفتوح قوم کا دین فتح کر ڈالتا ہے، جیسا کہ تاتاریوں کے ساتھ

ہوا۔ یقیناً صحابہؓ کرام کو بھی چار و نا چار فاتح ہونے کے بعد قیصر و کسریٰ کا دین قبول کرنے پر مجبور ہو جانا پڑتا اگر رسول ﷺ کتاب و سنت کی ایسی تعلیم و تربیت نہ دے جاتے جو بادیہ نشینی کی انتہائی سادہ زندگی گزارنے کے بعد آئندہ پیش آنے والے پیچ در پیچ مسائل کو اپنے دینی مزاج کے مطابق حل کرنے کی صلاحیت ان کے اندر پیدا کرنے کی ضامن تھی۔

آئندہ آنے والی نسلوں کی تعلیم کے اصول و طریقے میں کتاب و سنت سے رہنمائی حاصل کرنے کا سلسلہ کمزور پڑتا گیا، یہاں تک کہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں قرآن و حدیث کی تعلیم محض تبرک کے طور پر باقی رہ گئی اور بجائے اس کے کہ قرآن و حدیث پر خالی الذہن ہو کر فکر و تدبر کر کے ان کی ہدایت کے مطابق فلسفہ پیش کئے جاتے اور نظریے قائم کیے جاتے، فلسفے اور نظریے اغیار سے لے کر ان کی تائید کے لئے قرآن و حدیث کو استعمال کیا جانے لگا۔ یہاں میں اس کی ایک مثال دوں کہ آیات قرآنی میں پیش کئے گئے حقائق پر غور کرنے اور نہ کرنے کے سبب انسان کی علمی صلاحیت میں کتنا بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میرے استاد محترم نے اس دور میں بھی مجھ سے یہ کہا تھا کہ زمین کو قرار ہے اور آسمان گردش کرتا ہے جب کہ گلوب بھی وہ سامنے رکھے ہوئے تھے تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ نہیں مولانا! بلکہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے اور آسمان اضافی لحاظ سے ساکن ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہت ذہین تھے، انہوں نے فوراً فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو اور سورہ نمل کی آیت پڑھی اور فرمایا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ زمین گیند کی طرح گول ہے، وہ اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ مذکورہ آیت یہ تھی وترى الجبال تحسبها جامدة و هي تمر مرا لسحاب (النمل:۸۸)

اب ہم ایک اجمالی نظر اس پر ڈالیں کہ متذکرہ غرض کے لئے تعلیم اور طرز تعلیم سے متعلق قرآن سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔ انسانی تاریخ کو میں دو دور میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلا دور محض خلافت ارضی کا اور دوسرا دور خلافت ارضی کے ساتھ امامت اقوام کا۔ دوسرے دور کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتا ہے جبکہ پہلا دور حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ آیا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کوئی کتاب یا صحیفہ نازل ہوا تھا یا نہیں۔ میرے نزدیک قرآن کا یہ انداز بیان کہ وہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے کسی صحیفہ کا تذکرہ نہیں کرتا ہے اور آں جناب کے بعد صحیفوں اور کتابوں کا ذکر کرتا ہے بجائے خود معنی خیز ہے۔ اس میں ہمیں تعلیم دینے کے دو طریقوں کا اشارہ ملتا ہے۔ ایک طریقہ بغیر قلم اور کتاب کے اور دوسرا طریقہ بذریعہ قلم اور کتاب۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تاریخ پیغمبری میں حضرت ابراہیمؑ وہ پہلے پیغمبر ہیں جنہوں نے عقلی استدلال سے کام لیا اور مخالفوں سے برہان کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ آں حضرت ﷺ ہی پہلے پیغمبر ہیں جن کے لئے فتیٰ (جوان) کا لفظ استعمال کیا گیا۔ ان سب باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم اللہ تعالیٰ کے طریقۂ تعلیم پر غور کریں تو ہمیں صاف صاف اشارات مل جائیں گے کہ اپنی نسلوں کی تعلیم کس عمر سے شروع کریں اور کس مرحلۂ عمر میں کیا طریقۂ تعلیم اختیار کریں۔ یہاں پر میں صرف اشارات ہی کروں گا۔

تعلیم سے متعلق چند قرآنی اشارات

(۱) علم آدم الاسماء کلها (البقرہ:۳۱) سکھایا آدم کو سارے نام

(۲) الرحمن۔ علم القرآن۔ خلق الانسان۔ علمه البیان۔ الشمس و القمر بحسبان۔
(الرحمن: ۱ تا ۵)
رحمٰن نے سکھایا قرآن، پیدا کیا انسان کو، سکھایا اس کو بولنا، سورج اور چاند گردش میں ہیں۔

(۳) الذی علم با لقلم۔ علم الانسان ما لم یعلم (العلق :۴،۵)
جس نے سکھایا قلم سے، سکھایا انسان کو جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا۔

(۴) علمه شدید القویٰ۔ذو مرة فاستویٰ۔ وھو بالافق الاعلیٰ۔ ثم دنا فتدلی۔ فکان قاب قوسین او ادنی۔ فاوحی الی عبده ما اوحی۔ (النجم :۵تا۹)
سکھایا اس کو سخت قوت والوں نے، زورآور نے پھر سیدھا بڑھایا، اور وہ اونچے کنارے پر تھا، پھر نزدیک ہوا، پھر اتر کر آیا، پس رہ گیا دو کمان کے برابر کا اس سے بھی نزدیک، پھر حکم بھیجا اپنے بندے پر جو بھیجا۔

(۵) فتلقی اٰدم من ربه کلمات فتاب علیه (البقرہ :۳۷)
سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے چند کلمات پھر متوجہ ہوا اس پر۔

(۶) یتلوا علیھم ایاته و یزکیھم و یعلمھم الکتاب و الحکمة (آل عمران :۱۶۴)
پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں، اور پاک کرتا وہ ان کو، اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت۔

(۷) احصی کل شیء عددا (الجن :۲۸) کر لی ہے ہر چیز کی گنتی۔

(۸) کل شیء عنده بمقدار (الرعد :۸) ہر چیز اس کے پاس خاص مقدار میں ہے۔

(۹) ن و القلم وما یسطرون۔ ما انت بنعمة ربک بمجنون۔ و ان لک لأجرا غیر ممنون۔ و انک لعلی خلق عظیم۔ (القلم :۱تا۴)
قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں، تو نہیں اپنے رب کے فضل سے دیوانہ، اور بیشک تیرے واسطے بدلہ ہے بے انتہا، اور بے شک تو بڑے خلق پر ہے۔

ان آیات سے مندرجہ ذیل اشارات ملتے ہیں:

(۱) رضاعت کی عمر کو تعلیم کے پہلو سے ضائع نہ کرنا چاہئے بلکہ اس مرحلہ میں بچے کو مسمّی اور ان کے اسماء کا علم حاصل کرا دینا چاہئے۔

(۲) جب بچے کے اندر سچ اور جھوٹ صحیح اور غلط میں امتیاز کی استعداد پیدا ہو جائے تو اسی وقت سے بچے میں درج ذیل باتوں کو پیدا کرنے کے لئے اس کی مشق کرائی جائے۔ (الف) صحیح اور جھوٹ کی پہچان۔ (ب) غلط کے مقابلے میں صحیح کے انتخاب کی عادت۔ (ج) اعلیٰ نمونہ کے مطابق کام کرنے کا سلیقہ۔ (د) مختلف امور کی انجام دہی میں ظاہری ضابطہ (Form) کی پابندی کی اہمیت کا شعور۔ (ہ) نظم وضبط یعنی (Discipline) کی پابندی۔

(۳) بیان واظہار مافی الضمیر کے لئے قرآنی اسلوب وطرز استدلال کے ساتھ ساتھ اعلیٰ قسم کے علم الاعداد وعلم الاوزان وعلم الاقدار کی تعلیم اسے دی جانی چاہئے۔

(۴) قلم کے ذریعہ اسے وہ تعلیم دی جائے جو ان کے دماغ کو غیر متوازن sub-normal یا Ab-normal ہونے سے محفوظ رکھے۔ اور خلق عظیم پر فائز کر کے اسے پائدار نیکی کا سرچشمہ بنا دے، جن کا اجر کبھی ختم ہونے والا نہ ہو۔

(۵) جب وہ سن رشد کو پہنچ جائے تو آفاق وانفس میں پائی جانے والی اللہ کی نشانیوں سے صحیح نتائج اخذ کرنا اسے سکھایا جائے اور اسی کو اس کے تزکیہ کا ذریعہ بنایا جائے۔ پھر خلافت وامامت کے فرائض اسے بتائے جائیں اور اس کے اندر ابھری ہوئی، حکمتوں کو سمجھنے کی، صلاحیت اس کے اندر پیدا کی جائے۔ یہ سارے مقاصد حاصل کرنے کے لئے ایسے اساتذہ کی تیاری

لازمی شرط ہے جو درج ذیل صفات کے حامل ہوں۔(الف) پیشہ ور نہ ہوں۔(ب) اخلاق کریمانہ سے متصف ہوں۔ (ج) رعب اور وقار کے اعلیٰ افق پر فائز ہوں۔(د) تعلیم اور متعلمین پر ان کو دستگاہ (command) حاصل ہو۔(ہ) تلامذہ کی ذہنی سطح تک اتر کر، ان سے انتہائی قریب ہو کر اور ان کو خود سے مانوس کر کے ان کے دلوں میں مطلوبہ علم کو اتار سکیں۔

لازمی تعلیم

اب میں ہر انسان کے لئے لازمی تعلیم کا ایک سرسری خاکہ پیش کروں گا۔اس کا ایک آخری معیار طے ہو گا وہ یہ کہ:

(۱) زبان کی حد تک وہ خود کفیل ہو تا کہ اظہار مافی الضمیر پر پوری طرح قادر ہو اور جس قسم کی اختیاری تعلیم وہ حاصل کرنا چاہے اس سے متعلق کتابوں کو سمجھنے کی استعداد اس کے اندر پیدا ہو جائے۔زبان کی تعلیم کے سلسلہ میں لازمی ہے کہ ہر بچہ اپنی مادری زبان کے علاوہ قرآنی زبان (بین الاقوامی زبان اور ملکی زبان) سیکھے اور ہو سکتا ہے کہ ایک زبان ہی ان میں سے تمام حیثیتوں کی مالک ہو۔یہ سلسلہ شیر خواری کی عمر ہی سے شروع ہو جانا چاہئے جبکہ بچہ چسنی چوستا اور کھلونے سے کھیلتا ہے۔حسین رنگا رنگ لکڑی یا پلاسٹک یا کسی اور چیز کی بنی ہوئی چسنیاں اور کھلونے جو دراصل حرف تہجی ہوں اسے دئے جائیں اور بولنے لگے تو اس سے طلب کرائی جائیں تا آنکہ آئندہ وہ مفرد اور معرب حروف کو خوب پہچان جائے، پھر ان کے مرکبات دئے جائیں پھر مانوس اور غیر مانوس ضروری چیزوں کی شناخت، ان کے نام، ان کے موٹے موٹے خواص سے اسے روشناس کرا دیا جائے قبل اس کے کہ وہ مہد زمین پر اترے۔

(۲) حساب میں تناسب (Ratio) تک کی تعلیم ضروری ہے۔

(۳) جغرافیہ میں وقت کے تمدن کی مناسبت سے جتنا ضروری ہو۔

(۴) تواریخ میں اسلام کی تاریخ حضرت آدمؑ سے اپنے وقت تک کی، اپنے ملک کی تاریخ اور دنیا کی تواریخ ضروری حد تک۔

(۵) بچے کے پیدائشی ذوق کے مطابق کوئی ضروری فن و حرفہ جس سے وہ آئندہ زندگی میں کسب معاش کر سکے۔

(۶) علمی نہیں بلکہ عملی طور پر تجارت کی معلومات۔

(i) انفرادی تجارت (ii) اجتماعی تجارت (iii) خوردہ فروشی (iv) تھوک فروشی (v) حساب و کتاب (vi) بینک سے معاملات (vii) ٹرانسپورٹ کے تجربات (viii) درآمد و برآمد (ix) غیر ملکی زر مبادلہ وغیرہ۔اس کے لئے ہر یونیورسٹی ایک ملک تصور کر لی جائے۔ہر یونیورسٹی کی اپنی علیحدہ کاغذی کرنسی ہو جو صرف یونیورسٹی کی حدود میں جاری ہو سکتی ہو۔اس کرنسی کی قیمت کے برابر بہر حال ملکی کرنسی میں روپے جمع رہنے چاہئیں۔مختلف یونیورسٹی کی کرنسی مختلف Value کی ہونی چاہئے۔اور اس طرح بین الیونیورسٹی Inter-University تجارت کے ذریعہ درآمد و برآمد وغیرہ کے ہر پہلو کے عملی تجربات کرا دئے جائیں، نیز فورن اکسچینج کی اہمیت اور معاشی اور سیاسی زندگی پر اس کے اثرات کا ہلکا سا تجربہ کرا دیا جائے۔

(۷) سیاسیات کی تعلیم میں علمی طور پر ہر اسلامی اور غیر اسلامی سیاست کا فرق واضح کرایا جائے۔اور عملی لحاظ سے مذہبی اور سیاسی معاملات میں اختلافات کے حدود اور ان کو انگیز کرنے کی عادت و مشق کرائی جائے۔انتخاب میں اسلامی اور غیر اسلامی طریقوں کا فرق بتایا جائے اور اسلامی طریقوں کی عملی مشق کرائی جائے تا کہ یہ لڑکے کل جب شہری زندگی میں داخل ہوں تو انتخاب کی راہ سے باطل ان کے اندر نہ گھس سکے۔

قرآن کی تعلیم

یہ دراصل سب علموں کی اساس ہے، اس لئے اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کروں گا۔

(۱) طالب علم کو مشق کرائی جائے کہ جس طرح وہ ہر دوسری کتاب کو مفہوم سمجھتے ہوئے پڑھتا ہے اسی طرح قرآن کو بھی پڑھا کرے نہ کہ محض ثواب کی نیت سے صرف Rapid Reading کے طور پر۔

(۲) دوسری زبانوں کے مقابلہ میں قرآنی زبان اور اس کا مخصوص انداز بیان اس کو بتا دیا جائے تا کہ وہ عجمی زبانوں کے انداز پر اس کا مطالعہ کر کے غلط فہمی میں نہ پڑ جائے۔

(۳) اسے مشق کرائی جائے کہ وہ قرآن کی تلاوت اس طرح کرے جیسے اللہ سے اس کی باتیں ہو رہی ہوں۔ پہلے صرف اس حد تک کہ اللہ اس سے کچھ فرما رہا ہے یا وہ اللہ سے کچھ عرض و معروض کر رہا ہے۔ بعد میں اسے اس طرح مشق کرائی جائے کہ جیسے جیسے خطاب بدلتا جائے ویسے ویسے وہ اپنے ذہن اور تصور میں بھی تبدیلی لاتا جائے۔ مثلاً متکلم خود اللہ ہے اور مخاطب شیطان ہے تو اسی تصور کے ساتھ پڑھے، یا اس کے برعکس صورت میں برعکس تصور کے ساتھ پڑھے۔

(۴) قرآن میں ہر طرح کا انسانی کردار بیان کر دیا گیا ہے۔ طالب علم سے مشق کرائی جائے کہ وہ اس کے اندر سے کردار کو تلاش کرنے کی مہارت پیدا کر سکے۔ پہلے سادہ اور اکہرا کردار، پھر پیچیدہ اور مرکب کردار تلاش کرنے کی مشق کرائی جائے اور آخر میں طالب علم سے کہا جائے کہ وہ خود اپنا کردار اور اپنی تصویر ڈھونڈے۔

(۵) قرآن بتاتا ہے کہ قصے، واقعات اور تاریخ کا با مقصد مطالعہ ہونا چاہئے۔ طالب علم سے مشق کرائی جائے کہ وہ قرآن میں بیان کردہ واقعات میں کسی غلط ابتداء کے برے نتائج کو اور اسی طرح تعمیری پہلو سے اچھی ابتدا کے اچھے نتائج کو تلاش کرے اور ان دونوں کے فطری ربط کو معلوم کرے۔ پہلے سادہ اور پھر پیچیدہ مثالوں سے روشناس کرایا جائے۔

(۶) اسے قرآنی قصوں سے یہ حقیقت معلوم کرائی جائے کہ ہر نبی نے خواہ وہ کافر قوم میں یا بگڑی ہوئی مسلمان قوم میں مبعوث ہوا ہو بلا استثنٰی اپنی کوششوں کی ابتدا بنیادی دعوت یعنی توحید، آخرت اور رسالت ہی سے کی ہے۔

(۷) بنیادی مسائل قرآن میں یکجا بیان نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ان کے مختلف پہلوؤں کو مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے، اس لئے کسی مسئلہ کو اس کی کامل اور صحیح شکل میں جاننے کیلئے ضروری ہے کہ اس مسئلے سے متعلق جتنی آیتیں آئی ہیں سب کو یکجا جمع کر کے ان کے درمیان تطبیق دی جائے۔ گمراہیوں کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ کسی ایک پہلو سے متعلق آیتوں کو یکجا کر کے اسی پہلو کو مکمل مسئلے کی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ یہاں اس بات کا خیال رہے کہ اس مرحلہ میں مختلف پہلو علیحدہ علیحدہ کیوں بیان کئے جائیں، اس کی حکمت سے ان طالب علموں کو واقف کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۸) قرآن سے استنباط کے سادہ طریقے بتائے جائیں اور ان کی مشق کرائی جائے مثلاً دعا کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے حاملین عرش فرشتوں کی دعاء سے کس طرح استنباط کر کے دعاء سکھائی ہے۔

حضور ﷺ کی سکھائی ہوئی دعاء	قرآن میں فرشتوں کی دعاء
سبحانک اللھم و بحمدك و اشھد ان لا الہ الا انت استغفرك و اتوب الیک۔ اللھم اغفرلی والمومنین و المومنات	یسبحون بحمد ربھم و یومنون بہ و یستغفرون الذین آمنوا

☆ قربانی کے مسئلے میں اس آیت فصل لربک و انحر سے استنباط کر کے بقرعید میں نماز پہلے ادا کرنا اور قربانی اس کے بعد کرنا۔

☆ اسی طرح ایک صحابی یہ دعاء کر رہے تھے ربنا افرغ علینا صبرا آپؐ نے سنا تو فرمایا، یہ اپنے لئے مصیبت مانگ رہا ہے (کیوں کہ مصیبت آئے گی تب ہی تو خیر کی ضرورت ہوگی)

☆ دعائے یونسؑ کا پس منظر قرآن نے بتایا ہے نادیٰ فی الظلمت اس لئے یہ دعا ایسے موقعوں کے لئے تیر بہدف ہے جب آدمی ظلمتوں میں گھر گیا ہو۔

(۹) قرآن کے مختلف مقامات سے آیتوں کے ایسے انتخاب کی مشق جن سے کوئی سادہ سا مضمون پیدا ہو۔

(۱۰) کسی سادہ سے عنوان پر قرآن کا مطالعہ۔

نماز کا اہتمام اور تعلیم

(۱) نماز کی پابندی کرائی جائے اور اس کی مشق اس طرح کرائی جائے کہ وہ نماز کو خودکار مشین کی طرح نہ پڑھے بلکہ شعوری طور پر اور اللہ کے سامنے حضوری کے تصور کے ساتھ ادا کرے۔

(۲) نماز ہی کے ذریعہ اس کے ذہن و دل کو ایسا بنایا جائے کہ وہ اصول دین پر جمنا اور فروع دین میں اختلافات کو خوش دلی سے انگیز کرنا سیکھ لے۔ بلکہ یہ اس کے مزاج کا جزء بن جائے۔

(۳) نماز ہی کے ذریعہ اس کو نظم وضبط (Discipline) کی تعلیم دی جائے تا کہ یہ اس کی شخصیت کا حصہ بن جائے۔

(۴) نماز ہی کے ذریعہ پابندیٔ وقت اور مختلف اوقات کا مختلف اور مناسب ترین مصرف لینا سکھایا جائے۔

(۵) نماز ہی کے ذریعہ اسلامی اجتماعیت، اور فرد اور جماعت کے درمیان رشتے میں توازن اور اعتدال کی تعلیم دی جائے۔

(۶) نماز ہی کے ذریعہ نظام اطاعت کی خصوصیات اس کے ذہن نشین کرادی جائیں۔

یہ تو اس بنیادی تعلیم کا خاکہ ہے جو ہر مسلمان کو لازماً ملنی چاہیے۔ اس کے اختتام تک ہر طالب علم کے بارے میں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہ آگے کی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ نہیں، اور اگر رکھتا ہے تو علم کے کس شعبے کی۔ آگے کی تعلیم اختیاری ہونی چاہیے لازمی نہیں۔ البتہ بنیادی اور اعلیٰ دونوں تعلیم لازماً مفت ہونی چاہیے۔

اعلیٰ تعلیم

اعلیٰ تعلیم اگلے مرحلہ کی اس نہج پر ہونی چاہیے کہ اس سے فارغ ہوکر طالب علم ایک یا چند شعبۂ علم میں مہارت اور اختصاص پیدا کرے۔ دراصل یہی فارغین ہوں گے جو مستقبل کے نگراں، مستقبل کی کسی حد تک صورت گری کرنے والے اور ناگزیر مستقبل کے لئے پیشگی رہنمائی کرنے والے ہوں گے۔ اس غرض کے لئے تاریخ، علم النفس، سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ شعبہ ہائے علم کے ایسے ماہرین ہر نسل میں فراہم کرنے ہوں گے جو ان علوم سے متعلق مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت اور مجتہدانہ بصیرت کے حامل ہوں اور ساتھ ہی ان کے درمیان کامل تال میل (Co-ordination) ہونا چاہیے۔

علم النفس

اگر چہ علم النفس کے شعبہ میں مغربی ماہرین نے بہت ترقی کی ہے، مگر قطع نظر اس سے کہ کسی بھی شعبہ علم میں ترقی کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے، ان کی ترقی میرے خیال میں وہ انسانی نفسیات Human psychology میں نہیں بلکہ حیوانی

نفسیات Sub-human psychology میں ہے، کیوں کہ ان کے زیر تجربہ ومشاہدہ جولوگ رہتے ہیں وہ قرآن کی زبان میں "کالانعام بل ھم اضل" (جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ گئے گزرے) ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مادی اور صرف دنیوی خواہشات واغراض میں گھرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں اور جانوروں کی طرح فطرت کے لگے بندھے قوانین کے پابند ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح مادی اور طبعی سطح پر ہر چیز متعین ردعمل ظاہر کرتی ہے، اسی طرح یہ لوگ نفسیاتی سطح پر بھی متعین طریقے پر ردعمل Reaction کا اظہار کرتے ہیں۔ جبکہ انسان کو اس کی قوت ارادی کے ذریعہ اس کی لگی بندھی فطرت پر بالادستی عطا کی گئی ہے۔ اس لئے مسلمان ماہرین نفسیات کو جہاں مغربی علم النفس کو مزید ترقی دینا ہے وہیں انسانی نفسیات کو نئے سرے سے مدون کرنا ہے۔ اس غرض کے لئے انسان کے اندر جو قوت ارادی ودیعت کی ہوئی ہے اس کی نوعیت، ماہیت اور اس کے حدود کو پہلے جاننا ہوگا اور اس کی بنیاد پر انسانی علم النفس کی تدوین کرنی ہوگی۔ قوت ارادی سے مراد وہ قوت نہیں ہے جس کو مغربی یا جوگیانہ فلسفہ میں قوت ارادی کہتے ہیں بلکہ میری مراد اس سے وہ قوت ہے جس کی بنیاد پر انسان فرمان خداوندی کا مکلّف اور خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔

تاریخ

تاریخ اقوام وملل کے سلسلے میں بتانا ہوگا کہ تاریخ کن مراحل سے گزر رہی ہے اور آگے کون سا موڑ مڑنے والی ہے۔

سائنس

سائنس کے سلسلہ میں مسلم طالب علم کو غلط راہوں میں بھٹکنے اور غلط ہدف کی طرف بڑھنے کی بجائے ان کے لئے قرآن نے ایک شاہراہ کھول دی ہے اور اس کے نشانات بالکل واضح کردئے ہیں۔ قرآن نے فرمایا ان فی خلق السموات و الارض واختلاف اللیل و النھار (بیشک زمین وآسمان کی تخلیق اور رات اور دن کے اختلاف میں نشانیاں ہیں (آل عمران)۔ یعنی یہ ہست و بود باطل نہیں بنایا گیا ہے اس لئے کوئی نظریہ جو ان کو کسی حیثیت میں بھی باطل قرار دینے پر منتج ہوتا ہو صحیح سائنسی نظریہ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح یہ بھی بتایا گیا کہ اس کا ایک انجام بھی ہے۔ اس لئے اگر کسی غلط سائنسی نظریہ پر تمدن کی عمارت کھڑی کی جائے گی تو وہ مآل کار آگ سے دوچار ہوگی (آگ اجزاء وشیرازہ کو پراگندہ کردیتی ہے)۔ جو قوم اس آگ میں داخل کر دی گئی اسے ذلت وخواری سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ حقیقی علمی ترقی اس سائنسی نظریہ کی بنیاد پر ہی ہوگی کہ یہ کائنات نہ تو ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہے گی۔ نہ تو اپنے آپ بن گئی ہے اور نہ اس کی بنانے والی ایک سے زیادہ ہستیاں ہیں۔ اس کو بنانے والا بلکہ خلق کرنے والا ایک اور صرف ایک ہے اور یہ کہ جس طرح ایک حکومت میں ہر جگہ ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے اسی طرح جو قانون کائنات کے کسی ایک گوشہ میں چل رہا ہے وہ لازماً پوری کائنات میں نافذ ہے۔ ایک ماہر سائنس کو اس کائنات پر اور اس کے اندر واقع ہونے والے اختلافات وتبدیلیوں پر مستقل غور وفکر کرنا ہوگا۔

ٹکنالوجی

ٹکنالوجی کے سلسلے میں قرآن نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اس طبعی اور مادی کائنات کو اللہ تعالےٰ اگرچہ آن واحد میں بنا سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا بلکہ ابتداہی سے تخلیق کا کام تدریج اور ارتقاء کے اصول پر کیا۔ پہلے مجرد اکائیوں کو وجود بخشا اور پھر مرکب در مرکب کرتے ہوئے اس کو کمال تک پہنچایا۔

اللہ تعالےٰ نے اپنے فعل تخلیق یا کائنات میں اپنے تصرفات کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے۔ ایک وہ جو فطری قوانین سے بالاتر ہے۔ یہ عمل تخلیق یا تصرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔ دوسری وہ جو فطری قوانین کے مطابق ہے۔ اس صفت تخلیق میں سے اللہ نے

انسان کو بھی ایک حصہ عطا کیا ہے۔ایسا تصرف انسان بھی کرسکتا ہے بشرطیکہ ان فطری قوانین کو وہ جان لے جن کے مطابق کوئی خاص تخلیق یا تصرف ہوتا ہے۔میں نے اس سلسلے میں جہاں تک غور کیا ہے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جہاں اللہ تعالیٰ فاعل یا متصرف کی حیثیت سے اپنے لئے جمع متکلم کی ضمیر استعمال کرتا ہے وہاں ایسے تصرفات اور تخلیقات کا بیان ہوتا ہے جو فطرت کے لگے بندھے ضابطوں کے مطابق ہیں۔مثلاً سورہ لقمان کی آیت ''و انزلنا من السماء ماءً فانبتنا فیھا من کل زوج کریم'' اس میں انزلنا اور انبتنا میں جمع متکلم کی ضمیر آئی ہے۔اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے اندر روح پھونکنے کا تذکرہ جہاں قرآن میں آیا ہے وہاں جمع متکلم کی ضمیر استعمال کی گئی ہے،لیکن حضرت آدمؑ کے اندر روح پھونکنے کا ذکر ہر جگہ واحد متکلم کے ساتھ کیا گیا ہے۔بیان کے اس فرق سے اللہ کی اس مشیت کا علم ہوتا ہے کہ بغیر ماں باپ کے پیدا کرنے کا کام تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے مگر صرف بغیر باپ کے تخلیق کا عمل انسان بھی کرسکتا ہے۔

عالم آخرت اور دنیا: چند نکات

آخر میں قرآن واحادیث میں بیان کردہ درج ذیل چند حقائق کا ذکر کردوں جو اہل علم کے لئے وسیع تر میدان عمل فراہم کرتے ہیں:

(۱) کائنات پوری کی پوری انسان کے لئے مسخر کردی گئی ہے۔

(۲) موجودہ کائنات عارضی ہے۔اس کے بعد دوسری کائنات ہوگی۔

(۳) جو کچھ وہاں ہوگا اسی موجودہ کائنات کا،اس کے اندر ہمارے کاموں کا اور ہماری موجودہ زندگی کا ترقی یافتہ کبھی نہ ختم ہونے والا انجام ہوگا۔

(۴) اس سے پہلے اس دنیا کی ساری پوشیدہ استعداد Potentialities ظاہر ہوچکے گی۔

(۵) وہاں تدریج کا اصول کارفرما نہ ہوگا جبکہ یہاں تدریج کا اصول ہی کارفرما ہے۔

(۶) وہاں عسر اور یسر دونوں علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔یہاں دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔

(۷) وہاں خوشی اور غم،راحت ورنج،آرام وتکلیف بالکل جدا جدا ہوں گے،یہاں دونوں باہم بین السطور پائے جاتے ہیں۔

(۸) ایک ایک جنت اتنی وسیع ہوگی جتنی وسیع موجودہ پوری کائنات ہے،کم سے کم وسعت والی جنت ایسی ہے جیسی ہماری یہ زمین اور آسمانی دنیا۔ایک ایک مومن کو چار چار جنتیں بھی ملیں گی۔وہاں گھروں کی منزلیں زمین وآسمان کے ستاروں کی بلندی کی مانند ہوں گی۔

(۹) جنتی کی نگاہ اتنی تیز اور دوررس ہوگی کہ اپنی جنت میں خواہ جہاں پر بھی ہو وہیں سے اپنی جنت یا جنتوں کے ہر گوشہ کو دیکھے گا جب کہ اس دنیا میں ہماری نگاہ محدود مناظر کو ہی دیکھ سکتی ہے،اس لئے کہ روشنی کی محض چند لہروں (Light Wave) سے ہماری آنکھ متاثر ہوسکتی ہے،وہاں یہ حد بندی ختم ہوجائے گی۔چھوٹی سے چھوٹی اور لانبی سے لانبی لہر کا ادراک ہماری آنکھیں کرسکیں گی۔ان پوشیدہ لہروں میں کیسے کیسے حسین ودلکش مناظر پوشیدہ ہیں وہ ہم نہیں جانتے ہیں، وہاں ہم ان سب سے لطف اندوز ہوسکیں گے،البتہ بھیانک مناظر سے ہماری بینائی کو محفوظ کردیا جائے گا۔

(۱۰) جنت میں ہماری سماعت بھی لامحدود ہوجائے گی۔آواز کے لامتناہی زیروبم میں سے ہمارے کان یہاں صرف چند ہی آواز کی لہروں (Sound waves) کی گرفت کرپاتے ہیں۔وہاں صورت حال ایسی نہیں ہوگی۔بلکہ جتنی قسموں کی بھی

لہریں (Sound waves) ہیں سب کو ہم سن اور ان سے لطف اندوز ہوسکیں گے، البتہ دل خراش آوازوں سے ہماری سماعت کو محفوظ کردیا جائے گا۔ چکھنے، سونگھنے اور چھونے سے متعلق بھی ایسی ہی صورت حال ہوگی کہ جہاں آج یہ ساری قوتیں محدود ہیں وہاں یہ لامحدود کردی جائیں گی۔ اور ہم ہر طرح کی لذتوں سے متمتع ہوں گے، البتہ تکلیف دہ احساسات سے ہمیں بچالیا جائے گا۔

(۱۱) سرعت اور رفتار کار کے معاملے میں بھی یہی صورت ہوگی۔ جنت کے جس گوشے میں بھی جس بلندی پر ہم پہنچنا چاہیں گے آن واحد میں پہنچ جائیں گے۔ جنت میں درخت فوراً اگیں گے اور پھول پھل دیں گے۔ وہاں جسمانی کاوش کے بغیر نہریں کھودی جاسکیں گی۔

یہ ہیں آخرت کی ترقی یافتہ زندگی اور تمدن سے متعلق چند حقائق۔ ترقی کے اس دور کے شروع ہونے سے پہلے کے مراحل موجودہ دنیاوی زندگی ہی میں بتدریج طے ہونے ہیں۔

ہم آج بالائی منزل کے لئے خلائی اسٹیشن بنانے لگے ہیں یا ہم نے مسافت کی رفتار میں خاصی ترقی کی ہے یا دور کے مناظر اور آوازیں اپنی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے سننے اور دیکھنے لگے ہیں یا درخت سے جلد پھل حاصل کرنے کی سمت میں ترقی کی ہے یا نہر کھودنے اور اس جیسے مشقت طلب کام نسبتاً سہولت سے انجام دینے لگے ہیں تو یہ سب باتیں دور آخرت سے مشابہت رکھتی ہیں۔ البتہ ان تمام معاملات میں ہم دنیاوی اور انسانی حدود کے آگے نہیں جاسکتے گرچہ ان تمام ترقیات میں موجودہ مقام سے مزید اوپر جانے کا امکان موجود ہے۔

مسلم علمی ماہرین کی ذمہ داری یہ ہے کہ تمام علوم کی بنا اور ترقی کا نہج قرآن وحدیث کی روشنی میں متعین کریں اور باطل اصول ومبادیات پر ہونے والی علمی ترقی واختراعات کی نشاندہی کریں نیز انسان کی طبعی، تمدنی واخلاقی زندگی پر ان کے متوقع اثرات سے اور ان کے نتائج بد سے بچنے کی صورت سے آگاہ کریں۔ ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ مذکورہ تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو نصاب ونظام تعلیم مرتب کیا جائے اسے رائج کرے اور مخرب اخلاق وتمدن اور فاسد اختراعات پر پابندی عائد کرے۔

۞۞۞

ڈاکٹر صاحبؒ کا مرتب کردہ

نصاب مطالعہ وتربیت

ڈاکٹر صاحب انسانوں کو گڑھنے کا کام کیا کرتے تھے اور ان کو نک سک سے درست کرنے کے لئے متواتر سوچتے رہے اور اپنی سوچ کو انہوں نے متعین شکل (Concrete shape) بھی دیا اور اس پر عمل بھی کیا اور کروایا۔ اس پورے عمل کا جائزہ اور اس کے نتیجے میں مسلسل ہم ارتقاء ان کی سوچ میں دیکھتے ہیں۔ تعلیم وتربیت ڈاکٹر صاحب کے لئے کوئی نظری نہیں بلکہ عملی میدان ہے۔ اس کا ہدف بھی ان کے سامنے واضح ہے ______ امامت۔ ''انقلاب امامت'' اور ''امامت'' یہ دو تصور ڈاکٹر صاحب کے جہان میں مرکزی ہے۔ مورخہ ۲ رتا ۴ راپریل ۱۹۷۹ء کو ڈاکٹر صاحب نے حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے منتخب ارکان کا اجتماع دفتر حلقہ طلبہ اسلامی بہار، رمنہ روڈ پٹنہ میں طلب کیا۔ اس اجتماع میں شاید پندرہ (۱۵) طلبہ سے زائد شریک نہیں تھے۔ آپؒ نے مقصد بیان کرتے وقت فرمایا تھا ''باطل نظام موجودہ حالات کو Handle کرنے سے اب اپنے کو مجبور پا رہا ہے''۔ جیسی بھی تبدیلی بھی آجائے آپ پہلے سے اس کو Handle کرنے کے لئے تیار رہیں''۔ آپ نے اس اجتماع میں قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام اور نظریات کے مضامین پر مشتمل ایک نصاب طلبہ کے سامنے پیش کیا۔ یہ پورا نصاب ڈاکٹر صاحب نے تحریری شکل میں پیش کیا اور طلبہ نے اسے اپنی کاپیوں پر نقل کیا تھا۔ یہ بات اس لئے اہم ہے کہ ڈاکٹر صاحب بہت اہم مواقع پر ہی تحریری شکل میں اپنے خیالات کو رقم کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو نصاب پیش کیا تھا کہ اس کے ایک ایک جملے کی تفہیم آپ نے کرائی تھی اور ساتھ ہی ساتھ طلبہ کو اسؓ کی مشق بھی کروائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر تھا کہ موجود طلبہ اس نصاب کو منطقہ وار تربیتی اجتماع میں پیش کریں۔ ہسوہ (ضلع نوادہ) کے اجتماع میں ڈاکٹر صاحب ان طلبہ کے ذریعہ پیش کردہ پروگرام کو دیکھنے کے لئے خود بھی موجود تھے۔

ذیل میں نصاب کے علاوہ افتتاحی اور اختتامی تقریر نوٹ کی مدد سے تیار کردہ ہے۔ تقاریر کے تعلق سے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جتنی باتیں تحریر میں آئی ہیں وہ صرف تحریری نوٹ کو ترتیب دینے تک ہی محدود ہے۔ یہ نوٹ بھی ڈاکٹر صاحب کے اہم جملوں پر ہی مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ دونوں تقاریر حافظہ پر اعتبار کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم پینتالیس پینتالیس (۴۵۔۴۵) منٹ سے کم پر مشتمل نہیں تھی۔ ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا تھا کہ ایک پوری تقریر اس نوٹ کی مدد سے تیار کیا جائے لیکن اس سے زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ نوٹ کے جملوں کو ہی صرف ترتیب دے دیا جائے۔ بقیہ نصاب اور مشقی سوالات تقریباً ڈاکٹر صاحب کی تحریری پیش کش کا نوٹ ہے۔ اس پورے مضمون کو برادر ارشد اجمل نے اپنی نوٹ بک کی مدد سے مرتب کیا ہے (ادارہ)

افتتاحی تقریر

بعد حمد وثنا: آپ ایک Movement چلا رہے ہیں اور وہ ہے اقامت دین۔ ہر تحریک کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک ابتدائی مرحلہ جب وہ مقصد کے حصول کی جدو جہد کرتا ہے اور دوسرا وہ مرحلہ جب کہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، پھر اس کا چلایا جانا اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اب آپ دوسرے مرحلے میں قدم رکھنے والے ہیں۔

خلافت ارضی: انسان کو خلافت ارضی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس لیے یہ چیز اس کی فطرت میں ودیعت کردی گئی ہے۔ امت مسلمہ پر اللہ کی ایک نوازش اور ہے اور وہ یہ ہے کہ اسے دنیا کا امام بنایا گیا ہے۔ اس وقت یورپ Defacto (بالفعل) دنیا کا امام ہے لیکن Dejure (اصولاً) ہم ہی اس منصب پر فائز ہیں۔ ٹھیک بنی اسرائیل والی حیثیت ہماری ہوگئی ہے۔

خلافت تو ہمیشہ چمٹی رہے گی انسان سے لیکن امامت کے ساتھ یہ بات نہیں ہے۔

ابھی تک ہم Comparative Study کرتے تھے۔ لیکن اب وہ دور نہیں رہا۔ زمانہ اس تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ ایک نسل امامت کو حاصل کرے اور اسی نسل میں ختم بھی ہو جائے۔ تمدن کی رفتار تیز ہے اور وہ پوری طرح رواں دواں ہے اور اس پر کسی کا اختیار نہیں۔ اللہ تمدن کو بڑھاتا ہے اور بڑھا رہا ہے۔ رفتار تمدن کی تیزی کی وجہ سے انقلابات بہت تیزی سے آئیں گے۔

باطل نظام موجودہ حالات کو Handle کرنے سے اپنے آپ کو مجبور و معذور پا رہا ہے۔ لہٰذا جیسی بھی تبدیلی آجائے آپ پہلے سے اسے Handle کرنے کے لیے تیار رہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد کی مثال سامنے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام تربیت پر پوری طرح عامل نہ رہنے ہی کی وجہ سے زوال (Decline) آیا۔ ایسا ہونا فطری ہے۔

پچھلے تجربات اور نئے حالات کی روشنی میں متداول تعلیم سے رہنمائی کی صلاحیت (Leading Capacity) نہیں پیدا ہوسکتی ہے۔ رہنمائی کے لیے مستقبل کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ماضی اور حال کی تعلیم سے سربلندی حاصل نہیں ہوسکتی۔ آزاد تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ آزاد تعلیم حاصل کرنے والے کامیاب ہوتے ہیں۔ رسولؐ کی زندگی کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ علم انسان کی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔ اس سے زیادہ بنیادی مسئلہ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ علم ہی کی وجہ سے ہمیں خلافت عطا ہوئی ہے ____ گناہ کرنے کے باوجود۔

افتتاحی تقریر کے بعد تربیتی نصاب کے موضوعات (Subjects) کا تعارف کرایا گیا جو حسب ذیل ہے۔

(۱) قرآن (۲) حدیث (۳) فقہ (۴) تاریخ اسلام (۵) مطالعہ نظریات

اب موضوع وار ان کی تفصیل ملاحظہ ہو:

مطالعہ قرآن

(۱) اسلوب (Style) کا مطالعہ: ہر صاحب کلام کا اپنا اسلوب اور Style ہوتا ہے جس کو جانے بغیر اس کے کلام کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا بھی اپنا ایک اسلوب ہے جس کو جاننا ضروری ہے۔

(۲) محاورات اور اصطلاحات سے واقفیت۔

(۳) ربط کلام سے واقفیت اور اس کو سمجھنے کی اہمیت۔

(۴) سورتوں کے مرکزی مضامین اوران کے عنوانات سے واقفیت اوران کو متعین کرنے کے طریقے۔

(۵) کسی آیت کا مفہوم متعین کرنے کے لیے کن امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۶) قرآن سے کسی مسئلہ کے استنباط کے اصول۔

(۷) ہم آہنگ اور غیر ہم آہنگ آیتوں کو جاننا اور اس کو جاننے کی اہمیت۔

ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ سے استفادے کا مشورہ دیا تھا کہ یہ لفظی ترجمہ ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اس سمت میں بھی کوشش کی تھی کہ طلبہ عربی زبان سیکھیں کہ یہ ان کے نزدیک بہت اہم تھا۔ڈاکٹر صاحب نے قرآن سے براہ راست عربی زبان سکھانے کا طریقہ وضع کیا تھا۔طلبہ کے ایک گروپ نے ان کے کلاس میں کافی وقت تک شرکت کی تھی۔اس میں ڈاکٹر جاوید سرور کا نام ذہن میں آتا ہے جو کافی دنوں تک اس کلاس میں شریک ہوتے رہے۔شاید طالبات کا جو کلاس چلا تھا وہ زیادہ طویل تھا۔اگر ان لوگوں کے پاس اس کا نوٹ موجود ہو تو اس سے کام کی چیز نکل سکتی ہے۔

(ا) اسلوب

(الف) قرآن کے اندر زائد از ضرورت ایک لفظ بھی نہیں ہوتا۔

اس کی مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا:

حضرت سلیمان کے ذکر میں قرآن میں آتا ہے کہ وما کفر سلیمن و لکن الشیطین کفروا (البقرہ :۱۰۲) (حالاں کہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو شیاطین تھے)۔مسلمان جو شروع ہی سے حضرت سلیمانؑ کو پیغمبر برحق مانتا ہے، جھٹ سے سوال کر بیٹھتا ہے کہ آخر پیغمبر سے کفر کا امکان ہی کیا تھا۔

اہل کتاب کی مسلم کتاب بائبل (عہد عتیق) کے صحیفہ اسلاطین کے باب ۱۱ کی ابتدائی آیتوں میں یہ صاف درج ہے کہ سلیمانؑ اپنی آخری عمر میں معبودوں کی طرف مائل ہوگئے تھے اور یہود وعیسائیوں کی کروڑوں آبادی کے نزدیک مشرک ہوگئے تھے۔اتنی شدید گمراہی کی تردید قرآن اگر کھل کر نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

قرآن میں زائد از ضرورت لفظ نہیں ہے کی ایک اور مثال دیتے ہوئے طلبہ کو task دیا کہ سورہ القصص میں فرعون، ہامان کو حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے سلسلے میں کہتا ہے فاوقدلی بھا من علی الطین فاجعل لی صرحا لعلی اطلع الی الہ موسی. وانی لاظنہ من الکذبین (القصص ۳۸) (اے ہامان تو میرے لئے مٹی کی اینٹوں کو آگ دے تاکہ پکا محل کھڑا کریں۔جس پر سے ہم موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھ سکیں اور میں تو موسیٰ کو اس باب میں جھوٹا ہی سمجھتا ہوں) یہاں لفظ 'الطین' فاضل معلوم ہوتا ہے، اس کی وجہ تلاش کریں۔

ڈاکٹر صاحب ایک اور مثال اس ضمن میں مختلف مواقع پر دیا کرتے تھے، وہ تسمیہ میں الرحمٰن اور الرحیم کے تعلق سے ہے۔ڈاکٹر صاحب اس کو مترادف یا زور کلام سے توجیہ نہیں کرتے تھے۔اس طرح تو ''زائد از ضرورت لفظ'' کا معاملہ بنا ہی رہتا۔آپ کے مطابق یہ دو نوع کا رحم ہے، رحمٰن ماں کی محبت کے مانند ہے جس میں جوش، جذبہ اور والہانہ پن ہے جس کو اگر غصہ آجائے تو سخت سزا بھی دیتی ہے جب کہ رحیم باپ کی محبت کے مانند ہے جس میں عقل اور استمرار ہے، جس کو اگر غصہ بھی آجائے تو اس کا اظہار ایک حد کے اندر ہوگا۔رحمٰن والی صفت تمام انسانوں کو محیط ہے اور رحیم خدا پر ایمان لانے والوں کے لئے مختص ہے۔

(ب) عربی کلام کی یہ خصوصیت قرآن کے اسلوب میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ جہاں عجمی زبان چیونٹی کی چال چلتی ہے وہاں

عربی زبان ہرن کی چال چلتی ہے۔ یعنی عجمی زبان کسی موضوع کے جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ پیش قدمی کرتی ہے جب کی عربی زبان جزئیات اور تفصیلات کو جو عام ذہانت (Common Sense) کے ذریعہ خود سے سمجھ میں آسکیں حذف کرتی ہوئی چلتی ہے۔ اس کی نمایاں مثال سورہ 'النبا' ہے۔

اس کی مشق کراتے ہوئے پہلے سورہ النبا کی آیت ۶ تا ۱۷ کا ترجمہ لکھوایا اور حکم دیا کہ اس میں موجود خلا کو طلبہ پر کریں۔ ذیل میں پر کردہ حصہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا حصہ ہو، اس پر حافظہ سکوت اختیار کئے ہوئے، لیکن شاید ایسا ہوا کہ طلبہ کے ذریعہ پر کردہ حصہ ڈاکٹر صاحب نے فرداً فرداً ملاحظہ فرمایا اور اس پر اصلاح یا اطمینان کا اظہار کیا۔ ذیل کے حصوں کو اسی پس منظر میں لینا چاہئے۔

الم نجعل الارض مهدا. والجبال اوتادا. وخلقنكم ازواجا. وجعلنا نومكم سباتا . وجعلنا اليل لباسا. وجعلنا النهار معاشا. وبنينا فوقكم سبعا شدادا. وجعلنا سراجا وهاجا. وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجا. لنخرج به حبا ونباتا. وجنت الفافا.

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا
اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا
اور تمہیں جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا
اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا
اور رات کو پردہ پوش
اور دن کو معاش کا وقت بنایا
اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کئے
اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا
اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی
تاکہ اس کے ذریعہ سے غلہ اور سبزی اور گھنے باغ اگائیں (ترجمہ)

ہم نے زمین کو فرش بنایا اور اس کا زوج پہاڑ کو بنایا جس کو زمین میں میخوں کی طرح گاڑ دیا اور یہ اصول یعنی Balance کا ہر جگہ کارفرما ہے۔ تم کو خود مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا۔ اور یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ہر زوج ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دیکھو رات کا زوج دن ہے۔ رات میں سکون ہے اور یہ پردہ پوش ہے جب کہ دن دوڑ دھوپ کرنے کے لئے ہے اور اس میں تکان ہے اور رات کی سی پردہ پوشی نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنایا اور اس کو Balance کرنے کے لئے گرم اور روشن چراغ بنایا اور اس روشنی کو Balance کرنے کے لئے رات کی تاریکی ہے اور گرمی کا زوج بادلوں کی بارش ہے۔ اور یہ تمام چیزیں یعنی زمین، پہاڑ، انسانوں کا جوڑا رات کی تاریکی دن کی روشنی آسمان اور سورج اور بادل یہ تمام ترچیزیں زوج ہیں غلہ اور سبزی اور گھنے باغ کے۔

ڈاکٹر صاحب اس ضمن میں ایک اہم پہلو دلچسپ پیرائے میں فرمائی۔ فرمایا قرآن میں صرف چھلانگ نہیں ہے بلکہ ایک فکر ہے۔ چھلانگ کی مثال میں ایک شعر سنایا۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

(ج) خطاب بہت جلد جلد بدلتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی آیت میں مختلف قسم کے خطابات ہوتے ہیں۔

(د) قرآن کا انداز کلام شاہانہ ہے۔

(ہ) مستقبل کی بات کو پورے یقین سے بیان کرتا ہے جو خدا کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔

(و) ماضی کی باتوں کو مضارع کے صیغہ میں استعمال کرتا ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے اس کو ماضی کے صیغہ میں بیان کرتا ہے بعض بعض مقامات پر۔

(۲) محاورات واصطلاحات سے واقفیت

- مثلاً ''صلوٰۃ'' ایک مخصوص عبادت ہے جسے ہم نماز کہتے ہیں۔ اس کا یہ اصطلاحی نام ہے ورنہ لغت کی رو سے صلوٰۃ کا مفہوم دعا تھا لیکن قرآن نے اسے ایک جامع عبادت کی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا۔
- یا مثلاً 'الذین آمنوا' اس سے مراد ہر طرح کے مسلمان ہیں خواہ وہ سچے مومن ہوں یا پکے منافق۔ ان دونوں میں امتیاز کرنے کے لیے قرآن مومن اور منافق کا لفظ علحدہ علحدہ استعمال کرتا ہے۔

(۳) ربط کلام کو سمجھنے کی اہمیت اور ربط کلام سے واقفیت

(الف) قرآن ایک انتہائی مربوط کلام ہے، لیکن جو آدمی اس کے اسلوب اور طرز بیان سے واقف نہیں ہوگا وہ اس کو غیر مربوط سمجھے گا جیسا کہ بعض کفار اعتراض کرتے ہیں۔ بعض سچے مسلمان بھی جو گہرائی میں اتر کر ربط کو معلوم نہ کرسکے وہ اسی کو خوبی سمجھتے ہیں اور قرآن کے غیر مربوط کلام ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

(ب) قرآن کا ربط سمجھنے کے لیے آدمی کو کائنات کے مربوط نظام کو سمجھنا ہوگا۔ مثال کے طور پر ہم اس زمین ہی پر اگر نظر ڈالیں تو ہم کو زمین کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کے درختوں کے قطعات ملیں گے۔ ایک خاص حدود میں ایک خاص طرح کے درخت کثرت سے ملیں گے تو دوسرے حدود میں دوسرے طرح کے درخت، اور بظاہر ایسا محسوس ہوگا کہ ان قطعات کا اختلاف الل ٹپ قسم کا ہے، لیکن جب آدمی زمین کے اندر مختلف قسم کی کھادوں اور دھاتوں اور دیگر چیزوں سے واقف ہوتا ہے تو اس کو اس ظاہری اختلاف میں جو ربط چھپا ہوا ہے اس کا علم ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کے بھی مختلف اجزاء میں جو ظاہری بے ربطی نظر آتی ہے، آدمی اگر ڈوب کر مطالعہ کرے اور اس مطالعہ کے لیے اس کے پاس علمی مواد فراہم ہو چکا ہو تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کلام اسی ذات کا ہے اور اسی اسٹائل کا ہے جس ذات نے جس اسٹائل پر اس کائنات کو بنایا۔

(۴) سورتوں کے مرکزی مضامین، ان کے عنوانات سے واقفیت اور ان کو متعین کرنے کے طریقے

مرکزی مضمون عام طور پر توحید، رسالت، آخرت یا ان میں سے کوئی دو یا تینوں ہوتے ہیں لیکن خاص بات جو سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ مرکزی مضمون خواہ جو بھی ہو اس کی تفہیم کے لیے ہر سورت کا کوئی عنوان ہوتا ہے، اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی سورہ کی ابتدائی اور آخری آیتیں نشان دہی کر دیتی ہیں لیکن عنوان کے تعین کے لیے پوری سورہ کی تمام آیتوں کو اسی عنوان سے متعلق ہونا چاہئے۔ اگر اس تعلق میں کہیں خلاء پیدا ہو جائے تو یہ بات طے کرنے کے لیے کافی ہے کہ جو عنوان سمجھا گیا ہے وہ غلط ہے۔ اس کی جگہ

کوئی دوسرا عنوان ہوگا، اور پھر اس کی تلاش کرنی چاہیے۔

(۵) کسی آیت کا مفہوم متعین کرنے کے لیے کن امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے

(الف) ایک تو خود اس آیت کے اندرونی الفاظ کی باہمی ترتیب اور ربط

(ب) دوسرے اس آیت کا سیاق وسباق یعنی Immediate Context

(ج) تیسرے Broader Context یعنی پورے قرآن کا ربط

(د) چوتھے دین کی اسپرٹ (Spirit)

ان میں سے کسی کے ساتھ اس مفہوم کی مطابقت ہوگی تو اسے لیا جائے گا۔ اور اگر کسی ایک کے بھی مخالف ہوگا تو رد کر دیا جائے گا۔ مثلاً قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم (الزمر) یعنی ’’آپ کہہ دیجئے اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں‘‘۔ ایک آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس آیت کی رو سے لوگ رسول کے بندے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ یہ مفہوم اس لیے مردود ہوگا کہ یہ دین کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکمہ والنبوہ ثم یقول للناس کونوا عبادالی یعنی کسی بشر کا یہ کام نہیں ہوسکتا ہے کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے اور وہ شخص لوگوں سے یہ کہے کہ تم میرے بندے بن جاؤ اللہ کے سوا

یا مثلاً سورہ بقرہ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ھدی للمتقین ہدایت ہے متقیوں کے لیے یہاں متقیوں سے مراد ان پانچ صفتوں کے حامل افراد ہیں جن کا ذکر فوراً بعد کی آیتوں میں آیا ہے۔ یہاں متقین کی وہ تمام صفات مراد لینا صحیح نہ ہوگا جو پورے قرآن میں جگہ جگہ بیان کی گئی ہیں۔

(۶) قرآن سے کسی مسئلہ کے استنباط کے اصول

عموماً قرآن میں کوئی مسئلہ ایک جگہ مکمل شکل میں بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے مختلف پہلو مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی صرف ایک آیت یا ایک ہی پہلو سے متعلق چند آیتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے گا تو صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلہ سے متعلق پورے قرآن میں جتنی آیتیں آئی ہیں ان کو سامنے رکھے تب ہی صحیح تصویر سامنے آسکے گی اور صحیح نتیجہ اخذ کرسکے گا۔

(۷) ہم آہنگ اور غیر ہم آہنگ آیتوں کو جاننا اور اس کو جاننے کی اہمیت

قرآنی آیات کی بہت ساری قسمیں ہیں، مگر یہاں پر صرف دو قسموں کی آیات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن اسی اللہ کا کلام ہے جو اس کائنات کا خالق ہے، اس لیے کائنات اور قرآن کا انداز یکساں ہے۔ جس طرح مادی دنیا میں کچھ چیزیں Homogenous ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں Hetrogenous وہی حال قرآنی آیات کا بھی ہے۔ ہم آہنگ آیات کو آپس میں ملایا جاسکتا ہے اور ان کے ملانے سے طرح طرح کے مضامین پیدا ہوسکتے ہیں۔ بخلاف اس کے Hetrogenous آیات ملائی نہیں جاسکتیں۔ ان کو زبردستی ملانے سے مضمون میں فساد پیدا ہوجائے گا۔ اس کی نمایاں مثال آیتوں کے وہ ٹکڑے ہیں یا وہ دو آیتیں جن کے درمیان وقف لازم

لکھا رہتا ہے، ان کو ملا کر نہیں پڑھا جاسکتا باقی آیتیں ملا کر پڑھی جاتی ہیں۔

مطالعہ حدیث

(۱) تعریف (۲) قسمیں (۳) مقام (۴) تاریخ■

(۱) حدیث کی تعریف: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا، جو عمل کیا اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپؐ کے سامنے یا آپؐ کے علم میں جو کچھ کیا یا کہا، اس پر آپؐ کا سکوت یا پسندیدگی کا اظہار یا نکیر یہ سب حدیث ہے۔

(۲) حدیث کی قسمیں: حدیث کی قسمیں تو بہت سی ہیں لیکن ہمارے لیے Safe Side یہی ہے کہ ہم اپنی تحقیق اور ضرورتوں کا انحصار ان حدیثوں پر رکھیں جو قرآن کے مطابق ہوں، یا اس کے خلاف بہر حال نہ ہوں۔

(۳) مقام حدیث: حدیث کا اصل مقام یہی ہے کہ وہ (۱) قرآن کی شارح (۲) اس کے مفہوم کو متعین کرنے والی ہے یا یوں کہا جائے کہ وہ معلم قرآن ہے۔ اس کا یہ مقام بھی واضح ہے کہ (۳) قرآن میں جو باتیں مجمل بیان کی گئی ہیں ان کی وہ تفصیل بیان کرتی ہے اور (۴) ان کے عملی شکل متعین کرتی ہے۔ نیز جو باتیں قرآن میں نہیں ہیں یعنی جو زائد از قرآن ہیں ان کے معاملے میں بھی وہ (۵) Authority ہے، بس شرط وہی ہے کہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً نماز، اس کی رکعتیں، ہیئت اور کس وقت کیا چیزیں پڑھی جائیں____ ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن میں نہیں بیان کی گئی ہے، ان کی توضیح وتشریح حدیث ہی کرتی ہے۔

(۵) حدیثوں کی صحت کی کسوٹی■: پہلی کسوٹی تو یہی ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو اور دوسری یہ کہ اس کے راوی ثقہ ہوں۔ اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے تین کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا:

مظاہر حق مشکوٰۃ کی شرح	کتب خانہ امدادیہ دیوبند
فن اسماء الرجال	مصنف مناظر احسن گیلانی
ریاض الصالحین	امام نووی

مطالعہ کرنے کے ضمن میں مشورہ دیا کہ مطالعہ کرتے وقت تمام احادیث جو اس ایک موضوع پر ملتی ہے ان تمام کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اسی موقع پر شاید مردوں پر عذاب سے متعلق حدیث اور قرآن کا حوالہ دیا۔ ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ ''مردوں کے گھر والوں کے رونے کے باعث مردے پر عذاب ہوتا ہے'' اور قرآن میں ہے لاتزر وازرۃ وزر اخری ''کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا''

ذیل میں مثالوں کے ضمن میں حدیثیں نقل کی جارہی ہیں۔ اس تعلق سے دو باتیں سامنے رہے۔ تمام حدیث جو نقل کیا جارہا ہے وہ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہو ضروری نہیں بلکہ مشق کے طور پر طلبہ نے حدیث کی کتابوں سے ان کو نوٹ کیا تھا، ہاں یہ ہوا تھا کہ طلبہ نے ان احادیث کو ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کیا تھا۔ تمام احادیث کے Classification پر ڈاکٹر صاحب کے تصدیق کی مہر لگی ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ دوسری بات کے حدیث کا حوالہ اور پورا متن یہاں پر درج نہیں ہوا ہے۔

■ حدیث اور فقہ دونوں مضمون کے تحت ڈاکٹر صاحب نے ذیلی عنوان تاریخ بھی لکھوایا تھا۔ لیکن نوٹ بک میں اس پر کچھ تحریر بھی نہیں ہے۔ یا تو آپ نے اس پر کچھ نہیں فرمایا، یا نوٹ ہونے سے رہ گیا۔

■ یہ عنوان ذیلی عنوان کے تحت نہیں لکھوایا تھا، لیکن نوٹ بک میں یہ موجود ہے۔ اس میں خاص کر راوی کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کی ہے اس لئے اسے الگ ذیلی عنوان کے تحت دیا جارہا ہے۔

زائد از قرآن اور Authority کی مثالیں:

- قرآن میں صرف دوسگی بہنوں کو ایک ساتھ اپنی زوجیت میں رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے مگر حدیث میں خالہ، بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ اپنی زوجیت میں رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے۔
- ''جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی پڑھائے اس لیے کہ ان میں کمزور بیمار اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں۔ اور جب خود تنہا پڑھے تو جتنی چاہے لمبی اور طویل پڑھے۔'' (زائد از قرآن)
- میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا اور اس بات کا ارادہ کرتا ہوں کہ نماز کو دراز اور طویل کرونگا، پھر کسی بچے کے رونے کی آواز سن لیتا ہوں اور اپنی نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ یہ بات اس کی ماں پر شاق گذرے گی: بخاری (زائد از قرآن)
- حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت سردی کے ایام میں جمع کی نماز سویرے پڑھتے اور سخت گرمی میں دیر سے پڑھتے''
- ''حضرت عثمانؓ کہتے ہیں: تم میں سے بہتر ین شخص وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا'' (بخاری)
- ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ! میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں، آپؐ نے فرمایا، ہر روز ستر دفعہ (بخاری)
- مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔نہ اس سے خیانت کرے، نہ اس سے جھوٹ بولے اور نہ اس کو رسوا اور شرمندہ کرے۔ (Authority)
- ''مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے، اس کی عزت وآبرو، اس کا مال اور اس کا خون'' (Authority)
- ''تقویٰ اس جگہہ ہے'...(حضورؐ نے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا)'' (Authority)
- انسان کے لئے یہ خرابی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر وذلیل سمجھے۔ترمذی (Authority)
- ''مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری دے دو'' (Authority)
- ''خدا کی قسم وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جس کا پڑوسی اس کی تکالیف سے محفوظ نہ ہو'' (Authority)
- تیر کی نوک کو اندر رکھو۔
- ریشم، دیبا اور حریر کو مردوں کے لئے آپ نے حرام قرار دیا۔ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار پھینکی۔

اجمال کی تفصیل بیان کرنے والی حدیثوں کی مثالیں:

- قرآن میں ہے، ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی. یا ایھاالذین آمنوا صلوا علیہ وسلمو اتسلیما (الاحزاب:۵۶) ''بے شک اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو''۔
  یہ حکم جب نازل ہوا تو متعدد صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! سلام کا جو طریقہ آپؐ بتا چکے ہیں یعنی نماز میں ''السلام علیک یا ایھا النبی ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'' اور ملاقات کے وقت السلام علیک یارسول اللہ کہنا کیا اس کے علاوہ بھی صلوٰۃ و درود بھیجنا ہے۔اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو درود سکھائے وہ یہ ہے (کعب بن عمرؓ۔راوی) اللھم صلی علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید وبارک علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید۔
- سورہ الاحزاب:۴۰ میں فرمانِ الٰہی ہے: ماکان محمد ابا احد من رجالکم، ولکن رسول اللہ وخاتم النبین

. و کان اللہ بکل شئ علیما ۔(لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پاجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا، مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے۔

● سورہ الانشقاق: ۷۔۸ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فاما من اوتی کتبہ بیمینہ . فسوف یحاسب حسابا یسیرا ۔ ''تو جس شخص کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا گیا اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''حساب یسیر'' کے معنی تو عرض کرنے (پیش کرنے) کے ہیں یعنی اعمال نامہ اس کے سامنے رکھ کر صرف جتلا دیا جائے گا کہ تو نے فلاں فلاں عمل کیا ہے مگر اس پر باز پرس نہ ہوگی۔ اگر کسی سے یہ سوال کرلیا گیا کہ یہ کام کیوں کیا تو بے شک اس کی خیر نہیں''۔

خلاف قرآن:

جو حدیثیں قرآن کی آیت کے خلاف ہیں وہ قابل رد ہیں:

اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے اس حدیث کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا ہے کہ ابراہیمؑ زندگی میں تین بار جھوٹ بولے، ایک بت کو توڑنے کے وقت، دوسرے زائچہ کے تعلق سے اور تیسری دفعہ بیوی کو بہن کہتے وقت۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ حدیث خلاف قرآن ہے کہ قرآن کے مطابق انبیاء جھوٹ نہیں بولتے۔ اسی موقع پر اسلوبؐ کے متعلق ایک اہم نکتہ بیان فرمایا کہ سوال اور طنز جھوٹ نہیں ہوتا۔

دوسری اس حدیث کا تذکرہ کیا جس میں کہا گیا ہے کہ پندرہویں شعبان (شب برات) کو اللہ تعالیٰ زمین کے فرش پر آکر کہتا ہے کہ کون ہے جو مانگے، ہے کوئی مانگے روزی۔ یہ بات کاپی میں نوٹ ہونے سے رہ گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے خلاف قرآن ہونے کے لئے کیا دلیل دی تھی۔ البتہ یہ بات نوٹ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس حدیث کے راوی کی غیر ثقاہت کا بھی تذکرہ کیا تھا۔

مطالعہ فقہ

مرحلہ اول: تعریف، ضرورت واہمیت، اور مختصر تاریخ■

ڈاکٹر صاحب نے مرحلہ اول کے نکات لکھانے کے بعد فرمایا تھا کہ '' Definition کے چکر میں مت پھنسیے●''۔

■ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ پر شاید کچھ نہیں فرمایا۔

● دراصل ڈاکٹر صاحب معروف معنوں میں ''تعریف'' (Definition) کے قائل نہیں تھے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر متعدد مواقع پر ابھر کر سامنے آتا تھا کہ تعریف کا الجھاؤ ''شئے کی حقیقت'' کو سمجھنے میں حارج ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ ایسے اسلوب کو اختیار کرتے ہیں اور ان الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو سامع تک ترسیل میں کامیاب ہو۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوب اور انتخاب الفاظ الگ عنوان ہے۔ یہاں پر ایک مثال بے محل نہیں ہوگا۔ فرمایا ماں اپنے بچے کو آگ کی خطرناکی بتاتے ہوئے اسے آگ کے پاس جانے سے روکتی ہے اور کہتی ہے اسے مت چھونا نہیں تو ''اُوہو'' ہوجائے گا۔ بچہ ماں کی بات کو مان کر نہیں دیتا ہے اور موم بتی کی لو کو چھو لیتا ہے، تب اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ ''اُوہو'' کیا ہے؟ اسے شئے کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے۔ اس مثال میں دو باتیں ہیں ایک تو ماں کا معیاری لفظ کے بجائے ترسیل کے لئے ایک کامیاب لفظ کا انتخاب اور دوسرے بچے کا اپنا تجربہ۔ (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

فقہ کے معنی ہیں دین کی سمجھ۔ خاص طور پر یہاں مراد ہے دین کے قانون کی سمجھ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجتے ہوئے ان سے پوچھا، وہاں تمہارے سامنے معاملات آئیں گے تو فیصلہ کیسے کروگے؟ انہوں نے کہا، ہم کتاب اللہ میں دیکھیں گے، آپؐ نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ انہوں نے کہا، ہم سنت رسول اللہ میں ڈھونڈھینگے، آپؐ نے فرمایا اگر اس میں بھی نہ ملا تو؟ انہوں نے کہا، پھر ہم اجتہاد کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب پر خوشی میں ہی اللہ کا شکر ادا کیا۔

مرحلہ دوم:

فقہ کی جان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے۔ اختلاف امتی رحمت لھم ''میری امت کا اختلاف ان کے لیے رحمت ہے''...اس اختلاف سے مراد فقہی اختلاف ہے جو نفسانیت پر نہیں بلکہ دیانت داری پر مبنی ہو۔ اللہ اور رسولؐ نے کسی کم علمی کی وجہ سے نہیں بلکہ پورے علم کے ساتھ کچھ چیزوں کا یا تو ذکر ہی نہیں کیا یا کچھ چیزوں کا ذکر کیا ہے تو اس انداز میں کہ ایک ہی بات سے کئی کئی مفہوم نکلتے ہیں۔ یہیں آ کر مفہوم کے تعین میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ (اس موقع پر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا تین طلاق کے تعلق سے اختلاف کا ذکر کیا)۔ ان میں سے ہر مفہوم حق ہے بشرطیکہ اس مفہوم کے غلط ہونے کی دلیل دوسری نص میں نہ پائی جاتی ہو۔ ایسا اس لیے رکھا گیا ہے کہ ہمارا دین قیامت تک کے لیے ہے اور مکمل کر دیا گیا ہے۔ جو قانون سازی بے لچک ہوتی ہے اس کا دائرہ وقت اور جگہ کے لحاظ سے محدود ہوتا ہے اور جو State جتنا وسیع ہوتا ہے اتنا ہی اس کو اپنے قانون میں لچک رکھنی پڑتی ہے، اور اگر لچک رکھنا اس کے بس میں نہ ہو تو پھر وہ اپنے قانون کو بار بار بدلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اللہ کو ان سب حالات کا علم ہے جو وقوع پذیر ہونگے، اس لیے اس نے اپنے قوانین میں جو کتاب وسنت پر مشتمل ہیں، ایسی لچک رکھی ہے جو ہر دور اور ہر حال میں اپنے اپنے دور کے مجتہد اجتہاد کر کے مناسب رہنمائی حاصل کر لیں۔ مثلاً طریقہ انتخاب امیر ونمائندگان کی کوئی شکل شریعت نے متعین نہیں کی، اس معاملے میں امت آزاد چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے دور میں تمدنی وسائل اور حالات کے پیش نظر جو انسب طریقہ سمجھے اختیار کرے۔ یا مثلاً شراب یا جوئے کی کوئی متعین شکل نہیں بتائی گئی ہے، اس لیے کہ قیامت تک پتہ نہیں کتنی نشہ آور چیزیں استعمال میں لائی جائیں گی اور جوئے کی کتنی پرفریب شکلیں ایجاد کی جائیں گی۔

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کے دو جملے کاپی میں اور نوٹ ہیں جن کو نقل کر دیا جاتا ہے۔

''فقہ سے اجتہاد کا دروازہ کھلتا ہے اور اجتہاد قوموں کو سربلندی کی طرف لے جاتا ہے۔''

''وہ اجماع معتبر ہوگا جس پر پہلے سے کتاب وسنت میں کوئی دلیل موجود ہو۔ ورنہ محض ہوائے نفسانی سے کسی شئے پر جمع ہونا اجماع نہیں ہے۔''

اس لئے ڈاکٹر صاحب ایک جانب گہرے مضامین کو سمجھانے کے لئے اصل مثال ریکارڈ ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ ''تقدیر'' کا مسئلہ بڑا پیچیدہ رہا ہے۔ اس کو سمجھاتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا کہ ٹارچ کی جو بیٹری ہوتی ہے اگر اس کو مسلسل استعمال کیا جائے تو اس کی مدت عمر چوبیس گھنٹے ہے۔ اب یہ استعمال کرنے والے کے اوپر منحصر ہے کہ اس کو احتیاط اور ضرورت کے مطابق استعمال کرے گا یا بد احتیاطی سے اور بلاضرورت استعمال کرے گا۔ انہیں معنوں میں مہلت عمر متعین بھی ہے اور اچھے اعمال سے زندگی بڑھتی بھی ہے۔

مطالعہ تاریخ اسلام

تعریف: تاریخ اسلام سے مراد پوری تاریخ انسانی ہے (جس میں اسلام Involve رہا ہو)

مقاصد مطالعہ: اس کا مقصد عبرت اور دوسرا مقصد سبق ہے۔ (یہاں پر بھی ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''تعریف کے چکر میں مت پڑیئے'') عبرت سے مراد یہ ہے کہ پچھلے ادوار میں جو غلطیاں کی گئی ہیں ان سے بچنے کا ذہن پیدا ہو اور سبق سے مراد یہ ہے کہ پچھلے تاریخی تجربات کی روشنی میں ہم اپنے لیے کوئی مثبت پروگرام اور لائحہ عمل طے کرسکیں۔

مطالعہ تاریخ کیسے کریں: سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل پر فرد جرم (Charge Sheet) عائد کرتے ہوئے جس انداز میں ان کی ملی تاریخ بیان کی گئی ہے اسی نمونے پر تاریخ کا مطالعہ ہونا چاہئے۔

مطالعہ نظریات

اصلاً نظریات دو ہی ہوسکتے ہیں___ حق یا باطل

نظریات حق و باطل کی تمیز کی کسوٹی: اسلام کے مطابق پوری کائنات نظم کے لحاظ سے ایک وحدت ہے، ایک اکائی ہے اگر چہ بہت پھیلی ہوئی ہے اور بظاہر منتشر ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی بھی ایک وحدت اور ایک کل ہے چاہے وہ کتنی ہی وسیع الاطراف اور کتنے ہی شعبوں میں منقسم ہو۔ نظم کی یہ وحدت اس کے خالق کی ہدایت پر قائم ہے۔ اس لیے کوئی ایسا نظریہ جو انسانی زندگی کو مختلف خانوں میں بانٹ کر ان کو علحدہ علحدہ نظموں کا پابند کرتا ہو یا اس کے خالق کی ہدایت سے بے نیاز کسی اور اصول پر اس کی وحدت کی بنیاد رکھتا ہو یا اس کے خالق ہی کی ہدایت پر اس کی پوری زندگی کو نہیں بلکہ اس کی زندگی کے صرف ایک یا چند شعبوں کو یا ایک یا چند مسائل کو حل کرنا چاہتا ہو تو ایسا ہر نظریہ باطل ہوگا۔ حق صرف وہی ہوگا جو پوری زندگی کو ایک وحدت قرار دے کر خالق کی مکمل ہدایت کا پابند بنانا چاہتا ہو۔

باطل کی طرف دعوت دینے کے شیطانی ہتھکنڈے: دنیا میں بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تجربہ کرادیا کہ شیطان انہیں کس طرح اور کن راہوں سے بھٹکائے گا۔ چنانچہ شیطان نے ان کو الٹی پٹی پڑھائی کہ اگر وہ شجر ممنوعہ سے کھالیں گے تو یا تو وہ فرشتہ ہوجائیں گے یا ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کے واضح فرمان کے خلاف تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے بتا دیا تھا کہ اس درخت کے قریب بھی جاؤ گے تو ظالموں میں سے ہوجاؤ گے۔ دوسرے یہ کہ ایسا نہ ہو کہ شیطان تم کو جنت سے نکالنے میں کامیاب ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ فرشتے ظالم نہیں ہوتے۔ فرشتے اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتے، وہ تو صرف اس کے حکم کے مطابق ہی کرسکتے ہیں، اور درخت کے پھل کو کھاتے ہی اللہ کے حکم کی نافرمانی ہوتی تھی، پھر فرشتہ بننے کا کہاں سوال پیدا ہونا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہیں جنت سے نکالنے میں کامیاب نہ ہونے پائے۔ اور حضرت آدمؑ نے شیطان کو شیطان جاننے کے باوجود اس کا کہنا مانا یعنی کہ جنت سے نکلنے کا سامان کیا۔ یہ دونوں شیطان کی الٹی پٹی تھی جس سے آئندہ وہ دنیا میں کام لینے والا تھا اور لے رہا ہے۔

دوسری بات یہ کہ شیطان نے آدمؑ کی دو کمزوریوں کو بھانپ لیا اور انہیں بنیاد بنا کر ان کو باطل کی طرف راغب کیا۔ ایک کمزوری تو یہ تھی کہ انسان یا تو مذہبیت میں غلو کرتا ہے جس کو وہ روحانیت سے تعبیر کرتا ہے یا دنیا سے لطف اندوزی میں غلو کرتا ہے جس کو مادہ پرستی کہتے ہیں۔ چنانچہ شیطان نے دونوں ہی کمزوریوں سے اپیل کیا تا کہ یا تو حضرت آدمؑ مذہبیت کی طرف مائل ہوں تو روحانیت کے نقطۂ نظر سے فرشتوں کو معیار سمجھ کر فرشتہ بننے کی کوشش کریں یا ''کھاؤ، پیو اور موج کرو'' کی طرف راغب ہوں تو بے محنت اور بے مشقت کے کھانے پینے کی جگہ یعنی جنت میں رہنے کے خیال سے باطل کو قبول کرلیں جس کی طرف شیطان دعوت دے رہا تھا۔

راہ باطل پر چل پڑنے کے بعد تنبیہہ کرنے والی علامتیں:

راہ باطل پر چلنے کے بعد دو علامتیں سامنے آئیں (۱) برہنگی (۲) بے حیائی

جس کا مطلب یہ ہوا کہ جب کسی قوم کے اندر برہنگی اور بے حیائی کی طرف میلان پیدا ہونے لگے تو اس کے صالح عنصر کو ہوشیار ہو جانا چاہئے کہ ہماری اجتماعی گاڑی باطل کی پٹری پر چل پڑی ہے، لہذا ہم کو اس پر سے اتر جانا چاہئے۔

اختتامی تقریر

بعد حمد وثنا: تربیت جیسی بھی ہو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ آپ اب تک جو تربیتی اجتماعات چلاتے رہے ہیں اس کا بھی ایک مقصد تھا۔ ہر تحریک کے دو دور ہوتے ہیں۔ پہلا دور تحریک کے تعارف، کارکنوں کی تیاری اور تحریک کو برپا کرنے کا ہوتا ہے اور دوسرا دور مسائل زندگی کو حل کرنے کا ہوتا ہے۔ آپ پہلے دور کو طے کیا چاہتے ہیں۔ دوسرا دور مستقبل قریب میں سایہ فگن ہونے والا ہے۔ دوسرے دور میں کوئی تحریک فیل ہو جاتی ہے تو ہمیشہ کے لیے فیل ہو جاتی ہے۔ سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔

آپ کو دو مرحلے سے گذرنا ہے۔ ایک تو جو مسائل آ جائیں ان کو فوراً Tackle کریں۔ آئندہ دور میں جو مسائل آنے والے ہیں ان کو پہلے ہی سے حل کر لیا جائے۔ دوسرے آئندہ نسل کو تیار کرنا ہے۔ لہذا آپ کے سامنے جو مسائل آئیں آپ انہیں حل کرلیں اور آئندہ نسل کو تیار کردیں۔ آئندہ دور کے مسائل کے لیے آپ کو Advance تربیت کرنی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی تربیت کی ہے۔ تعلیم کے معاملے میں ہم نے وہاں سے رہنمائی حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ Tough کو آسان لذیذ بنادیں۔ اگر ایسا کرنا چاہیں تو یہ اتنا مشکل نہیں ہے۔ مشکل ضرور ہے، مگر بہت مشکل نہیں ہے۔ میری دلی خواہش تو یہی ہوگی کہ آپ ایسا پروگرام بنائیں کہ اس کو Tackle کرسکیں۔

نصاب کے سلسلے میں چند مشورے:

(۱) کوشش یہ کریں کہ ہر لڑکا Involve رہے۔

(۲) شوق اور جذبہ لڑکوں کے اندر خود پیدا ہو۔ اس لیے انڈیلنا نہیں ہے بلکہ ابھارنا ہے اندر سے۔

(۳) اس بات کی کوشش کریں کہ لڑکے Theoretical سے زیادہ Practical بنیں۔

(۴) بے کردار عالم مت بنایئے۔ جتنا Knowledge (علم) Impart کریں اتنا عمل پر ابھاریئے۔ Knowledge وہاں پر Stop کردیں جہاں پر عمل ختم ہو جائے۔

اس نصاب کی بنیاد پر حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے متعدد چار روزہ اجتماعات ہوئے۔ ان اجتماعات میں اس نصاب کو روبہ عمل لانے کے ساتھ ہی اس کی بنیاد پر Home Task بھی طلبا کو دیے جاتے رہے۔ اس کے کچھ نمونے Subject-vise ذیل میں درج ہیں:

مشق (Home Task)

قرآن:

(۱) سورہ آل عمران کا مطالعہ اس طرح کرنا ہے کہ مطالعہ کے دوران ان آیات کی نشاندہی کی جائے کہ کہاں کہاں اللہ تعالیٰ ہم سے مخاطب ہے اور کہاں کہاں ہم اس سے مخاطب ہیں۔

(۲) قرآن سے دس مفرد اور دس مرکب کردار تلاش کریں۔

(۳) قرآن سے ایسے دس الفاظ منتخب کریں جو بظاہر زائداز ضرورت محسوس ہو۔

(۴) قرآن سے دس ایسے مقامات کا انتخاب کیجئے جہاں آیات کے درمیان خلاء محسوس ہوتا ہے۔

(۵) پانچ مثالیں ایسی دیجئے جن میں سے ایک ہی آیت میں مختلف انداز خطاب ہے۔

(۶) الم نشرح تاالناس کی مشق اس طرح کریں کہ ان سورتوں کو پڑھتے وقت ہر آیت کا مفہوم ذہن میں آتا چلا جائے۔

(۷) مطالعہ اس طرح کریں کہ اللہ سے ہم کلامی ہو رہی ہے۔اس میں اللہ کی طرف جو کہا جا رہا ہے وہ اللہ ہم سے کہہ رہا ہے اور جو بات بندے کی طرف سے کہی جا رہی ہے وہ میں کہہ رہا ہے۔

(۸) قرآن میں ہر طرح کے کردار کی تفصیل ہے تو جب قرآن کا مطالعہ کریں تو کردار کو ڈھونڈیں (مشق دو کردار کو ڈھونڈو)

(۹) قرآن میں تلاوت کرنے کا بھی ذکر ہے۔فیہ ذکرکم۔ (مشق ۳۰ پاروں میں اپنے ذکر کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنا)

حدیث :

(۱) دس حدیثیں ایسی منتخب کیجئے جو قرآن کے مطابق ہیں۔

(۲) دس ایسی حدیثیں منتخب کریں جو زائداز قرآن ہوں مگر قرآن کے خلاف نہ ہوں۔

(۳) دو ایسی حدیثیں منتخب کریں جو قرآن کے خلاف ہوں۔

(۴) دس ایسی حدیثیں منتخب کیجئے جو اگرچہ قرآن کے خلاف تو نہ ہوں مگر راوی بھی ثقہ نہ ہوں۔

فقہ :

(۱) دس مسئلہ ایسا منتخب کریں جو قرآن وحدیث میں نہیں ہے لیکن فقہاء نے قرآن وحدیث کی اسپرٹ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے قیاس سے بیان کیا ہے۔

(۲) قرآن کی ایسی پانچ آیتیں منتخب کیجئے جن میں سے ہر ایک آیت سے فقہی مسائل نکالنے کے سلسلے میں ایک سے زیادہ مفہوم نکالنے کی گنجائش ہو۔

تاریخ اسلام :

(۱) قرآن میں مختلف امتوں کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ان میں سے پانچ مقامات کا انتخاب کر کے یہ بتایئے کہ کس رویہ کا کیا انجام دنیا میں سامنے آیا؟

مطالعہ نظریات :

حق وباطل کے سامنے میں کوئی تین نظریہ پیش کیجئے اور اس بات کی نشان دہی کیجئے کہ وہ نظریہ کیسے حق اور کیسے باطل ہے؟

☆☆☆

خطوط

تقریباً چالیس (۴۰) صفحات پر مشتمل اس حصہ میں خطوط ہیں۔ ان میں زیادہ تر خطوط خود ڈاکٹر صاحبؒ کے پاس محفوظ تھے۔ ان خطوط کو تاریخ کی امانت سمجھ کر من و عن شائع کیا جا رہا ہے۔

اس مجلہ کے لئے تأثراتی خطوط

جناب سراج الحسن صاحب، امیر جماعت اسلامی ہند کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنگلور

۱۱/۷/۲۰۰۲ء

برادر مکرم زید مجدکم!

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا گرامی نامہ مورخہ ۱/جولائی بہ سلسلہ ایک تاثراتی مضمون ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم کی یاد میں نکالے جانے والے ''نذر ضیاء الہدیٰ'' نامی یادگار مجلّہ کیلئے موصول اور نظر نواز ہوا۔ عرصہ کے بعد آپ کی تحریر نظر سے گذری، مسرت ہوئی جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ افسوس کہ مضمون نگاری کی صلاحیت سے مرحوم ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے یقیناً ہمارے تعلقات برسوں سے رہے ہیں لیکن بہت زیادہ گہرے اور قریبی نہیں البتہ موصوف کی سادہ زندگی اور انکے تقویٰ وطہارت کے بارے میں ضرور قریبی احباب سے سنتا رہا ہوں اور قلب میں احترام اور محبت کے جذبات بھی پاتا رہا ہوں اور اب بھی ان میں تازگی ہی محسوس کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے، اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت کرے۔ آمین

میں ۱۹/جون سے دہلی سے باہر ہوں، بورڈ کے اجلاس میں شرکت کیلئے دہلی سے مرکزی احباب کے ہمراہ نکلا تھا، اجلاس کے بعد گھر چلا آیا۔ صحت کی ناسازی کی وجہ سے ماہ ستمبر کے وسط تک یہیں رہوں گا احباب اور اہل خانہ تک سلام خلوص پہونچادیں۔

والسلام مخلص

سراج الحسن

جناب شفیع مونس صاحب، نائب امیر جماعت اسلامی، ہند کا خط

مرکز جماعت اسلامی ہند

نئی دہلی

۲۱ر جولائی ۲۰۰۲ء

برادر محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کے حسب خواہش مرحوم ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب سے متعلق میرے تاثرات مختصراً ذیل میں درج ہیں۔

مرحوم ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب سے میری پہلی ملاقات جون ۱۹۴۶ء میں بمقام پٹنہ (بہار) ہوئی۔ وہ اپنی جوانی میں ہی جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ڈاک وتار کے محکمے میں ان کی سرکاری ملازمت تھی جس سے جماعت اسلامی کے ساتھ وابستگی کی بنا پر علیحدگی ہو گئی تھی۔ انہیں جماعت کے حلقہ مدراس (موجودہ حلقہ تمل ناڈو) کا امیر مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن کچھ تو اپنی خرابی صحت کی بنا پر اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ طبعاً وہ کفاف پر جماعت کی خدمت کو پسند نہیں کرتے تھے، امارت حلقہ سے سبکدوشی کی انہوں نے درخواست کی جسے مرکز نے منظور کرلیا۔ وہاں سے واپس آکر انہوں نے ہومیوپیتھی کے ذریعہ علاج معالجے کو اپنی معاش کا ذریعہ بنایا۔ لیکن جماعت کے کاموں میں ان کی مصروفیت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور معاشی طور پر فراخی کی زندگی نہ گزار سکے۔

ڈاکٹر صاحب ایک عرصے تک بہار کے امیر حلقہ بھی رہے اور مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بھی۔ اپنے تحریکی ساتھیوں کی تربیت کے معاملے میں ان کی خدمات کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ان کی خداترسی وسادگی کا جماعت کے سرکل سے باہر بھی بہت اچھا اثر تھا۔ البتہ تنظیمی صلاحیت بہت نمایاں نہ تھی۔

اب سے کوئی پندرہ بیس سال پہلے جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اس مسئلے پر غور کیا تھا کہ پارلیمانی الیکشن کے سلسلے میں اس کی کیا پالیسی ہوگی۔ دینی وواقعاتی نقطۂ نظر سے جو اصول طے کئے گئے وہ جماعت کے درمیان متفق علیہ تھے۔ لیکن اس کے بعد ایک عرصے تک اس سلسلے میں شوریٰ کے درمیان اور اس کے باہر بھی افراد جماعت کے درمیان بحث ومباحثہ ہوتا رہا۔ کچھ طبیعتوں پر اس کا خراب اثر پڑا جن میں مرحوم ڈاکٹر صاحب کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب مضطرب ہوتے گئے اور آخر کار جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو جانے کے بعد ایک محدود حلقے میں ان کی دعوتی وتربیتی مساعی کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات کو شرف قبول بخشے اور بہشت بریں میں نمایاں مقام عطا فرمائے۔

والسلام

محمد شفیع مونس

☆☆☆

جماعت اسلامی کی پالیسیوں سے متعلق خط و کتابت

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا خط مولانا محمد یوسفؒ کے خط کے جواب میں

۲۸ رجنوری ۱۹۷۴ء

برادر عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اصولی حیثیت سے میری رائے اب بھی یہی ہے کہ ایک لادینی ریاست میں لادینی دستور کے تحت حکومت کا انتظام چلانے اور پالیسیاں بنانے کے لیے جو پارلیمنٹ یا مجلس قانون ساز بنے اس میں حصہ لینا مومن کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ شرکت اس کی حکم رانی کو امر واقعہ کے بجائے اسے امر جائز تسلیم کرنے کے ہم معنی ہوگی، اور یہ چیز ہمارے دین میں صحیح نہیں ہے۔ امر واقعہ کو تو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ واقعی امر کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، اور اس کے امر واقعی ہونے کے جو تقاضے ہیں انہیں بھی ہم پورا کرتے ہیں، یعنی اس کے قواعد وضوابط کی پابندی کرتے ہیں اور اس کے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ لیکن اسے امر جائز مان لینا اور اس کے چلانے میں حصہ لینا اس پوری دعوت کے خلاف ہے جو ہم اقامت دین کے لیے دیتے ہیں، اور اس تضاد کو ہر وہ شخص محسوس کرے گا جو ایک طرف ہماری دعوت کو اور دوسری طرف ہمارے عمل کو دیکھے گا۔

عملی حیثیت سے بھی حصہ لے کر ہم ایک طرف دوسرے عناصر سے انتخابی الجھنوں میں پھنس جائیں گے جو ہماری دعوت کے پھیلنے میں رکاوٹ بنے گا، اور دوسری طرف ہم مسلمانوں کے قومی مفاد کی کشمکش سے وابستہ ہوجائیں گے جس کے متعلق میں نے مدراس کی تقریر میں توجہ دلائی تھی کہ اب یہ اسلامی دعوت کی راہ میں پھر وہی رکاوٹیں ڈال دے گی جو پہلے سے رہی ہیں اور خود مسلمانوں کے مفاد کی بھی کوئی قابل لحاظ خدمت نہ انجام پاسکے گی۔

انتخابات میں حصہ لینے کی اگر کوئی صورت ہوسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم اس کے ذریعے سے نظام حکومت کو تبدیل کرنے کی امید کرسکتے ہوں، لیکن اس کے آثار ابھی دور دور کہیں نظر نہیں آتے ہیں۔ اس کا امکان تو اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم دعوت عام کے ذریعے سے آبادی کے بہت بڑے حصے کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔

لوکل باڈیز کا جو دائرہ کار ہے اسے دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے انتخابات میں حصہ لیا جاسکتا ہے، کیونکہ لادینی نظام کے قیام یا عدم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ اس پہلو پر غور کرلینا چاہیے کہ آیا یہ ہمارے اثرات بڑھانے کا ذریعہ بنے گا یا انتخابی مقابلوں سے جو تلخیاں پیدا ہوا کرتی ہیں وہ توسیع دعوت میں رکاوٹ بن جائیں گی؟ اس کا فیصلہ مقامی حالات کو دیکھ کر وہی لوگ کرسکتے ہیں جو برسر موقع موجود ہوں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

ضیاءالہدیٰؒ کا خط مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کے نام

۸۵/۵/۲ء

مولانائے محترم		السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ایک عریضہ محترم امیر جماعت کی خدمت میں اس سے پہلے پیش کر چکا ہوں جس کی نقل آپ کو بھی بھیجی تھی مگر اندازہ ہوا کہ وہ آپ تک نہیں پہنچ سکی اور یہ معلوم ہوا کہ آپ شدید علیل ہیں جس کی وجہ سے مجھے تردد بھی ہے۔ خدا کرے کہ آپ صحت یاب ہو چکے ہوں۔ مجھے اس وقت آپ کی رہنمائی کی شدید ترین ضرورت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کو آپ کی تحریر میں بھی اور بالمشافہ ملاقات میں بھی فقہی عالم نہیں پایا جس کا کام رخصتیں اور جواز فراہم کرنا رہ گیا ہے، بلکہ اسلامی انقلاب کا [illegible]۔

اب دوسری عرضداشت امیر جماعت کی خدمت میں بھیج رہا ہوں جس کی نقل بھی اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ مجھے ایسا سننے میں آیا کہ شوریٰ کے تازہ فیصلے کے سلسلے میں آپکا خیال بدل گیا ہے یعنی پہلے آپ اس کو عقیدے کا مسئلہ سمجھتے تھے اور اب ایسا نہیں سمجھتے ہیں۔

۶۷ء کا فیصلہ مجمل تھا جس کے سلسلے میں جماعت اسلامی کی شوریٰ پر بجا طور پر اعتماد کرنا چاہیئے تھا کہ وہ اس فیصلے کو کتاب وسنت کی حدود میں نافذ کریگی۔ جیسا کہ عملاً ۷۷ء میں اس نے کیا بھی اور ناگزیر حد تک ہی کیا لیکن اس فیصلے کی بنیاد پر اب جو فیصلے کئے گئے ہیں وہ صریح طور پر اپنے حدود سے تجاوز ہیں اور شوریٰ جس رخ پر چل رہی ہے اب اس کو حاکمیت الٰہ کے بجائے عملاً حاکمیت جمہور کی منزل تک جانے سے کوئی نہیں روک سکتا، الا یہ کہ نمایندگان روک دیں جس کی راہ بھی بند ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ ابھی آپ کی رہنمائی کی ہم کو سخت ضرورت ہے۔

والسلام

ضیاءالہدیٰ

☆☆☆

ضیاءالہدیٰؒ کا خط حامد حسینؒ (سابق سکریٹری جماعت اسلامی، ہند) کے نام

۸۵/۵/۲

اے طائر لاہوتی		تجھ پر سلامتی ہو

امیر محترم کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کر رہا ہوں جس کی نقل آپ کے مطالعے کے لئے منسلک ہے۔ میں اپنے سابقہ خط کے جواب کا تو منتظر ہی رہا۔ شاید اس خط کا بھی وہی انجام ہو۔ ویسے میں آپ سے خوش گمان ہوں۔

والسلام

ضیاءالہدیٰ

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ کا خط امیر جماعت اسلامی، ہند کے نام

۸۵/۵/۲ء

محترم امیر جماعت اسلامی ہند السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اپنی علمی کم مائیگی کے پورے احساس اور آپ کی دینی بصیرت، اصابت رائے اور معاملہ فہمی کے پورے شعور اور اعتراف کے باوجود اور آپ کے حلم اور بردباری کا جو مشاہدہ میں کرتا رہا ہوں اس کے پیش نظر میں کچھ معروضات ذیل میں پیش کرر ہا ہوں جو دراصل میرے احساسات کی ترجمانی ہیں اور اس لئے ہوسکتا ہے کہ ان کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں کہیں کہیں مروج حدود آداب سے تجاوز ہو جائے لیکن اسلامی حدود وآداب سے تجاوز انشاء اللہ نہیں ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ بسیار گوئی میری عادت نہیں ہے۔ اس لئے نکات ہی پیش کرونگا جن میں بہت سی باتیں ایسی ہوں گی جن کا آپ کو بھی علم ہوگا اور ایسی باتیں بھی ہوں گی جن کا علم آپ کو اب تک نہ ہوا ہو۔

امت کے بحر الکاہل میں تحریک اسلامی ایک دھارا (Current) کی شکل میں چلی تھی جس کا سرچشمہ حاکمیت الٰہ اور خلافت جمہور کا عقیدہ اور اس کو عملاً قائم کرنے کی کوشش تھا۔ کچھ دور اور کچھ دیر تک تو یہ دھارا اپنی رفتار سے چلتا رہا مگر آہستہ آہستہ اس میں اضمحلال آنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیز چھوڑی تھی ایک الجماعت اور دوسری امت۔ الجماعت تو کب کی ختم ہوگئی لیکن امت باقی رہی اور باقی رہے گی۔ امت میں سب طرح کے لوگ رہے ہیں یہاں تک کہ عبداللہ بن ابی بھی جماعت ہی میں شامل تھا۔ یہ امت تو موجود ہے اس لئے امت کے اندر کوئی امت نہیں بنائی جاسکتی تھی مگر چونکہ الجماعت باقی نہیں رہی تھی اس لئے امت میں سے باشعور لوگوں کی اولین ذمہ داری تھی کہ وہ الجماعت کو وجود میں لائیں۔ اس سلسلے کی کوششوں میں سے ایک کوشش جماعت اسلامی کی تشکیل تھی جو الجماعت بننے کے رخ پر بڑھ رہی تھی، اس لئے یہ بالقویٰ الجماعت تھی اور اسی لئے ہر اس مسلمان کے لئے جو اپنے ایمان کی خیر چاہتا تھا ایسی کسی دوسری جماعت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس جماعت میں شریک ہونا لازمی تھا، لیکن یہ شرکت الجماعت میں ہوتی نہ کہ محض جماعت میں۔ ہم کو الجماعت کے ساتھ وابستگی کا پابند کیا گیا ہے نہ کہ محض جماعت نام کی کوئی جماعت کا۔ کہا گیا علیکم بالجماعت یہ نہیں کہا گیا ہے کہ علیکم بجماعت۔ اگر جماعت اسلامی بھی اسی سطح پر پہنچ جائے جس سطح پر مسلمانوں کی دوسری جماعتیں ہیں اور اپنی بنیادی خصوصیت کھو بیٹھے تو پھر اس کے ساتھ وابستگی فرض نہیں رہ سکتی۔ اور اگر اسی سطح پر ابتداءً بنتی تو جمعیۃ العلماء کی موجودگی میں اس کی تشکیل میرے خیال میں موجب ثواب نہیں ہوتی۔

والسلام
ضیاء الہدیٰ

سید عروج قادریؒ کا خط ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ کے نام

باسمہ تعالیٰ

۸۵/۳/۱۱

برادر مکرم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا۔ اس کا تفصیلی جواب تو زبانی ہی مناسب ہوگا۔ مختصراً چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ ووٹ کے مسئلے پر وسط نومبر ۸۴ء میں جو ہنگامی اجلاس ہوا تھا یاد آتا ہے کہ شاید آپ اس میں شریک تھے۔ یا ممکن ہے اس وقت بھی شریک نہ ہوئے ہوں۔ اس اجلاس میں سابق امیر جماعت نے ڈیڑھ دنوں تک اپنا تحریری اظہار خیال کیا تھا اور پابندی نہ اٹھانے کے سلسلے میں دلائل کی کوئی کسر انہوں نے نہیں چھوڑی تھی لیکن اس کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑا جو اس پابندی کو ہٹانے کے حق میں تھے جب اس پر ارکان کی رائے لی گئی تو نتیجہ یہی نکلا تھا کہ اس کو مجلس نا ہندگان میں جانا چاہئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ کوئی رکن اس مہمل زحمت کیلئے تیار نہ تھا۔ ایک رکن نے ۱۹۶۷ء کا ایک فیصلہ پیش کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اسی کو منظور کرلیا جائے۔ بحث وتمحیص کے بعد یہ تجویز منظور ہوگئی۔ طئے پایا کے فروری کے اخیر تک کمیٹی ۶۷ء کی طئے کردہ شرائط پر نظر ثانی کر کے اپنی رپورٹ شوریٰ کے سالانہ اجلاس میں پیش کرے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے غالباً آپ واقف ہونگے۔ وسط فروری میں جو ہنگامی اجلاس ہوا اس میں میری شرکت ہی مشکوک ہوگئی تھی اس لئے کہ مجھے قلب کا ایک مرض پیدا ہوگیا تھا اور بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا مگر آخر میں میں نے فیصلہ کیا کہ دہلی جانا چاہئے چنانچہ میں وہاں گیا۔ اختلاج کچھ اور بڑھ گیا، آخر مجھے ہسپتال جانا پڑا۔ میں شوریٰ کے تمام اجلاس میں شریک نہیں ہوسکا آپ بھی نہ آسکے، مولانا صدرالدین صاحب بھی نہ آسکے، سابق امیر جماعت بھی شریک نہ ہوسکے صرف پہلا اجلاس تبرکاً ان کے مکان میں منعقد ہوا اور بس۔ یہ سب کہ آپ کو معلوم ہوگا میں نے صرف دہرا دیا ہے۔ اب میں آپ کے اصل سوال کا جواب عرض کرتا ہوں۔ یہ جواب فیصلہ ہوا ہے وہ ہمارے عقیدے سے متصادم نہیں ہے۔ اور گر یہ متصادم ہے تو ۶۷ء بلکہ اس سے بھی پہلے متصادم ہو چکا تھا۔ جس عبارت پر آپ کو زیادہ الجھن ہے وہ محض ایک مصلحتی جز ہے۔ ایسا ہونا شاید عملاً ناممکن ہے کہ دو ایسی پارٹیوں میں سے کسی ایک کا جیت جانا یقینی بن جائے اور ہمیں کم مضر پارٹی کو ووٹ دینا پڑے اسی طرح فیصلے کا یہ جز بھی محض مصلحتی ہے کہ اگر کوئی ہندو بھی اس کا وعدہ کرے کہ ہمارے تمام مسائل کی تائید کرے گا اور کسی ایسے فیصلے پر رائے نہ دے گا جس سے مسلمانوں کے کاز کو نقصان پہنچے اور اس سے ایفائے عہد کی امید بھی ہو۔ یہ تمام چیزیں محض مصلحت کے پیش نظر بڑھائی گئی ہیں۔

میرے حقیر علم کی حد تک ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا ہے کہ ہم جماعت سے الگ ہو جانے کی سوچیں۔ بلاشبہ، جماعت جس رخ رپ جارہی ہے وہ تشویش ناک ہے۔ اس فیصلے پر اگر کہیں عمل ہوا ہوگا تو وہ آندھرا پردیش ہے۔ وہیں کی مجلس شوریٰ کی تجویز پر وسط فروری میں ہنگامی اجلاس ہوا تھا اور معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے فوراً اپنی مجلس شوریٰ حیدرآباد میں طلب بھی کرلی تھی۔ کیا ہوا یہ مجھے ابھی نہیں معلوم ہے جو طریقہ رکھا گیا ہے وہ اتنا مشکل ہے کہ اس پر عمل آسان نہیں ہے۔ برادر ابھی جماعت کو چھوڑنے کا خیال نہ کیجئے۔ اب تک ہم نے صبر کیا ہے اب ووٹ کے حامیوں کو ذرا تجربہ کر کے دیکھ لینے دیجئے۔ ہر رکن پر ووٹ کا استعمال لازم نہیں قرار دیا گیا ہے۔ زندگی باقی رہی اور آپ سے ملاقات ہوگئی تو انشاء اللہ زبانی اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بات چیت ہوگی۔ رفقاء کو سلام

سید احمد قادری

صدر الدین اصلاحیؒ کا خط ضیاء الہدیٰ ؒ کے نام

باسمہ تعالیٰ

پھول پور
۲۶ر فروری

برادر مکرم ومحترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ امید ہے کہ بفضلہ تعالیٰ مع متعلقین ورفقاء بخیریت ہوں گے۔

گرامی نامہ کل موصول ہوا۔ جواب میں کچھ عرض کرنے سے پہلے اپنی صحت کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتادوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت تھی کہ گزشتہ سال کی آخر سہ ماہی میرے لیے بڑی اچھی ثابت ہوئی اور صحت ایک خاص حد تک بحال رہی۔ مگر دسمبر کے اواخر میں پھر فرق پڑنا شروع ہوگیا، اور صحت میں تھوڑا تھوڑا زوال آنے لگا۔ اسی حال میں مجھے دس فروری کو بنارس جانا پڑ گیا۔ اہلیہ کی دونوں آنکھوں میں موتیا بند ہوگیا ہے۔ بلکہ بائیں آنکھ تو بینائی سے تقریباً محروم ہی ہو چکی ہے۔ ذیابطس کی شکایت اس پر مستزاد۔ بہر حال اس سفر کی تکان نے خاصا نڈھال کر دیا تھا۔ پھر ۱۳ر فروری کو ہی جامعۃ الفلاح جانا پڑ گیا۔ وہاں سے پندرہ کو لوٹا۔ اور حسب اندیشہ سخت تکان کے باعث اور نڈھال ہوگیا۔ پھر شدید نزلہ اور بخار نے حملہ کر دیا، جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، غذا بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ نماز کے لیے مسجد نہیں جارہا ہوں جو گھر سے تیس چالیس گز سے زیادہ دور نہیں۔ نقاہت کا اس وقت حال یہ ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔

اتنی تفصیل میں نے آپ کو اس لیے سنائی ہے کہ جب میں نمائندگان کے اجلاس میں شرکت سے اپنی معذوری اور مجبوری کی بات آپ کے سامنے رکھوں تو اسے آپ حق بجانب سمجھیں۔ مسئلہ کی اہمیت کا مجھے بھی احساس ہے، لیکن تکلیف مالا یطاق کا بار اٹھانے کی جرأت کیسے کروں۔ آپ فرمائیں گے کہ ابھی تو ساڑھے تین ہفتے باقی ہیں۔ لیکن اب تک کے مسلسل تجربات کی روشنی میں اس کی ہرگز توقع نہیں کر سکتا کہ اس وقت تک صحت میں اتنا سدھار اور جسم میں اتنی طاقت آجائے گی کہ دہلی تک کے طویل سفر کے قابل ہو جاؤں گا۔

جہاں تک استعفیٰ کی بات ہے وہ تو ارکان نمائندگان کو بھیجے جانے والے ایجنڈے میں ''امیر جماعت کے استعفیٰ پر غور وفیصلہ'' کے لفظوں درج ہی ہے۔ اس لیے یہ مسئلہ اجلاس میں زیر بحث تو لازماً آئے ہی گا۔ جو منظور بھی کر لیا جاسکتا ہے اور نامنظور بھی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ منظور نہ کیا جائے گا، اور لوگ عرض معروض کر کے امیر جماعت کو استعفاء واپس لے لینے پر راضی کر لیں گے میرے اس اندازے کی ایک خاص بنیاد ہے یہ شاید جماعت کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ نمائندگان کے اجلاس کا ایجنڈا ''دعوت'' میں شائع نہیں کرایا گیا ہے، صرف اجلاس کی تاریخیں ہی شائع کرا دینے پر اکتفا کر لیا گیا ہے۔ یہ بات بلا وجہ نہیں ہو سکتی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قیم جماعت اور ان کے نائبین اس خبر کو عام نہیں ہونے دینا چاہتے، اور ان کا رجحان ہی نہیں بلکہ شاید طے شدہ عزم یہ ہے کہ نمائندگان سے اس استعفیٰ کو نامنظور کرا دیں گے۔ اس متوقع صورت حال کے پیش نظر نئے انتخاب کا مسئلہ غالباً پیدا ہی نہ ہوگا۔

کچھ لکھنا چاہتا تھا، لیکن قلم کو حرکت دینے میں اب مشکل پیش آرہی ہے۔ اتنی سطریں بھی کچھ بیٹھ کر اور کچھ لیٹ کر لکھی ہیں۔

برادرم محمد جعفر صاحب کو سلام مسنون پہنچا دیں۔

والسلام

صدر الدین اصلاحی

مولانا صدر الدینؒ صاحب کا خط ضیاء الہدیٰؒ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خان کلینک
پھول پور، اعظم گڑھ
۲۲ رمئی

برادر مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ دعا ہے کہ آپ بخیریت وعافیت ہوں اور آپ کی رفیقۂ حیات نہ صرف روبصحت ہی ہوں بلکہ اب پوری طرح شفایاب بھی ہو چکی ہوں۔ آمین!

گذشتہ دنوں 'دعوت' میں یہ پڑھ کر دلی افسوس ہوا تھا کہ آپ کی منہ بولی بیٹی اللہ کے جوار رحمت میں پہنچ گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حادثہ آپ دونوں کے لیے جتنا جانکاہ ہوسکتا ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن آپ کے مومنانہ صبر ورضا سے مجھے پوری توقع ہے کہ آپ پوری استقامت سے اس غم پر قابو پا رہے ہوں گے۔ یقیناً آدمی کے لیے اس غم سے بڑا کوئی غم نہیں ہوسکتا مگر یہ بھی یقینی امر ہے کہ اس غم پر صبر ورضا کا اجر بھی بڑا عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو ایسے ہی صبر کی توفیق عطا فرمائے اور مرحومہ کو اپنی مغفرت کا سایہ اور رحمت کی ٹھنڈک نصیب کرے۔ آمین! ہفتہ عشرہ قبل آپ کا مکتوب دردموصول ہوا، اور ساتھ ان دونوں تحریروں کی نقول بھی جنہیں آپ نے امیر جماعت کی خدمت میں ارسال کیا ہے۔ یہ چیزیں دہلی سے بذریعہ ڈاک مجھے موصول ہوئی ہیں۔

آپ کی دونوں تحریریں پڑھیں، ایک مقام پر پہنچ کر تو آنکھوں میں آنسو بھی آگئے۔ پوری تحریر پڑھ کر محسوس ہوا کہ کم از کم ننانوے فی صد یہ میرے ہی دل کی آواز ہے جسے آپ نے بہتر سے بہتر انداز میں الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے۔ میں اس تحریر پر تفصیل سے اپنی معروضات پیش کرتا، لیکن صحت کی خرابی اور رمضان المبارک کی موجودگی اس کی بالکل اجازت نہیں دے رہی ہے۔ خدا کرے کہ جلد ہی ملاقات کی کوئی صورت نکلے تو بالمشافہ گفتگو ہو، اور میں بھی آپ کے انکشافات کے پہلو بہ پہلو کچھ مزید انکشافات کرسکوں۔ سردست تو صرف اتنا کہنے پر اکتفا کر رہا ہوں کہ میرے بارے میں جو بات آپ نے سنی ہے وہ صدفی صد غلط ہے۔ میری جو رائے آج سے ۳۷ برس قبل رہی ہے وہی اب بھی ہے، اور قریب قریب وہی ہے جو آپ نے اپنی اس تحریر میں ظاہر کیا ہے۔

شاید یہ زیر بحث فیصلہ کی اولین 'برکت' ہے کہ عجیب عجیب بے اصل باتیں اڑائی جا رہی ہیں، اور دکھ کی بات یہ ہے کہ ان حرکات کا صدور جماعت کے عوام ہی سے نہیں خواص سے بھی ہو رہا ہے۔ بس اللہ ہی ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

اگر اس وقت دو باتیں مختصراً مجھے بتا دیں تو بڑا اچھا ہو:

ایک تو یہ کہ امیر محترم نے آپ کی اس گزارش کا کیا جواب دیا جو اجلاس بلانے کے سلسلے میں آپ نے ان سے کی تھی۔

دوسرے یہ کہ سراج الحسن صاحب مرکز کے نمائندے کی حیثیت سے حلقہ بہار کے رفقاء کو فیصلہ زیر بحث کی جو تفہیم کرانے گئے تھے اس تفہیم کی نوعیت کیا تھی اور رفقاء کے ذہن کو وہ کس قدر مطمئن کرسکی؟

اس عریضہ کی رسید ضرور بھیجیں۔ انتظار رہے گا۔

والسلام

صدر الدین اصلاحی

مولانا صدرالدینؒ کا خط ضیاء الہدیٰؒ کے نام

باسمہ تعالیٰ

پھول پور

۴-۳-۶-۷۲

برادرم مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ دعا ہے کہ آپ اور اہل خانہ بخیریت وبعافیت ہوں۔ میں بھی بحمد اللہ ٹھیک ہی ہوں۔

رجسٹرڈ مکتوب کل ۱۳ر جولائی کو موصول ہوا۔ اس کے مطالعے سے کچھ نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مولانا عروج صاحب کا خط اپنے اندر تشفی کا کوئی سامان نہیں رکھتا، اور امیر جماعت کا مکتوب گرامی تو فی الواقع الجھن کو اور زیادہ بڑھا دینے والا ہے۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہماری زندگیوں کی سب سے قیمتی شئے داؤ پر لگا دی گئی ہے اور ہم ہیں کہ کہیں خوش گمانیوں سے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور کہیں قانونی اور آئینی موشگافیوں سے لوگوں کا منہ بند کرنا چاہتے ہیں۔

مسئلہ اتنا تفصیل طلب، پیچیدہ، دوررس نتائج کا حامل اور غور کا طالب ہے کہ خط وکتابت سے نہیں سمجھا سمجھایا جا سکتا۔ اس کے لیے بالمشافہ گفتگو اور بحث وتمحیص کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ اس کی کوئی شکل جلد پیدا ہو جائے۔

افسوس کی بات ہے کہ صورت حال کا واقعی جائزہ نہیں لیا جا رہا ہے اور تفہیم کے نتائج کو فی الجملہ اطمینان بخش کہا جا رہا ہے۔ جب کہ میری معلومات کی حد تک بات یہ نہیں ہے۔ خود بہار کی جو صورت حال آپ نے بتائی ہے وہ بھی یہی ظاہر کر رہی ہے۔

مزید افسوس یہ ہے کہ عام ارکان جماعت کو، جن کی خاصی بڑی تعداد سادہ اور خوش اعتماد بھی ہے، یہ تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ فیصلہ شوریٰ کا متفقہ فیصلہ ہے۔ اس صورت حال میں ''پیش قاضی تنہا روی راضی آئی'' کی مثال صادق نہ آئے تو کیا ہو۔

آپ نے دستور کی متعلقہ دفعات میں جو نقص بتلایا ہے میرے نزدیک وہ نقص نہیں ہے۔ آپ کو یہ بات معلوم ہوگی کہ دستور کا مسودہ تیار کرنے میں میرا کافی ہاتھ رہا ہے۔ ایک لفظ کو کافی غور وخوض اور بحث وتمحیص کے بعد منتخب کیا گیا تھا۔ بہرحال میں اپنی بات کسی گفتگو کے موقع پر ہی واضح کر سکوں گا۔

آپ نے مجھ سے جس تحریر کے مرتب کرنے کی فرمائش کی ہے اس کی ضرورت کا مجھے خود احساس ہے۔ معاملہ اشخاص ورجال کا نہیں ہے، بلکہ تحریک اسلامی کے مفاد ومصالح کا ہے۔ تحریک اسلامی کا اپنے متبعین پر یہ ایک بہت بڑا اور بنیادی حق ہے کہ وہ اس کی حرمت کو برقرار رکھنے اور اس کو صحیح منزل کی طرف رواں رکھنے کے لیے جس بات کو صحیح اور ضروری سمجھتے ہوں اس کو بے لاگ اور واضح ومدلل طریقے سے اپنے رفیقوں کے سامنے لازماً پیش کرتے رہیں، اور افہام وتفہیم کی کسی کوشش سے دریغ نہ کریں۔ ان شاء اللہ میں اس کے اس حق کو اپنی طاقت کی حد تک ادا کرنے کی پوری سعی کروں گا۔ دعا فرماتے رہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے مجھے ضروری صحت اور توانائی بھی عطا کرے اور ذہنی سکون بھی۔ ان دنوں بعض اہم خانگی مسائل کے باعث یہ سکون بڑی حد تک ناپید ہے۔

آپ کی اہلیہ محترمہ کی علالت کا تسلسل معلوم کر کے افسوس ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں اپنے فضل خاص سے کامل شفا عطا فرما دے۔ آمین!

والسلام

صدرالدین اصلاحی

صدرالدین اصلاحیؒ کا خط ضیاءالہدیٰؒ کے نام

باسمہ تعالیٰ

پھول پور
۲۴/جولائی

برادرمکرم ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ دعا ہے کہ مع متعلقین واحباب بخیر ہوں۔ میں تو بدستور آپ حضرات کی دعاؤں کا حاجت مند بنا ہوا ہوں۔ وسط فروری میں جو جھٹکا لگ گیا تھا وہ اب تک سنبھلنے نہیں دے رہا ہے۔ کم زوری اتنی رہنے لگی ہے کہ گھر سے بالکل قریب ہی کی مسجد میں پنج وقتہ حاضری تک (یا پھر جمعہ کے دن جامع مسجد تک) چلنا پھرنا محدود ہو کر رہ گیا ہے، اور بسا اوقات اس سے بھی معذوری ہو جایا کرتی ہے۔ اس سال نہ کسی دن روزہ رکھ سکا نہ تراویح پڑھ سکا۔

انعام صاحب کو آپ نے جو خط لکھا تھا اس کی نقل انہوں نے مجھے ارسال فرمادی ہے اور ساتھ ہی ٹی۔ کے صاحب کی ایک تجویز کی نقل بھی، نیز ایک طویل خط بھی بھیجا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے مجھے مطلع کیا ہے، اس تجویز کی اور اس طویل مکتوب کی نقل انہوں نے آپ کو بھی بھیج دی ہے۔ اس لیے ساری تفصیل آپ کے علم میں آچکی ہوگی۔

یہ عریضہ صرف اس اطلاع کے لیے تحریر کر رہا ہوں کہ انعام صاحب کی رائے سے پوری طرح متفق نہ ہونے کے باوجود میں نے اس کی حمایت کر دی ہے اور انہیں لکھ دیا ہے کہ بہتر ہے صرف آپ ہی تشریف لائیں، ڈاکٹر صاحب کو (یعنی آپ کو) کم از کم اس وقت زحمت نہ کرنے کا مشورہ دے دوں گا۔ مختصر یہ کہ ابھی آپ تشریف آوری کی نہ سوچیں۔ بعد میں یہ فیصلہ کر لیا جائے گا کہ سفر کی زحمت آپ اٹھائیں یا نہیں؟ اور اٹھائیں تو کب؟

والسلام
صدرالدین اصلاحی

انعام صاحب سے مراد انعام الرحمٰن خاں، بھوپال ہیں
ٹی۔ کے صاحب سے مراد ٹی۔ کے عبداللہ، کیرالہ ہیں
دونوں حضرات رکن مجلس شوریٰ جماعت اسلامی رہے ہیں۔ ادارہ

☆☆☆

صدرالدینؒ کا خط ضیاءالہدیٰؒ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پھول پور
۵/ستمبر

برادر محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ امید ہے کہ بعافیت ہوں گے، میں بھی بحمد اللہ فی الجملہ ٹھیک ہوں۔

آپ کا گرامی نامہ موصول ہو گیا تھا، اور میں نے جلد ہی اس کا جواب بھی ارسال کر دیا تھا۔ مگر برادرم محمد جعفر صاحب کے ایک خط سے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ میرا عریضہ آپ تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ بنا بریں آج پھر لکھ رہا ہوں، اور اب کی بار جعفر صاحب کے توسط سے بھیج رہا ہوں، جب کہ مذکورہ بالا عریضہ آپ کے تحریر کیے ہوئے پتہ پر بھیجا تھا۔

آپ کا مشورہ صائب مشورہ تھا، چنانچہ قریب قریب اس کے مطابق ہی میں نے عمل کیا ہے۔ چند روز ہوئے فرحان احمد سلمہ کے توسط سے قیم صاحب کو اپنا گزارش نامہ بھیج دیا ہے۔ امیر جماعت کے بجائے قیم جماعت کو مخاطب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اجلاس مجلس شوریٰ کے معتمد، از روے دستور وہی ہیں۔ اجلاس کی کارروائیوں کو ٹھیک ٹھیک نوٹ کرتے جانا اور اسے شوریٰ کے رجسٹر میں صحیح صحیح درج کرنا انہی کی ذمہ داری ہے۔

آپ کی ارسال کردہ دوائیں موصول ہو گئی ہیں۔ ابھی ان کا استعمال شروع نہیں کر سکا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی شروع کروں گا۔ افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ نے جو ترکیب استعمال تحریر فرمائی تھی اس کا رقعہ نہیں مل رہا ہے، کہیں کاغذات میں دب کر رہ گیا ہے۔ اس لیے مہربانی کر کے پھر سے زحمت فرمائیں۔ وضاحت سے مطلع کریں کہ یہ دوائیں کس طرح استعمال کروں؟

نیز یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ہومیو پیتھک دوائیں ہیں یا کوئی اور قسم کی۔ یہ بات اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ اگر یہ دوائیں ہومیو پیتھک ہوں گی تو کسی ضرورت کے پڑنے پر بھی کوئی اور دوا، انگریزی یا یونانی، استعمال نہ کر سکوں گا اور احتیاط برتنا پڑے گا۔ بہتر ہو گا یہ بھی بتا دیں کہ دوائیں عام صحت کے لیے ہیں یا کسی خاص بیماری کے علاج کے لیے؟

والسلام
طالب دعاء
صدرالدین اصلاحی

(اگلے صفحات پر درج خطوط اس خط و کتابت کا حصہ ہیں جس کا حوالہ ضیاءالہدیٰؒ کے نام مندرجہ بالا خط میں ہے جو نومبر ۸۴ء کے اجلاس شوریٰ میں الیکشن کے مسئلہ پر مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کے ووٹ دینے کی واقعی صورت حال کے بارے میں ان کے اور قیم جماعت، افضل حسین صاحب مرحوم، کے مابین ہوئی تھی)

مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب مرحوم کا پہلا عریضہ قیم جماعت کے نام

باسمہ تعالیٰ

پھول پور۔اعظم گڑھ

۲۷ر اگست ۸۶ء

مکرمی جناب افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی ہند و معتمد اجلاس مجلس شوریٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

میں نے کئی ماہ قبل تحریری طور پر اور وضاحت کے ساتھ ،آپ کو مطلع کیا تھا کہ نومبر ۸۴ء کے اجلاس شوریٰ میں الیکشن کے مسئلے پر میں نے اپنے اتفاق کا اظہار نہیں کیا تھا اور یہ رائے نہیں دی تھی کہ یوسف صاحب کی تجویز سے میں متفق ہوں، جب کہ مجھے مسلسل اطلاعات مل رہی ہیں کہ آپ حضرات، کسی غلط فہمی کی بنا پر، عام ارکان کو یہی بتایا کرتے ہیں۔ مجھے توقع تھی کہ میری اس وضاحت اور توجہ دہانی کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہو جائے گا۔مگر میری توقع پوری نہیں ہوئی۔(حتیٰ کہ آپ نے میرے عریضے کا کوئی جواب بھی نہیں دیا، بلکہ رسید تک نہیں بھیجی) چنانچہ ''مسئلہ الیکشن اور مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند___ روداد اپریل ۸۴ تا اپریل ۸۵'' نامی کتابچہ جب مجھے اپریل ۸۶ء میں پڑھنے کو ملا تو اسکے صفحہ ۴۰ پر یہ دیکھ کر مجھے افسوس بھی ہوا، اور تعجب بھی، کہ اس میں رپورٹنگ کی بعض اور اہم خامیوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی واضح اندراج موجود ہے کہ یوسف صاحب کی متعلقہ تجویز سے میں نے بھی اظہار اتفاق کیا تھا۔یہی وہ صورت حال تھی جس کے پیش نظر گزشتہ ماہ (جولائی ۸۶ء) کے سالانہ اجلاس شوریٰ میں میں نے ،اک گونہ احتجاجی انداز میں، اس طرف پھر توجہ دلائی تھی۔مگر اس بار بھی حسب معمول سب کچھ سن کر سکوت اختیار کر لیا گیا۔

آج پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ براہ کرم اس طرف توجہ فرمائیں، اور اس خلاف واقعہ رپورٹنگ کی تصحیح کر بھی لیں اور کر بھی دیں، یعنی کسی سرکلر کے ذریعہ، یا جس طرح آپ مناسب سمجھیں، ارکان جماعت کو ضرور مطلع کر دیں کہ مذکورہ بالا کتابچہ میں صفحہ ۴۰ پر یوسف صاحب کی تجویز سے اظہار اتفاق کرنے والوں میں صدرالدین کا نام غلط فہمی کی بنا پر سہواً درج ہو گیا ہے۔

غالباً اس اظہار امر کی چنداں ضرورت نہ ہوگی کہ میرے نزدیک یہ کوئی سادہ سی بات نہیں ہے، بلکہ مختلف پہلوؤں سے نہایت اہم بات ہے، میری یا آپ کی ذات کے لیے نہیں، بلکہ تحریک اور جماعت کے لئے۔ورنہ میں اس قدر اس معاملہ پر زور نہ دیتا۔

اس عریضے کے جواب کا، یا کم از کم اس کی رسید کا شدت سے منتظر رہوں گا۔

والسلام

صدرالدین

☆☆☆

پہلے عریضہ کا جواب قیم جماعت کی طرف سے

دہلی ۳ر ستمبر ۸۶ء

برادر مکرم ومحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۲۷ر اگست ۸۶ء عزیزی فرحان سلمہ کے ہاتھ کل موصول ہوا۔شعبۂ تنظیم نے آپ کے گرامی نامہ کے

پیش نظر اپنی یادداشت کو تازہ کر کے تبادلۂ خیال کیا اور درج ذیل نوٹ لکھا گیا۔ اگر آپ کی یادداشت کے مطابق اس میں کوئی کمی بیشی ہو تو اس سے مطلع فرمائیں۔ اسے درج کر لیا جائے گا۔

''نومبر ۸۴ء کے اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ میں جناب سید یوسف صاحب نے درج ذیل تجویز پیش کی:

''مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ جنوری ۶۷ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ پارلیمانی انتخابات میں ارکان کے ووٹ دینے پر جو پابندی اب تک عائد ہے اصول سوم (یعنی اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے لیے) کی حد تک اس میں استثنائی صورت نکالی جائے۔ اس فیصلہ پر اب عمل درآمد کیا جائے کیونکہ یہ فیصلہ آج تک برقرار ہے۔

جب یہ تجویز سامنے آئی تو ارکان شوریٰ کے خیالات کچھ اس طرح تھے:

۱۔ تجویز میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے پیش نظر دراصل کوئی نیا فیصلہ نہیں کرنا ہے بلکہ جنوری ۶۷ء کے فیصلے کو روبہ عمل لے آنا ہے۔

۲۔ شوریٰ کے اجلاس میں جو تجویزیں پیش ہوئیں اور ان پر تبادلۂ خیال ہوا اس سے ایک احساس یہ پیدا ہو رہا تھا کہ اگر شوریٰ اس وقت کسی مثبت نتیجہ پر نہیں پہنچتی ہے تو مسئلہ پھر اختلافی قرار پا کر اجلاس نمائندگان میں لے جانا ہوگا۔

اس طرح کے احساسات کے پیش نظر یہ خیال پیدا ہوا کہ سید یوسف صاحب کی تجویز سے اتفاق کر لیا جائے۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے اس سے اختلاف کیا اور شوریٰ کے ارکان بشمول مولانا صدرالدین صاحب نے مولانا یوسف صاحب سے گزارش کی کہ مسئلہ کو حسن وخوبی کے ساتھ حل کرنے کی غرض سے اتفاق کر لیا جائے، لیکن مولانا یوسف صاحب اس پر آمادہ نہ ہو سکے اور فرمایا جب مجھے اختلاف ہے تو اتفاق کس طرح کر سکتا ہوں۔

مولانا صدرالدین صاحب نے فرمایا کہ اختلاف تو مجھے بھی ہے لیکن مسئلہ تو حل ہونا ہی چاہئے۔ اس کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب کے اختلاف کے ساتھ سید یوسف صاحب کی تجویز منظور کر لی گئی۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ گھر میں سلام بچوں کو دعائیں۔

برادرم سراج الحسن صاحب، برادرم مونس صاحب اور مرکز کے دیگر رفقاء کی طرف سے ہدیۂ سلام مسنون۔

والسلام
افضل حسین

☆☆☆

مولاناؒ کا دوسرا عریضہ قیم جماعت کے نام

باسمہ تعالیٰ

پھول پور۔ ۱۹ر ستمبر ۸۶ء

مکرمی ومحترمی جناب قیم صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

عریضے کا جواب موصول ہوا۔ اسے پڑھ کو محسوس ہوا کہ بات جہاں تھی اب بھی وہیں رہ گئی ہے۔ بلکہ شاید کچھ اور الٹی ہوگئی ہے۔ میرا اندازہ اور قیاس یہ ہے کہ زیر بحث مسئلے پر اجلاس شوریٰ میں جو کافی طویل گفتگو اور بحث ہوئی تھی اسے آپ منٹ بک میں درج نہیں کر سکے تھے، اور اب ''شعبہ تنظیم'' کی یادداشتوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ بہر حال آپ نے فرمایا ہے کہ میں اپنی یادداشت کے مطابق آپ کے جواب میں کوئی کمی بیشی پاؤں تو اس سے مطلع کردوں۔ لہٰذا ذیل میں اپنی یادداشت کو قدرے تفصیل سے درج کررہا ہوں:

جب محترم امیر جماعت کے رائے نہ دینے پر اصرار کے نتیجہ میں اکتوبر ۸۴ء کے اجلاس شوریٰ ہی کی طرح الیکشن کے مسئلے میں نومبر ۸۴ء کے اجلاس میں بھی از روے دستور کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا تو دوران گفتگو بعض اور تجاویز اور مشوروں کے پیش ہونے، ان پر بحث ہونے اور پھر بھی ڈور کے نہ سلجھ سکنے کے بعد بعض ارکان شوریٰ کا یہ خیال سامنے آیا کہ ''۶۷ء کا ایک فیصلہ (شوریٰ) کا پہلے سے موجود ہے، اس لئے اب کسی فیصلے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس وقت اس فیصلے کا نفاذ ملتوی کردیا گیا تھا، اب اسے نافذ کردیا جائے''۔ اس خیال یا دعوے کے سامنے آجانے کے بعد وہی اجلاس میں بحث و گفتگو کا محور بن گیا۔ اکثر لوگوں نے اس کی تائید کی، جب کہ کچھ نے اس بات کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ دونوں طرف کے لوگوں نے اپنی اپنی دلیلیں دیں۔ فریق اول کی دلیل یہ تھی کہ ۶۷ء کا فیصلہ آج تک شوریٰ کے کسی اجلاس نے بھی منسوخ نہیں کیا ہے، اس لیے وہ اب تک بدستور برقرار ہے، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس وقت کے ملتوی شدہ فیصلے کو اب زیر عمل لانے کا فیصلہ کرلیا جائے۔ فریق دوم کا (جس میں میں بھی شریک تھا) استدلال یہ تھا کہ ''۶۷ء کے بعد سے آج ۸۴ء تک کی سترہ برس کی طویل مدت میں ووٹ پر سے پابندی اٹھا لینے کی تجویز کئی بار شوریٰ کے اجلاس میں آتی رہی اور اختلافی قرار پاکر نمائندگان میں جاکر رد ہوتی رہی (بالفاظ دیگر ۶۷ء کے فیصلے کی عملی تنسیخ ہوتی رہی) اس لئے اب ۶۷ء کا فیصلہ آپ سے آپ ختم ہو چکا ہے''۔ لیکن فریق اول نے اس استدلال کو تسلیم نہیں کیا۔ بالآخر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ''۶۷ء کے فیصلے کے بدستور اب بھی برقرار رہنے یا نہ رہ جانے کا اگر فیصلہ ہونا ہے تو یہ فیصلہ صدر مجلس کی رولنگ سے ہوگا، نہ کہ ارکان شوریٰ کی رایوں سے، یعنی یہ رولنگ کا معاملہ ہے نہ کہ رائے دہی سے طے ہونے کا، صدر مجلس رولنگ دے دیں، بات ابھی ختم ہو جائے گی''۔ مگر صدر مجلس جس طرح الیکشن کے مسئلے میں تقسیم آراء کے وقت رائے دینے سے بشدت انکار کرچکے تھے اسی طرح اب رولنگ دینے سے بھی انکار کردیا۔ اس طرح بات بدستور، الجھاوے میں پڑی کی پڑی رہ گئی، اور یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ اکتوبر ۸۴ء کا اجلاس، جو خاص اسی مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، کوئی فیصلہ کے بغیر ختم ہوگیا تھا، کہیں نومبر کے اس اجلاس کا بھی وہی حشر نہ ہو جائے، اگر ایسا ہوا تو شوریٰ کی ساکھ سخت مجروح ہوگی اور ارکان بددلی اور کم اعتمادی کا شکار ہو جائیں گے۔ یہی وہ پریشان کن صورت حال تھی جس سے مجبور ہوکر میں نے مصلحتہً اپنے اس اصرار کو ترک کردیا کہ صدر مجلس رولنگ دیں تبھی ۶۷ء کے فیصلے کے بدستور برقرار رہنے یا نہ رہنے کی بات تسلیم کی جاسکے گی، اور پھر کوشش یہ ہوئی کہ شوریٰ کوئی ایسا فیصلہ کرنے کے بعد ہی اٹھے جس سے عام ارکان جماعت کو اب بھی یہ محسوس نہ ہونے پائے کہ اس مسئلہ میں شوریٰ کا پچیس سالہ اختلاف ونزاع اپنی جگہ بدستور قائم و برقرار ہے اور وہ خاص اسی مسئلے کے فیصلے کے لئے بلائے گئے دو دو خصوصی اجلاسوں کے بعد بھی کوئی راہ نہیں نکال سکی۔ بالآخر مغرب بعد (یا عشاء بعد) کی نشست میں فیصلے کے الفاظ سوچے اور لکھے جانے کا مرحلہ آیا۔ آپ قلم اور کاغذ لیے بیٹھے پوچھتے رہے کہ کیا لکھوں؟ کسی اور طرف سے کوئی واضح مشورہ سامنے نہ آنے کی شکل میں میں نے عرض کیا کہ اچھا یوں لکھیے ''بلا اختلاف رائے طے ہوا کہ'' میں ابھی اتنے ہی الفاظ بول پایا تھا کہ محترم مولانا محمد یوسف صاحب، جو مجھ سے بہت دور میرے بالمقابل جنوبی مغربی گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے، زور سے بولے'' آپ ایسا کیوں

لکھاتے ہیں؟ مجھے تو اختلاف ہے''۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ ''اختلاف تو مجھے بھی ہے، لیکن مسئلے کا کوئی حل تو اب نکلنا ہی چاہئے'' یہ ہے میری یادداشت کے مطابق صورت واقعہ کی ضروری تفصیل۔

اب بعض ضروری وضاحتیں بھی کردینے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(۱) اس ''حل نکلنے'' کا مطلب واضح اور قطعی طور پر یہ تھا، اور بحث و گفتگو کے سیاق وسباق میں یہی ہوسکتا تھا، کہ جب امیر جماعت رولنگ نہیں دے رہے ہیں تو مجبوراً رولنگ کے مطالبے کے سلسلے میں اب خاموشی اختیار کر لی جائے اور ارکان شوریٰ کی اکثریت کے کہنے کے مطابق فیصلہ ہوجانے دیا جائے اور اپنے اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے اسے لفظوں کے پردے میں اس طرح چھپادیا جائے کہ عام ارکان جماعت کو اس کا حتی الوسع احساس نہ ہونے پائے۔ اگر صورت واقعہ یہ نہ ہوتی تو میں آپ سے ''بلا اختلاف طے ہوا'' کے بجائے ''باتفاق رائے طے ہوا'' لکھنے کے لیے کہتا۔ (واضح رہے کہ ''بلا'' اختلاف رائے کے الفاظ سے میرا قطعی منشا ''بلا اظہار اختلاف رائے'' تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ''باتفاق رائے'' کے الفاظ چھوڑ کر ''بلا اختلاف لکھنے کے لیے کہتا''۔ میری اس وضاحت پر آج گرفت کی جاسکتی ہے، مگر واضح طور پر یہ گرفت برائے گرفت ہی ہوگی)۔

(۲) مجھے افسوس ہے کہ کتابچہ روداد کے صفحہ ۴۰ پر یوسف صاحب کی تجویز کا اندراج کر کے صرف اتنا لکھ دینے پر اکتفاء کرلیا گیا ہے کہ ''اظہار خیال کافی ہو چکا تھا۔ اب اس پر رائیں لی گئیں۔۔۔۔ الخ'' اور پھر یہی انداز رپورٹنگ کا آپ کے اس گرامی نامہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے جواب آپ نے شعبہ تنظیم کی یادداشتوں کی روشنی میں مرتب کر کے ارسال فرمایا ہے۔ آپ خود غور فرمائیں یہ رپورٹنگ کہاں تک صحیح ہے؟ اور رپورٹنگ کا یہ طریقہ کہاں تک قابل اعتماد اور اطمینان بخش کہا جاسکتا ہے؟ ''اظہار خیال کافی ہو چکا تھا'' کے گول مول جملے اور ''حروف مقطعاتی'' الفاظ میں اتفاق واختلاف کی وہ پوری بحث غائب کردی گئی ہے جو ۶۷ء کے فیصلے کے زندہ رہنے یا مردہ ہوچکنے کے سلسلے میں مع دلائل ہوئی تھی، اور اس امر کا گمان تک نہیں پیدا ہونے دیا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف بھی تھا۔

(۳) ذرا ایک اور پہلو سے بھی اس قضیہ پر غور فرمالیں۔ اگر مسئلہ صرف یہ تھا کہ یوسف صاحب کی تجویز کو منظور کرلیا جائے تو صرف مولانا محمد یوسف صاحب کے اور میرے اختلاف سے اس کی منظوری کیسے رکی جارہی تھی، اور شوریٰ کی بھاری اکثریت کے اتفاق کر لینے کے بعد بھی وہ کون سا مسئلہ لاینحل رہا جاتا تھا جن کے لیے آپ کی اور مجھے، اور دیگر احباب کو بھی مولانا یوسف صاحب کے اظہار اختلاف پر یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ ''مسئلہ تو حل ہونا ہی چاہئے''۔

(۴) آخر میں ایک مودبانہ گزارش کرتا ہوں۔ اجلاس شوریٰ کے معتمد آپ ہیں اور دستور کی رو سے اجلاس کی کارروائیوں کو بلا کم وکاست پوری صحت کے ساتھ قلم بند کرتے رہنا آپ کی ذمہ داری ہے، نہ کہ شعبہ تنظیم کی۔ خلق اور خدا کے سامنے اس باب خاص میں آپ جواب دہ ہیں نہ کہ کوئی اور۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی، آپ کو بھی اور ہر رفیق کو خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ رکھے۔

والسلام

صدرالدین اصلاحی

☆☆☆

صدرالدین صاحبؒ کے دوسرے عریضہ کے جواب میں قیم جماعت کا خط

تاریخ: ۸۶/۱۰/۳۰

برادرم مکرم ومحترم السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۱۸ رستمبر ۸۶ء دستی موصول ہوا تھا۔ جیسا کہ پچھلی بار لکھا گیا تھا کہ آپ کی بات مندرجہ ذیل صراحت کے ساتھ ریکارڈ پر لے آئی جائے گی۔

''امیر جماعت کی رولنگ کی بات درحقیقت سید یوسف صاحب کی تجویز پر رائے شماری کے وقت زیر بحث نہیں آئی تھی بلکہ اس سے پہلے دراصل یہ بات اس وقت کی ہے جب برادرم عبدالفتاح صاحب کی اصل تجویز پر رایوں کا اظہار ہو چکا تھا اور برادرم ڈی کے عبداللہ صاحب نے اپنی یہ تجویز رکھی تھی کہ فیصلہ دستور جماعت کی دفعہ ۳۹ (ب) کے تحت معمولی اکثریت سے ہونا چاہئے نہ کہ دستور جماعت کی دفعہ ۳۹ (ج) کے تحت۔ اس موقع پر تفصیلی اظہار خیال کے بعد محترم امیر جماعت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں اپنی رولنگ دیں لیکن موصوف نے یہ کہہ کر رولنگ دینے سے انکار کر دیا کہ رولنگ کا مطلب رائے دینے کا ہے۔

اس کے بعد محترم امیر جماعت نے ارکان شوریٰ کی اس یقین دہانی پر اجلاس کی صدارت فرمائی تھی کہ ان سے رولنگ دینے یا اظہار رائے کے لئے گذارش نہیں کی جائے گی۔''

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ مرکز کے جملہ احباب کی طرف سے ہدیہ سلام مسنون۔ گھر میں سلام بچوں کو دعائیں۔

والسلام

افضل حسین

مندرجہ بالا خط وکتابت کے بعد صدر الدین اصلاحی مرحوم کی اس سے متعلق مزید وضاحت خط میں آگے مولانا نے نوٹ دے کر لکھا

نوٹ: یہ خط وکتابت تو یہاں تک پہنچ کر رک گئی تھی، یا یوں سمجھیے کہ میں نے ختم کردی تھی اب آگے اس قضیہ کے سلسلہ میں ضروری باتوں کا تذکرہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

قیم صاحب کا یہ جواب صراحتہً ٹالنے والا ایک رسمی جواب تھا، اور مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹنے کا جیسے تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں نے مزید کچھ عرض کرنا بے سود خیال کر کے انہیں پھر کچھ لکھنا نامناسب سمجھا اور خاموش ہو رہا۔ آخر ان کے پاس میرے اس اعتراض کا کیا جواب ہو سکتا تھا کہ

> ''اگر مسئلہ صرف یہ تھا کہ یوسف صاحب کی تجویز کو منظور کر لیا جائے تو صرف مولانا محمد یوسف صاحب کے اور میرے اختلاف سے اس کی منظوری کیسے رکی جا رہی تھی، اور شوریٰ کی بھاری اکثریت کے اتفاق کر لینے کے بعد بھی وہ کون سا مسئلہ لاینحل رہا جاتا تھا جس کے لیے آپ کو، اور مجھے، اور دیگر احباب کو بھی مولانا یوسف صاحب کے اظہار اختلاف پر یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ ''مسئلہ تو حل ہونا ہی چاہئے۔''

یقینی طور پر میری اس دلیل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا نہ ہو سکتا تھا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ وہ اسے خاموشی سے پی کر رہ گئے۔ ورنہ صرف یہی ایک بات ان کو اپنی غلط رپورٹنگ کا یقین دلا دینے کے لیے کافی ہو جا سکتی تھی۔

عجیب بات ہے کہ انہوں نے اس طویل بحث کا شوریٰ کی کارروائی میں کہیں ذکر تک نہیں آنے دیا ہے جو شوریٰ ۶۷ء کے

فیصلہ کے ۸۴ء تک بدستور زندہ برقرار رہنے یا نہ رہ جانے کے بارے میں ہوئی تھی، اور پھر میرے کہنے اور یاد دلانے پر بھی اس کا کوئی نوٹس لینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ میری اس بات کو بھی وہ ماننے کے لئے تیار نہ ہو سکے کہ ۶۷ء کے فیصلے کے بدستور اب بھی برقرار رہ جانے یا نہ رہ جانے کا فیصلہ ارکان شوریٰ کی رایوں سے نہیں ہوسکتا بلکہ صدر مجلس کی رولنگ ہی سے ہوسکتا ہے۔ میں نے پورے وثوق سے ان کو یاد دلایا تھا کہ میں نے امیر جماعت (صدر مجلس) سے رولنگ کی گزارش کی تھی جس کے لیے وہ آمادہ نہ ہو سکے اور صاف انکار کر گئے، مگر قیم صاحب فرماتے ہیں کہ رولنگ کی بات ٹی۔ کے عبداللہ صاحب کی ایک اور تجویز کے سلسلے میں سامنے آئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں گویا وہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ ۶۷ء کے فیصلے کے سلسلہ میں ایسی کوئی بات نہیں سامنے لائی گئی تھی۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ گزارش امیر جماعت سے کی تھی۔ اب قیم صاحب نے میری یہ بات نہ سنی ہو یا سن کر فراموش کر بیٹھے ہوں تو اس میں میرا کیا قصور۔

بہر حال ایسے بہت سے نکتے ہیں جو قیم صاحب کے جواب کے بارے میں اٹھائے جاسکتے ہیں مگر جب توقع ہی اٹھ جائے تو کسی کا کیا گلہ کیا جائے۔

صدرالدین اصلاحی

☆☆☆

سابق قیم جماعت اسلامی ہند افضل حسینؒ کا ضیاء الہدیٰؒ کے نام ان سے وضاحت طلبی کا ایک خط

۸۹/۶/۹ء

برادر مکرم ومحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا تازہ کتابچہ ''انقلابی تحریک'' مرکزی مجلس شوریٰ کے حالیہ اجلاس منعقدہ مئی ۸۹ء میں ارکان شوریٰ کو ملا تھا۔ انہوں نے اس کا مطالعہ کیا اور پھر اسکے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد شوریٰ نے جو رائے قائم کی وہ اس طرح ہے۔

- مصنف سے اس سلسلہ میں وضاحت طلب کی جائے۔
- کتابچہ کی فروخت فی الفور بند کر دینے کا انہیں پابند کیا جائے۔
- کتابچہ کے مطالعہ سے واضح طور پر رائے قائم ہوتی ہے کہ وہ دستور جماعت کی دفعہ ۶۸ سے قولاً یا عملاً انحراف کے زمرے میں آتا ہے۔

کتابچہ کی جن عبارتوں پر خاص طور پر گفتگو ہوئی ان کی روشنی میں درج ذیل خیالات نوٹ کیے گئے۔

☆ کتابچہ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف موصوف کو جماعت اسلامی کے مطلوبہ صالح انقلاب اور اقامت دین کے نہج (Process) سے یا تو واقفیت نہیں ہے یا جماعت کے دستور اور اسکے پالیسی پروگرام سے انہیں اتفاق نہیں ہے. موصوف کتابچہ کے پیش لفظ صفحہ ۲ میں تحریری فرماتے ہیں۔ ''چالیس سال سے زیادہ گذرے جب کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی۔ مگر بحیثیت مجموعی نہج (Process) پھر بھی واضح نہیں تھا''۔

اور چالیس سال کے غور وفکر اور قرآن کی طرف رجوع ہونے کے بعد بھی جو کیفیت تھی اسکے بارے میں فرماتے ہیں'' میں خود اپنے اندر باطنی اور ظاہری دونوں حیثیت سے یہ صلاحیت نہیں پاتا کہ اس کام کو مطلوبہ نہج پر چلا سکوں''۔

☆ مصنف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

انبیاء علیہم السلام جو تحریکیں چلاتے رہے ان کی تفصیلات نہ تو تاریخ میں نہ قرآن سے پہلے کے پچھلے الہامی ریکارڈ میں مستند انداز میں محفوظ ہیں......اس کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام تا رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وتعلیمات سے وہ دلائل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆ اور تحریک اسلامی (جماعت اسلامی) کو صفحہ ۲۱ تا آخر جس طرح ہدف تنقید بناتے ہیں وہ موصوف کے ایک جملہ سے بخوبی واضح ہے'' اسلامی انقلاب بھاڑے کے لوگوں اور بامعاوضہ (خواہ مشاہرہ کہا جائے خواہ کفاف) کام کرنے والوں کے ذریعہ برپا ہو ہی نہیں سکتا''۔

وہ جماعت کی معروف اصطلاحوں پر واشگاف انداز میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔ ''ہمہ وقتی یا جز وقتی بامعاوضہ کارکن صفحہ ۲۱

☆ امیج بنانے اور امیج کو اچھا بنانے کی کوشش جو مصنف کے خیال میں مادہ پرستانہ انداز فکر ہے۔ صفحہ ۲۳

پبلسٹی کا تشہیر کا کام صفحہ ۲۵ بھی مصنف کے خیال میں غیر مفید ہے۔

صفحہ ۴۰ پر تحریک اسلامی میں دو طرح کے افراد کو غیر مخلصین کے زمرے میں شامل ثابت کرتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو تحریک کا امیج بنانے میں ایشوز اور پبلسٹی سے بھی کام لیتے ہیں، اور دوسرے وہ لوگ جو بیرون ملک بڑی بڑی تنخواہوں کے ساتھ ملازمت کرتے ہیں''۔

☆ کتابچہ کا ایک اقتباس اس طرح ہے۔

''اس دور میں تحریک اسلامی کو سبوتاژ کرنے والی طاقتیں باہر سے بڑی بڑی رقمیں دیکر تحریک میں گھسے ہوئے لوگوں کو اپنا آلہ کار

بنا کران کے ذریعہ اور بڑی بڑی تنخواہوں کے ساتھ ملازمت دے کر براہ راست اپنے لیے فضا ساز گار بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔صفحہ ۳۷ مخلصین کو ایسے لوگوں سے جو کنارہ کرنے کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔

☆ اسٹیٹ کو ایک بت ثابت کر کے بالغ رائے دہندگی کو شرک و بت پرستی کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے صفحہ ۴۵ ''گویا ریاست (اسٹیٹ) اسی طرح ایک بت ہے جس طرح بت پرستوں کے مٹی یا دھات کے بت ہوتے ہیں۔

☆ مصنف کے خیال میں اسلام میں بالغ رائے دہنگی (A.F) کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

☆ دستور جماعت اسلامی امیر اور شوریٰ کے انتخاب کا جو طریقہ بنایا گیا ہے وہ موصوف کے مندرجہ ذیل اقتباسات کی روشنی میں نادرست قرار پاتا ہے۔

''شوریٰ کے لوگ عام لوگوں کے منتخب کیے ہوتے یا امیر اور شوریٰ بنانے والے لوگ بھی عام لوگوں کے منتخب کیے ہوئے نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اللہ، رسول اور اسلام کے لیے اپنے مخلصانہ کارناموں کی وجہ سے خود بخود ممتاز ہو جاتے ہیں۔صفحہ ۴۰

''ارباب حل وعقد میں سے مشورے کے لیے افراد کا انتخاب امیر کا کام ہوگا نہ کہ حل وعقد کا۔''

امید ہے آپ درج بالا اقتباسات کو سامنے رکھ کر ایک بار اپنے کتابچہ کا بغور مطالعہ فرمائیں گے اور اسکے بعد شوریٰ کے نشان زدہ اقتباسات اور قائم شدہ خیالات کو سامنے رکھ کر واضح طور پر اپنے جواب سے مطلع فرمائیں گے۔ اور پوری کوشش کریں گے کہ ماہ رواں کے آخر تک آپ کے جواب سے مرکز مطلع ہو جائے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

والسلام

افضل حسین

☆☆☆

ضیاءالہدیٰ ؒ کا خط قیم جماعت کے اس ضابطے کے خط کے جواب میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم قیم صاحب! وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ ۸۹/۶/۹ء پیش نظر ہے۔ جواباً عرض ہے کہ: میرا کتابچہ ''انقلابی تحریک'' ایک علمی ایجابی (سلبی نہیں) مضمون پر مشتمل ہے۔ جو مستقبل میں انقلابی (اصلاحی نہیں) تحریک لیکر اٹھنے والوں کے لئے لکھا گیا ہے کیوں کہ میں قبر سے اٹھ کران کے پاس تو آ ؤنگا نہیں ۔ نوشتہ بماند سیہہ برسفید نو پسندہ را نیست فردا امید

اس میں کتاب وسنت کے حوالوں سے انکے لئے خاکہ پیش کیا گیا ہے؟

اس کے پیش لفظ میں صاف اور صریح الفاظ میں میں نے لکھ دیا ہے کہ ''میں تحریر کی شکل میں اس لئے نہیں لارہا ہوں کہ جو اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں ان پر کوئی نقد یا تبصرہ پیش نظر ہو (ہر ایک کو اسکے خلوص کے مطابق آخرت میں اجر بہر حال ملے گا)۔ یہ تحریر آئندہ اسلامی تحریک برپا کرنے والوں کے لئے اگر رہنمائی کا سبب بن جائے تو ان کے اجر میں شاید میرا بھی کچھ حصہ ہو جائے۔ اس تحریر میں بہر حال ایک خاکہ ہی پیش کیا گیا ہے تفصیلات کا رنگ بھرنا آئندہ تحریک چلانے والوں کا کام ہے''۔

اس صاف اور صریح وضاحت کے بعد کون سا معروف اخلاقی جواز ہے کہ کوئی مجھ پر یہ الزام لگائے کہ میں نے کسی فرد یا چند افراد یا کسی تحریک کو نشانہ بنایا ہے۔ البتہ علمی حیثیت سے اس پر تنقید اعتراض اور غلطیوں کی نشاندہی کرنے کا حق ہر آدمی کو ہے اور میں اسکو خوش آمدید (Welcome) کرتا ہوں۔

والسلام

ضیاءالہدیٰ

صدرالدین اصلاحیؒ کا خط ضیاءالہدیٰؒ کے نام

بسمہ تعالیٰ

پھول پور اعظم گڑھ

۲۰/اپریل

برادر مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خدا کرے بخیر وعافیت ہوں۔

گرامی نامہ موصول ہوا۔ دوڈھائی ماہ سے خرابی صحت اور ضعف ونقاہت میں مسلسل اضافے کے باعث اگر چہ کچھ لکھنے پڑھنے میں بڑی زحمت محسوس کرتا ہوں اور طبیعت اس کے لئے ذرا بھی آمادہ نہیں ہوتی، لیکن کسی نہ کسی طرح آپ کے مضمون کو تھوڑا تھوڑا دیکھتا رہا ہوں۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ کوشش کروں گا کہ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر اسے بھی نپٹا دوں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے طاقت اور توفیق عطا فرمادے۔

آپ نے اپنے مضمون میں جو یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ دعوت اسلامی کے کام کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں وہ السابقون کی ٹیم تیار کرتی ہے، دوسرے مرحلے میں مقتصدین کی ٹیم، اور آخر میں کمزور ترین مسلمانوں کی ٹیم۔ یہ بات مجھے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ دعوت اسلامی اس طرح بالارادہ مراحل کی تعین نہیں کرتی نہ اس طرح یکے بعد دیگرے ترتیب کے ساتھ ٹیمیں تیار کرتی ہے۔ اس کی تمنا تو یہ ہوتی ہے کہ سارے ہی اہل ایمان السابقون کے معیار کے مومن بنیں۔ لیکن عملاً ایسا ہوتا نہیں، بلکہ ہوتا یہی ہے کہ ابتدائی دور کے بعد تینوں ہی قسم کے لوگ دائرہ اسلام یا حلقہ دعوت میں موجود پائے جانے لگتے ہیں، خواہ ان کا باہمی تناسب کچھ بھی ہو۔ اور ایسا ہونا ایک فطری بات ہے۔ میں نے مسودہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسی بات کو سامنے رکھا ہے۔

اپنا مسودہ لے جانے کے لیے کسی کو یہاں تک دوڑانے کی زحمت کیوں کریں؟ میں رجسٹرڈ ڈاک سے خود ہی بھیج دوں گا۔

کتاب کا مقدمہ لکھنے کی آپ نے جو فرمائش کی ہے، افسوس ہے کہ اس کی تعمیل نہ کرسکوں گا۔ جسم اور ذہن دونوں ہی ازکار رفتہ ہوتے جارہے ہیں مجھ سے اس طرح کی تحریری خدمات انجام دینے کے لئے آئے دن تقاضا ہوتا رہتا ہے۔ مگر میں فوراً ہی معذرت کا اظہار کردیا کرتا ہوں۔ یہ صرف آپ کی ذات کا استثناء رہا ہے کہ آپ کے مسودے کی نظر ثانی کا کام از خود میں نے اپنے سر لے لیا تھا۔ اور اب کیا بتاؤں کہ یہ ہفتہ دو ہفتہ کا کام جواب تک تکمیل کو نہ پہنچ سکا ہے، کسی طرح طبیعت پر جبر کرکے نپٹارہا ہوں اور وہ بھی اس طرح کہ عموماً لیٹ کر ہی دیکھتا اور لکھتا ہوں۔ لہذا گزارش ہے کہ اس دوسری خدمت سے مجھے معاف فرمائیں۔

آپ نے تنظیم سے علیحدگی کے جس ارادے کا اظہار فرمایا ہے، میرا مشورہ ہے کہ ابھی توقف فرمائیں۔ نئی صورت حال کے نتائج کا ابھی کچھ دنوں جائزہ لے لینا ضروری ہے، ممکن ہے کہ رخ کچھ بہتری ہی کی طرف ہوجائے۔ میں اگر چہ حاضر نہیں تھا، نہ مجھے اس کی کوئی تفصیل ہی معلوم ہے کہ مجلس نمائندگان کی کارروائیوں اور بحثوں کا انداز کیا رہا ہے، اس کے باوجود میرا حسن ظن تھوڑا بہت یہی ہے کہ ان شاءاللہ مستقبل ماضی سے بہتر رہے گا۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ لہذا پھر عرض کروں کہ ابھی صبر اور توقف سے کام لیں۔

والسلام

صدرالدین اصلاحی

☆☆☆

ضیاء الہدیٰ کے جماعت اسلامی سے استعفیٰ کے بعد کی خط و کتابت

ضیاء الہدیٰ کا جماعت اسلامی، ہند کی رکنیت سے استعفیٰ نامہ

بسمہ تعالیٰ

پٹنہ۔ بہار
یکم رمضان المبارک
۱۴۱۱ھ

محترم امیر جماعت اسلامی ہند السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ عرض مدعا یہ ہے:

اب تک اپنے بعض بزرگوں اور عزیزوں کے مشورے اور خواہش کے احترام اور لحاظ کے پیش نظر اپنے آپ پر جبر کرتا رہا۔ لیکن اب میرا ضمیر مجھے چین لینے نہیں دے رہا ہے۔ زندگی اور موت کا تو کبھی بھی اعتبار نہیں مگر عمر کے جس مرحلے میں اب میں ہوں اس میں ویسے بھی آدمی کو موت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

اپنے رب سے میں اس داغ کے ساتھ ملنا نہیں چاہتا کہ وہ سوال فرمائے کہ باطل کو مٹانے کیلئے جو جماعت قائم کی گئی تھی باطل کو عملاً سہارا دینے کی پالیسی پر گامزن کر دی گئی اسکے باوجود تو اس سے وابستہ رہتے ہوئے ہمارے سامنے حاضر ہوا ہے۔ کیا تجھے فراست ایمانی اور فہم دین اس لئے عطا ہوا تھا کہ وہم اور خود فریبی پر مبنی دلیل کو تو رد نہ کر سکے جو ہمارے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتی۔

کیا روس سے مسلمان تمام تر قہرمانیوں کے باوجود ختم کر دیئے گئے۔ کیا چین سے مسلمان مٹائے گئے۔ کیا برما سے مسلمان نابود کر دیئے گئے۔ ہاں کیا اس وقت سے بھی زیادہ خطرناک اور نازک گھڑی آ گئی تھی جبکہ ہمارا آخری نبی ہماری بارگاہ میں گڑگڑا کر عرض کر رہا تھا کہ یہ مٹھی بھر جماعت اگر ختم ہوگئی تو قیامت تک روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔ اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی کیا ہم نے حکمت عملی کے طور پر ادنیٰ سی مداہنت کی بھی اجازت دی۔

چنانچہ میں جماعت اسلامی ہند کی بنیادی رکنیت سے مستعفی ہوتا ہوں اور اب آپ کی جماعت کے ضابطوں اور قیود سے بالکل آزاد ہوگیا۔

براہ کرم آئندہ اس سلسلے میں خط و کتابت کی زحمت نہ فرمائیں۔ اور اگر آپ کی طرف سے کوئی تحریر آئے بھی تو مجھ سے کسی جواب کی امید نہ رکھیں۔

فقط
والسلام
ضیاء الہدیٰ

جناب شفیع مونس صاحب نائب امیر جماعت اسلامی کا خط ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کے نام

۹۱/۳/۲۱ء

برادر محترم ومکرم السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

اب سے ڈیڑھ دو ماہ قبل میں نے یہ چاہا تھا کہ دو ایک روز کے لئے پٹنہ آؤں تا کہ آپ اور دیگر رفقائے جماعت سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع ملے اور وہاں کے جماعتی کام کے سلسلہ میں بھی ضروری چیزیں دیکھی جاسکیں۔ قیم جماعت جناب محمد جعفر صاحب بھی اس پروگرام میں شرکت کے لئے آمادہ تھے مگر بعد میں اس خیال سے پروگرام ملتوی کر دیا گیا کہ کچھ دنوں کے بعد کسی ایسے موقع پر پٹنہ آنا زیادہ مفید ہوگا جبکہ حلقہ کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا ہو اور حلقہ کی ارکان شوریٰ سے بھی بالمشافہ گفتگو ہو سکے میرا خیال ہے کہ انشاء اللہ آئندہ ماہ اسکا موقع مل سکے گا۔ ابھی محترم امیر جماعت کے نام آپ کی موصولہ تحریر ملی۔ میرا خیال یہ ہے اور قیم جماعت نے بھی محتاط انداز میں اسی سے اتفاق کیا ہے کہ غالباً پارلمانی الکشن میں ووٹ کے استعمال سے متعلق ہمارے یہاں جو بحثیں چلتی رہی ہیں کچھ انہیں کا تاثر آپ کے ذہن پر ہے جیسا کہ ایک دو بار مجملاً آپ سے گفتگو بھی ہو چکی ہے میں شروع ہی سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ اگر ہمارے ارکان جماعت خاص طور پر جماعت کے ذمہ داروں کو کھل کر تبادلۂ خیال کا موقع ملے اور ایک دوسرے کے خیالات سے وہ دلائل کے ساتھ واقف ہوتے رہیں تو انشاء اللہ اس کا نتیجہ خیر اور اطمینان کی صورت میں برآمد ہوگا۔ اس حقیقت سے آپ میرے مقابلہ میں زیادہ واقف ہیں کہ جب کسی جماعت کے سامنے کچھ زیادہ پیچیدہ سوالات آجاتے ہیں تو وہ خیر واستحکام کا باعث ہوتے ہیں بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ان پر غور ہوتا رہے اور مجھے جماعت کے ارکان اور ذمہ دار رفقاء سے اس بات کی توقع ہے کہ انشاء اللہ ہمارے درمیان ایک خاص مسئلہ میں جو اختلافی خیال پیدا ہو گیا ہے نہ صرف یہ کہ وہ رفع ہوگا بلکہ بہتر نتائج سامنے لائے گا۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اور ہاں میں اپنا یہ ناچیز خیال بھی صاف صاف ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے پیدا ہونے کے وقت جو پریشان کن فضاء محسوس ہوئی تھی الحمدللہ اس میں کمی آئی ہے اور ہمارے اذہان بہت سنجیدگی کے ساتھ مسئلہ کو ٹھیک طور پر سمجھنے سمجھانے کے لئے آمادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بنا پر میری گذارش یہی ہے کہ آپ خود بھی پر امید ہو کر افہام وتفہیم کی مناسب راہیں اختیار کریں اور ہم سب اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی کریں کہ اسکی رہنمائی اور مدد ہمارے شامل حال ہو۔

محترم امیر جماعت حیدرآباد سے اپنے وطن چلے گئے ہیں۔ ابھی واپسی نہیں ہوئی ہے اور جناب قیم جماعت سلام عرض کرتے ہیں۔ ماہ صیام کی خصوصی دعاؤں میں ہم کو بھی یاد رکھیں۔

والسلام
شفیع مونس

ضیاءالہدیٰؒ کا خط مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کے نام

بسم اللہ

پٹنہ
۶؍مئی ۹۱ء

مولانا مکرم السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کو بخیر وعافیت رکھے اور آپکی رفاقت کو ہم لوگوں کے لئے باعث تقویت بنائے!

معلوم ہوا کہ آپ نے میرے استفسار کے جواب میں ایک خط لکھا ہے، لیکن وہ اب تک موصول نہیں ہوا۔ امید ہے کہ جعفر صاحب کی معرفت آپکو دوامل گئی ہوگی۔

جماعت اسلامی کی رکنیت سے میرے استعفیٰ کی اطلاع شاید آپ کو مل گئی ہوگی۔ دل تو قبل ہی اس پر مطمئن ہو چکا تھا لیکن مزید غور وفکر کے لئے کچھ توقف کرنا مناسب معلوم ہوا اور پھر آپ لوگوں سے ایک سال کے انتظار کا وعدہ بھی پورا کرنا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہتری کی امید ہو تو انتظار کو طول دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن امید کی کچھ بنیاد تو ہونی ہی چاہئے، جو مجھے نظر نہیں آتی۔ وہ رفقاء جو تحریک کو صحیح سمت میں چلا سکتے یا رکھ سکتے تھے وہ عملاً یا تو الگ ہو گئے ہیں یا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ تحریک کے ساتھ ساتھ مجھ جیسوں کا ذاتی نقصان بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ تلافی کی صورت نکالے۔

جماعت کے فکری استحکام اور انداز کار کی یکسوئی میں انتشار کا جو عمل لوگوں نے شروع کیا تھا وہ اپنے آخری مراحل میں ہے۔ انتشار صرف جماعت کا بکھر جانا ہی نہیں ہے بلکہ کسی جماعت کا اپنے مقصد سے عملاً الگ ہو جانا بھی انتشار ہی ہے۔ ووٹ دینے کی آزادی کا فیصلہ تو صرف ایک بہانہ ہے بتدریج عملی رویئے کی ایک بڑی تبدیلی کا، جسکا ثبوت ذمہ داروں کے بیانات ہیں جو شوریٰ کے حالیہ فیصلے سے ایک قدم آگے کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ اب مزید کسی انتشار کا سوال ہی باقی کہاں رہ جاتا ہے۔ ویسے بھی جماعت برائے جماعت اور استحکام برائے استحکام کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جماعت تو مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہے لیکن جماعت ہی خود مقصد بن جائے تو مجھ ناچیز کی رائے میں اس سے الگ ہو جانا ہی عین تقاضۂ دین ہے۔ ہم جیسے چند لوگوں کے جماعت کے اندر رہنے یا الگ ہو جانے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے، البتہ بعض لوگ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو جماعت کے اندر قائم رکھ کر اسکی ساکھ محفوظ رکھی جائے۔

ہمارے بعض ہم خیال رفقاء نے جو مرکزی عہدے دار ہیں مجھے طفل تسلی دینے کی کوشش بھی کی۔ شفیع مونس صاحب کا بھی ایک خط میرے نام آیا تھا، بعد میں وہ خود بھی آئے تھے۔ میرے خیال میں یہ حضرات یا تو اب تک خوش فہمی میں خود مبتلا ہیں یا دوسروں کو مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ اس موقع سے عبدالباری صاحب مرحوم کی بعض رفقاء سے متعلق رائے کافی وزنی معلوم ہوتی ہے۔

بہر کیف! زندگی کے اس مرحلہ پر آپ جیسے بزرگ رفقاء سے استفادے کی ضرورت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذہنی وجسمانی صلاحیت اور دین کی جو سمجھ عطا کی ہے اسکے مطابق عمل کرنے اور لوگوں کو اسکی طرف بلانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! آپ میرے لئے دعاء کریں۔ اپنے استعفیٰ نامہ کی ایک کاپی بھی ارسال کر رہا ہوں۔

والسلام

ضیاءالہدیٰ

محمد جعفر صاحب، قیم جماعت اسلامی ہند کا خط ضیاء الہدیٰ ؒ کے نام

۱۳/۶/۹۱ء

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

محترمی حسن رضا صاحب نے حال میں ایک خط میں آپ سے ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ الحمد للہ آپکے ذہن میں میرے سلسلہ میں قیمی کی ذمہ داری قبول کرنے سے متعلق جو باتیں تھیں وہ صاف ہو چکی ہیں البتہ آپکو میرے اس طرز استدلال سے تکلیف پہنچی ہے کہ میں الیکشن میں ووٹ کے استعمال کے فیصلہ سے اختلاف رکھنے والوں سے یہ کہتا ہوں کہ وہ اپنے موقف کے حق میں قرآن وسنت سے دلائل لائیں اور آپکو اس بات کا افسوس ہے کہ جب تک میں امیر حلقہ بہار تھا میرا یہ طرز استدلال نہیں تھا۔

قیمی سے متعلق میرے سلسلہ میں آپکے ذہن میں جو بات رہ گئی تھی وہ تو میرے خیال میں حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تھی لیکن یہ دوسری بات آپکے ذہن میں کیسے آئی ہے میں سمجھ نہیں سکا۔ میرا جو موقف امارت حلقہ بہار کے درمیان رہا وہ اب بھی ہے اور مجھے یاد نہیں کہ قیم جماعت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد کسی سے شخصی تبادلہ خیال میں یا کسی اجتماعی نشست میں میں نے یہ طرز استدلال اختیار کیا ہو۔ اگر آپ نے براہ راست میری گفتگو یا کسی تحریر سے خود یہ نتیجہ اخذ کیا ہے تو از راہ عنایت اس کا حوالہ دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ میں اپنی یادداشت پر زور دیکر سمجھنے کی کوشش کرونگا کہ یہ بات یا اس طرح کی بات میں نے کیوں اور کن حالات میں کہی ہے یا کیا بات کہی ہے جسکا تاثر یہ ہوا ہے اور اگر کسی اور سے آپ نے سنی ہے اور اسکی بنیاد پر آپکو میرے تعلق سے افسوس ہوا ہے تو از راہ عنایت آپ ایک بار پھر متعین طور سے اسکی تحقیق فرمالیں کیونکہ جس بات کو میں خود صحیح نہیں سمجھتا اسکا مطالبہ دوسروں سے کرنے کی جرأت کیسے کرسکتا ہوں امید ہے میرے تعلق سے آپ اس غلط فہمی کو بھی دور فرمالینگے۔ انشاءاللہ بقرعید کے موقع پر پٹنہ آؤنگا تو آپ سے تبادلہ خیال بھی کرونگا۔ سنا ہے کہ میری والدہ کو ہاتھ پیر میں رعشہ کی شکایت ہوگئی ہے اور غالباً یونانی علاج کرا رہی ہیں انکی صحت کے سلسلہ میں حسب ضرورت مشورہ کرونگا فی الوقت دعاء کی درخواست ہے۔ پرسان حال کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

طالب دعا

محمد جعفر

صدرالدین اصلاحیؒ کا خط ضیاء الہدیٰؒ کے نام

باسمہ تعالیٰ

پھول پور۔اعظم گڑھ
۶ ؍جولائی ۱۹۹۱ء

برادر مکرم ومحترم!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ خدا کرے بخیریت وبعافیت ہوں۔ میں بھی بحمداللہ فی الجملہ ٹھیک ہی ہوں، مگر عمر اور علالت دونوں ہی کا طول قدرتی طور پر اپنا اعصاب شکن اثر بڑھاتا ہی جارہا ہے۔ اکثر تو دو چار فرلانگ چلنا بھی دوبھر ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے عنایت نامے کے جواب میں اتنی غیر معمولی تاخیر ہوگئی۔ جس کے لئے احساس ندامت کے ساتھ معذرت خواہ ہوں، آپ کی یکسوئی کی اطلاع مجھے جلد ہی مل گئی تھی اور اس بات کی بھی کہ مونس صاحب آپ کے پاس گفتگو اور افہام وتفہیم کے لیے گئے بھی تھے۔ بہر حال آپ کے استعفیٰ کی اطلاع ملنے پر مجھے فطری طور پر ایک جھٹکا لگا۔ ہم نے اپنی پوری عمر اس تحریک سے وابستہ رکھنے کا فیصلہ اس طرح کے دن دیکھنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ لیکن میں آپ کو آپ کے اس اقدام پر موردالزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔ موردالزام اگر ٹھیرایا جاسکتا ہے تو انہی حضرات کو ٹھیرایا جاسکتا ہے جنہوں نے عاقبت اندیشی کا حق نہ ادا کرتے ہوئے ایسے حالات پیدا کردیے کہ آپ جیسا شخص بھی الگ ہوجانے پر مجبور ہوگیا۔ جہاں تک آپ کی اس فرمائش کا تعلق ہے کہ آپ کو اپنے مجوزہ تعمیر معاشرہ اسلامی کے کام اور پروگرام کے سلسلے میں کچھ مشورہ دوں، تو صحیح بات یہ ہے کہ اب میں اپنے جسمانی ہی نہیں، ذہنی اور دماغی ضعف کی بھی وجہ سے اس قابل نہیں رہ گیا ہوں کہ اتنے اہم مسئلے میں، یعنی ایک مستقل اسلامی تحریک وتنظیم کے خطوط کار کی کسی واضح اور حسب ضرورت تعین میں کوئی قابل اطمینان مشورہ دے سکوں۔ برادرم! مجھے تو اب از کار رفتہ ہی سمجھیے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ آپ کے شائع شدہ کتابچوں میں وہ بنیادی نکات موجود ہی ہیں جن کو سامنے رکھ کر آپ کام کا آغاز بآسانی کرسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق آپ کے شامل حال رہے۔ جوں جوں قدم بڑھتا جائے گا تجربہ بھی اور مزید غور وفکر بھی ان شاء اللہ آگے کی راہ کھولتا جائے گا۔

میری اس وقت کی معذرت خواہی یا اظہار عجز کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر زندگی کچھ دنوں اور باقی رہی اور ذہنی وفکری توانائی میں کچھ سدھار بھی آیا تب بھی میں آپ کو کوئی مشورہ دینے سے پہلو تہی کر جاؤں گا۔ آخر میں ایک تشویش ناک خبر بھی تحریر کر رہا ہوں۔ پرسوں یعنی جمعرات ۴؍جولائی کی شام میں مرکز جماعت سے بذریعہ فون آیا کہ سابق امیر جماعت، محترم مولانا محمد یوسف صاحب پر فالج کا حملہ ہوگیا ہے۔ خدا کرے حملہ ہلکا ہی ہو اور اب وہ روبصحت بھی ہوں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ فضل وکرم فرمائے اور موصوف کو شفائے عاجلہ وکاملہ عطا فرمادے۔ آمین

والسلام
صدرالدین اصلاحی

☆☆☆

حسنین سید صاحب کا خط ضیاء الہدیٰ ؒ کے نام

باسمہ تعالیٰ

دارالسلام
اسلام نگر، دربھنگہ
۲۸/۷/۹۱ء

برادر محترم و مکرم!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ آپ کے حال پر رحم فرمائے۔

آپ محسوس کرتے ہوں گے کہ بعض موقعوں پر بعض مسائل میں آپ سے اختلاف کے باوجود آپ کے لئے میرے دل میں غیر معمولی قدر اور محبت ہے۔

قومی تنظیم میں آپ کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت افسوس اور صدمہ ہوا، عمر اور صحت کے جس حال میں آپ ہیں آپ کے انتقال پر ملال کی خبر سننے کے لئے تو تیار تھا، جیسے مولانا محمد یوسف صاحب کے انتقال کی خبر ریڈیو پر سنی، افسوس تو ہوا مگر غیر متوقع نہیں تھی، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور فردوس میں ان کو جگہ دے۔ مگر آپ کے جماعت سے استعفیٰ کی خبر کے لئے ہم تیار نہیں تھے اس لئے غیر معمولی افسوس ہوا، اور اس حالت میں محترم امیر جماعت کو بہت سخت خط لکھ کر ارسا کر دیا۔

کوئی علم وتقویٰ کی کتنی ہی بلندی پر ہو اسکو اپنے کو نفس اور شیطان کے شر سے محفوظ نہیں سمجھنا چاہئے۔ جماعت سے استعفیٰ کیوں؟

اکتوبر ۱۹۴۱ء میں جب میں رکن بنایا گیا اس وقت تک جماعت اسلامی کا کوئی لٹریچر وجود میں نہیں آیا تھا۔ میں اپنے گاؤں کمھرولی میں تھا، ایک بزرگ ترجمان القرآن منگارہے تھے، ان سے لے کر پڑھا کرتا تھا، ستمبر ۴۱ء کا جو شمارہ آیا اس میں جماعت اسلامی کی تشکیل کی روداد تھی۔ اور جو دستور طے پایا تھا وہ بھی اس میں درج تھا، اسکو پڑھ کر ایسا لگا کہ میری دلی تمنا برآئی۔ اقبالؒ کے دو اشعار پڑھے تھے ؎

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اور یہ کہ ؎

لا کہیں سے ڈھونڈھ کر اسلاف کا قلب وجگر تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار

تو تشکیل جماعت اسلامی سے مجھ کو خلافت کی بناء استوار ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور میں نے بے جھجک اپنے آپ کو رکنیت کے لئے پیش کر دیا۔

میں نے مولانا مودودی رحمتہ اللہ کو مبارکبادی کے ساتھ ان کی شان میں یہ گستاخی بھی کر ڈالی۔ لکھا کہ ’’آپ بہت بڑا دعویٰ کر اٹھے ہیں، اللہ کرے کہ آپ مخلص اور ثابت قدم ثابت ہوں۔ ورنہ یہ ایک بڑا المیہ بھی ہوسکتا ہے‘‘ اور مجھ کو جماعت کا رکن بنا سکتے ہیں۔ جواب آ گیا کہ آپ کو رکن بنالیا گیا، دستور جماعت جو طے پایا تھا اور روداد جماعت جو ترجمان القرآن میں شائع ہوئی تھی

کتابچوں کی شکل میں ڈاک سے ارسال کیا اور ہدایت فرمائی کہ آپ اپنے حلقۂ تعارف میں جماعت کی دعوت کا تعارف کرانے کی کوشش کیجئے۔

اللہ کا شکر ہے مولانا مودودی رحمتہ اللہ اپنے اخلاص اور ثبات کا گہرا نقش اقامت دین کی تاریخ میں ثبت کر کے دنیا سے تشریف لے گئے۔ اب ہم نالائق ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی بجائے اس کو صدمہ پہونچانے کا باعث بنیں تو یہ ایک المیہ ہی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے اقامت دین یا خلافت کے قیام کی کسی کو ٹھیکہ داری کہاں دی ہے؟ رضائے الٰہی کی نیت اور جذبۂ اخلاص وتقویٰ کے ساتھ اپنی فہم اور ظرف واستعداد کے مطابق جدو جہد ہی کا مکلّف بنایا ہے نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مولانا مودودی رحمتہ اللہ کو میں نے ۷۷ء میں ایک صاحب کے ذریعہ دستی خط لکھا تھا، ان سے ملاقات اور پاکستان کی زیارت کی تمنا ظاہر کی تو اس کے جواب میں ڈاک کے ذریعہ لکھا کہ ''جس مقصد کے لئے ہم ۳۶ سال سے جدو جہد کر رہے ہیں امید بندھی ہے کہ وہ مقصد اب حاصل ہو جائے اگر اللہ کا فضل وکرم شامل ہوا تو پاکستان کو دارالسلام بنتا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔ لہذا جب پاکستان دارالاسلام بن جائے تو چند دنوں کے لئے آیئے''۔

۷۹ء میں دو سالوں کے بعد علی گڑھ کے کچھ طلباء مرکز جماعت اسلامی دلی کے دفتر میں ملے اور بتایا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں مولانا مودودیؒ کی خدمت میں حاضر ہونگے، آپ مولانا مودودی کو کوئی خط دینگے؟ میں نے کہا ہاں، میں نے مولانا مودودی کو لکھا کہ ''دو سال قبل میں نے آپ کی خدمت میں حاضری کی تمنا ظاہر کی تھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ پاکستان دارالاسلام بن جائے تب آنا، ایسی حالت میں آپ کو اپنی زندگی اور میری زندگی کی ضمانت دینی چاہئے''۔

اسکے جواب میں مولانا مودودیؒ نے ڈاک کے ذریعہ خط ارسال کیا اور لکھا کہ '' آپ کا دستی خط ملا۔ اس نصف ملاقات سے دلی مسرت ہوئی، اب خدا کرے کہ کسی دن آپ آجایئے اور پوری ملاقات نصیب ہو جائے۔ پاکستان کو دارالاسلام بنانے کی کوشش تو سنجیدگی سے ہو رہی ہے مگر اسکا انحصار اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ہے''۔

مولانا مودودیؒ نے اپنی پوری زندگی ایمان وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت اپنی فہم وذہانت سے اقامت دین کی جدو جہد میں کھپا دی اور پاکستان کو دارالاسلام دیکھنے کی تمنا لے کر دنیا سے تشریف لے گئے، اللہ ان کی جدو جہد کو قبول فرمائے اور پاکستان بالآخر دارالاسلام بنے، ہم لوگ بھی فہم کے مطابق نیک نیت اور اخلاص وللّٰہیت، صحیح سمت میں جدو جہد ہی کے مکلّف ہیں، شیطان کو یہ بات سب باتوں سے زیادہ ناگوار ہے، اللہ نے اسکو مہلت اور ذہانت دی ہے کہ ہماری راہ روکے، ہم کو شیطان اور اپنے نفس کی شرارتوں سے ہشیار رہنا چاہئے۔ اور شعوری طور پر اللہ سے پناہ مانگتے رہنا چاہئے۔

میں اپنی شام زندگی میں اقامت دین کی سمت میں اپنی سی ممکنہ جدو جہد کے ساتھ روزانہ یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ جماعت اسلامی کو مسخ ہونے اور منتشر ہونے سے بچائے، جماعت کو مخلص کارکن، اچھے رہنماؤں سے اور ضروری وسائل وذرائع سے نوازے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے ''امرھم شوریٰ بینھم '' آپ کو یہ قدم اٹھانا ہی تھا تو جو لوگ جماعت میں آپ کے فکر وخیال کے ہیں ان سے مشورہ کرتے، آخر مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب ابھی حیات ہیں ان کے علم وتقویٰ پر ان کی فہم وفراست پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

معاف کیجئے، آپ اور جناب انعام الرحمٰن خان صاحب مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی کے کس درجہ معتقد اور حامی تھے، ۸۲ء اور ۸۶ء میں بھی امیر جماعت کے انتخاب کے موقعہ پر آپ نے مولانا ابواللیث صاحبؒ کی حمایت کی تھی، اور میں نے مخالفت

کی تھی، بعد میں بالآخراب مولانا ابواللیث صاحب سے برگشتہ اور مایوس ہوگئے۔ انشاء اللہ حالیہ انتخاب کے بعد جو الکشن کے ذریعہ بھارت میں اقامت دین کے حامی ہیں ان کی سمجھ میں اب یہ بات آجانی چاہئے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مکہ مکرمہ اور مدینہ میں اقامت دین کا اسوہ پیش کرایا ہے وہی صحیح ہے۔

ہر شخص اپنی نیت اور اخلاص وللٰہیت کے مطابق ہی اللہ کے اجر کا مستحق ہوگا۔ ہم کو دوسروں کی نیت اور اخلاص پر شبہ سے بھی گریز کرنا چاہئے۔

آپ کی کتاب 'اسلامی معاشرہ' اور 'دور حاضر اور عذاب الٰہی' نظر نواز ہوئی۔ دوسری کتاب کے آخر میں آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ مسلمان جب عذاب الٰہی میں گھر ہی جائے اور کوئی صورت نجات کی نظر نہ آئے تو تسبیح یونس سوالاکھ بار (الانبیاء: ۸۷) اور ''وقدمنا الی ما عملو من عمل فجعلنه هبآء منثورا'' (الفرقان: ۲۳) اجتماعی طور پر پڑھے تو کتاب وسنت سے اسکی کیا سند ہے؟

ہر حال میں جماعتی زندگی گذارنے کی جاتا کید ہے جماعت سے الگ ہونے پر کیا آپ اپنے ہم خیال لوگوں کو لے کر کوئی جماعت بنا سکتے ہیں؟

اگر آپ نے جماعت سے اپنی رکنیت سے استعفیٰ پر اصرار نہیں کیا ہے اور ابتک آپ کا استعفیٰ منظور نہ ہوا ہو تو میری رائے میں استعفیٰ واپس لے لینا ہی بہتر ہے۔

والسلام
محتاج دعاء
محمد حسنین سید

افسوس ہے بینائی کی کمزوری کی وجہ سے سرے سے
لکھنا پڑھنا مشکل ہوگیا ہے لہذا عزیزی مولوی ریاض احمد فلاحی
سے اس خط کو املا کرانا پڑا ہے۔

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کا خط حسنین سید صاحب کے نام

باسمہ تعالیٰ

پھول پور۔ اعظم گڑھ

۲۷؍۶؍۳۰۴

برادر مکرم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

دعا ہے کہ مع متعلقین احباب بخیر وعافیت ہوں۔ چند روز قبل عنایت نامہ موصول ہوا، اس کے بعد سے میں نزلے کا اور پھر شدید ترین نزلے کا شکار ہوں۔ تیز بخار اور بلغم کی کثرت نے ضعف وناتوانی کو انتہا پر پہنچا دیا ہے۔ نمازیں گھر ہی پر اور بیٹھ کر ادا کر پاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جواب تاخیر سے ارسال کر رہا ہوں۔

اوائل ستمبر کے قبل تک چند مہینوں تک صحت خاصی حد تک بہتر رہی۔ مگر اب تازہ افتاد نے گویا نیم جان ہی نہیں نوے فی صد بے جان بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ عریضہ بھی لیٹے لیٹے لکھ رہا ہوں۔ اب تو کھلی آنکھوں دکھائی دے رہا ہے کہ جسم وجان کا رشتہ بوسیدگی کی اپنی آخری حد کو پہنچ کر اب ٹوٹا کہ تب ٹوٹا کی کیفیت سے دوچار ہو چکا ہے۔ بڑی عاجزی سے درخواست ہے کہ مجھ سیہ کار کی آنے والی زندگی کے لئے صدق دل سے دعائے خیر فرمائیے گا۔

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کے اقدام کے سلسلے میں ساری تفصیلات میرے علم میں ہیں۔ یہ اقدام تو وہ بہت پہلے کر چکے ہوتے مگر کچھ رفیقوں کی گزارشوں کی وجہ سے جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے، وہ مزید انتظار کے لئے آمادہ ہو جاتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ حالات خرابی کی طرف برابر آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں (ان کے اپنے جائزے کے مطابق) تو ان کی بے قراری بھی اپنی انتہاء کو پہنچ گئی، اور پھر انہوں نے وہ قدم اٹھا ہی دیا جس کا نہ اٹھانا ان کے بس میں نہیں رہ گیا تھا۔ ان کا ضمیر اب بھی خاموشی اختیار کیے رہنے کی اجازت دینے سے انکار کر چکا تھا۔

میری اپنی خواہش اور رائے تو یہی تھی اور ہے کہ وہ یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتے، اندر رہ کر ہی اصلاح حال کی کوشش جاری رکھتے، لیکن اب جب کہ وہ یہ قدم اٹھا چکے ہیں تو ان کے اس رویہ پر اس طرح کا تبصرہ بھی نہیں کرسکتا جس طرح کا تبصرہ آپ کے گرامی نامہ میں درج ہے۔ ضیاء صاحب جیسے مخلص، خداشناس اور باعمل انسان کے بارے میں میں یہ گمان نہیں کرسکتا کہ انہوں نے کسی غلط رجحان کے تحت یہ اقدام کر ڈالا ہے، یا غور وفکر کا حق ادا کئے بغیر رکنیت چھوڑ بیٹھے ہیں۔

والسلام

صدرالدین اصلاحی

صدرالدین اصلاحیؒ کا خط ضیاء الہدیٰؒ کے نام

پھول پور

۳۱ر مارچ

برادر مکرم ومحترم!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ خدا کرے آپ بخیر وعافیت ہوں آپ کے فرستادے، برادر عزیز راشد نیر صاحب تشریف لائے اوران کے ذریعہ گرامی نامہ بلکہ فرمائش نامہ مع کتابچہ موصول ہوا۔آپ جانتے ہی ہیں کہ میں جسمانی اور ذہنی طور پر اب اتنا ناکارہ سا ہو چکا ہوں کہ کسی اہم مسئلے پر کما حقہ غور وفکر کر کے اس سے متعلق ضروری باتیں ضبط تحریر میں لانا از حد دشوار ہو گیا ہے۔

تاہم جب آپ کی ایسی فرمائش ہے تو چند موٹی موٹی باتیں درج کرتا ہوں:

۱۔ اسلامی معاشرہ کی تعمیر وتشکیل کا صحیح، نتیجہ خیز اور مکمل خاکہ بنیادی طور پر تو خود آپ کے اس کتابچہ ہی میں موجود ہے، اور سچی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک اقامت دین کا بنیادی اور اولین مرحلہ اسی طرح کے معاشرے کی تعمیر ہی تھا اور ہے۔لیکن افسوس ہے کہ جماعت اس تعمیر کی مطلوبہ کوششوں کا اور اس کی ناگزیر ضرورتوں کا کما حقہ پاس ولحاظ نہ رکھ سکی، اور دیگر کم اہم یا بعد کے مراحل کے کاموں میں اپنی توجہات اور اپنی توانائیوں کا بیشتر حصہ صرف کرتی چلی آرہی ہے۔

۲۔ ایسی صورت حال میں ہمیں اپنے انداز فکر اور اپنی سمت سفر درست کرنے کی ضرورت ہے۔میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تعمیر معاشرہ کی مطلوبہ بنیادیں تو بالکل واضح ہی ہیں۔البتہ تفصیلات کی ضرورت پڑسکتی ہے۔لیکن جب کام صحیح طریقے سے یکسوئی کے ساتھ ہونے لگے گا اور ہوتا رہے گا تو پیش آمدہ حالات اور تجربات خود رہنمائی کرتے جائیں گے۔

غرض اصل ضرورت کسی تفصیلی خاکے کی نہیں، بلکہ صحیح رخ پر یکسوئی کے ساتھ کام کرتے رہنے کی ہے۔آپ کے بقول السابقون کا گروہ وجود میں لانا ہی اس مہم کی شاہ کلید ہے۔

والسلام

صدرالدین اصلاحی

سراج الاسلام صاحب، جماعت اسلامی، مغربی بنگال کے سابق رکن شوریٰ کا خط ضیاء الہدیٰ ؒ کے نام

باسمہ تعالیٰ

۹۱/۱۰/۷ء

جامبوریہ، ہاوڑہ

محترمی مولانا! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں۔ اور اقامت دین کیلئے ازحد کوشاں ہوں۔ شاید آپ پہچانتے ہونگے، مغربی بنگال میں سب سے پہلا بنگالی رکن جماعت جناب مولانا نورالاسلام خان صاحب جو مجلس نمائندگان کے رکن بھی چنے گئے تھے۔ ویسے حلقہ کے مجلس شوریٰ میں مسلسل رکن رہے تھے۔ بنگلہ اسلامی پرکاشنی ٹرسٹ کے بھی رکن ہیں۔ میزان Weekly کے اس وقت Acting Editor ہیں۔ انہوں نے جماعت کی رکنیت سے Resignation دے دیا ہے۔ انکے حکم سے لکھ رہا ہوں۔ انکے ساتھ کئی اور ارکان Election کے معاملہ میں جماعتی کام، Method وغیرہ میں اختلاف کرتے ہوئے جماعت چھوڑ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ باجماعت اقامت دین کیلئے تو کچھ کرنا ہی ہے۔ جناب خان صاحب اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کچھ کرنا (یعنی ایک جماعت کی تشکیل دینا) چاہتے ہیں۔ آپ بھی تو کوئی نہ کوئی Noble cause کے تحت چھوڑے ہونگے۔ لہذا جناب خان صاحب آپ سے Contact کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس بنا پر خط لکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ براہ کرم مندرجہ ذیل پتہ پر آپ کیا سوچ رہے ہیں خط وکتابت کے ذریعہ ہمیں اطلاع کریں۔ اور آپ کا وقت اگر آپکو Permit کرتا ہے تو کلکتہ تشریف لائیں تو بہت اچھا رہے گا تاکہ سب کے ساتھ تبادلہ خیال کا موقعہ ملیگا اور اس سے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کوئی راستہ نکل آئیگا۔

فقط والسلام

محمد سراج الاسلام

عبدالخالق بادل صاحب کا خط ڈاکٹر صاحبؒ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دفتر جماعت اسلامی مونگیر

۳۰ رنومبر ۱۹۹۱ء

محترم المقام جناب ڈاکٹر صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

امید ہے مع دیگر رفقاء خیر بخیر ہونگے۔

جس دن آپ سے ملا تھا اسی دن میں مونگیر واپس آ گیا۔ گھر میں میں نے بتا دیا کہ جماعت سے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ چند دنوں کے بعد اتوار تھا۔ ہفتہ وار اجتماع میں میں نے کارکنان اور امیدوار رکن کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا۔ یہ سلسلہ سورہ زمر کی آیت طاغوت والے سے درس دیا اسی کو اپنا موضوع بحث بنایا۔ ہمارے کارکنان پہلے سے بھی الیکشن وغیرہ کے مسئلہ سے واقف تھے۔ سبھوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ہم نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہے۔ ہم اسی دفتر سے انہی کتابوں سے دین کا کام انجام دیتے رہیں گے۔ مزے کی بات یہ کہ اس دفتر میں خدا نے سائن بورڈ نہیں لگنے دیا ہے۔

چند دنوں کی بات ہے اثر گنج تارا پور مسجد کے امام کا مسجد کے باہر گولی مار کر قتل کر دیا گیا اور ایک ٹیلر زخمی ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک قبرستان کیلئے جھگڑا چل رہا تھا یہ دونوں مزاحم تھے۔ میں چند دیگر تنظیم کے ذمہ داروں سمیت وہاں دورہ پر گیا۔ شبنم صاحب جیپ سے وہاں پہنچے ہم لوگوں کے متعلق معلوم ہوا۔ وہ مونگیر اقبال الرحمٰن صاحب کے ساتھ آئے مجھ سے ملے میرے یہاں رات کو قیام کیا۔ اقبال صاحب نے مجھ سے کہا دیہات سے دفتر شہر میں لے چلو۔ امیر حلقہ نے کہا کہ مونگیر کی جماعت ڈیڈ ہو گئی ہے۔ میں نے کہا میں جماعت سے علیحدہ ہو رہا ہوں آپ شہر دفتر کھولئے۔ وہ تو بیمار ذہن اور ڈاکٹر صاحب سے ملے ہو کیا؟ میں نے کہا ۱۹۷۴ء دہلی اجتماع اور بھوپال کے اجتماع کے موقع پر ہی میرا سخت ردعمل دیکھنے کو ملا ہے۔

شبنم صاحب تو ایسا سکتے میں گئے کہ جیسے لگتا تھا ہارٹ فیل کر جائینگے۔

میں استعفیٰ سے قبل امیر جماعت، امیر حلقہ، شوریٰ ونمائندگان کے اراکین سے خط وکتابت کرنا چاہتا ہوں دیکھوں کیا جواب دیتے ہیں۔ ویسے استعفیٰ لکھا ہوا تیار ہے۔ میں سمجھتا ہوں حلقہ ومرکز سب کو میرے متعلق معلوم ہو گیا ہوگا۔

محمود عالم صاحب سے السلام علیکم کہیئے گا۔

دیگر رفقاء کی خدمت میں بھی سلام عرض کر دیں۔ رفقاء اس سے مراد موجودہ رفیق۔

عبداللہ کا خط سعودی عرب سے آیا وہ کام سے لگ گیا ہے۔ دعاء کیجئے کامیاب وکامراں رہے۔

بقیہ سب خیریت ہے۔

فقط والسلام

خالق بادل۔ مونگیر

حمایت المقیت صدیقی صاحب (حیدرآباد) کا خط ضیاء الہدیٰؒ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مورخہ ۱۷/مئی ۹۳ء

محترمی ومکرمی جناب ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ ان شاء اللہ آپ بخیر وعافیت ہونگے

پچھلے بیس سال سے میں سعودی عرب میں حصول معاش کی جدوجہد میں مشغول رہا۔ اس عرصے میں جماعت اور رفقائے جماعت کے بارے میں گاہے گاہے کوئی خبر مل جاتی تھی۔ جب وہاں سے ریٹائر ہو کر ہندوستان واپس آیا تو سننے میں آیا کہ آپ بھی جماعت سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ البتہ استعفیٰ کا سبب معلوم نہیں ہو سکا نہ میں نے کسی سے دریافت کرنے کی کوشش کی۔

ادھر ملک میں پچھلے چھ مہینوں سے جو کچھ حوادث پیش آرہے ہیں اور ان کی روشنی میں مستقبل کے بارے میں جو اندازہ ہو رہا ہے وہ تشویشناک ہے اور اسی وجہ سے یہ خط آپ کو لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔

میری رائے ہے کہ سابق ارکان جماعت اور خصوصاً وہ جو جماعت کی پالیسی اور پروگرام سے مطمئن نہیں ہیں ایک بار مجتمع ہو کر اور باہمی تبادلہ خیال کے بعد کوئی اصولی اور مناسب حال راہ اختیار کریں۔ حیدرآباد میں چند سابق ارکان جماعت بھی ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہم اس ملک میں تحریک اسلامی کو ۱۹۴۷ء سے قبل کے موقف میں لیجائیں یعنی دعوت، تربیت، تنظیم وغیرہ ابتدائی کام سے آغاز کریں اور مولانا مرحوم کے چارنکاتی لائحہ عمل کی روشنی میں بنیادی کاموں پر زیادہ توجہ دیں۔

میری یہ تجویز ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں جہاں جہاں سابق ارکان پائے جاتے ہوں ان سے ربط قائم کر کے ایک اجتماع کا انتظام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم حیدرآباد میں ایسے ایک اجتماع کا انتظام کر سکتے ہیں اور کرنے کے لئے تیار ہیں اور آپ کی حد تک ریلوے سفر کے مصارف برداشت کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اس تجویز سے متفق ہوں تو جن سابق ارکان کے نام و پتہ آپ کو معلوم ہوں ہمیں بھیجئے تاکہ ہم انہیں بھی مدعو کر سکیں۔ جون یا جولائی ۹۳ء کے ختم تک اجتماع منعقد کیا جا سکتا ہے۔

اگر حیدرآباد کے بجائے یوپی یا بہار میں اجتماع کے انعقاد کی تجویز سامنے آئے تو ہم اس پر بھی غور کر سکتے ہیں۔

آخر میں اس بات کی وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ اس قسم کا اقدام ''جماعت'' کے خلاف کوئی محاذ آرائی نہ سمجھا جائے۔ سابق ارکان کو پہلے مرحلہ پر اسلئے مخاطب کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اصحاب پہلے ہی سے دین کا جامع وعالمی تصور اور اسلام کی تحریکیت کو سمجھے ہوئے ہیں ورنہ جماعت کے کسی آدمی کو جماعت سے توڑنے یا جماعت کی ''دُخمی'' میں قدم رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دین کے داعیوں میں باہمی تعاون ہونا چاہیئے نہ کہ تصادم۔ وتعاونوا علی البر والتقویٰ۔

آپ کے جواب کا انتظار رہیگا۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

مخلص

محمد حمایت المقیت صدیقی

متفرق خطوط

انیس الدینؒ، سابق امیر حلقہ، جماعت اسلامی بہار کا خط ضیاء الہدیٰ ؒ کے نام

چتر پور ۸؍۱اکتوبر ۷۵ء

برادر محترم السلام علیکم

کل بخیریت تمام پہونچا لیکن آ کر بیمار پڑ گیا، آثار گیا ہی میں ظاہر ہو گئے تھے، بہر حال حملہ شدید نہیں ہے۔ غالباً ایک ہفتہ میں صحت ہو جائیگی، گیا کا دورہ بہت کامیاب رہا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ پٹنہ سے لوگ گیا کے لوگوں کی رہنمائی کرتے رہیں، وقتاً فوقتاً دورہ بھی ہوتا رہے اور گیا پٹنہ کے تعلقات استوار ہو جائیں۔

خدا کے فضل سے یہاں سبھی حضرات مع الخیر ہیں، درسگاہ کی عمارت کے دو کمروں پر چھت پڑ گئی ہے ۱۵؍اکتوبر کو اسکا تالب کھول دیا جائیگا اور انشاء اللہ ۲۰؍اکتوبر کو باقی دو کمروں پر بھی چھت پڑ جائیگی آپ حضرات دعا فرمائیں کہ اس راہ کی رکاوٹیں جلد دور ہو جائیں۔

سالانہ اجتماع کے سلسلہ میں اردو، ہندی کے پوسٹر اور دعوت نامے طبع کرانے کی بات کر کے میں پٹنہ سے آیا تھا، ان کی طباعت نہ ہوگی، مکرمی طہ صاحب اور نسیم احمد صاحب کو مطلع فرمادیں، وجہ یہ ہے کہ محترم امیر جماعت اپنی صحت کی مجبوری اور مرکز میں بہت زیادہ مشغولیتوں کے باعث جنوبی بہار کے سالانہ اجتماع میں تو شرکت کر سکیں گے لیکن دوسرے مقامات کا دورہ نہیں کر سکیں گے۔ تاریخ بھی اب تک طے نہیں ہوئی ہے۔ میں نے ان سے صرف ۵؍دنوں کا وقت مانگا ہے جو چتر پور میں گذریگا، مگر سفر کی ترتیب طے ہو گئی ہے، حلقہ شمالی بہار، بنگال و آسام اور اسکے بعد آخری میں جنوبی بہار یعنی چتر پور تشریف لائینگے، اس وقت یہاں سردی خاصی پڑ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اجتماع کے موقع پر جاڑا شباب پر ہوگا۔ اب آپ حضرات یکسو ہو جائیں کہ صرف چتر پور کے اجتماع میں شرکت کرنی ہے۔

امید ہے دفتر کے لئے لوگ مکان تلاش کر چکے ہونگے، یا کم از کم اس سلسلہ میں غافل نہ ہونگے۔ سیٹی والے دفتر کے سلسلہ میں کیا ہوا کچھ امید ہے یا نہیں۔

یہ بھی امید ہے کہ شبیر صاحب کو آپ نے خط لکھ دیا ہوگا۔ آپکی شیروانی کا کپڑا گیا میں نہ مل سکا، ایک تو اتوار کی وجہ سے دوکانیں بند تھیں دوسرے ابھی سردی کے کپڑے بازار میں نہیں آئے ہیں۔ اگر آپ منظور کریں تو میں ہزاری باغ سے کپڑے منگوالوں، صرف آپ اپنی ناپ جلد از جلد بھیجدیں۔ اگر ناپ وقت پر مل گئی تو اجتماع کے موقع پر آپکی شیروانی تیار ملیگی۔

رفیق نسیم احمد صاحب کو کہدیں کہ حلقہ کی لائبریری کیلئے درج ذیل کتب خرید لیں، روپیہ بیت المال سے لے لیں میں یہاں ادا کر دونگا۔

1. Selected works of Marx & Engels Vol I & II.
2. Whitter world by Lawrence Benjamin
3. Challenge to Democracy
4. Political Theory by Asir Watham
5. Changing Hopes by Bertrand Russel

سالانہ اجتماع کے سرکلر کے سلسلہ میں مختلف مقامات سے جو جوابات موصول ہوئے ہیں ان میں ترپال اور دریاں بہت کم ہیں آپ حضرات کوشش فرمائیں کہ ان کی تعداد زیادہ ہو۔

محبوب عالم صاحب کے والد صاحب کا اب رویہ کیسا ہے مطلع فرمائیں۔ اس سلسلہ میں سخت تشویش ہے۔ امید ہے کہ وقتاً فوقتاً مجھے اطلاع ملتی رہیگی۔ خدا جلد از جلد اس معاملہ کو سلجھادے۔ اور فریقین کو عقل سلیم دے۔ آمین

میرا ایک ٹاٹ کا نیا جھولا اور ایک نیا تولیہ پٹنہ کے دفتر میں چھوٹ گیا ہے۔ حفاظت سے رکھوادیں۔ آتے وقت لیتے آئیں گے۔

رفیقی مولانا محمد حبیب اللہ صاحب کی طبیعت ناساز ہے، حلق کی تکلیف ہے اسلئے 99% امید ہے کہ وہ سالانہ اجتماع کے موقع پر نہ درس دے سکینگے اور نہ خطاب ہی کرسکیں گے، آپ ان دونوں چیزوں کیلئے تیار رہیں، بہت غور وتدبر کے بات یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ حلقہ میں کوئی دوسرا مناسب آدمی نہیں ہے اس وجہ سے اگر کوئی عذر ہو بھی تو اسکو رفع کرنے کی کوشش کرینگے ابھی وقت کافی ہے، نسیم احمد صاحب سے کہدیں کہ ان کی کتاب What is Marxism? جو موصوف نے مجھے دی تھی اب واپس نہ ہوگی وہ دوسری اپنے لئے خریدلیں، میں ان کو صرف قیمت واپس کرسکونگا۔ جملہ احباب و پرسان حال کو سلام مسنون۔

والسلام

انیس الدین احمد

☆☆☆

حسنین سید صاحب کا خط ضیاء الہدیٰ ؒ کے نام

۱۰ ستمبر ۸۵ء

برادر محترم ومکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ کرے کہ آپ اور محترمہ بھابھی خیر وعافیت سے ہوں، برادرم عبدالودود صاحب کے خط اور ۷ ستمبر کے دعوت سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے بحیثیت امیر حلقہ بہار اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لئے صحت واطمینان کے ساتھ ہر طرح کی آسانیاں بہم پہونچائے۔

میرے خیال میں آپ کی رخصت کے زمانہ میں حالات میں ابتری ہی پیدا ہوئی۔ بہتر ہوگا کہ آپ جلد سے جلد حلقہ کی شوریٰ کا اجلاس طلب کر کے حالات کا جائزہ لیں اور باقی ماندہ میقات میں دعوتی سرگرمیوں کو تیز سے تیز تر کرنے کے امکانات پر غور کریں۔

نیز یہ کہ محمد جعفر صاحب کو آفس سکریٹری کی جگہ معاون امیر حلقہ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع دینا بہتر ہوگا باقی انشاء اللہ عندالملاقات۔

والسلام

محتاج دعا

محمد حسنین سید

مَوار صاحب، آر۔ایس۔ایس کے ایک کارکن کا خط ضیاء الہدیٰ کے نام جن سے جیل کے اندر قربت کا موقع ملا

AVANTIKA
MOH : SULTANGANJ
19.2.77

Respected Doctor Saheb.

Adab Arz!

Hope you are quite all right and cheerful in your usual style. In my daily life I miss you so much. I am quite well. And the outside world too appears like a prison, a greater and bigger prison, with all the restrictions on my activities and movements. At Phulwari, friends were my companions, at home family members are my companions.

Today is the last day of my 15-days parole. But by your blessings I have been granted an extension of 45 days more with the usual restrictions.

Hope that Ram Nagina Baboo has left. If not kindly convey my regards to him. Please convey my 'Adab' to Dr. Khalil, Sri R. L. Gupta, Sri R. D. Mahto, Batooaji, Gangaji and other friends. I am anxious to know about 'Neta' and Dukhan Mahto.

In yesterday's Searchlight (Feb 18), the President of the Janata Party of Bihar has demanded the release of 50 Misa detenus. All the 50 names are there. Hope your name too figures in the list.

People who know, think that all of us would be released latest after the polls are over. The release may come earlier as well.

With my affectionate and respectful regards.

Yours as ever
Lalit
(L.K.S. Mawar)

مولانا ابواللیثؒ (سابق امیر جماعت اسلامی، ہند) کا خط ضیاء الہدیٰؒ کے نام

۲۱/اگست ۸۹ء
مرکز جماعت اسلامی ہند

برادر عزیز السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

تازہ دعوت میں برادرم جناب جعفر صاحب امیر حلقہ بہار کی طرف سے آپ کی صحت کے بارے میں جو اطلاع شائع ہوئی ہے، اسے پڑھ کر حد درجہ قلق وافسوس محسوس ہو رہا ہے۔ آپ کی ذات ہمارے لئے ایک نہایت قیمتی متاع کی حیثیت رکھتی ہے اور ذاتی طور سے مجھے آپ سے شروع ہی سے بہت زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ اور بحمد للہ اب بھی قائم ہے۔ میں دل سے آپ کی صحت کاملہ وعاجلہ کیلئے دعا کرتا ہوں۔ آپ کو خود تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کسی کو پابند فرمادیں کہ وہ آپ کی صحت کے بارے میں مجھے برابر مطلع کرتے رہیں، میں منتظر رہوں گا۔ ان دنوں تو میری صحت بھی خراب چل رہی ہے۔

دعاء کا خواستگار ہوں
والسلام
ابواللیث

صدرالدین اصلاحیؒ کا خط ضیاءالہدیٰؒ کے نام

بسمہ سبحانہ

پھول پور ۶/مارچ

برادرمکرم ومحترم!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ اللہ کرے آپ بخیریت وعافیت ہوں۔

''دعوت سہ روزہ'' میں یہ خبر پڑھ کر افسوس اور صدمہ ہوا کہ آپ کی اہلیہ محترمہ اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں پہنچ گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دعا ہے کہ رب رحیم وکریم ان کی نیکیوں کو قبول کرے، خطاؤں سے درگزر فرمائے اور بال بال مغفرت فرماتے ہوئے اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔ نیز آپ کو مومنانہ صبر کی توفیق سے نوازے۔ کسی عزیز کی جدائی یوں بھی غم واندوہ کی موجب ہوا ہی کرتی ہے، لیکن بعض حالات میں اس طرح کے حادثے غیر معمولی حد تک صبر آزما اور جان کاہ بن جاتے ہیں۔ آپ عمر کی جس منزل میں ہیں اور ابھی کچھ مدت ہی قبل اس قسم کے ایک اور صدمہ سے جس طرح دوچار ہو چکے ہیں اسے دیکھتے ہوئے موجودہ صورت حالات کو ایک غیر معمولی آزمائش ہی کہا جائے گا۔ مگر آپ کے اندر جس مومنانہ صبر وتحمل کا بلکہ تسلیم ورضا کا جو ہر دیکھنے والوں کو دکھائی دیا کرتا ہے، مجھے قوی امید ہے، یقین کی حد تک امید ہے کہ اس صدمہ کو پوری ایمانی شان کے ساتھ برداشت کر لے جائیں گے، اور پھر یہ مظاہرۂ صبر وبرداشت کل ان شاءاللہ آپ کے لیے اجر عظیم کا موجب بن جائے گا۔

آخر میں مرحومہ کے لیے رحمت ومغفرت کی پھر دعا کرتا ہوں۔

صدرالدین اصلاحی

☆☆

محمد جعفر صاحب کا خط ڈاکٹر ضیاءالہدیٰ صاحبؒ کے نام

۹۲/۲/۲۲ء

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امید کے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آج ڈاکٹر اختر رضا صاحب سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے یہ تذکرہ کیا کہ چچی صاحبہ کا تقریباً دو ہفتہ قبل انتقال ہو گیا اور آج میں برادرم احمد علی اختر صاحب کا ۹/فروری کا تحریر کردہ خط تقریباً دو ہفتے پر عبداللہ صاحب کے ہاتھ سے ملا جس سے بھی یہ خبر ملی۔ بڑا رنج ہوا۔ اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔ گرچہ کہ وہ عرصہ سے صاحب فراش تھیں اور آپ سے بہت دنوں سے الگ رہنے لگی تھیں تاہم ذہنی وقلبی قربت ولگاؤ خوب تھا اور جسکے اب نہ ہونے سے آپکو اپنی زندگی میں بڑا خلاء اور تنہائی کا احساس ہو رہا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ صبر وحوصلہ عطا فرمائے۔ میری والدہ اور اہلیہ سلام کہتی ہیں تعزیت کر رہی ہیں۔ دعائے مغفرت کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ تمام ہی رفقاء مرکز نے اپنے غم کا اظہار کیا ہے اور دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ سبھی آپکی خدمت میں سلام کہتے ہیں۔ محترم امیر جماعت رانچور میں ہیں۔

میں انشاءاللہ یکم مارچ کو پٹنہ آؤنگا۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی جانب سے اصلاح معاشرہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی ملاقات ہوگی۔ پرسان حال کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

طالب دعا محمد جعفر

ڈاکٹر جاوید اختر صاحب، سابق ناظم اعلیٰ، حلقہ طلبہ اسلامی بہار، کا خط ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ کے نام

بسم اللہ

انگلینڈ

۱۲/۱/۷۸ء

محترمی و مکرمی السلام علیکم

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

ایک عرصہ سے خط لکھنے کا ارادہ تھا مگر حالات نے اجازت نہ دی۔ یوں تو لوگوں کو خط لکھ ہی رہا تھا مگر آپ کو خط لکھنے کیلئے یکسوئی کی ضرورت تھی، بہرحال آج سونچا کہ یکسوئی کے انتظار میں کافی تاخیر ہو چکا ہے اس لئے آج یہ سلسلہ شروع کر دیا جائے ورنہ اس دنیا میں کب کسے یکسوئی ملی ہے جو مجھے ملے گی۔ آپ لوگوں سے رخصت ہو کر میں جب لندن پہنچا تو یقین مانیئے لندن airport پر ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دوسری جہاز سے واپس وطن عزیز پہنچ جاؤں۔ چوں کہ اس سے قبل کبھی والدین اور اعزا و اقارب سے جدائی کا موقع نہیں ملا تھا اس لئے اس فرقت وجدائی نے تو پریشان کر کے رکھ دیا۔ ایک ماہ کے Clinical attachment کے بعد جب ملازمت کی تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ میڈسن میں ملازمت نہیں مل سکتی ہے حالانکہ عارضی طور پر کام مل گیا تھا مگر اس کے بعد کہیں کوئی صورت نہ نظر آرہی تھی۔ ویسے دوسرے .Deptt میں ملازمت مل گئی تھی۔ کیوں کہ Precautionary measure کیلئے میں نے Surgery کے ایک ذیلی شعبہ میں Apply کیا تھا تاکہ میڈسن میں Job نہ ملے تو یہاں بیکار نہ بیٹھنا پڑے۔ مگر میں اپنی پسند اور ناپسند کے معاملہ میں بہت ہی نازک مزاج واقع ہوا ہوں۔ ارفع و اعلیٰ چیز پر ہی نگاہ ٹکی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ذہنی طور پر منتشر ہو کر رہ گیا۔ رنجیدگی اور مایوسی اس حد تک بڑھی کہ وطن عزیز واپس ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔ والد کا خط بھی آ گیا تھا مگر ٹھیک آخری وقت میں میڈسن میں Job مل گیا۔ ویسے اس سے قبل بھی میڈسن میں ہی کام کر رہا تھا مگر یہ بالکل عارضی تھا۔ مستقل Job مل جانے سے کچھ ہمت بندھی ہے یہاں زیادہ تر لوگ آتے ہیں کچھ سوچ کر مگر زمانہ کی گردش اور لیل و نہار انہیں کہیں اور ہی Settle کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مجھے Medicine سے والہانہ محبت ہے ظاہر ہے میں کام Surgery میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے پریشانی زیادہ ہوئی۔ ویسے اب اللہ کے فضل سے یکسو ہوں اور ملازمت بھی اچھی جگہہ ملی ہے۔ Teaching Hospital ہے۔ سیکھنے کے مواقع کافی ہیں۔ پڑھائی پوری طرح چل رہی ہے تاکہ یہاں سے علم و تجربہ کے ساتھ واپسی ہو۔ یہاں مشین کا استعمال اس قدر ہوتا ہے کہ ابتدا میں بہت دقت ہوتی ہے کیوں کہ ہم لوگ ان مشینوں کے استعمال سے ناواقف ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی ابتدا میں پریشان کن ہوتا ہے۔ یہاں کی انگریزی کا Tone، Accent وغیرہ قطعاً مختلف ہے اس لئے دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں کافی دقت ہوتی ہے۔ ویسے رفتہ رفتہ یہاں adjust کرتا جا رہا ہوں۔

پریشانی زیادہ کچھ اس وجہہ سے بھی تھی کہ آپ لوگوں کو ناخوش کر کے یہاں آیا تھا۔ کبھی معلوم ہوتا کہ میں سزا بھگت رہا ہوں۔ بہرحال امید ہے مجھے معاف کر چکے ہوں گے۔ ویسے یہاں آنے کی غرض و غایت میں یہاں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

میری مالی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ آمدنی میں اضافہ ہو رہا تھا مگر گھریلو ذمہ داریاں جس قدر بڑھتی جا رہی تھیں میری آمدنی اس کی متحمل نہ تھی۔ پھر موہوم سی امید پر Clinic کھولتے وقت دوسروں سے قرض بھی لے چکا تھا۔

ایک بڑی رقم قرض پڑھنے کے زمانہ سے چلی آرہی تھی، مگر میں Clinic کھولنے کے بعد بھی قرض کی ادائیگی پوری طرح نہ کرسکا۔ پھر بھائیوں کی پڑھائی پر صرفہ دن بدن بڑھتا جارہا تھا۔ گھر کا خرچ بھی کافی ہے ظاہر ہے ان حالات میں میرے والد محترم کے پاس ایک ہی چارہ تھا اور وہ یہ کہ میری طرح میرے چھوٹے بھائی فیروز کو بھی وہ کسی آدمی کے سر ڈال دیں۔ حالانکہ میں اپنے والد کے کردار سے اچھی طرح واقف ہوں، بہت ہی باکردار آدمی ہیں اور پیسہ کی ہوس ولالچ تو سرے سے ہے ہی نہیں مگر پیسہ کی مجبوری سے وہ اس رخ پر سوچنے لگے تھے، پھر فیروز سے چھوٹے چار بھائی اور ہیں۔ گویا اس انداز سے پیسہ کے لین دین کا سلسلہ ختم ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے علاوہ جن سے قرض لیا تھا، اسے بھی ادا کرنا تھا، ہر چند کہ کسی نے تقاضا نہیں کیا تھا مگر اپنا دل جس طرح مضطرب تھا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بالآخر مجبور ہوکر میں نے یہ سوچا کہ مجھے اس طرح اپنے آپ کو adjust کرنا چاہئے جس سے قرض بھی جلد سے جلد ادا ہوجائے اور گھر سے پیسہ کے لین دین کی کریہہ رسم بھی ختم ہوجائے۔ چنانچہ میں نے لندن کا رخ کیا۔ پیسہ کے ساتھ ساتھ یہاں تعلیم کا شوق بھی پورا ہونے کی امید تھی اس لئے اسے ہی مناسب سمجھا۔ ایک مثال میں آپ کو دے دوں تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ منان صاحب پٹنہ سیٹی سے میں نے آپکے توسط سے جو رقم لی تھی اس میں بھی -/125 روپیہ میرے ذمہ اب تک باقی ہے۔ منان صاحب میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟ اس طرح دوسروں کا بھی حال ہوگا۔ جب کہ قرض ایک دو ہزار نہیں بلکہ کافی بڑی رقم میرے ذمہ واجب الادا ہوچکی تھی۔ اس لئے پریشان ہوکر یہاں کا سفر کرنا پڑا۔ گیا کچھ روپیہ روانہ کیا ہے۔ امید ہے منو (میرے چھوٹے بھائی) آپ کو جاکر یہ رقم دے دینگے آپ اسے منان صاحب کو دے دینگے۔

جب میں انگلینڈ آنے والا تھا، تو میرے بہت سارے رفقاء کچھ اس انداز سے سوچ رہے تھے کہ میں شاید پیسہ اور مادہ پرستی کی طرف مائل ہوں۔ کچھ نے تو اپنے ہلکے پن کا مظاہرہ اس انداز سے بھی کیا کہ نہایت ہی ناگوار گزرا۔ کتنوں نے شک وشبہہ کی نگاہ سے دیکھا اور کتنی زبانیں تبصرہ پر اتر آئیں۔ یقین مانیئے اس وقت ہمارے دل پر جو گزرتا تھا وہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ کبھی لوگ یہ کہتے کہ اب جاوید صاحب بالکل بدل گئے ہیں۔ کبھی پیسہ کی ہوس پر تبصرہ ہوتا کبھی گزرے ہوئے ماضی کو سامنے رکھ کر حال پر کچھ اس طرح تبصرہ ہوتا کہ گویا میں اب وہ نہیں رہا جو قبل تھا یا میں نے راستہ بدل دیا ہے۔ آتے وقت اپنے ایک رفیق سے کہا کہ میرے لئے دعا کیجئے کہ میں یہاں سے کامیاب ہوکر وطن عزیز واپس آؤں تو انہوں نے کیا کہا ذرا یہ بھی سن لیجئے ''اللہ آپ کی جائز خواہشات کو پورا کرے''۔ بظاہر یہ دعا میرے لئے ضروری بھی تھی اور اب بھی اس کی ضرورت ہے، مگر اپنے ایک رفیق کی زبان سے اس انداز کی دعا سن کر دل برداشتہ ہوکر رہ گیا۔ جدائی اور فرقت نے یوں ہی دل پارہ پارہ کرکے رکھ دیا تھا مگر لوگوں کی شک وشبہہ بھری نگاہیں اور اس قسم کے جملے اور بھی پریشان کن ثابت ہورہے تھے۔ بہر حال جوں توں کرکے یہاں کیلئے رخت سفر باندھا۔ اور جب یہاں آخر وقت ہونے لگی تو دل نے یہی سمجھا کہ لوگوں کا دل دکھا کر یہاں آیا ہوں اسی کی یہ سزا ہے۔ جعفر صاحب کے خط میں میں نے معذرت کی تھی۔ امید ہے آپ نے اپنے دل میں میرے تئیں اب بھی نرم گوشہ موجود رکھا ہوگا۔

میں یہاں ڈگری حاصل کرنے کے بجائے تجربہ کو اہمیت دے رہا ہوں، تجربہ حاصل ہوجائے تو وطن عزیز کی طرف واپسی کے بارے میں سوچوں گا۔ اب ذرا یہاں کی روداد بھی سن لیجئے۔

یوں تو میں مغربی تہذیب کے زیادہ تر پہلو سے قبل بھی واقف تھا مگر جب اسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے کہ جنت اور دوزخ پر ایمان ہے۔ ہیبت ناکی کا تصور بھی ایک حد تک ہے مگر جب انسان سر کی آنکھوں سے دیکھ لے تو پھر اس کے دل کی دنیا ہی بدل جائے۔ یہی حال اس تہذیب کا بھی ہے۔ ہندوستان میں سنتا بھی آیا تھا اور اخبارات ورسالے

میں اس پر مضامین بھی پڑھے تھے مگر یہاں آ کر اس کی اصل حقیقت واضح ہوئی۔ انسان نے جس قدر ترقی کی ہے، وہ قابل دید ہے۔ زیادہ تر کام مشین سے ہوتا ہے۔ انسان صرف مشین Handle کرتا ہے۔ پیسہ کی فراوانی کا عالم بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ کام میں ایمانداری، فرض شناسی وغیرہ اب تک کافی ہے۔ لوگ نہایت ہی Soft Spoken ہیں۔ ایک دوسرے کو مدد کرنے کا جذبہ بھی کافی ہے۔ سارا کام وقت سے ہوتا ہے۔ ہر چیز میں حسن وخوبصورتی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو خوبصورتی عطا کی ہے مگر خوبصورتی برقرار رکھنا بھی یہ لوگ خوب جانتے ہیں۔ جمہوریت اگر دیکھنی ہو تو یہاں دیکھنی چاہئے۔ .T.V (ٹیلی ویژن) پر حکومت اور Tory Party پر جس انداز سے تبصرے ہوتے ہیں اور دونوں کو اپنی بات پیش کرنے کا جو موقع دیا جاتا ہے وہ بھی تعجب خیز ہے۔ حزب مخالف کو پورا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ معمولی سی غلطی کسی سے ہوئی اور اسے .T.V پر پیش کر دیا جائیگا اس لئے ہر لمحہ لوگوں کو خدشہ رہتا ہے اور کام میں ایمانداری سے کام لیتے ہیں مگر ہاتھی کے دانت کی طرح یہ بھی ظاہری حالات ہیں۔ باطن کھوکھلا ہے۔ جس میں حسن وخوبصورتی سرے سے نہیں ہے۔ جہاں مسکراہٹ کے برخلاف کرب اور اضطراب ملے گا۔ سکون وقرار کے برعکس انتشار ہے ایمانداری کی جگہہ صریح بددیانتی ہے، معاشرتی زندگی جس قدر گھناؤنی ہے شاید اس کا تصور بھی ناممکن ہے واقعی انسان جانور نظر آتا ہے۔ شوہر اور بیوی دونوں نے پوری طرح مصالحت کر رکھی ہے۔ نہ شوہر کو شکوہ بیوی سے ہے اور نہ بیوی کو گلہ ہے شوہر سے، جو جہاں ہے enjoy کر سکتا/ کر سکتی ہے۔ اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔ سب سے زیادہ ہنسی تو اس وقت آتی ہے جب ۸۰ برس کی بوڑھی عورت بھی فیشن کی آخری سرحدوں کو چھوتی ہوئی ملے گی۔ ہر عورت کے پاس ایک ہینڈ بیگ ضرورر ہے گا خواہ وہ جہاں بھی ہو اور اس میں فیشن کے متعلق تمام سامان موجود ملیگا۔ شراب کا استعمال پانی کی طرح ہوتا ہے۔ یہاں پانی سرے سے نہیں پیا جاتا ہے۔ کھانا ہر دو گھنٹہ پر کھایا جاتا ہے کبھی Snack کے نام پر اور کبھی Tea کے نام پر۔ دن رات میں کل ملا کر ۹ مرتبہ Tea, Snack اور Dinner ہوتا ہے۔ ہر آدمی Dieting کرتا ہوا ملے گا۔ تا کہ وزن گھٹایا جاسکے۔ مگر کھانے میں صرف کاربو ہائیڈریٹ سے احتراز کیا جاتا ہے بقیہ چیزیں کھائی جاتی ہیں۔

حال ہی میں پروفیسر خورشید صاحب کو اہلیہ اور بچوں سمیت Television پر ایک انٹرویو میں دیکھا۔ ''اسلام میں کھانے کا تصور'' سے متعلق انٹرویو تھا۔ پروفیسر خورشید صاحب کی اہلیہ عربی پردہ میں تھیں۔ انٹرویو اچھا تھا۔

جعفر صاحب اور اقبال صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ اس طرف دعوتی وتحریکی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ حلقہ طلبہ کا حلقہ بھی وسیع ہوا ہے۔ یہ خبر ملی تو کافی خوشی ہوئی۔ جسمانی طور پر یہاں ہوں مگر دماغی اعتبار سے پٹنہ وگیا کی گلیوں میں سیر کرتا رہتا ہوں۔ بھری محفل میں جسے رہنے کی عادت ہو وہ بھلا تنہائی کیسے برداشت کر سکتا ہے؟۔ دعا کریں کہ یہاں سے صحت اور ایمان کی سلامتی اور تعلیم، تجربہ اور سند کے ساتھ وطن عزیز واپس آؤں۔ اور میرے حق میں حالات سازگار رہیں۔ اس وقت میں بزرگوں کی دعا کا سخت محتاج ہوں کیوں کہ یہاں قلب ونظر کو مسلمان بنائے رکھنا سخت مشکل کام ہے۔ اللہ کے فضل سے فرائض کا اہتمام اپنی حد تک ہوتا ہے۔ ویسے اقامت دین کا کام یہاں تقریباً ٹھپ ہی ہے۔ اپنے رشتہ داروں کو خط لکھتا ہوں تو اس میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ اور امید ہے انشاء اللہ اس کا فائدہ نظر آئے گا۔

وہاں دفتر میں عبدالودود صاحب، نصیر خاں صاحب، جعفر صاحب اور احمد علی اختر صاحب کو میرا پر خلوص سلام عرض ہے۔ ساتھ ہی شمیم صاحب کو بھی (جو آپ کے بھتیجہ محترم ہیں)۔ رفقاء جماعت کو بھی سلام عرض کر دینگے۔ اچھا تو اب اجازت دیں۔

فقط والسلام ایم۔ جاوید اختر

متفرقات

اس حصہ میں منظوم تاثر کے علاوہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیں مسودہ کی کمپوزنگ کے مکمل ہونے کے بعد دستیاب ہوئیں۔اس لئے اسے ہم اسکے اصل مقام کے بجائے یہاں دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ؒ کی سرکاری ملازمت چھوڑنے کی خبر سن کر مولانا عروج قادریؒ نے یہ قطعہ اپنی ڈائری میں تحریر فرمایا تھا

قطعہ

۳۰/رجب ۱۳۷۲ھ بمطابق ۱۵/اپریل ۱۹۵۳ء

ہم نشیں بندش طاغوت سے تو چھوٹ گیا
بندش نفس سے اللہ کرے تجھ کو رہا
دیر سے راہ میں چھایا تھا اندھیرا ہر سمت
یک بیک پھیل گئی دور تلک تیری ضیاء

قطعۂ تاریخ رحلت

ضیاءالہدیٰ ؒ ۱۶؍صفر۱۴۱۹ھ

ارتضاءالدین حاذق سہسرامی

جگاتی رہی جس کو یاد خدا
وہی سوگیا جاکے مرقد میں کیا
عدد لے کے حاذق لکھو یاد کا
۱۵

مربی و داعی ضیاء الہدیٰ
۱۴۰۴

۱۴۰۴
۱۵
۱۴۱۹

مولانا ارتضاء الدین صاحب، رکن مجلس شوریٰ جماعت اسلامی بہار ورکن مجلس نمائندگان جماعت اسلامی ہند۔ عالم دین اور ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ کے دیرینہ تحریکی رفیق۔ (قیام: سہسرام)

ضیاء الہدیٰؒ کی ایک جھلک

محمد شہاب الدین ہمراز رہتاسی

آہ اے مرد مجاہد آہ اے مرد فقیر ۔۔۔ اب نظر آتا نہیں کوئی ترا ثانی نظیر
تیری رحلت سے بھی زیادہ ہم سبھی کو ہے یہ غم ۔۔۔ کس میں وصف رُحماء بینہم دیکھیں گے ہم
کس میں اب دیکھیں گے ہم حسن تبسم کا گداز ۔۔۔ کس کے چشمہ فیض سے حاصل کریں گے ہم نیاز
کس کی ذات محتشم کو ہم کہیں باغ وبہار ۔۔۔ کس کے انداز قیادت پہ کریں ہم دل نثار
کس کی شان بے نیازی کی قسم کھائیں گے ہم ۔۔۔ کس میں طرز حسن گویائی کو اب پائیں گے ہم
کس کے زہد واتقا سے ہوں گے ہم سب فیضیاب ۔۔۔ کس کے درس تربیت سے ہوں گے ہم سب کامیاب
کس کا ڈھونڈیں رہنمائی کے لئے نقش قدم ۔۔۔ کس کے حسن سادگی پہ ہم کریں گے چشم نم
کس کے ہم غربت کدہ پہ جاکے لیں درس غنا ۔۔۔ ہم کریں قربان اب جاکر کہاں اپنی انا
کس کے درپہ جاکے دیکھیں عہد ماضی کی بہار ۔۔۔ ہو تصدق اب کہاں پہ اہل ثروت کا وقار
کس کے عزم استقامت کا کریں اب تذکرہ ۔۔۔ کس کے ہم صبر وقناعت پہ کریں اب تبصرہ
کون ہے کہ اس سے پوچھیں اپنی راہ مستقیم ۔۔۔ کس میں اب اسلاف کا دیکھیں گے ہم طرز قدیم
کس کے دست ناتواں میں دیں قیادت کا علم ۔۔۔ میکدے کا کون رکھے گا بھلا تیرے بھرم
اب بجھائے کون تیرے میکشوں کی تشنگی ۔۔۔ یاس کی ظلمت میں ہے سب کی بڑھی آشفتگی
اب ترا نعم البدل کوئی نظر آتا نہیں ۔۔۔ جو چلا جاتا ہے واپس لوٹ کرآتا نہیں

چھوڑ کر نقش عمل جو چل بسے ضیاء الہدیٰ
۱۹۹۸
آہ ! اے ہمراز اب کہنا پڑا کہ الوداع

شہاب الدین صاحب، جماعت اسلامی ہند کے قدیم اور مخلص رکن اور سابق ناظم علاقہ، جماعت اسلامی ہند بہار کے مکتبہ کے انچارج۔ فکر اسلامی کی نمائندگی کرنے والے شاعر، ڈاکٹر صاحبؒ سے دیرینہ جذباتی تعلق۔ (قیام: پٹنہ)

فرزند حرم

(ضیاءالہدیٰؒ)

فراہیم احمد شارب

دستار فضیلت نہ عصا ہات میں دیکھا
لوگوں پہ جو اثرات تھے وہ بات میں دیکھا
اس شخص کی عظمت تو مساوات میں دیکھا
اعجاز قیادت رہ خطرات میں دیکھا
قرآں پہ وہ رکھتا تھا تدبر کی نگاہیں
اعجاز خطابت سے سلجھ جاتی تھیں راہیں

اسلام کی خدمت سے کبھی ہات نہ کھینچا
دن رات کی محنت سے چمن دین کا سینچا
باہوں میں سمیٹا کبھی آغوش میں بھینچا
سمجھا نہ کسی فرد کو کم رتبہ و نیچا
آئینۂ دل گرد سے جو پاک تھا اس کا
تنقید کا انداز بھی بے باک تھا اس کا

یہ شان امارت تھی کہ محبوب نظر تھا
دشمن کا بھی اقرار ہے وہ نیک بشر تھا
تحریک جماعت کے لئے سینہ سپر تھا
کرتا تھا اٹل فیصلہ پتھر کا جگر تھا
اس شخص کی آنکھوں میں تھی کردار کی قیمت
معلوم مجاہد کو تھی تلوار کی قیمت

پیکر تھا ہراک حال میں وہ صبر ورضا کا
رکھتا تھا دل شوق میں وہ خوف خدا کا
اس سیرت خوش رنگ کو زیور تھا حیا کا
کردار کی تعمیر میں جذبہ تھا جزا کا
حالات شکستہ میں بھی انداز جدا تھا
اس کے لئے ہتھیار سدا حرف دعا تھا

نکلا جو کبھی دشت طریقت کے سفر میں
بکھرا نہ کبھی ٹوٹ کے وہ راہ گذر میں
احیائے شریعت کا تھا احساس جگر میں
رکھتا تھا رسالت کو سدا اپنی نظر میں
منہاج کرامت سے الگ اس کی ڈگر تھی
مسلک کی روایت پہ زبردست نظر تھی

خورشید ہدایت تھا ضیاء بانٹ رہا تھا
درویش تھا سامان رضا بانٹ رہا تھا
قرطاس وقلم دیکھئے کیا بانٹ رہا تھا
تطہیر وطہارت کی دعا بانٹ رہا تھا
افکار وتجسس کا صحیفہ اسے کہئے
اس دور تذبذب کا مسیحا اسے کہئے

کتبہ ہے نہ چادر ہے نہ اک پھول چڑھا ہے
درویش کی تربت ہے مگر رنگ جدا ہے
سویا ہے ضیاءؔ خاک میں رحمت کی ردا ہے
شاید ترے محبوب کی یہ نیک دعا ہے
کرتے ہیں دعا صاحب تربت پہ کرم ہو
محبوب خدایا تجھے فرزند حرم ہو

فراہیم احمد صاحب، قادرالکلام شاعر، ڈاکٹر صاحبؒ سے فکری وذاتی تعلق، سابق گورنمنٹ سرونٹ (مقام: پٹنہ)

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ مرحوم

اس چمن سے بلبل شیریں بیاں جاتا رہا
ساز ہے خاموش، وہ نغمہ خواں جاتا رہا
وہ علم بردارِ صداقت، باصفا مردِ خدا
بے زبانوں کی زباں، وہ ترجماں جاتا رہا
جسکی سنجیدہ کلامی، رشک ہر شعلہ بیاں
جسکی حق گوئی تھی، باطل پر گراں جاتا رہا
جسکی آنکھوں میں نگاہ مرد مومن کی جھلک
بے نیازی جسکے چہرے سے تھی عیاں جاتا رہا
جسکی شخصیت، اثر انداز تھی ہر شخص پر
آہ! وہ مردِ مجاہد بے گماں جاتا رہا
گمرہی وتیرگی کے، وحشت زدہ ماحول میں
جس سے ملتی تھی ضیاء وہ ضیاؔء جاتا رہا
زندگی جسکی چراغ رہگذربن کررہی
اس جہاں سے وہ چراغ ضوفشاں جاتا رہا
راہ سے بھٹکے ہوئے، ہم غافلوں کے واسطے
جسکے سینے میں، تھا درد نہاں جاتا رہا
جسکے ایثار ومروت، کا تھا چمن بھی معترف
وہ گل خوشبو، وہ فخر گلستاں جاتا رہا
سخت مشکل ہے تلافی جسکی یہ نقصان ہے
کارواں بھی سست، ظفرؔ میر کارواں جاتا رہا

نتیجہ فکر: محمد ظفر امام ظفرؔ کاکوی **بہ قلم:** صلاح الدین احمد۔ احمدیہ کوچ، عالم گنج، پٹنہ

روز نامہ سنگم پٹنہ میں شائع ہوا 22.6.98 بروز جمعہ

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ

اطہر ہلسوی

وہ مرد باوقار وہ ہستی پر جلال
ہے جس کے انتقال پہ ہر شخص کو ملال

سنجیدہ ،خوش مزاج، طبیعت کے نیک تھے
کہئے کہ وہ ہزاروں کیا، لاکھوں میں ایک تھے

کچھ امتیاز تھا نہ سفید و سیاہ میں
امراء غریب ایک تھے ان کی نگاہ میں

بے باک حق پسند تھے مرد عظیم تھے
جن کے کلام میں تھا اثر وہ کلیم تھے

دریائے علم دین تھے کرتے تھے دل پہ راج
جن کو کہ اہل علم بھی دیتے رہے خراج

ہو اجتماع گاہ کہ محفل ہو بے نظیر
تقریر ان کی ہوتی تھی ہر جا پہ دل پذیر

شیریں زباں تھے پائی طبیعت میں سادگی
خوش قسمتی سے جو ملی صحبت کبھی کبھی

ان کی جدائی بن گئی بے شک دلوں کے داغ
بہار کے لئے تھے ہدایت کا اک چراغ

حق تو یہ ہے کہ دین کا اک شاہ باز تھا
شہر عظیم آباد کو خود جس پہ ناز تھا

اطہرؔ ہے ان کی روح مقدس کو سو سلام
اللہ ! ان کا جنت فردوس ہو مقام

اطہر ہلسوی، ڈاکٹر صاحبؒ کے شیدا اور قادر کلام شاعر (مقام: سوہ سرائے، بہار شریف)

ڈاکٹر صاحبؒ کے حج کی مختصر روداد

مرتب: راشد نیر

ڈاکٹر صاحبؒ نے حج ۱۹۹۲ء میں اپنے دو مقربین محبوب عالم صاحب، شریف کالونی، پٹنہ اور محمود عالم صاحب، نالہ روڈ، پٹنہ کے ہم راہ کیا۔ ان دونوں حضرات سے حاصل ہوئی معلومات کی بنیاد پر یہ مختصر روداد مرتب کی گئی۔

ڈاکٹر صاحب علیہ رحمہ کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی سنتوں کی پیروی کا جو اہتمام پایا جاتا تھا اس میں حج جیسے عظیم الشان فریضہ کی ادائیگی کی تمنا کا ہونا ایک فطری امر تھا۔ یہ خواہش اس وقت ارادہ میں بدل گئی جب ایک دفعہ چند رفقاء نے اپنے خرچ پر حج کرانے کی ان کے سامنے تجویز رکھی۔ اسی طرح سعودی عرب کی حکومت کی دعوت پر حج کو جانے والے وفد میں شامل ہونے کی پیش کش بھی ہوئی تھی۔ ان تجاویز کو تو ڈاکٹر صاحب نے قبول نہ کیا لیکن اس کے بعد سے اپنی محدود آمدنی میں سے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے حج کے اخراجات کے لئے ایک جھولے میں رکھنا شروع کیا۔ چند سالوں کے بعد جب جھولے میں جمع شدہ رقم کو گنا تو مطلوبہ رقم سے کم تھی۔ لیکن اسکے اگلے سال رقم پوری ہوگئی۔ اس لئے جیسے ہی محبوب عالم صاحب نے اپنے حج پر جانے کے ارادہ کا تذکرہ کیا تو ڈاکٹر صاحبؒ بھی ان کے ہم راہ چلنے کو تیار ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے حج کے سفر کی اطلاع کسی کو نہ کی بلکہ اخفاء برتنے کی کوشش کی اور اپنے دونوں ہم سفر رفقاء کو بھی اس کا مشورہ دیا۔ دوران سفر محمود عالم صاحب سے ملنے دہلی سے پہلے فیروز آباد اسٹیشن پر انکے شناسا اور انکی چوڑی کی فیکٹری میں کام کرنے والے اسٹاف کافی تعداد میں آئے۔ ان لوگوں نے محمود عالم صاحب کو پھول کا ہار پہنایا۔ وہ جب ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے تو انہوں نے مربیانہ انداز میں مزاحاً کہا کہ ''بہت اچھا لگ رہا ہوگا''۔ پھر فوراً ہار کو اتروا دیا۔ سامان کے بہ طور ڈاکٹر صاحب کے پاس ہاتھ میں ایک جھولا جس میں چند جوڑے کپڑے تھے اور کندھے پر ایک چھوٹا بیگ جس میں ضروری کاغذات سفر وغیرہ تھے۔ تمام سفر کے دوران ڈاکٹر صاحب نے اپنا سامان خود ہی اٹھایا۔ ان لوگوں کے ساتھ دہلی تک محمد ابراہیم بھی ہمراہ گئے۔ دہلی میں قیام حج ہاؤس میں ہوا۔ وہاں شفیق الرحمٰن صاحب اور جماعت اسلامی کے ذمہ دار شفیع مونس صاحب اور جعفر صاحب ملنے آئے۔ گرچہ ڈاکٹر صاحب نے کسی کو خبر نہ کی تھی۔ مکہ کے قیام کے دوران بھی کئی لوگ ملنے آئے اور اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہا لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کسی کے یہاں نہیں گئے، صرف محمد داؤد (محبوب حسین صاحب مرحوم، رمنہ روڈ، پٹنہ کے صاحبزادے) کے گھر گئے۔ یہ اس وجہ کر بھی کہ خانہ کعبہ کی نماز باجماعت نہ چھوٹے۔ دوران سفر غذا عموماً دہی روٹی رہی، پٹنہ سے ہمراہ چنے کا ستو بھی لے گئے تھے۔ دونوں رفقاء سفر کے کھانے میں گرچہ دوسری چیزیں بھی شامل ہوتیں۔ اسی لئے جب ان حضرات نے اخراجات کا حساب کرتے وقت، کیونکہ تینوں کے اخراجات منجملہ کئے جا رہے تھے، کچھ زیادہ رقم دینی چاہی تو ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ جب ساتھ ہیں تو برابر خرچ برداشت کیا جائے۔

ڈاکٹر صاحبؒ حج کے دوران کافی Energetic نظر آئے اور تمام ارکان کو بہت مستعدی کے ساتھ ادا کیا۔ عرفات، مزدلفہ، منیٰ اور مکہ کے درمیان پیدل سفر کیا۔ ایک دن عشاء کے بعد سے فجر تک رات بھر پیدل چلے۔ رفقاء پر اکثر تکان کا اثر دکھائی دیتا

لیکن ڈاکٹر صاحب پر اس کا اثر معلوم نہیں پڑتا۔ ایک دفعہ محمود عالم صاحب نے از راہ عقیدت پیر دبانے کی کوشش کی تو منع کر دیا۔ مکہ میں قیام کے لئے جو کمرہ ملا اس میں ایئر کنڈیشن لگا ہوا تھا۔ دوسرے اگر کھولتے تو ڈاکٹر صاحب اسے بند کروا دیتے۔ ایک تو ڈاکٹر صاحب کو اس کی عادت نہیں تھی اور دوسرے وہ اس طرح کی آسائشوں کو پسند نہیں فرماتے۔ سعودی عرب میں حج کے مقامات کو پر آسائش دیکھا تو کہا کہ "لوگوں نے حج جیسے عظیم فریضہ کو مذہبی پکنک بنا کر رکھ دیا ہے"۔ ڈاکٹر صاحب کا معمول یہ رہتا کہ تہجد کے وقت اٹھ کر حرم شریف چلے جاتے۔ جب تک قیام قریب میں رہا، مسجد قباء بھی تینوں تقریباً روزانہ جایا کرتے۔ رمی کے رکن کو تو ڈاکٹر صاحب وغیرہ نے وقت اور جگہ کی منصوبہ بندی کر کے بہ سہولت ادا کر لیا لیکن اس وقت جو افراتفری کا عالم ہوتا ہے اور لوگ جس بے ہنگم پنے کا مظاہرہ کرتے ہیں اس پر ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ یہ تھا کہ "لوگ تو شیطان کو مار رہے ہوتے ہیں مگر لگتا ہے کہ مانو شیطان دور کھڑا انہیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے"۔ دوران حج رفقاء کے سامنے ڈاکٹر صاحب کی روداد قلبی کا کوئی اظہار تو نہ ہوا البتہ جنت البقیع میں حضرت فاطمہؓ کی قبر کے پاس حالت میں تغیر نظر آیا۔ حضرت خدیجہؓ کی قبر کے پاس پہنچے تو رفقاء سے انکے عظیم احسانات کا تذکرہ کیا۔ مختلف مواقع پر ڈاکٹر صاحبؒ کی صحبت کی وجہ کر دینی نقطہ نظر سے معلومات اور ارکان کی درست ادائیگی میں جو سہولت ہوئی اس کا ان کے ہم سفر رفقاء کو اعتراف رہا۔

حج سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھ کھجور اور آب زم زم لائے اور رفقاء سے کہا کہ لے جانے کی چیز اصلاً تو صرف زم زم ہی ہے۔ واپسی پر ان لوگوں کو لینے دہلی محمد ابراہیم اور محبوب عالم صاحب کے لڑکے فیض گئے۔ ابراہیم سے ملتے ہی لپٹ گئے اور رقت آمیز لہجے میں پوچھا کہ "تحریکی کام جاری رکھے ہوئے ہے یا لپیٹ دیا"۔ واپسی کے بعد اپنے ہم سفر رفقاء کو خاص طور سے آپسی احتساب کے لئے بٹھایا اور پوچھا کے ہم راہ کی حیثیت سے ان کی ذات سے کوئی تکلیف انہیں ہوئی ہو یا کوئی کمزوری نظر آئی ہو تو بتائیں۔ ان لوگوں کی طرف سے ایسی کسی بات کی نشاندہی نہ کرنے اور پورے اطمینان کے اظہار پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ پٹنہ کی اپنی ہفتہ وار مجلس میں مختصراً اپنے حج کا تاثر بیان کیا۔ کعبہ پر پہلی نظر پڑنے کے وقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا اس وقت کعبہ سے ایک خاص طرح کے نور کے پھوٹنے کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے احرام کے کپڑے کو ٹکڑے کروا کر قریبی خواتین میں تقسیم کروایا اور ملنے کے لئے آنے والوں کو کھجور اور زمزم دیا اور اسے بعض کے گھروں میں بھجوایا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب

کچھ یادیں کچھ باتیں

پروفیسر احمد سجاد

۱۹۵۵ء کے اوایل میں محلّہ سوہ ڈیہہ، سوہ سرائے، بہار شریف کا ایک نوجوان پٹنہ کالج کا طالبعلم تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اسنے ان دنوں بہار شریف میں دینی و علمی اور اصلاحی تحریکات کی ہماہمی دیکھی۔ مولانا علی حسین عاصم بہاری کی مومن تحریک، محمد علی مرحوم کی اصلاحی تحریک، علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی خاکسار تحریک، اور صغریٰ وقف اسٹیٹ کے قایم کردہ ہائی اسکول کی علمی فضا مذکورہ وقف کے زیر اہتمام ادبی مجلسوں اور مشاعروں کی رونق، مخدوم شرف الدین بہاریؒ کی خانقاہ کے صوفیانہ مشغلے اور عرس کے موقعہ پر سہ روزہ دھوم دھام اور محرم کے اکھاڑوں کی 'اکھاڑ پچھاڑ' غرض پورا ماحول اپنے مخصوص انداز میں زندہ اور متحرک تھا۔ اس ماحول سے کٹ کے یکا یک جب وہ پٹنہ پہنچا تو اس نے جماعت اسلامی ہند کے ماہانہ اجتماع کا اشتہار ایک دیوار پر چسپاں دیکھا۔ سبزی باغ سے پوچھتا ہوا ایک بس کے ذریعہ درگاہ محلّہ کی مسجد بعد مغرب پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر مقامی پٹنہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب حاضرین سے خطاب کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر موصوف کی منطقی تقریر سننے کے بعد غالباً دن بھر کی تکان کے نتیجے میں اسے بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی۔ چنانچہ اس پہلی نشست کی کوئی بات اسکے ذہن میں محفوظ نہیں رہی البتہ اجتماع ختم ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی تعارف ہوا۔ آغاز میں گاہے گاہے اور سلطان گنج علاقے میں برسوں قیام کے دوران موصوف کے مطب میں تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی اور اکثر گھنٹوں مختلف موضوعات پر تفصیلی گفتگو ہوتی۔ رفتہ رفتہ یہ انکشاف ہوا کہ موصوف کا تعلق اسلام پور کے صوفی خانوادے سے بھی تھا اور چند ماہ دارالعلوم دیوبند کے طالبعلم بھی رہے مگر وہاں کی فضا راس نہیں آئی اور واپس آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی مدرسہ یا کالج ویونیورسٹی کی کوئی ڈگری تو نہیں حاصل کی مگر مختلف موضوعات کا مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ ان دنوں پٹنہ کی ادبی و شعری فضا بھی اپنے شباب پر تھی۔ انہیں ابتدائی عمر ہی سے غالب کی شاعری سے ایک خاص مناسبت تھی۔ چنانچہ اپنی نوجوانی کے زمانے کی ایک پرانی سی کاپی ایک روز عنایت کی اور کہا کہ اس میں اشعار غالب کی توضیع وتشریح عام ڈگر سے ہٹ کر کی گئی ہے، آپ علامہ جمیل مظہری اور پروفیسر اختر اورینوی کے شاگرد ہیں اپنے تاثرات سے مطلع کیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ عام شارحین غالب سے ان کا انداز بالکل جدا بلکہ نرالا اور خیال انگیز تھا۔ معلوم نہیں وہ نوٹس محفوظ ہیں بھی یا نہیں، قرآن اور اسلامیات پر موصوف کی نکتہ رسی پورے پٹنہ میں مشہور تھی۔ جماعتی دلچسپی اور رکنیت کے سبب ملازمت سے مستعفی ہو کر ہومیو پیتھی کی پریکٹس کرنے لگے تھے۔ سلطان گنج کا مطب، مریضوں، طالبعلموں، عقیدتمندوں اور بعض مسائل میں ان سے اخذ واستفادہ نیز تبادلۂ خیال کرنیوالوں کا یکساں ایک مشترکہ مرکز تھا۔ ظہر کی اذان سے تقریباً نصف گھنٹہ قبل بے تکلفی سے اٹھتے دونوں پاؤں میں پائجامے کے کپڑے کو سمیٹ کے کلپ لگاتے اور اپنی دیرینہ سواری پرانی سی سائیکل پر سوار ہو کر روانہ ہو جاتے۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں موصوف نے تقریباً پورے ہفتہ شہر کی کسی نہ کسی مسجد میں درس قرآن کیلئے اپنا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ مئی جون کی لو، اور تیز وتند ہوا چل رہی ہے۔ ساڑھے بارہ بجے جلتی دوپہر کا وقت ہے اور ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''کہاں چلے ڈاکٹر صاحب!'' جواباً فرمایا۔ ''آج فلاں دن ہے ظہر کی نماز گردنی باغ کی مسجد میں ادا کرنی ہے''۔ یعنی بعد نماز ظہر درس قرآن کا پروگرام ہے۔

موصوف کے عقیدتمندوں میں ایک نوجوان نے الکٹری سیٹی کی ٹریننگ لیکر اپنا کاروبار شروع کردیا تھا۔ ایک روز عالم گنج والے حجرے میں حاضری ہوئی تو چار پانچ پرانے مرکری ٹیوب کا گچھا بندھا ہوا انکے کمرے کی چھپر سے لٹک رہا تھا۔ باتوں باتوں میں بتایا کہ جس ٹیوب کو لوگ سال چھ ماہ استعمال کے بعد فیوز سمجھ کے کنارے ڈال دیتے ہیں ایسے چار پانچ ٹیوب کو اکھٹا کر کے ان بجلی مستری سے تبادلۂ خیال کے بعد کچھ ایسی ترکیب کی کہ پورا کمرہ روشن ہوگیا۔ کہنے لگے کہ ایسے ٹرانسسٹر ریڈیو کا تجربہ کیا جا چکا ہے جسے ہم لوگ اپنے تیار کردہ خانہ ساز ریڈیو اسٹیشن سے بیس پچیس کیلومیٹر تک بخوبی استعمال کرسکیں گے۔ جسے کاروباری انداز سے بازار میں لایا جاسکتا اور تحریکی طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

غرض ڈاکٹر صاحب کا نکتہ رس دماغ جس طرف مایل ہوجاتا کچھ نئی چیزیں ضرور ڈھونڈ نکالتا تھا۔ اس نکتہ رسی کے علاوہ ان کی صاف ستھری اور سادہ ترین دینی زندگی ہر شخص کیلئے متاثر کن تھی۔ موصوف پسند وناپسند کے معاملے میں بھی خاصے سخت تھے۔ چنانچہ بعض مباح چیزیں جیسے چائے اور پان کو بھی بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ اشیاء کی طرح بعض افراد کو بھی کسی وجہ سے پسند کرتے تھے تو بعض کو ناپسند۔ بعض اوقات اظہار ناپسندیدگی میں حد اعتدال سے بھی تجاوز کرجاتے تھے۔

تقریر وتحریر چونکہ انسانی سوچ کے عملی مظاہرے ہیں اس لئے ڈاکٹر صاحب کا جملہ تحریری وتقریری اثاثہ تحریک اسلامی کیلئے فضابندی اور افراد سازی کے گرد گھومتا ہے اور قیمتی ہے۔ ان کی مطبوعہ تحریروں کی ایک فہرست ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

۱۔ خلائی دور ۲۔ نماز ایک معجزہ ۳۔ نماز، قرب الٰہی کا ذریعہ ۴۔ قانون مکافات ۵۔ عذاب الٰہی اور دور حاضر
۶۔ سازش ۷۔ انقلابی تحریک ۸۔ اسلامی معاشرہ ۹۔ فطرت کے اشارے ۱۰۔ تدبر فی القرآن ۱۱۔ خیر وشر کا معیار
۱۲۔ تنظیم کے فطری اصول ۱۳۔ پندرہویں صدی اور اسکی اہمیت ۱۴۔ متحدہ سیرت کمیٹی کی دعوت کیا ہے؟
۱۵۔ سچا مذہب کیا ہے وغیرہ

بعض تحریریں ان کی نوشتہ، بعض تقاریر کو ان کے سامعین نے مرتب کیا ہے اور دروس قرآن ہیں اور بعض ان کی املا کرائی ہوئی تحریریں بھی ہیں۔ تقریباً جملہ تحریریں، مختصر اور جامع ہیں۔ اس اختصار کیوجہ سے سامعین ان کے بنیادی نکتوں کو آسانی سے ذہن نشیں کرلیتے تھے۔ انداز بیان صاف، سادہ، مدلل، اور دلنشیں ہوتا اس لئے پڑھنے میں بھی قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان تحریروں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اختصار کی وجہ سے جن موضوعات کو چھیڑا گیا ہے ان کے عملی پہلوؤں میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب مرحوم مزاجاً ایک آئیڈیالسٹ مربی تھے۔ اس لئے عمر بھر اپنے سے قریب رہنے والے نوجوانوں اور افراد کی اسی انداز سے ذہنی تربیت کرتے رہتے تھے۔

بعض تقاریر ان کے طویل غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً ان کا مقالہ ''متحدہ سیرت کمیٹی، پٹنہ کی دعوت کیا ہے؟'' جو ماہنامہ 'زندگی' کے شمارہ اپریل ۶۸ء میں شایع ہوا تھا۔ اس مقالے میں ملی ''متفقہ بنیادوں'' کا تذکرہ کرنے کے بعد ''ملت فروشی کی کاٹ'' نیز ''بازاری سیاست'' پر بھی اپنے تنقیدی تاثرات کو واشگاف لفظوں میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں انبیائی سیاست کے ذیل میں حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے مثالی کردار کی علمبردار پارٹی بنانے پر خطیبانہ انداز سے ایک ایک پیراگراف میں مشورہ دیا ہے۔ بعض ''بیوقوفیوں'' ''افتراق کی وجہ'' اور ''تحفظ'' ''فسادات کے نئے رخ'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیاسی اخلاق نہیں ''اخلاقی سیاست'' اور دیگر ذیلی موضوعات پر بھی چند جملوں میں ایمان افروز باتیں بتائی ہیں مگر ہندوستان کی برہمنی، مشرکانہ وفرقہ وارانہ اور ذات پات کی سیاست میں ''اخلاقی سیاست'' کیلئے ہندوستانی مسلمانوں کو کن مراحل ومسایل سے گزرنا اور نمٹنا ہوگا اس کی عملی شکل کیا

ہوگی؟ ان امور پر روشنی نہیں ڈالی جاسکی ہے۔ توقع تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے مشہور کتابچہ ''انقلابی تحریک''، میں ان امور پر تفصیلی اظہار خیال کیا گیا ہوگا کیونکہ اس مقالہ کے پیش لفظ میں موصوف نے لکھا ہے کہ:

''دین قایم ہو جائے اس کی خواہش تو مجھے زمانہ شباب ہی سے رہی مگر اسکا نہج کیا ہو یہ سامنے نہیں تھا۔
چالیس سال سے زیادہ گزرنے کے بعد کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی مگر بحیثیت مجموعی نہج (Process)
پھر بھی واضح نہیں تھا''۔

ڈاکٹر صاحب نے پوری ایمانداری سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ چالیس سالہ غور وفکر کے باوجود سیاسی نہج یا لائحہ عمل ان پر واضح نہ ہوسکا۔ سچ تو یہ ہے کہ آخر عمر تک موصوف اس مسئلہ خاص میں الجھنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ ہندوستانی سیاسی وسماجی تناظر میں اس کا کوئی حل نہ پیش کرسکے بلکہ بعض امور میں اپنے مطالعہ اور دلائل کی وجہ سے اس قدر جذباتی ہوگئے کہ جس تحریک میں انہوں نے پوری زندگی لگادی تھی اس سے مستعفی ہونے کے وقت مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب اور مولانا سید عروج قادری صاحب جیسے اکابرین تحریک اسلامی سے مراسلت کے باوجود اپنے استعفی نامہ پر نظرثانی کیلئے آمادہ نہ ہوسکے۔ مولانا سید عروج قادری صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی ایک تحریر کے جواب میں واضح لفظوں میں لکھا تھا کہ:

''میرے حقیر علم کی حد تک ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا کہ ہم جماعت سے الگ ہوجانے کی سوچیں''۔

مگر ڈاکٹر صاحب کے اس مسئلہ میں جذباتی ہونے کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ محترم امیر جماعت کے نام اپنے استعفی نامہ (مورخہ یکم رمضان ۱۴۱۱ھ) میں انہوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں انکے جذبات ابلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً

''...... پرکاہ برابر بھی وزن نہیں رکھتی...... تحریر آئے بھی تو جواب کی امید نہ رکھیں''۔

''انقلابی تحریک'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں شایع ہوا۔ نظرثانی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے سیاسی خیالات کو قرآن وسنت، تاریخ اسلام اور مروجہ سیاست کی روشنی میں نہایت مربوط اور مدلل بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ پیش کیا ہے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے پورے خلوص اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ماضی وحال کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد موصوف رقمطراز ہیں کہ

''جمہوریت بھی ایک مستقل نظام ہے اور ان سب کی بنیاد خدا سے بے نیازی یا اس کے انکار پر ہے''۔ مزید یہ کہ ''.... چنانچہ اسلام میں بالغ رائے دہندگی (Adult Franchise) کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے جس میں اکثریت کی رائے فیصلہ کن مانی جاتی ہے''۔

''.... اسلامی انقلاب کی اصل غایت جنتی زندگی کے نمونے پر دنیوی تہذیب وتمدن کو ڈھالنا ہے''۔

قرآن وسنت سے اخذ واستفادہ کے بعد ''مکمل یکسوئی، مفاد پرستانہ ذہنیت اور مداہنت'' سے احتراز ''اخلاق حسنہ کی آبیاری'' ''خدائی تائید پر بھروسہ'' ''منافقوں پر کڑی نگاہ'' کے ذیلی عنوانات کے تحت نہایت عمدہ ناصحانہ گفتگو کی گئی ہے اور بکثرت آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ باتیں ایمان افروز ہیں مگر پھر بھی یہ سوال رہ جاتا ہے کہ ہندوستانی یا عالمی تناظر میں مسلمان کہیں اکثریت تو کہیں اقلیت میں ہیں اس صورت میں عملی سیاسی حل کیا ہو اس رخ کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ نہ ہی صلح حدیبیہ، حضور کی حلیف سازی، میثاق مدینہ یا ووٹ کو بطور ہتھیار (بطور عقیدہ نہیں) استعمال کرنے کے مسایل پر کوئی سیر حاصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ جمہوریت کی تمام

کمزوریوں کو تسلیم کرتے ہوئے جمہوریت کی روح، خود کو بدلنے کی جو باضابطہ اجازت دیتی ہے اور جس سے ساری دنیا کی مسلم جماعتیں، دینی تحریکیں، دشمنان اسلام اور مختلف نظریات کے حاملین ہر جگہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس صورت حال میں عارضی وعبوری طور پر ہندوستان کے مسلمان اور دینی جماعتیں کیسے استفادہ کر سکتی ہیں ان معاملات کو ڈاکٹر صاحب کا ائیڈیل ذہن شاید قابل غور نہیں سمجھتا۔ کم وبیش تمام مسلمانوں کا آئیڈیل تو وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب مدلل انداز میں پیش کرتے ہیں مگر اصل مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ ہندوستان کے مخصوص سیاسی تناظر میں ہمارا واقعی لائحہ عمل کیا ہو سچ تو یہ ہے کہ یہ موضوع ڈاکٹر صاحب کا میدان کبھی نہیں رہا۔ پھر بھی انہوں نے ''انقلابی تحریک'' کے موضوع پر چالیس سالہ اور پھر پنچ سالہ مکرر غور وفکر کے بعد جو مربوط آئیڈیل پیش کیا ہے اس میں دیندار مسلمانوں اور تحریکی کارکنوں کیلئے اچھا خاصا ائیڈیل مواد ہے جس کا مطالعہ ضرور ہونا چاہئے۔

ان کتابچوں کے علاوہ 'نماز ایک معجزہ' دروس قرآن 'اسلامی نظام تعلیم' سچا مذہب کیا ہے وغیرہ میں ڈاکٹر صاحب کی جولانی فکر قابل دید ہے۔ ''اسلامی نظام تعلیم'' میں مضمون نگار نے ''تعلیم سے متعلق چند قرآنی اشارات'' میں بنیادی آیات کا نچوڑ پیش کرنے کے بعد ''لازمی تعلیم'' کا خاکہ اہم نکات کی شکل میں پیش کیا ہے۔ پھر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ''نماز کا اہتمام اور تعلیم' اعلیٰ تعلیم' ''علم النفس' تاریخ: ''تاریخ اقوام وملل کے سلسلے میں بتانا ہوگا کہ تاریخ کن مراحل سے گذر رہی ہے اور آگے کون سا موڑ مڑنے والی ہے''۔

اسی طرح ''سائنس'' ٹکنالوجی اور آخر میں ''عالم آخرت'' اور دنیا'' چند نکات کے ذیل میں نو نکات کے آخر میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری کو اس طرح پیش کرتے ہیں

> ''مسلم علمی ماہرین کی ذمہ داری یہ ہے کہ تمام علوم کی بنا اور ترقی کا نہج قرآن وحدیث کی روشنی میں متعین کریں اور باطل اصول ومبادیات پر ہونے والی علمی ترقی واختراعات کی نشاندہی کریں نیز انسان کی طبعی تمدنی واخلاقی زندگی پر ان کے متوقع اثرات سے اوران کے نتائج بد سے بچنے کی صورت سے آگاہ کریں''۔

یہ تمام باتیں نہایت عمدہ اور خیال انگریز ہیں مگر اپنے ملک میں اس آئیڈیل اسلامی نظام تعلیم کو تعلیم کے بھگوا کرن (Saffronisation of Education) والے ماحول میں کیسے نافذ کیا جائے اس سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔

''خلائی دور'' کے زیر عنوان مضمون ایک رسالہ کی شکل میں ۷ر رمضان المبارک ۱۳۸۹ء مطابق ۱۸ر نومبر ۱۹۶۹ء کو شائع کیا گیا جب امریکی خلا بازوں نے چاند کی سطح پر قدم رکھ کر دنیا میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک بڑی علمی خوبی یہ تھی کہ وقت کے ابھرتے اور چلتے ہوئے مسایل پر قرآن وسنت کی روشنی میں گہرے غور وفکر کے بعد وہ اپنی سوچ کے ماحصل سے کارکنان تحریک کے علاوہ عوام الناس کو بھی اخذ واستفادے کا موقعہ دیتے تھے۔ ان کی بیشتر تحریریں اسی ضرورت کی پیداوار ہیں۔ اس ضمن میں کبھی کبھی ان کے تخیل کی بلند پروازی حد اعتدال سے پرے لے جاتی تو اہل علم تنقید سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ آج سے اٹھارہ بیس سال قبل چتر پور کے ایک تربیتی پروگرام میں قرآن، حدیث، تاریخ، فقہ اور بعض علوم وفنون کے تحریکی مطالعہ کے طریق کار پر موصوف حاضرین کو ایک نوٹ املا کرا رہے تھے جس میں تشبیہاً چیونٹی اور مینڈک کی چال کا نکتہ اٹھایا تو مولانا ارتضا الدین حاذق ضیائی سہسرامی صاحب نے سخت تنقید کی اور وہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

حالانکہ اپنی بساط بھر موصوف غور وفکر کے ساتھ تحقیقی مواد بھی پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر دوسرے درجے کے ماخذ سے استفادہ کی وجہ سے اخذ نتائج میں سہو ہونا فطری ہے۔ علمی کام کرنے والوں کی سطح خواہ کتنی ہی بلند ہو اس طرح کے بشری تسامحات فطری ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب سے بھی اس طرح کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں مثلاً ''خلائی دور'' پر مدیر زندگی رامپور مولانا سید احمد

عروج قادری صاحب نے جواداراتی نوٹ (مارچ ۰۷ء) دیا ہے اس میں یہ نشاندہی کی ہے۔

''واقعہ معراج کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ حضورؐ کا سفر سدرۃ المنتہیٰ تک براق پر ہوا تھا یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔''

زندگی کے مدیر محترم نے حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر قرآن کے حوالے سے ان کی یہ تحقیق پیش کی ہے کہ ''حضرت جبرئیلؑ حضورؐ کو براق پر سوار کر کے بیت المقدس تک لے گئے اور وہاں براق کو ایک خاص چٹان کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر وہاں سے وہ حضورؐ کو کسی سواری کے بغیر سدرۃ المنتہیٰ تک لے گئے۔''

.........ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ براق کا چہرہ آدمی کے چہرے جیسا تھا۔ یہ بات کسی بھی صحیح ماخذ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ محض قصے کہانی کی بات ہوگی۔''

اس طرح چھٹی صدی ہجری میں ابن مقنع کے نقلی چاند بنا کر میدان کے ایک کنارے کے کنوئیں سے نکال کر دوسرے کنوئیں میں ڈبانے کی جو بات غیاث الغات وقرآن السعدین کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے درج کی ہے وہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (معارف اسلامیہ، مطبوعہ لاہور) کی تحقیق سے بالکل مختلف ہے۔ معارف اسلامی کے مطابق ابن مقنع ایک شعبدہ باز اوہ اپنے جسم میں الوہیت کے حلول کا دعویدار تھا چنانچہ خلفیۂ وقت نے بڑی مشکل سے اس کے فتنہ کا سد باب کیا۔

بہر حال ''خلائی دور'' ڈاکٹر صاحب مرحوم کے شاہکار کارناموں میں شمار کے جانے کے لائق ہے۔ جس میں خلا اور کائنات سے متعلق ایک درجن بنیادی سوالات اٹھا کر قرآنی آیات کی روشنی میں کائناتی حقائق پر پہلے فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے پھر خلائی سفر سے متعلق تکنیکی اور علمی رہنمائی مہیا کی گئی ہے۔ اس مقالہ کے آخری حصہ میں نکلیر (Nuclear) نظام کی طرح مزید چھوٹے نظام کی دریافت کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ جس کی طرف جدید سائنس انتھک محنت اور تحقیق کر رہی ہے۔

چنانچہ مائیکروٹکنالوجی (Micro Technology) کے بعد دنیا نینوٹکنالوجی (Nano Technology) کی دریافت میں بے پناہ خرچ کر رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لفظوں میں اس سے Super Electricity پیدا ہو سکے گی۔

اسی طرح موصوف نے مٹکے کے برابر جھڑ بیری والی حدیث سے یہ استنباط کیا ہے کہ سائنسی ترقی کا یہ بھی ایک لازمی مرحلہ ہے جو پیش آنیوالا ہے۔ بلکہ بایوٹکنالوجی (Bio Technology) کے ذریعہ اس میدان میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا جا چکا ہے۔

مقالہ کے آخر میں موصوف نے ''لا اقسم بالشفق .....ترکبن طبقا طبق'' کی روشنی میں حدیث شاطبی کی طرح ظلم وانصاف اور بربریت ورحمت کی آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی یہ دنیا بدر کامل یعنی امام مہدی کے ظہور سے آشنا ہوگی۔ وہی دور ہوگا جب تم طبق بہ طبق سواری کرو گے''۔ یہانتک کہ یہ کائنات آگے بڑھتی ہوئی مزید ارتقاء کی گنجائش سے خالی ہوکر پھٹ (Burst) پڑیگی۔ پھر اس کی جگہ ایک لامحدود کائنات موجود ہوجائیگی جہاں ارتقا کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہیگا اور کبھی ختم نہ ہوگا اور وہاں حکومت ایک اللہ کے سوا کسی کی نہ ہوگی۔ لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پروفیسر احمد سجاد صاحب، رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند اور صدر شعبہ اردو، رانچی یونیورسیٹی۔ اہل قلم اور معروف ادیب۔ ڈاکٹر ضیاالہدیٰؒ سے تحریکی تعلق۔ (قیام: رانچی)

ڈاکٹر صاحبؒ کی ڈائری سے

(ذیل میں ڈاکٹر صاحبؒ کے Undeciphered ذخیرے سے جوان کی ڈائریوں میں موجود ہے، ایک چیز بطور نمونہ اس مجلّہ میں شامل کی جارہی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حصہ ڈاکٹر صاحبؒ نے کسی مطبوعہ یا مخطوطہ سے نقل کیا ہے۔ ویسے اس سلسلے میں ڈائری میں ایک تحریر یوں ہے ''از تبریز ترجمہ ابریز''۔ بغیر کسی ایڈیٹنگ کے یہ چیز پیش ہے)

حروف تہجی سریانی زبان میں کس معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ (اور بقیہ حروف مقطعات کی شرح بھی ان کے ذریعہ معلوم ہوسکتی ہے۔)

أ : جمیع اشیا خواہ قلیل ہوں یا کثیر۔ اور کبھی اشارہ ہے نفس متکلم کی طرف۔ مگر اس اشارہ میں قبض مطلق نہیں۔

اُ : وہ شئے جو قریب ہو اور قلیل مقدار میں ہو۔

اِ : وہ شئے جو قلیل بدرجہ مناسب ہو۔

بَ : وہ شئے جو نہایت درجہ باعزت ہو یا نہایت درجہ ذلیل

بُ : اشارہ ہے مگر اس کے ساتھ قبض ہے

بِ : وہ شئے جو ذات پر داخل ہو یا داخل ہونے والی ہو

تَ : خیر کثیر وعظیم

تُ : قلیل چیز جو ظاہر ہو۔ اور کبھی اجتماع ضدین کے لئے بھی آتی ہے

تِ : وہ مصنوع جو ظاہر ہو

ثَ : نور یا ظلمت

ثُ : اشارہ ہے کسی شئے سے کچھ زائل ہو جانے کا

ثِ : اشارہ ہے ایک شئے کا دوسری شئے پر تقرر

جَ : نبوت یا ولایت بشرطیکہ اس کے قبل یا بعد حروف ہو جو اس پر دلالت کرے ورنہ خیر دائم، جسے زوال نہ ہو

جُ : بہترین چیز جو کھانے میں آئے یا جس سے لوگ نفع اٹھائیں

جِ : قلیل وضعیف نور ایمان

حَ : اشیاء کے احاطہ اور تمام چیزوں کے شمول پر دلالت کرے گا

حُ : تعداد کثیر بنی آدم کے سوا مثلاً ستارے

حِ : ذات پر داخل ہونے والی چیزیں یا جن پر ذات کا تسلط ہو مثلاً غلام اور درہم دینار

خَ : حد درجہ کا طول جس کے ساتھ رقت بھی ہو

خُ : وہ کمال جو حیوانات میں ہو

خِ : وہ کمال جو جمادات میں ہو

دَ : وہ شئے جو ذات سے خارج ہو

دُ : قلیل یا قبیح چیز جس میں غصہ ساتھ ہو

دِ : وہ شئے جو ذات میں داخل ہو یا ذات سے قریب یا ذات پر داخل ہو

ذَ : شئے اندرون ذات اور ساتھ ہی اس شئے کی عظمت کا اظہار جس پر ذات کا قبضہ ہو

ذُ : وہ شئے جس میں بالذات خشونت ہو یا شئے باعظمت یا قبیح

ذِ : ایسی قبیح چیز جس پر بالذات غصہ نہیں

رَ : تمامی خوبیاں ظاہری اور باطنی

رُ : وہ شئے جو اکیلی ہو اور ظاہر ہو

رِ : روح یا ذی روح غیر بنی آدم

زَ : وہ شئے جو ذات پر داخل ہو تو مضرت پہنچائے۔ یا قابل احتراز

زُ : وہ قبیح جس میں مضرت ہو مثلاً کبیرہ گناہ

زِ : وہ قبیح جس میں (عیب ضرور ہے مگر) مضرت نہیں جیسے صغیرہ گناہ اور شبہات

سَ : ملیح شئے جو طبعاً رقیق ہو

سُ : قبیح اور کھری شئے یا سیاہ چیز ظاہراً و باطناً

سِ : طبعی کمال مثلاً عقل کامل یا حلم وعفو

شَ : رحمت جس کے پیچھے عذاب نہ ہو۔ یا وہ شخص عذاب جس سے دور ہو اور رحمت نے داخل ہو کر اس کو پاک صاف بنا دیا ہو

شُ : اس شخص کی اظہار عظمت کے لئے ہے جو بالذات بلند مرتبہ ہو۔ یا جس میں عقل متحیر ہو یا آنکھ کو تکلیف تو ہے مثلاً کنگ

شِ : قلب میں چھپی ہوئی چیز یا جس شئے کو پاؤں وغیرہ نے کچلا ہو، اور وہ ظاہر نہ ہو

صَ : اگر مرقق ہے (حسب تجوید باریک پڑھنے کا مقام ہے) زمین کے تمامی ذرات جو محشر میں بحضور حق جل شانہ حاضر ہونگے (مٹی سے پیدا ہوئی ہر چیز اس میں داخل ہے)

صُ : تمامی پیداوار زمین

صِ : ساتوں زمین

صَ : اگر مفخم ہے (پُر پڑھنے کا مقام ہے) وہ شئے جس پر غضب الٰہی ہو۔

صُ : مفخم: ہر وہ ضرر جو مذکور ذیل سے ہر دو چیزوں سے ہمیں پہنچے۔

صِ : مفخم: زمین جس میں نبات نہ ہو یا وہ ذات جس میں کوئی خوبی نہ ہو

ضَ : صحبت اور عدم بلا

ضُ : وہ شئے جس میں مطلق نور یا مطلق ظلمت نہ ہو

ضِ : خشوع وخضوع

طَ : نہایت پاک صاف چیز

طُ : نہایت خبیث وگندی شئے

طِ : وہ شئے جس کا اثر طبعی ہو سکون، یا جس کو سکون کا حکم دیا جائے

ظَ : وہ شئے جو فی نفسہٖ بڑی ہو اور اس کی ضد کا وجود نہ ہو سکے۔ مثلاً شرفا میں جود وسخا۔ یا مثلاً قوم یہود میں دھوکا دہی

ظُ : وہ شئے جو تحریک نفسانی کا اتباع کرے اور اس کی تباہی میں مساعی ہو

ظِ : وہ شئے جس سے بندہ کو مضرت پہنچے اور ضرر رسانی اس کا امر طبعی ہو

عَ : مسافر کا آنا یا مقیم کا سفر کرنا

عُ : وہ شئے جو ذات میں قائم ہو اور اسی سے ذات کا قوام وبقا ہو

عِ : ذاتی خبث یا عبودیت کی گندگی

غَ : وہ نگاہ جو شئے کی حقیقت تک پہنچ جائے

غُ : اللہ کا نام ہے (جیسا بچے غوغو کہتے ہیں) اور اس میں شفقت پر دلالت ہے۔

غِ : سوال ہے نامعلوم کا تاکہ دوسرا جواب دے اپنی معلومات سے

فَ : خبث کی نفی ہے جبکہ معلوم ہو کہ اسکی جنس میں خبث ہے یعنی اظہار ہے کہ یہ خود طاہر ہے مگر اسکی جنس خبیث ہے اور خبیث سے مراد معاصی وغیرہ ہیں۔

فُ : خبث زائل کرنے کے لئے ہے

فِ : اشارہ ہے ذات کی طرف اور جس پر ذات مشتمل ہو۔ اور کبھی اسکے ساتھ اظہار قلت بھی شامل ہوتا ہے۔

قَ : تمامی خوبیاں یا تمامی انوار

قُ : اصل آفرینش یا علم قدیم

قِ : اشارہ ہے ذات کی طرف

کَ : حقیقت عبودیت کاملہ

کُ : سیاہ فام غلام یا قبیح

کِ : عبودیت کے تمہاری طرف منسوب ہونے کا اشارہ ہے

لَ : متکلم کو کسی بڑی چیز کا حصول اور اشارہ کسی باعظمت چیز کی طرف

لُ : ایسی چیز جس کی انتہا نہیں

لِ : متکلم کی طرف اشارہ ہے اپنی ذات کی طرف۔ یہ تو اس صورت میں ہے لام کو باریک پڑھا جائے اور اگر لام کو پُر پڑھا جائے تو اس میں قلق یا فتح بھی شامل ہوگا۔

مَ : تمام کائنات

مُ : پیاری چیز اور قلیل جیسے آنکھ کا پانی (جس پر بینائی کا مدار ہے) اور اسی سے ہے مؤمؤ (جو شیر خوار بچوں سے کسی چھوٹے بچہ کو پاس بٹھا کر کہا کرتے ہیں)

مِ : ذات کا ظاہری نور جیسے آنکھ کی روشنی اور باطنی نور جیسے قلب کی بصیرت

نَ : خیر وخوبی جو ذات میں مستقر اور مشتعل ہے

نُ : خیر کامل یا پھیلا ہوا نور

نِ : وہ جو متکلم کو ملے گی یا ملی ہوئی ہے

وَ : وہ چیزیں جن کا انسان میں پھیلا ہوا ہے جیسے رگیں وغیرہ

وُ : وہ چیزیں جو بنی آدم سے مبائن ہیں جیسے آسمان اور پہاڑ وغیرہ

وِ : پھیلی ہوئی چیزیں گھناؤنی جیسے آنتیں وغیرہ (کہ محل براز ہیں)

ہَ : رحمت پاک صاف بے انتہا

ہُ : نام ہے اللہ پاک کا

ہِ : وہ نور جو مخلوق سے نکلتا یا خاص مومنین سے خارج ہوتا ہے

یَ : ندا کے لئے ہے اور کبھی خبر کے لئے بھی آتی ہے جس میں ضمناً ندا ہو۔ جیسے لم یلد کہ جملہ خبر یہ ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اے وہ ذات جو دلالت سے منزہ ہے

یُ : وہ چیز جسے قرار نہ ہو جیسے بجلی وغیر

یِ : وہ چیز جس سے حیا آئے مثلاً شرم گاہ

☆☆☆

نذر ضیاء الھدیٰ

عکس دستاویزات

بچلر آف ہومیو پیتھ میڈیسین کی ڈگری کی True Copy کا عکس

TRUE COPY.

SIMILIA SIMILIBUS CURANTUR

THE PRINCE HOMOEOPATHIC MEDICAL SCIENCE COLLEGE
Registered under the Govt. of India Act XXI of 1860.
DANIAPORE, PATNA.

H.M.B.

This is to certify that Saiyid Ziaulhuda, son of Saiyid Nurulhuda, having passed the examination for the degree of Bachelor of Homoeopathic Medicines held in the month of Decem[ber] 1948 and having satisfactorily completed the course was admitted to the degree and in confirmation thereof we herein subscribe our names.

Signed this 30th day of December 1948.

Sd/- S.M. Masaud.
President.

Sd/- Habibul H.
Principal.

N.B.:- He was awarded a...........medal in.....

Attested
Addl. Under Secretary,
Local [illegible] Government Department
Patna.

ڈیفنس آف انڈیا رول (DIR) کے تحت ڈاکٹر صاحبؒ کی گرفتاری کی مدت کو مزید بڑھانے کا حکم نامہ

बिहार सरकार
गृह विभाग
(विशेष शाखा)
आ दे श

पटना, दिनांक 16 सितम्बर, 1976 ई0।

संख्या- 1213 / आं0 आन्तरिक सुरक्षा अधिनियम, 1971(26, 1971) की धारा 16 (क) की उप-धारा (4) द्वारा प्रदत्त शक्तियों का प्रयोग करते हुए राज्य सरकार तारीख 5. 4. 1976 को उक्त अधिनियम के अधीन श्री सैयद जियाउल होदा पिता का नाम स्वर्गीय नुरूल होदा के संबंध में आदेश संख्या 4724 तारीख 5.8.1975 में जिला दण्डाधिकारी, पटना द्वारा किये गए निरोध और घोषणा, जिसकी सम्पुष्टि राज्य सरकार के आदेश संख्या 4754 तारीख 19.8.1975 द्वारा की गई है, पर पुनर्विचार करने के बाद यह समझती है कि उक्त अधिनियम के अधीन उक्त श्री सैयद जियाउल होदा का निरोध आपात स्थिति से कारगर रूप से निपटने के लिये अभी भी आवश्यक है और निदेश देती है कि उक्त श्री सैयद जियाउल होदा को अभी भी निरोध में रखा जाय।

बिहार राज्यपाल के आदेश से,
16/9/76
(हरि किशोर राय)
सरकार के अवर सचिव।

16-9-76

तीन प्रतियां अधीक्षक, बिहार मंडल कारा, फुलवारी शरीफ, पटना को निरुद्ध व्यक्ति पर तुरत तामील करने के लिये भेजी जाती है। इसकी एक प्रति निरुद्ध व्यक्ति को दी जाय दूसरा प्रति कारा में रखी जाय, तथा तीसरी प्रति जिस पर तामील के प्रतीक स्वरूप निरुद्ध व्यक्ति का हस्ताक्षर या अंगूठे का निशान रहेगा, सरकार के पास तुरत लौटा दी जाय।

ह0 अ0

MAA School, Patna City کے ہیڈ ماسٹر کے ذریعہ جاری کردہ سرٹی فکیٹ کا عکس جس میں ڈاکٹر صاحبؒ کی اسکول ریکارڈ میں درج تاریخ پیدائش دی ہوئی ہے۔

24/9/ 7

This is to certify that S.Zeaul Hudda Son of M.S.Md.Nurul Hudda was a student of this school in the year 1928.

His date of birth as recorded in the admission register is 25-12-1920.

Head Master, 24/9/87
M. A. A. School,
Patna City.

MISA کے تحت ڈاکٹر صاحبؒ کی گرفتاری کے حکم نامہ کا عکس

Government of Bihar
Home Department
Special Section

ORDER

PATNA, the 16/9/ 1976.

No. 9243 /C. In exercise of the powers conferred by Sub-Section (4) of Section 16A of the Maintenance of Internal Security Act, 1971 (No. 26 of 1971) the State Government having reconsidered on 6.4.1976 the detention and declaration made by the District Magistrate, Patna in order No. 4724 dated 5.3.1975 in respect of Shri Syed Ziaul Hoda Son of Shri Late Nurul Hoda under the said Act and confirmed by the State Government Order No. 4758 dated the 19.[illegible].1975 consider that the detention of the said Shri Syed Ziaul Hoda under the said Act continues to be necessary for effectively dealing with the emrgency, directs that the said Shri Syed Ziaul Hoda shall be made to continue in detention.

16-9-76

By order of the Governor of Bihar,
[signature] 16/9/76
(H. K. Sahay)
UNDER SECRETARY TO GOVERNMENT.

Forwarded in triplicate to the Superintendent Camp Jail, Phulwari Sharif, for immediate service on the detenu. One copy should be given to the detenu second copy kept in jail and the third copy bearing the signature or thumb impression of the detenu in token of receipt should be returned to Government immediately.

ڈاکٹر صاحبؒ کے زرد اچک کارڈ پر نام کا عکس جس میں ان کا نام محمد عبداللہ ضیاء الہدیٰ درج ہے۔

219

859789

No. D

निर्वाचक कार्ड

गैरमानक ।

भाग संख्या .... निर्वाचन क्षेत्र का नाम ....

इलाका ....

प्रखंड/ग्राम पंचायत/गाँव/शहर/मुहल्ला .... मतदान केन्द्र संख्या ....

स्थान का नाम .... मकान नं० ....

नगर पालिका वार्ड नं० .... (यदि कोई हो) उपरोक्त परिसरों में मामूली तौर से निवास करने वाले वयस्क नागरिकों के नाम और ब्योरे

क्रम सं०	नागरिक का नाम	पिता/माता या पति का नाम	पुरुष या महिला	1 जनवरी 1995 को लगभग आयु
1				

वयस्क नागरिकों की कुल संख्या (शब्दों में)

मैं निष्ठापूर्वक घोषणा करता हूँ कि उपरोक्त दिये गये ब्योरे मेरी जानकारी के अनुसार सत्य है और उन नामों में से किसी का भी नाम किसी अन्य निर्वाचन क्षेत्र की निर्वाचक नामावली में सम्मिलित नहीं किया गया है ।

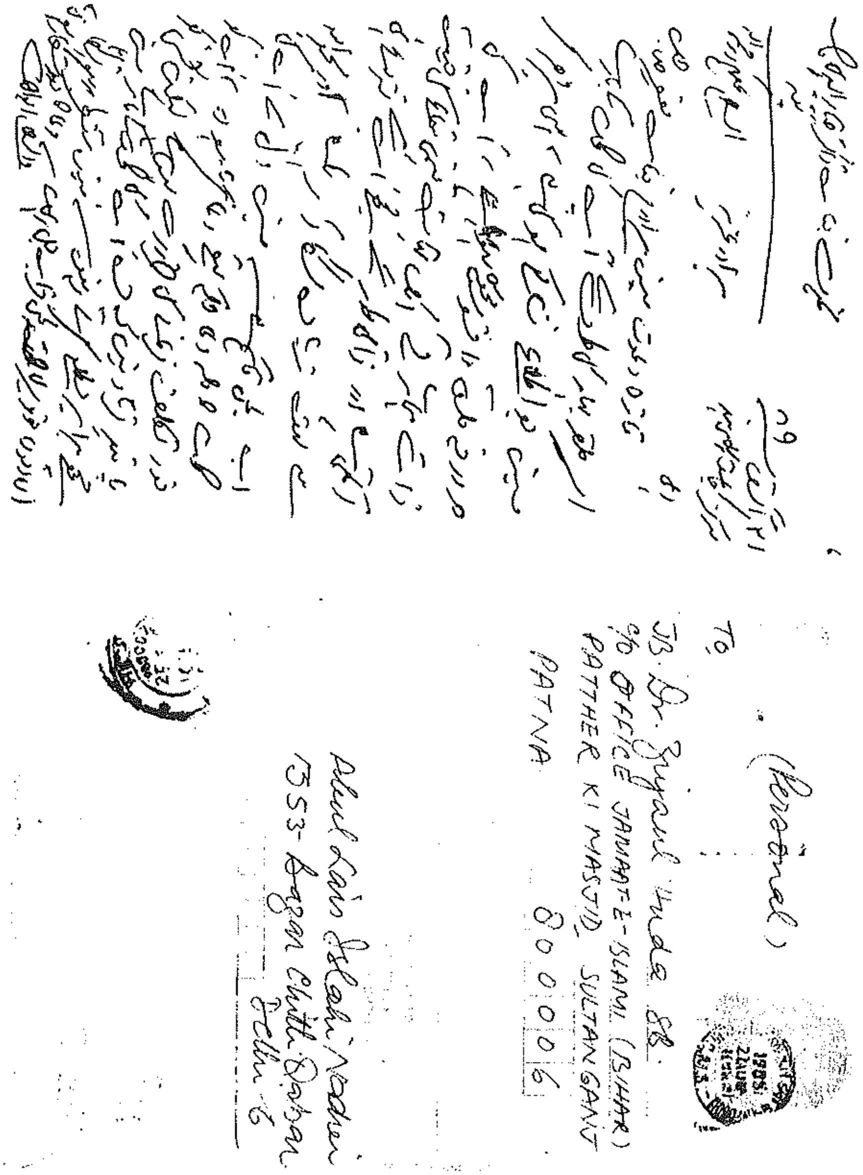
मैंने उपरोक्त कार्ड की एक प्रति प्राप्त कर ली है, जिसमें मेरे परिवार के सभी वयस्क नागरिकों के नाम दिये गये हैं ।

प्रगणक के हस्ताक्षर (तारीख सहित) — घर के मुखिया/वरिष्ठ सदस्य
नाम (पूरा) .... — हस्ताक्षर/अँगूठे का निशान
कोड नं० .... — नाम (पूरा) ....

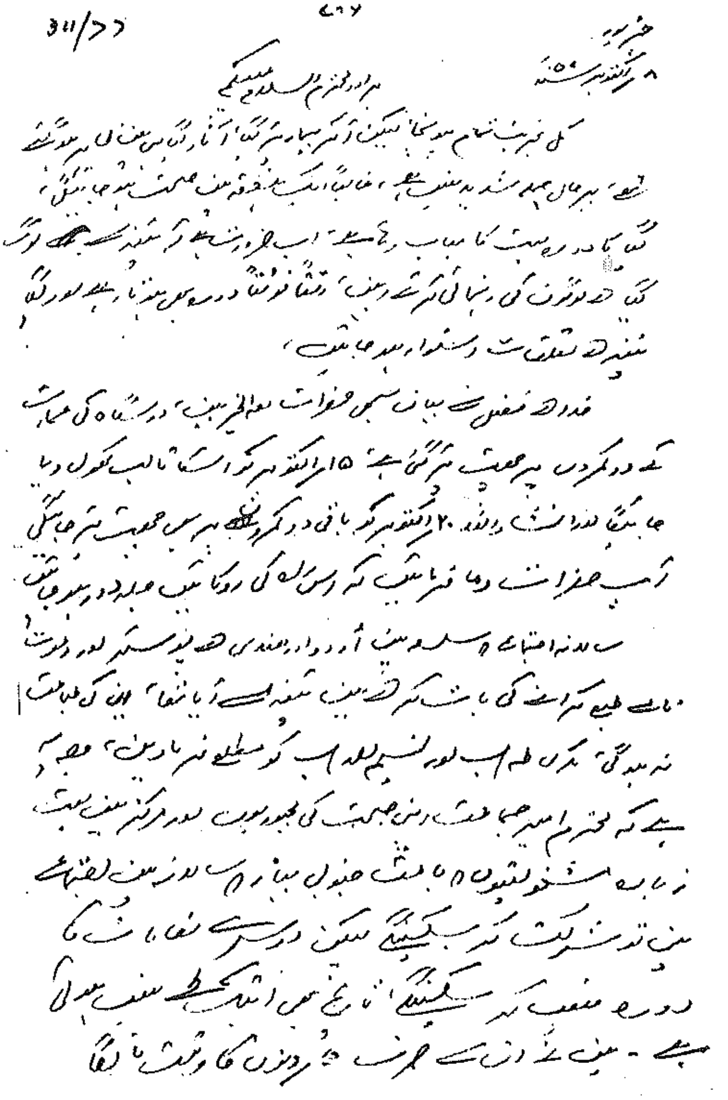
अनुदेश :—दावे और आक्षेप आमंत्रित करने वाले प्रारूप में प्रकाशित होने वाली निर्वाचक नामावली के सुसंगत भाग की कृपया जाँच कर लें । यदि इस कार्ड में दर्ज परिवार के किसी सदस्य का नाम उक्त प्रारूप नामावली में नहीं आता है तो वे अपना नाम सम्मिलित करने के लिए विधि के अन्तर्गत प्रारूप 6 में व्यक्तिगत दावा दाखिल करें।

कोई व्यक्ति जो ऐसा विवरण या घोषणा करता है जो वह या तो जानता है या मानता है कि झूठ है या मानता है कि सत्य नहीं है, तो वह लोक प्रतिनिधित्व अधिनियम, 1950 की धारा 31 के अन्तर्गत एक अवधि की कैद के साथ दण्डनीय है जो कि एक वर्ष की अवधि तक या जुर्माना या दोनों के साथ हो सकती है ।

ڈاکٹر صاحبؒ کے نام مولانا ابواللیثؒ کے ایک خط کا عکس



انیس الدین احمد صاحب کے ایک خط کا عکس جو ڈاکٹر صاحب ؒ کو لکھا گیا



مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کے ایک خط کا عکس، جس میں ڈاکٹر صاحبؒ کی کتاب ''اسلامی معاشرہ'' پر اظہار خیال ہے۔

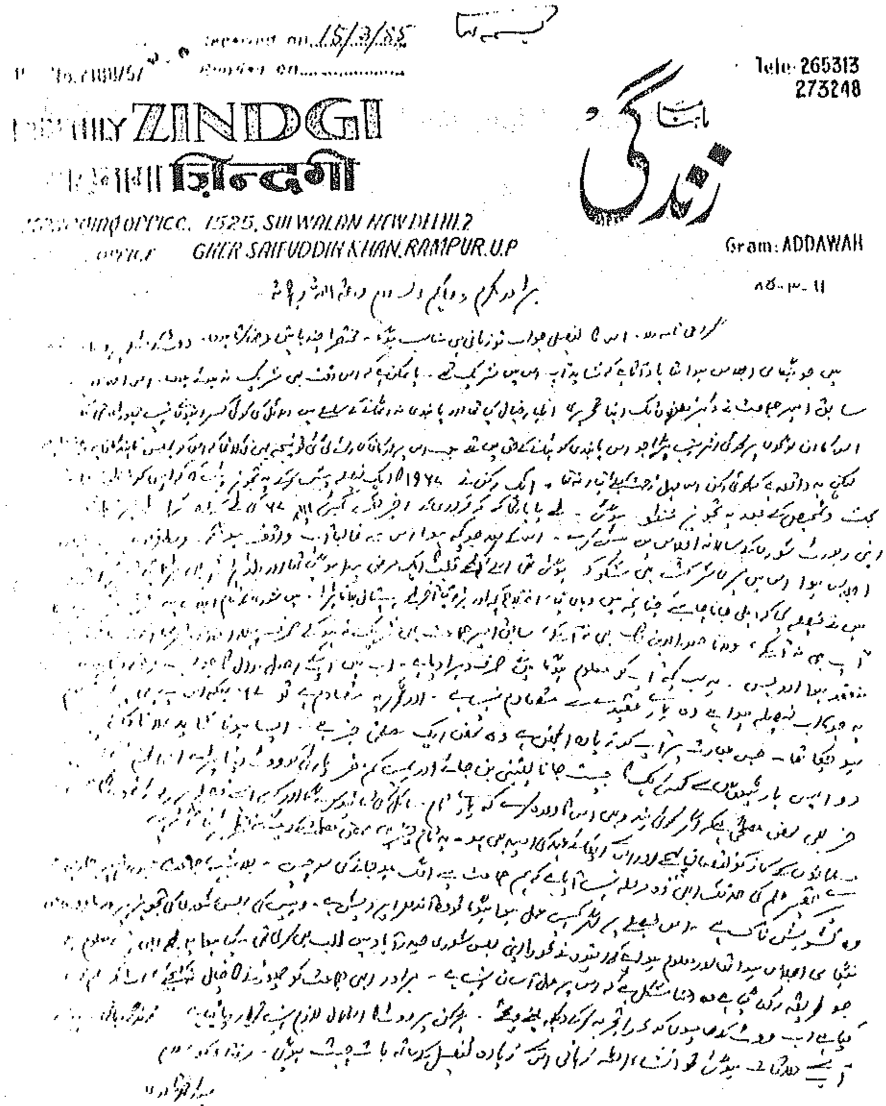
بسمہ

پھولپور
۳۱ مارچ

برادر مکرم و محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں
آپ کے فرستادہ، برادر عزیز راشد نیر صاحب تشریف لائے اور ان کے
ذریعہ گرامی نامہ مع فرمائش نامہ کے کتابچہ موصول ہوا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں
جسمانی اور ذہنی طور پر اب اتنا ناکارہ سا ہو چکا ہوں کہ کسی اہم مسئلے پر کما حقہ
غور و فکر کر کے اس سے متعلق ضروری باتیں ضبط تحریر میں لانا از حد دشوار ہو گیا ہے۔
تاہم جب آپ کی ایسی فرمائش ہے تو چند موٹی موٹی باتیں درج کرتا ہوں:
۱- اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کا صحیح، نتیجہ خیز اور مکمل خاکہ بنیادی طور پر تو خود
آپ کے اس کتابچہ ہی میں موجود ہے۔ اور یہی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک اقامت
دین کا بنیادی اور اولین مرحلہ اسی طرح کے معاشرے کی تعمیر ہی تھا اور ہے۔ لیکن افسوس
ہے کہ جماعت اس تعمیر کی مطلوبہ کوششوں کا اور اس کی ناگزیر ضرورتوں کا کما حقہ پاس و
لحاظ نہ رکھ سکی، اور دیگر کم اہم یا بعد کے مراحل کے کاموں میں اپنی توجہات اور اپنی توانائیوں
کا بیشتر حصہ صرف کرتی چلی آرہی ہے۔ ~~بہرحال~~
۲- ایسی صورت حال میں ہمیں اپنے انداز فکر اور اپنی سمت سفر درست کرنے کی ضرورت ہے۔ مرے
کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تعمیر معاشرہ کی مطلوبہ بنیادیں تو بالکل واضح ہی ہیں۔ البتہ تفصیلات
کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ لیکن جب کام صحیح طریقے سے اور یکسوئی کے ساتھ ہونے
لگے گا اور ہوتا رہے گا تو پیش آمدہ حالات اور تجربات خود رہنمائی کرتے جائیں گے۔
غرض اصل ضرورت کسی تفصیلی خاکے کی نہیں، بلکہ صحیح رخ پر یکسوئی کے ساتھ کام کرتے
رہنے کی ہے۔ آپ کے بقول السابقون کا گروہ وجود میں لانا ہی اس مہم کی شاہ
کلید ہے۔ والسلام صدرالدین اصلاحی

مولینا سید احمد قادریؒ کے ایک خط کا عکس



افضل حسینؒ کا بحیثیت قیم جماعت، ڈاکٹر صاحبؒ کی کتاب ''انقلابی تحریک'' پر وضاحت طلبی کا خط

Grams: MARKAZ' Phone: 268622

جماعت اسلامی ہند

Jamaat-e-Islami Hind

Ref. No. Dated 9-6-89

برادر مکرم و محترم ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا تازہ کتابچہ "انقلابی تحریک" مرکزی مجلس شوریٰ کے حالیہ اجلاس منعقدہ مئی ۸۹ء میں ارکان شوریٰ کو ملا تھا۔ انھوں نے اس کا مطالعہ کیا اور پھر اس کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد شوریٰ نے جو رائے قائم کی وہ اس طرح ہے ۔

- مصنف سے اس سلسلہ میں وضاحت طلب کی جائے ۔
- کتابچہ کی فروخت فی الفور بند کر دینے کا انھیں پابند کیا جائے ۔
- کتابچہ کے مطالعہ سے واضح طور پر رائے قائم ہوتی ہے کہ وہ دستور جماعت کی دفعہ ۶۸ کے قولاً یا عملاً انحراف کے زمرے میں آتا ہے ۔
- کتابچہ کی جن عبارتوں پر خاص طور سے گفتگو ہوئی ان کی روشنی میں درج ذیل خیالات نوٹ کیے گئے ۔

۱۔ کتابچہ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف موصوف کو جماعت اسلامی کے مطلوبہ صالح انقلاب اور اقامت دین کے نہج (Process) سے یا تو واقفیت نہیں ہے یا جماعت کے دستور اور اس کی پالیسی پروگرام سے انھیں اتفاق نہیں ہے ؟

موصوف کتابچہ کے پیش لفظ صفحہ ۲ میں تحریر فرماتے ہیں ۔

"چالیس سال سے زیادہ گزرے جب کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی ، مگر تحریک کا صحیح نہج (Process) پھر بھی واضح نہیں ہوا تھا"

اور چالیس سال کے غور و فکر اور قرآن کی طرف رجوع ہونے کے بعد بھی جو کیفیت تھی اس کے بارے میں فرماتے ہیں ۔

"میں خود اپنے اندر باطنی اور ظاہری دونوں حیثیت سے یہ صلاحیت نہیں پاتا کہ اس کام کو مطلوبہ نہج پر چلا سکوں"

- مصنف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ : نہ تو تاریخ میں نہ قرآن سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام جو تحریکیں چلاتے رہے ان کی تفصیلات صحیفے الہامی ریکارڈ میں مستند انداز میں محفوظ ہیں ——— اس کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام تا رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ و تعلیمات سے وہ دلائل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اور تحریک اسلامی (جماعت اسلامی) کو صفحہ ۲۱ تا آخر جس طرح ہدف تنقید بنائے ہیں وہ موصوف کے ایک جملہ سے بخوبی واضح ہے ،

"اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لوگوں اور با مقصد جماعت (خواہ شاہرہ کیا جائے خواہ کتنا ہی) کام کرنے والوں کے ذہن پر یا بھی نہیں سکتے تھے"

وہ جماعت کی موجودہ اصطلاحوں پر ناپسندیدگی انداز میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں ۔

"ہمہ وقتی یا جزوقتی یا مددگار کارکن صفحہ ۲۱ — اسپیچ بنانے اور اسپیچ کو اچھا بنانے کی کوشش جو مصنف کے خیال میں مادہ پرستانہ انداز فکر ہے ۔ صفحہ ۲۳"

Grams : 'MARKAZ' Phone : 260622

جماعت اسلامی ہند

Jamaat-e-Islami Hind

BAZAR CHITLI QABAR, DELHI-110006

Ref. No. Dated

پبلیسٹی یا تشہیر کا کام۔ صفحہ ۲۵ بھی مصنف کے خیال میں غیر مفید ہے۔

• صفحہ ۲۶ پر تحریک اسلامی میں دو طرح کے افراد کو غیر مخلصین کے زمرے میں شامل ثابت کرتے ہیں۔
ایک وہ لوگ جو تحریک کا امیج بنانے میں ایشوز اور پبلیسٹی سے بھی کام لیتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو بیرون ملک بڑی بڑی تنخواہوں کے ساتھ ملازمت کرتے ہیں۔

کتابچہ کا ایک اقتباس اس طرح ہے۔

" اس دور میں تحریک اسلامی کو سبوتاژ کرنے والی طاقتیں باہر سے بڑی بڑی رقمیں دیکر تحریک میں گھسے ہوئے لوگوں کو اپنا آلہ کار بنا کر ان کے ذریعہ اور بڑی بڑی تنخواہوں کے ساتھ ملازمت دے کر براہ راست اپنے لیے خوشامد گار بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ صفحہ ۳۷

" مخلصین کو ایسے لوگوں سے جو کفار [illegible] [illegible] بن گئی ہیں۔

• اسٹیٹ کو ایک بت ثابت کر کے بالغ رائے دہندگی کو شرک و بت پرستی کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے۔ صفحہ ۴۵
" گویا ریاست (اسٹیٹ) اسی طرح ایک بت ہے جس طرح بت پرستوں کے مٹی یا دھات کے بت ہوتے ہیں

• مصنف کے خیال میں اسلام میں بالغ رائے دہندگی (A.F) کا سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

• دستور جماعت اسلامی میں امیر اور شوریٰ کے انتخاب کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ موصوف کے مندرجہ ذیل اقتباسات کی روشنی میں نادرست قرار پاتا ہے۔

" شوریٰ کے لوگ عام لوگوں کے منتخب کیے ہوئے یا امیر اور شوریٰ بنانے والے لوگ بھی عام لوگوں کے منتخب کیے ہوئے نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اللہ، رسول اور اسلام کے لیے اپنے مخلصانہ کارناموں کی وجہ سے خود بخود ممتاز ہو جاتے ہیں۔ صفحہ ۵۰

" در باب حل و عقد میں یہ مشورہ ہے کہ یہ لوگ رائے دہی کا انتخاب امیر کا کام ہوگا نہ کہ حل و عقد کا۔

امید ہے آپ درج بالا اقتباسات کو سامنے رکھ کر ایک بار اپنی کتاب کا بغور مطالعہ فرمائیں گے اور اسکے بعد شوریٰ کے نشان زدہ اقتباسات اور قائم شدہ خیالات کو سامنے رکھ کر واضح طور پر اپنے جواب سے مطلع فرمائیں گے۔ اور پوری کوشش کریں گے کہ ماہ رواں کے آخر تک آپ کے جواب سے مرکز مطلع ہو جائے۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

والسلام

افضل حسین

ڈاکٹر صاحبؒ کی طرف سے افضل حسین صاحب کے وضاحت طلب خط کا جواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

11

محترم فہیم صاحب! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ 9.6.89 پیش نظر ہے۔ جواباً عرض ہے کہ آپ نے ... پر "انقلابی تحریک" ایک علمی اجمالی [illegible] (اسلامی نہیں) [illegible] مضمون پر مشتمل ہے [illegible] ہے۔ اس میں پیش لفظ میں صاف اور صریح الفاظ میں میں نے لکھ دیا ہے کہ "........ میں تحریر کی شکل میں اس لئے نہیں لا رہا ہوں کہ جو اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں ان پر کوئی نقد یا تبصرہ پیش نظر ہو (اگرچہ ان کے خلوص کے صلے ان کو آخرت میں اجر بہرحال ملے گا) .... یہ تحریر آئندہ اسلامی تحریک برپا کرنے والوں کے لئے راہنمائی کا سبب بن جائے تو ان کے اجر میں شاید میرا بھی کچھ حصہ ہو جائے۔ اس تحریر میں بہرحال ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے تفصیلات کا رنگ بھرنا آئندہ تحریک چلانے والوں کا کام ہے"

اس صاف اور صریح وضاحت کے بعد کون سا معروف اخلاقی جواز ہے کہ کوئی مجھ پر یہ الزام لگائے کہ میں نے کسی فرد یا چند افراد یا کسی تحریک کو نشانہ بنایا ہے۔ البتہ علمی حیثیت سے اس پر تنقید، اعتراض اور غلطیوں کی نشاندہی کرنے کا حق ہر آدمی کو ہے اور میں اس کو خوش آمدید (welcome) کرتا ہوں۔

والسلام

جو مستقبل میں انقلابی (صفحہ [illegible]) تحریک [illegible] [illegible]

حسنین سید صاحب کے ایک خط کا عکس

जमाअत-इस्लामी हिन्द	JAMAAT-E-ISLAMI HIND
इस्लाम नगर	ISLAM NAGAR
पो० दरभंगा मेडिकल कॉलेज	P.O. Darbhanga Medical College
(दरभंगा)	Dist. Darbhanga-846003

Ref

Dated ۱۰ ستمبر ۸۵

برادر محترم و مکرم السلام علیکم و رحمۃ اللہ

امید ہے کہ آپ اور محترمہ بھابی مع خیر و عافیت کے ہوں گے،
برادرم عبدالودود صاحب کے خط اور ۵ ستمبر کی دعوت سے یہ
معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ نے بحیثیت امیر حلقہ بہار
اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے
فرائض کو بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے صحت و اطمینان
کے ساتھ ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائے۔

میرے خیال میں آپ کی افتتاح کے زمانہ میں حالات میں
امید کا پہلو پیدا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ آپ جلد سے جلد حلقہ کی
شوریٰ کا اجلاس طلب کرکے حالات کا جائزہ لیں
اور باقی ماندہ میقات میں دعوتی سرگرمیوں کو تیز
تر کرنے کے امکانات پر غور کریں۔

نیز یہ کہ محترم جعفر صاحب کو ~~[illegible]~~ سکریٹری کا چارج
معاون امیر حلقہ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع دینا بہتر ہوگا
باقی ان شاء اللہ عند الملاقات والسلام محتاج دعا

محمد حسنین سید

مکتوب گرامی

ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ - امیر حلقہ بہار

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ کا جماعت اسلامی ہند سے استعفیٰ نامہ کا عکس

باسمہ تعالیٰ و بحمدہ

پٹنہ - بہار
یکم رمضان المبارک
سنہ ۱۴۱۱ھ

محترم امیر جماعت اسلامی ہند ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔ عرض مدعا یہ ہے :

اب تک اپنے بعض بزرگوں اور عزیزوں کے مشورے اور خواہش کے احترام اور لحاظ کے تحت فقط اپنے آپ پر جبر کرتا رہا ۔ لیکن اب میرا ضمیر مجھے چین لینے نہیں دے رہا ہے ۔ زندگی اور موت کا کبھی بھی اعتبار نہیں مگر عمر کے جس مرحلے میں اب میں ہوں اس میں تو ہمہ وقت موت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے ۔

اپنے رب سے میں اس داغ کے ساتھ ملنا نہیں چاہتا کہ وہ سوال فرمائے کہ باطل کو مٹانے کیلئے جو جماعت قائم کی گئی تھی باطل کو عملاً سہارا دینے کی پالیسی پر گامزن کردی گئی اس کے باوجود تم اس سے وابستہ رہتے ہوئے ہمارے سامنے حاضر ہوا ہے ۔ کیا تجھے فراست ایمانی اور فہم دین دونوں سے عاری ہوا تھا مسلم ادھر خود فریبی پر مبنی دلیل کو تو رد نہ کر کے جو ہمارے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتی ۔

کیا روس سے مسلمانوں کا تاشقند و بخارا چھین لیا گیا، ادھر نہ ختم ہو گئے ۔ کیا چین سے مسلمان ختم ہو گئے ۔ کیا برما سے مسلمان نابود کردئے گئے ۔ ہاں کیا اس وقت سے بھی زیادہ خطرناک اور نازک گھڑی آگئی تو جبکہ ہمارا آخری نبی ہمارے بارگاہ میں گڑگڑا کر عرض کر رہا تھا کہ یہ مٹھی بھر جماعت اگر ختم ہوگئی تو قیامت تک روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی ۔ اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا ۔ پھر بھی کیا ہم نے حکمت عملی کے طور پر ادنیٰ سی مداہنت کی بھی اجازت دی

چنانچہ میں جماعت اسلامی ہند کی بنیادی رکنیت سے مستعفی ہوتا ہوں اور اب آپکی جماعت کے ضابطوں اور قیود سے بالکل آزاد ہوگیا ۔

براہ کرم آئندہ اس سلسلے میں خط و کتابت کی زحمت نہ فرمائیں ۔ اور اگر آپکی طرف سے کوئی کو ... اٹھے تو مجھ سے کسی جواب کی امید نہ رکھیں ۔ فقط

والسلام
ضیاء الہدیٰ

صدرالدین اصلاحیؒ کی تحریر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ایک خط کی نقل کا عکس

(ذیل میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اس گرامی نامے کی نقل درج ہے جسے انہوں نے مولانا محمد یوسف صاحب کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ صدرالدین اصلاحی)

[illegible]

---

۲۸ فروری ۱۹۴۶ء

برادر عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اصولی حیثیت سے میری رائے اب بھی یہی ہے کہ ایک لادینی ریاست میں لادینی دستور کے تحت حکومت کا انتظام چلانے اور پالیسیاں بنانے کے لیے جو پارلیمنٹ یا مجلس قانون ساز بنے اس میں حصہ لینا مومن کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ شرکت اس کی حکمرانی کو امر واقعہ کے بجائے اسے امر جائز تسلیم کرنے کے ہم معنی ہوگی، اور یہ چیز ہمارے دین میں صحیح نہیں ہے۔ امر واقعہ تو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ واقعی امر کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس کے امر واقعی ہونے کے جو تقاضے ہیں انہیں بھی ہم پورا کرتے ہیں، یعنی اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرتے ہیں اور اس کے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ لیکن اسے امر جائز مان لینا اور اس کے چلانے میں حصہ لینا اس پوری دعوت کے خلاف ہے جو ہم اقامت دین کے لیے دیتے ہیں، اور اس تضاد کو ہر وہ شخص محسوس کرے گا جو ایک طرف ہماری دعوت کو اور دوسری طرف ہمارے عمل کو دیکھے گا۔

عملی حیثیت سے بھی حصہ لے کر ہم ایک طرف دوسرے عناصر سے انتخابی الجھنوں میں پھنس جائیں گے جو ہماری دعوت کے پھیلنے میں رکاوٹ بنے گا، اور دوسری طرف ہم مسلمانوں کے قومی مفاد کی کشمکش سے وابستہ ہو جائیں گے جس کے متعلق میں نے مدراس کی تقریر میں توجہ دلائی تھی کہ اب یہ اسلامی دعوت کی راہ میں پھر روڑے [illegible] کوئی قابل لحاظ خدمت نہ انجام پا سکے گا۔

انتخابات میں حصہ لینے کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم اس کے ذریعے سے نظام حکومت کو تبدیل کرنے کی امید کر سکتے ہوں، لیکن اس کے آثار ابھی دور دور کہیں نظر نہیں آتے ہیں۔ اس کا امکان تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم دعوت عام کے ذریعے سے آبادی کے بہت بڑے حصے کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

لوکل باڈیز کا جو دائرہ کار ہے اسے دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے انتخابات میں حصہ لیا جا سکتا ہے، کیونکہ لادینی نظام کے قیام یا عدم سے ان کا [illegible] تعلق نہیں ہے۔ البتہ اس پہلو پر غور کر لینا چاہیے کہ آیا یہ ہمارے اثرات بڑھانے کا ذریعہ بنے گا یا انتخابی مقابلوں سے جو تلخیاں پیدا ہوتی ہیں وہ توسیع دعوت میں رکاوٹ بن جائیں گی؟ اس کا فیصلہ [illegible] ہوں۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کا ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ کے استعفٰی کی اطلاع ملنے کے بعد کے خط کا عکس

بسم

1661

پھول پور - اعظم گڑھ
۶ جولائی

برادر مکرم و محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ - خدا کرے بخیریت و بعافیت ہوں - میں بھی بحمد اللہ فی الجملہ ٹھیک ہی ہوں، مگر کبر اور علالت دونوں ہی کا طول قدرتی طور پر اپنا اعصاب شکن اثر بڑھاتا ہی جا رہا ہے، اب تو دو چار فرلانگ چلنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ آپ کے عنایت نامے کے جواب میں اتنی غیر معمولی تاخیر ہو گئی، جس کے لیے احساس ندامت کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔

آپ کی یکسوئی کی اطلاع مجھے جلد ہی مل گئی تھی اور اس بات کی بھی کہ مولانا صاحب آپ کے پاس گفتگو اور افہام و تفہیم کے لیے گئے بھی تھے - بہرحال آپ کے استعفے کی اطلاع ملنے پر مجھے فطری طور پر ایک جھٹکا لگا۔ ہم نے اپنی پوری عمر اس تحریک سے وابستہ رکھنے کا فیصلہ اس طرح کے دن دیکھنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ لیکن میں آپ کو آپ کے اس اقدام پر مورد الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔ مورد الزام اگر ٹھہرایا جا سکتا ہے تو انہی حضرات کو ٹھہرایا جا سکتا ہے جنہوں نے عاقبت اندیشی کا حق نہ ادا کرتے ہوئے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ آپ جیسا شخص بھی الگ ہو جانے پر مجبور ہو گیا۔

جہاں تک آپ کی اس فرمائش کا تعلق ہے کہ آپ کو اپنے مجوزہ تحریک معاشرۂ اسلامی کے کام اور پروگرام کے سلسلے میں کچھ مشورہ دوں، تو اس وقت صحیح بات یہ ہے کہ اب میں اپنے جسمانی ہی نہیں، ذہنی اور دماغی ضعف کی بھی وجہ سے اس قابل نہیں رہ گیا ہوں کہ اتنے اہم مسئلے میں، یعنی ایک مستقل اسلامی تحریک و تنظیم کے خطوط کار کی کسی واضح اور

FIRST FOLD

حسب ضرورت تعین میں کوئی قابل اطمینان مشورہ دے سکوں۔ برادرم! مجھے
تو اب از کار رفتہ ہی سمجھیے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ آپ کے شائع شدہ کتابچوں
میں وہ بنیادی نکات موجود ہی ہیں جن کو سامنے رکھ کر آپ کام کا آغاز
بآسانی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق آپ کے شامل حال رہے۔ جوں جوں
قدم بڑھتا جائے گا تجربات بھی اور مزید غور و فکر بھی ان شاء اللہ آگے کی راہ
کھولتا جائے گا۔

میری اس وقت کی معذرت خواہی یا اظہار عجز کا مطلب یہ نہیں ہے
کہ اگر زندگی کچھ دنوں اور باقی رہی اور ذہنی و فکری توانائی میں کچھ سدھار
بھی آیا تب بھی میں آپ کو کوئی مشورہ دینے سے پہلوتہی کر جاؤں گا۔

آخر میں ایک تشویش ناک خبر بھی تحریر کر رہا ہوں۔ پرسوں یعنی
جمعرات ۸ جولائی کی شام میں مرکز جماعت سے بلریا گنج فون آیا کہ سابق امیر جماعت، محترم مولانا محمد یوسف صاحب پر فالج کا حملہ ہو گیا
ہے۔ خدا کرے حملہ ہلکا ہی ہو اور اب وہ رو بصحت بھی ہوں۔
دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم فرمائے اور موصوف کو
شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمادے۔ آمین

والسلام
عبدالحق انصاری

نذر ضیاء الہدیٰ اردو

NAZR-E-ZIYAUL HUDA 2003 AD

MAJLIS RUFAQA-E-QADEEM HALQA TALABA ISLAMI, BIHAR

وقت برف کی طرح تیزی سے پگھل رہا ہے۔ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے، موجودہ تہذیب کی قیامت کو قریب تر کرتا جا رہا ہے۔ موجودہ تہذیب اب اتنا جلد مٹ جانے والی ہے کہ جو لوگ باقی رہیں گے وہ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ یہ تہذیب صرف خود ہی نہیں مٹے گی بلکہ اپنے علم برداروں کے ساتھ مٹے گی اور جو لوگ ان علم برداروں کے پیچھے چل رہے ہوں گے ان کا انجام بھی انہیں کے ساتھ ہوگا۔

خالص دنیاوی نقطہ نظر سے بھی عقل مندی کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی وقت کے اشاروں کو سمجھے اور مستقبل کے موڑ پر نگاہ رکھے۔ اب جب کہ یہ تہذیب مٹنے جا رہی ہے، یقینی بات ہے کہ اس کی جگہ کوئی دوسری تہذیب لے لے گی۔ دور اندیشی کا تقاضہ یہی ہے کہ موجودہ تہذیب کے ساتھ وفاداری کو ترک کر دیا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ آنے والی تہذیب کیسی ہوگی؟ اور پھر اپنے ذہن، اپنے رجحانات اور اپنی خواہشوں کو اسی کے مطابق بدلنے کی اور اپنے عملی رویوں کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع کر دی جائے ____ میں اپنے عزیز طلبہ کو اس کی طرف خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں ____ انہیں چاہئے کہ جس پٹی پٹائی راہ پر وہ چلتے آ رہے ہیں اسے فوراً چھوڑ دیں۔ مگر دوسری راہ کوئی بنی بنائی نہیں ہے جس پر وہ آسانی سے چلنا شروع کریں۔ یہ راہ انہیں خود بنانی ہوگی۔ اور تاریخ سازی کا رول ادا کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰؒ